کلیات

مولانا محمد حسین آزاد

کلیات

مولانا محمد حسین آزاد

بک ٹاک
میاں چیمبرز، 3ٹمپل روڈ، لاہور

کلیات

مولانا محمد حسین آزاد

ناشر ——— بک ٹاک، لاہور

اشاعت ——— 2006ء

طابع ——— علی پرنٹرز، لاہور

قیمت ——— -/850 روپے

بک ٹاک ——— میاں چیمبرز، 3۔ ٹمپل روڈ۔ لاہور

فون ——— 6303321 - 6370656

شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد

(حیات و خدمات)

ہندوستان کی عظیم مغلیہ سلطنت اپنی آخری سانسیں شمار کر رہی تھی اور مغل فاتحین کے کارنامے تاریخ کا حصہ بن چکے تھے۔ بہادر شاہ ظفر کی تخت نشینی کے تذکرے ہر زبان پر تھے۔ دہلی کے تخت پر بہادر شاہ ظفر کے براجمان ہونے سے ایک سال قبل 1836ء میں مولوی محمد باقر نے اردو اخبار کی بنیاد رکھی جو شمالی ہند کا پہلا اور ہندوستان کا دوسرا اخبار تھا۔

اس سے اگلے سال سرسید احمد خان کے بڑے بھائی سید محمد خان نے سید الاخبار جاری کیا۔ اس کے بعد صادق الاخبار اور گلِ رعنا بھی سامنے آ گیا۔

مولوی باقر علی دہلی کے ایک علمی گھرانے کے فرد تھے۔ ابتدائی تعلیم سے فراغت پا کر وہ میاں عبدالرزاق کے درس میں شرکت کرنے لگے۔ یہیں ان کی ملاقات شیخ ابراہیم ذوق سے ہوئی۔ جلد ہی یہ ملاقات پُر خلوص دوستی میں بدل گئی۔

آگے چل کر ابراہیم ذوق نے شاعری کا میدان اختیار کیا اور مولوی باقر نے دہلی کالج کی مدرسی اور بعد میں اردو اخبار کے اجرا کی ذمہ داری اپنے کاندھوں پر اُٹھالی۔ اگرچہ دہلی کے دستور کے مطابق دوستوں کی محفل میں بچوں کو لے جانے کا رواج نہیں

تھا لیکن مولوی باقر اپنے بیٹے محمد حسین کو اس کی ذہانت و فطانت کے پیشِ نظر کبھی کبھی ذوق کے پاس لے جایا کرتے تھے۔

یہ وہی محمد حسین تھے جو 10 جنوری 1830ء کو پیدا ہوئے اور آنے والے دور میں شمس العلماء مولوی محمد حسین آزاد کے نام سے مشہور ہوئے۔

شیخ ابراہیم ذوق کی محفل میں ہر طرف شاعری کی حکمرانی تھی۔ محمد حسین ایام طفلی کے باوجود اکتائے بغیر گھنٹوں اس محفل میں اپنے باپ کے ساتھ موجود رہتا۔ مولوی باقر علی اپنی اخباری و کاروباری مصروفیات کے باعث محمد حسین کی نوشت و خواند کی طرف زیادہ توجہ نہ کر سکے، البتہ جب وہ مکتب کی تعلیم ختم کرتے کرتے اپنی عمر سے زیادہ بڑی باتیں کرنے لگا تو اس کے علمی شوق کے چرچے گلی گلی میں پھیل گئے۔

گھر والوں نے جب اپنے ہونہار بیٹے کی علمی پیاس کو دیکھا تو اُسے دہلی کالج میں داخل کرا دیا۔ یہاں کے اساتذہ کی قابلیت اور روشن دماغی نے بہت جلد محمد حسین کی پوشیدہ صلاحیتوں کو ابھارنا شروع کر دیا۔

محمد حسین چوری چھپے شعر بھی کہا کرتا تھا، لیکن کچھ جھجک اور کچھ خوف کے سبب اپنی اس صلاحیت کا اظہار نہیں کرتا تھا۔ جب پے در پے دلی کالج کے دو مقابلوں میں، جن کا دائرہ مضمون نویسی تک محدود تھا، محمد حسین کے لکھے مضمونوں نے اوّل انعام پایا تو اس کے اعتماد بڑھا، جھجک ختم ہوئی اور اُسے یقین ہو گیا کہ وہ ایک اچھا ادیب و شاعر بن سکتا ہے۔

انھی دنوں ایک بار وہ شیخ ابراہیم ذوق کو ملنے گیا۔ وہ بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے لیے غزل کہنے کی فکر میں تھے، باتوں باتوں میں ذوق کے اصرار پر اس نے ایک شعر موزوں کیا:

آ جائے اگر ہاتھ تو کیا چین سے رہے
سینے سے لگائے تری تصویر ہمیشہ

ذوق نے اس شعر کی تعریف کی تو محمد حسین کی دُنیا ہی بدل گئی۔ اب وہ باقاعدگی سے شعر کہنے لگا اور ساتھ ہی اپنے استاد شیخ ابراہیم ذوق کا دیوان مرتب کرنے میں مصروف ہو گیا۔ ذوق کی وفات کے بعد اس کی یہ مصروفیت اور بھی بڑھ گئی۔ اس معاملے میں اُسے ذوق کے فرزند شیخ اسمٰعیل کا پر خلوص تعاون بھی میسر تھا۔

اب تک وہ حکیم آغا جان عیش جیسے بزرگوں کی صحبت میں بھی فیضیاب ہو چکا تھا۔ ذوق کے بعد اس نے جو بھی سیکھا انہیں سے سیکھا۔ ابھی وہ ذوق کا کلام صاف کر کے لکھ رہا تھا اور بتدریج نثر نگاری کی طرف بھی مائل ہو رہا تھا کہ 1857ء کا سال آ پہنچا۔

دہلی کالج بھی جنگِ آزادی کے ہنگاموں کی زد میں آیا اور محمد حسین کا تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا۔ اب تک آزاد کی شادی ہو چکی تھی اور وہ ایک بیٹی کا باپ بھی تھا۔ جنگِ آزادی کے شعلوں نے دہلی سمیت ہندوستان کے بہت سے شہروں اور قصبوں کی دُنیا ہی بدل دی۔ مولوی باقر کو باغیوں کا ساتھ دینے، دہلی اخبار اردو میں بادشاہ کے حق میں لکھنے اور جنگِ آزادی کو جہاد قرار دینے کی پاداش میں گرفتار کر کے گولی سے اڑا دیا گیا۔

آزاد کو دہلی سے جدا ہونا پڑا۔ ایک گولہ پھٹنے سے اس کی شیر خوار بیٹی سکتے میں چلی گئی اور بعد میں انتقال کر گئی۔ بیوی اور باقی اقارب کو سونی پت کا سفر کرنا پڑا۔ خود آزاد لکھنؤ گیا، انیس جیسے شاعر سے ملا، زادِ سفر کے نام پر صرف بغل میں ذوق کا دیوان تھا۔ میر انیس سے وہ اپنی شناخت چھپا کر ایک عام دہلوی باشندے کی حیثیت سے ملا تا کہ خاندانی وقار اور آن کو ٹھیس نہ پہنچے۔

اسی دوران معلوم ہوا کہ انگریزوں نے اس کی گرفتاری کے وارنٹ نکال دیے ہیں اور الزام ہے کہ دہلی اردو اخبار کے باغیانہ مضامین اور اشتہار لکھنے میں اس کا بھی ہاتھ تھا۔ یہ بھی سنا گیا کہ اس کی گرفتاری پر پانچ سو روپے کا انعام مقرر کر دیا گیا ہے۔

یہ خوفناک اطلاع ملتے ہی آزاد لکھنؤ سے نکلا اور مدراس پہنچا۔ نیل گری کے ملٹری اسکول میں نوکری کر کے کچھ پیسے جمع کیے اور بمبئی چلا گیا۔ یہاں اس نے پارسیوں کے علماء سے فیض حاصل کیا اور فارسی زبان کا جائزہ لیا۔ یہاں بھی زیادہ دیر ٹھہرنا اس کے مقدر میں نہ تھا لہٰذا اب کی بار اس نے پنجاب کی ایک ریاست جند کے راجا سروپ سنگھ کے ہاں دفترِ فوجداری میں محافظِ دفتر کی نوکری حاصل کر لی۔

خیال یہ تھا کہ کب تک شناخت چھپا کر نوکریاں اور محنت کرتا رہوں گا اور ارادہ تھا کہ سروپ سنگھ کے وسیلے سے وہ حکومت کو اپنا قصور معاف کرنے کی درخواست دے گا۔ اس نے راجا کی شان میں قصیدے لکھے اور دربار تک رسائی پا لی۔ آزاد کی علمیت اس کے قصیدوں میں بڑے بھرپور انداز میں جھلکتی ہے۔ مثالیں ملاحظہ ہوں:

فروغِ نور سے کس کی ہے یہ جہاں روشن
کہ ہے زمیں سے ولا تا بہ آسماں روشن
زبسکہ عالم انوار مہر زرہ نواز
جہاں جہاں ہیں منور، مکاں مکاں روشن

اس نے کئی قصیدے راجا کے حضور دربار میں پیش کیے لیکن صلہ ندارد۔ ان حالات کے نتیجہ میں ایک اور سفر اس کا منتظر تھا۔

ارسطو جاہ رجب علی شاہ محمد حسین آزاد کے والد کے شاگرد تھے۔ اب اس نے جند سے نکل کر لدھیانہ کے قریب جگراؤں میں رجب علی کے قائم کردہ پریس مجمع

البحرین میں ملازمت کر لی۔ سکھ کا سانس میسر آیا تو سونی پت سے اہل خانہ کو بھی بلا لیا۔

بظاہر سب کچھ ٹھیک ہو چکا تھا لیکن آزاد کے پاؤں میں چکر تھا۔ قدرت اُسے ایک جگہ جم کر بیٹھنے ہی نہ دیتی تھی۔ پریس کے کام سے اکتا کر وہ لاہور میں اپنے پھوپھی زاد بھائی محمد علی کے پاس پہنچے جو پوسٹ ماسٹر جنرل کے دفتر میں ہیڈ کلرک تھا۔ لاہور آنے کا مقصد یہ تھا کہ محکمہء تعلیم میں ملازمت کی کوشش کی جائے لیکن یہ تمنا دل ہی میں رہی اور آزاد کو عارضی طور پر محکمہء ڈاک میں نوکری کرنی پڑی۔ دہلی کالج میں اس کے ہم سبق ڈپٹی نذیر احمد اور مولوی ذکاء اللہ بہت ترقی کر چکے تھے، دونوں بالترتیب ڈپٹی کلکٹر اور انسپکٹر مدارس تھے۔ لیکن آزاد ابھی تک زمانے کی ٹھوکریں کھا رہا تھا۔

1862ء میں اس کے لڑکیوں کی تعلیم کے بارے میں ایک کتاب ''آئینہ صحت'' لکھی جو اس کی پہلی تصنیف تھی اور جسے عوامی سطح پر پذیرائی ملی نہ سرکاری سطح پر۔ مایوسی کے ان ایام میں اس نے محکمہء ڈاک کی ملازمت چھوڑ دی اور پرانی کتابیں خرید کر اعلیٰ افسران کو بیچنے لگا۔ اس کاروبار کی وجہ سے وہ لاہور میں گورنر پنجاب کے محکمے کے میر منشی پنڈت من پھول سے ملا اور ان کے وسیلے سے ایک بااثر انگریز میجر فلر سے تعلق پیدا کرنے میں کامیاب ہوا۔ ان روابط کی بدولت اُسے محکمہء تعلیم میں نوکری مل گئی اور وہ اپنی قسمت پر ناز کرنے لگا کہ برسوں بعد ہی سہی لیکن ایک دیرینہ خواب کو تعبیر تو ملی۔

انہی دنوں آزاد نے تعلیم نسواں کے موضوع پر ''کرن پھول'' نامی کتاب لکھی جو تعلیمی سے زیادہ ادبی اہمیت کی حامل تھی۔ 1864ء میں محکمہء تعلیم میں اس کا تقرر ہوا تھا اور اسی سال گورنمنٹ کالج لاہور کا قیام عمل میں آیا تھا۔ ڈاکٹر لائٹنر اس کالج کا پرنسپل

بن کر لاہور آیا تو اردو سیکھنے پر آمادہ ہوا۔ یہ موقع بھی آزاد کے ہاتھ لگا اور وہ ڈاکٹر صاحب کو اردو پڑھانے لگے۔ جلد ہی استاد شاگرد کا رشتہ دوستی میں بدل گیا اور اعلیٰ افسران کے حلقے میں آزاد کو پہچانا جانے لگا۔ اب وہ خاص و عام میں مقبول ہونے لگا، اس کے حوصلے بلند ہوئے اور وہ نئے عزم سے کارزارِ حیات میں شریک ہوگیا۔

ڈاکٹر لائٹز نے پنڈت من پھول کی مدد اور رئیسانِ لاہور کے مشورے سے ''انجمن مطالبِ مفیدہ پنجاب'' قائم کی تو آزاد کی صلاحیتیں اپنے عروج پر پہنچ چکی تھیں۔ اب وہ لاہور کے چند قابل ترین لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ انجمن کے اجلاسوں اور تقریبات کے موقع پر اس نے اپنے بہت سے نادر و شاہکار مضامین عوام کے سامنے پیش کر کے مقبولیت حاصل کی۔ اب اس کی شہرت دور دور تک پھیل چکی تھی۔ ڈاکٹر لائٹز اور ارسطو جاہ کی کوششوں سے حاسدین کی شر انگیزی کے باوجود اسے 1857ء کی بغاوت میں شامل ہونے کے الزام سے بری کر دیا گیا تھا۔

رفتہ رفتہ محمد حسین آزاد سرکاری اور عوامی حلقوں میں اتنا بااثر ہوگیا کہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں جب برطانیہ کو یہ تشویش لاحق ہوئی کہ توسیع پسند روس کہیں افغانستان کے راستے ہندوستان تک نہ چلا آئے، اسے پنڈت من پھول، منشی فیض بخش اور کرم چند نند رام کے ساتھ وسط ایشیا کے حالات معلوم کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ یہ ایک انتہائی خفیہ اور اہم جاسوسی مشن تھا۔ اس سے حکومت کی نظروں میں آزاد کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس سفر کی تکمیل کے بعد آزاد نے کچھ عرصہ کلکتہ میں گزارا، اس سے پہلے وہ دلی جا کر سسرالیوں کے ہاں مقیم اپنے بیوی بچوں سے ملا جو اس کے جدائی کا عرصہ سسک سسک کر کاٹ رہے تھے، کلکتہ میں قیام کے دوران اس نے پنڈت من پھول کے ساتھ مل کر مشن کی تحریری رپورٹ تیار کر کے حکومت کو پیش کی، کتب خانوں سے استفادہ کیا، نادر و نایاب کتابیں خریدیں اور مستقبل کی

منصوبہ بندی کی۔

اس دوران کسی بے قاعدگی کی وجہ سے اس کی محکمہ تعلیم کی ملازمت ختم ہو چکی تھی۔ لیکن جب انسپکٹر تعلیمات مسٹر پیئرسن نے اردو زبان میں تاریخ ہند مرتب کرنا شروع کی تو اس کی نگاہِ انتخاب آزاد پر پڑی۔ یوں ایک بار پھر وہ محکمہ تعلیم سے منسلک ہو گیا اور کوہ مری میں پیئرسن کی معاونت کرنے لگا۔ اس قلمی رقابت کے بعد آزاد کو ایک سرکاری اخبار کا ایڈیٹر مقرر کر دیا گیا اور یہ دور ہی اصل میں اس کی سرکاری، تعلیمی اور ادبی مصروفیات کے عروج کا دور تھا۔ اسی زمانے میں محمد حسین آزاد نے اپنی مشہور تصنیف ''قصصِ ہند'' لکھی۔ ساتھ ہی وہ بچوں کے لیے اردو ریڈریں تیار کرتا رہا جو پنجاب کے ناظم تعلیمات ہالرائیڈ کے نام سے شائع ہوتی تھیں۔

انہی دنوں آزاد نے فارسی قواعد مرتب کی اور مولوی علمدار حسین کی جگہ گورنمنٹ کالج لاہور میں پہلے عربی زبان کے عارضی اور پھر مستقل استاد بنے۔ اس ملازمت کے ساتھ کچھ عرصہ ''انجمن پنجاب'' کے اخبار ''ہمائے پنجاب'' کی ذمہ داریاں بھی ادا کرتے رہے۔

جب لیفٹیننٹ گورنر کی ہدایت پر ناظم تعلیمات پنجاب مسٹر ہالرائیڈ نے بچوں کے نصاب میں نظمیں شامل کرنے کا منصوبہ پر کام شروع کیا تو آزاد کی مشاورت سے ایسے شاعروں کا چلن ہوا جن میں نئی طرح کی نظمیں پڑھی جاتی تھیں۔

آزاد نے ایسی نظمیں خود بھی تخلیق کیں اور یہ سرگرمیاں تمام تر مخالفت کے باوجود جدید اردو شاعری کا نقطہ آغاز بن گئیں۔ اس نے رات کی حالت پر ایک مثنوی لکھی جس کے چند اشعار بطور نمونہ پیش ہیں:

ہونا وہ بعد شام شفق پر عیاں ترا
اڑنا وہ آبنوس کا تختِ رواں ترا

اے رات سنتا ہوں کہ ترے سر پہ تاج ہے
ہر گوہر اس میں ملکِ حبش کا خراج ہے
دنیا پہ سلطنت کا تری دیکھ کر حشم
کھاتا ہے دن بھی تاروں بھری رات کی قسم

اس تحریک میں سرسید جیسے عظیم اکابرین قوم نے بھی آزاد کا ساتھ دیا اور جلد ہی وہ جدید شاعری کے اولین علم برداروں میں نمایاں ترین مقام پر فائز ہو گیا۔ انہی دنوں اُس نے اپنے مضامین کے دو مجموعوں ''آبِ حیات'' اور ''نیرنگ خیال'' کی ترتیب و تدوین کا کام بھی شروع کر دیا تھا۔ جب یہ کارنامے لوگوں کے سامنے آئے تو ''آبِ حیات'' بیک وقت تعریف و تنقید کے مراحل سے گزرنے کے باوجود ہندوستان بھر میں مقبول ہو گئی۔

آج تک کسی نے آزاد جیسی مرصع اور رنگین نثر نہیں لکھی تھی۔ ''نیرنگ خیال'' کی بدولت وہ تخیلاتی مضامین کو اچھوتے انداز سے بیان کرنے کا ماہر قرار دیا گیا اور آج بھی یہ کتاب آزاد کی فکری و تخلیقی قوت کا بہت بڑا ثبوت ہے۔ ان کتابوں کی مقبولیت کے بعد آزاد نے ''دربار اکبری'' کو مرتب کرنا شروع کیا۔ آنے والے دنوں میں اس نے ''آبِ حیات'' کو نظر ثانی کے مرحلے سے گزار کر ترامیم اور اضافوں کے بعد دوبارہ شائع کیا۔

اسی دوران گورنمنٹ کالج، پنجاب یونیورسٹی کی تحویل میں دینے کا فیصلہ ہوا۔ یوں اپنی عمر کے پندرہ قیمتی ترین سال کالج کی نذر کر کے وہ یونیورسٹی سے وابستہ ہو گیا۔ اب وہ اعصابی طور پر کمزور ہو کر بیماریوں کی پوٹلی بن چکا تھا اور مزید ستم یہ کہ تصنیفی و تالیفی سرگرمیاں پہلے سے بڑھ چکی تھیں نیز گھریلو اور ذہنی پریشانیاں بھی اچانک ٹوٹ پڑی تھیں۔ اب تک وہ اپنے چودہ بچوں کی موت کا صدمہ برداشت کر چکا تھا۔ لیکن جب

اس کی بہت پیاری بیٹی فوت ہوئی جو تصنیف و تالیف میں اس کی مددگار رہی تھی اور جس کی شادی سے وہ کچھ عرصہ قبل ہی بڑے چاؤ سے فارغ ہوا تھا تو ہوش جاتے رہے۔ مگر دیوانگی یہ کیفیت عارضی تھی۔

اگلا ایک سال انھوں نے بے خودی کے عالم میں گزارا مگر ملازمت کسی نہ کسی طرح چلتی رہی، پھر اچانک ایران کے دورے پر آمادہ ہوئے اور عزیز و اقارب کی مخالفت کے باوجود ایران کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ اس سلسلے میں محکمہ تعلیم نے بھی بڑی مشکلوں سے اجازت دی تھی۔ بہر حال آزاد ایران کا سفر کر کے لوٹے اور اپنی شکستہ حالی کا خیال کیے بغیر "سخن دانِ فارس" اور "نگارستانِ فارس" کی تالیف شروع کر دی۔ ان کی مسلسل درخواستوں پر حکومت نے انہیں کتب خانہ بنانے کے لیے درگاہ شاہ محمد غوث کے پاس زمین عطا کر دی تھی۔ آزاد نے اپنی مخصوص بے خودی کے عالم میں تعمیراتی کام کروایا اور کتب خانہ بن گیا۔

اسی دوران ملکہ وکٹوریہ کے پچاس سالہ جشن کے موقع پر انہیں شمس العلماء کا خطاب عطا کیا گیا۔ یاد رہے کہ آزاد اپنے معاصرین میں سے یہ خطاب پانے والے واحد ادیب و انشا پرداز تھے۔ نوکری اور کتب خانے کے کام، گھریلو الجھنوں، ذہنی حالت کی نادرستی کے باوجود انہوں نے 1857ء کے ہنگامے سے بچائی گئی اپنے استاد کی بے بہا دولت کو عام کرنے کا عزم کیا اور ابراہیم ذوق کی غزلوں کو "دیوانِ ذوق" کی صورت دینے میں مصروف ہو گئے۔

دس مہینے کی محنت کے بعد ایک ایسا دیوان مرتب ہو گیا جس نے شیخ ابراہیم ذوق کے نام کو ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیا۔ ذوق کے نام کا چراغ جل اُٹھا لیکن اب اس چراغ کو جلانے والا خود بجھنے لگا تھا۔ دیوان مرتب کرتے ہوئے وہ اتنا جاگا تھا کہ سونے کی عادت ہی ختم ہو گئی تھی۔ اکثر خود کلامی، وہم پرستی، اندیشگی، اضطراب اور چڑچڑا پن ان

پر چھایا رہتا تھا۔

رفتہ رفتہ یہ حالت مکمل دیوانگی بن گئی لیکن اکثر اوقات وہ بالکل وہی آزاد بن جاتے جو کبھی تھے اور دوستوں سے علمی نکات پر بحثوں کے دوران ایسے ایسے قیمتی نکات بیان کرتے کہ سب ششدر رہ جاتے۔ اسی عالم میں ایک بار لاہور سے دہلی اور دوسری بار علی گڑھ جا پہنچے۔ کچھ عرصہ تک لاہور کے ذہنی امراض کے شفاخانے میں زیر علاج بھی رہے لیکن طبیعت نہ سنبھل سکی۔ آخر کار برصغیر پاک و ہند کا یہ عظیم انشا پرداز، محقق اور ادیب و مدرس 22 جنوری 1910ء کو ہمیشہ کے لیے اس عالمِ فانی سے رخصت ہو گیا۔ ان کی عمر کے آخری بیس سال شدید مصائب، پریشانیوں اور ناآسودگی میں گزرے۔ شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد کو لاہور میں کربلا گامے شاہ میں دفن کیا گیا۔

آزاد کی ادبی شخصیت ایک ہشت پہلو نگینہ ہے۔ اس کا جو رُخ بھی ہمارے سامنے آتا ہے، وہ اپنی تابناکی سے نگاہوں کو خیرہ کر دیتا ہے۔ اس نگینے کی تراش، رنگ روپ، وزن سب اہم ہیں لیکن اس کی انشا پردازی ان باقی تمام صفات پر فوقیت رکھتی ہے۔ معروف نقاد اور ادبی مبصر جناب مہدی افادی نے بجاطور پر انہیں خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا تھا:

> ''سرسید سے معقولات الگ کر لیجیے تو کچھ نہیں رہتے۔ نذیر احمد مذہب کے لقمہ بھی نہیں توڑ سکتے۔ شبلی سے تاریخ لے لیجیے تو قریب قریب کودے رہ جائیں گے۔ حالی بھی جہاں تک نثر کا تعلق ہے سوانح نگاری کے ساتھ ہی چل سکتے ہیں۔ لیکن آزاد صرف انشا پرداز ہیں جن کو کسی اور سہارے کی ضرورت نہیں''۔

شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد کی اہم ترین ادبی تصانیف میں آبِ حیات، نیرنگِ خیال، سخن دانِ فارس، نگارستان فارس، دربار اکبری، دیوانِ ذوق، ڈراما اکبر، نظم آزاد اور خم کدۂ آزاد شامل ہیں۔ ان کی تعلیمی تصانیف میں نصیحت کا کرن پھول، قصصِ ہند، فارسی کی پہلی کتاب، اردو کی پہلی، دوسری، تیسری اور چوتھی کتاب، قواعد اردو، قواعد فارسی، جامع القواعد، تذکرۂ علما، کائناتِ عرب، حکایاتِ آزاد، قند پارسی، آموز گار پارسی اور لغت آزاد شامل ہیں۔ ان کی متفرق تصانیف میں بیاضِ آزاد، سیر ایران اور مکتوبات آزاد شامل ہیں۔ آزاد کی غیر مطبوعہ تصانیف میں تاریخی مقامات، ترکی قواعد، عربی قواعد، قواعد اردو اور قواعد فارسی شامل ہے۔

دیوانگی کے دور میں اس عظیم انشا پرداز نے سپارک و نماک، مکاشفاتِ آزاد، فلسفہء الہیات اور جانوستان جیسی تصانیف کے علاوہ کم و بیش 89 مسودے لکھے۔ اردو ادب تو کیا، عالمی ادب میں بھی ایسی کوئی مثال نہیں ملتی کہ کسی ادیب نے ذہنی پراگندگی میں بھی اتنی صحت و درستی سے زبان لکھی ہو۔ ان کے تمام مسودے انتہائی خوش خط ہیں اور ان کی نفیس طبیعت کی عکاسی کرتے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب ''کلیات'' شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد کے تین بلند پایہ اور عظیم فن پاروں پر مشتمل ہے۔ ''کلیات'' میں سخن دانِ فارس، نیرنگِ خیال اور قصصِ ہند شامل ہیں۔

اس وقیع اور اہم کاوش کا حصہ بننے والی آزاد کی تصنیف ''سخن دانِ فارس'' ہندی، سنسکرت اور فارسی زبان کے تعلق، ایرانی رسوم و آداب اور لسانیات کے بنیادی اصولوں پر ایک گراں قدر تحقیقی کاوش ہے جو گذشتہ تین نسلوں اور کئی دہائیوں سے اساتذہ، طلبا، محققین، تمام قارئین اور اردو ادب کے دلدادہ افراز سے خراجِ تحسین حاصل کرتی رہی ہے۔ یہ کتاب نہ صرف ادبی خوبیوں سے مالا مال ہے بلکہ مشکل لسانیاتی مباحث کو آزاد

نے اپنے مخصوص اسلوب میں بیان کر کے نہایت سادہ اور دلچسپ بنا دیا ہے، جس سے اس ادبی و تحقیقی کارنامے کی اہمیت کئی گنا بڑھ گئی ہے۔

''نیرنگِ خیال'' کلیات میں صرف اس وجہ سے شامل نہیں کہ یہ بھی آزاد کی بہت سی تصانیف میں شامل ہے بلکہ اسے ترجیح دینے کی وجہ یہ ہے کہ یہ عدیم النظیر تخلیق آزاد کے ان عظیم الشان مضامین پر مشتمل ہے جو محض تخیلاتی ہیں مگر اسلوب اور اندازِ تحریر اتنا پُر اثر اور دلفریب ہے کہ ہر لفظ دِل میں اُترتا محسوس ہوتا ہے۔ محمد حسین آزاد اگر آج ایک عظیم نثر نگار اور انشا پرداز کی حیثیت سے زندہ ہیں تو اس بقائے دوام میں ''نیرنگِ خیال'' کی نیرنگیوں کو باقی تصانیف کی خوبیوں کے مقابلے میں زیادہ دخل ہے۔

زیرِ نظر ''کلیات'' میں شامل تیسری تصنیف ''قصصِ ہند'' ہے جو بیک وقت ادبی، تاریخی اور علمی پہلوؤں سے ایک نادر و نایاب کاوش کا درجہ رکھتی ہے اور تشنگانِ علم و ادب میں ہمیشہ سے مقبول رہی ہے۔

اگر شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد کے کارناموں کی نوعیت بیان کرنی ہو اور جن علمی شعبوں میں انہوں نے گراں قدر خدمات انجام دیں، اُن کا ذکر کرنا ہو تو محض تین الفاظ ہی کافی ہیں: تاریخ، لسانیات اور تحقیق۔ ''کلیات'' میں شامل تینوں تصانیف ان شعبہ ہائے علم کا بخوبی احاطہ کرتی ہیں۔

یہ خوبی اپنی جگہ لائق تحسین ہے لیکن اس پر مستزاد وہ لطیف پیرایہ، شاندار ادبی اسلوب اور تخلیقیت ہے جو ان تصانیف کے ہر لفظ سے عیاں ہے۔ یہ ایک ایسی خوبی ہے جو بعض اوقات آزاد کے قاری کو موضوع سے بے نیاز کر کے اسلوب میں گم کر دیتی ہے اور یہی آزاد کی شہرۂ آفاق جادو بیانی اور طلسمی اسلوب ہے جو آج تک ناقابل تقلید رہا ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔

ان خصوصیات کے پیش نظر بلا خوف تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ ''کلیات'' آزاد کی

اہم ترین اور نمائندہ تصانیف کا مجموعہ ہونے کی وجہ سے کتب خانوں، محققین، اساتذہ، طلبا اور عام قارئین کے لیے بے حد مفید اور مؤثر کتاب ثابت ہو گی۔ امید ہے کہ قارئین ہماری اس کوشش کو پذیرائی سے نوازیں گے۔

(ادارہ)

قصصِ ہند

مولانا محمد حسین آزاد

فہرست

ابتدائیہ

ہر زبان کی ارتقائی تاریخ کچھ ایسے نادرِ روزگار افراد کے فکری اور قلمی کارناموں سے عبارت ہوتی ہے، جو بجا طور پر صدیوں کے بعد پیدا ہوتے ہیں۔ دنیا کی دیگر زبانوں کی طرح اردو بھی اپنے دامن میں کچھ ایسے گراں مایہ گوہر رکھتی ہے، جو اس لاوارث زبان کے وارث بنے، اسے پرورش کیا اور بامِ عروج پر پہنچایا۔ آج اردو ہر قسم کے علمی موضوعات کے لئے موزوں زبانوں کی فہرست میں جگہ پا چکی ہے تو اس کی بڑی وجہ انہی عظیم لوگوں کی خدمات ہیں جنہوں نے اس وقت اردو میں نئے اسلوب اور منفرد انداز میں لکھا جب اس زبان کو جدید مطالب کے ادا کرنے کی اعلیٰ صلاحیت سے محروم خیال کیا جاتا تھا۔ اگر اردو زبان کے محسنوں کی داستان رقم کی جائے تو بلاشبہ مولانا محمد حسین آزاد اس کا نمایاں اور اہم باب قرار پائیں گے۔

محمد حسین آزاد کی شخصیت ہمہ صفت موصوف ہے۔ وہ بیک وقت بہت سے ادبی حوالوں کے ساتھ پہچانے جاتے ہیں۔ ''آبِ حیات'' کو دیکھیں تو آزاد ایک منجھے ہوئے تذکرہ نویس اور ناقد نظر آتے ہیں۔ اگر ''سخندانِ فارس'' ملاحظہ کریں تو وہ ایک عمدہ ماہرِ لسانیات اور تقابل و تنقید کی زبردست قوت کے حامل فنکار دکھائی دیتے ہیں اور ''دربارِ اکبری'' کا مطالعہ کریں تو ان کی زبان دانی کا لوہا ماننا پڑتا ہے اور ان کے قلم سے نکلے الفاظ کا طلسم اپنے اثر میں جکڑ لیتا ہے۔ مذکورہ کتب کے علاوہ بھی مولانا محمد حسین آزاد نے جو کچھ لکھا، کمال لکھا اور اہلِ کمال ہونے کا ثبوت دیا۔ اردو زبان کی نثر

ابتداء ہی سے شکوک وشبہات کی فضا میں سانس لے رہی تھی، یہ صورتحال عرصہ دراز تک قائم رہی، بعدازاں آہستہ آہستہ کچھ غیر معمولی افراد آگے آئے، انہوں نے اردو نثر کو اپنے ذہنی سرمائے اور فکری صلاحیتوں سے آرائش وزیبائش دی، غیر ملکی زبانوں کی منتخب نثر کا مطالعہ کیا، اپنے تجربات ومشاہدات اور حاصل مطالعہ کو اردو نثر کی ترقی اور فروغ کی مقامی تحریک کی بنیاد بنایا اور اس زبان کے دامن کو وہ عظیم وسعت عطا کی کہ آج بلاشبہ اردو زبان انہی لوگوں کے احسانات کی طفیل ہر طرح کے موضوعات اور متنوع ادائے مطلب کے لئے معنوی حوالے سے کھلا میدان کہلانے کی حقدار ہے۔ اردو نثر کے ان محسنوں میں خاص طور پر محمد حسین آزاد کا ایک منفرد مقام اور جداگانہ حثیت ہے جو کسی بھی قسم کے شک وشبہ کے گہن سے مبرا ہے۔

آزاد نے اردو نثر میں ایک نئے، رواں، دلچسپ، دلکش، منفرد اور ناقابل فراموش اسلوب کی بنیاد رکھی، جو قابل تقلید تو ضرور ہے مگر حقیقت میں اس کی تقلید بھی ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں ہے۔ مولانا کی تحریر میں ایک مبہوت کر دینے والی روانی، سلاست اور نفاست پائی جاتی ہے، جو انہی کا حصہ ہے۔ اس حوالہ سے نہ کوئی ماضی میں ان کا ہم پلہ تھا اور نہ کوئی مستقبل میں ہم سر ہوگا۔

زیر نظر کتاب ''قصص ہند'' بھی مولانا محمد حسین آزاد کے جادو اثر قلم کا شہکار ہے۔ جس کا ہر صفحہ فاضل نثر نگار کی تاریخی سوجھ بوجھ اور زبان پر دسترس کا آئینہ دار ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے محمود غزنوی، شہاب الدین غوری، علاؤالدین خلجی، بابر، ہمایوں، اکبر، نور جہاں، شاہجہاں، اورنگ زیب، سیواجی، محمد شاہ، نادر شاہ، اور گورونانک دیوجی کے بارے میں مستند، دلچسپ اور اہم تاریخی معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ ان تاریخی مضامین کا زمانی عرصہ مسلم عہد ہے۔ مصنف کی معجز بیانی اس عہد کی رنگارنگ تصویر کا ہر زاویہ نہ صرف آشکار کرتی ہے بلکہ اسے ایک نیا ڈھنگ اور دلکش انداز بھی عطا کرتی ہے۔ محمود غزنوی کا تذکرہ پڑھتے ہوئے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے

قاری خود غزنوی دربار میں کھڑا ہر منظر، ہر حکم، ہر حملے اور ہر کارروائی کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ نور جہاں بیگم کے بارے میں لکھا گیا مضمون موصوفہ کا لفظی پیکر کہلانے کا حقدار ہے، اسی طرح اکبر، بابر، اورنگ زیب اور دیگر مسلم بادشاہوں کے تذکرے بھی قاری کو اس عہد میں لے جاتے ہیں جب ہندوستان پر مسلمان حکمران تھے اور مسلم تمدن کے جلوے ''جے رام جی'' کے نعروں پر غالب آ چکے تھے۔ مولانا محمد حسین آزاد کی نثر کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا، بہت کچھ لکھا جا رہا ہے اور آئندہ بھی بہت کچھ لکھا جائے گا لیکن مختصر الفاظ میں یہی کہا جا سکتا ہے کہ وہ تحریر نہیں لکھتے بلکہ الفاظ کے رنگوں سے ایسی تصویر بناتے ہیں جو ان کی فکری طاقت سے تحریک پا کر قاری کو نہ صرف چلتی پھرتی نظر آتی ہے بلکہ پڑھنے والے کو تصوراتی طور پر اسی عہد میں لے جاتی ہے، جس میں وہ واقعی زندہ اور رقصاں تھی۔ مولانا کی یہی عظیم نثری خوبی اور جادو بیانی ''قصص ہند'' میں بھی آپ کی منتظر ہے۔ مصنف کا اسلوب وہ سحر ہے جو قاری کو زمانی حدود سے تصوراتی طور پر بے نیاز کر دیتا ہے۔ اس کتاب کی اشاعت اردو نثر کے ابتدائی شاندار اثاثے کی تجدید اور ابلاغ کی طرف ایک اہم قدم اور باذوق قارئین کے لئے ایک گراں قدر تحفہ ہے۔

نعیم احسن

لاہور

قصصِ ہند

عہد اسلامی

غزنوی خاندان کی ابتدا

سلاطین سامانیہ جو توران اور ایران وغیرہ میں بڑے با اقتدار بادشاہ گزرے ہیں ان میں سے عبدالملک ابن نوح پانچویں بادشاہ کی خدمت میں الپتگین نام ایک غلام تھا کہ بادشاہ کو بھان متی کے تماشے دکھا کر اور نقلیں سنا کر خوش کیا کرتا تھا۔ رفتہ رفتہ مجلس عشرت سے نکل کر دربار سلطنت میں داخل ہوا اور پھر اپنی دانش و دانائی کی بدولت حاکم خراسان ہو گیا جب عبدالملک مر گیا تو امرائے دربار نے اسے بھی خط لکھا کہ تخت نشین کس کو کرنا چاہیے۔ اس تقدیر کے مارے نے منصور کے برخلاف رائے دی کہ وہ نوجوان یہاں تخت نشین ہو چکا تھا۔ منصور نے اس کا خط دیکھ کر بہت پیچ و تاب کھایا اور اس کے درپے ہو گیا۔ دشمن اس کی ابھی تاک میں لگے ہی تھے۔ فوراً دربار میں طلب ہوئی۔ چنانچہ ایسے نازک وقت میں اگر جان نہ جاتی تو قید ہو جانے میں تو شبہ ہی نہ تھا۔ ناچار سپاہیانہ پیچ کھیلا۔ اس کے پاس خاصے کے غلاموں اور نوکروں کا جتھا خوب تھا، انہی کی آڑ میں جان بچا کر مقام غزنی میں، کہ عین کوہ سلیمان کے پیچوں پیچ میں ہے، جا پہنچا۔ غرض ادھر کے بہادر اور قوی ہیکل خودسروں کو سمیٹ کر دشمنوں کے قابو کا نہ رہا مگر پھر بھی اپنے آقا کے گھرانے کی اطاعت ہی کرتا رہا۔ تین ہزار غلام اس کے تن کا ہمراہ

آیا تھا۔اس کے علاوہ ادھر کے افغان اگر دل سے تابع نہ ہوئے تو وقت پر نوکر ہو گئے۔ غرض اس قطعہ پر قابض ہو گیا کہ جس میں بلخ، ہرات، سیستان وغیرہ شامل ہیں۔سبکتگین ایک فلک زدہ ایران کے شاہی خاندان کا لڑکا تھا کہ الپتگین نے اسے ایک بخاری سوداگر سے خریدا تھا اور ایسے مرتبے پر پہنچایا تھا کہ بعد اس کے دربار میں رکن اعظم وہی ٹھہرا۔ چنانچہ الپتگین کے بعد جب اس کا بیٹا جانشین ہوا اور اطراف کے لوگوں نے زور دیا تو سبکتگین اسے بخارا سے حکومت کی سند دلوا کر لایا۔جس میں نیابت سبکتگین کے نام پر تھی۔دو برس کے بعد وہ بھی مر گیا اور ایک، دو اتار چڑھاؤ کے بعد جب اہل دربار نے ملک غیروں کے ہاتھ جاتا دیکھا تو بالاتفاق سبکتگین کی اطاعت پر رضامند ہو گئے۔چونکہ صاحب ہمت اور باتدبیر شخص تھا، تخت پر بیٹھتے ہی ایک ہمسایہ کے حاکم نے اس سے مدد لے کر دشمن کے ہاتھ سے اپنا ملک بچایا مگر احسان نہ مانا اس لئے ملک سبکتگین کے حوالے کرنا پڑا۔سبکتگین نے الپتگین کی بیٹی سے شادی بھی کر لی اور یہیں سے ستارۂ اقبال کا طلوع شروع ہوا۔

پنجاب کی حد ان دنوں میں غزنی کی حد تک پھیلی ہوئی تھی اور راجہ یہاں کا جے پال تھا۔ جب مسلمانوں کے قدم آگے بڑھتے معلوم ہوئے تو اس نے غزنی پر ایک بھاری فوج سے چڑھائی کی۔ چنانچہ دفعتہً لمغان پر جا کر ڈیرے ڈال دیے اور پشاور سے کابل تک برابر لشکر پھیلا دیا۔ادھر سے سبکتگین بھی نکلا۔ چنانچہ دونوں فوجیں آمنے سامنے پڑی تھیں۔ایک دوسرے کی پیش دستی کا منتظر تھا کہ دفعتاً آسمانی گولا پڑنے لگا یعنی بے موسم برف گرنی شروع ہو گئی۔وہ لوگ تو برف کے کیڑے تھے۔انہیں خبر بھی نہ ہوئی۔ ہندوستانی بیچارے اپنے لحاف اور رضائیاں ڈھونڈنے لگے مگر وہاں رضائی کا گزارہ کہاں۔سینکڑوں اکڑ کر مر گئے۔ ہزاروں کے ہاتھ پاؤں رہ گئے جو بچے ان کے اوسان جاتے رہے۔ گھروں میں جو کہانیاں سنا کرتے تھے کہ ان پہاڑوں میں ایک چشمہ ہے کہ جب اس میں کچھ ناپاک چیز ڈالتے ہیں تو اتنی برف پڑتی ہے کہ شہر کے شہر دب جاتے ہیں۔ جانا کہ یقیناً ان لوگوں نے ہمارے مارنے کے لئے کچھ ویسا ہی عمل

کیا۔ بس اب گھر جانا اور گھر والوں کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔ راجہ جے پال نے جب ان پہاڑوں میں بارش کی ایسی شدت دیکھی اور سردی کے مارے فوج کو بے کار پایا تو پیغام صلح کا بھیجا۔ سبکتگین نے اسی وقت ارکان دولت کو جمع کر کے صلاح کی۔ سب کے صلح کو غنیمت جانا۔ مگر ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات محمود کہ نوجوانی کے زور میں بھرا ہوا تھا، اس نے نہ مانا اور راجہ کے وکیلوں کو ناکام پھیر دیا۔ راجہ سن کر بہت خفا ہوا اور پھر دوبارہ کہلا بھیجا کہ معلوم ہوتا ہے ہمارے لشکر کے بھاری بھاری سامانوں کے لوٹنے کی طمع تم کو صلح نہیں کرنے دیتی۔ مگر یاد رکھنا ہم راجپوتوں کا قاعدہ ہے کہ جب ایسا موقع آ پڑتا ہے تو اول تمام بال بچوں کو اپنے ہاتھ سے فنا کرتے ہیں۔ مال و دولت نقد و جنس کو جلا کر خاک کرتے ہیں۔ ہاتھی گھوڑوں اور مواشی کو اندھا کر دیتے ہیں۔ بعد اس کے آپس میں ایک دوسرے کے گلے مل، تلواریں کھینچ، دشمنوں پر جا پڑتے ہیں۔ پھر جو کرے سو خدا۔ اگر مار لیا تو دم کے ساتھ پھر سب کچھ موجود ہے اور جو مر گئے تو دنیا میں سرخ رو ہوئے۔ عاقبت میں بہشت پائی اور خاکستر کے سوا دشمن کے ہاتھ خاک بھی نہ آئی۔ اس پیغام کو سن کر محمود بھی خاموش ہو رہا اور سب نے کہا کہ جس جان کے لینے میں مال ہاتھ سے جائے اس جان کے لینے سے کیا حاصل۔ بہرحال صلح بہتر ہے کہ روپیہ آئے تو مسلمانوں کے کام آئے۔ جب سب کے اتفاق رائے سے صلح ٹھہر گئی تو راجہ نے اپنا ایک معتبر یہاں چھوڑا اور سبکتگین کے آدمی ساتھ لئے کہ اپنی تخت گاہ میں جا کر بموجب عہد نامہ کے ہاتھی گھوڑے مال و دولت سب سپرد کر دے گا۔ مگر جب اپنے ملک میں پہنچ کر برف و باراں کی سردی اور تلوار کی آنچ سے خاطر جمع ہوئی تو دربار عام کیا۔ اس زمانے میں دستور تھا کہ داہنے ہاتھ پر دھرم کے مالک برہمن اور بائیں طرف صاحب شمشیر چھتریوں کے بڑے بڑے سردار کھڑے رہتے تھے۔ ان کی صلاح کے بموجب سلطنت کے کام طے ہوتے تھے۔ برہمنوں نے کہا کہ مہاراج اس طرح مسلمانوں کو خراج دینے میں حضور کی بدنامی اور بے عزتی ہے۔ آپ بادشاہ کے آدمیوں کو روک لیجیے اور کہہ دیجیے کہ جب تک ہمارا آدمی وہاں سے نہ آئے گا ہم ان آدمیوں کو

نہ جانے دیں گے۔ مگر چھتریوں نے کہا کہ مرد کو بات کا پاس ضرور ہے۔ دوست سے ہو یا دشمن سے دوسرے ترکوں کی فوج جس کے سامنے سے ایک دفعہ فوج ہماری ہٹ آئی اب اس کے مقابلے پر تھمنا بہت مشکل ہوگا۔ اگر وہ لوگ ادھر چڑھ آئے تو تمام ہندوستان کو تہہ و بالا کر دیں گے۔ پھر اس خلق خدا کا خون اور ننگ و ناموس کا گناہ کس پر ہوگا؟ غرض چھتریوں نے ہزار جتن سے جتایا، برہمنوں کے بچن کے آگے ان کی تلوار کاٹ نہ کر سکی۔ آخر وہی ہوا کہ بادشاہی آدمیوں کو روک لیا۔ غزنی میں فوراً خبر اڑی کہ بادشاہ کے آدمی قید ہو گئے۔ مگر سبکتگین کو یقین نہ آیا اور کہا کہ یہ خبر ہوائی ہے، لوگوں نے اڑائی ہے، جب تحریریں پہنچیں اور تحقیق ہوئی تو اسی وقت ضلع ضلع سے فوجیں سمیٹ کر برستی گھٹا کی طرح شمال سے اٹھا اور آتے ہی سرحد کے ملکوں پر آفت برسا دی۔ بہت سا مال و دولت لوٹا اور ہزاروں کو لونڈی غلام بنا لیا۔ راجہ کو جب یہ خبر پہنچی تو تمام ہندوستان میں چٹھیاں دوڑا دیں۔ خلاصہ ان کا یہ کہ دشمن کا بادشاہ اور ملیچھوں کا سلطان جنگل پہاڑ کے راچھسوں کی فوجیں لے کر چڑھ آیا ہے۔ پنجاب کا ملک قدیم الایام سے سب بھائی بندوں کی سپر بنا ہوا ہے۔ چنانچہ اگلے سال میں نے خود اس کے گھر پر جا کر ایک ٹکر کو روکا۔ مگر اب دھرم کی لاج رکھنے کا وقت ہے، نہیں تو اس سرے سے اس سرے تک تمام ہندوستان پر پانی پھر جائے گا۔ ان چٹھیوں نے بڑا کام کیا یعنی علاوہ اور ملکوں کے دلی، اجمیر، قنوج، کالنجر کی عظیم الشان سلطنتوں نے اپنی اپنی انتخابی فوج بے تعداد خزانوں کے ساتھ بھیجی اور آڑے وقت پر خود بھی آنے کا وعدہ کیا۔ سارے لشکروں کی چھاؤنی پشاور پر ہوئی بادشاہ کو اس دھوم دھام کی خبریں ایک سے دو چند ہو کر پہنچیں۔ گھبرایا اور شیر کی طرح پھر جھپٹ کر آیا۔ پاس پہنچا تو ایک پہاڑ کے ٹیکرے پر چڑھ کر نظر دوڑائی۔ جہاں تک آنکھ نے کام کیا فوج ہی فوج پائی۔ اترا اور اپنے سرداروں کو بلایا ان کے بھی ہوش اڑے پائے۔ اول تو بہت سے مضمون ثواب جہاد اور تائید غیبی کے سنائے، پھر شجاعوں کی الوالعزمیاں اور کارنامے کہہ کر دل بڑھائے۔ بعد اس کے کہا کہ دیر کا موقع نہیں، لڑائی شروع کر دینی چاہیے۔ لیکن چال نئی چلا یعنی اگر آج کل کی جنگی قواعد پر نظر

کریں تو معمولی سی بات ہے۔ مگر اس وقت کے نکتے میں تھوڑی سی فوج نے دل بادل لشکر کو توڑ دیا۔ چنانچہ حکم دیا کہ پان پان سو سوار کا رسالہ ایک ایک سردار کے نیچے مقرر ہو۔ باری باری سے جائیں اور ہمت آزمائیں۔ جب وہ تھک جائیں تو ان کی جگہ اور تازہ دم جا کر مورچے جمائیں۔ اس ترکیب سے ہندو شام تک لڑتے لڑتے دق ہو گئے تو بھی لشکر کی بہتات سے دل قوی رکھتے تھے۔ سب نے جمع ہو کر ایک حملہ ایسا کیا جس میں لڑائی دوٹوک ہو جائے۔ چنانچہ کیا سوار کیا پیادے، نرسنگے بجاتے اور کڑکے گاتے غول کے غول نکلے اور اس طرح بے جگر ہو کر گرے کہ تیر اور نیزے کا گزارہ نہ رہا۔ خنجر کا تلوار سے اور کھانڈے کا کٹار سے مقدمہ آ پڑا۔ پیادے، پیادوں سے لپٹ گئے۔ سوار گھوڑوں سے کود کود پڑے۔ ہاتھیوں نے اپنا پرایا کچھ نہ دیکھا، سب کو چکی کی طرح دل ڈالا۔ مگر خدا کی خدائی ایسے وقت پر نظر آتی ہے۔ اسے ہر بات میں اپنی قدرت کا دکھانا ہے۔ ہندو مسلمان کا بہانا ہے۔ آخر ہزاروں کا کھیت پڑا اور خاتمہ ہندوؤں کی شکست پر ہوا۔ فتح یاب لوٹتے مارتے اٹک تک آئے اور دو سو ہاتھی اور لاکھوں کا زر و مال لے کر گھر کو چلے گئے۔ بادشاہ کی حکومت اس وقت غزنی سے قندھار کے آگے تک تھی۔ اس کی درستی میں مصروف ہوا اور چند روز کے بعد ۲۸ھ ۹۹۷ء میں مر گیا۔

محمود غزنوی

محمود اور اسمٰعیل دو بیٹے سبکتگین کے تھے، مگر محمود کا لڑکپن سے یہ حال تھا کہ فوج کشی اور لڑائیوں میں باپ کے ساتھ ہی رہتا تھا بلکہ ہر مہم میں ایسا اپنی بساط سے بڑھ کر قدم مارتا تھا کہ تجربہ کار سپہ سالار دیکھتے رہ جاتے تھے۔ جب باپ مرا تو یہ نیشاپور میں حاکم تھا۔ تیس برس کی عمر تھی اور لیاقت، شجاعت کی رو سے ہر طرح جانشینی کے قابل تھا۔ اتنی بات ضرور تھی کہ ماں کی طرف سے داغدار تھا۔ چھوٹے بیٹے کو باپ بہت چاہتا اور اپنے پاس ہی رکھتا تھا۔ اس نے جب باپ کے مرنے سے تخت کے ساتھ میدان خالی پایا تو فوراً تاج سر پر رکھا جا بجا فرمان جاری کئے اور دربار میں امیروں وزیروں کے منصب فوج کی تنخواہیں بڑھا کر جشن شاہانہ شروع کر دیے تاکہ سب کے دل میں گھر ہو جائے اور دلاور بھائی کا خیال ان کی طبیعتوں سے جاتا رہے۔ محمود نے یہ حال سن کر پیغام بھیجا کہ والد مرحوم نے خانہ سلطنت کو آراستہ چھوڑا مگر حال اس کا یہ ہے کہ چاروں طرف سے دشمنوں میں گھرا ہوا ہے۔ اگر تمہاری عمر اور تجربہ اس کے سنبھالنے کے لائق ہوتا تو عین آرزو تھی کہ تم باپ کے جانشین ہوتے مگر مجھے مصلحت یہی معلوم ہوتی ہے کہ دولت اور خزانوں کو شریعت کے بموجب تقسیم کر کے دارالسلطنت کو میرے سپرد کر دو۔ تمہاری حکومت کے لئے بلخ اور خراسان کا ملک میں صاف کر دیتا ہوں۔

جب تاج سر پر اور خوشامدی گرد ہوتے ہیں تو ایسی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔ محمود کی یہ بات پیش نہ گئی۔ جب اس نے دیکھا کہ میری نصیحت نے نہ اس نو دولت کو اثر کیا نہ ارکان دولت نے میرے حق کو حق سمجھا تو سوائے اس کے چارہ نہ دیکھا کہ خاص

دارالخلافہ پر حملہ کر کے اس جھگڑے کا فیصلہ کرے۔

اسمٰعیل بھی ادھر سے فوج لے کر آیا اور اس میں شک نہیں کہ کوئی دقیقہ سپاہگری کا باقی نہ چھوڑا۔ مگر فتح شکست خدا کے اختیار ہے۔ اخیر کو قید ہوا اور محمود کے نام کا نقارہ غزنی کے نوبت خانے میں بج گیا۔ اس کے اقبال سے ایران اور توران کے ملک اس وقت اپنے اپنے حال میں گرفتار تھے۔ چنانچہ محمود نے پہلے اپنے گھر کا بندوبست کیا اور پھر آہستہ آہستہ سب کو زیر قلم کیا۔ ہندوستان جنت نشان جس کا دروازہ باپ نے کھولا ہوا تھا، اسے قنوج اور کالنجر تک گیارہ دفعہ زیر و زبر کیا اور اپنے نام کو سلطان کے لقب سے تاجدار کیا کہ اس وقت تک کسی بادشاہ اسلام کو نصیب نہ ہوا تھا۔ ایک دن مصاحبوں کے ساتھ بیٹھ کر ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ صد ہا کوس تک کوئی مملکت نظر نہ آئی جس کی فتح سے پر مال خزانے کو مالا مال کرنے ارکان دولت کو جمع کیا۔ سب نے خیال کے عیار اور فکر کے جاسوس چاروں طرف دوڑائے۔ آخر معلوم ہوا کہ اسی خراب آباد ہندوستان میں جسے گیارہ دفعہ پامال کر لیا ہے ملک گجرات میں سمندر کے کنارے ایک شہر عظیم الشان ہے اور اس میں ایک عبادت خانہ ہنود کا ہے کہ اپنے دیوتا کے نام سے سومنات کہلاتا ہے اور چونکہ ہزاروں ہزاروں برس ہوئے راجہ سے لے کر پرجا تک ملک ملک کی خلقت اسے صدق دل سے مانتی ہے، اس لیے نہ مال و زر کا ٹھکانا ہے نہ زر و جواہر کی کچھ انتہا ہے۔ حسن میمندی نے زمین خدمت کو بوسہ دیا اور عرض کی کہ قبلہ عالم میں نے وہاں کے حالات عجیب و غریب سنے ہیں۔ کہتے ہیں کہ جس مکان میں سومنات دیوتا ہے باہر کی روشنی کو وہاں دخل نہیں۔ جواہرات اور الماس جو در و دیوار میں جڑے اور جڑاؤ قندیلوں میں لگے ہیں ان کی جگمگاہٹ سے دن رات برابر ہے۔ بیچ میں ایک بڑی بھاری سونے کی زنجیر لٹکتی ہے کہ اس میں گھنٹے اور گھڑیال آویزاں ہیں۔ جب پوجا کا وقت ہوتا ہے تو جس طرح ہم اذان دیتے ہیں وہ اسے ہلاتے ہیں کہ سب کو خبر ہو جائے۔ ملک ملک کے راجاؤں نے جو جاگیریں دے رکھی ہیں انہیں جمع کریں تو دو ہزار گاؤں ہوتا ہے۔ ہر چند کہ گنگا وہاں سے چھ سو کوس پر ہے مگر روز تازہ گنگا جل سے

اس کا اشنان ہوتا ہے۔ دو ہزار برہمن فقط وہاں کے پجاری ہیں پانسو لونڈیاں گانے والی اور تین سو گویے ہیں کہ پوجا کے وقت بھجن گاتے ہیں اور ناچتے ہیں۔ زیور، لباس خرچ اخراجات ان کا سب وہیں سے ملتا ہے۔ یہ سب تو ان کی باتیں ہیں مگر ہمارے مطلب کی بات یہ ہے کہ مال وزر اور زیور و جواہر کا وہاں یہ عالم ہے کہ اس کا عشر عشیر بھی کسی بادشاہ کے خزانے میں نہیں سما سکتا۔

یہ سن کر محمود کے دہان طمع میں پانی بھر آیا اور دل سانپ کی طرح لہرانے لگا۔ اسی وقت سپہ سالار کو حکم پہنچا کہ ہاں لشکر تیار ہو۔ ہر علاقے سے سپاہ طلب ہوئی۔ میدان شہر خیموں ڈیروں سے پٹ گیا۔ فوج فوج کے نشان جدا جدا لہرانے لگے۔ لشکر خاصہ کے علاوہ تاتار کے ترک اور کوہستان کے افغان، لوٹ مار کی نیت باندھے شب و روز روزے سے بیٹھے رہتے تھے۔ ہزاروں کی جگہ لاکھوں جمع ہو گئے۔ اس ٹڈی دل کو لے کر اڑا اور ملتان میں آ کر دم لیا۔ ٹوٹے پھوٹے کی مرمت ساز و سامان کی درستی کی۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ رستے میں ایسے ایسے ریگستان اور چٹیل میدان ہیں کہ جہاں کوسوں تک پانی کا پتا اور گھاس کا پتا نہیں ملتا اس لئے حکم دیا کہ ہر شخص کئی کئی دن کا کھانا پانی اپنے اپنے ساتھ اٹھا لے اور سرکار شاہی سے بھی دو ہزار اونٹ رسد کے دانے پانی اور گھاس پات سے لدوا کر ساتھ لئے۔

غرض ان لق و دق میدانوں کو لپیٹ سپیٹ کر دفعتہً اجمیر پر جا پہنچا۔ اگرچہ کوئی راجہ محمود کے حال سے غافل نہ تھا مگر یہ بھی خیال نہ تھا کہ ایسے میدان طے کر کے یہ طوفان یوں یکایک بجلی کی طرح آن گرے گا۔ اب سوا کنارہ کرنے کے اور کیا ہو سکتا ہے۔ راجہ اور شہر کے لوگ جو بھاگ سکے وہ جان لے کر بھاگ گئے مگر اس آندھی سے شہر میں چراغ اور باہر تنکا تک نہ رہا۔ تارا گڑھ کا قلعہ سامنے پہاڑ پر چمک رہا تھا مگر دیکھا کہ اس کے محاصرے میں خدا جانے کتنے دن لگیں اور کیا پیش آئے، اس لئے سیدھا منزل مقصود کا رخ کیا۔ رستہ میں جو جو قلعے اور شہر نظر آئے انہیں ٹھکراتا اور سامان خداداد سمیٹتا دو منزلہ اور سہ منزلہ کرتا چلا جاتا تھا کہ سمندر کے کنارے پر ایک قلعہ

عالیشان نمودار ہوا جس کا ایک ایک برج سر بفلک تھا اور دریا کی لہریں پاؤں میں لوٹ رہی تھیں۔ معلوم ہوا کہ شہر سومنات یہی ہے۔ اہل شہر بے خبر گھروں میں پڑے آنند کر رہے تھے، دیکھا تو یہی دیکھا کہ فوج کا دل بادل چھا گیا ہے اور نشان محمودی لہرا رہا ہے۔ سب گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ پانڈے بیچارے بھولے بھالے جنہوں نے کبھی ننگی تلوار نہ دیکھی تھی فصیل پر چڑھ کر حیرت سے دیکھنے اور چلانے لگے کہ اے مسلمانو تم اپنی فوج اور لشکر کے گھمنڈ پر ہمیں لوٹنے آئے ہو یہ خبر تمہیں نہیں کہ دھرم مورت پر ماتما ہمارا اسی واسطے تمہیں لایا ہے کہ جو جو مندر شوالے تم نے ہندوستان میں توڑے ہیں سب کی سزا یہاں دے گا۔ قاصد آئے، انہوں نے بھی ایسے ہی پیغام سنائے مگر محمود ان باتوں کو کب خاطر میں لاتا تھا۔ تیوری بدل کر منہ پھیر لیا اور کہا کہ خیر جو کچھ ہو گا کل معلوم ہو جائے گا۔

وہ دن تو جوں توں کر کے کاٹا۔ دوسرے دن جب مشرق کا شہسوار ستاروں کی فوج کو شکست دے کر شعاع کا نیزہ ہاتھ میں لئے نکلا، محمود سر سے پاؤں تک لوہے میں غرق، ہوا کے گھوڑے پر سوار چتر لگائے میدان جنگ میں آ کھڑا ہوا۔ نقارے پر چوٹ پڑی کہ دل سینوں میں دہل گئے۔ دلیروں نے قلعہ کی طرف بڑھ کر ایسے تیر برسانے شروع کئے کہ ہندوؤں کو فصیل چھوڑتے ہی بن آئی۔ قلعے سے مندر میں بھی راہ تھی۔ سب گھبرا کر ادھر گھس گئے۔ مسلمان جھٹ سیڑھیاں لگا کمندیں ڈال فصیلوں پر چڑھ گئے اور اللہ اکبر اللہ اکبر کے نعرے مارنے شروع کئے کہ قلعے سے لے کر کوہ و دشت تک گونج اٹھا۔ تکبیر کی آواز سے برہمنوں اور پانڈوں کے دلوں میں گیان دھرم کی آگ سے ایک دھواں اٹھا اور راجپوتوں کے دلوں میں خون غیرت نے جوش مارا۔ دفعتاً آگ بگولا ہو کر دوڑے۔ جو تیر انداز فصیل پر کھڑے تھے ان سے آتے ہی چھری کٹاری ہو گئے اور سب کو کاٹ کر نیچے گرا دیا۔ پھر تو ادھر سے آتش بازی کے بان اور رال کی ہانڈیاں تھیں اور ادھر سے تیروں کی بوچھاڑ اور برچھیوں کی بجلیاں۔ عالم گرد و غبار سے اندھیرا ہو گیا اور لڑائی برابر ترازو کا تول تلی ہوئی تھی مگر قلعے کا پلہ بھاری تھا کہ اتنے میں شام نے آ کر

اندھیرے کی سپر بیچ میں رکھ دی۔ دونوں لشکر اپنے اپنے مقام پر آئے۔ شبخوب کی روک تھام کا بندوبست ہوا۔ حکم تھا کہ چراغ کا تو کیا ذکر ہے، آگ کی چنگاری تک نہ چمکنے پائے۔ مگر دلوں کی بے قراری اور مایوسی کچھ کہی نہ جاتی تھی۔ ادھر تو محمود کے لشکری سناٹے میں تھے کہ کہاں وہ کوہ وشت پر بہار اور خدائی گلزار، کہاں یہ ریگستان بیابان گھروں سے ہزاروں کوس آن پڑے۔ اللہ ہے جو پھر بھی اہل وعیال کا منہ دیکھنا نصیب ہو۔ روئے طمع سیاہ، جس نے یہ دن دکھایا۔ لوٹ کا لالچ نہ ہوتا تو کیوں اس بلا میں پڑتے۔ کرتے تو کر بیٹھے مگر دیکھیے کہ اب اونٹ کس کروٹ بیٹھے ادھر قلعہ بند بچارے مصیبت کے مارے جانوں سے نراس بیٹھے تھے اور کہتے تھے ''ہے نرنکار یہ آسمانی بلا کہاں سے آ گئی۔ ہم تو اپنے گھروں آرام سے رام رام کی سمرن جپتے تھے۔ تو ہی اس آفت کو ٹالے تو ٹالے، تیرے سوا کس کا آسرا ہے''۔ غرض دونوں طرف سناٹے کا عالم تھا۔ اندھیری رات میں سنسان جنگل سائیں سائیں کرتا تھا اور گھوڑے سے لے کر اونٹ تک سانس نہ لیتا تھا۔ ہاں تدبیروں کے قاصد اور کاغذ کے گھوڑے دوڑ رہے تھے۔ قلعے والوں کو رات بھر نیند آئی۔ دیس دیس کے ٹھاکروں اور راجاؤں کو چٹھیاں لکھیں کہ یہی وقت ہے اگر آج دھرم کی لاج نہ رکھی تو کب رکھو گے۔ ادھر آدھی رات تھی جو محمود کی آنکھ کھلی۔ دل گھبرایا اور اسی وقت سرداران لشکر کو بلا کر کہا کہ صبح سر پر کھڑی ہے بندوبست کرنا چاہیے کہ میدان جنگ کس ڈھنگ پر ڈالا جائے۔ وزیر نے ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ جس طرح ہو سکے اس لڑائی کا فیصلہ جلد کرنا چاہیے۔ ملک بیگانہ ہے اور عرصہ دور کا ہے جس قدر دیر ہوگی ہیبت ہماری کم اور جمیعت گھٹتی جائے گی اور دشمن کی امدادیں پہنچ کر قوت بڑھتی جائے گی۔ ایک ایک سپاہی کے دل پر غلام کی نظر ہے۔ دیکھتا ہوں کہ رفیقوں کے جی چھوٹے جاتے ہیں۔ محمود نے اس رائے کو نہایت پسند کیا اور سب نے تائید کی۔ اسی وقت پس وپیش اور یمین ویساہ کی تقسیم ہو کر ڈیرے ڈیرے میں حکم پہنچ گیا کہ صبح نور کے تڑکے قلعہ پر دھاوا ہو جائے راتوں رات سینکڑوں سیڑھیاں اور کمندیں اور ہزاروں فولادی میخیں تیار ہو گئیں۔ تمام رات بہادروں نے ہتھیاروں

کی تیاری میں کاٹی۔ جب پچھلی پہر رات باقی رہی تو ستاروں کے پہرہ دار اپنے اپنے پہروں پر قائم تھے جو محمود نے وضو کر کے دوگانہ نماز کا ادا کیا۔ سلاح جنگ زیب بدن کرتے ہی سواری کا حکم دیا۔ ادھر صبح کی سفیدی مشرق سے نمودار ہوئی، ادھر سرخ پھریرا نشان جنگ کا ہوا میں لہرایا۔ جب سپہ سالار کو تیسرا حکم پہنچا تو اس نے خود کرنا ہاتھ میں لے کر منہ پر رکھی اور جس طرف سے کہ دھاوے کا موقع تھا ادھر سے پہلو دے کر دوسرے رخ سے لڑائی ڈالی۔ محمود بذات خاص ایک رسالہ لے کر الگ کھڑا ہوا کہ جب قلعے والے فوج کی طرف جھکیں تو یہ ادھر سے کمندیں ڈال کر اندر جا پڑے قلعے میں بھی تمام رات آنکھوں میں کٹی تھی۔ پانڈے، پجاری، برہمن اور راجپوت دھاوے کا غل سن کر گھبرا گئے۔ پہلے تو سب مندر کی طرف دوڑے اور سومنات کی پرتما سے لپٹ لپٹ کر زار زار روئے کوئی پاؤں میں لوٹتا تھا کوئی زار و نیاز سے کھڑا دعا مانگ رہا تھا۔ آخر روتے دھوتے باہر نکلے۔ جدھر کو دھاوے کا زور دیکھا سب کے سب ادھر ہی امنڈ پڑے اور لڑائی شروع ہوگئی۔ چاروں طرف سے خبریں چلی آتی تھیں اور تدبیر کی نظر ہر طرف برابر دوڑ رہی تھی۔ اتنے میں ایک پہرے کے سپاہی نے محمود کو رپٹ دی کہ ادھر سے غبار نمودار ہوتا ہے اور رخ اس کا اسی طرف معلوم ہوتا ہے۔ عجب نہیں کہ کوئی راجہ قلعے کی مدد کو پہنچا ہو۔ اسی وقت سانڈنی سوار اور ہرکارے دوڑ گئے۔ دم کے دم میں پھر کر آئے اور خبر لائے کہ فلاں فلاں شہر کے راجہ اس اس قدر فوج کی جمعیت سے آن پہنچے۔ شاہ باتدبیر نے اس خبر کو یہیں بند رکھا کہ اگر لڑتی ہوئی فوج کو یہ خبر وحشت ناک پہنچی تو سارے لشکر میں ہل چل پڑ جائے گی۔ فوراً اپنی رکاب کی فوج لے کر برق و باد کی طرح لپکا اور اس کالی آندھی کے سامنے جا کر پہاڑ کی طرح ڈٹ گیا۔ اول پیغام بھیجا کہ اس وقت قلعہ والوں سے ہمارا مقابلہ ہو رہا ہے۔ شایان جوانمردی یہ ہے کہ جب تک ہم ادھر سے فارغ نہ ہو لیں تم ہم پر حملہ نہ کرو۔ انہوں نے کہلا بھیجا کہ قلعہ اور ہم کچھ جدا نہیں، زبانی باتیں نہ بناؤ مرد ہو تو تلوار لے کر سامنے آؤ۔ محمود کو اتنی فرصت بھی کافی تھی یہ دایاں بایاں سرداروں کو بانٹ، فوج کا قلعہ باندھ، قلب میں قائم ہو چکا تھا۔ ادھر سے

کرنا اور ادھر سے نرسنگا لڑائی کا پھونکا گیا۔ پہلے تو تیر و خدنگ سے پیغام وسلام موت کے آئے۔ مگر ادھر ہندوستان کے سور بیر ادھر ترک طرار اور افغان خونخوار بڑھ بڑھ کر حملے کرنے لگے۔ جنگ کا ہنگامہ گرم ہوا۔ تلوار کی آنچ سے خود وزرہ کے نیچے بدن بہادروں کے جل اٹھے اور خون پانی ہو کر بہہ گئے۔ کہ دفعتۃً ایک طرف سے غبار اٹھا۔ سب کی آنکھیں ادھر لگ گئیں۔ جب غبار کے دامن کو مقراض ہوا نے چاک کیا اور گرد کے گریبان سے نشان لشکر نے سر نکالا تو معلوم ہوا کہ نہر والہ کا راجہ بھی آیا۔ اس خبر کو سن کر کیا ترک کیا افغان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور محمود کے بھی اوسان بھول گئے۔ مگر پھر سنبھلا۔ ادھر تو جو فوج قلعے پر لڑ رہی تھی اسے پیغام بھیجا کہ قلعے کا پیچھا چھوڑ دو اور یہاں کی خبر لو۔ ادھر گھوڑے سے کود جبین نیاز کو اپنے خدا کے سامنے خاک عجز پر رکھ دیا اور دیر تک درگاہ الٰہی میں یہ گریہ وزاری دعا مانگتا رہا۔ بعد ازاں اٹھا اور فوج کی طرف مخاطب ہو کر کہا کہ اے شیرو! دلیرو! دیکھو دشمن نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ خراسان اور ترکستان یہاں سے سینکڑوں نہیں ہزاروں کوس کا پلہ ہے۔ اگر پر بھی لگا کر اڑو گے تو جان لے کر وہاں نہ پہنچ سکو گے۔ اے مسلمانو! باایمانو! اب سوائے خدائے وحدہ لاشریک کے کسی کا سہارا نہیں۔ یا اس کا آسرا ہے یا ہمت مردانہ اور بازوئے دلیرانہ کا۔ بھاگ کر مرنے سے مار کر مرنا بہتر ہے۔ نام تو رہے گا کہ غازی بھی ہوئے اور شہید بھی۔ دیکھو اس میدان سے گھر دور ہے مگر بہشت قریب ہے۔ شہادت کا تاج سر پر لو اور بہشت میں داخل ہو۔ اس تقریر کا افسوں اس وقت پر ایسا کام آیا کہ ٹوٹی ہوئی کمریں پھر بندھ گئیں۔ سب یکدل و یکجان ہو کر ٹوٹ پڑے اور ایسا جی توڑ کر حملہ کیا کہ ایک دھاوے میں پانچ ہزار کا کھیت ڈال دیا جو باقی رہے ان کے پاؤں اکھڑ گئے۔ فتح یابوں نے کئی کوس تک پیچھا کیا زخمیوں کی کمریں ٹٹول کر اور مردوں کی ہمیانیاں کھول کھول کر کمر کیسے خوب ٹھوک کر بھرے۔ قیدیوں کو کون پکڑتا کہ پہلے ہی غزنی کے گھر بار اور ایران توران کے بازار لونڈی غلاموں سے بھرے پڑے تھے۔ اس فتح کا حال دیکھ کر قلعہ والوں کی رہی سہی آس بھی ٹوٹ گئی۔ محمود مع فوج کے فتح کا نقارہ بجاتا قلعہ میں داخل

ہوا اور دروازے پر نشان محمودی لہرانے لگا۔ اب دل کو تاب کہاں تھی۔ سید ھا مندر میں پہنچا۔ عمارت کی شان و شوکت دیکھ کر آنکھیں کھل گئیں۔ چھپن ستونوں پر گنبدی چھت بیضہ وعنقا کی طرح دھری تھی کہ ہر ستون ایک ڈال سنگ مرمر کا تراشا ہوا تھا اور سر سے پاؤں تک جواہرات سے مرصع تھا۔ پچی کاری کی گلکاری چین کے نقش و نگار مٹاتی تھی اور کندن کی ڈلک ستاروں پر آنکھ مارتی تھی۔ بیچوں بیچ میں ایک جڑاؤ زنجیر لٹکتی تھی۔ اس میں ایک سونے کا چراغ دن رات دھڑ دھڑ جلتا تھا۔ خدا جانے کن وقتوں سے اسی طرح روشن چلا آتا تھا جس کی قسمت میں آج کے دن اس آندھی سے گل ہونا لکھا تھا۔ دروازے کے سامنے سومنات دیوتا کھڑے تھے جن کا قد پورا پانچ گز کا تھا کہ دو گز زمین میں اور تین گز باہر نمودار تھے۔ محمود نے خود ایک تیر کمان میں جوڑ کر اس کی ناک پر مارا اور توڑنے کا حکم دیا۔ تمام پجاری بیچارے دوڑ کر پاؤں پر گر پڑے اور کہا کہ اُسے نہ توڑو اور بہت سے خزانے نذرانے لو۔ وزیر نے بھی سفارش کی مگر بادشاہ نے سوچ سوچ کر کہا کہ میرے نزدیک بت فروش نام پانے سے بت شکن ہونا بہتر ہے۔ یہ کہہ کر گرز فولادی جو ہاتھ میں تھا اس زور سے مارا کہ وہ پڑتما جو سونے کی ڈھلی اور اندر سے کھوکھلی تھی ٹکڑے ٹکڑے ہو کر گر پڑی۔ اقبال کے خزانے پر نظر کرو کہ جو روپیہ پجاری دیتے تھے اس سے چند و چند زیادہ کا جواہرات اس میں سے نکل پڑا۔ محمود مارے خوشی کے باغ باغ ہو گیا۔ دو ٹکڑے اس کے مکہ اور مدینہ بھیجے اور دو غزنی کو بھجوائے کہ ایک جامع مسجد اور ایک دیوان عام کے دروازے پر ڈال دیں ۱۔ زر و جواہر اور مال و دولت اس قدر ہاتھ آیا کہ تمام عمر کی لوٹ کو بھول گیا اور چند روز کے بعد غزنی کو پھرا۔ جب ان لڑائیوں اور فتح یابیوں کی دفتر تقدیر میں جگہ نہ رہی تو خاتمے کا وقت آیا۔

۴۲۱ھ ۱۰۳۰ء میں ۶۳ برس کی عمر ۳۲ برس کی سلطنت کے بعد پیمانہ عمر لبریز ہوا اور مرض نے ایسا زور پکڑا کہ اسے بھی زندگی کی آس نہ رہی۔ حکم دیا کہ سارے جواہر خانے اور دولت کے خزانے لا کر دربار میں سجاؤ۔ ان خدائی خزانوں کی کون سے مکان میں سمائی ہوتی۔ باہر شہر کے ایک میدان میں خیمے، ڈیرے، شامیانے سراپردے کھڑے

ہو گئے۔ کشمیری پشمینے، نبات، سقرلات، اطلس فرنگی، دیبائے رومی، کاشانی مخمل، ایرانی قالین، فرش فروش، پردوں اور آئین بندی سے نگار خانہ چین کر دیا۔ ہزاروں لاکھوں روپیہ کے توڑے، اشرفیوں کی تھیلیاں، شیشہ اور بلور کی ڈبیوں میں لعل بدخشاں، جواہر آبدار، گوہر شاہوار، تاج مرصع، جڑاؤ تخت سونے چاندی کی کرسیاں۔ اس کے علاوہ ہزاروں نادر نفائس اور گراں بہا عجائب سے اس مقام کو ایسا سجایا کہ طلسمات کا عالم ہو گیا۔ وہ محمود جس کی ران کے نیچے عمر بھر اقبال کا گھوڑا بجلی کی طرح چمکتا رہا، ایک ناکی میں تصویر ہیجان کی طرح لیٹا ہوا آیا۔ گلاب سے چہرے پر مردنی چھائی تھی اور آنکھوں سے حسرت ٹپکتی تھی۔ غلاموں نے بغلوں میں ہاتھ دے کر اٹھایا عصا کے آسرے سے آہستہ آہستہ آیا اور تکیوں کے سہارے سے تخت زر نگار پر بیٹھ گیا۔ ضعف کے مارے پیشانی پر پسینہ آتا تھا اور رومال سے پونچھتا جاتا تھا۔ وہ امراء کہ خوں ریزیوں کی مصیبتوں میں جان وتن سے شریک رہے تھے۔ سر جھکائے کھڑے تھے اور سب پر ایک اداسی کا عالم چھایا ہوا تھا۔ محمود نے پہلے تمام دربار کو نظر یاس سے دیکھا پھر جو نقد و جواہر خلق خدا کے کلیجوں میں ہاتھ ڈال ڈال کر اکٹھے کئے تھے ان پر نظر ڈالی۔ مگر جدھر نگاہ جا پڑتی تھی اور اٹھ نہ سکتی تھی۔ ٹھنڈی سانس بھرتا تھا اور رہ جاتا تھا۔ پھر حکم دیا کہ اصطبل اور فیل خانے اور شتر خانے کے نادرات بھی لاؤ۔ وہ بھی زرکار جھولوں اور مرصع نگار زیور و ساز سے سجے ہوئے آئے۔ کثرت ان کی کیا بیان ہو کہ دور دور تک جنگل اور پہاڑ جگمگ جگمگ کرنے لگے۔ ناکی میں سوار ہو کر انہیں دیکھا۔ آہیں سرد بھریں اور زار زار رویا مگر حیف کہ ہاتھ نہ اٹھا جو ایک پیسا کسی کو دیتا۔ آخر جان دی اور دنیا سے کوچ کیا۔

شہاب الدین غوری

جب غزنوی حکومت میں ضعف آیا تو غیاث الدین اور شہاب الدین دو بھائی غور کے خاندان سے نکل کر تخت غزنی پر قائم ہو گئے۔ ان میں سے غیاث الدین تو تاجدار تھا اور شہاب الدین سپہداری کر کے بڑے بھائی کی اطاعت کا حق ادا کرتا تھا۔ شہاب الدین نے پنجاب میں آ کر کئی معرکے مارے اور سنا کہ بٹھنڈا قدیم سے راجگان عظیم الشان کا دارالسلطنت چلا آتا ہے۔ چنانچہ اس پر فوج کشی کی اور جنگ عظیم کے بعد فتح یاب ہوا۔ سب بندوبستوں سے فارغ ہو کر ایک دن دربار عام کیا۔ امیر و وزیر، سپہ سالار بخشی سب اپنے اپنے عہدوں پر حاضر تھے اور گفتگو یہ ہو رہی تھی ۔۔۔ کہ دارالخلافے کو چلنے کے لیے کونسی تاریخ مقرر کی جائے۔ دفعتہً سرحد کے سردار کا عریضہ پہنچا کہ رائے پتھوراوالی اجمیر اپنے بھائی کھانڈے راؤ حاکم دہلی کو ساتھ لے کر دو لاکھ فوج جرار اور تین ہزار فیل جنگی سے بٹھنڈے کے چھڑانے کو آندھی اور بھونچال کی طرح چلا آتا ہے۔ اقبال خداوندی کی توجہ واجب ہے، نہیں تو اس ملک ہند میں زن و بچے مسلمانوں کے تباہ ہو جائیں گے۔ بادشاہ نے اسی وقت لشکر اسلام میں منادی کر دی کہ جب تک اس مہم کا فیصلہ خاطر خواہ نہ ہو جائے مسلمان باایمان کو غزنی کی طرف قدم اٹھانا حرام ہے۔ ساتھ ہی لشکر کی تیاری کا حکم اور رستے کا کارداروں کے نام سامان رسد کے حکم نامے جاری ہو گئے۔ لشکر جرار منزل بہ منزل یلغار کرتا جاتا تھا جو انبالہ کے ڈیروں پہ خبر لگی کہ لشکر راجہ کا پانی پت کے مقام پر ہے مگر فیل خانہ کرنال میں آ گیا۔ بادشاہ نے وہیں مقام کر دیا اور فوج کو پس و پیش سے درست کر کے کوچ بکوچ آگے بڑھا۔

تلاوری 2 کے میدان میں دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہو گیا۔ دن موروچوں کی درستی میں گزرا، شام کو سب نے گھوڑوں کے تنگے ڈھیلے کر دیے۔ دانہ چڑھا، زین پوش بچھا کر بیٹھ گئے۔ باگ ڈوریں زانوؤں سے باندھ لیں اور خرجیوں سے روٹیاں نکال کر کھانے لگے۔ شہاب الدین ابھی خاصے ہی پر تھا کہ گشت کے سواروں نے دشمن کی فوج کے چند گھسیارے اور لکڑ ہارے جنگل سے پکڑ کر حاضر کیے۔ سواروں کو انعام دے کر رخصت کیا اور ان لوگوں کو مودھی کے سپرد کیا کہ جو کچھ مانگیں انہیں کھلاؤ پلاؤ۔ آدھے بجے سامنے بلایا۔ سب کے سب جنگلی گنوار تھے مگر دو بڈھے ہشیار اور تجربہ کار نکلے جن سے لشکر کے اتارے کا رخ، فوج کی تعداد، پیچھے کی مدد، رسد کے بندوبست، غرض ڈیرے ڈیرے کا حال معلوم کر لیا۔ تمام رات فوج کی قسمت اور موروچوں کی تقسیم میں گزری۔ پچھلی پہر رات تھی کہ کمر بندی کا حکم پہنچا۔ صبح ہوتے ہوتے تمام لشکر کیل کانٹے سے لیس ہو کر میدان میں جم گیا۔ آگے پیچھے دائیں بائیں ہر ایک سردار اپنی اپنی فوج کو سنبھالے تھا۔ خود صاحب لشکر زرہ بکتر چار آئینہ سجے، سر پر خود فولادی، کمر میں شمشیر اصفہانی، پشت پر سپر، کندھے پر کمان، زین پر گرز گاؤ سر دھرا، کمند ابریشمی شکار بند میں آویزاں، علم کے سائے کے نیچے نیزہ تانے کھڑا تھا اور اسپ عربی جس پر پوست پلنگ کی پاکھر پڑی تھی، رانوں میں سے نکلا جاتا تھا ادھر حریف کے لشکر میں پہلے ہاتھیوں کی قطار، بعد اس کے رتھیں اور بہلیں، پیادہ اور سوار فوج تھی کہ جس کا شمار سوائے منشی تقدیر کے کسی کو معلوم نہیں۔ ہاں سلسلہ انتظام اس کا خاص ایک شخص کی چٹکی میں تھا کہ جدھر چاہے ادھر جھونک دے۔ بیچوں بیچ میں ہند کا سیناپتی۔ مگر سر سے پاؤں تک اوچھی بنا ہوا، زردو گلے پر چلتا اور اس پر زرہ بکتر چار آئینہ سجے راجپوتی ایک پیچ جھون پر رکھے، کمر میں ایک طرف سروہی کی تلوار، دوسری طرف کھانڈا اور کٹار، پشت پر گینڈے کی ڈھال، سورج مکھی کے سائے میں ہاتھی پر بیٹھا دونوں لشکروں پر نظر غور سے دیکھ رہا تھا۔ آخر نہ رہ سکا اور تڑپ کر ہاتھی سے کود، گھوڑے پر سوار ہوا۔ بھائی کو ہاتھی پر بٹھا دیا۔ آپ دکھنی گھوڑی اڑاتا تا، ہسپاہ گری کا بانکپن دکھاتا، بھالے کے ہاتھ نکالتا ہوا، دائیں

سے بائیں اور بائیں سے دائیں تک ایک چکر لگایا اور سامنے لشکر کے کھڑے ہو کر اہل لشکر کے دلوں کو اس طرح بڑھایا کہ اے راجپوتوں کے سپوتو! پہاڑوں کے افغان اور تاتار کے ترکوں کا سامنا ہے۔ ملیچھ مسلمان ہیں اور ست دھرم کے بھرشٹ کرنے پر کمریں باندھ باندھ کر آئے ہیں۔ ابھی تک تمہاری سرحد پر کھڑے ہیں اگر ہمت کرو تو کچھ مال نہیں۔ خرگوشوں کی طرح جھاڑیوں میں بھگا بھگا کر مار لو گے اور اگر ایک قدم تمہارا ہٹا تو پاؤں ان کے ہمارے تمہارے گھروں میں اور ہاتھ ننگ و ناموس میں ہیں۔ آج دھرم گیان کی لاج تمہاری تلوار کی باڑ پر ہے۔ مارو مارو دم نہ لو اور جانے نہ دو۔ راجہ ابھی یہ تقریر تمام نہ کر چکا تھا کہ اتنے میں لشکر شاہی کے بائیں ہاتھ پر جو افغان پرا جمائے کھڑے تھے آگے بڑھے اور خلجیوں نے بھی باگیں لیں۔ انہیں دیکھ کر راجپوت بہادروں کے سپوت جن کی تلواریں میانوں میں مچھلی کی طرح تڑپی جاتی تھیں، ہاتھیوں کی صف کو چیر کر نکل آئے۔ تیر برساتے ہوئے دوڑے اور ایک دم میں برچھیوں پر لے لیا۔ جب یہ حال دیکھا تو افغان پیچھے ہٹے اور خلجیوں کے پرے نے بھی گھونگٹ کھایا۔ مگر سپہ دار بے سپاہ قلب میں، اسی طرح جما ہوا تیر مارے جاتا تھا جو ایک مصاحب نے آ کر عرض کی کہ افغان اور خلجیوں نے پیٹھ دکھائی۔ جن نمک خواروں، سرداروں سے پسینے کی جگہ خون کرانے کی امید تھی وہ جان بچا کر بھاگ گئے۔ دشمن چلا چڑھا آتا ہے۔ حضور اب کس کی راہ دیکھتے ہیں۔ برائے خدا گھوڑے کی باگ پھیریئے۔ اب لاہور میں پہنچ کر بداندیشوں کا بندوبست قرار واقعی ہو جائے گا۔ یہ سنتے ہی بادشاہ شعلے کی طرح بھڑک اٹھا۔ رہی سہی فوج کو سمیٹ کر للکارا اور گھوڑے کا ڈپٹا کر برق کی طرح دشمن پر جا پڑا۔ نیزہ اور شمشیر سے گزر کر فقط خنجر اور کٹار پر نوبت آ گئی۔ اتنے میں کھانڈے راؤ کی نظر بادشاہ پر پڑی۔ فیلبان کو آواز دی کہ خبردار جانے نہ پائے۔ اس نے ہاتھی کو ریلا۔ شہاب الدین بھی چمک کر اس طرح جھپٹا کہ گھوڑے کے دونوں ہاتھ ہاتھی کے مستک پر بیٹھے اور ہاتھی کے منہ میں ایسا نیزہ مارا کہ کئی دانت اس کے ٹوٹ گئے مگر خود زخم کاری کھایا۔ ڈگمگا کر گھوڑے سے گرا چاہتا تھا کہ ایک غلام باوفا

جست کر کے پیچھے جا بیٹھا اور گھوڑا اڑا کر برق کی طرح نظروں سے غائب ہو گیا۔ غرض بھاگے بھٹکے سپاہی اور ٹوٹا پھوٹا لشکر پھر لاہور میں آیا اور یہاں کے ملک کا بندوبست کر کے غزنی کو روانہ ہو گیا۔ اس لڑائی میں تماشہ یہ ہوا کہ جن جن سرداروں کو بہادری اور جان نثاری کے بڑے بڑے دعوے تھے اور بادشاہ کو بھی ان پر بھروسے تھے، وہی میدان جنگ سے بھاگے تھے۔ چنانچہ غزنی میں پہنچ کر علما سے فتویٰ طلب کیا کہ جو مسلمان جہاد سے بھاگے اس کے لئے کیا حکم ہے۔ سب نے لکھا کہ وہ گنہگار خدا ہے۔ گھوڑوں کے توبڑوں میں ڈال کر انہیں چڑھوا دیے اور بازاروں میں چھوڑ دیا کہ خاص و عام عبرت پکڑیں اور جو نہ کھائے اس کا سر الگ۔ پھر یہ سزا تو معاف ہو گئی مگر دربار سے بند ہو گئے۔

دوسرے برس سال نوروزی نے پلٹا کھایا۔ بادشاہ نے اندر ہی اندر سب سامان کر رکھے تھے۔ فہرست منگا کر دیکھی اور ہر کارخانے میں حکم کوچ کا بھیج دیا۔ آٹھویں دن خود سوار ہوا۔ جب پشاور میں پہنچا تو ایک پیر مرد، دیرینہ سال کی غوری کے خاندان میں سے تھا اور خلوت کی صحبتوں میں بے تکلف تھا اس نے عرض کی کہ اس مہم میں سامان تو جنگ عظیم کا نظر آتا ہے مگر کھلتا نہیں کہ ارادہ کدھر ہے؟ بادشاہ نے آہ سرد بھر کے کہا کہ اے مرد مسلم! عجب ہے کہ اس سن و سال پر تیرا یہ سوال ہے۔ اگلے برس کی شکست تجھے یاد نہیں۔ آیا وہ صدمہ اسلام کے شیشہ عزت کے لئے کچھ چھوٹا پتھر ہے؟ پھر قبا کے بند کھولے اور کہا کہ دیکھ لے اس دن سے آج تک نہ میں نے کپڑے بدلے ہیں نہ حرم سرا میں بستر پر سویا ہوں۔ اس پیر مرد نے دعائے خیر دی اور کہا کہ اگر یہ بات ہے تو اب مصلحت وقت کے بموجب کام کرنا چاہیے۔ یعنی جو جو سردار غضب شاہی میں دربار سے بند ہوئے ہیں، انہیں پھر دربار میں بلا کر انعام دیجیے اور ترقی کے وعدوں سے دل بڑھائیے کہ جان لڑا کر پہلے داغ کو دھوئیں۔ چنانچہ ملتان میں آ کر چند مقام کیے۔ دربار عام کر کے سب سرداروں کو بلایا اور کہا کہ دھوئیں۔ چنانچہ ملتان میں آ کر چند مقام کیے۔ دربار عام کر کے سب سرداروں کو بلایا اور کہا کہ اے مسلمانو سال گزشتہ میں

جو داغ دامن اسلام پر آیا سب پر روشن ہے اور تدارک اس کا ہر مومن مسلمان پر واجب ہے۔ وہ اگلی ندامت کے سبب سے کچھ نہ کہہ سکے۔ مگر سب نے تلواروں پر ہاتھ رکھ کر سامنے سر جھکا دیے۔ غرض وہاں سے روانہ ہو کر لاہور پہنچا اور سید قوائم الملک رکن الدین کو کہ تدبیر اور تقریر میں بے مثل تھا ایلچی کر کے نامے کے ساتھ روانہ کیا نامے کا مضمون یہ تھا کہ میں بموجب حکم اپنے بڑے بھائی کے کہ میرے باپ کی جگہ ہے اور خراسان سے پنجاب تک مسلمانوں کا بادشاہ ہے فوج لے کر اس طرف آیا ہوں۔ رائے پرتھی راج کہ راجگان ہندوستان میں مہاراجہ ہے اسے لکھا جاتا ہے کہ اسلام کی اطاعت کر کے اتفاق کا طریقہ قائم کر لے تاکہ خلق خدا کی آسائش میں خلل راہ نہ پائے۔ نہیں تو ملک خدا کا ہے اور حکم خدا کا، تلوار دونوں کا فیصلہ کرے گی۔

جب یہ مراسلہ راجہ کی نظر سے گزرا تو بہت خفا ہوا۔ ادھر تو ایک جواب کہ پتھر اور لوہے سے بھی کڑا تھا لکھ کر روانہ کیا اور ادھر راجگان ہندوستان کو جمع کر کے تین لاکھ راجپوتوں کا لشکر جن کی تلواروں سے خون ٹپکتا تھا ہمراہ لے کر چلا۔ پہلی فتح کے بھروسے پر بہت سے راجہ بہادرانہ رفاقت کے دم بھرتے مدد کو آئے۔ شہاب الدین بھی ادھر سے آگے بڑھا اور نہر سرسوتی کو بیچ میں ڈال کر دونوں لشکر اتر پڑے۔

پرتھی راج نے بھی اول ایک خط اس مضمون کا لکھا کہ حال اس فوج بے شمار کا سپہ دار اسلام کو معلوم ہوا ہو گا مگر اس کے علاوہ بھی ہندوستان سے برابر فوجیں چلی آتی ہیں۔ ایک ایک راجپوت وہ من چلا بہادر ہے جس کی تلوار کی کابل اور قندھار تک پناہ نہیں۔ یہ چند نامراد ترک بچے اور افغان زادے جنہیں لوٹ کھسوٹ کا لالچ دے کر گھروں سے یہاں لایا ہے، چاہیے کہ ان کی جوانی اور ماں باپ کے بڑھاپے پر رحم کر کے یہیں سے پھر جائے۔ ہمیں جان جوانمردی کی قسم ہے کہ پیچھا نہ کریں گے اور نہیں تو دیکھ لو کہ آتش بازی کے سامان بے شمار ہیں اور جنگی ہاتھی کچھ اوپر تین ہزار ہیں۔ اگر اس تحریر پر خیال کیا تو بہتر ہے نہیں تو یاد رہے کہ ایک جاندار اس میدان سے جیتا نہ جائے گا۔

شہاب الدین اس موقع پر دھیما ہوا اور جواب میں لکھا کہ راجہ نے جو نیک اصلاح دی، عین شفقت ہے مگر سب پر روشن ہے کہ اس لشکر کشی میں مجھے کچھ اختیار نہیں۔ بھائی کے حکم سے اس مہم کا بوجھ سر پر لیا ہے۔ جب تک وہاں سے حکم نہ آئے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ اس قدر مہلت ہو کہ وہاں سے جواب آ جائے۔ اس وقت صلح اس عہد پر ہو جائے گی کہ ملک پنجاب سرہند تک ہمارے پاس رہے، باقی کل ہندوستان تمہارا۔

جب یہ نا قوت جواب راجہ کے پاس پہنچا، تمام اہل دربار ہنسنے لگے اور لشکر میں فتح کی سی خوشیاں ہو گئیں، بلکہ نچنت ہو کر ڈیرے ڈیرے میں ناچ رنگ شروع کر دیے۔ وہاں شہاب الدین نے سر شام فوج کو کمر بندی کا حکم دے کر خیمے ڈیرے سب قائم رکھے اور راتوں رات کئی کوس کا چکر دے کر دریا پار اتر گیا۔ صبح کو راجہ کے لشکر میں ابھی کوئی بستر پر تھا کوئی اشنان کو گیا تھا کہ دفعۃً پہلو میں آ، دمامہ جنگی پر چوٹ لگا، اس زناٹے سے کرنا پھونکی کہ سوتے جاگتے سب اچھل پڑے۔ تمام فوج میں کھلبلی پڑ گئی۔ وہ لشکر بے شمار ایسا دریا تھا کہ ایک طرف کی ہل چل کی دوسری طرف خبر بھی نہ ہوتی تھی۔ مگر راجہ نے اس وقت ہوش و حواس کو جمع کیا۔ ذرا نہ گھبرایا۔ ایک فوج تو تیار کر کے سامنے کی اور باقی ساقی انبوہ کو سمیٹ کر پھر میدان میں لا جمایا۔ ادھر شہاب الدین نے فوج کے چار حصے کر کے چار سپہ سالاروں کے ماتحت قائم کر دیے کہ باری باری سے جائیں اور اس لشکر کثیر کے مقابل میں جان لڑائیں۔ راجپوت بہادر بھی اس میدان میں دائیں بائیں سے درست ہو کر اس خوبصورتی اور بندوبست کے ساتھ لڑے کہ مسلمانوں کے جی چھوٹ چھوٹ گئے۔ تب شہاب الدین شکست کی صورت بنا کر پیچھے ہٹا۔ حریف نے پیچھا کیا۔ جب جمعیت ان کی بے انتظام ہوئی تو دوسرے غول سے تازہ دم حملہ کیا۔ مگر جمعیت ہندوؤں کی بے شمار تھی۔ اس لئے اس سے بھی مطلب نہ حاصل ہوا۔ جب ٹھیک دوپہر ہوئی تو رائے پرتھی راج ایک سو پچاس راجہ اور مہاراجہ کو لے کر ایک درخت کے سائے میں آیا۔ سب نے تلواروں کے قبضوں پر ہاتھ رکھ رکھ کر قسم کھائی اور ایک ایک پیالہ شربت کا پی، پان کا بیڑا منہ میں، تلسی کی پتی زبان پر رکھ، کیسر کے ٹیکے پیشانیوں پر

دیے۔ ادھر شہاب الدین بھی بارہ ہزار غلام خاص جن کے سروں پر فولادی خود جواہرات سے مرصع دھرے ہوئے تھے، انہیں لے کر جدا ہوا۔ اول خود تاج شاہی اتار کفن سر سے باندھا، پھر شمشیر اصفہانی گھسیٹ۔ میان اس کا توڑ کر پھینک دیا۔ بادشاہ کا یہ حال دیکھتے ہی سب نے خود خورجیوں میں ڈال کفن سروں پر لپیٹ لئے اور ایمانی تلواریں کھینچ، داڑھیاں منہ میں لے، اس طرح جوش میں آ کر حملہ کیا کہ یا تو اپنی جگہ جمے کھڑے تھے یا پلک مارتے خاص راجہ کے قلب لشکر میں جا کر دھواں دھار ہو گئے اور جو جو سر لشکر ادھر ادھر لڑ رہے تھے وہ بھی دائیں بائیں زور دے کر گرے۔ اس گھمسان کا رن پڑا کہ دم کے دم میں ہزاروں کا کھیت پڑ گیا۔ اگرچہ راجپوت تلواروں نے بڑا سا کھا گیا، مگر انجام کھانڈے راؤ میدان جنگ میں بہادری کا حق ادا کر کے زندگی کے بوجھ سے سبکدوش ہوا۔ رائے پتھورا دریائے سرستی کے کنارے گرفتار ہو کر مارا گیا۔ تمام فوج پریشان ہو گئی۔ فتح یاب سپاہی شام تک قتل و غارت میں ہاتھ رنگتے رہے۔ بادشاہ نے راتوں رات لاہور اور غزنی کو فتح نامے روانہ کر کے دوسرے دن لشکر کا انتظام کیا اور آگے روانہ ہوا۔ بعد ازاں اجمیر کو جو دارالحکومت راجہ کا تھا، فتح کرتا ہوا دلی میں آیا اور ادھر ہی کے راجاؤں کو تاج بخشیاں کرتا، کچھ اپنے حاکم بٹھاتا دلی سے لاہور سے غزنی میں پہنچا۔ کئی برس کے بعد کوہاٹ کے رستے ہندوستان سے پھرا ہوا جاتا تھا، چند گکھڑ جن کی قوم کی کثرت اور غارت گری کا شہرہ اس زمانے میں بڑے زور و شور پر تھا، رات کو خیمہ پھاڑ کر چپکے سے اندر گھس گئے اور بادشاہ کو مار ڈالا۔

شہاب الدین بھائی کے مرنے کے بعد ۵۹۹ھ ۱۲۰۲ء میں بادشاہ ہوا اور ۶۰۲ھ ۱۲۰۶ء میں قتل ہوا۔

علاؤ الدین اور کولا دیوی

علاؤ الدین خلجی ایک بادشاہ ہندوستان کا تھا۔ جب تخت پر بیٹھا خزانوں کے منہ کھول دیے اور داد و دہش کے ساتھ عیش و عشرت کی محفلیں گرم کر دیں۔ امن اور ارزانی اس کے عہد میں ایسی ہوئی کہ کسی بادشاہ کو نصیب نہ ہوئی تھی۔ فتح نصیب ایسا کہ سیت بندرامیشور پر جا کر مسجد کے مینار بلند کئے۔ علماء فضلاء خدا پرست، شاعر، حکیم، گویے، نجومی، معمار غرض ہر فن کے صاحب کمال وہ پائے کہ جن کا نظیر پھر نظر نہ آیا۔ چنانچہ اکثر علماء کی کتابیں، نظام الدین اولیاء کے نصائح، امیر خسرو کی تصنیفات اب تک موجود ہیں۔ بادشاہی شان و شوکت کو بھی بہت بڑھایا بلکہ ہاتھی پر عماری پہلے اسی نے رکھی۔

ہر چند خدائی کے سامان موجود تھے مگر چونکہ دکن کا ملک وہ میدان تھا جس میں چچا کے عہد میں اس نے خود بڑے بڑے معرکے مارے ہوئے تھے، اس لئے اس کی یاد بھولی نہ تھی۔ چنانچہ اپنے بھائی کو ایک لشکر جرار دے کر روانہ کیا۔ اس نے جاتے ہی گجرات پٹن کو فتح کر راجہ کرن کو بھگا، تمام ملک دکن میں بھونچال ڈال دیا۔ فتح یاب آپ دیوگدھ کو چلا اور فتح نامہ شہنشاہ بھائی کو بھیجا۔ ساتھ اس کے دولت و مال تحائف بے مثال گھوڑے، ہاتھی، لونڈی، غلام اس قدر روانہ کئے کہ جن کی تفصیل سوائے کاتب قدرت کے کسی دفتر میں نہ ہوگی۔ جب فتح نامہ پہنچا تو بادشاہ بہت خوش ہوا اور حکم دیا کہ باہر شہر کے شامیانے کھڑے ہوں۔ کل سردار بار ملاحظہ کریں گے۔ دوسرے دن دربار عام ہوا۔ وزیر کے ہاتھ میں فرد تھی اور داروغہ ایک ایک چیز پیش کرتا تھا کہ ایک جھومر 3 عورتوں کا سامنے لائے اور عرض کیا کہ یہ بھی بندی میں آئی ہیں۔ خانہ بربادوں کی تباہی

اور شکستہ حالی کا کیا پوچھنا مگر انہی میں ایک بی بی نظر آئی کہ اگرچہ اس عالم میں ہے مگر سب عورتیں ادب کے ساتھ اسے بیچ میں لئے ہیں اور وہ بھی اپنے تئیں حیا کی چادر میں اس طرح چھپائے ہے کہ دیکھنے والے کی آنکھ خود بخود جھپک جاتی ہے۔ بادشاہ نے حیران ہو کر اس کا حال پوچھا۔ ایک سن رسیدہ عورت آگے بڑھ کر کچھ بولنے کو ہوئی مگر اسی بی بی نے چپکے سے ایسا کچھ کہا کہ بڑھیا خاموش ہو گئی۔ بادشاہ سمجھ گیا کہ یہ حیا والی پردہ نشین ضرور محلوں کی مسند نشین ہے زمانے کی گردش نے یہ دن دکھایا ہے۔ اسی وقت خواجہ سرا کو حکم دیا کہ سب کو قید خانے میں، مگر اس بی بی کو عزت و حرمت سے حرم سرا میں لے جاؤ اور مفصل حال عرض کرو۔ جب خواجہ سرا حکم لے کر پہنچا تو اس حمیت والی نے کہا کہ مصیبت و ذلت کے وقت میں ان لوگوں نے میرا ساتھ نہ چھوڑا، میں عزت کے وقت میں انہیں چھوڑوں، ہمت اور حمیت سے بعید ہے۔ یہ سن کر بادشاہ اور حیران ہوا اور تمام اہل دربار نے عورت کی ہمت پر آفریں کی۔ غرض اس کی بدولت سب بیبیاں عزت و حرمت سے حرم سرا میں داخل ہوئیں۔ بادشاہ نے محل کی سب بیگمات کو حکم دیا کہ جا کر اس سے ملیں اور دلداری اور خاطر داری کر کے حقیقت معلوم کریں۔ انجام یہ کھلا کہ وہ بی بی کولا دیوی نام راجہ کرن کی مہارانی ہے۔ باقی سب عورتیں امیروں اور وزیروں کی بیبیاں ہیں اور اس کی سہیلیاں ہیں۔

بادشاہ اس نیک بخت کی ہمت اور حمیت اور سلیقہ اور لیاقت کا قائل ہو گیا۔ اس وقت تو نہ بولا مگر کئی دن کے بعد حرم سرا کی بیبیوں کے ہاتھ پیغام بھیجا کی قضائے الٰہی سے جو ہونا تھا سو ہوا، اب اس محل کو اپنا محل سمجھو اور جس طرح وہاں کے راج میں رانی تھیں یہاں بادشاہ بیگم ہو کر حکمرانی کرو۔

رانی سنتے ہی آگ بگولا ہو گئی اور کہا کہ خبردار پھر یہ بات منہ سے نہ نکالنا۔ ننگ و ناموس کا مقدمہ ہے قسمت جس طرح چاہے خاک میں ملائے، مگر راجپوت کی مٹی سے یہ بے آبروئی کبھی نہ اٹھے گی۔ جان پر کھیل جانا کتنی بڑی بات ہے، مال صدقہ جان ہے اور جان حرمت پر قربان ہے اگر بادشاہ نے ایسا ارادہ کیا تو دیکھ لو، ہیرے کی انگوٹھی

میری انگلی میں ہے۔

ایک کنی میں کام تمام ہوتا ہے۔ غرض یہ کہہ کر رانی نے اس طرح تیور بدلے کہ جو عورت پیام لائی تھی اپنا سا منہ لے کر چپ چلی آئی۔ یہ جواب سن کر بادشاہ تو ایسا مایوس ہوا کہ سب سلطنت کا کاروبار بھول گیا مگر وزیر کو یہ پتہ لگا کہ وہی سن رسیدہ عورت جو ساتھ ہے، اس نے رانی کو پالا ہے، اگر نکلے تو اسی کی معرفت کام نکلے۔ کئی باتمیز عورتوں کو سمجھا بجھا کر بھیجا چنانچہ وہ گئیں اور بڑھیا سے مل کر آمد و رفت کی راہ نکالی۔ دنیا کے لوگ جسے جادو طلسم کہتے ہیں وہ در حقیقت روپے کے حرفوں میں بند ہے۔ چنانچہ دو تین ہی دن میں اس نے حامی بھر لی اور کہا کہ خیر بادشاہ سے کہہ دو، اتنا گھبراؤ نہیں۔ اگر دم میں دم ہے تو ایک دن رانی کو حضور کے پہلو میں لا بٹھاتی ہوں۔ ادھر وقت بے وقت رانی کو سمجھانا شروع کیا اور ایک دن صاف صاف کہا کہ دھرم کی آن تو جانی تھی سو جا چکی، اب پردہ ننگ و ناموس کا ہے تو اسی میں ہے جیسی پڑے ویسی بندہ سہے۔ آگے جو مرضی خدا کی۔ غرض آہستہ آہستہ ایسے باغ سبز دکھائے کہ پری شیشے میں اتر آئی یعنی اس نے بھی منظور کر لیا۔ چنانچہ بادشاہ کی بیچی دلہن کی ماں بنی اور بادشاہی ریت رسوم کے بموجب شاہانہ دھوم دھام سے دونوں کا بیاہ ہو گیا۔

پدمنی

رانی نے جوہر کر کے خاندان کی آن پر جان قربان کی

بادشاہ کے نام پر چچا کے خون کا دھبہ ایسا لگا تھا کہ اس نے مٹانے اور سب کا دل ہاتھ میں لانے کا بڑا خیال تھا۔ چنانچہ اس نظر سے اکثر عیش وعشرت کی محفلیں کرتا تھا اور ان جلسوں پر انعام واکرام کے رنگ میں چڑھاتا تھا۔ اسی عالم میں کسی خوشامد خورے نے عرض کی کہ چتوڑ کے راجہ کے محلوں میں اگرچہ بہت سی رانیاں ہیں مگر ایک رانی پدمنی نام ہے کہ حسن وجمال میں دن کو مہر نیمروز اور رات کو ماہ تمام ہے۔ قاعدہ ہے کہ جوں جوں انسان بڈھا ہوتا ہے حرص جوان ہوتی ہے۔ بادشاہ یہ سنتے ہی مشتاق ہوگیا۔ لشکر کی تیاری کا حکم دیا اور خود فوج لے کر چتوڑ پر چلا۔ چند لڑائیوں کے بعد راجہ مقابلے کی تاب نہ لایا اور اخیر کو قلعہ نشین ہوا۔ بادشاہ نے چاروں طرف فوجیں ڈال دیں اور سخت محاصرہ کر کے پیغام بھیجا کہ اب بھی اگر پدمنی کو شاہ محل میں داخل کر دو تو اسی وقت محاصرہ اٹھ جائے اور راج پاٹ بدستور قائم رہے۔ چنانچہ بہت سے پیغام سلاموں کے بعد یہ ٹھہری کہ بادشاہ خود قلعے میں جائے۔ پدمنی آئینے میں اپنی صورت دکھائے اور صلح ہو جائے۔ علاؤ الدین چند امیروں کو لے کر قلعہ میں گیا۔ راجہ نے بڑی عزت اور احترام سے ملاقات کی۔ دونوں تاجدار کے لئے بیٹھے۔ آئینہ آگے رکھا گیا اور وہ عالم تصویر گھونگٹ نکالے خنجر آبدار ہاتھ میں لئے پیچھے آ کر کھڑی ہوئی۔ اس کے یہ معنی کہ اگر بادشاہ اس کے پکڑنے کا ارادہ کرے تو اسی وقت جان پر کھیل جائے۔ غرض اس کے جمال کو دیکھ کر بادشاہ آئینے کی طرح حیران رہ گیا بلکہ اشتیاق کا شعلہ ایسا بھڑکا کہ مہمان نے عہد و پیمان

کو وہیں طاق پر رکھا اور مروت کے گھر کو آگ لگا دی۔ چونکہ راجہ کا اقبال منہ پھیر چکا تھا اور قید ہو کر دلی کا آب و دانہ کھانا تھا۔ تدبیر کی کوتاہی اور تقدیر کا پیچ ایسا پڑا کہ رانی تو نہ ہاتھ آئی مگر راجہ بے چارہ پھندے میں پھنس گیا۔ گھر اور گھرانا ویران ہو گیا اور رفیق یگانے جنگل پہاڑ میں پریشان ہو گئے۔ بادشاہ اسے دلی میں لے آیا اور یہاں آ کر پھر تشدد کیا کہ رانی کو منگا دو۔ قید بری بلا ہوتی ہے۔ ناچار بچارے نے منظور کر لیا اور جو جو قول کے پورے پہاڑوں میں اڑے بیٹھے تھے انہیں کہلا بھیجا۔ وہ سب سن کر پہلے بہت روئے اور کہا کہ خدا جانے راجہ کو کیا ہو گیا۔ راجپوت کا نام ڈبو دیا۔ پھر تجویز یہ ٹھہرائی کہ یہاں سے راجہ کے لئے مٹھائی اکثر جایا کرتی ہے اس میں زہر ملا کر بھیج دو کہ کام اس کا تمام ہو جائے اور ننگ و نام کے دامن پر داغ نہ آئے۔

راجہ کی ایک بیٹی بڑی عقلمند تھی۔ اس نے خاندان کے بزرگوں اور لشکر کے سرداروں کو جمع کیا اور کہا کہ اگر تم سب کے خیال میں آئے تو میری عقل میں ایک بات آئی ہے کہ خاندان کی بھی لاج رہ جائے اور راجہ کی جان پر بھی آنچ نہ آئے۔ صورت اس کی یہ ہے کہ یہی ٹوٹے پھوٹے نمک حلال جو ساتھ ہیں انہیں جمع کرو اور کہو کہ بھائیو! شرافت اور نمک کا حق ایک وقت پر دیکھا جاتا ہے۔ آج ایسا موقع آن پڑا ہے کہ جان سے گزر کر تمہارے راجہ کے ننگ و ناموس پر آن بنی ہے لیکن تم اگر ہمت کرو تو دونوں بچ جاتے ہیں اور تمہارے لئے بھی دو انجام ہیں کہ دونوں میں جیت تمہاری ہے، یعنی آقا کو چھڑا لائے تو ملک و دولت تمہارا ہی مال ہے اور اگر مارے گئے تو نام تمہارے زمانے کے چہرے پر جواں مردی کا ٹیکہ ہو کر چمکیں گے۔ تدبیر اس کی یہ ہے کہ بہت سے سپاہی زنانے کپڑے پہن لو اور سلاح جنگ سنبھال کر پالکیوں میں بیٹھ جاؤ۔ مشہور یہ کرو کہ راجہ کا حکم آیا ہے اس لئے سب رانیاں دلی چلی ہیں۔ جب شہر کے پاس جاؤ تو ایسے موقع سے پہنچو کہ رات کو شہر میں داخل ہو۔ شہر میں گھستے ہی سیدھے قلعہ کا رخ کرو۔ اس وقت جان جوکھوں کے ساتھ پھرتی کا کام ہے کہ تلواریں سونت سونت کر قید خانے پر گر پڑو۔ مگر ایک گھوڑا بھی کسا کسایا ساتھ ہو کہ جس کا دم سو کوس سے کم نہ ہو۔ راجہ کو لو اور گھوڑے

پر چڑھا ہوا ہو جاؤ۔

سب نے اس کی رائے کو پسند کیا۔ سولہ سو سورما اور من چلے بہادر جنھوں نے عمریں دھاووں اور مار دھاڑوں میں گزاری تھیں، ڈولیوں میں بیٹھ کر روانہ ہوئے اور کہا کہ راجہ نے بلایا ہے۔ رانی جی سارے کنبے سمیت دلی چلی ہیں۔ بادشاہ نے یہ خبر سن کر ادھر راجہ کی قید ہلکی کر دی، ادھر رستے کے حاکموں کو لکھ بھیجا کہ حفاظت کے ساتھ کل سامان اور بار برداری ذمہ اپنا سمجھو اور کمال عزت اور احتیاط کے ساتھ اپنی حد سے نکال کر دوسرے کے سپرد کر دو۔ الغرض منزل بہ منزل سواریاں چلی جاتی تھیں۔ ہر پڑاؤ، ہر سرائے پر خیمے قناتیں کھڑی ہوتی تھیں۔ جگہ جگہ کے حاکم خود آن کر اہتمام کرتے تھے۔ اندر سے عورتیں نکلتی تھیں اور جو جو ضرورت ہوتی تھی لے جاتی تھیں۔ غیر صورت کا پرندہ تک قنات کے پاس نہ پھٹکنے پاتا تھا۔ اس طرح وہ پردہ نشین قافلہ دلی کے پاس پہنچا۔ جب شہر دو کوچ رہا تو دو منزلہ کر کے دفعتہً رات ہی کو شہر میں داخل ہو گئے۔ غل پڑ گیا کہ رانی پدمنی کی سواری آ گئی۔ مگر پالکیاں قلعے کے نیچے پہنچتے ہی سارے راجپوت تلواریں گھسیٹ، ڈولیوں اور پالکیوں سے کود، بجلی کی طرح قید خانے پر جا گرے جو سامنے آیا سے مار گرایا اور راجہ کا طوق زنجیر توڑ گھوڑے پر چڑھا۔ راجہ بھی اس طرح نکلا جیسے جنگلی طوطا جال سے نکلے رستے میں کچھ سوار ٹھہرے ہوئے تھے، سب نے گھوڑے چمکائے اور پارے کی طرح اڑ گئے۔

یہاں بادشاہ خوش بیٹھا تھا جو یکایک غل اٹھا۔ کسی نے کہا چنگیزی مغل آئے۔ کسی نے کہا ڈاکہ پڑا۔ اتنے میں خبر پہنچی کہ کل جو رانی کے آنے کی ہوائی اڑی تھی وہ فقط بہانا تھا مطلب راجہ کا لے جانا تھے۔ کئی سو راجپوت آئے اور سپاہیانہ پیچ کھیل کر اپنے راجہ کو نکال لے گئے۔ یہ سنتے ہی بادشاہ کے ہوش اڑ گئے، حکم دیا کہ پر لگاؤ اڑ کر جاؤ، جس طرح ہو اسے پکڑ لاؤ، غول کے غول سواروں کے گئے۔ کئی جگہ تلوار بھی چلی، مگر راجہ لڑتا بھڑتا پہاڑوں میں گھس اپنے ٹھکانے جا ہی پہنچا۔ کوئی دن وہاں بیٹھ کر ہاتھ پاؤں سنبھالے۔ چند روز کے بعد پھر گھر یاد آیا۔ پرچے پیغام دوڑانے شروع کیے۔ باپ دادا

کی رعیت کو پھیر لینا کتنی بڑی بات تھی آیا اور ملک پر قابض ہو گیا۔

یہاں بادشاہ کے دل کو قرار کہاں تھا۔ ایک تو آیا ہوا ملک ہاتھ سے گیا دوسرے راجہ اس طرح ڈنکے کی چوٹ قلعے میں سے نکل گیا اور سب سے زیادہ یہ کہ پدمنی کی لگن لگی ہوئی تھی۔ غرض پھر فوج لے کر آپ پہنچا اور جاتے ہی چاروں طرف سر شیر کو گھیر لیا۔

راجہ نے بھی باہر نکل کر خوب خوب مقابلے کئے۔ جان ہاروں نے ملک کے نام پر جانیں قربان کیں، مگر کہاں تمام ہندوستان کا تاجدار کہاں چتوڑ کا باج گزار جوان بیٹے آنکھوں کے سامنے مارے گئے۔ بڑے بڑے سردار کٹ گئے۔ جب سب طرح سے آس ٹوٹ گئی تو ایک بیٹا باقی تھا اسے بلا کر کہا کہ اے فرزند جو کچھ یہاں ہم پر گزرے گی آثار اس کے نمودار ہیں اب بہتر یہی ہے کہ تم یہاں سے کسی طرف کو نکل جاؤ کہ نسل تو قائم رہے۔ بعد اس کے پدمنی کو سامنے بلایا اور دیکھ کر آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔ ہر چند کہ وہ عورت تھی مگر بڑی رمز شناس تھی۔ اس نے اسی وقت صندل کی لکڑیاں منگا کر سات چتائیں چنوائیں۔ تمام خاندان کی عورتیں اور بڑے بڑے ٹھاکروں اور سرداروں کی بیبیاں جو خاوند اور خاندان کے نام کے آگے جان کو کچھ مال نہ سمجھتی تھیں، سب آئیں۔ سر سے پاؤں تک چادریں اوڑھے گھونگھٹ نکلے، پھولوں کی ایک ایک مالا گلے میں، رام رام کی سمرن کرتی چتاؤں کے گرد کھڑی ہوئیں اور خلقت کا ہجوم ہو گیا۔

جس وقت چتاؤں کو آگ دی اور شعلے بلند ہوئے، دلوں سے دھوئیں اور خلائق سے ایک غل اٹھا۔ ہر ستونتی لاج کی ماری ایک ایک سے آگے بڑھتی تھی۔ اپنی آبرو اور مردوں کی فتح کی دعا کرتی تھی اور پروانے کی طرح اس بھڑکتی آگ پر گر کر آن کی آن میں جل مرتی تھی۔

جب اس ہمت مردانہ سے کہ جس پر ہزار جواں مردوں کو صدقہ کر ڈالئے، عورتوں نے یہ ساکھا کیا تو سب کا دل زندگی سے بیزار ہو گیا۔ راجہ رہے سہے رفیقوں کو لے کر اول قلعے کے میدان میں کھڑا ہوا۔ دل غم سے پانی پانی تھا اور نگاہوں سے خون ٹپکتا تھا مگر نہ آنکھ سے آنسو نکلتا تھا نہ منہ سے بات نکلتی تھی۔ بھائی بھائی سے اور باپ بیٹے سے

رخصت ہوا۔ سب سے آگے راجہ اور پیچھے تمام جان نثار جن میں سپاہی اور سردار، سب برابر ہو رہے تھے۔ قلعے سے باگیں اٹھائے نکلے اور ان گنتی کی جانوں کو گٹھڑی کر کے لشکر شاہی کے دریا میں دے مارا۔ اگرچہ دیکھنے والوں کے نزدیک ان کی وہ حالت ہوئی کہ کوئی ایک مٹھی خاک کی طوفان نوح میں پھینک دے مگر اہل نظر جانتے ہیں کہ جب تک چاند سورج باقی ہیں ان مردوں کے نام آسمان مردانگی پر آفتاب مہتاب ہو کر چمکیں گے۔

جب میدان جنگ کا اس طرح خاتمہ ہوا تو بادشاہ فوراً قلعے میں پہنچا اور جاتے پوچھا کہ پدمنی کا محل کون سا ہے۔ چند عورتیں ایک راکھ کے ڈھیر پر کھڑی رو رہی تھیں، انہوں نے ایک مٹھی خاکستر اڑا کر دکھائی اور چیخیں مار مار کر رونے لگیں۔ اس وقت بادشاہ سے سوائے اس کے اور کیا ہو سکتا تھا کہ افسوس کرتا ہوا نکل آیا اور دارالخلافہ کو مراجعت کی۔

خضر خاں اور دیول دیوی

اگرچہ علاؤ الدین بادشاہ کے محلوں میں کولا دیوی بادشاہ بیگم تھی، دنیا کی نعمتیں موجود اور عیش و عشرت کا گلشن ہمیشہ بہار پر تھا، مگر کولا دیوی کے دل کا کنول کملایا ہی رہتا تھا۔ بادشاہ پوچھتا تو کچھ بتاتی نہ تھی۔ اتفاقاً چند روز کے بعد بادشاہ نے پھر دکن پر فوج کشی کا حکم دیا اور کولا دیوی نے بھی سنا۔ جب بادشاہ محل میں آئے تو عرض کی کہ جہاں پناہ حضور کے اقبال سے آج میں ملک ہندوستان کی ملکہ ہوں اور جدھر دیکھتی ہوں مرادوں کا چمن لہلہا رہا ہے مگر ایک کانٹا غم کا ہے کہ دل میں کھٹکتا ہے۔ چونکہ اس کے نکالنے میں ملکوں کی تباہی اور ہزاروں بندگان خدا کا خون بہتا نظر آتا تھا اس لئے کہنے کو جی نہ چاہتا تھا۔ اب یہ صورت خدا ساز پیش آئی ہے اس لئے عرض کرتی ہوں کہ جب میں راجہ کرن کے محلوں میں راج کرتی تھی تو خدا نے دو بیٹیاں عنایت کی تھیں کہ ہر ایک حسن و جمال کے سانچے میں پتلی کی طرح ڈھلی تھی۔ ایک تو خورد سال ہی مر گئی تھی۔ دوسری جس کا دیول دیوی نام ہے زندہ و سلامت موجود ہے۔ آتما کی آنچ سے دل سینے میں مچھلی کی طرح تڑپتا ہے۔ اگر وہ کسی طرح صحیح و سلامت آئے تو آنکھوں کو سکھ کلیجے کو ٹھنڈک آ جائے۔ بادشاہ نے کہا یہ کتنی بڑی بات ہے۔ اسی وقت سپہ سالاروں کے نام حکم بھیجا کہ راجہ کرن جو ملک دکن میں آوارہ ہے اسے دیول دیوی کے لئے پیغام بھیجو اور خواہ صلح خواہ لڑائی جس طرح ہو لے کر اس طرف روانہ کرو۔

طرفہ ماجرا یہ ہوا کہ جب یہ ذکر ہو رہا تھا تو خضر خاں بادشاہ کا بیٹا بھی حاضر تھا۔ اس کے حسن و جمال کی تعریف سن کر دل میں عشق غائبانہ کے نور نے ایسا جلوہ دکھایا کہ

ایک جان سے ہزار جان عاشق ہو گیا۔ وہاں تو مارے شرم کے کچھ نہ کہہ سکا مگر سپہ سالاروں کو خود ایک خط روانہ کیا۔ جب انہوں نے فرمان شاہی کے ساتھ ولی عہد کا خط بھی دیکھا تو ایک کہ جگہ وہ چند خیال ہو گیا۔ یلغار کرتے ہوئے اڑے اور دکن کی حد میں پہنچتے ہی فوج کے دو حصے ہو کر راجہ کرن پر گرے۔ اس نے بھی دو مہینے تک دونوں طرف خوب میدان کئے۔ اتفاق تقدیر کا دیکھو کہ دیو گڈھ کے راجہ کا بیٹا بھی دیول دیوی پر عاشق تھا مگر وہ قوم کا مرہٹا تھا اور راجہ کرن کہ اصل راجپوت تھا اسے مرہٹا ذات کا بٹیا سمجھ کر بٹی دینے کو راضی نہ ہوتا تھا۔ اب جو فوج شاہی سے یہ معاملہ آن پڑا تو اس نے بھی سب خبریں سنیں۔ بھیم دیو نے اپنے چھوٹے بھائی کو تحفہ تحائف دے کر پیغام بھیجا کہ ترکوں اور ہندوؤں میں جو دن رات کا فرق ہے آپ پر ظاہر ہے۔ اگر اب بھی شفقت بزرگانہ سے آپ فرزندی میں قبول فرمائیں تو ان ترکوں کی ترکی تمام کو دینی کچھ بڑی بات نہیں۔ راجہ کرن ایسے نازک وقت میں مصلحت یہی سمجھا کہ فوراً دیول دیوی کو اس کے ساتھ دیو گڈھ کو بھیج دیا۔ ادھر بادشاہی لشکر میں خبردار نے خبر پہنچائی کہ پری کو دیو لے اڑا۔ سپہ سالار نے اسی وقت سرداروں کو جمع کر کے کہا کہ اگر دیول دیوی ہاتھ سے گئی تو پھر یہ منہ دربار کے دکھانے کے قابل نہ رہے گا۔ آج ہمت کے بازوؤں میں جتنا زور ہے سب لگا دو اور دیول دیوی کو جانے نہ دو۔ سب نے اس رائے پر اتفاق کیا۔ اسی وقت تین تین دن کا کھانا پانی کمروں سے باندھ جانوں سے ہاتھ دھو پہاڑ میں گھسے۔ نہ دن دیکھا نہ رات۔ تیسرے دن نور کا تڑکا تھا اور راجہ کا لشکر ابھی بستروں پر تھا کہ ترکی اور تازی گھوڑوں کا ہنہنانے کی آوازیں کانوں میں پہنچیں۔ راجپوت بھی جس حال میں تھے ایسے چمک کر اٹھے جیسے پتھر سے شرارہ یا سپند اور انگارہ اگاڑی پچھاڑی تلواروں سے کاٹ ننگی پیٹھوں پر چڑھ بیٹھے۔ پیادے کو ہوش نہ تھا کہ ہاتھ میں تلوار ہے یا کٹار ہے۔ سوار کو خبر نہ تھی کہ سیدھا ہے یا الٹا، گھوڑے پر سوار ہے۔ غرض کہ صبح سے لے کر تین پہر تک برابر تلوار چلی۔ کیا ترک، کیا راجپوت دونوں ہار گئے مگر ولایتی شمشیروں نے راجپوتی کھانڈوں کے منہ پھیر دیے۔ راجہ کرن نے سیدھا دیو

گڈھ کا رخ کیا۔ فتح یابوں نے سکڑوں ہاتھی ہزاروں گھوڑے لاکھوں کے خزانے اور جواہرات لوٹے مگر وہ گوہر شب چراغ نہ ہاتھ آیا جس کے لئے رانی کے محل اور ولی عہد کی آنکھوں میں دنیا اندھیر تھی۔ جان نثار سپہ سالار کو بادشاہ کے حکم اور ولی عہد کی بات کا خیال تھا۔ جب دیول دیوی کو نہ پایا بہت گھبرایا۔ ٹھہرنا مناسب نہ جانا۔ جنگل اور پہاڑ میں برابر تین دن تک بجلی کی طرح کڑکتا اور بادل کی طرح برستا چلا گیا۔ جب دیوگڈھ ایک دن کے رستے پر رہا تو ایک تالاب نظر آیا۔ اور نا امید ہو کر کنارے اتر پڑا۔

اتفاقاً فوج کے جوان جوان بہادر جمع ہو کر سپہ سالار کے پاس آئے اور کہا کہ تقدیر سے یہاں آنا ہو گیا ہے نہیں تو ہم کجا؟ اور یہ جنگل پہاڑ کجا؟ دنیا دیکھنے کے لئے ہے آخر مر جانا ہے۔ پہلو میں کوہ الورا کے قدیمی غار ہیں اور ان میں کسی زمانے کی عمارتیں ہیں جن کی دستکاریاں دیکھ کر صنعت الٰہی یاد آتی ہے۔ اگر اجازت ہو تو جا کر دیکھ آئیں۔ سپہ سالار نے کہا جاؤ مگر دائیں بائیں سے ذرا ہوشیار جانا کہ دشمن کا گھر ہے اور ہر قدم پر خطر ہے۔ غرض چند سردار اور کئی سو آدمی لشکر سے گئے۔ اب قدرت الٰہی کا تماشا دیکھو کہ یہ سب ہنستے بولتے آگے پیچھے چلے جاتے تھے جو یکایک سامنے کچھ سوار نظر آئے۔ یہ گھبرائے کہ شاید دشمن دیوگڈھ سے مدد لے کر پھر پلٹا۔ چنانچہ اپنی جمعیت کو ترتیب دیا اور سب سنبھل کر دفعتہً جا پڑے۔ ان بیچاروں کی حقیقت کیا تھی۔ ایک حملے میں تتر بتر ہو گئے۔ ادھر سے انہوں نے نوچ کھسوٹ مار دھاڑ شروع کر دی۔ ایک سپاہی کو چنیں نظر آئی کہ کہار رکھ کر بھاگ گئے ہیں اور چند مرہٹیں ہتھیار بند آس پاس کھڑی ہیں۔ یہ للکار کر پہنچا اور تلوار کھینچ کر کہا کہ نکل آ اور نکال جو کچھ پاس ہے۔ ایک لونڈی گھبرا کر چلائی کہ خبردار ہاتھ نہ اٹھانا۔ جس کے لئے ہزاروں آدمی کے لہو پانی ہو کر بہہ گئے وہ گوہر مقصود اسی میں ہے۔ یعنی دیول دیوی کا سکھ پال ہے۔ یہ سنتے ہی سب دوڑے آئے اور ہاتھوں ہاتھ سکھ پال اٹھا، سپہ سالار کی خدمت میں لا حاضر کیا۔ اسی وقت ایک عرضی بادشاہ کو دوسری مبارکباد ولی عہد کو لکھ کر گھڑ بہل میں دیوی کو بٹھایا اور ایک دستہ دو سپہ سواروں کا ساتھ کر کے کمال حفاظت کے ساتھ دلی کو روانہ کر دیا۔ سواروں کو تاب کہاں

تھی، منزل کو دو منزلہ اور دو منزلہ کو سہ منزلہ کرتے، دوڑا دوڑ اور بھاگا بھاگ اس طرح آئے گویا قلعے کے نیچے ہی کھڑے تھے۔ بادشاہ یہاں بے خبر محلوں میں بیٹھے تھے۔ شاہزادہ منہ لپیٹے چھپر کھٹ میں پڑا تھا یوتو پرچہ نویسوں کی تحریر سے معلوم ہوا تھا کہ فتح ہو گئی ہے مگر راجہ نے دیول دیوی کو دیوگڈھ بھیج دیا ہے۔ یا دفعتہً اڑدا بیگنی نے خبر دی کہ قبلہ عالم رانی جی کا سکھ پال خاص ڈیوڑھی پر دھرا ہے۔ بادشاہ مارے خوشی کے باغ باغ ہو گیا۔ اسی وقت سر سے شال کھول اس کے سر پر ڈال دی۔ ولی عہد چھپر کھٹ میں پڑا تھا۔ وزیر زادہ دوڑا آیا اور کہا کہ لو میاں پروانے اٹھو تمہاری شمع نے آ کر محل کو روشن کر دیا۔ سنتے ہی حیران ہو گیا۔ جب وزیر زادے نے قسم کھا کر کہا تو اٹھ کر اس کی پیشانی چوم لی اور کلاہ جواہر نگر جس پر ہما کے پروں کی کلغی لگی تھی تکیے پر سے اٹھا، اس کے سر پر رکھ دی۔ ماں بے اختیار ہو کر دوڑی۔ بیٹی کو اتروایا اور دیر تک گلے لگا کر روئی۔ بعد اس کے اندر لا کر مسند پر بٹھایا مگر منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔ گویا دو چینی کی عورتیں تھیں کہ آمنے سامنے دھری تھیں۔ ہاں آنسوؤں کے تار جاری تھے اور دلوں پر ہزاروں خیال گزر رہے تھے کہ کیا تھا اور کیا ہو گیا۔

غرض تھوڑی دیر کے بعد ماں بیٹی میں کچھ باتیں ہو کر دیول دیوی کو غسل کروایا۔ محل کی ساری بیبیوں نے آ کر مبارک باد دی۔ مگر اب ولی عہد کو تاب کہاں تھی؟ باپ سے کچھ نہ کہہ سکا۔ وزیر کے پاس پیغام دوڑانے شروع کیے۔ وزیر نے بادشاہ سے عرض کی۔ بادشاہ نے کہا کہ میں کیا کہوں، اس لڑکی کے ماں باپ کو کچھ مجبورانی ہے۔ اس سے پوچھنا چاہیے۔ رانی پہلے تو بہت حیران ہوئی اور کہا کہ مسلمانوں کا یہ نرالا دستور ہے۔ بھلا میں حضور کی خدمت میں، تو میری بیٹی حضور کے بیٹے سے کیونکر منسوب ہو سکتی ہے؟ بادشاہ ہنسے اور کہا کہ یہ مسئلہ شریعت کا ہے۔ جب ان دونوں کے باپ جدا جدا ہیں، ماں جدا جدا ہیں، تو پھر شادی کا کیا مضائقہ ہے۔ رانی کو کیا عذر تھا، وہ راضی ہو گئی۔ غرض تجویز یہ ٹھہری کہ وزیر دلہن کا باپ بنے دولہا برات لے کر اس کے گھر جائے اور رسم شاہانہ سے دلہن بیاہ لائے۔ اسی وقت تمام شہر میں آئینہ بندی کا حکم ہو گیا۔ نوبت

خانے پر نکور پڑی۔ گھر گھر میں طبلہ کھڑکنے لگا۔ بادشاہی باورچی خانے گرم ہو گئے اور حکم ہوا کہ چالیس دن تک کسی گھر میں کھانے پکانے کا دھواں نہ اٹھے۔ اسی طرح شبھ لگن مبارک ساعت دیکھ کر صبح ہوتے گل کا بلبل سے عقد ہوا اور دن کو دلہن بیاہ لائے۔ ان دونوں کا عشق ایسا عالم آشوب ہوا کہ ہندی فارسی کے شاعروں نے قصے جوڑے اور کہانیاں بنائیں۔ سینکڑوں برس گزرے اب تک لوگ ان کی گیت گاتے ہیں۔

ظہیر الدین بابر بادشاہ

کہتے ہیں کہ ملک فرغانہ میں عمر شیخ نام ایک بادشاہ تھا۔ جو چوتھی پشت میں امیر تیمور کا پوتا تھا۔ قضائے الٰہی سے دفعتہً مر گیا۔ بابر اس کا بیٹا بارہ برس کا تھا۔ باپ کے مرنے سے تخت و تاراج کا بر یکبار سر پر آ پڑ ۔ اگرچہ تخت نے پاؤں چومے اور تاج سر پر قربان ہوا مگر چچا اور ماموں، بھائی اور ہمشیر کی یادگار سے شمشیر کے ساتھ پیش آئے اور جب خورد سال بادشاہ کی ہوا بگڑی دیکھی تو اندر باہر بہت سے دشمن کھڑے ہو گئے۔ یہ ہمت والا سب کو جواب دیتا رہا۔ بہت دفعہ گرا اور بہت دفعہ سنبھلا، مگر جب شیبانی نام ایک ازبک دشت قبچاق سے اٹھ کر تمام بخارا اور سمرقند پر چھا گیا اور باپ کے ملک میں نمک حرام نوکروں نے دم نہ لینے دیا تو اس کی بھی آس ٹوٹ گئی۔ چنانچہ آخری مصیبت کی کہانی یہ ہے کہ جب میدان جنگ کو چھوڑا تو بیس آدمی اس کے ہمراہ تھے۔ دشمن کے سوار پیچھے تھے اور یہ گھوڑے مارے چلے جاتے تھے۔ جب پھر کر دیکھتے ان کا غبار پیچھے ہی دکھائی دیتا۔ ناچار پھر بھاگ نکلتے۔ آخر گھوڑوں کے دم ٹوٹنے لگے اور نوبت یہ ہوئی کہ جس باوفا کے گھوڑے میں ذرا دم ہوتا وہ اپنا گھوڑا نہیں دے دیتا اور ان کی گرد کو حسرت کی نگاہ سے دیکھتا ہوا رستے سے کٹ کر کسی گاؤں میں چلا جاتا۔ اخیر کو ایک بابر اور ایک اس کا کوکہ 5 رہ گیا۔ جب چلتے چلتے اس کا گھوڑا بھی ہار گیا تو بابر نے بھی اپنی لگام روکی۔ اس نے کہا کہ آپ میرا ساتھ کیوں دیتے ہیں۔ آگے بڑھ جائیے۔ شاید آپ کی جان بچ جائے۔ بابر نے آبدیدہ ہو کر کہا کہ تجھے اس حال میں چھوڑ کر کہاں جاؤں۔ ایک بچھونے میں پرورش پائی اچھا ہے کہ دونوں کے مردے بھی ایک ہی جگہ

پڑے پائیں۔ غرض کہ کوکہ دعا دے کر رخصت ہوا اور بابر آگے چلا۔ تھوڑی ہی دور گیا تھا جو دو سوار پیچھے نظر آئے مگر ان کے گھوڑوں میں بھی جان نہ رہی تھی۔ جب وہ تیر کی زد پر پہنچے تو سامنے پہاڑ تھا۔ بابر نے چاہا کہ تیر مارتا ہوا اوپر چڑھ جائے۔ ترکش کی طرف دیکھا تو انیس تیر تھے۔ دل قوی ہو گیا اور آگے بڑھا۔ جب آفتاب غروب ہونے لگا تو انہوں نے آواز دی کہ اس طرح آپ کہاں تک جائیں گے۔ بھائی تو پکڑے گئے آپ بھی چلے آئیے۔ یہ سن کر بہت فکر ہوا مگر جواب کچھ نہ دیا اور آگے بڑھے گیا۔ وہ بھی گھوڑوں سے اتر لئے اور اب عذر خواہی کے طور پر کچھ کچھ سمجھاتے ہوئے چلے کہ پھر چلنا مناسب ہے۔ بابر نے کہا کہ پھرنا تو اب ممکن نہیں لیکن تم اگر خدمت کرنی چاہو تو البتہ یہ ایسا وقت ہے کہ عمر بھر نہ پاؤ گے۔ بات فقط اتنی ہے کہ مجھے ایسے رستے پر ڈال دو جہاں سے میں اپنے ماموؤں میں جا پہنچوں اور تمہیں وہ کچھ دوں کہ تمہاری آرزو سے زیادہ ہو۔ اگر یہ نہیں تو جس رستے آئے ہو پھر جاؤ۔ جو میری قسمت میں ہونا ہے ہو رہے گا۔ انہوں نے کہا کہ اس طرح آپ کو چھوڑ کہاں جائیں کاش کہ ہم نہ آتے۔ خیر ادھر آپ نہیں چلتے تو جہاں چلئے ہم خدمت کو حاضر ہیں۔ چنانچہ قسمیں کھا کر ساتھ ہو لئے مگر اس نے انہیں آگے رکھا اور آپ پیچھے ہوا۔ جب نکاس کی جگہ پر پہنچے تو نابکاروں نے دھوکہ دیا اور اندھیرے میں کہیں کے کہیں لے کر نکل گئے۔ غرض رات بھر پہاڑوں میں ٹکراتے ٹھوکریں کھاتے پچھلا پہرا تھا جو ایک آبادی کے پاس پہنچے۔ تینوں تھک کر چور ہو گئے تھے اور جاڑا ابھی سخت تھا۔ بابر وہاں ٹھہرا اور ان سے کہا کہ صبح قریب ہے۔ کسی ایسے ویران گوشے میں چل کر دن گزارو جہاں کوئی ہمارے حال سے خبردار نہ ہو۔ ایک بولا کہ گھوڑے، آٹھ پہر سے بھوکے ہیں میں دانہ تو لاؤں یہ کہا اور گاؤں میں چلا گیا۔ یہاں صبح ہوتی تھی اور بابر کا رنگ فق ہوتا تھا۔ جب دن نکلا تو فقط تین روٹیاں ہاتھ میں لئے آیا۔ انہوں نے گھبرا کر ایک ایک روٹی بغل میں رکھ لی اور ایک پشتے پر چڑھے کہ اس کے پیچھے دن گزار دیں۔ سر سبز زمین میں گھوڑے چھوڑ دیے اور تینوں تین پشتوں پر بیٹھ کر پہرا دینے لگا۔ بابر دور سے لوگوں کو آتا جاتا دیکھتا تھا مگر وہم کے مارے

کسی کے بلانے کو جی نہ چاہتا تھا۔ شام ہوئی تو انہوں نے صلاح دی کہ شہر میں ایک باغ سب سے الگ ہے، اس میں چل بیٹھیں تو بہتر ہے۔ چنانچہ وہاں جا کر ایک ٹوٹا سا مکان پڑا تھا وہیں بیٹھ گئے۔ ایک ان میں سے گیا۔ پرانا سا پوستین اور ارزن[6] کی آتش[7] لا یا اگرچہ گلے میں اٹکتی تھی اور منہ کو کڑوی لگتی تھی مگر خوب گرم گرم تھی، وہ پی کر اور پوستین اوڑھ کر عجب لطف حاصل ہوا۔ لکڑیاں جلا کر سینکنے لگے اور بابر درخت سے کمر لگا کر ذرا سو گیا۔

حقیقت میں ان بدذاتوں نے گاؤں کے ملک[8] سے سازش کر کے اسے غنیم کے بھیج دیا تھا۔ یہاں اس کی خاطر جمع کر کے بیٹھنے کی صلاح دی اور آپ کوٹھے پر جا کر پہرا دینے لگے۔ دفعۃً ایک آیا اور کہا کہ فلاں سردار آتا ہے۔ بابر بہت گھبرایا اور کہا جا کر دیکھو تو سہی یوں ہی آیا ہے یا میرے سراغ پر آیا ہے۔ وہ گیا اور آ کر کہا کہ آپ ہی کے پاس آیا ہے۔ پوچھا کس ارادے سے؟ کہا کہ آپ کے نوکر ہیں ارادہ کیا کریں گے۔ لے جائیں گے بادشاہ بنائیں گے، آپ ڈریئے نہیں۔ اتنے میں وہ آیا۔ تسلیم کر کے بیٹھ گیا اور ایسی باتیں سنائیں کہ بابر کو تردد ہوا۔ مگر پھر بھی اپنے تئیں سنبھالا اور اس سے کہا کہ مرنے سے تو میں نہیں ڈرتا مگر تجھے خدا کی قسم سچ کہہ اگر کچھ اور صورت ہو تو میں وضو کروں کہ آخیر وقت خدا کے سامنے باطہارت تو جاؤں۔ سردار مذکور نے بار بار قسمیں کھائیں۔ تب بابر نے اسے بٹھایا اور آپ اٹھ کر باغ کے کونے کی طرف گیا۔ دل میں کہا کہ مرنا تو برحق ہے۔ مگر ہاتھ پاؤں چلتے ہیں تو انہیں ہلانا چاہیے۔ اسی وقت دیوار پھاند سیدھا بیابان کا رستہ لیا اور خراسان کی طرف رخ کیا۔ آبادی سے بچتا اور رستے سے کتنا چلا جاتا تھا۔ رات ہوتی تو درخت کے نیچے پڑ رہتا تھا۔ صبح کو چل کھڑا ہوتا۔ پہلی منزل میں بغل کی روٹی نے رفاقت کی۔ دوسری میں جنگل کے گھاس پات نے ضیافت کی۔ تیسرے دن ایک گاؤں میں پہنچا اور توکل بخدا اندر داخل ہوا۔ اتفاقاً وہاں کسی زمانے کے اپنے چند نوکر بھی آئے ہوئے پڑے تھے۔ سب نے آ کر قدم لئے اور لوگوں کو خبر کی۔ پہاڑی نیک نیت بڑی محبت اور مہمان نوازی سے پیش آئے۔ غرض

یہاں بیٹھ کر دم لیا کپڑے دھلوا کر پہنے اور یہ پہلی دفعہ تھی کہ چہرے پر خط نے اصلاح پائی۔ چنانچہ اسی وقت اپنی توزک میں تحریر کیا۔ چند آدمیوں کو ادھر ادھر بھیجا کہ جو اور نمک خوار کھنڈے ہوئے ملیں انہیں سمیٹیں۔ ماں تباہی زدہ بھی اس طرف آ نکلی تھی۔ چنانچہ جب دو سو آدمی سے زیادہ جمع ہو گیا اور اس چھوٹے سے گاؤں میں گنجائش نہ رہی تو دل نے کہا کہ جس مٹی میں کھیل کود بڑا ہوا، اب قسمت کا آب و دانہ وہاں نہیں۔ مصلحت یہی ہے کہ پانچ پشت کی میراث سے ہاتھ اٹھا کر باپ دادا کے ملک کو خدا حافظ کہو اور اپنی قسمت جیحوں پار چل کر آزماؤ۔ اس وقت اپنی عمر ۲۳ برس کی تھی اور ان مصیبتوں کی عمر ۱۱ برس ہوئی تھی۔ مگر وزن کرو تو عمروں کے لئے بہت ہیں۔ غرض ہزار جر ثقیل سے کابل کو روانہ ہوا۔ فوج کی جمعیت دیکھو تو جیسے لٹا بنجارا، شمار میں دو سو سے زیادہ مگر سب پیادے۔ ٹوٹے پھوٹے موزے گھٹنوں تک چڑھے، کندھوں پر لاٹھیاں، سامان میں دو چار در خیمے تھے کہ ایک میں اماں اترتی تھی ایک کے نیچے آپ بیٹھ رہا کرتا تھا۔

کابل میں اس کے چچا کو مار کر اور رشتہ داروں کو اندھا کر کے خسرو نام ایک نمک حرام وزیر خسرو شاہ بن بیٹھا تھا۔ جب بابر پہنچا تو اس کا نام سنتے ہی تمام ولایت میں غلغلہ ہو گیا اور لوگ اٹھ اٹھ کر آنے لگے۔ بلخ کی حد سے آگے بڑھے تو یہ عالم ہوا کہ خسرو کا دربار ٹوٹنے لگا۔ آخر اس نے بہت عذر و معذرت کے ساتھ پیغام بھیجا کہ ملک حضور کا اور حضور کے بزرگوں کا ہے۔ میری جاں بخشی اور اسباب ضروری کی اجازت ہو جائے۔ چنانچہ وہ ادھر سے سامان شاہی کے ساتھ آیا۔ یہ اپنے قلندروں کے ساتھ جہاں اترے تھے وہاں سے اٹھ کر ایک چنار کے درخت کے نیچے جا بیٹھے۔ خسرو خود پیشکش لے کر حاضر ہوا اور قدیمانہ طور سے آداب و تسلیمات کے ساتھ نذرانہ پیش کیا۔ وہ تو نذر دے کے رخصت ہوا اور یہ اٹھ کر اپنے خیمے میں آئے مگر اسی وقت سب خورد وکلاں اس طرح اٹھ کر اس کے لشکر میں آ گئے گویا ادھر کی دنیا ادھر ہو گئی۔ بڈھا وزیر جو برسوں سے لڑکوں کی اتالیقی میں بادشاہی کرتا تھا، اکیلا رہ گیا اور یہ یا تو ان حالوں سے آیا تھا یا بیس تیس ہزار لشکر مسلح سے بنے بنائے دربار میں بادشاہ افغانستان بن کر بیٹھ

گیا۔ غرض منزل بہ منزل کابل پر آئے۔ حاکم وہاں کا ایک دو دن اٹکا پر اب وزرا ان کا ستارہ بھی چمک گیا تھا، معافی کے وعدہ پر شہر خالی کروالیا۔ قلعے میں آ کر دوبارہ کیا۔ ضلع ضلع کے سردار حاضر ہوئے، مگر خزانے اور توشہ کانے سب خالی پڑے تھے۔ فقط دلاسا اور تسلی دے کر سب کو رخصت کیا اور سلطنت کے کاروبار جاری کر دیے۔

اب گویا تاتاری خانہ برباد کو افغانستان میں گھر ملا۔ نہیں۔ نصیب کی گردشوں نے نقل مکان کیا کیونکہ ادھر ترکوں اور مغلوں کی مصیبت تھی ادھر افغانوں کی آفت سامنے ہوئی۔ اپنی کوئی جمعیت ساتھ نہ تھی جس پر بھروسہ ہو۔ بھائی قوت بازو تھا تو وہ تھا کہ برسوں غنیم کے ساتھ رہ کر منہ پر تلواریں مار چکا تھا۔ وطن سے تو کچھ واسطہ ہی نہ تھا۔ ہاں ادھر سے دشمنوں کے پیچھا کرنے کا کھٹکا ضرور لگا ہوا تھا۔ مگر وہی حوصلے والا تھا کہ پہاڑوں سے ہمت آزماتا تھا اور کیا ہزارئے کیا افغان دونوں سے ٹکراتا تھا۔ اضلاع کابل کے قدرتی گلزار گویا باغ بہشت کے نقشے تھے۔ ان میں پھر کر چپہ چپہ زمین کو دیکھا، ہر قسم کی پیداوار، ہر ایک میوہ، ایک ایک چرند اور پرند کا حال اپنی توزک میں ذخیرہ کیا۔ درختوں کا جھومنا، سبزے کا لہلہانا، نہروں کا لہرانا، سرو شمشاد کی چھاؤں میں بیٹھنا، ہری ہری گھاپر لوٹنا، غرض کسی بات کا لطف باقی نہ چھوڑا اور انہی دنوں میں خط بابری بھی ایجاد کیا۔ اس کی طبیعت خدا نے ایسی شگفتہ بنائی تھی کہ جس حال میں ہو دل کو خوش رکھتا تھا۔ چنانچہ اسی عالم میں جس گلزار یا سبز پہاڑ میں گزر ہوتا مصاحبوں کو لے کر بیٹھ جاتا۔ کبھی عالم آب کی سیر کرتا۔ کشتی آہستہ آہستہ چلی جاتی ہے، آپ غزلیں کہتا ہے، رباب بجواتا ہے اور ترکی ترانے سنتا جاتا ہے۔ باغ تو جابجا لگائے مگر کابل کے برابر دامن کوہ میں ایک باغ ایسا لگایا کہ لاہور کا شالامار گویا ایک ناتمام اس کی نقل ہے۔ نو درجے تک برابر گلزار، چشموں سے نہریں اور نہروں سے قدرتی آبشار جاری۔ سب سے اوپر کے درجے میں ایک مکان دلفزا بنایا کہ اس میں بیٹھ کر جہاں تک نظر کام کرے گل اور لالہ ہی نظر آتا ہے۔

بابر کا چچا سلطان حسین باقرا۔ خراسان کا بادشاہ عالی شان تھا۔ اس کو خبر پہنچی کہ

شیبانی خان نے اب ادھر کا رخ کیا۔ سلطان نے جا بجا مراسلے بھیجے اور بابر کو بھی بلایا مگر اسی عرصے میں وہ مر گیا۔ اس کے بارہ بیٹے تھے۔ سب وہاں جمع ہوئے اور اسے پھر طلب کیا۔ اول تو شیبانی خاں کا خوف، دوسرے سنتا تھا کہ ہرات کو چچا نے خوب آراستہ کیا ہے۔ اس لئے روانہ ہوا۔ اس نے جا کر چچا کا پرسہ دیا۔ بھائی بھی بڑی محبت سے پیش آئے۔ ایک ایک نے جدا جدا ضیافت کی اور چنگیزی رسمیں جن کو اب تک اپنا دستور العمل سمجھتے تھے، سب عمل میں لائے۔ بابر نے تمام شہر اور عمارات کو دیکھا اور ایک ایک مکان اور وہاں کی ایک ایک صحبت کا حال اپنے توزک میں لکھا۔ اس عرصے میں برف پڑنے لگی اور ڈاک بند ہو گئی۔ چونکہ اسے گھر کا فکر لگا ہوا تھا۔ اس لئے جس طرح ہوا رخصت ہو کر ادھر روانہ ہوا۔ مگر رستے میں ایسی تکلیفیں پیش آئیں کہ آج تک کسی سفر میں نہ دیکھی تھیں۔ زمین آسمان برف ہی نظر آتے تھے اور جہاں گھوڑے قدم رکھتے تھے۔ زمین تک غرق ہو جاتے تھے۔ تیس سوار سے زیادہ ساتھ نہ تھے، ان میں بھی مارے سردی کے، نہ کسی کے ہاتھ پاؤں میں دم تھا نہ سر میں ہوش وحواس تھے۔ ناچار خود گھوڑے سے کود پڑا اس کے ساتھ اور وفاداروں کو بھی کودنا پڑا اور برف کو کوٹتے آگے رستہ بناتے چلے۔ اب مشکل یہ ہوئی کہ برف نے سارے اتے پتے چھپا دیے تھے اس لئے رستہ بتانے والا خود رستہ بھول گیا۔ ایسے پہاڑوں میں جا پڑے کہ آبادی کا تو کیا ذکر ہے کوئی قافلہ بھی وہاں نہ گزرا ہوگا۔ اسی حالت میں شام ہو گئی۔ سب حیران اور ڈر یہ تھا کہ اگر پہاڑ کے اوپر سے برف 9 لڑکی تو سب کے سب اس طرح دبیں گے کہ برسوں تک کسی کو خبر نہ ہو گی۔ جب چلتے چلتے اندھیرا ہو گیا تو ایک جگہ اتر پڑے اور اپنے ہاتھ سے گردن گردن تک برف ہٹا کر زمین نکالی کہ بستر کر کے رات بسر کریں۔ ایک مصاحب نے آ کر خبر دی کہ پہلو میں ایک طاق سا نظر آتا ہے آپ اس میں چل بیٹھیں کہ سر پر سایہ تو ہو۔ بابر نے کہا جو سب کا حال سو اپنا حال ایسا نہیں ہو سکتا۔ اتنا میں دوسرا آیا اور کہا کہ جسے طاق سمجھتے تھے وہ بڑا غار ہے اور اس میں تیس چالیس آدمی بہ آرام رہ سکتے ہیں۔ چنانچہ سب نے اندر جا کر بستر کیے اور خورجیوں سے گوشت نکال کر وہیں

ایک دیگ چڑھا دی۔ شوربے میں خشک روٹیاں ڈبو کر دو دو پیالے سب نے پیے اور گرم ہو کر خدا کا شکر ادا کیا۔ تمام رات چائے کی پیالیاں پی کر کاٹی۔ صبح کو روانہ ہوئے اور اسی طرح مرتے دکھ بھرتے بامیاں تک آئے۔ وہاں آ کر اسی برف باری میں ہزارے کے وحشیوں سے مقابلے ہو رہے تھے، جو خبر آئی کہ ایک بھائی کابل میں بادشاہ ہو گیا اور مشہور کر دیا کہ آپ ہرات میں قید ہو گئے۔ مگر اب تک ایک نمک حلال بالا حصار[10] کا قلعہ روکے ہوئے اڑا ہوا ہے۔ بابر بہت گھبرایا۔ رفیقوں کو ترکستان کی مصیبتیں یاد آ گئیں۔ اس نے اسی وقت ایک جاسوس قلعہ دار کے پاس بھیجا کہ خاطر جمع رکھنا ہم آ پہنچے۔ جس وقت تم کو معلوم ہو جائے کہ ہم دو تین کوس پر پہنچ گئے تو قلعے کے برج پر آگ جلا کر روشنی کرنا کہ ہم سمجھ جائیں اور خود باہر نکل پڑنا۔ چنانچہ اسی طرح عمل میں آیا اور یہ کوچہ و بازار کو کشت و خون سے لال کر کے قلعے میں داخل ہوا بھائی بے وفا بھی گرفتار ہوا اور تلوار و ترکش جو مارنے کو کمر سے باندھے تھے، گلے میں ڈال کر چنگیزی رسم کے بموجب دربار میں آیا۔ مگر بابر ذرا آنکھ پر میل نہ لایا، دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور کہا آؤ بھائی گلے تو ملو۔ وہ بدستور دو جگہ تسلیم کو جھکا مگر ایسا شرمایا ہوا تھا کہ الجھ کر دونوں دفعہ گرا۔ اس نے پہلو میں بٹھایا اور اس کے لئے شربت منگایا۔ جب آیا تو پہلے دو گھونٹ اس میں سے آپ پی لئے پھر پلایا کہ اسے وہم نہ آئے۔ بابر نے اب تک شراب نہ پی تھی۔ ہرات کی ضیافتوں میں بھائیوں نے بہت منتیں کیں۔ وہاں تو شرماتا ہی رہا مگر یہاں آ کر عمر بھر کا بدلا نکالا کوئی قطعہ زمین کا ایسا نہ چھوڑا جہاں بیٹھ کر اس کا لطف نہ اٹھایا ہو۔ مصاحبوں کے جلسے جماتا شرابیں پیتا نہ ملتی تو معجون ہی کھا کر خوش مستیاں کرتا۔ وہی باغ نو بہار جس کے چند درجے اب تک بھی باقی ہیں، اس میں ایک خوش نما سنگ مرمر کا بنوایا۔ اسے شراب انگوری سے بھرتا۔ مصاحبوں کو لے کر بے تکلف بیٹھتا اور وقت کو مزے سے گزارتا۔ حوض مذکور کے کنارے پر یہ شعر آبدار لکھا تھا:

نوروز و نو بہار و می و دل ربا خوش ست
بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست

ایک دفعہ دورہ کرتا ہوا غزنی میں جا نکلا۔ پرانی عمارتوں کو دیکھ کر اور مزاروں پر جا کر زیارتیں کیں۔ لوگوں نے کہا۔ "یہاں ایک مزار ایسا ہے کہ جب اس پر کچھ پڑھتے ہیں تو ہلنے لگتا ہے"۔ چنانچہ خود جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ فقط خادموں کی دوکانداری ہے اور کچھ نہیں۔ چنانچہ انہیں بلا کر خوب دھمکایا۔

اکثر کتابوں میں لکھا ہے کہ نواح غزنی میں ایک چشمہ ہے۔ جب اس میں کچھ نجاست پڑ جاتی ہے تو بے انتہا برف آسمان سے گرنے لگتی ہے۔ چنانچہ اسے بھی تلاش کیا ۔کہیں پتہ نہ لگا۔ چند روز کے بعد وطن کی کشش نے بھر بغل میں گدگدی کی، یعنی شیبانی خان جس نے سمرقند اور بخارا سے تیمور کا نام مٹایا تھا وہ جوش مذہبی میں آ کر جہاد کے بہانے شاہ ایران سے جا بھڑا اور لڑائی میں مارا گیا۔ بابر کی بہن کسی لڑائی میں اس کے ہاتھ آئی تھی اب وہ بندی میں گرفتار ہوئی۔ شاہ نے اسے بڑی عزت سے بابر کے پاس بھجوا دیا۔ انہیں راہ پیدا کرنے کو اتنا سہارا بہت ہوا۔ دو دفعہ شاہ سے مدد لے کر ایسی باگیں اٹھائیں کہ گویا بخارا ہی میں بیٹھے تھے۔ مگر قسمت میں سیب سمرقندی اور انگور بخارائی نہ تھے۔ ہندوستان کا دانا پانی لکھا تھا۔ چنانچہ دشمنوں نے رعایا کو بھڑکا دیا کہ بابر شیعوں کی مدد لے کر آیا ہے، اس کا نکالنا واجب ہے۔ یہ بغاوت ایسی آندھی کی طرح اٹھی کہ ننگے سر ننگے پاؤں جان لے کر وہاں سے بھاگا اور کابل میں آ کر دم لیا۔

بابر سے بھی مسند پر بیٹھ کر کھانا ہضم نہ ہوتا تھا۔ چار دفعہ ہندوستان آیا اور ہر بار قدم آگے ہی بڑھایا مگر پانچویں دفعہ ایسا آیا کہ پھر جنازہ ہی یہاں سے پھرا۔ ہاں اولاد کے لئے پشتوں تک سلطنت قائم کر گیا۔ چنانچہ پنجاب کو صاف کرتا ہوا دلی پر چلا۔ ادھر سے ابراہیم لودھی ایک لاکھ فوج اور ایک ہزار ہاتھی جنگی لے کر اس دھوم دھام سے نکلا گویا ہندوستان کی آرائش اور تین پشت کی شان شاہانہ کو نکال باہر ڈال دیا۔ بابر جب یلغار سے فتح وظفر کا غبار اڑاتا پانی پت پر پہنچا تو ایک میدان وسیع نظر آیا۔ ادھر ادھر گھوڑا مار کر نشیب و فراز سرداران لشکر کو دکھایا بعد اس کے نیزہ زمین پر گاڑ گھوڑے سے کود پڑا اور حکم دیا کہ یہیں ڈیرے ڈال دو۔ دوسرے دن صبح کو اٹھ کر توطوغیں[1] اور نشان

سامنے لشکر کے کھڑے کئے۔ تمام سرداران کے نیچے آ کر جمع ہوئے۔ ایک نشان آپ لیا باقی اوروں نے لئے۔ چند سرداران کے پھریرے تان کر کھڑے ہوئے اور تاتاری رسم کے بموجب اس زبان میں کچھ منتر پڑھے۔ بعد اس کے فوج کو آراستہ کر کے کمان[12] سے ماپا تو لشکر جرار بارہ ہزار شمار میں آیا۔ چنانچہ شہر پانی پت کو داہنے ہاتھ پر رکھا۔ شاہ قلی توپچی اپنی رومی قواعد کام میں لایا یعنے چمڑے کے رسوں سے توپوں کا زنجیر جمایا اور بوروں کے مورچے باندھ سلامت کوچے اور خندقیں کھود لیں۔ رات کو شبخون بھیجا مگر حریف کی فوج چھ کوس تک برابر پڑی ہوئی تھی، جاتے جاتے صبح ہوگئی، شبخون پورا نہ پڑا۔ دوسرے دن صبح ہوتے خبر دار نے خبر دی کہ دشمن نے اپنے دریائے لشکر کو جنبش دی ہے۔ بابر شیر کی طرح انگڑائی لے کر بستر سے اٹھا ہتھیار سجے اور فوج کو مرتب کر کے سامنے کیا۔ توپیں تو جہاں کھڑی تھیں وہاں سے ہل ہی نہ سکتی تھیں۔ بے ٹھکانے گولے مارنے شروع کر دیے اور ترکان تاتاری نے دائیں بائیں سرگرز ور دیا۔ حریف کا لشکر جب آگے بڑھا تھا تو ایسا معلوم ہوا تھا کہ دریا چڑھا چلا آتا ہے مگر جب اس نے کوئی طرف دبتی نہ دیکھی تو تھم گیا اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا سوچتا ہے کہ بڑھوں یا نہ بڑھوں۔ ٹھہروں یا ہٹ جاؤں۔ بابر نے دفعتہً حملے کا حکم دیا۔ بارہ ہزار ترک خونخوار اور سوار جرار اس دریا میں مچھلیوں کی طرح تیرنے لگے۔ اس طرح کی قیامت برپا ہوئی کہ جس سے نجات کے لئے چالیس ہزار جان ہاروں کے ساتھ خود ابراہیم کو جان قربانی میں دینی پڑی۔ سپاہی اس کے بھاگتے پھرتے تھے اور ترک تلواروں سے مارتے پھرتے تھے۔ ایک سردار شمشیر بکف کسی کھنڈر میں جا نکلا۔ دیکھا کہ کئی سو کشتے اور زخمی کٹے پڑے ہیں مگر سب سردار اور منصب دار معلوم ہوتے ہیں۔ انہی میں تاجدار ہند بھی بے تاج بے کلاہ مرا پڑا تھا۔ خدا کی قدرت ہے، وہ میدان جس میں صبح تک ''ابراہیم ابراہیم'' کا نقارہ بجتا تھا، خیمے، سراچے، سراپردے کھڑے تھے، نشان لہراتے تھے، بازار لگتے تھے۔ دوپہر تک ہو کا میدان ہو گیا اور زمین و آسمان سے ''بابر بابر'' کی صدا آنے لگی۔ جنہوں نے رستمی اور اسفندیاری کے دعووں سے تلواریں باندھی تھیں، سب فنا ہو

گئے اور جو بچے بھیس بدل بدل کر نکل گئے۔ فتح یاب نے ہمایوں ولی عہد کو معد چند سرداروں کے آگرے روانہ کیا اور آپ دلی میں آیا۔ قدیمی عمارتوں کو دیکھا اور درگاہوں کو سلام کیا اور بادرفتار سے اتر کر آبی سواری میں بیٹھا کہ دریا کی راہ آرام سے آگرے پہنچے۔ ابراہیم کے اہل وعیال مع خزانے کے وہیں تھے اور گوالیار کا راجہ قلعہ دار تھا کہ سو برس سے پشت بہ پشت راجہ چلا آتا تھا۔ مگر وہ رفیق پرست میدان جنگ میں سر کے ساتھ رفاقت کا حق گردن سے اتار چکا تھا۔ چنانچہ ہمایوں بے تکلف قلعے میں داخل ہوا۔ ستارہ اقبال کا چڑھا ہوا تھا اور دل شیر سے کئی میدان آگے بڑھا ہوا تھا۔ فوراً دروازوں کا بندوبست کر، فوج فصیلوں پر پھیلا دی۔ ابراہیم کی ماں دیرینہ سال بھی زندہ تھی۔ اس نے جب دیکھا کہ حریف کا بیٹا قلعے میں آ گیا تو ایک دم حیرت کا عالم رہا۔ آخر کچھ نہ بن آئی۔ شرم وحیا کے برقع کو پھاڑ چادر سر پر ڈالی اور حرم سرا سے نکلی۔ آگے آگے دو خواجہ سرا پیچھے پیچھے چند یتیم بچے اور بیوہ لاوارثیں۔ جگر غم سے داغ داغ اور زمانیں ضبط سے چاک چاک۔ دلوں میں آہیں مگر منہ سے دعائیں دیتی شاہزادے کے سامنے آئی اور کہا کہ "اے فرزند اقبال بلند۔ اس چراغ سحری کی دعا لے اور باپ فتح مند کی سلامتی میں ان بیواؤں اور یتیموں کی جاں بخشی کر"۔ سعادت مند شہزادہ انقلاب فلک کو دیکھ کر کانپ گیا اور دنیا کی بے وفائی آئینہ ہو گئی۔ بہت خاطر جمع کی اور اشارہ کیا کہ انہیں حرم سرا میں لے جاؤ۔ اس سن رسیدہ بی بی نے تھر تھراتا ہاتھ چادر سے نکال کر صندل کی ڈبیا میں ایک الماس گراں بہا دیا اور کہا "نور چشم بکرماجیت کے وقت سے اس گوہر شب چراغ کے شہرے نے عالم کو روشن کر رکھا تھا۔ علاؤ الدین کے عہد سے شاہان اسلام کے خزانے میں آیا۔ تین پشت تک ہم نے بھی امانت داری کی۔ وہ آج ہی کے لئے تھی۔ اب یہ تمہارا حق ہے"۔ غرض ہمایوں انہیں عزت وحرمت سے بٹھا کر آپ خزانوں کی طرف متوجہ ہوا۔ ابراہیم کو روپیہ سمیٹنے کا شوق بڑا تھا اور اسی سبب سے فوج اور رعیت پریشان بے سامان رہتی تھی۔ چنانچہ خزانوں کو دیکھا تو بھرے پائے۔ سب کا بندوبست کر کے باپ کی خدمت میں آیا۔ سارا حال عرض کیا اور الماس نذر دے کر

انعام میں لیا۔ دریا دل بادشاہوں کا قاعدہ ہے کہ زور تیغ سے لیتے ہیں اور بے دریغ دیتے ہیں۔ بابر نے خزانوں میں سے کئی کئی لاکھ نقد اور انواع واقسام کے تحفے ایک ایک بیٹے اور ہر ایک سردار کو دیے۔ لشکر میں ترک، افغان، ہزارے، عرب، بلوچ فرقے فرقے کے لوگ تھے، سب کو نہال کر دیا۔ بخارا اور سمرقند میں اپنے خاندانی مشائخوں کو عجیب وغریب تحفے بھیجے۔ کابل کی رعایا میں بچے بچے تک ایک ایک شاہرخی[13] بٹی۔ بعد اس کے دفتروں پر متوجہ ہوا اور بندوبست کے ساتھ خانہ سلطنت کی آرائشیں کرنے لگا۔ ہندوستان کے حالات اور پیداواروں اور صنعتوں کی تحقیقاتیں شروع کیں۔ عمارتوں کو دیکھا اور خود ایسے باغ لگائے اور مکانات اور حمام بنائے کہ ہندوستانی آ کر دیکھتے اور کہتے کہ آگرہ بھی کابل قندھار ہو گیا۔ یہاں کے لوگ سمجھتے تھے کہ جس طرح محمود اور تیمور آندھی کی طرح آئے اور بگولے کی طرح چلے گئے اسی طرح بابر بھی چلا جائے گا جب اس کا جماؤ دیکھا تو اودے پور کا رانا جس کے خاندان میں صدہا سال سے راج چلا آتا تھا اس نے بہت سے ہندو مسلمان سرداروں کو سمیٹ کر لاکھ آدمی کا جتھا جمع کیا کہ اس ترک بچے کو مار کر نکال دو۔ بابر نے رفیقوں کو بلا کر گفتگو شروع کی۔ چنانچہ پہلی تجویز یہ ٹھہری کہ جو جو یہاں کے لوگ فوج میں شامل ہوئے ہیں انہیں اضلاع میں بھیج دینا چاہیے، تاکہ میدان میں عین وقت پر دغا نہ کریں۔ بعد اس کے سرداروں نے کہا کہ اپنی کمی اور غنیم کی زیادتی ظاہر ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ آپ پنجاب میں جا کر عنایت الٰہی کے منتظر رہیں۔ جان نثار میدان گرم کریں۔ اگر فتح پائی تو حضور دولت واقبال کو رکاب میں لے کر تشریف لائیں اور اگر ہم شہادت سے سرخرو ہوئے تو پنجاب سے کابل تک کا ملک حضور کو مبارک رہے۔ اس ہمت والے نے کہا کہ اے میرے رفیقو جو فتح تم نے کی ہے اس کی عالم میں دھوم مچ گئی ہے مگر اس حرکت کو سن کر ملک ملک کے بادشاہ یہی کہیں گے کہ اتنا بڑا ملک لے کر یہ خزانے اور جواہرات مارے اور جب تلوار مارنے کا وقت آیا تو سرداروں کو آگے رکھ کر آپ سرک گیا۔ تیمور وچنگیز کے نام پر داغ لگانے سے مر جانا ہزار درجے بہتر ہے۔ خیر اب جو

تمہارا حال سو میرا حال۔ یہ سن کر تمام سرداروں نے دعا دی اور فوج معہ توپ خانے کے روانہ ہوئی۔ فتح پور سیکری کے پاس یہ پرچا لگا کہ دشمن بھی بڑھا چلا آتا ہے اور ہراول کی فوجوں کی ٹکر ہو گئی۔ بادشاہ یہ خبر سنتے ہی خود باگیں اٹھایا چاہتا تھا جو خبر آئی کہ میدان اپنے ہاتھ رہا۔ غرض جس ڈھنگ سے ابراہیم لودھی کی لڑائی میں لشکر اترا تھا اسی طرح یہاں اتارا۔ مگر شام کو جب فوج کی موجودات لی تو معلوم ہوا کہ سپاہ کے دل بجھے ہوئے ہیں۔ اسی وقت سرداروں کو میدان میں بلایا اور ایک پرتاثیر تقریر اس طرح ادا کی کہ اے غریب الوطن بادشاہ کے رفیقو، تم دیکھتے ہو کہ ہم کون ہیں اور کہاں کھڑے ہیں۔ برسوں محنت کی، مدتوں مصیبت سہی، اپنی جان خطروں میں ڈالی، پیارے رفیقوں کی جانیں دیں، تب نامور دشمنوں کو زیر کیا اور وہ ملک تم نے لیا کہ روئے زمین کے سلاطین اس کی آرزو کرتے ہیں۔ بہادرو دیکھتا ہوں کہ تمہارے دل گھٹے جاتے ہیں تم جانتے ہو کہ جمعیت کے گھٹنے کا مضائقہ نہیں مگر دلوں کا گھٹنا غضب ہے۔ خدانہ کرے کہ ذرا بھی ہوا پلٹے، پھر زمین و آسمان میں ٹھکانا نہیں۔ دیکھو تیموری تلوار جس نے یہاں تک پہنچایا وہ تمہارے ہاتھ میں ہے، پھر خطر کس بات میں ہے۔ ہاں وہ بات نہ ہو کہ بے وفائی سے روسیاہی کے دفتر میں نام لکھا جائے اور ہڈیاں سب کی یہاں خاک ہوں۔ دیکھو آخر مرنا اول مرنا۔ پھر مرنے سے کیا ڈرنا۔ مگر تلوار مار کر مرنا ہزار زندگی سے بہتر ہے۔ جینا انہی لوگوں کا ہے جو آقا کے نمک اور بازوؤں کے زور پر لڑے اور مردوں کے دفتر میں نام لکھوا کر خدا کے سامنے سرخ رو گئے۔ لو اب یہ قرآن شریف تمہارے سامنے ہے، تم جانو اور یہ جانے۔ قرآن کو دیکھتے ہی سب نے سر جھکا دیئے۔ چہرے سرخ ہو گئے اور بہتوں کے آنسو نکل پڑے۔ دوڑ دوڑ کر اس پر سر رکھ دیے اور ہاتھ رکھ رکھ کر کہا کہ جب تک دم میں دم ہے جو بادشاہ سے پھرے خدا کا کلام خدا سے پھرے غرض سب کے دل قوی ہو گئے اور ہنسی خوشی اپنے اپنے خیموں میں آ گئے۔ نیا نکتہ یہ نکلا کہ شراب انگوری خاص کابل سے منگائی تھی وہ دو دن پہلے پہنچی تھی بلکہ ہمایوں کو شراب سے نفرت تھی، اسے بڑی منتوں سے پلائی تھی۔ اس موقع پر فتح کی منت مان کر توبہ کی اور تمام سونے چاندی

کے باسن تڑوا کر نام خدا دے دیے۔ چندتر کی شعر توبہ کے مضمون میں کہے بجائے شراب خانے کے تعمیر مسجد کا حکم بھیج دیا۔ ساتھ ہی مسلمانوں کے کل محصول معاف کر کے تمام گناہوں سے، یہاں تک کہ داڑھی منڈانے سے بھی توبہ کی۔ مگر شیطان نے ایک شوشہ چھوڑا یعنے وطن سے کوئی نحوست زدہ نجومی پہنچا۔ اس نے تمام لشکر میں ہل چل ڈال دی کہ اس لڑائی میں ہماری شکست ہوگی۔ لوگ تو بہت گھبرائے مگر بادشاہ نے کچھ پروانہ کی اور صبحدم ابھی مشرق سے علم آفتاب بلند نہ ہوا تھا کہ اس نے پھریرا علم کا میدان میں کھول دیا۔ پہلے ہی توپوں کے منہ سے بسم اللہ ہوئی۔ سامنا سامنے قائم رہا اور ترک غول کے غول جدا ہو ہو کر چاروں طرف سے گرنے لگے۔ غنیم نے بھی مردانگی کی داد دی، مگر دوپہر سے اس کا طور بے طور ہونے لگا۔ بابر نہ دفعۃً نقارہ فتح کا بجا کر ایسا حملہ کیا کہ سب کے قدم اکھڑ گئے۔ دور تک بھاگتوں کا پیچھا کیا۔ شام کو پھرے اور غنیم کے خیمہ گاہ اور لشکر کے بازاروں کو دیکھتے ہوئے رات کو اپنے ڈیروں میں پہنچے۔ ہوا خواہ آتے تھے اور مبارکبادیں دیتے تھے۔ آغا، نجومی بھی شرمندہ صورت آئے۔ بابر نے بہت سی گالیاں دیں، مگر چونکہ نمک خوار قدیمی تھا، اس لئے لاکھ ٹنکہ دے کر حکم دیا کہ ابھی لشکر سے نکل جائے۔ وہاں ایک مینار یادگار بنایا اور فتح کا نقارہ بجاتا، اقبال کا نشان اڑاتا گوالیار میں آیا۔ پتھر کا ہاتھی اور شمس الدین التمش کی مسجد دیکھی اور اس فتح سے فرمانوں میں بادشاہ غازی تحریر ہونے لگا۔

بابر بادشاہ جیسا مزاج کا رنگین تھا ویسا ہی دل کا سخت اور طبیعت کا مصیبت پسند تھا۔ کئی دفعہ کالپی سے گھوڑا اڑایا اور ایک سو ساٹھ میل زمین طے کر کے دوسرے دن آگرے میں دم لیا۔ کشتیاں موجود ہوتیں اور گنگا جیسے دریا پر کپڑے اتار ننگی تلوار ہاتھ میں لے کر کود پڑتا۔ تیر کر پار اتر جاتا اور حریف پر دھاوا مارتا۔ آخر کوچ کے دن نزدیک آئے اور بیمار ہو کر طبیعت بے اعتدال ہوئی۔ اتفاق یہ کہ انہی دنوں میں ہمایوں بھی سخت بیمار ہوا۔ حکیم طبیب سب نے اپنی اپنی حکمت خرچ کی مگر کسی سے کچھ نہ ہوا۔ آخر مشائخوں اور بزرگوں کو بلا کر پوچھا۔ انہوں نے عرض کی کہ جو چیز حضور کی نظر میں نہایت

گراں نہاں ہو وہ نور چشم پر نثار کیجیے کہ اس کی آئی بلا ٹلے۔ بابر سمجھ گیا کہ یہ ابراہیم لودھی والے الماس کا اشارہ ہے۔ کہا کہ پتھر کیا مال ہے۔ لختِ جگر پر میں اپنا گوہر جان قربان کروں گا۔ یہ کہہ کر اٹھا، تین بار گرد پھرا اور کہا کہ الٰہی اس کی بلائیں نے اپنی جان پر لے لی، لے لی، لے لی۔ بعد اس کے سجدہ کیا اور دیر تک رو رو کر دعا مانگتا رہا۔ خدا کی قدرت کہ اسی وقت سے اس کا مرض گھٹنے لگا اور اس کا بڑھنے لگا۔ بیٹے سے کہا کہ تخت تمہیں مبارک ہو۔ ہمارے لئے حکم دو کہ تختہ تابوت تیار کریں۔ آخر بیٹا بستر بیماری سے اٹھ کھڑا ہوا اور باپ نے بستر عدم پر آرام کیا۔ تاریخ ہوئی کہ:

ہمایوں بود وارث ملک دی۔ لاش کابل میں بھیجی گئی۔ چنانچہ جہانگیر نے اس پر ایسا عالی شان مقبرہ بنوایا کہ اب بھی سیاح لوگ اسے دنیا کی بے نظر عمارتوں میں شمار کرتے ہیں۔

اس وقت تک امیر تیمور کی اولاد میں جو بادشاہ ہوئے، امیر کی رعایت سے امیرزا کہلاتے تھے۔ بابر نے ہندوستان مار کر اپنے نام پر امیر المومنین کا تاج رکھا اور شاہی کا تمغہ لگایا۔

نصیرالدین ہمایوں

جب ہمایوں کے سر پر ہمائے سلطنت نے سایہ ڈالا تو جشن شاہانہ سے جہان کو روشن کیا اور اتنے خوان اور کشتیاں بھر بھر کر انعام دے کہ تخت نشینی کی تاریخی کشتی زر ہو گئی۔ بہادری اور قابلیت کے ساتھ دل کا رحیم اور ہاتھ کا سخی ایسا تھا کہ بیان سے باہر ہے۔ جو جو ملک بھائیوں نے مانگے اس نے ہنسی خوشی دے دیے۔ خطا بخشی کا یہ عالم تھا کہ اپنے تو درکنار دشمن بھی جب کشت و خون سے دل کی ہوس نکال کر عذر کرتے تو معاف ہی کر دیتا۔ چند روز کے بعد ملک گیری کو اٹھا دکن کی مہموں میں فتح کے نشان اڑاتا پھرتا تھا جو پرچہ لگا کر فرید افغان شیر خاں بن کر بنگالہ کی طرف حملے کر رہا ہے۔ چنانچہ خود فوج لے کر ادھر آیا اور شیر کے پنجے سے اپنے شکار چھڑانے لگا۔ مگر اس ملک کی سرسبزی اور برسات کی بہار سے آرام طلبی ایسی غالب ہوئی کہ گور[14] کا نام جنت آباد رکھ کر خود عیش و عشرت میں مست ہو بیٹھا۔ لشکر کچھ تو سفر کے مارے ٹوٹ گیا تھا۔ یہاں بنگالہ کی برسات اور ہوا کے بگاڑ نے انسان حیوان سب کو گرا دیا۔ چاروں طرف نالے دریا چڑھ کر خبریں بھی بند ہو گئیں اور جا بجا فساد ہونے لگے۔ ادھر ایک بھائی آگرے میں آیا اور ایک ادھر کو بڑھا۔ شیر خاں اور بھی شیر ہو گیا اور اس نے بھی ادھر کا رخ کیا۔ بادشاہ کو یا تو خبر نہ تھی ہوئی تو سب باتوں کی ایک دفعہ ہی خبر ہوئی۔ فوج کو دیکھا کہ شکستہ حال بلکہ شکستہ دل پایا۔ چنانچہ برسات کے بعد رستہ کھلتے ہی فوج کے بہادر بھاگنے لگے۔ اس نے بھائیوں کو لکھا کہ جو ملک باپ نے بڑی بڑی جانیں کھپا کر لیا تھا آپس کے جھگڑوں میں مفت ہاتھ سے جاتا ہے۔ شیر خاں بری بلا ہے۔ پہلے سب مل کر اس کا فیصلہ کر لو۔ پھر

تمہاری خوشی سے مجھے کسی طرح انکار نہیں۔

کوتہ اندیش بھائیوں نے شفیق بھائی کی کچھ نہ سنی۔ ناچار گھر کی خبر لینی واجب سمجھ کر پہلے آگرے کو چلا۔ رستے میں دیکھے تو ایک ایک نالہ دریا اور ہر دریا سمندر ہو رہا ہے۔ ہاتھی اور اونٹوں کو بار برداری تو درکنار اپنی جان کا اٹھانا بھی وہاں ہو گیا۔ غرض معہ لشکر سفر کے دریا میں تیرتا چلا آتا تھا کہ شیر خاں کو خبر لگی وہ سنتے ہی شیر کی طرح جھپٹا اور نہنگ کی طرح ندی نالوں سے اترا۔ فوج اس کی جو دن رات یلغاروں پر چڑھی ہوئی تھی اس طرح باگیں اٹھائے آئی کہ ہمایوں کو رستے ہی میں آن لیا۔ امیروں نے بادشاہ کو صلاح دی کہ حریف برابر دو منزلہ اور سہ منزلہ کرتا ہوا آیا ہے، آج ہی اس پر جا پڑیں تو بہتر ہے۔ مگر بادشاہ کے خیال میں نہ آیا۔ شیر خاں نے راتوں رات کھائیاں اور مورچے تیار کئے۔ دوسرے دن جو اسے دیکھا تو قلعے میں بیٹھا پایا۔ ناچار یہ صلاح ٹھہری کہ ادھر کشتیاں جمع کرتے رہیں اور لڑائی کو ٹالتے رہیں۔ جب موقع پائیں تو پار اتر جائیں۔ شیر خاں بھی کچھ فوج اور کچھ سامان کے انتظار میں تھا وہ غنیمت سمجھا اور اس عرصے میں دو مہینے گزار دیے۔ بعد اس کے یہ پیچ کھیلا کہ ایک دن خیمہ ڈیروں سے لشکر کا چہرہ درست رکھا اور خود ایک فوج جرار لے، پانچ سات کوس کا چکر دے، بادشاہ کے پیچھے آ پڑا اور اپنے پیر کو نامہ دے کر یہ پیغام بھیجا کہ اگر حضور بنگالہ کا ملک مجھے دیں تو آگے کی طمع نہ کروں اور سکہ خطبہ حضور کا قائم رکھوں۔ بادشاہ اس وقت میں یہی غنیمت سمجھا اور قرآن پر مہریں ہو کر عہد و پیمان ہو گئے۔ لیکن آج تو قسما قسمی کر کے خاطر جمع کی، دوسرے دن قرآن کو مع عہد و پیمان طاق پر رکھ۔ فوج کے تین حصے کئے۔ عین صبح کا وقت تھا جو تلوار یں کھینچ اس طرح آن پڑا کہ بادشاہ اور سارا لشکر حیران رہ گیا۔ اس وقت سوائے گریز کے کوئی رستہ نظر نہ آیا اور جدھر جس کا منہ اٹھا ادھر بھاگا۔ لاکھوں کا ٹڈی دل تھا مارے گئے کیچڑ میں پھنس کر رہ گئے۔ جو ان بلاؤں سے بچے وہ آنکھیں بند کر کے پانی میں کود پڑے۔ بادشاہ نے بھی دریا میں گھوڑا ڈالا۔ ستارہ ایسا ڈوبا تھا کہ بیچ مانجھ دھار میں جا کر گھوڑا بھی غوطے کھانے لگا۔ بادشاہ نے دیکھا کہ لشکر کا ایک سقہ اپنی

مشک پر تیرتا چلا جاتا ہے۔ ہاتھ اٹھا کر آواز دی کہ اے آب حیات کے فرشتے، لینا کہ وقت لینے کا ہے اور مانگ کیا مانگتا ہے؟ اس نے کہا کہ دو پہر کی بادشاہت غرض پیٹھ پر ڈال ہاتھ پاؤں مار۔ کنارے پر پہنچا دیا۔ چنانچہ بادشاہ نے آگرے پہنچ کر وعدہ وفا کیا۔ اس نے بھی دو پہر کی بادشاہت میں تمام بھائی بندوں کو نہال کر لیا اور اپنا سکہ یہ بٹھایا کہ مشکیں کتروا کر چام کے دام چلائے۔ شیر خاں نے یہ بڑی انسانیت کی کہ بادشاہ بیگم اس دار و گیر میں وہیں رہ گئی تھی۔ اسے نہایت ستر پردے سے رکھا اور بڑی عزت و حرمت سے ہمایوں کے پاس بھجوا دیا۔ غرض ہمایوں نے خلوت میں تمام سرداروں کو جمع کیا اور بھائیوں کو بلا کر آپس کے فساد کا انجام اور اس مقدمے کا نشیب و فراز سمجھایا۔ انہیں شیر خاں نے یہ بھلاوا دے رکھا تھا کہ اگر تم اس معاملے میں الگ رہو تو بعد فتح کے پنجاب کا ملک تمہیں دے دوں گا۔ یہ سمجھے کہ ہمایوں کے آگے ہمارا چراغ جلنا محال ہے اور یہ کانٹا نکل جائے تو شیر خاں کچھ مال نہیں۔ خرگوش کی طرح جھاڑیوں میں بھگا بھگا کر مار لیں گے۔ چنانچہ بھائی سے حیلے حوالے کر کے پنجاب کی طرف پہلو بچا آئے۔ شیر نے چھ مہینے کے بعد انگڑائی لی اور پچاس ہزار کی جمعیت سے ادھر بڑھا۔ بادشاہ بھی ایک لاکھ فوج سے پھر نشان اٹھا کر چلا۔ ادھر سے شیر خاں کا بیٹا ہراول آتا تھا۔ ان کے ہراول نے جاتے ہی شکار کیا اور سارا لشکر مچھلیوں کی طرح پیر گنگا پار اتر گیا۔ مگر جب دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا تو مہینہ بھر تک آمنے سامنے پڑے رہے اور لڑائی کے طول نے بادشاہی لشکر کو ایسا دل تنگ کیا کہ لوگ پھر چپکے چپکے سرکنے لگے۔ اوپر سے برسات آئی اس نے سب کو اگلا برس یاد دلایا۔

ایک دن سر شام آسمان کے میدان پر جنگ کا سامان نظر آیا۔ پنجہ خورشید کے نیچے پھریرا شفق کا لہرانے لگا۔ پھر بادل رنگا رنگ کی وردیاں پہن کر آنے شروع ہوئے۔ رعد کے کڑکیت ابھی کڑکا اپنا نہ کہہ چکے تھے جو رات بھی اپنا اندھیرا یا لشکر لے کر نمودار ہوئی۔ عالم دھواں دھار ہو گیا۔ برق مہتاب اڑانے لگی اور توپیں کرج کر اولوں کا گرب پڑنے لگا۔ رات بھر یہی عالم رہا۔ مگر صبح ہوتے مشرق کی طرف سے ایک قدرتی

گولہ ایسا چلا کہ جس نے سب کے دھوئیں اڑا دیے اور عالم میں پھر امن کی روشنی ہوئی۔
چونکہ جہاں یہ اترے تھے وہ جگہ نشیب میں تھی۔ تمام خیموں میں پانی بھر گیا۔ ناچار جگہ بدلنے کا ارادہ کیا۔ غرض یہ تو اپنے اپنے اسباب کے سنبھالنے میں لگے ہوئے تھے اور عین صبح کا وقت تھا جو شیر خاں تمام فوج کو لے کر دفعتہً آن پڑا۔ سب کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور بے تحاشا بھاگے۔ افغان تلواریں کھینچ کھینچ کر دوڑے۔ پل توڑ کشتیوں پر سوار ہو گئے اور جو طوفان زدہ موت کے دریا میں غوطے کھا رہے تھے، بلا کی طرح ان کے پیچھے پڑ گئے۔ نیزے، برچھی، تیر، تفنگ سے شکار کرتے تھے اور تلوار کے گھاٹ سے ملک عدم میں اتار دیتے تھے۔ جواں مرد بادشاہ نے چاہا کہ آج اسی میدان میں جان دے دے، مگر خدا کو ابھی اس سے اور اس کی اولاد سے بڑے بڑے کام لینے تھے۔ اتفاقاً گھوڑا تیر کھا کر بھاگا۔ دریا کے کنارے پر ایک خواجہ سرا فیل سوار کھڑا تھا۔ اس نے دیکھتے ہی ہاتھی بٹھا دیا اور سوار کر کے دریا کی طرف لے چلا۔ فیل بان سے کہا کہ ہاتھی دریا میں ڈال۔ اس نمک حرام کی نیت بگڑی ہوئی تھی۔ حیلے حوالوں میں وقت ٹالنے لگا۔ خواجہ سرا خوجہ تھا مگر ہمت مردانہ میں کوئی کسر نہ تھی۔ اسی وقت تلوار گھسیٹ فیلبان کو دو ٹکڑے کر کے گرایا اور آپ آگے بیٹھ ہاتھی کو دریا میں ہول دیا۔ گنگا سا دریا، برسات کا موسم اور ہاتھی انجانوں کے نیچے، غرض کہ ڈوبتے اچھلتے کنارے پر پہنچے۔ مگر ایسی جگہ پر جا کر نکلے کہ وہاں سے کڑاڑا بہت اونچا تھا۔ اتفاقاً ایک سردار اور دو سپاہی پہلے پار پہنچے تھے۔ وہ دیکھتے ہی دوڑے۔ سر کی پگڑیاں اور کمر کے پٹکے کھول کھول کر رسا بنا بادشاہ کو کھینچ کر نکالا اور پھر آگرے میں آئے۔

اس فتح سے شیر خاں شیر شاہ بن گیا اور آگرے کا رخ کیا۔ ہمایوں بہت گھبرایا۔ ناچار پنجاب میں آیا کہ بھائیوں سے کچھ صورت بنے۔ مگر بھائی حضرت یوسفؑ کے بھائی نکلے اور جب سنا کہ شیر خاں یہاں بھی آیا تو انہوں نے کہا کہ ہم تو کابل اور قندھار پر قناعت کرتے ہیں، تمہیں اپنا اختیار ہے۔ ہمایوں حیران رہ گیا۔ ناچار سندھ کا رستہ لیا اور وہاں کے سرداروں سے مدد مانگی مگر نہ اس ریگستان کی مٹی میں کچھ سکت تھی نہ اس میں

کچھ نظر آتا تھا، جس امید پر کوئی رفاقت کرے۔ بعض نے مدد کی، بعضوں سے لڑائی بھڑائی بھی ہوئی۔ آخر اس ویرانے میں جب کھانے پینے کا بھی ٹھکانا نہ دیکھا اور جودھپور والے کی چند تحریریں پہنچیں تو ارادہ کیا کہ ملتان بیکانیر کے ویران ویران رستے سے دفعتۂ جودھپور پہنچے اور عین ہندوستان کے بیچوں بیچ سر نکالے چنانچہ اسی ارادے پر روانہ ہوا مگر اس تباہی کی تکلیفیں حد بیان سے باہر ہیں۔ ریگستان کی راہ اونٹ کے سوا گھوڑے کا گزارہ نہیں۔ رستے گم، دن کو آگ برسے، رات کو کوچ کرنا پڑے، ستاروں کے حساب پر رستہ چلے، کوسوں پانی کا پتہ نہیں۔ غرض جب جیسلمیر پہنچا تو راجہ نے دیکھا کہ ایک ترک بے سروسامان چلا جاتا ہے، فوج دوڑا دی۔ یہ بھی جانوں سے ناامید تھے، لڑ بھڑ کر ان سے پیچھا چھڑایا۔ جب جودھپور دس کوس رہا تو آپ ٹھہر گئے اور ایک آدمی خفیہ خبر لینے کو بھیجا وہاں ایک باوفا کہ پہلے ہمایوں کا کتاب دار تھا، اب راجہ کا نوکر تھا۔ یہ شخص اس سے جا کر ملا تو معلوم ہوا کہ پہلے بے شک راجہ رفاقت پر تھا۔ مگر ایک تو شکستوں کے حال مفصل سنے۔ دوسرے شیر شاہ کے وکیل پہنچے۔ اب اس کا قطعی ارادہ ہے کہ اگر ہمایوں ہاتھ آئے تو شیر شاہ کے حوالے کر کے سرخ رو ہووے۔

یہاں بے سروسامان خدا کی آس پر جنگل میں پڑے تھے جو رات کے وقت یہ خبر آئی سب گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور انہی کٹھن منزلوں کو پھر دہرانا پڑا۔ بلا کے جنگل میں قدم قدم پر نئی منزل اور ایک ایک بات نئی مہم تھی۔ حاملہ بی بی ساتھ تھی، جس کی سواری میں ایک نوکر کا گھوڑا تھا وہ بھی اس نمک حرام نے مانگا۔ ہر چند بادشاہ نے کہا کہ بھائی وقت کو دیکھ اور بات کو سمجھ۔ مگر جب اس نے زبردستی اتار دیا تو ناچار اپنے گھوڑے پر بی بی کو سوار کیا اور آپ پیادہ ہو گیا۔ ایک اور سردار سے گھوڑا مانگا۔ کیا برا موقع تھا کہ اس کور نمک نے بھی آنکھیں پھیر لیں اور اگر گھوڑا ہاتھ آیا تو قسمت سے مر گیا۔ آخر ایک اونٹ ملا، اسی کو غنیمت سمجھ کر سوار ہو گیا۔ اسی عالم میں اپنے کوکہ کو دیکھا کہ مردار سے گھوڑے پر ماں کو سوار کیا ہے اور آپ ہانکتا چلا جاتا ہے۔ بادشاہ کو ترس آیا۔ بڑھیا کو اپنے پیچھے بٹھا لیا اور کوکہ کو اس گھوڑے پر سوار کیا۔ اگرچہ پیچھے راجہ کی دوڑ کا بھی کھٹکا

لگا تھا مگر پانی کی نایابی غضب تھی۔ بہتوں نے تڑپ تڑپ کر جان دی اور جو زندہ تھے وہ مردوں سے بدتر تھے۔ جب منزلوں کے بعد گاؤں آتا تو گنواروں کو گوارا نہ ہوتا کہ بوند پانی دیں۔ اگر وہ دیتے تو یہاں آپس میں کٹ کر چند پیاسوں کے خون بہتے۔ قسمت سے ایک کنواں نظر آیا۔ سب وہاں اتر پڑے۔ مگر ادھر کے کنوئیں میں پانی بہت دور ہوتا ہے۔ چنانچہ آدمی ڈول کھینچ کر لے جاتا ہے۔ ایک کنوئیں پر کھڑا ہوتا ہے۔ جب ڈول نکلتا ہے تو کنوئیں والا ڈھول بجاتا ہے۔ تب کھینچنے والے کو خبر ہوتی ہے کہ وہ ٹھہر جاتا ہے۔ لوگ ایسے پیاسے ہو رہے تھے کہ جب کنوئیں میں سے ڈول نکلا تو دس پانچ آدمی ایک ہی دفعہ اوپر جا پڑے۔ چند مرتبہ پانی ضائع ہو کر ڈول کنوئیں میں گر پڑا۔ بڑے بڑے جوانمرد مارے پیاس کے تڑپتے تھے اور زار زار روتے تھے۔ کئی آدمی کنوئیں میں گر کر پیاس کے عذاب سے چھوٹے۔ آخر چتوں کے دونے بنا کر اور سر کی پگڑیاں کمر کے پٹکے لگا کر پانی کھینچا اونٹ اور گھوڑے مدت سے پیاس بھر پانی کو ترس رہے تھے، اتنا پی گئے کہ اکثر تو جان سے جاتے رہے۔ غرض پچھلی رات باقی تھی غنیمت سمجھ کر دم کے دم آرام لیا۔ مگر صبح ہوتے ہی سب کے منہ فق ہو گئے کیونکہ بستروں پر آنکھ کھول کر پہلے جس کی صورت دیکھی وہ کالا غبار تھا۔ جس میں سے جودھپور والے کا بیٹا نکلا اور آتے ہی للکارا کہ " اے ترکو مسلمانو! نے گھر بے خانمانو! تم کون تھے جو بے اجازت ہمارے ملک میں چلے آئے۔ مگر تقدیر کی خبر نہ تھی کہ انہیں آفت زدوں میں ایک بی بی کے پیٹ میں وہ بچہ ہے جسے ہند کا شہنشاہ ہونا ہے اور چار دانگ ہندوستان میں اس کے نام کا ڈنکا بجنا ہے۔ یہ دیکھ کر مصیبت زدوں کی آنکھوں میں موت کی تصویر پھر گئی اور ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگا۔ سو راجپوت ان میں سے گھوڑے مار کر الگ ہوئے اور پھیل کر انہیں گھیر لیا۔ جس نے سامنا کیا وہ تو جان سے گیا۔ باقی جنگل میں تتر بتر ہو گئے اور جس جو ہڑ پر ان کی زندگی کی آس تھی اسے انہوں نے قبضہ مین کیا۔ جب بہتوں کو مار کر جی ٹھنڈا کیا تو راجہ کا بیٹا سفید جھنڈا لے کر خود امان دیتا ہوا آیا اور کہا کہ تم لوگ ہمارے علاقے میں بے اجازت کیوں آئے اور دھرم کے راج میں گئے کیوں ذبح کی۔

انہوں نے کہا کہ پیٹ ظالم ہے، جب کھانے کو نہ ملے تو کیا کریں۔ بیکسوں کی حالت ایسی ہو رہی تھی کہ دشمن کو بھی سوائے رحم کے کچھ بن نہ آئی۔ اور جانے کی اجازت دی۔ مگر قدرتی دشمن کو کون ٹال سکے۔ کڑی منزلوں کی بلائیں سامنے تھیں اور قسمت کی گردش پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ آخر مرتے دکھ بھرتے چلے۔ جب قدیمی نمک حلال اور جانی رفیق تڑپ تڑپ کر آنکھوں کے سامنے مر گئے تو شاہ بے سپاہ سات آدمیوں کے ساتھ امر کوٹ میں داخل ہوا۔ راجہ وہاں کا اس عالم میں بھی اسی عالی ہمتی سے پیش آیا کہ جو خاندانی راجاؤں کے بادشاہوں کے ساتھ چاہیے۔ چنانچہ یہاں بیٹھ کر بھی چاروں طرف ہاتھ پاؤں ہلائے۔ مگر قسمت یاور نہ تھی۔ قدم نہ جمے۔ آخر جب کہیں ٹھکانہ نہ ملا تو خدا کا گھر یاد آیا۔ حج کا ارادہ کیا اور سب رفیقوں کو لے کر قندھار کے رستے پر چلا۔

ایک دن دامن کوہ میں منزل کیے پڑے تھے جو ایک سوار گھوڑا مارے بیرم خاں کو پوچھتا آیا۔ سیدھا اس کے خیمے میں چلا گیا اور کہا کہ قندھار میں عسکری مرزا بادشاہ کے بھائی کو ان کے اس حال سے یہاں آنے کی خبر جا پہنچی۔ چنانچہ انہوں نے تحقیق کے لئے ایک آدمی بھیجنا چاہا۔ مگر میرے دل کی عقیدت کی انہیں خبر نہ تھی۔ اس لئے بے تکلف مجھ سے کہا۔ میں نے غنیمت سمجھا اور انہی کے خاصے کا گھوڑا لے کر روانہ ہوا کہ جلد پہنچوں اور حضور کے حق نمک سے ادا ہوں۔ بیرم خاں اسی وقت بادشاہ کے پاس دوڑا گیا۔ وہ سن کر بہت گھبرایا اور کچھ سوچ کر تیاری کا حکم دیا۔ جو رفیق ہمراہی میں تجویز ہوئے تھے ان میں گھوڑے بھی پورے نہ تھے۔ غرض رستے کی تکلیف اور گرمی کے سبب سے اکبر کو تو وہیں چھوڑا، آپ بی بی کو ساتھ لے کر ترکستان کا ارادہ کیا۔ بیرم خاں نے آکر پھر عرض کی کہ وطن سے آپ کے والد نے کیا پایا جو آپ پائیں گے۔ خدا پر توکل کریے اور ایران کو چلئے کہ وہاں کے لوگ مہمان نواز ہیں۔ دیکھیے شاہ صفی صوفی نے امیر تیمور کے ساتھ کیسا سلوک کیا۔ اس کی اولاد نے حضور کے والد کے ساتھ دو دفعہ رفاقت کی یہ بات ہمایوں کی سمجھ میں آ گئی۔ سب کو یہاں چھوڑا اور اس طرف روانہ ہوا۔ ان بائیس آدمیوں میں کوئی ایسا بھی نہ تھا جس نے پہلے وہ رستہ دیکھا ہو اور بدرقہ 15 کا تو کیا ذکر

ہے۔ خدا کی قدرت ادھر ان کا یہاں سے نکلنا کہ عسکری مرزا بھی آن پہنچا۔ روانگی کی خبر سن کر دل میں بہت افسوس کیا مگر ظاہر میں کہا کہ میں تو بھائی کے آنے کی خبر سن کر استقبال کو آیا ہوں۔ خزانچی کو بلا کر کہا کہ خزانہ لاؤ مگر اس کا خزانہ حمام کا خزانہ ہو رہا تھا۔ خیر بھوکوں کے پیٹ کاٹتا تھا اس کا خوب خمیازہ کھینچا۔ اکبر کو لا کر چچا کی گود میں دیا۔ اس نے ظاہر میں بھتیجے کو بہت پیار کیا اور سب کو لے کر قندھار چلا گیا۔

ادھر جب ہمایوں یہاں سے نکلا تو خدا نے ایک بلوچ اپنی قدرت سے بھیج دیا کہ راہ بر ہوا اور یہ بے سامان قافلہ جس کا قافلہ سالار ہمایوں بادشاہ تھا، سیستان میں پہنچا۔ وہاں عمل شاہ ایران کا تھا۔ شاہ کی طرف سے پہلے ہی قدم قدم رستے کے لئے مفصل حکم پہنچ گئے تھے۔ حاکم کو معہ فوج سرحد پر حاضر پایا۔ چنانچہ جہاں جہاں ہمایوں پہنچتا حاکم شہر یا پیادہ سرحد اور قدروے کر رکاب پکڑ ساتھ ہو لیتا۔ جو کچھ پوچھتا اس کا جواب دیتا۔ جتنی دور حکم تھا اتنی دور پیادہ چل کر سوار ہو جاتا اور مع لشکر پیچھے پیچھے روانہ ہوتا۔ جو باغ یا محل اترنے کے لئے ہوتا اس کی آرائش کی کیا تعریف ہو۔ کوسوں مخمل اور زربفت کے فرش پا انداز ہوتے تھے۔ جب وہاں پہنچتے تو جشن شاہانہ سے دربار ہوتا اور سب نذریں دیتے۔ غرض جس حاکم کو دیکھا بندہ فرماں بردار تھا اور جہاں پہنچا گویا اپنا ہی گھر بار تھا۔ اسی طرح برابر ضیافتیں اور مہمانیاں ہوتی چلی آئیں۔ بیرم خاں کہ رزم میں رستم اور بزم میں ارسطو بن جاتا تھا، نامہ لے کر گیا اور جواب[16] نہایت باصواب لایا۔ غرض وہ شہریار بے ملک، شہر شہر کی سیر کرتا، مشہور مشہور مقاموں کو دیکھتا چلا جاتا تھا۔ جب دارالخلافہ پر پہنچا تو دونوں بادشاہوں میں عجب لطف سے ملاقات ہوئی۔ جہاں خورشید کلاہ ایران میزبان اور امیر تیمور کا پوتا ہندوستان کا بادشاہ مہمان ہو، اس مہمان داری کی دھوم دھام کا کیا بیان ہو۔ مگر حق یہ ہے کہ ادارائے ایران نے مہمان داری کا حق اس خوبصورتی سے ادا کیا کہ آج تک تاریخوں کے صفحے اس کی خوبیوں سے آراستہ ہیں۔ تمام ملک میں حکم دے دیا کہ شکست کا لفظ زبان پر نہ آئے تاکہ میرے مہمانوں کا دل شکستہ نہ ہو۔ ایک دن شاہ ایران نے ایوان شاہی میں ہمایوں کی ضیافت کی۔ جب

دسترخوان اٹھا تو ارباب نشاط اپنے اپنے کمال دکھانے کو حاضر ہوئے۔ چنانچہ ایک نے یہ غزل گانی شروع کی۔

ہمایوں منزلے کان خانہ راما ہے چنیں باشد
مبارک کشورے کان عرصہ راشا ہے چنیں باشد

شاہ اور تمام اہل دربار سن کر اچھل پڑے۔ مگر دوسرا شعر اس نے یہ گایا:

زرنج و راحت گیتی مشو خنداں مرنجاں دل!
کہ آئین جہاں گا ہے چناں گا ہے چنیں باشد

یہ سن کر ہمایوں کے دل پر ایسی چوٹ لگی کہ آنسو بھر آئے۔ شاہ کو بھی اس بات کا بہت رنج ہوا۔ فوراً اس گویے کو اٹھا دیا اور دوسری چوکی حاضر ہوگئی۔

ایک دن دونوں بادشاہ برابر بیٹھے تھے مگر ہمایوں کا زانو مسند سے ذرا نیچے تھا۔ بیرم خان کو تاب نہ آئی۔ اسی وقت کمر سے چھری نکال اپنا زریں پٹکا کاٹا اور آقا کے زانو کے نیچے بچھا دیا۔ یہ نمک کا جوش شاہ کو بھی بہت بھایا اور ہمایوں سے فرمایا کہ ایسے جان نثار تمہارے ساتھ تھے پھر کیا ہوا کہ یہاں تک نوبت پہنچی۔ اس نے جواب دیا کہ ان کی رائے پر عمل نہ کیا اور بھائی جو قوت بازو ہوتے ہیں وہ درپے خرابی ہوگئے۔ شاہ نے کہا کہ اس ملک کے لوگوں نے بھی رفاقت نہ کی؟ ہمایوں بولا کہ وہ قوم غیر مذہب، غیر جنس ہے۔ ان سے ہم لوگوں کا اتفاق ممکن نہیں۔ شاہ نے کہا کہ جب بادشاہ غیر قوم میں داخل ہو، واجب ہے کہ ان سے اتحاد اور یگانگی پیدا کرے۔ اب کی دفعہ تم بھی اس بات کا لحاظ ضرور رکھنا۔ تھوڑی دیر میں دسترخوان بچھا۔ سام مرزا اس کا بھائی کمر بستہ کھڑا تھا۔ اسی وقت سلانچی آفتابہ سامنے لایا اور ہاتھ دھلوائے۔ چنانچہ شاہ نے اشارہ کیا کہ دیکھو بھائیوں کو اس طرح رکھتے ہیں۔ مہمانوں کی تفریح طبع کے لئے کئی دفعہ شکار جرگہ 17 بھی کیا اور ان میں پہلے اپنے ساتھ ہمایوں کو شکار کھلوایا۔ پھر بیرم خان کو، پھر اپنے بھائی سام مرزا کو اجازت دی۔ پھر حکم عام ہوگیا۔ غرض کئی برس کے بعد جب مہمان خود مہمانیاں کھاتے کھاتے تھک گئے تو شاہ نے بڑی شان و شوکت سے رخصت کر بارہ ہزار

قزلباش کا لشکر ایک جانباز بہادر کی سرداری سے ساتھ کیا اور شگون کے لئے اپنے شیر خوار بیٹے کے نام پر سپہ سالاری کر کے ساتھ کر دیا۔ ہمایوں نے بھی وعدہ کیا کہ بعد فتح کے قندھار شہزادہ کے نام پر کر کے سلطنت ایران سے متعلق کر دیا جائے گا۔ غرض آتے ہی قندھار کا محاصرہ کیا اور کئی مہینے کے بعد فتح کیا۔ عسکری مرزا ننگی تلوار گلے میں ڈال معافی کے لئے سر دربار حاضر ہوا۔ ہمایوں کابل میں آیا وہاں کامران کامرانی کرتا تھا۔ اس نے مقابلہ کیا۔ چند روز تک محاصرہ رہا۔ آخر یہ بھی قلعے کو نہ تھام سکا۔ دیوار توڑ کر رات کو نکل بھاگا۔ فتح یاب لشکر شہر میں داخل ہوا۔ گھر گھر عید ہوگئی۔ شام کو بادشاہ بھی پہنچا۔ شہر کے لوگوں نے چراغاں سے رات کو شب برات کر کے دلوں کی عقیدت کو روشن کیا۔ ہندوستان میں شیر شاہ کا بیٹا بھی کئی برس بادشاہت کر کے مر گیا تھا اور ہندوستان پانچ بادشاہوں میں بٹ گیا تھا۔ ہمایوں کے آنے کو لوگوں نے غنیمت سمجھ کر طلب کیا۔ چنانچہ دو تین میدان مار کر دلی پر قابض ہو گیا۔ چاروں طرف فرمان جاری کئے۔ پرانے قلعہ کی مرمت اور تعمیر کر کے دین پناہ نام رکھا۔ ہمایوں کو علم ہیئت کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ سات سیاروں کے بموجب سات محل بنوائے تھے۔ ان میں ہر سیارے کے مناسب کاروبار اور دربار ہوتے تھے۔ مثلاً اگر جمعرات کو کہ مشتری سے منسوب ہے، علماء اور مشائخ کی صحبت ہوتی تھی تو پیر کو کہ زہرہ سے منسوب ہے۔ ارباب نشاط سے عشرت ہوتی تھی۔ غرض شیر منڈل جس کی ایک ٹوٹی پھوٹی عمارت اب بھی باقی ہے۔ وہاں کتب خانہ تھا۔ شام کو زہرہ طلوع ہونے والا تھا، اس کے دیکھنے کے لئے کوٹھے پر چڑھا۔ جب اترنے لگا تو زینے سے پاؤں پھسل گیا اور ایسا بے ڈھب گرا کہ بے ہوش ہو کر پھر ہوش میں نہ آیا۔ اسی وقت اٹھا کر اندر لے گئے۔ سارے طبیب جمع ہوئے مگر کوئی دوا کارگر نہ ہوئی اور چوتھے دن مر گیا۔ تاریخ یہ ہوئی کہ:

ہمایوں بادشاہ از بام افتاد

اکبر اس وقت جالندھر کے پہاڑوں میں افغانوں سے لڑ رہا تھا۔ اہل مصلحت نے ادھر تو اسی وقت عریضہ لکھا، ادھر بادشاہ کا مرنا مشہور نہ کیا۔ کہتے تھے کہ ضعف بہت ہے

اس لئے دربار نہیں کر سکتے۔ شکیبی شاعر بادشاہ سے بہت مشابہ تھا۔ اسے کبھی کبھی دیوان عام کے کوٹھے پر لباس شاہانہ پہنا کر بٹھا دیتے۔ سب نوکر نیچے میدان میں کھڑے ہو کر مجرا کر لیتے اور یہی جانتے کہ بادشاہ بیٹھے ہیں۔ جب اکبر کلانور 18 میں تخت نشین ہو گیا تب اس راز مخفی کو کھولا۔

جلال الدین اکبر بادشاہ

جب کہ ہمایوں جودھپور کی مصیبت بھر کر امر کوٹ میں پہنچا تو پل کی پل ستارہ نے آنکھ کھولی یعنی اکبر پیدا ہوا۔ شاہ بے سپاہ کے نمک حلال رفیقوں نے آ کر مبارک بادیں دیں۔ اس کے پاس کوئی رسم ادا کرنے کا سامان نہ تھا، چپ ہو گیا۔ لیکن کمر میں ایک مشک نافہ یاد آ گیا۔ وہی نکالا اور شگون کے لئے ذرا ذرا سا مشک سب کو بانٹ[19] دیا۔ خدا کی قدرت اس نحوست کے وقت میں کسے خیال ہوگا کہ اس بچے کے شمیم اقبال بوئے مشک کی طرح تمام عالم میں پھیلے گی۔ چند ہی روز کے بعد قندھار کا سفر پیش آیا۔ اس منزل دنیا کے تازہ وارد کو باپ کا ساتھ دینا پڑا۔ مگر راہ میں ہمایوں تو مرزا عسکری یعنی بھائی کے ڈر سے ایران کو بھاگا۔ بیٹے کو گرمی کے سبب سے جان نثاروں کے حوالے کیا اور ماں کلیجہ پکڑ کر روتی دھوتی خاوند کے ساتھ چلی گئی۔ پیچھے مرزا عسکری یعنی چچا آیا رہا سہا اسباب بھائی کا سمیٹ قندھار کو چلا گیا اور بھتیجے کو کابل میں دوسرے چچا کامران کے پاس بھیج دیا۔ یہ نونہال اقبال کا وہاں پرورش پاتا اور ایسی باتیں کرتا کہ دیکھنے والوں کا تعجب آتا۔ کامران کا بیٹا اس سے کئی برس بڑا تھا اور یہ دودھ پیتا تھا۔ ایک دن چچا نے دونوں کو کشتی لڑوایا۔ اس کی انا۔ ہمایوں اور بیگم کی یاد میں اور اپنی قید میں آٹھ پہر روتی رہتی تھی۔ اس نے شگون لیا اور دل میں کہا کہ اگر اس وقت اکبر نے اس لڑکے کو پچھاڑ دیا تو جانوں گی کہ اس کے باپ کا اقبال بھی ضرور پلٹے گا۔ خدا کی شان اس نے حریف کو اس طرح اٹھا کر پٹکا کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ کہتے ہیں کہ جب ہمایوں ایران سے پھرا اور کابل کا محاصرہ کیا تو باہر سے قلعہ پر توپیں مار رہے تھے کہ فصیل پر کوئی بیٹھا

ہوا معلوم ہوا۔ جب اس پر مارنے لگے تو کبھی توپ رنجک چاٹ گئی۔ کبھی گولا اگل دیا۔ سب حیران ہوئے۔ آخر معلوم ہوا کہ اس طرف سے گولوں کی بہت بوچھاڑ دیکھ کر بے رحم چچا نے بھتیجے کو بٹھلا دیا ہے۔

جب فتح یاب شہر میں داخل ہوئے تو بیگماتیں محل سرا میں جا اتریں۔ اس وقت عجب لطف ہوا یعنی بادشاہ بیگم بھی انہی میں مل کر بیٹھ گئیں۔ اب اکبر سوا چار برس کا تھا۔ انا انگلی پکڑے لائی اور کہا کہ لو اماں جان کو پہنچا تو اوران کی گودی میں جا بیٹھو۔ اکبر نے بیچ میں کھڑے ہو کر سب کو بغور دیکھا اور دوڑ کر سیدھا ماں کی گود میں جا بیٹھا۔ غرض ہونہار بیٹا باپ کے ساتھ کئی برس تک فتوحات میں اپنے اقبال سے مدد دیتا پھرا۔ جب دلی میں آئے تو باپ دارالخلافہ میں حکمرانی کرتا تھا اور افغان جو پنجاب کے دامن کوہ میں چھپے تھے یہ ان پر دشمن شکاری کی مشق کرتا پھرتا تھا کہ دفعۃً باپ کے مرنے کی خبر پہنچی۔ بیرم خاں اتالیق تھا۔ چنانچہ اکبر اسے خان بابا کہتا تھا اور وہی کاروبار کا منتظم تھا۔ اس نے فوراً سرداروں کو جمع کر کے شہزادے کے سر پر تاج شاہی رکھ دیا اور دلی کی طرف تخت رواں کا رخ کیا۔ رستے میں خبر لگی کہ ہیمو بقال نے آگرہ لے کر دلی کی طرف باگیں اٹھائیں۔ جالندھر کے مقام پر عرضیاں پہنچیں کہ دلی کے حاکم نے آگے بڑھ کر میدان کیا تھا۔ مگر خود شکست کھا کر پنجاب کو بھاگا اور ہیمو دلی میں آ گیا۔ اکبر تو لڑکا تھا سنتے ہی چپ ہو گیا۔ مگر تمام سرداروں کی آنکھوں میں شیر شاہی معرکے پھر گئے اور کہا کہ دشمن ایک لاکھ سوار اور ہزار ہاتھی کی فوج رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ اس حال سے مقابلہ کرنا اپنے خون سے ہاتھ دھونا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ یہیں سے کابل کو پھرو، سال آئندہ میں آ کر خبر لیں گے۔ اکبر نے بیرم خاں سے علیحدہ کہا کہ دادا کا نام اور والد کا کام تمہارے دم سے بنا، اب تم کہو کہ صلاح کیا ہے؟ اس نے کہا کہ تمام دربار میرے حاسدوں سے بھرا ہوا ہے۔ آپ کے والد کی قدر دانی سے میرا گزارہ تھا۔ اس معرکے کا سنبھال لینا بھی کچھ بڑی بات نہیں۔ مگر یہ لوگ میری بات پیش نہ جانے دیں گے۔ اکبر نے ہمایوں کی روح کی قسم دے کر کہا کہ تم کسی کی پروا نہ کرو اور بے تامل جو مناسب دیکھو وہ کرو۔

خان خاناں نے پھر جلسے میں آ کر تقریر کا سلسلہ ہلایا۔ سب نے کہا کہ بیگانے ملک میں مر کر لاشے چیل کوؤں کو کھلانے سے کیا حاصل۔ بہتر یہ ہے کہ کابل میں چک کر بیٹھو اور ادھر سے لشکر لے کر سال آئندہ میں مہم کرو۔ بیرم خاں نے کہا کہ جس ملک کو دو دفعہ لاکھوں جانیں دے کر لیا، اسے بے مرے مارے دشمن کے حوالے کرنا مردانگی کا منہ کالا کرنا ہے۔ بادشاہ تو آج بچہ ہے مگر ہم تم بوڑھے سردار ہیں۔ آقا نے عزتیں بڑھا کر ایران توران تک ہمارا نام روشن کیا۔ لوگ کیا کہیں گے؟ سفید داڑھیوں پر یہ روسیاہی اٹھانی بڑے حیف کی بات ہے۔ اکبر اسی چھوٹی سی عمر میں سنبھل کر ہو بیٹھا اور کہا کہ خان بابا میری رائے تمہارے ساتھ ہے۔ اب کہاں جانا اور کہاں آنا۔ بغیر مرے مارے ہندوستان نہ چھوڑیں گے۔ یا تخت یا تختہ۔ بچے کے اس کلام سے بڈھوں کی خشک رگوں میں خون مردانگی دوڑ گیا۔ بیرم خاں، خان خاناں اسی وقت تلوار ٹیک کر اٹھ کھڑا ہوا اور کوچ کا حکم ہو گیا۔ رستے میں ادھر کے بھاگے ہوئے سردار آ کر ملنے شروع ہوئے۔ خان خاناں نے بہت شرمندہ کیا اور کہا کہ سبحان اللہ آقا کے بعد اس کے بیٹے کے ساتھ جواں مرد اسی طرح حق نمک ادا کرتے ہیں۔ غرض کسی کو سزا کسی کو دلاسا دیتے چلے۔

ہیمو ڈھوسر بھی نام کو بقال تھا مگر ہمت کا بورا اور عقل کا ٹوکرا ہی تھا۔ دلی لے کر دل اور بھی قوی ہو گیا تھا۔ بڑے بڑے افغانوں کو توپ خانہ دے کر آگے بڑھایا مگر انہوں نے ہراول سے ہاتھی چھنوا دیے۔ پانی پت کے ڈیروں دونوں لشکروں کا مقابلہ ہوا۔ ہیمو نے پہلے توپوں کا زنجیر باندھا۔ پھر ہاتھی جن کا اسے بڑا گھمنڈ تھا اور کئی بادشاہوں کے گھر بگاڑ کر جمع کیے تھے، انہیں دیوار فولاد کی طرح قائم کیا۔ ایک ہاتھی پر کہ ڈیل ڈول میں ابر سیاہ اور رفتار میں بجلی تھا اور اس کا نام ہوائی رکھا تھا خود صندوقی ہودج میں بیٹھ کر قائم ہوا۔ طرفین کے بہادر داد مردانگی کی دینے لگے۔ اسی حالت میں ایک قضا کا تیر ہودج کو توڑ کر ہیمو کی بھینگی آنکھ میں لگا۔ خون جاری ہوتے ہی تمام فوج میں ہل چل پڑ گئی۔ ہیمو نے آپ تیر کھینچ رومال سے آنکھ باندھ لی اور ہودج میں کھڑا ہو گیا۔ ادھر ادھر پھرتا تھا اور سرداروں کو پکارتا تھا، مگر ہاتھی تیروں کی بوچھاڑ سے بھاگا۔ ایک ترک بے خبر تھا کتا

ہاتھی دیکھ کر دوڑا اور فیل بان پر تیر جوڑا۔ وہ چلایا کہ نہ مارنا۔ مطلب میرے ہی پاس ہے۔ یہ سن کر خوش ہوگیا۔ تین کوس پیچھے بادشاہ تھے۔ ہاتھی کو گھیر کر وہاں پہنچایا اور باندھ کر سامنے حاضر کیا۔ خان خاناں نے اکبر سے کہا کہ پہلی مہم ہے۔ حضور خود شگون فرمائیں کہ جہاد اکبر ہو۔ وہ ہنس کر بولا کہ بندھے ہوئے دشمن پر؟ غرض بادشاہ نے تلوار چھوادی۔ خانخاناں نے بیٹھے بیٹھے ایک ہاتھ ایسا مارا کہ اس کا سر پاؤں میں گر کر کابل پہنچا اور بالا حصار کے دروازے پر لٹکا۔ بدن دلی میں بھیج دیا کہ اس فتح عظیم کی خبر خاص و عام کو ہو جائے۔ خود دارالخلافہ میں آیا اور دوبارہ تخت نشینی کا جشن کر کے اہل مراد کی مرادیں پوری کیں۔ بعد اس کے صوبوں کے بندوبست شروع ہو گئے۔ بڑے بڑے راجہ مہاراجہ، ٹھاکر، سردار حاضر دربار ہوئے۔ ہر علم اور فن کے صاحب کمال خدمت میں رہنے لگے۔ اکبر اگرچہ خالص ترک بچہ تھا اور علم سے بے بہرہ، مگر اسی وقت سے سب کے ساتھ محبت اور ملنساری کے ڈھنگ ڈالتا تھا۔ بیٹھتا تو تاریخی داستانیں اور علمی باتیں سنتا۔ اٹھتا تو ہاتھی لڑاتا، شیر مارتا۔ باز اڑاتا، ملک گیریاں کرتا اور ملک بخشتا۔ دکن کی طرف اکثر علاقے فتح کر کے ابراہیم مرزا اور حسین مرزا وغیرہ تیموری شاہزادوں کو دے رکھے تھے اور احمد آباد گجرات میں اپنے کوکہ مرزا عزیز کو صوبہ کیا تھا۔

اکبر کی یلغار احمد آباد گجرات پر

اکبر ایک دن دربار کر رہا تھا اور اکبری نورتن [20] سے سلطنت کا بازار آراستہ تھا جو دفعتہً پرچہ لگا کہ دکن کے حشری باغیوں نے بہت سی جمعیت پیدا کی ہے۔ چنانچہ حسین مرزا اختیار الملک دکنی کو شریک کر کے ان کا سردار ہوا ہے اور ملک مار کر مرزا عزیز کو اس طرح قلعہ بند کیا ہے کہ نہ وہ اندر سے نکل سکے نہ باہر سے مدد جا سکے۔ مرزا عزیز نے گھبرا کر ادھر اکبر کو عرضیاں ادھر ماں کو خط لکھنے شروع کیے، اکبر اسی فکر میں تھا جو محل میں جی [21] جی نے رونا شروع کر دیا کہ جس طرح ہو میرے بچے کو بلا دو۔ بادشاہ نے دیکھا کہ سارا لشکر بھیر و بنگاہ سمیت اس قدر جلد نہیں جا سکتا، اس لئے دو ہزار کار آزمودہ اور من چلے بہادر تو اسی وقت روانہ کر دیے۔ ساتھ ہی رستے کے حاکموں کو لکھا کہ جتنی کوتل سواریاں ہوں، تیار کر کے اپنی اپنی انتخابی فوج سے سر راہ حاضر ہوں۔ خود تین سو جاں نثاروں سے کہ تمام نامی سردار اور منصب دار تھے۔ سانڈھنیوں پر بیٹھ کوتل گھوڑے لگا، نہ دن دیکھا نہ رات، جنگل اور پہاڑ کاٹ، ستائیس منزلوں کو لپیٹ نویں دن گجرات کے کنارے پر جا کھڑا ہوا۔ شمار کیا تو تین ہزار جوان علم شاہی کے نیچے مرنے مارنے کو کمر بستہ پائے۔ اس وقت کسی نے کہا کہ کچھ جاں نثار آیا چاہتے ہیں ان کا انتظار کرنا چاہیے۔ کسی نے کہا کہ شبخون مارنا چاہیے۔ بادشاہ نے کہا کہ انتظار بزدلی ہے اور شبخون چوری ہے۔ اسی وقت ہتھیار سلاح خانے سے بانٹ دیے۔ مرزا عبدالرحیم [22] یعنی خان خاناں کا بیٹا سولہ برس کا نوجوان تھا، اسے ہراول بنایا۔ دائیں بائیں کی تقسیم کر کے خود سو سوار سے الگ ہوا اور نقارہ کا حکم دیا۔ خان اعظم کو آدمی بھیجا کہ ہم آ پہنچے، تم اندر سے

نکلو۔ اس پر ایسا ڈر چھایا تھا کہ قاصد بھی پہنچے تھے۔ ماں نے بھی خط لکھے تھے مگر یقین ہی نہ آتا تھا۔ یہی کہتا تھا کہ دشمن غالب ہے۔ کیونکر نکلوں؟ آخر جب احمد آباد تین کوس رہا تو نقارہ اکبری پر چوٹ پڑی اور گورکھی[23] کی گرج سے گجرات گونج اٹھا۔ اس وقت بھی غنیم کو اس یلغار کی خبر نہ تھی۔ ڈنکے کی آواز سے اس کے لشکر میں کھل بلی پڑی اور حسین مرزا خود گھوڑا مار کر آیا۔ احمد آباد کے نیچے ایک دریا بہتا تھا، اس کے کنارے پر آ کر کھڑا ہوا۔ ابھی نور کا تڑکا تھا اور ایک بادشاہی سردار پار اتر کر میدان دیکھتا پھرتا تھا۔ حسین مرزا نے دیکھ کر آواز دی کہ بہادر یہ لشکر کس کا ہے اور سر لشکر کون ہے؟ اس نے کہا کہ لشکر بادشاہی اور شہنشاہ آپ سر لشکر ہیں۔ مرزا نے کہا کہ چودھواں دن ہے میرے جاسوسوں نے انہیں آگرے میں چھوڑا ہے۔ سردار مذکور نے ایک قہقہہ مارا۔ مرزا نے کہا کہ اگر بادشاہ ہیں تو ماہی مراتب کہاں؟ اور وہ جنگی ہاتھی کہاں ہیں جو رکاب سے جدا نہیں ہوتے؟ سردار مذکور نے کہا کہ آج نواں دن ہے۔ حضور نے رکاب میں قدم رکھا۔ ہاتھی کیا ہاتھ میں اٹھا لاتے۔ شیر جنگ بہادر بھی ہاتھیوں سے کچھ کم نہیں۔ کس نیند سوتے ہو اٹھو آفتاب سر پر آ گیا۔ مرزا الٹا ہی پھرا اور اختیار الملک کو محاصرے پر چھوڑ کر خود سات ہزار فوج سے سامنے آ کر جم گیا۔ بادشاہ کو انتظار تھا کہ خان اعظم ادھر سے زور دے کر نکلے۔ مگر جب وہ دروازے سے سر بھی نہ نکال سکا تو بادشاہ نے کشتی کا انتظار بھی نہ کیا، توکل بخدا گھوڑے دریا میں ڈال دیے۔ ترکوں کا قاعدہ ہے کہ حملے کے وقت دو بلغہ آگے رکھتے ہیں۔ ہراول نے آواز دی کہ دو بلغہ آگے لاؤ۔ معلوم ہوا کہ سلاخ خانے کا داروغہ اضطراب میں کہیں بھول آیا۔ اکبر نے کہا کہ آگے بڑھو۔ یہی شگون اچھا ہے کہ سامنے میدان صاف ہے۔ غرض بادشاہ کی جمعیت قلیل دیکھ کر مرزا خود پندرہ سو فدائی مغلوں کو لے کر سامنے آیا ور بھائی اس کا بائیں پر گرا۔ ساتھ ہی حبشی اور گجراتی فوج بازوؤں پر آئی۔ ادھر سے بھی ترکی بہ ترکی کلہ بہ کلہ جواب دینے لگے۔ اکبر نے دور سے ۔۔۔۔۔ دیکھا کہ ہراول پر زور پڑا۔ راجہ بھگوان داس نان سنگھ کے باپ سے کہا کہ اپنی فوج تھوڑی ہے اور غنیم ہزاروں ہیں۔ چلو ہم تم مل کر جا پڑیں کہ پنجے سے مشت

کی چوٹ کڑی پڑتی ہے۔ ان دنوں خواجہ معین الدین چشتی سے بہت اعتقاد تھا اور یا معین کا وظیفہ ہر وقت زبان پر تھا۔ آپ اور سو سوار یا معین یا معین کے نعرے لگاتے جا گرے۔ اکبر کا نام سنتے ہی مرزا کے ہوش اڑ گئے۔ فوج بکھر گئی اور خود بے سروپا بھاگا۔ رخسارے پر ایک زخم بھی آیا۔ گھوڑا مارے چلا جاتا تھا کہ ایک چھوٹا سا درخت سامنے آیا ۔گھوڑا جھجکا۔ اس نے چاہا کہ اڑ جائے مگر نہ ہو سکا اور خود گر پڑا۔ بادشاہی سپاہی پیچھے مارا مار چلے جاتے تھے۔ اسی وقت پکڑ لیا اور باندھ کر سامنے لا حاضر کیا۔ ہر شخص کہتا تھا کہ میں نے پکڑا ہے۔ اکبر نے ہنس کر کہا کہ مرزا تم آپ بتا دو تمہیں کس نے پکڑا ہے۔ اس نے کہا مجھے تو حضور کے نمک نے پکڑا ہے۔ غرض ایک ایک کی جانبازی اور جانفشانی کے حال عرض ہوتے تھے اور سپاہی جو گرد و پیش حاضر تھے دو سو بھی نہ تھے کہ پھر ایک پہاڑی کے نیچے سے غبار کی آندھی اٹھی۔ کسی نے کہا کہ خان اعظم نکلا ہے۔ کسی نے کہا کہ غنیم آیا۔ ایک سوار حکم شاہی کے ساتھ دوڑا اور آواز کی طرح پہاڑ سے پھرا۔ معلوم ہوا کہ محاصرے کو چھوڑ کر اختیار الملک ادھر پلٹا ہے۔ بادشاہ نے خود کرنا اٹھا کر پھونکی اور للکارا کہ تیروں کی بوچھاڑ بوچھاڑ! جانباز کمانیں سنبھال سنبھال کر سمٹے۔ ہندو اور مسلمان یا معین یا معین کہتے دوڑے۔ نقارچی ایسا گھبرایا کہ نقارے پر چوب تک بھی لگانی بھول گیا۔ بادشاہ نے اسے بھی ڈانٹا اور خود بجلی کی طرح کڑک کر پہنچا۔ چند متواتر فتحوں سے ہندوستان میں یہ دھاک بندھ گئی تھی کہ اکبر نے تسخیر آفتاب کا عمل کیا ہے۔ جوں ہی اختیار الملک نے سنا کہ اکبر اس غول میں خود موجود ہے یا طوفان کی طرح چڑھا آتا تھا یا بخت برگشتہ کی طرح پیچھے ہٹا اور بھاگتا گرفتار ہو کر مارا گیا۔ جب سارے معرکے طے ہو چکے تو خان اعظم نے بھی صحیح سلامت قلعے سے نکل کر سلام کیا۔ اکبر نے گلے لگایا اور ملک اسی کے سپرد کر کے پھر یلغار ہی کرتا ہوا فتح پور کو پھرا۔ پاس پہنچے تو جو لوگ رکاب میں تھے سب کو دکھنی وردی سے سجایا۔ وہی چھوٹی چھوٹی برچھیاں ہاتھوں میں دیں اور خود ان کا افسر ہو کر شہر میں داخل ہوا۔ فیضی نے دربار عام میں یہ قصیدہ کہہ کر گزرانا:

نسیم خوشدلی از فتح پور[24] می آید
کہ بادشاہ من ازراہ دور می آید

غرض اس طرح کی فتوحات سے کہ جن پر ہزار رستم و اسفندیار کی جان قربان ہو، تمام ہندوستان کو تسخیر کیا اور بنیاد سلطنت کی فقط اس بات پر رکھی کہ کسی کی خوشحالی اور فارغ البالی میں فرق نہ آئے۔ اپنے بیگانے سب آسودہ حال رہیں۔ محاصل کے انتظام، اجناس کی پیداواریں، امدنی کی تدبیریں، زمینوں کی پیمائش، محصولوں کے بندوبست اور حساب کتاب کے آئین ایسے ایسے باندھے کہ اس وقت تک کسی بادشاہ کو نہ سوجھے تھے۔ ہر قسم کے اہل کمال کی قدر دانی کرتا اور ہر مذہب کی رعایت کرتا۔ چنانچہ جزیہ کل ہندوؤں سے موقوف کر دیا۔ راجہ اپنے اپنے راج پر برقرار تھے اور خلوت و دربار میں دم ساز تھے۔ اپنے علماء کے علاوہ بڑے گنی پنڈت اور گویے گنوان خدمت میں حاضر رہتے۔ اشرفیوں کا ڈھیر سامنے لگا رہتا۔ ہر شخص قسمت کے دامن بھر کے لے جاتا۔ دوہرے لنگر خانے جابجا جاری تھے۔ انواع و اقسام کے کھانے پکتے اور ہندو مسلمانوں کے بٹتے۔ جب ہندوؤں سے صحبتیں زیادہ ہوئیں تو معلوم ہوا کہ اس پرانے ویرانے میں بڑا خزانہ ہے مگر دھرم دان پنڈت پتا نہیں بتاتے۔ اس لئے ایک دفتر ترجمے کا مقرر کیا جس میں چند فاضل عربی فارسی کے زبان دان اور بڑے بڑے گنی بدیا دان پنڈت مترجم مقرر کئے اور مکتب خانہ اس کا نام رکھا۔ چنانچہ سنگھاسن تبیسی کی چتلیوں نے ایرانی کپڑے پہنے اور بہت سی کتابیں سنسکرت، عربی، ترکی سے فارسی میں ترجمہ ہوئیں۔ انجیل و توریت کے ترجموں کے لئے شاہان فرہنگ سے خط و کتابت کی ابتدا میں دینداری اور خوش اعتقادی کا دریا جوش میں تھا لاکھوں روپے درگاہوں میں چڑھاتا، فقرا کی بہت خدمت کرتا۔ اجمیر تک کئی مرتبہ منزل بہ منزل پیادہ گیا۔ فتح پور سیکری میں ایوان شاہی کے پاس سب سے الگ ایک عمارت بنا کر عبادت خانہ نام رکھا۔ وہاں رات کو اکیلا شب بیداری کرتا اور ایک سل باہر پڑی تھی اس پر بیٹھ کر نور سحر سے دل روشن کرتا۔ تمام مشائخ اور علماء اور امراء جمعہ کی رات کو جمع ہوتے۔ مکان معطر

سے معطر اور پھولوں سے گلزار ہو جاتا۔ عقلی اور نقلی اور تاریخی تذکروں سے دل خوش کرتے۔ لوگ انعام و اکرام سے نہال ہو جاتے اور نفیس نفیس کتابیں اہل علم کو تقسیم ہوتیں۔ مگران لوگوں نے اپنی نشستوں کے مقام اور عزت واحترام میں جھگڑے نکالے۔ اس لئے حکم دیا کہ امرا آفتاب کے رخ، سادات قبلہ کے رخ، علماء جنوب کی جانب، مشائخ شمال میں الگ الگ ایوان میں بیٹھیں۔ آپ نوبت بہ نوبت ہر ایک جلسے میں آتا اور ہر چمن سے پھول چنتا۔ ہمیشہ جماعت سے نماز پڑھتا۔ سات عالم امام تھے، ہر شخص ہفتے میں ایک ایک دن نماز پڑھاتا۔ ہر سال حج کو قافلہ جاتا۔ ایک دو امیر اس پر میر حاج ہوتے حاجیوں کو سفر خرچ دیتا اور لاکھوں روپیہ کا نقد وجنس بھیجتا۔ ایک دفعہ چھ لاکھ روپیہ بھیجا کہ وہاں محتاجوں کو تقسیم ہو اور ایک عمارت عالی تعمیر ہو۔ جب قافلے کو رخصت کیا تو آپ عین حالت حج کی وضع بنائی۔ وہی دو چادروں کا لباس، ننگے سر ننگے پاؤں تھوڑی دور قافلے کا ساتھ دیا اور جب بآواز بلند لبیک لبیک لاشریک لک لبیک کہنا شروع کیا تو دیکھنے والوں پر ایک عالم طاری ہوا اور اس انبوہ سے غل نالہ وزاری کا بلند ہوا۔

لطیفہ۔ عبادت خانے کے جلسے میں مرزا مفلس نام ایک فاضل کامل کچھ تقریر کر رہا تھا۔ حاجی ملا ابراہیم کہ کج بحثی میں لاجواب تھا، اس نے سوال کیا کہ موسیٰ کیا صیغہ ہے۔ مرزا مفلس اس وقت جواب میں بھی تہی دست نکلے۔ نا انصافوں میں حاجی صاحب کی فوقیت کا شہرہ ہو گیا۔ دوسرے دن اکبر نے کسی اور عالم سے کہا کہ تم رات کے جلسے میں نہیں آتے۔ اس نے ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ حضور جب وہاں حاجی ابراہیم مجھ سے پوچھے کہ عیسیٰ کیا صیغہ ہے تو میں کیا جواب دوں؟ بادشاہ اور سب صاحب فہم بہت محظوظ ہوئے۔ مگر یہ بہار چند روز سے زیادہ نہ رہی کیونکہ حسد تو معلم الملکوت سے علم کے ساتھ ساتھ چلا آتا ہے۔ ان اہل علم نے مباحثوں کے مجادلے بنا دیے۔ ایک عالم جس مسئلے کو ثابت کرتا دوسرا اسے اسی پر تکفیر کرتا اور نامعقول تقریروں سے اتنا غل ہوتا کہ آواز سنائی نہ دیتی۔ بادشاہ نے تنگ ہو کر حکم دیا کہ جو ایسے مباحثے کرے، اسے اٹھا دو۔ آخر ان لوگوں سے بے اعتقاد ہوتے ہوتے مقدمے کی صورت

بالکل بدل گئی۔

شیر شاہی عہد سے چند متعصب علماء کا بڑا زور تھا کہ ان کے سبب سے اکثر صاحب جو ہر جلا وطن پھرتے تھے۔ اس طالب کمال کے پاس ابوالفضل اور فیضی جیسے لوگ پہنچے اور ہر مذہب کے باکمالوں کو دخل ہوا۔ آخر رفتہ رفتہ یہ خیال ہو گیا کہ کوئی مذہب اہل کرامت سے خالی نہیں۔ چنانچہ قربت کے سبب سے پہلے ہندوؤں کے اہل علم آگے بڑھے اور گفتگوئیں ہونے لگیں۔

لطیفہ۔ ایک دن گائے کی تعظیم میں پنڈت تقریر کر رہے تھے، ایک فاضل طبیب نے عرض کی کہ ہماری کتابوں میں بھی لکھا ہے کہ اس کا دودھ شفا ہے مگر گوشت نرا مرض ہے۔ ایک ہندو ظریف بولا کہ حضور اگر گائے میں کچھ عظمت نہ ہوتی تو قرآن میں سب سے پہلے سورۂ بقر کیوں ہوتی۔ اکثر ہندوؤں نے پرانے پرانے اشلوک نکالے جن میں اکبر بادشاہت، کی پیشین گوئی تھی۔ چنانچہ برہمن الہٰ آباد سے آئے اور عرض کی کہ مکند برہم چاری جس نے اپنا تمام بند کاٹ کر ہون کر دیا تھا، اس نے یہ اشلوک بھی لکھ کر دیا تھا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ میں عنقریب ایک بادشاہ با اقبال ہو کر آؤں گا اس وقت تم بھی حاضر ہونا۔ چنانچہ اسی گیان پر حضور کا دھیان کیے بیٹھے ہیں۔ حساب کیا تو اس کے مرنے اور اکبر کے پیدا ہونے میں فقط تین چار مہینے کا فرق تھا۔ بعض لوگوں نے اعتراض کیا کہ برہمن کو ملیکش یعنی مسلمانوں کے گھر میں جنم لینا خلاف قیاس ہے۔ عرض کی کہ اس نے اپنی طرف سے تدبیر کی مگر تقدیر سے ہون کی جگہ کچھ ہڈیاں اور لوہا وغیرہ گر اتھا یہ اس کا اثر ہے۔

ایک بالا خانہ خواب گاہ کہلاتا تھا۔ اکبر خود اس میں بیٹھتا تھا اور ایک برہمن کو چارپائی 25 پر بٹھا کر اس میں رسیاں باندھتے اور کھینچ لیتے تھے، وہ معلق رہتا اور آفتاب اور ستاروں اور دیوتاؤں کے منتر سکھایا کرتا۔ چنانچہ تسخیر آفتاب کا منتر اور اس کے ایک ہزار ایک نام سیکھ کر پڑھنے شروع کیے۔ اکثر شرق کو منہ کر کے سویا کرتا کہ آفتاب خدا کا مظہر ہے اور زراعت و میوہ بلکہ کل کاروبار عالم کے اس پر منحصر ہیں۔ غرض محلوں میں

رانیاں تھیں دربار میں راجہ تھے۔ چند روز کے بعد قبلہ عالم سے مہابلی بن گئے۔ اسلام کی رسموں کو سلام کر کے ڈاڑھی کے ساتھ رخصت کر دیا۔ عیدوں سے زیادہ جشن نوروزی اور ہندی تہواروں کی دھوم دھام ہونے لگی۔ جشن کے دن قبا اور خفتان کے ساتھ عمامہ سر سے بڑھا، جامہ پہن کھڑکی دار پگڑی سر سے باندھی۔ مبارک گھڑی شبھ لگن دیکھ کر پوجا کے بعد برہمن نے پیشانی پر ٹیکا لگایا۔ جواہر نگار کنگنا ہاتھ میں باندھا۔ ادھر بادشاہ نے تخت پر قدم رکھا ادھر کڑاہی میں بڑا اپڑا[26]۔ اور ہون ہونے لگا۔ تلاوان میں منوں سونا اور جواہرات چڑھتا اور دربار میں نچھاور ہوتا۔ دسہرے کو باز ہاتھ پر لیتے۔ قلعہ کے برجوں پر شراب رکھی جاتی۔ بادشاہ کے سبب سے ایرانی و تورانی سب اہل دربار اسی رنگ میں رنگے گئے اور پان کی گلوری اس کا جز ہو گئی۔ گائے کا گوشت اور لسن پیاز وغیرہ بہت سی چیزیں حرام اور بہت سی حلال ہو گئیں، بلکہ جب والدہ کا انتقال ہوا تو پندرہ ہزار اہل دربار کے ساتھ بھدرا کروایا۔ انہی دنوں میں گجرات کی طرف سے آتش پرست آئے، انہوں نے کیانی بادشاہوں کے ساتھ پرانا رشتہ نکال کر اپنے مذہب کی روشنی سے نیا نور پھیلایا۔ ان کی بہت سی رسمیں تو ہندوؤں کے مطابق ہی تھیں۔ حکم ہو گیا کہ قدیم رسم فارس کے بموجب آتش کدہ بنے اور آگ اس کی ہرگز بجھنے نہ پائے۔ چنانچہ ابوالفضل اس کے مہتمم ہوئے دفتر سے سنہ ہجری موقوف ہو کر سنہ الٰہی اکبر شاہی قائم ہو۔ بلکہ کل اکبری آئین کا نام آئین الٰہی رکھا۔ ملک فرنگ سے پادری اور پاپا آئے۔ انہوں نے کتب آسمانی پیش کر کے ان کے مطالب بیان کیے اور بزرگوں کی تصویریں پیش کیں۔ جس وقت حضرت عیسیٰ اور حضرت مریم کی تصویر نکالی تو تعظیم کے لئے دوزانو اٹھ کھڑا ہوا اور اس قدر شوق ہوا کہ ابوالفضل توریت و انجیل کے ترجمے پر مقرر ہوا۔ چنانچہ اول ہی اس نے یہ مصرع کہا:

اے نامی[27] تو ژژو کرستو

دوسرا مصرع سوچتا تھا جو فیضی برابر سے بجا تک لاشریک یاھو بادشاہ کا دل دنیا کی رنگارنگی کا ایک عجائب نمونہ تھا۔ چنانچہ ان رنگوں کے بعد یہ نیرنگ چھایا کہ میں خود خلیفہ

اللہ ہوں۔ اقبال کی یاوری سے برابر فتحیں ہوتی گئیں۔ جو بات منہ سے نکلی وہ بن پڑی۔ خوشامدی نسب پڑھے ہوئے جن تھے۔ انہوں نے اپنا تاریخی تجربہ ذہن نشین کیا کہ ہزار برس کے بعد دنیا میں ایک اولوالعزم خلیفہ خدا اور صاحب مذہب پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ اب آپ خلیفتہ اللہ ہیں۔ شاہ خورشید نگاہ جس نے بہت سے مذہبوں سے نور اٹھایا تھا، اس بات سے نہایت خوش ہوا اور دین الٰہی اکبر شاہی کا انتظام شروع کر دیا کہ آفتاب کی تعظیم اس کا جزو اعظم تھا۔ کلمہ اس کا[28] لا الہ الا اللہ اکبر خلیفتہ اللہ سلام علیک میں اللہ اکبر اور جل جلالہ پر کفایت ہوئی۔ حکم تھا کہ شراب اتنی پیو کہ بدمست نہ کر دے۔ شیر اور سور شجاع جانور ہیں اس لئے ان کا گوشت بھی شجاعت بخشتا ہے۔ جو مرید کہ دین الٰہی میں آتے وہ چیلے کہلاتے تھے۔

دین آئین کے حکم تو ہزاروں تھے مگر خاتمہ اس پر ہے کہ جو شخص مرجائے اس کے گلے میں کچھ اناج اور کچی اینٹیں باندھ کر پانی میں ڈبو دیں۔ پانی نہ ہو تو جلا دیں۔

ایک مرید خاص مرگیا تو اس کی قبر میں جالی رکھی گئی کہ آفتاب کی روشنی پہنچتی رہے بلکہ چراغ کی لو بھی منہ کو لگائی کہ روشنی اور آگ پاک کرتی ہیں۔

عالم بھی ایسے ایسے جمع ہو گئے کہ قاضی نظام بدخشی ایک بڑا فاضل صاحب تصنیف تھا جس کا خطاب قاضی خاں تھا۔ چنانچہ سجدہ زمین بوس کا مصنف وہی تھا۔ ملا عالم کابلی اس پر افسوس کیا کرتا تھا کہ ہائے یہ نکتہ مجھے پہلے نہ سوجھا۔ داڑھی منڈوانے کے لئے بھی چند وجوہات پیدا ہو گئیں۔ نور کے تڑکے بادشاہ کی صورت دیکھنی عبادت تھی، اسی واسطے لب دریا شرق رویہ مکان میں بیٹھتے تھے اس کا نام جھروکہ درشن تھا کہ لوگ وہاں سے مہابلی کے درشن کریں اور وہ سورج دیوتا کے درشن کرتے رہیں۔ اگرچہ بیربل بھی دین الٰہی دکن اعظم تھے مگر ابوالفضل خلیفہ تھے کہ انہی کے ذریعہ سے چیلے پیش ہوتے۔ مریدوں کے لئے چار منزلیں خلوص دل کی تھیں، ترک مال، ترک عیال، ترک زن، ترک ایمان اور اس میں بڑے بڑے امرا اور دکن دربار داخل ہوتے۔ چنانچہ خلیفہ کی تصدیق سے اقرار نامہ لکھ کر گزرانتے۔ خلاصہ مضمون اس کا یہ ہوتا کہ میں فلاں ابن

فلاں عقیدت دل سے اقرار کرتا ہوں کہ اسلام مجازی اور دین تقلیدی کو چھوڑ کر دین الٰہی اکبر شاہی میں داخل ہوا اور چاروں خلوصوں کو صدق دل سے قبول کیا۔ چیلوں کو بجائے شجرے کے ایک تصویر بادشاہ کی مل جاتی تھی اور اللہ اکبر کا وظیفہ[29] ہوتا۔

لطیفہ۔ خان اعظم اکبر کا کوکہ اور سپہ سالار ایک سیدھا سادھا مسلمان تھا کہ داڑھی اس کی بہت لمبی تھی۔ وہ کسی علاقے پر تھا۔ کئی دفعہ بادشاہ نے اسے بلایا وہ کاروبار کے سبب سے نہ آسکا۔ آخر فرمان تاکیدی میں یہ بھی لکھا گیا کہ معلوم ہوتا ہے تمہیں داڑھی کا بوجھ ہلنے نہیں دیتا جو یہاں تک آؤ۔ ناچار ہو کر بچارا حج کو چلا گیا۔ مگر آکر سجدہ بھی کیا۔ داڑھی کو بھی صفائی دی اور مریدوں میں بھی داخل ہوا۔

ایک دن تجویز ٹھہری کہ نماز جمعہ کے بعد بجائے خطبہ کے خلیفۃ اللہ کچھ آپ ارشاد کریں۔ چنانچہ تمام امرا جمع ہوئے مگر جب خلیفۃ اللہ منبر پر چلے تو دفعۃً تھرتھرانے لگے اور جو کچھ سوچا تھا ایک حرف زبان سے نہ نکلا۔ آخر فیضی کے چند شعر پڑھ کر اتر آئے کہ وہ بھی اور لوگ بتاتے گئے۔ خود بھی عبادت کرتے تھے مگر راودھنگ اس کا نرالا رکھا تھا یعنی آفتاب کے سامنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ کر کھڑے ہوتے، کچھ اچھلتے کچھ چکر کھا کر کانوں پر مکے مارتے جاتے تھے۔ اپنا سر بھی تالو پر سے منڈواتے تھے کہ بزرگوں کی روح تالو میں سے نکلا کرتی ہے۔

بدیاوان پنڈتوں نے ایک ہزار ایک نام ان کا بھی تصنیف کیا کہ وہ چیلوں کا وظیفہ تھا۔ جب آپ عبادت کر کے باہر آتے تو چیلے انہیں دیکھتے ہی سجدے میں گر پڑتے۔ عبادت کا وقت صبح اور آدھی رات تھی۔ ان دونوں وقتوں میں اذان کی جگہ نوبت اور باجے بڑے زور شور سے بجتے تھے۔ جانور کا ذبح اتوار کو تمام ملک میں منع تھا کہ خلیفۃ اللہ کا جنم دن ہے۔ جشن ولادت میں مہینہ بھر تک ذبح کی ممانعت رہتی تھی۔ حکم تھا کہ ذبح کرنے والے کا ہاتھ اور جو شریک ہو اس کی انگلی کاٹ[30] لو۔

چونکہ ان تمام باتوں کے لئے کرامات کا لازمہ بھی ضرور ہے اور ان میں سے یہاں کچھ نہ تھا۔ اس لئے صاحب کرامت فقیروں اور جوگیوں وغیرہ کی بہت تلاش رہتی

تھی۔ لوگوں نے کہا کہ خطا اور تبت میں لامے گرد ترک دنیا کر کے پہاڑوں میں دو دو سو برس تک زندگی کرتے ہیں اور بڑی بڑی عمریں پاتے ہیں۔ اس لئے بادشاہ نے بھی محلوں میں جانا چھوڑ دیا۔

لطیفہ۔ ایک مکار اسی شہر لاہور میں مشہور ہوا کہ دریا کے کنارے پر باتیں کرتے کرتے دفعتہً بے پل و بے کشتی پار جا کھڑا ہوتا ہے اور وہیں سے آواز دیتا ہے کہ تم گھر جاؤ اب ہم جاتے ہیں۔ بادشاہ نے اسے بلا کر خلوت میں بہت سے دم دیئے اور اخیر میں دھمکا کر سمجھایا۔ تب اس نے پیٹ کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ سب اس دوزخ کے واسطے ہے اور حقیقت حال یہ کھلی کہ آپ تو باتیں کرتے کرتے پانی میں کود کر ادھر ادھر چھپ جاتا تھا۔ بیٹا اس کا ہم آواز تھا وہ پار کھڑا رہتا تھا اور وہاں سے آواز دیتا تھا۔ لوگ جانتے تھے کہ شاہ جی نے کرامات دکھائی۔ باوجود ان باتوں کے کمال اور ہنر کا طالب اور شجاعت کا نہایت قدردان تھا۔ جب اس کی قدردانی سے اہل فرنگ کی آمد و رفت جاری ہوئی تو ایک باجا آیا اس کا نام ارغنوں تھا۔ لفظ میں تو ارگن کا معرب معلوم ہوتا ہے مگر اس میں بہت کچھ کھڑاگ تھا یعنی اک بڑا صندوق تھا اور جدھر سے کھول کر بجاتے تھے ادھر مور کی دم یا کسی اور جانور کے پر لگے تھے کہ انہیں انگلیوں سے دباتے تھے۔ اس سے ایسے نغمہ ہائے رنگیں نکلتے تھے کہ سننے والے حیران رہ جاتے تھے۔ پھر مشہور ہوا کہ اس کے اندر دو آدمی بھی ہیں ان کا کچھ تصرف ہے۔ ان لوگوں نے بلون پر اڑ کر دیکھنے والوں کی عقل اڑائی۔ شاہزادہ مراد اور چند امیر زادوں کو فریتون فرنگی کا شاگرد کیا کہ یونانی زبان سیکھیں۔ حکیم علی گیلانی نے ایک حوض ایسا طلسمات کا بنایا کہ پانی سے لبریز تھا اور اندر ایک پہلو میں وسیع حجرہ کھلا تھا مگر پانی اس میں نہ جا سکتا تھا۔ دریائے راوی میں ایک جہاز بنوا کر ڈالا کہ یہاں سے روڑی اور کوٹری بندر کو رستہ جاری ہو جائے۔ مگر پانی کی کمی سے بہ مشکل پہنچا رستہ چل نہ سکا۔

ایک دن گفتگو آئی کہ ملک ملک کے لوگوں کی زبان جدا جدا ہے اس لئے انسان کی طبعی زبان کو بھی دریافت کرنا چاہیے۔ چنانچہ شہر کے باہر بہت دور ایک مکان عالیشان کو

سب ضروری سامان سے آراستہ کیا۔ بہت سے لڑکے اور لڑکیاں پیدا ہوتے ہی ماں باپ سے لے لیں اور انہیں بہت احتیاط سے وہاں رکھا۔ بچوں کی دائیاں اور اہل خدمت اور پہرے کے سپاہی بھی گونگے ہی رکھے کہ انسان کی آواز تک کان میں نہ پہنچے اور مکان کا نام گنگ محل رکھا۔ جب وہ بچے پانچ سات سات برس کے ہوئے تو انہیں دربار میں منگوا کر سامنے چھوڑا۔ سب جنگل کے جانوروں کی طرح غائیں بائیں کرتے تھے۔ ایک حرف سمجھ میں نہ آتا تھا۔

جشن کے دنوں میں مینا بازار لگتا تھا۔ چنانچہ تمام امرا دکاندار بنتے۔ جو جو عجائبات بہم پہنچاتے وہ لا کر سجاتے۔ اہل صنعت کے جوہر کھلتے۔ جرثقیل اور طبیعات کے عمل ہوتے، علم ہیئت کے آلات رکھے جاتے، علم کیمیا اور نیرنجات کے شعبہ سے کام میں آتے۔ جب مردانہ بازار ہو چکتا تو محل کی عورتیں آتی تھیں ان کا بازار گرم ہوتا۔

لطیفہ۔ ایک راجپوت لڑائی میں مارا گیا۔ بی بی اس کی حاملہ تھی۔ جب بچہ پیدا ہوا تو دیکھا کہ جہاں جہاں باپ کے زخم لگے تھے، وہیں بیٹے کے نشان موجود ہیں۔ تذکرہ اس کا دربار میں پیش ہوا۔ سن کر کہا کہ باپ کے جو زخم لگے تھے تو بدن پر لگے تھے نہ کہ روح پر۔ اس بچے میں اگر اس کی روح خیال کریں تو بدن پر زخموں کے نشان پر لگے تھے نہ کہ روح پر۔ اس بچے میں اگر اس کی روح خیال کریں تو بدن پر زخموں کے نشان ہونے سے کیا علاقہ؟ اس پر اپنی نقل بیان کی کہ جب خود حمل میں تھا تو ایک دن ہمایوں بادشاہ محل میں آئے دیکھا کہ بادشاہ بیگم اپنے پاؤں کا تلوا سوئی سے گود کے سرمے سے پھول بناتی ہیں۔ سبب پوچھا تو کہا کہ جی چاہتا ہے ایسا ہی پھول میرے بچے کے پاؤں میں بھی ہو۔ خدا کی قدرت کہ جب اکبر پیدا ہوا تو بعینہ وہی نشان تلوے میں موجود تھا۔

اکبر کی شجاعت اور دلاوری کے معرکے بھی ایسے ہیں کہ انہیں فقط زور اقبال کہنا چاہیے۔ چونکہ اس زمانے میں لڑائی کے وقت ہاتھیوں سے بڑا کام نکلتا تھا، اس لئے اس کو بھی ہاتھیوں کا کمال شوق تھا۔ خود سوار ہو کر لڑاتا تھا اور مست ہاتھی کہ جن کے پاس فیلبان نہ جاتے تھے، یہ سائے کی طرح برابر جاتا اور دانت پر ہاتھ رکھتے ہی گردن پر

بیٹھا نظر آتا۔ مست ہاتھی[31] لڑتے ہوتے تھے اور یہ ایک پر سے اچھل کر دوسرے پر جا بیٹھتا تھا۔ ایک دفعہ مست ہاتھی چھٹ کر شہر میں آیا اور لوگوں کے جان و مال ضائع کرنے لگا۔ فیل بان جان کے ڈر سے جرات نہ کر سکتے تھے۔ اکبر سنتے ہی محل سے نکلا اور جس طرف اس کی آمد تھی اس طرف بازار میں آکر ایک کوٹھے پر کھڑا ہو گیا۔ جوں ہی ہاتھی برابر آیا جھٹ جست کر کے پیٹھ پر جا بیٹھا اور اس دیو کو زیر کیا۔

لطیفہ۔ ایک دن دو راجپوت نوکری کے طالب آئے۔ اکبر نے پوچھا کہ کیا جوہر دکھا سکتے ہو۔ راجپوت جان ہار نے نیزہ لے کر ایک انی اپنے سینہ پر رکھی اور دوسری دوسرے رفیق کے سینے پر ساتھ ہی تلواریں کھینچ گھوڑوں کو ڈپٹا۔ دونوں چھد کر بیچ نیزے پر آ گئے اور خود ایک ایک تلوار میں ڈھیر ہو کر رہ گئے۔ اس بے جگری پر بادشاہ کو بھی جوش آ گیا۔ جانتا تھا کہ کوئی نمک خوار اس طرح میرے سامنے نہ کھڑا ہو گا۔ اس لئے دیوار میں تلوار کا قبضہ گڑوا کر پھل اس کا باہر رکھا اور پلپلے پر سینہ رکھ کر چاہتا تھا کہ آگے حملہ کرے جو راجہ مان سنگھ دوڑ کر لپٹ گیا۔ اکبر نے اسے اٹھا کر دے مارا اور نہایت خفا ہوا کہ تو نے میری دلاوری کا جوہر کیوں نہ کھلنے دیا۔

شیر کے شکار کا عاشق تھا۔ اکثر چیتے اور شیر شمشیر سے شکار کئے۔ چنانچہ اگر اس کی بہادری کے کارناموں کو کوئی پھیلائے تو ایک شاہنامہ تیار ہو جائے۔ آخر پچاس برس کی سلطنت کے بعد ۱۰۱۵ھ ۱۶۰۵ء میں خود شیر اجل کا شکار ہو گیا۔ تاریخ ہوئی کہ:

الف کشیدہ ملایک زفوت اکبر شاہ

نور جہاں بیگم

ملک ایران میں خواجہ محمد شریف نام ایک عہدہ دار بادشاہی تھا۔ چونکہ آدمی بالیاقت اور صاحب تدبیر تھا، بڑھتے بڑھتے بادشاہ کے دربار میں وزارت کے مرتبے کو پہنچ گیا۔ چند روز کے بعد اس کا انتقال ہوا۔ مگر وارثوں سے فلک نے دغا کی۔ مرزا غیاث اس کا بیٹا ایسا تباہ ہوا کہ معاش کی تلاش میں گھر سے نکلا اور ایک قافلے کے پیچھے پیچھے مع عیال ہندوستان کو روانہ ہوا۔ بی بی حاملہ تھی۔ اسی حالت میں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ بے سامانی کا سفر، جنگل کا مقام، محلوں کے بیٹھنے والے ماں باپ نے ساری رات جنگل میں روتے دھوتے کاٹی۔ صبح ہوتے پھر روانہ ہوئے مگر لڑکی جو ایسی نحوست کے وقت میں پیدا ہوئی تھی اس کا لے چلنا سخت مشکل ہوا۔ آخر باپ نے اپنی حالت اور بیٹی ذات کے انجام کو سوچا، کہا کہ خدا پر توکل کرو، اس کی قسمت کے حوالے کر کے یہیں چھوڑ دو۔ ہر چند آمتا کی آنچ گود سے اتارنے نہ دیتی تھی مگر جب کچھ بن نہ آئی تو ماں نے بھی کلیجے کے ٹکڑے کو زمین پر رکھ دیا اور روتی چلی گئی۔ ایک رات کی جان جنگل میں پڑی روتی تھی۔ تھک جاتی تو ہاتھ چوسنے لگتی تھی۔ مگر قسمت سرہانے کھڑی ہنستی تھی کہ جلدی نہ کر جس محل میں تجھے ملکہ بنا کر بٹھانا ہے وہ ابھی تعمیر نہیں ہوا۔ پیچھے پیچھے قافلہ بھی آتا تھا۔ اس صبح کے ستارے کو زمین پر پڑا دیکھ کر سب حیران ہو گئے۔ ایک سوداگر کے دل میں خدا نے رحم ڈالا۔ گود میں لئے منزل پر آیا۔ اس جنگل بیابان میں دودھ کہاں، سارے قافلے میں اس بات کا چرچا تھا۔ کسی کو مرزا غیاث کا بھی خیال آیا۔ سوداگر سے کہا کہ وہ فلک زدہ جو قافلے کے ساتھ ہے اس کے عیال بھی ہمراہ ہیں۔ اگر سپرد کرو تو

عجب نہیں کہ اس بچی کی جان بچ جائے۔ غرض کچھ اجرت پر لڑکی اس کے حوالہ ہو گئی۔ اتنی برکت تو پیدا ہوتے ہی معلوم ہوئی کہ کچھ کھانا قافلے سے آنے لگا اور ایک سواری بھی مل گئی۔ سوداگر نے جب مرزا غیاث کی لیاقت اور خاندان کا حال معلوم کیا تو بہت افسوس کیا اور ہندوستان میں پہنچ کر اکبر کے دربار میں پہنچایا۔

ہمایوں بادشاہ جب ہرات میں پہنچا تھا تو خواجہ شریف یعنی مرزا غیاث کا باپ ہرات کا حاکم تھا اور اس وقت میں بادشاہ کی بہت خدمت کی تھی۔ چنانچہ اب مرزا غیاث نے باپ کے حقوق کو سفارش میں پیش کیا اور چونکہ خود بھی محاسب اور خوش نویس اور شاعر خوش تقریر تھا دیوان بیوتات [32] ہو گیا۔ جس طرح اور امراء کی بی بیاں محل میں جایا کرتی تھیں، اسی طرح مرزا غیاث کی بی بی بھی جایا کرتی تھی۔ بلکہ اس کا ایک بیگم سے بہناپا بھی ہو گیا تھا اور چونکہ اس عرصے میں لڑکی بھی بڑی ہو گئی تھی اس کا نام مہر النساء رکھا تھا۔ چنانچہ ماں کے ساتھ بیٹی بھی جایا کرتی تھی۔ مگر اسی عالم میں حسن خداداد کے ساتھ اس کے آن و انداز کو دیکھ کر ساری بی بیاں کہتی تھیں کہ دیکھیے یہ بجلی کدھر گرتی ہے۔ ایک دن مینا بازار میں پھرتی تھی، جہانگیر کہ ان دنوں میں شاہزادہ تھا دو کبوتر ہاتھ میں لئے روش پر جا نکلا۔ اس وقت سرور کے عالم میں تھا۔ مہر النساء کا البیلے پن سے چمن میں پھرنا بہت بھایا۔ آپ پھول توڑنے لگا اور اس سے کہا کہ بی لڑکی ذرا ہمارے کبوتر لئے رہو۔ مہر النساء نے کبوتر اس کے ہاتھ سے لے لئے۔ اتفاقاً ایک کبوتر بھڑک کر ہاتھ سے چھٹ گیا۔ جب شاہزادہ ادھر متوجہ ہوا تو پوچھا کہ ہیں میرا کبوتر کیا ہوا۔ اس نے کہا کہ صاحب عالم وہ تو اڑ گیا۔ شاہزادے نے کہا کیونکر؟ اس نے دوسرا بھی اڑا دیا کہ حضور اس طرح اڑ گیا۔ یہ بھولے پن کی ادا اس وقت ایسی بھلی معلوم ہوئی کہ شاہزادے کو ایک خیال پیدا ہو گیا۔

ماں کو جب یہ حال معلوم ہوا تو بیگم سے شکایت کی اور بیٹی کو محل میں لے جانا چھوڑ دیا۔ بلکہ رفتہ رفتہ یہ شکایت بادشاہ کے کان تک پہنچی۔ اکبر بہت خفا ہوا۔ بیٹے کو خلوت میں بلا کر سمجھایا کہ بیٹا بادشاہوں پر واجب ہے، نوکروں کی بہو بیٹیوں کو اپنی بیٹیاں

سمجھیں۔ اگر ہم ایسی باتیں کرنے لگیں تو دنیا میں آج ہی قیامت آ جائے۔ تمہیں بھی ایک دن بادشاہ ہونا ہے۔ خبر دار پھر ایسا خیال نہ کرنا۔ ساتھ اس کے مرزا غیاث کی بی بی سے بھی کہا کہ تم بیٹی کی کہیں شادی کر دو اور چند روز اسے جہانگیر کی آنکھوں سے الگ رکھو۔

علی قلی خاں ایک شخص شاہ ایران کے نعمت خانے کا داروغہ تھا وہ بادشاہ کے مرنے کے بعد انقلاب سلطنت سے ملتان میں آ نکلا۔ عبدالرحیم خان خاناں ان دنوں بھکر پر لڑتا تھا۔ اس سے ملاقات ہوئی اور معرکے اس بڑی بڑی جانبازیاں کیں۔ جب خان خاناں دربار میں آیا تو اسے بھی حاضر کیا۔ علی قلی خاں جیسا لئیق بہادر تھا۔ ویسا ہی صورت کا وجیہ تھا۔ اکبر نے ایک معزز عہدہ دے کر اس سے مہر النسا کی شادی کی اور ڈھاکے کا صوبہ کر کے بھیج دیا۔ مہر النساء حسن خوبی کے ساتھ عقل کی پتلی اور لطایف وظرایف میں بلبل ہزار داستان تھی۔ چند روز میں میاں کو غلام بنا لیا۔ علی قلی خاں کو فن رمل میں بھی دخل تھا۔ ایک دن زائچہ دیکھ رہا تھا، بیگم نے کہا ذرا میرا زائچہ بھی تو دیکھو۔ اس نے قرعہ پھینکا اور دیکھ کر کہا کہ بیگم سر پر چتر شاہی قربان ہوتا نظر آتا ہے۔ بیگم ہنسنے لگی مگر ساتھ ہی جہانگیر کا معاملہ دل میں کھٹک گیا۔ الغرض جب کہ جہانگیر بادشاہ ہوا تو پھر اس کی نیت برگشتہ ہوئی اور عشق کی چنگاری جو کجلا گئی تھی وہ چمک اٹھی۔ علی قلی خاں کو بہانے سے بلا بھیجا اور چاہا کہ کسی ایسے ڈھب سے مروا ڈالے جس کا الزام نہ آئے۔ چنانچہ ایک دن اس کی شجاعت اور بہادری کی بہت سی تعریفیں کر کے مست ہاتھی کے سامنے کر دیا۔ اس شیر جنگ نے اسے مار ہٹایا۔ پھر ایک شیر سے نہتا بھڑا دیا۔ اس نے بے ہتھیار ہی مرا اور شیر افگن خاں کا خطاب لیا۔ جب یہ وار نہ چلے تو ایک راز دار کی زبانی صاف پیغام بھیجا۔ اس غیرت والے کی عزت نے گوارا نہ کیا اور سوچ کر یہی مناسب سمجھا کہ اس نوکری پر لعنت کر کے اپنی جاگیر پر جا بیٹھے۔ بادشاہ نے قطب الدین خاں اپنے کوکہ کو وہاں کا صوبہ کر کے بھیجا اور اشارا کر دیا کہ جس طرح ہو اس کا کام تمام کر دے۔ شیر افگن خاں بے خبر بردوان میں اپنی جاگیر پر بیٹھا تھا، سنتے ہی استقبال کو آیا۔ دو چار جان نثار اس

کے ساتھ تھے۔ قطب الدین خاں کے آدمیوں نے فوراً انہیں گرفتار کر لیا۔ شیر افگن خاں دیکھ کر حیران ہو گیا۔ سمجھا کہ معاملہ بگڑ گیا۔ تلوار گھسیٹ کر کوکہ جی کے ایسا ایک ہاتھ مارا کہ دو ٹکڑے ہو کر ہزار سالہ مردوں میں جا ملے۔ بادشاہی سپاہی دیکھتے ہی ٹوٹ پڑے اور اس تن تنہا کی بوٹی بوٹی بانٹ لی۔ مگر ننگ و نام کے دیوان میں نام اس کا سر دفتروں میں لکھا گیا۔ اس بے گناہ کے لئے ہزار جرموں کے برابر تو یہی جرم تھا کہ جہانگیر کا رقیب تھا۔ اب تو بادشاہی صوبہ کو مارا، سلطنت کا گنہگار بھی ہو گیا۔ سب گھر بار ضبط ہو کر دربار کو روانہ ہوا مگر مقصد اسی گوہر شب چراغ سے تھا۔ چنانچہ اب تو پردہ بھی درمیان سے اٹھ گیا۔ ایک بی بی کھلم کھلا پیغام لے کر آئیں۔ مہر النساء سن کر آنکھوں میں آنسو بھر لائی اور بولی کی شیر افگن جیسے خاوند کو گنوا کر دوسرے کا منہ دیکھنا ننگ و وفا کا منہ کالا کرنا ہے۔ بی بی! تم میری طرف سے حضور میں عرض کرو کہ خیر جہاں پناہ اس بدنصیب پر جو کچھ گزر گئی اس کی تقدیر میں یہی لکھا تھا مگر بیوہ بے کس پر اب رحم فرمایئے اور اس مرنے والے کی روح کو ایذا نہ دیجیے۔ اس جواب کو جس نے سنا یہی کہا کہ سبحان اللہ لاج والی بی بی جسے اپنے پیارے شوہر کا رقیب سمجھتی ہے اس کی مسند شاہی پر اس طرح خاک ڈالتی ہے۔ مگر جہانگیر اس روکھے پن سے بہت اچاٹ ہوا تو بھی جو دل کی پھانس تھی وہ لگی رہی۔ چنانچہ کچھ عرصے کے بعد ماں کو اشارہ کیا کہ مہر النساء کو اپنے مصاحبوں میں رکھ لو۔ مدت اس طرح بھی گزری۔ غرض پرچتے پرچاتے آخر کو یہ ہوا کہ مہر النساء سے نور محل اور نور محل سے نور جہاں بادشاہ بیگم بن کر نورالدین جہانگیر کے پہلو میں بیٹھ گئیں۔ نور جہاں حسن تدبیر کے ساتھ سلیقے میں بھی بے نظیر تھی۔ بادشاہ تو شراب کا نام رام رنگی رکھ کر اس کی رنگ رلیوں میں لگ گئے۔ اس نے تمام سلطنت سنبھال لی۔ یہاں تک کہ جو حضور میں کچھ عرض کرتا جواب پاتا کہ ہم تو دو پیالے شراب اور ایک سیخ کباب پر سلطنت بیگم کے ہاتھ بیچ چکے۔ جو کہنا ہو ان سے کہو۔ روپیہ اشرفی پر سکہ لگ گیا کہ:

بہ حکم شاہ جہاں گیر یافت صد زیور
بنام نور جہاں بادشاہ بیگم زر

مہر کا سجع تھا کہ:

نور جہاں گشت بفضل الہ
ہمدم و ہمراز جہانگیر شاہ

مرزا غیاث یعنی باپ اعتماد الدولہ ہو کر وزیر سلطنت اور بھائی آصف جاہ ہو کر دربار کے مالک ہوئے۔ خود جھروکے میں بیٹھ کر حکم احکام جاری کرتی تھی اور تمام منصب دار اپنی اپنی عرض و معروض کرتے تھے۔ بادشاہ کا یہ عالم تھا کہ ایک دم بیگم جدا ہوتیں تو بے چین ہو جاتے۔ اگر دم کے دم دربار میں بیٹھتے تو پیچھے پردہ پڑ جاتا۔ بیگم پشت پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہتیں۔ غرض خلوت و جلوت میں اسی کا جلوہ تھا۔ راجہ مان سنگھ کی بہن۔ مہاراجہ جودھ پور کی بیٹی وغیرہ رانیاں اور مہارانیاں تھیں۔ مگر نور جہاں نے سب کے چراغ بے نور کر دیے تھے۔

بادشاہ کے کئی بیٹے تھے۔ مگر ایک بیٹا دوسرے چھوٹا خرم تھا کہ وہی شاہ جہان ہو کر بادشاہ ہوا۔ چونکہ ابتدا سے یہ شاہزادہ ہونہار نظر آتا تھا، آصف جاہ نے دوراندیشی کی آنکھ سے دیکھ کر اس سے اپنی بیٹی کی شادی کر دی تھی۔

نور جہاں کی ایک بیٹی شیر افگن خاں سے بھی تھی۔ اس کی شادی بادشاہ کے چھوٹے بیٹے شہریار سے ہوگئی۔ اب نور جہاں کو یہ فکر پڑی کہ جہانگیر کے بعد تاج شہریاری کسی طرح شہریار کے سر پر رکھا جائے۔ اس لئے بھائی سے بھی کھٹک گئی اور خرم کی طرف سے بادشاہ کے ایسے کان بھرے کہ اس کا ملک شہریار کو مل گیا۔ یہاں تک کہ باپ بیٹے کو لاکھوں کے ساتھ لڑوا دیا۔ ان لڑائیوں میں بادشاہ کی طرف سے مہابت خاں نے بھی خوب خوب جوہر وفاداری کے دکھائے تھے چنانچہ اب اس نے ایسا زور پکڑا کہ وہ نور جہاں اور آصف جاہ دونوں کے ہاتھوں سے نکلنے لگا۔ چونکہ دربار نور جہاں کی چٹکی میں تھا، یہاں سے الٹے سیدھے احکام جاری ہونے شروع ہوئے۔ آخر حکم پہنچا کہ اپنے علاقے سے چلے آؤ اور حساب و کتاب سمجھاؤ۔ ناچار مہابت خاں آیا مگر اپنی رفاقت میں پانچ ہزار راجپوت ایسے لایا کہ جو اسی کے نام پر سر کٹوانے کو سرخ روئی زندگی سمجھتے

تھے۔ بادشاہ کابل کو جاتے تھے اور جہلم کے کنارے بڑے تھے جو حاضری کی اطلاع ہوئی۔ حکم ہوا کہ جب تک آصف جاہ کو حساب نہ سمجھا دو، تب تک مجرا موقوف۔ مہابت خاں بہت دق ہوا۔ وہ دن تو ٹالا۔ دوسرے دن علی الصباح دیکھا کہ بادشاہ حرم سرا میں مع چند خواصوں اور خواجہ سراؤں کے رہ گئے ہیں۔ آصف جاہ اور تمام لشکر پار اتر گیا ہے۔ اسی وقت پل اور گھاٹ کو روک خیموں کے گرد راجپوتوں کو پھیلا دیا اور خود گھوڑے پر سوار قناتوں کے اندر بارگاہ کے دروازے پر آن کھڑا ہوا۔ حرم سرا میں غل مچ گیا۔ بادشاہ گھبرا کر باہر نکل آئے اور کہا کہ مہابت خاں کیا کہتا ہے۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی دشمنوں کے ہاتھ سے جان بچا کر حضور کی پناہ میں آیا ہوں۔ بعد اس کے تین دفعہ تصدق ہوا اور اسی وقت پالکی اپنے سپاہیوں سے اٹھوا کر خود کندھا دیتا ہوا اپنے خیمے میں لے گیا۔ تدریں دلوائیں اور بیٹوں کو تصدق کیا۔ ساتھ ہی خیال آتا کہ چال چوک گیا۔ بیگم کو ضرور لینا تھا۔ چنانچہ پھر بادشاہ کو سوار کر کے لایا مگر وہ اتنے عرصے میں پار اتر گئی تھی۔ ناچار شہریار کے پکڑنے کا خیال کر کے اس کے ڈیروں پر آیا اور وہیں بادشاہ کو اتارا۔

ادھر بیگم نے پار جا کر بھائی کے ساتھ تمام سرداروں کو بہت لعنت ملامت کی اور فوج کو تیار کیا۔ یہاں بادشاہ کو بیگم یاد آئیں اور ہر چند حکم پہنچے کہ خبردار لڑائی کا ڈھنگ نہ ڈالنا مگر وہ باز نہ آئی۔ پہلے دن ایک سردار فوج لے کر اترا اور ناکام پھرا۔ دوسرے دن آپ ہودج میں بیٹھی۔ شہریار کی چھوٹی سی بیٹی کو گود میں اور دو خواجہ سراؤں کو آگے پیچھے بٹھا کر سب سے پہلے اپنا ہاتھی دریا میں ڈالا اور فوج کو پایاب اتار کر میدان گرم کیا۔ بہت سرکش تیروں کے آپ خالی کیے۔ آخر ہزاروں آدمی ضائع ہوئے لڑکی گود میں زخمی ہوئی اور بیگم خود اس کا بازو باندھتی ہوئی پار اتر گئی۔

ادھر مہابت خاں سجدے کر کر کے بادشاہ کے تصدق ہوتا تھا مگر قید کر رکھا تھا اور جو چاہتا تھا سو کرتا تھا۔ دو تین دن کے بعد قول و قسم کر کے بیگم کو بلایا لیکن الگ خیمے میں اتار کر قید کر دیا اور جبراً قہراً بادشاہ سے قتل کا حکم لکھوالیا۔ بعد اس کے خواجہ سرا کو بلایا اور بیگم کو

موت کا پیغام سنایا۔ بیگم نے جب حکم سنا تو ہاتھ کے طوطے اڑ گئے۔ مگر تدبیر کے میدان میں ایک قدم نہ چوکی۔ نہایت بے پروائی سے کہا کہ خیر میرے مالک کا یہی حکم ہے تو ایسا مرنا مجھے ہزار جینے سے بہتر ہے۔ ایک دفعہ ۔۔۔۔۔۔ اس کا آخری دیدار دکھا دو۔ مہابت خاں نے بڑی تکرار سے مانا مگر اس شرط پر کہ ملاقات میرے سامنے ہو۔ چنانچہ وہ نور جہاں جس کے پردے کے سامنے سے امرا اور وزرا پنج ہزاری ہفت ہزاری خلعت پہن کر چلے جاتے تھے نظر بندی کے خیمے سے سکھپال میں بیٹھ کر آئی میلے کچیلے کپڑے پہنے۔ چہرے پر ہوائیاں اڑتی، ہاتھوں میں سونے کی ہتھکڑیاں، پاؤں میں بیڑیاں پہنے، منہ سے کچھ نہ بولی۔ مگر اس انداز سے آ کر کھڑی ہوئی کہ مایوسی اور بے اختیاری کی تصویر سامنے کھینچ دی۔ اس کی صورت دیکھتے ہی بادشاہ کا جگر پانی پانی ہو گیا اور آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ غرض مہابت خاں کی منتیں کر کے جان بخشی کروائی اور تمام لشکر کابل کو روانہ ہوا۔

اب بیگم نے اندر ہی اندر پھر اپنے بندوبست شروع کیے۔ ادھر آصف جاہ جو بھاگے ہوئے تھے وہ بھی صفائی کر کے آ گئے اور مہابت خاں کی مہابت میں فرق آنے لگا۔ مگر راجپوت جنہیں سوا تلوار مارنے کے اور کسی بات کی عقل نہ تھی وہ بدستور زوروں پر چڑھے ہوئے تھے۔ چنانچہ کابل میں ۔۔۔۔۔۔۔ ایک دن ان سے اور دربار شاہی کے سپاہیوں سے کسی آپس کی بات پر تلوار چلی۔ کچھ تو ملک غیر تھا کچھ ہوا بدلی ہوئی تھی۔ غرض یہاں راجپوتی کھانڈوں کی کھنڈت ہوئی۔ بہت سے مارے گئے۔ بہت سے بھاگ کر پہاڑوں میں ٹکرائے۔ بہتیرے خراسان و ترکستان میں غلام ہو کر بک گئے۔ مہابت خاں کا زور اور بھی کم ہوا اور نور جہاں پھر اپنی چمک دمک دکھانے لگی۔ چنانچہ مہابت خاں کو شاہجہاں کی مہم کا بہانہ کر کے نکال دیا کہ دشمن کے ہاتھ سے سانپ مرے اور دونوں طرح اپنا مطلب قائم رہے۔ بادشاہ چند روز کے بعد وہاں سے کشمیر پہنچے مگر سردی کے سبب سے دمے کی پرانی بیماری نے زور کیا اور پھر ہندوستان کو پھرے۔ جب مار گلے کے مقام پر پہنچے تو شام کے قریب شکار کھیلنے بیٹھے۔ قراول اور

وہاں کے پہاڑی زمیندار ہرن وغیرہ شکاروں کو گھیر گھیر لاتے تھے۔ سامنے ایک پہاڑ کی دھار تھی۔ جب ہرن اس کی چوٹی پر آتا تو بادشاہ بندوق مارتے تھے کہ شکار گولی کھا کر قلابازیاں کھاتا نیچے جا پڑتا۔ ایک اجل رسیدہ لڑکا ہرن کو گھیر کر سامنے لایا مگر ہرن ابھی ٹھیک زرد کے مقام پر نہ آیا تھا۔ یہ بچارا خدمت کے جوش میں اور آگے بڑھا کہ اسے روک کر آگے بڑھائے اتفاقاً پاؤں پھسل گیا۔ پاس ایک چھوٹا سا درخت اگا ہوا تھا۔ سہارے کے لئے اس پر ہاتھ مارا مگر وہ بھی ٹوٹ گیا اور یہ اجل کا شکار خود شکار کی طرح ہاتھ پاؤں مارتا قلابازیاں کھاتا پہاڑ کی تہہ میں پہنچا کہ ہڈیوں چور چور ہو گئیں۔ بادشاہ گھبرا کر اٹھ کھڑے ہوئے اور حرم سرا میں آئے۔ اسی وقت سے طبیعت دم بدم بگڑنی شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ تیسرے دن جہان سے رخصت ہوئے اور تاریخ ہوئی کہ:

جہانگیر از جہاں رفت

نور جہاں کی جہاں داری کا دن بے نور ہو گیا۔ بہت روئی، بہت پیٹی، منہ نوچا، بال کھسوٹے، اور جس روز سیاہ کے اندیشے کا برسوں سے بندوبست کر رہی تھی وہ وقت آ گیا۔ آصف جاہ کو بلا بھیجا کہ شہریار کے لئے کچھ تدبیر کرو مگر بھائی کو اپنے گھر میں سلطنت لینی تھی۔ اسی وقت بہن کو نظر بند کر لیا اور سب کی آمد و رفت بند کر دی۔ اس نے بھی بہتیرے منصوبے کھیلے۔ مگر عورت تھی، کوئی چال اس کی نہ چل سکی۔ آخر رضا بہ قضا دے کر بیٹھ رہی۔ نور جہاں بڑی سلیقے والی بی بی تھی۔ زیور پوشاک، بناؤ سنگھار گھر کی آرائشوں میں نئے نئے ایجاد کر گئی۔ گلاب کا عطر بھی اس کی یا اس کی ماں کی گل افشانی ہے۔ گھوڑے پر خوب سوار ہوتی تھی۔ شکار ایسا کھیلتی تھی جس کے نشانے سے ہرن پاڑھا چکارا تو کیا ہے۔ شیر و پلنگ کو پناہ نہ تھی۔ چنانچہ ایک دفعہ شیر شکار کیا تو کسی ظریف نے یہ مطلع کہا اور وفعۃً عالم میں مشہور ہو گیا:

نور جہاں گرچہ بظاہر زن است
در صف مرداں زن شیر افگن است

حاضر جوابی کا یہ عالم تھا کہ منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ ساتھ اس کے خود بھی شاعر

تھیں۔ ایک دفعہ رمضان ختم ہوا۔ بادشاہ نے عید کا چاند دیکھ کر نور جہاں کی طرف دیکھا اور کہا کہ:

ہلال عید بر اوج فلک ہویدا شد

اس نے فوراً کہا:

کلید میکدہ گم گشتہ بود پیدا شد

ایک دفعہ آسمان پر دم دار تارا نکلا جسے جاہل لوگ بادشاہ یا بادشاہت پر منحوس سمجھتے ہیں۔ بادشاہ محل میں کھڑے دیکھ رہے تھے۔ کسی خواص کے منہ سے نکلا کہ دیکھو تو کیا لمبی شعاعیں ہیں۔ بیگم نے اسی وقت یہ شعر پڑھا:

ستارہ نیست بدیں طول سر برآوردہ
فلک بہ شاطری شاہ پر برآوردہ

ایک دن بادشاہ نے جو قبا پہنی تو اس میں لعل کی گھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ نور جہاں نے دیکھ کر شعر پڑھا:

ترا نہ تکمہ لعل ست درلباس حریر
شدست قطرۂ خون منت گریبان گیر

جس طرح خود شاعر تھی اسی طرح شعرا کی قدردانی بھی کرتی تھی۔ چنانچہ ایک دن باغ کی سیر کو گئی۔ تمام باغ میں پردہ ہو گیا۔ منہ پر نقاب ڈالے ہنستی بولتی مصاحبوں کے ساتھ چلی جاتی تھی۔ مرزا ہمیدی شاعر اسی دن شہر میں پہنچا تھا اور اسی باغ کے کنارے ایک کوٹھے پر اترا تھا۔ اسے خبر نہ تھی کہ نور جہاں یہی ہے۔ بے تکلف یہ شعر پڑھا:

برقع برخ افگندہ برد ناز بباغش
تا نکہت گل بیختہ آید بہ دماغش

نور جہاں نے سن کر حال دریافت کیا، پانسو روپیہ تو اسی وقت انعام دیا اور پھر بلا کر شعرائے دربار میں داخل کیا۔ اکثر شعرا سے مباحثے بھی رہتے تھے چنانچہ سلیم شاعر

نے ایک دفعہ یہ شعر کہا:

زشرم آب شدم کاب را شکستی نیست
بحیرتم کہ مرا روزگار چوں بشکست

نور جہاں نے ہنس کر کہا کہ:

یخ بستہ بشکست

ایک دن طالب آملی سے کہا تم حضور کی تعریف میں قصیدے کہتے ہو کچھ ہمارے لئے نہیں کہتے؟ اس حاضر جواب نے ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ جسے دیکھا نہ ہو اس کی تعریف کیا کرو؟ شاہ جہاں نے بادشاہ ہو کر پچیس لاکھ روپیہ کی جاگیر مقرر کر دی اور بہت عزت و حرمت سے رکھا۔ مگر نور جہاں کی آنکھوں میں جہان سیاہ تھا۔ رنگیلے شوہر کے بعد جب تک زندہ رہی رنگین کپڑے نہ پہنے۔ آخر بارہ برس کے بعد دنیا سے منہ موڑا اور شہر لاہور کے پاس خاوند کے مقبرے[33] کے پہلو میں آرام کیا۔ چنانچہ ٹوٹا پھوٹا گنبد اس کا اب بھی موجود ہے۔

شہاب الدین شاہ جہان

جب جہانگیر بادشاہ نے جہان کی دار و گیر سے مخلصی پائی تو آصف جاہ وزیر نے ہر کارون کے داروغہ کو خلوت میں بلا کر کہا کہ کوئی ایسا تیز رفتار اور با اعتبار ہر کارہ لاؤ کہ اسی وقت ہوا ہو جائے اور یہ ہمارے ہاتھ کی انگوٹھی ہے اسے شاہزادہ خرم تک پہنچائے کہ حیدر آباد دکن میں ہے۔ ایک اشرفی کوس کا تو ابھی حساب سمجھا دو اور انعام پیچھے دیکھا جائے گا۔ چنانچہ مہتا بنارسی نام ایک ہر کارہ آیا اور انگوٹھی لے سلام کر روانہ ہوا۔ یہاں مصلحتہً ایک شہزادے کو تخت پر بٹھا دیا اور تمام لشکر کو لے کر لاہور میں آیا۔ ادھر ہر کارہ انگوٹھی لے کر اڑا۔ کوہ و دریا پر سے ہوا کی طرح گزرتا اور ہوا کو گرد کی طرح پیچھے چھوڑتا دو مہینے کی منزلیں بیس دن میں طے کر کے جنیر کے مقام میں شاہزادے کو جا مجرا کیا۔ خسر اور داماد میں پہلے ہی اشارے ٹھہرے ہوئے تھے۔ انگوٹھی کو دیکھتے ہی مطلب سمجھ گیا اور فوراً آگرے کی طرف کوچ کیا۔ منزل بہ منزل دار الخلافہ میں پہنچا اور جشن شاہانہ سے دربار کیا۔ جا بجا فرمان جاری ہوئے اور شہاب الدین شاہ جہان کے لقب سے فرمانوں کی پیشانی نے رونق پائی۔

شاہ جہانی سلطنت کے لئے اول تو کئی پشت سے سکہ بیٹھا ہوا تھا۔ دوسرے جن ہونہاروں کی طرف سے کھٹکا تھا۔ تخت پر بیٹھتے ہی ان سے خاندان کو صاف کیا۔ ساتھ اس کے عام رعیت کے لئے بھی اس کی نیت بہت نیک تھی۔ اس لئے کوئی خرخشہ ایسا نہ ہوا جس سے بنیاد سلطنت میں خلل پڑے۔ خان جہاں لودھی اپنے نمک خوار کی بغاوت کے سبب سے دکن میں فساد ہوا۔ چنانچہ لودھی تو ناکام مارا گیا مگر ملک دکن اس کی آفت

میں گرفتار ہو گیا اور نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ وہاں کے حاکموں سے خاطر خواہ اطاعتیں لینے لے لئے بڑے بڑے معرکے ہوئے اور عہد نامے تازہ ہو کر ان کے زور گھٹائے گئے۔ علی مردان خاں شاہ ایران کے کاردار نے اپنے آقا سے ناراض ہو کر قندھار شاہجہان کو حوالے کر دیا مگر شاہ ایران نے پھر چھین لیا۔ ہر چند ایک دفعہ دارا شکوہ اور دوسری دفعہ اورنگ زیب بڑے بڑے سامانوں سے گئے مگر دونوں ناکام پھرے۔ بلخ کو بھی فتح کیا مگر سنبھال نہ سکے۔ اہل پرتگال نے چاٹگام میں ایک کوٹھی مستحکم بنائی اور ہگلی اس کا نام رکھا۔ ڈھاکے کے حاکم کو ان کی طرف سے شبہ پیدا ہوا۔ چنانچہ اس نے دربار کو اس کی شکایت لکھی اور یہ بھی لکھا کہ یہ لوگ روز بروز گستاخ ہوتے جاتے ہیں بلکہ قلعے پر توپیں بھی چڑھائی ہیں۔ بادشاہ نے حکم بھیجا کہ ان بت پرستوں کو نکال دو۔ چنانچہ بہت سے آدمی ان کے قتل ہوئے باقی اس طرح نکالے گئے کہ پھر اہل پرتگال کو بنگال میں قدم رکھنا نصیب نہ ہوا۔ اس کے علاوہ جاہ و حشم کے آئین نے جشن جمشید اور آئین سکندر کو گرد کر دیا۔ اکبری عہد کے خلاف شروع قواعد و آئین جہانگیر کے وقت کے عیش رنگین، سب موقوف کئے اور بندوبست کے آئین و قوانین جاری کئے۔

قلعہ دہلی

جب جاہ و حشم کے ہجوم کے لئے آگرہ اور لاہور کے قلعوں میں گنجائش نہ رہی تو دلی میں ایک نیا قلعہ [34] بنوانا شروع کیا کہ قلعہ آگرہ سے دو چند اور لاہور سے چند در چند زیادہ ہو۔ چنانچہ کروڑ روپیہ کی لاگت سے دس برس میں بن کر تیار ہوا۔ میر عمارت نے عرضی لکھی۔ خود بدولت ہوادار آبی پر سوار ہو کر لب دریا کے دروازے سے قلعہ میں داخل ہوئے قلعے کو ملاحظہ کیا۔ سر سے پاؤں تک سنگ سرخ سے گلرنگ اس پر سنگ مرمر کے حاشیے کا نرالا ڈھنگ، برجیاں، فصیلیں اور مرغولیں خوشنما عمارتیں اور باغ اور باغوں کی نہریں ایسی دلکشا کہ اگر بے مبالغہ بھی ایک ایک کی تفصیل لکھی جائے تو ایک دفتر آراستہ ہو جائے۔ کل قلعے کا نقشہ دیکھو تو کاغذ پر ایک ہشت پہلو پھول نظر آتا

ہے۔

غرض جشن کا سامان شروع ہوا۔ دیوان عام کے سامنے وہ شامیانہ کہ جس کا نام دل بادل تھا اور دیوان خاص کے میدان میں سہامنڈل خیمہ استادہ ہوا جس کا کلس خیمہ فلک کے پار نکلا جاتا تھا۔ یہ بھی سات برس کے عرصے میں تیار ہوئے تھے اور ہزاروں گز پشمینے کشمیر کے اور مخمل زرباف گجرات کے، ان پر خرچ ہوئے تھے دونوں سونے کے ستونوں اور چاندی کے استادوں پر کھڑے تھے۔ ان کے آگے خوشنما شامیانے اطلسی و زربانی، سنہری روپہلی چوبوں پر تانے گئے۔ ایوان عالی جس طرح طلائی چھت کی میناکاری سے گوناگوں تھا، ویسے ہی ایرانی قالین اور بناری کم خوابوں سے بوقلموں تھا۔ صدر سے لے کر پا انداز کے ایک ایک مکان تک در و دیوار کو مخمل، زرباف، بادلہ و کمخواب پردہ ہائے فرنگی، دیبائے رومی، اطلس چینی سے نگار خانہ چین کر دیا۔ صدر میں تخت طاؤس سجایا گیا۔

تخت طاؤس

نمونہ عجائبات دنیا کا تھا۔ کروڑ روپیہ کہنے کو تو دو لفظ اور ایک بات ہے، مگر خیال کرنا چاہیے کہ آج اس قدر سونے اور جواہرات کے لئے کس قدر دریا اور پہاڑ الٹنے پڑتے ہیں۔ پشت کا تختہ جس پر بادشاہ تکیہ لگا کر بیٹھتا تھا دس لاکھ روپیہ کا تھا۔

بارہ مرصع ستونوں پر مغرق محرابیں اور جڑاؤ میناکاری کی چھت دھری تھی۔ چھت سے پایہ تک خاص کندن اور آبدار جواہر سے جگمگ جگمگ کر رہا تھا اور تین سیڑھی بلند چبوترے پر یہ عالم تھا تو یا ایک ستارے کا نگینہ ہے کہ انگوٹھی پر دھرا ہے۔ اس کی روکار کی محراب پر ایک درخت طلائی بھاری دھرا تھا۔ جسے سبزہ والماس سے سرسبز اور لعل و یاقوت سے گلرنگ کیا تھا۔ ادھر ادھر اس کے دو مور رنگا رنگ کے جواہرات سے مرصع چونچ میں موتیوں کی تسبیحیں لئے اس طرح کھڑے تھے گویا اب ناچنے لگتے ہیں۔ چاروں طرف چاروں چتر زرنگا۔ جن میں موتیوں کی جھالر جھلملاتی تھی۔ آگے ایک

شامیانہ کہ جواہرات اور موتیوں کی آبداری سے دریائے نور کی طرح لہراتا تھا اور ایک لاکھ روپیہ کی لاگت سے تیار ہوا تھا۔ سونے روپے کے چوبوں پر استادہ تھا۔ گرد اس 7
کے کرسیاں اور چوکیاں اپنے اپنے مرتبے سے بجی ہوئی تھیں۔ تخت کے گرد پاس ادب کے لئے کئی کئی گز تک حاشیہ چھوڑ کر چاندی کا کٹہرا ایسا خوشنما لگا تھا کہ جس کی مینا کار جالیاں مرغ نظر کو شکار کرتی تھیں۔ غرض دربار آراستہ ہوا مگر اقبال کا رعب داب دیکھ کر قدرت خدا یاد آتی تھی۔ چنانچہ کٹہرے کے باہر اول یمین و یسار شاہزادے والا تبار، بعد ان کے راجہ و مہاراجہ ملک ملک کے حاکم امیر و وزیر اپنے اپنے عہدے لئے کھڑے مگر تمام فرماں برداروں کی آنکھیں زمین پر اور گوش دل اپنے فرماں روا کے حکم پر لگے تھے۔ ہر ایک در میں دو دو خاص بردار، مخمل کی غلاف دار بندوقیں کندھوں پر، بادلے کی جھنڈیاں ہاتھوں میں لئے بت بنے ہوئے قائم تھے۔ باہر کے دالان میں اور عہدہ دار منصب دار حکم کے منتظر حاضر تھے۔ اس سے آگے کے دروں میں تین تین حبشی جیسے کالے پہاڑ۔ آنکھیں لال لال، زربفت کی وردیاں پہنے ہتھیاروں میں اوچھی بنے، گرز ہائے فولادی کندھوں پر، بادلے کی بیرقیں ہاتھوں میں تیسرے درجے میں اہل کار اور ہر کار خانے کے کاروار۔ منشی، متصدی، قلمدان بغل میں، بستے آگے رکھے موجود تھے اور وردیوں میں سپاہی ننگی تلواریں علم کئے قد آدم، چاندی کے کٹہرے سے لگے خاموش کھڑے تھے۔ باہر تیس گز کا فاصلہ دے کر پھر چاندی کا کٹہرا کھڑا تھا اور اس کے برابر بہادر سپاہی، خاص بادشاہی جن میں داہنی پر ترک، بائیں پر افغان، سامنے راجپوت، اپنی اپنی وردیاں پہنے سنہری رپہلی بیرقیں ہاتھوں میں لئے جمے تھے۔ یہاں سے دروازے تک سواروں کے پرے۔ دو رستہ پابستہ آراستہ تھے۔ جو درباری لوگ آتے، پہرے پہرے پر اپنے اپنے نشان بتاتے اور آگے بڑھے جاتے۔ مگر دبدبہ و دہشت کا یہ عالم تھا کہ ہوش و حواس کے قدم تھرتھراتے تھے۔ دربار میں پہنچ کر تین سلام گاہوں پر تسلیم بجالاتے تھے۔ جب نقیب آواز دیتا تھا کہ آداب بجالاؤ، جہاں پناہ بادشاہ سلامت، عالم پناہ بادشاہ سلامت تو دل سینوں میں دہل جاتے تھے۔ کٹہرے کے

پاس کورنش کا آداب ادا کرتے تھے۔ غرض اول شاہزادوں کی نذریں گزرنی شروع ہوئیں۔ ہر ایک کو خلعت اور ترقی منصب کے احکام سنائے گئے۔ سعد اللہ خاں[35] وزیر اعظم کو ہفت ہزاری ہفت ہزار سوار کا منصب عنایت ہوا۔

عبرت۔ دربار میں یہ شان پروردگار۔ آشکار تھی کہ دفعۃً بادشاہ آبدیدہ ہوئے اور دونوں ہاتھ فاتحہ کو اٹھائے، ساتھ ہی سب اہل دربار نے ہاتھ اٹھائے۔ مگر پاس ادب سے کوئی شخص جرات سوال کی نہ کرسکا۔ بعد فاتحہ کے خود بادشاہ نے کہا کہ اے بندگان با اخلاص جو خیال اس وقت میرے دل میں گزرا، اس کا اظہار تم پر بھی واجب سمجھتا ہوں وہ یہ ہے کہ فرعون نے ایک آبنوس اور ہاتھی دانت کے تخت پر بیٹھ کر دعویٰ خدائی کا کیا۔ گواہ اور آگاہ ہو کہ جس نخوت اور تکبر سے اس نے وہ دعویٰ کیا تھا میں اس سے لاکھ مرتبہ عجز و نیاز کے ساتھ عبودیت الٰہی کا اقرار کرتا ہوں۔ یہ کہہ کر اٹھا اور دوگانہ شکرانے کا بجالا کر دیر تک پیشانی کو زمین نیاز پر ملتا رہا۔ وقت کی تاثیر سے دربار میں سناٹے کا عالم ہوگیا۔ سب کے دل آب ہوگئے اور سینوں کے ولولوں نے دم گرم سے اس ایوان میں ایک گونج پیدا کی۔ بادشاہ سجدے سے اٹھ کر دوبارہ مسند پر بیٹھا۔ ملک الشعراء نے قصیدہ مبارک باد کا پڑھا۔ کسی باکمال نے گیت سنائے، کوئی اشرفیوں میں تلا، کسی کا منہ موتیوں سے بھرا گیا۔ اتنے میں غلامان خاص جواہر کار خوان ہاتھوں میں لئے آئے۔۔۔۔۔۔۔جن کے جواہر نگار خوان پوشوں میں موتیوں کی جھالر لٹکتی تھی۔ میر دربار نے اشارہ کیا۔ اشارے کے ساتھ ہی سونے روپے کے پھول اور جواہرات کا مینہ چھم چھم برسنے لگا۔

رات کو جشن ماہتابی ہوا کہ تمام دیوان عام ایک بقعہ نور نظر آنے لگا۔ فرش میں سفید مخملیں سفید ہی قالین۔ دیواروں پر براق اطلسیں، زربفت و کمخواب کے پردے، مگر وہ بھی رپہلی آرائش کے سامان اور روشنی کے سب لوازمات موجود۔ مگر تمام بلور اور شیشے سفید، سامنے چمن اور درختوں کے پھول پتے تمام سفید۔ روشوں پر گھاس سفید دربار کا لباس سفید یہاں تک کہ انگوٹھی بھی چاندی کی اس پر بھی الماس سفید۔ غرض کہ

زمین آسمان تک نور کا عالم تھا اور دریائے مہتاب لہراتا نظر آتا تھا۔ چندر ما کی تلا کے جشن میں نو دن باقی تھے۔ اس لئے نو دن تک برابر جشن کے انعام و اکرام جاری رہے۔

شاہجہان کی ایک بی بی ممتاز محل آصف جاہ کی بیٹی تھی کہ نہایت نیک نیت و نیک طبیعت تھی۔ چاروں بیٹے بھی اسی کے شکم سے تھے اور جو محبت کہ بادشاہ کو اس سے تھی کسی سے نہ تھی۔ وہ حاملہ ہوئی۔ جب ولادت کا وقت قریب آیا تو اندر کاردان دائیاں اور باہر حاذق حکیم جمع ہوئے۔ دفعتہً پیٹ میں سے بچے کے رونے کی آواز آئی سب سن کر حیران بلکہ ہراساں ہوئے۔ بیگم نے خود بادشاہ کو بلایا اور کہا کہ اب وقت قریب آیا ہے دو وصیتیں میری ہیں وہ سن لو۔ اول یہ کہ بعد میرے اور شادی نہ کرنا۔ ایسا نہ ہو سوتیلے بھائیوں میں بگاڑ ہو اور میرے بچوں کی جانیں تلف ہوں۔ دوسرے یہ کہ میری قبر پر ایسی عمارت بنوانا کہ عالم میں یادگار رہے۔ تھوڑی دیر کے بعد لڑکی پیدا ہوئی اور بیگم کا انتقال ہوا۔ بادشاہ کو بڑا غم ہوا۔ دو برس تک دنیا کی لذتوں کا لطف نہ اٹھایا۔ ناچ رنگ کی صحبتیں بند کر دیں۔ اور دل و دماغ پر ایسا صدمہ ہوا کہ چند روز میں بال سفید ہو گئے۔ عمارت جو بیگم کے مزار پر بنی وہ حقیقت میں ایسی ہی بنی ہے کہ روئے زمین پر ثانی نہیں رکھتی۔ چنانچہ تاج گنج کا روضہ خاص و عام میں مشہور ہے۔ الغرض ۳۱ برس کی سلطنت کے بعد اقبال کا آفتاب ڈھلنا شروع ہوا۔

محی الدین اورنگ زیب کی عالمگیری

اخیر عمر میں بادشاہی کرتے تھے اور چاروں بیٹے ملک گیری اور ملک داری کرتے تھے۔ مراد اور شجاع تو نرے شاہزادے ہی تھے۔ دارا شکوہ جو سب میں بڑا تھا شہزادہ پن کے ساتھ فقیری اور تصوف میں بھی ڈوبا ہوا تھا۔ فقرا خواہ صوفی، خواہ ویدانتی صحبت میں رہتے۔ ان کی کتابیں پڑھواتا۔ باتیں سنتا عربی اور فارسی میں تصوف کی کتابیں تصنیف کرواتا بلکہ سنسکرت سے فارسی میں ترجمے کرواتا۔ اورنگ زیب برخلاف ان سب کے ایسا متین شخص تھا کہ پابندی شرع کے لحاظ سے ملکی جوڑ توڑوں کے سوا دوسرا خیال نہ رکھتا تھا۔ جابجا پرچہ نویس بٹھائے ہوئے تھے۔ ہر طرف کان لگے رکھتا بلکہ ہر بات کی پیش بندی برسوں پہلے سر کرتا۔ مگر باپ کو چاروں بیٹوں میں دارا ہی پیارا تھا اور اکثر اسی کو پاس رکھتا تھا۔ چنانچہ تیس برس کی سلطنت کے بعد ایک دفعہ ایسا بیمار ہوا کہ کل کاروبار دارا کے ہاتھ میں آ گئے۔ چونکہ یہ ناز پروردہ اور سلطنت کے کاروبار میں بے تجربہ تھا، باپ کو چراغ سحر اور تخت کو زیر قدم پا کر بھائیوں کے نام ایسے احکام جاری کئے کہ انہیں پڑھ کر اور باپ کو بیمار سن کر گھبرا اٹھے۔ ساتھ ہی ان کے وکیلوں کو نظر بند کر لیا اور دربار کی خبروں کے بند کرنے کے لئے ادھر کے سوداگروں اور بنجاروں تک کو بھی روک لیا۔ یہ حال دیکھ کر تینوں بھائی اپنے اپنے علاقوں سے چلے۔ مراد اور شجاع نے تو کھلم کھلا سلطنت کے نشانوں پر پھریرے چڑھا دیے۔۔۔۔ مگر اورنگ زیب نے یہاں بھی اپنی متانت خرچ کی یعنی درپردہ پورے سامان کئے مگر ظاہر میں مراد چھوٹا بھائی جو گجرات دکن میں اس کے قریب تھا اسے نہایت دردمندی کے ساتھ ایک خط لکھا خلاصہ اس کا یہ

ہے کہ مجھے سلطنت کی ہوس نہیں مگر چونکہ دارا شکوہ بد عقیدہ اور بد مذہب ہے اور تم جیسے چھوٹے بھائی پر کہ قابل سلطنت ہو ناحق جبر کرتا ہے میں برادر عزیز کی حق تلفی ناجائز سمجھ کر اعانت فرض سمجھتا ہوں۔ میرا ارادہ یہ ہے کہ اس مہم کے بعد حج کو چلا جاؤں اور وہیں گوشہ عافیت میں بیٹھ کر یاد الٰہی میں خاتمہ کر دوں۔ چھوٹا بھائی نہ سمجھا کہ بڑا بھائی شفقت کے پردے میں دغا کرتا ہے۔ صاف دل سے آیا اور جان و جگر سے رفیق ہو کر آگرے کو روانہ ہوا۔ یہاں بادشاہ کو شفا ہو گئی۔ دیکھا تو عالم تہ و بالا ہے۔ اسی وقت کاروبار سلطنت کو سنبھال بیٹوں کے نام فرمان جاری کیے۔ مگر ادھر تو انہیں یقین نہ آیا ادھر دارا شکوہ جو اس عرصے میں ایک دفعہ شجاع کو شکست بھی دے چکا تھا، مقابلے کو تیار ہو گیا۔ باپ بڑھا تجربہ کار تھا، وہ اس ناز پردردہ کی حقیقت کو بھی جانتا تھا اور اورنگ زیب کو بھی خوب پہنچانتا تھا اس لئے مقابلے کو منع کیا اور کہا کہ دونوں تمہارے چھوٹے بھائی ہیں ہم صفائی کرا دیں گے۔ دارا نے نہ مانا۔ اپنی شکوہ میں آ کر ان دونوں بھائیوں سے بھی جا اڑا۔ مگر چونکہ میدان جنگ کا مشاق نہ تھا اس لئے شکست فاش کھائی اور ہاتھی پر سے ننگے پاؤں کود کر پنجاب* اپنے علاقے میں بھاگ آیا کہ یہ ملک وسیع اور باسامان بھی ہے اور ادھر سے ایران کا رستہ بھی کھلا ہے، یہاں بیٹھ کر خاطر خواہ بندوبست ہو جائے گا۔ فتح یاب نشان اقبال اڑاتے آگرہ میں داخل ہوئے مگر مراد اس مہم میں ایسی جانبازی سے لڑا کہ شجاعت کا چہرہ زخموں سے گلرنگ ہو گیا۔ ہاتھی کا میکڈ میر مارے تیروں کے سیہ جانور کا نمونہ بن گیا۔ عالمگیر نے باپ کو عرضی لکھی اور چونکہ آپ نے اب تک سلطنت کا دعویٰ نہیں کیا تھا اس لئے بھائیوں کی بے اعتدالی کا افسوس بھی لکھا۔ باپ نے ایک تلوار بھیجی اور نہایت محبت سے لکھا کہ فتح مبارک ہو مگر مجھے آ کر منہ تو دکھاؤ۔ اس نے عذر معذرت کے بہانے کر کے ہمراہ بیٹے کو بھیجا۔ آپ باہر رہا مگر یہیں بیٹھے بیٹھے ایسا پیچ مارا کہ بوڑھا باپ نہ سمجھا۔ سنا تو دفعتہً یہی سنا کہ تمام دروازوں اور چوکی پہروں پر عالمگیری سپاہی بیٹھے ہیں۔ غرض باپ کو قید اور آگرے کا بندوبست کر کے آگے بڑھا۔ مراد کے زخمی ہونے سے اس کی مراد خاطر خواہ بر آئی۔ چنانچہ سلطنت کی صورت

بختی دیکھ کر اس کے نامراد کرنے کے بندوبست کرنے لگا۔ روز عیادت کو جاتا اور جو انعام واکرام فوجوں کو دیتا، ان سے کہتا کہ تدریں شکریے کی اسی کو جا کر دو۔ چند روز کے بعد ایک دن اپنے خیمے میں اس کی ضیافت کی۔ وہ بے تکلف چلا آیا اور چونکہ اس کا دل صاف تھا اس لئے خاطر جمع سے عیش وعشرت میں مصروف ہوا اور رات کو وہیں رہا۔ اس نے فوراً گرفتار کر گوالیار کے قلعے میں قید کر دیا۔

اب دارا کا حال سنو کہ لاہور میں بیٹھ کر ادھر کے سرداروں کو شامل کیا اور ہندوستان کے راجاؤں کو بغاوت کے لئے خطوط لکھے۔ باپ کو بھی منت وزاری کے ساتھ عرضیاں لکھیں۔ ادھر سے بھی ہر طرف تحریریں جاری ہوئیں۔ چونکہ لاہور کا خزانہ ہاتھ میں تھا، لشکر جمع کر کے ستلج اور بیاس کے گھاٹوں کا بندوبست کیا۔ مگر جب ادھر سے سکندری نقارہ بجتا آیا تو دارائی فوجیں بھاگیں اور خود بھی گھبرا کر ملتان پہنچا کہ بھکر سے ہمایوں کے قدموں ایران چلا جائے۔ شاہ ایران کو ایک خط لکھ کر مدد مانگی۔ مگر وہاں سے جواب آیا کہ اس طرح فوج کا مدد کے لئے آنا زیبا نہیں۔ تم خانہ بے تکلف سمجھ کر یہاں آ جاؤ اور چند روز اس ملک کی سیر کرو۔ ہم تمہارے باپ اور بھائیوں سے خط وکتابت کریں گے۔ اگر تحریر سے کام نکلا تو بہتر ہے، نہیں تو جس طرح ہو گا تمہارا حق تمہیں دلوا دیں گے۔ اس آوارہ نصیب نے قندھار کا ارادہ کیا مگر ساتھ فقط رفیقوں کی رفاقت اور خدمت گاروں کی جمعیت باقی تھی وہ بھی اکثر ہندوستانی یا وہ ولایتی تھے کہ ہندوستان میں رہ سہہ کر ایسی ایسی محنتوں کے چور ہو گئے تھے۔ رفیقوں نے ساتھ چھوڑنا شروع کیا۔ سب سے زیادہ یہ کہ پیاری بی بی اور کچھ عیال بھی ساتھ کجاووں میں سوار تھے۔ جب کوہستان میں داخل ہوئے اور اونچے اونچے پہاڑ نظر آئے تو بی بی ہندوستان کے محلوں کو یاد کر رونے لگی اور کسی طرح آگے جانے کو راضی نہ ہوئی۔ دارا کو اس سے نہایت محبت تھی ناچار الٹا پھرا اور یاغستان کے جنگلوں میں گھس گیا۔ اس حالت میں جسونت سنگھ جودھپور کا راجہ جو پہلے معرکوں میں اس کے ساتھ حق رفاقت ادا کرتا رہا تھا اس کی طرف سے جواب آیا اور اس نے وہیں بلایا۔ ایسے ڈوبتے کو اس تنکے کا سہارا غنیمت ہوا اور

پھرادھر کی طرف چلا۔ رستے کی مصیبتوں کا کیا حال بیان ہو کہ ہمایوں کی مصیبتوں سے ابھی قلم کا دم نہیں ٹھہرا۔ غرض جودھ پور کے پاس پہنچ کر خط لکھا اور راجہ کا انتظار شروع کیا۔ عالمگیر نے اسے پہلے ہی توڑ لیا تھا۔ جواب میں ادھر سے غبار بھی نہ اٹھا۔ امیر سردار سب گئے بلکہ ناچار ہو کر بیٹے کو بھیجا اور بہت سی منت وزاری کی مگر وہاں سے جو ہمایوں کو ناکامی نصیب ہوئی تھی وہی میراث اسے ملی۔ وہ یہی کہے گیا کہ تم اجمیر میں چل کر ٹھہرو۔ میں وہیں آتا ہوں۔ ناچار یہاں آیا اور ہر چند کہ پہاڑوں کو مورچوں اور توپوں سے سد سکندری بنالیا، مگر نصیبے میں تو خود دارا تھا۔ یہاں بھی شکست کھائی۔ شام تک ایک پہاڑی پر کھڑا لڑائی کا رنگ دیکھا کیا۔ رہے سہے جاں نثار کٹے جاتے تھے اور مورچہ بہ مورچہ دشمن چھائے چلے جاتے تھے۔ جب رات ہوگئی تو مایوس ہو کر بھاگا۔ اندھیرے میں اہل وعیال کہیں کے کہیں جا پڑے۔ صبح ہوتے ان کو بھی بھٹکتا پایا اور احمد آباد کا رخ کیا۔ پہاڑوں اور جنگلوں کی راہ، خود بے سامان، دشمن کے تعاقب کا خطرہ رستے میں پتا پتا بلا نظر آتا تھا۔ اگر چہ عالمگیر نے پیچھا نہ کیا، مگر پہاڑوں کے بھیل دبا تے چلے آتے تھے۔ جب موقع پاتے تھے آن گرتے تھے اور جو پیچھے رہ جاتا تھا اسے نوچ گھسوٹ کر بدن پر کپڑا نہ چھوڑتے تھے۔ غرض آٹھ دن تک گرتا پڑتا برابر چلا گیا۔ اسی عالم میں دیکھا کہ ایک قافلہ دلی کو چلا جاتا ہے اور اس میں ڈاکٹر فرنگی بھی ساتھ ہے۔ دارا کی بی بی زخمی ہوگئی تھی اور حکیم جراح کوئی ساتھ نہ تھا اس بے سروسامان نے ڈاکٹر صاحب سے خود ملاقات کی اور کہا کہ اس برے وقت میں تم ہمارا ساتھ دو تو بندوں کی شکر گزاری کے علاوہ خدا کے ہاں بھی ثواب ہو۔ اس کی بیکسی دیکھ کر مروت نے ڈاکٹر صاحب کو آنکھ نہ پھیرنے دی اور قافلے کو چھوڑ، اس کے ساتھ روانہ ہوئے۔ تین دن کے بعد جب احمد آباد ایک منزل رہا تو سب خوش ہو گئے کہ کل شہر میں پہنچ کر بسم اللہ کے گنبد میں بیٹھ جائیں گے۔ گویا اتنی راہ میں رات کو سرائے نصیب ہوئی اور یہی غنیمت ہوا کہ رہزنوں کی آفت سے تو خاطر جمع ہوئی۔ مگر مکان کی قلت اور آدمیوں کی کثرت سے ایسی چپقلش تھی کہ جو بیبیاں کئی کئی ڈیوڑیوں کے اندر محلوں میں بیٹھی تھیں ان میں اور

ڈاکٹر صاحب میں فقط ایک ٹاٹ کا پردہ تھا۔ غرض جوں توں رات کاٹی۔ صبح کو کوچ کی تیار ہوتی تھی جو ایک شخص نے اندر جا کر کچھ کہا کہ دفعتہً ساری بیبیاں رونے لگیں اور ان کی باتوں سے یہ سمجھ میں آیا کہ احمد آباد کے دروازے بند ہیں یعنی آفت نصیبوں کو اندر جانا نصیب نہ ہوگا۔ اب جان کی خیر اس میں ہے کہ یہیں سے پھریں اور کسی اور طرف کو نکل چلیں اتنے میں دارا شکوہ اندر سے حیران پریشان نکلا۔ سب نے تعظیم دی مگر چپ کھڑے تھے۔ اس کے چہرے سے معلوم ہوتا تھا کہ گویا زمین و آسمان میں اسے کہیں ٹھکانا نہیں نظر آتا اور سوائے مایوسی کے کسی کی آس نہیں۔ دل شکستہ نوکروں سے آبدیدہ ہو کر کہا کہ میں نہیں جانتا مجھ پر اور ان پردہ نشینوں پر ظالموں کے ہاتھ سے کیا کیا کچھ ہونا ہے۔ خیر رفاقت کا وقت ہے۔ یہ حالت اس کی دیکھ کر ڈاکٹر صاحب کے بھی آنسو نکل پڑے۔ غرض اس غم و اندوہ کے دھویں سے دل کو خالی کر کے ڈاکٹر صاحب سے بھی رخصت ہوا۔ چار پانچ زنانی سواریوں کے ساتھ دو ہاتھیوں پر چند صندوقچے اور کئی گٹھڑیاں لاد کر سوار ہوا۔ اور چند رفیقوں اور خواجہ سراؤں کو لے کر چلا، مگر لٹیروں کے ہاتھ سے امید نہ تھی کہ چار قدم بھی صحیح سلامت چل سکے۔ غرض جس رستے آیا تھا انہیں قدموں پھر بھکر کو روانہ ہوا۔

جاتے ہوئے کچھ کے راجہ نے بڑی خاطر کی تھی اور اپنی بیٹی اس کے بیٹے سے نامزد کی تھی۔ اب کی دفعہ وہ بھی اس بے مروتی سے پیش آیا کہ دنیا کی بے وفائی کی تصویر دل پر کھچ گئی اور اس کے پنجے سے نجات پائی غنیمت ہوئی۔ ناچار پھر بھکر کو روانہ ہوا کہ ادھر سے قندھار کی راہ ایران کو نکل جائے۔ اب فقط گنتی کے خدمت گار اور چند خواجہ سرا عیال و اطفال کے ساتھ تھے اور دریائے سندھ کے کناروں اور سرحد کے پہاڑوں میں ٹکراتا پھرتا تھا۔ چنانچہ ان ہی پہاڑوں کا ایک سردار بڑے خلوص اور خاطر داری سے پیش آیا اور وعدہ کیا کہ قندھار تک خود جا کر پہنچا آئے گا۔ مگر ملک جیون نام ایک افغان ادھر کا سردار تھا کہ شاہ جہان نے ایک دفعہ اسے ہاتھی کے پاؤں سے کچلوانے کا حکم دیا تھا اور دارا شکوہ نے اسے بچایا تھا۔ اس وقت میں اس کے خط پہنچے۔ دارا کو پھر لالچ آیا کہ

شاید اس کی مدد سے یہیں کچھ بات بن جائے۔ چنانچہ بے تکلف اس کے گھر چلا آیا۔ وہ بڑی تعظیم و تواضع سے پیش آیا۔ یہ فلک آوارہ اس کے دل کی دغا سے بے خبر تھا۔ بے تکلف رہنے لگا کہ چند روز بیٹھ کر دم یہاں لے۔ مگر قسمت کی سرگشتگی کب ٹھہرنے دیتی تھی۔ جس پیاری بی بی کے سوا کوئی غم خوار رفیق نہ رہا تھا ان دکھوں کا وہ بھی ساتھ نہ دے سکی۔ یعنی مصیبتوں کے علاوہ کئی مہینے جو بیماری کے دکھوں میں مبتلا تھی جان دے کر عذاب دنیا سے چھوٹ گئی۔ دارا کو نہایت رنج ہوا۔ دل زندگی سے بیزار ہو گیا اور رہے سہے ہوش و حواس بھی جاتے رہے۔ چنانچہ جو جاں نثار ایسے وقتوں کے رفیق تھے انہیں جنازے کے ساتھ کر کے لاہور بھیجا کہ اپنے پیر یعنی میاں میر صاحب کی خانقاہ میں دفن کریں۔ اس وقت اس آفت زدہ کو اکیلا دیکھ کر ملک جیون کی بدنیتی پھوٹ بہی اور فوراً گرفتار کر لیا۔ بادشاہی کاردار سرحد پر موجود تھے انہیں خط لکھ بھیجے اور انہوں نے بادشاہ کو عرضیاں کیں، چھوٹے بھائی نے بڑے بھائی کی گرفتاری کی خبر سن کر شادیانے بجوائے اور ملک جیون کے لئے خلعت بیش بہا اور بختیار خاں کا خطاب بھیج کر حکم دیا کہ جلد لے کر حاضر ہو۔ دارا بیچارا مع عیال و اطفال پاؤں میں زنجیر ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنے اسی وقت روانہ ہوا۔ جب شہر ایک منزل رہا تو بادشاہ نے ایک معتبر خاص بھیجا کہ جا کر خود دیکھ آئے اور نئے حکم پہنچائے۔ چنانچہ دوسرے دن اسی ہدایت کے بموجب شہر میں لائے۔ ایک ہتھنی کہ جس کی پیٹھ پر عماری تک بھی نہ تھی اس پر وہ قیدی طوق و زنجیر میں مسلسل تھا۔ بیٹا برابر بیٹھا تھا اور خدا کی قدرت کو دیکھتا تھا کہ یہ کون سا شاہجہان آباد ہے اور آج اس میں میرا کیا حال ہے۔ شہر کے لوگ بازاروں میں کھڑے زار زار روتے تھے اور دم نہ مار سکتے تھے۔ چنانچہ تمام شہر میں پھرایا اور پرانی دلی میں لے جا کر قید کر دیا۔ دوسرے دن بختیار خاں بدبخت بھی اپنے حسن خدمت کے انعام کے لئے دربار میں حاضر ہوا۔ جوں ہی شہر میں قدم رکھا، ہزاروں آدمی کوٹھوں اور دوکانوں پر کھڑے ہو گئے اور چاروں طرف سے لعنت پھٹکار کا غل ہوا۔ جوتیاں، ٹھیکرے خاک، مٹی جو کچھ جس کے ہاتھ میں آیا برسانے لگے اور اس قدر ریل کر گرے کہ کئی ہمراہی اس

کے پامال ہو گئے بلکہ اگر کوتوال نہ آ پہنچتا تو لوگ بد بخت خاں کی بوٹیاں اڑا دیتے۔

دارا شکوہ نے اسی عالم میں ایک دفعہ رقعہ اپنے ہاتھ سے لکھ کر بھیجا، جس کا ترجمہ یہ ہے۔

رقعہ۔ برادر من بادشاہ من سلامت و سلطنت تمہیں اور تمہارے بچوں کو مبارک ہو۔ مجھے اب کچھ ہوس نہیں رہی فقط ایک گوشہ عافیت اور ایک لونڈی[36] خدمت گار چاہتا ہوں کہ لقمہ کھا کر پانی کا گھونٹ پیوں اور تمہارے لئے دعا کرتا رہوں۔ والدعا۔ بادشاہ بھائی نے اس کے جواب میں کیا تو یہ کیا کہ علماء کو بلا کر چند رسالے اور کتابیں جو اس نے علم تصوف میں تالیف و ترجمہ کروائی تھیں وہ پیش کیں اور پوچھا کہ جس شخص کا یہ اعتقاد ہو اس کے لئے شرع میں کیا حکم ہے۔ انہوں نے کہا کہ ان کے مضامین شریعت کے خلاف ہیں۔ جس مسلمان کا یہ اعتقاد ہو اس کا قتل واجب ہے۔ چنانچہ اپنے نزدیک یہ حجت شرعی قائم کی۔ مگر معلوم ہوا کہ کوئی شخص اس مظلوم کا قتل قبول نہ کرے گا۔ ایک سنگ دل اپنی عداوت ذاتی سے اس کا لہو کا پیاسا تھا اسے حکم دے کر چند ظالموں کے ساتھ بھیجا۔ دونوں باپ بیٹے اس ویران گھر میں بیٹھے مسور کی دال پکا رہے تھے۔ بلکہ اس عالم میں زہر کے خوف سے اکثر وہی کھایا کرتے تھے۔ گوسپندوں نے اپنے قسائیوں کے سامنے آتے ہی پہنچان لیا۔ لیکن تیموری لہو نے اس وقت بھی بے کسی سے خاک میں ملنا گوارا نہ کیا۔ ایک چھوٹی سی چھری باورچی خانے میں پڑی تھی، وہی اٹھالی اور جب تک کہ ظالم چاروں طرف سے نہ آن گرے تب تک وہ بھی نہ کرا را آخر زخموں سے چور چور ہو کر مارا گیا اور مر کر پھر کوچہ و بازار میں تشہیر ہوا۔ بلکہ جن لوگوں نے بختیار کے ہمراہیوں کو پامال کیا تھا ان پر بھی خلیفۃ اللہ کی مخالفت کا جرم ثابت کر کے مارا اور رعب اپنا لوگوں کے دلوں پر قائم کیا:

اے سکندر نہ رہی تیری بھی عالمگیری
کتنے دن آپ جیا جس لئے دارا مارا

بڑے بھائی کا تو یہ حال ہوا، مراد بخش چھوٹے بھائی کا حال سنو کہ گوالیار کے قلعے

میں قید تھا۔ معلوم ہوا کہ اس کا ارادہ بھاگنے کا ہے۔ اسے وہاں سے طلب کیا اور قتل کا سامان اس طرح تیار کیا کہ مراد بخش کو دکن سے چلتے وقت ایک خدمت گار پر سازش کا شبہ ہوا تھا اور اظہاروں کے وقت اس نے بہت گستاخی سے جواب سوال کئے تھے۔ چونکہ میدان جنگ کا سامنا تھا اور موقع نازک تھا اس لئے اسے مروا ڈالا تھا۔

اب اس کا بیٹا دربار میں مدعی بن کر پیش ہوا۔ چنانچہ بادشاہ عادل نے اس نامراد بھائی کو گوالیار سے بلا لیا اور قصاص کے حکم سے اطلاع بھیجی۔ اس نے جواب میں کہلا بھیجا کہ مرنے سے میں نہیں ڈرتا مگر جس وقت قتل کا حکم دیا تھا تو میں حاکم با اختیار تھا بلکہ تم نے بھی مجھے بادشاہ مانا ہوا تھا اور حاکم با اختیار اپنی مسند حکومت پر جو حکم تجویز کرے اگر اس کی رائے درست ہے تو بارگاہ الٰہی میں دو ثوابوں کا مستحق ہے اور اگر خطا پر ہے تو ایک ثواب کا حاکم پر کسی شرع اور قانون میں اس طرح قصاص مجرمانہ نہیں آیا۔ اورنگ زیبی عدالت میں یہ عذر بے جا منظور ہو کر حکم قتل کا جاری ہوا۔ اور وہ نامراد نوجوان اپنے نامہربان بھائی کے حکم سے مارا گیا۔

شجاع نے اگرچہ بہت دفعہ شجاعت دکھائی مگر ہر دفعہ شکست کھائی۔ جب اورنگ زیبی فوج برابر دبائے چلی گئی اور کسی طرح پیچھا نہ چھوڑا تو ناچار ہٹتا گھٹتا ارکان کے راجہ کے پاس چلا گیا اور وہاں جا کر مفقود الخبر ہو گیا۔

عالمگیر کا لشکر دکن پر جاتا ہے

ملک دکن کے اضلاع اکبر کے عہد میں بھی خراج دینے لگے تھے۔ شاہجہان نے اپنی حکومت کو ان میں زیادہ تر زور دیا تھا اور خود عالمگیر ہی اس وقت بھی فوج لے گیا تھا۔ اب جو سب طرف سے خاطر جمع ہوئی اور دیکھا کہ جواہرات کی کانوں اور سمندر کی بندرگاہوں سے اس زرخیز ملک میں روپیہ کی بڑی کثرت ہے۔ چاہا کہ اپنی عالمگیری کو وہاں پورا کرے۔ اس واسطے اس کے لینے کا ارادہ کیا۔ اگرچہ ریاستیں وہاں اور بھی بڑی بڑی تھیں۔ مگر ابوالحسن تاناشاہ حیدرآباد اور گول گنڈہ کا حاکم بڑا صاحب اقتدار اور عالی دماغ بادشاہ تھا۔ ساتھ اس کے خوش مزاجی اور نیک نیتی سے رعیت بھی اسے نہایت عزیز رکھتی تھی۔ چونکہ بادشاہ مذکور عالمگیر کے ساتھ بھی عہد و پیمان پر صدق دل سے قائم تھا، اس لئے سردست کچھ بہانہ ہاتھ نہ آیا۔ آخر ایک جان نثار خاص کو روانہ کیا اور پیغام یہ بھیجا کہ سنا ہے ایک الماس نہایت نایاب تمہارے جواہر خانے میں ہے، وہ بادشاہی جواہر خانے میں داخل کرو۔ امیر مذکور کو خلوت میں یہ بھی سمجھا دیا کہ غرض اس وکالت سے فقط لڑائی کا بہانہ پیدا کرنا ہے، اس لئے تمہیں بھیجا جاتا ہے کہ تاناشاہ کی ہر ایک بات پر نظر رکھنا اور جس طرح ہو تکرار کے بڑھانے میں کوشش کرنا بلکہ اس طرح بیباکی اور گستاخی کی باتیں کرنا جن کا تاناشاہ متحمل نہ ہو سکے اور کسی طرح لڑائی کے لئے ایک سبب معقول پیدا ہو جائے۔ امیر مذکور وہاں گیا تو تاناشاہ نے نہایت تعظیم و تکریم سے استقبال کیا اور بڑی دھوم سے مہمان داری کی۔ جب اس نے الماس کے باب میں کہا تو اپنے جواہر خانے کے داروغہ کو بلا کر تمام جواہرات مع فرد کے سامنے رکھ دیے۔ بلکہ

قسمیہ کہا کہ ان جواہرات کے سوا میرے پاس کوئی الماس نہیں ہے اور جو کچھ یہاں ہے بندگان عالی کا مال ہے۔ انہیں دیکھ کر جو اعلیٰ سے اعلیٰ رقم ہو وہ لے لو۔ چنانچہ ایک قطعہ الماس اس نے لے لیا مگر جب تک وہاں رہا کوئی موقع بگاڑ کا نہ ہاتھ آیا۔ چونکہ وکالت کی اصل خدمت یہی تھی اس نے سر دربار سخت کلام کرنے شروع کئے۔ پھر بھی تانا شاہ ایسے معقول جواب دیتا تھا کہ یہ بند ہو جاتا تھا اور کوئی بات ایسی نہ ہوتی تھی جس پر گرفت کر سکے۔ چنانچہ ایک دن تانا شاہ نے اثنائے تقریر میں کہا اگرچہ ہم بھی بادشاہ ہیں مگر اپنے تئیں عالمگیر بادشاہ کے نوکروں میں جانتے ہیں۔ امیر مذکور نے بگڑ کر کہا کہ عالمگیر بادشاہ کے نام کے ساتھ اپنے لئے بادشاہی کا نام لینا آپ کو نہیں چاہیے۔ ابوالحسن نے ہنس کر کہا کہ نہیں تمہاری غلطی ہے اگر ہم بادشاہ نہ ہوں گے تو عالمگیر کو شہنشاہ کون کہے گا۔ آخر باوجود ان سب باتوں کے شہنشاہ ہوس پناہ نے فوج کشی کے سامان کر دیے۔ لیکن اکبر کے آئین اور جہانگیر کی خوش مستیوں نے عہد شاہجہان کے امن و امان میں پرورش پا کر عجیب و غریب رنگ پیدا کئے تھے یعنی سلطنت کی شان و شوکت کے ساتھ فوج کا ڈھنگ بدل گیا تھا۔ چنانچہ جب دیکھنے والے انہیں دیکھ کر تیموری اور بابری سواروں کا اور ان کی بگٹوٹ یلغاروں کا خیال کرتے تھے تو تعجب آتا تھا۔ لشکر کے ادنیٰ ادنیٰ رسالہ دار کا یہ عالم تھا کہ اس کے ساتھ رسالہ ایک دولہا کی برات معلوم ہوتی تھی۔ خیال کرنا چاہیے کہ ایک ایک شاہزادے کا اور خود بادشاہ کی سواری کا کیا عالم ہو گا۔ غرض لشکر شاہی نے نشان چڑھایا اور دکن کو روانہ ہوا۔ سب سے پہلے ایک ہاتھی پر علم اژدہا پیکر، پیچھے اس کے ہاتھیوں پر ہندوستان کا ماہی مراتب اپنی ولایت کے طوغ و علم، برنجی اور فولادی نقارے اور دمامے، بعد ان کے ہزاروں ہاتھی مووج عماری سے سجے۔ سونڈوں میں فولادی زنجیریں نلئے، گلے میں ٹنکلیں، پیشانیاں شام شفق کی طرح رنگین، اس پر سنہری روپہلی ڈھالیں، زربفت کی جھولیں پاؤں تک لٹکتی۔ کسی پر ہووج، کسی پر عماری، ریشمی اور کلابتونی رسوں سے کسی، گردنوں پر مہاوت جن کے گلے میں زربفت کی کرتیاں سر پر جوڑے دار پگڑیاں کمر میں کٹار، ایک ہاتھ میں گجباگ ایک میں

آنکس جھومتے جھامتے چلے جاتے تھے۔ آگے پیچھے چوکٹے۔ سانٹے مار، بھالے بردار، برچھت، باندار، فیلے سلگاتے بھاگے جاتے تھے۔

پھر ہزاروں سواروں کے پرے، سر سے پاؤں تک لوہے میں ڈوبے بہادر نوجوان ترک بچے، افغان، حبشی، راجپوت، دو دو تلواریں باندھے، فولادی خود سروں پر دھرے کمر میں قرولی اور کٹار۔ پشت پر کینڈے کی ڈھال۔ چار آئینہ سجے، کہنیوں تک دستانے چڑھے، ہاتھوں میں سات گز کا برچھا، نگاہوں سے خون ٹپکتا، مونچھوں کو تاؤ دیتے، گھوڑے اڑاتے چلے جاتے تھے۔ پھر ہزاروں سانڈھنیاں خوش رفتار کہ جن کے سو سو کوس کے دام ان پر تانگے راجپوت لال پگڑیاں باندھے، زرد انگر کھے پہنے، آبی بانات کے پاجامے چڑھائے، ہتھیار لگائے مہاریں اٹھائے، جب یہ گزر گئے تو سواری کے خاصے نظر آئے۔ عربی، ترکی، عراقی، یمنی، کاٹھیاواڑ کے دکنی، چاندی سونے کے بھاری بھاری ساز، کسی پر جڑاؤ زین دھرا، کسی پر چار جامہ کسا، قجریاں اور پاکھریں پٹھوں پر پڑیں، جن میں قاقم وسمور کی جھالر، کلابتوں کے پھندنے، گلے میں سراگائے کی چوریاں لٹکتی، سر پر کلغیاں طلائی اور نقرئی ریشمی باگ ڈوریں سائیسوں کے ہاتھ میں الیل کرتے اور چوکریاں بھرتے جاتے تھے ان کے بعد عربی، رومی، تاتاری، فرنگی، ہندی باجے، نقیبوں اور چوبداروں کے آوارے دمامے کی چوٹ کے ساتھ کڑکیتوں کے کڑکوں کا وہ سماں بندھا ہوا کہ بزدلوں کے دلوں میں لہو جوش مارنے لگے ان کے بعد احدیوں اور خواصوں کا انبوہ، کندھوں پر بندوقیں جن پر بانات کے غلاف۔ پھر خاص برداروں کا غول، سروں پر کشمیری شالیں بندھی کمخواب کے انگر کھے، زربفت کی نیما آستینیں پہنے، گجراتی مشروع کے گھٹنے چڑھائے اصفہانی تلواریں سونے مرصع قبضے ہاتھ میں۔ سنہری روپہلی میان کمر میں۔ ان کے بعد سقوں کا غول آیا کہ چھڑکاؤ سے روئے زمین کو ترتازہ کر دیا۔ غلام اور خواجہ سرا انگیٹھیاں اور عود سوز لئے خوشبوؤں سے دماغ معطر کرتے چلے گئے۔ پھر ارکان دربار کے جمگھٹ، بیچ میں شاہ خورشید کلاہ سفید داڑھی، بڑھاپے کا نور منہ پر، ہوادار میں سوار۔ ساتھ ایک خاصے کا گھوڑا پیچھے سونے کی

عماری ہاتھی پر دھری۔ جوریب کا پیمانہ اور کوس کا پیا پڑتا چلا جاتا تھا سواری سے کوس بھر پیچھے سینکڑوں ہاتھی مست، جنگی دیوزاد کی صورت مستکوں پر فولادی ڈھالیں، ایک کالی گھٹا چلی آتی تھی کہ جس سے بجائے پانی کے مستی ٹپکتی تھی۔ پیچھے چیتوں کے چھکڑے، آنکھوں پر زردوزی دبدہ بند، کمر میں کلاتونی اور ابریشمی حلقے پڑے، ساتھ ہی شکاری کتے تازی، ولائتی، بودار، بلڈوگ کہ شیر کا سامنا کریں اور پلنگ سے منہ نہ پھیریں۔ پیچھے کوسوں تک شاہزادوں اور ارکان دولت کے لشکر۔ راجوں اور مہاراجوں کی فوجیں، پیادوں کے غول اور سواروں کے رسالے، رنگارنگ کے نشان جدا جدا پھریرے اڑاتے چلے آتے تھے۔ بہرہ بنگاہ کا تانتا لگا تھا کہ جس کا صبح سے شام تک خاتمہ نہ تھا۔

غرض [37] کہ شاہ خوش نصیب نے پہلے شاہزادوں کو روانہ کیا، انہوں نے جا کر سرحد کے قلعوں سے چھیڑ چھاڑ شروع کی اور بیجاپور اور حیدر آباد پر بھی فوجیں گئیں۔ دکنی جوان ایک ایک قلعہ اور گڑھی پر ایسے جان توڑ کر مٹے کہ بادشاہی سپاہ کے جی چھوٹ چھوٹ گئے اور اورنگ زیبی تدبیریں اور ان کے جاسوسوں کی تحریریں کچھ کام نہ کر سکیں۔ یہ باہر سے بہتیرے بندوبست کرتے مگر وہ بہادرانہ حملوں اور دلاورانہ مقابلوں سے ایسی ایسی زکیں دیتے کہ بادشاہ کے قدیمی جاں نثار اور بڑے بڑے سپہ دار ندامت پر ندامت اٹھاتے۔ آخر محاصرے سے تنگ ہو کر حاکم بیجاپور نے اطاعت اختیار کی اور حیدر آباد اور گولکنڈہ کی نوبت آئی۔ عالمگیر عقل و تدبیر میں سکندر کو اور شجاعت میں رستم و اسفندیار کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور اخبار نویسوں کے بھروسہ پر یہ سمجھے ہوئے تھے کہ کوئی بات مجھ سے مخفی نہیں۔ چنانچہ کسی سردار پر بزدلی کا الزام، کسی امیر پر بے لیاقتی کا جرم قائم کیا بلکہ جن نمک حلالوں نے حد سے زیادہ جاں نثاریاں کی تھیں۔ انہی کو سازش کی تہمتیں لگائیں۔ انتہا یہ کہ ولی عہد سلطنت کو معہ اس کی بی بی کے ادنٰی گنہگاروں کی طرح قید کیا۔ غسل اور حجامت تک بند کر دی اور زیور ضروری اسباب سب چھین لیا اور اس میں بھی شک نہیں کہ طرف ثانی آخر مسلمان تھے اور چونکہ یہ لڑائی بادشاہ نے فقط شوق طبیعت اور وسعت سلطنت کے اشتیاق میں اٹھائی تھی اس میں

لاکھوں مسلمانوں کا خون ناحق بہتا کسی کو بھلا نہ معلوم ہوتا۔ غرض بادشاہی لشکر اور سلطنت کے سامان کے سامنے ایک صوبے کی کیا بساط ہے: برسوں کا طول کھنچ گیا۔ چنانچہ اس عرصے میں بعض قلعے فتح ہوئے۔ بعض کے محاصرے سالہا سال تک قائم رہے۔ آخر خود بدولت پہنچے اور تدبیروں کے جال پھیلانے شروع کر دیے۔ چونکہ لڑائی میں ایسے کام کرنے کچھ فریب نہیں بلکہ سپاہیانہ پیچ ہیں۔ اس لئے سازش کے سلسلے دوڑا کر ابوالحسن کے نوکروں کو توڑنا شروع کیا۔ بہت سے ادھر کے بے وفا ادھر آ گئے۔ شاہ مصلحت پناہ نے ان کے دل بڑھانے اور درجے چڑھانے کے لئے اپنے پنج ہزاری اور ہفت ہزاری منصب داروں کو موقوف کیا اور موروثی کاردار بے کار کر دیے۔ غرض انواع و اقسام کی تدبیریں اور رنگا رنگ کی تجویزیں ہوتی تھیں لیکن چونکہ حق دار کا حق بھی ایک قوی زور رکھتا ہے، اس لئے فتح کی صورت نہ کھائی دیتی تھی بلکہ ہر بات میں ندامت حاصل ہوتی تھی۔ ایک دفعہ بہت سے مشورے اور گفتگو کے بعد یہ ٹھہری کہ خان فیروز جو ان دنوں میں بڑی چلتی تلوار نکلا تھا، رات کو شبخون کرے اور کمندیں ڈال کر قلعے پر چڑھ جائے۔ چنانچہ وہ ایک شب بڑے بڑے جانباز سپاہیوں کو ساتھ لے کر رات بھر اندھیری رات کی چادر میں چھپا رہا۔ صبح ہوتے کمندیں اور زینے لگا دیے اور جب سپاہی ان پر چڑھنے لگے تو حاجی محراب مقرب خاص کہ اکثر معاملوں میں خفیہ نگہداشت اس کا کام تھا، ان کی کارگزاری دیکھنے کے لئے کہیں لگا ہوا تھا۔ وہ اسی وقت دوڑا ہوا آیا۔ بادشاہ ابھی سجادہ پر تھے کہ دور ہی سے مجرے سلام مبارک باد کے کرنے لگا۔ یعنی فوج قلعہ پر چڑھ گئی۔ بادشاہ بھی باوجود اپنی تمکنت و وقار کے خوشی کے مارے اٹھ کھڑے ہوئے اور اشارہ کیا کہ ہوں یعنی فتح کے شادیانے کیوں نہیں بجاتے۔ ساتھ ہی پوشاک پہن کر سواری منگائی اور خود تماشا دیکھنے کو تیار ہوئے۔ تمام آس پاس کے لوگ آتے تھے اور آداب تسلیمات بجا لا کر مبارک بادیں دیتے تھے۔ اتنے میں خبر آئی کہ منصوبہ الٹا پڑا اور جان نثاروں کو بڑی چشم زخم پہنچی۔ صورت یہ ہوئی کہ برجوں کے پہرہ داران کی آہٹ سن کر ہوشیار ہو گئے۔ مگر دغا باز چپکے بیٹھے رہے بلکہ ہتھیار لگا لئے اور

لوہے کے پنجے ہاتھوں پر چڑھا لئے۔ جوں ہی نیچے والوں نے فصیل سے سر نکالا، انہوں نے پہلے ہی وار میں پگڑیاں اور خود اڑا ئے بعد اس کے سر گھسوٹ اور منہ نوچ نوچ کر اس طرح دھکیلا کہ اوپر والوں نے اپنے نیچے والوں کو لیتے ہوئے زمین پر آ کر دم لیا۔ جو زندہ رہے خراب خستہ لوٹتے پیٹتے ڈیروں میں آئے۔ مگر ایک کی صورت نہ پہچانی جاتی تھی۔ بادشاہ کے نمک حلال اخبار نویس اور معتبر جاسوس جن پر کل کاروبار کا دارومدار تھا، انہوں نے اس حملے کے بگڑ جانے کی اصل دریافت کر کے حق نمک ادا کیا اور لکھا کہ دلیروں کی دلیری میں تو کچھ شک وشبہ نہیں مگر حقیقت میں فصیل پر ایک کتا بیٹھا تھا وہ ناپاک ان کی آہٹ سن کر بھونکنے لگا کہ پہرہ دار جاگ اٹھے۔ نہیں تو قلعے کے فتح ہو جانے میں کچھ باقی نہ تھا۔ چنانچہ ابوالحسن اس کتے کی نمک حلالی سے بہت خوش ہوا۔ سونے کی ہنسلی اور زنجیر گلے میں پہنا کر زربفت کی جھول کا خلعت دیا ہے اور وہ منصب وخطاب عطا کیا ہے کہ تمام منصب دار اس سے رشک کرنے لگے ہیں۔ چونکہ ایسی ہی خبریں حضور میں تدبیر سلطنت کی راز سمجھی جاتی تھیں۔ اس لئے شاہ باتدبیر نے بھی اخبار نویس کو خوشنودی مزاج کا پروانہ لکھا۔

ایک دن بہت مینہ برسا۔ قلعے کی فوج اسی عالم میں نکلی اور اس دلاوری سے حملے کئے کہ مورچالوں کے دھوئیں اڑا دیے اور بارہ نامور منصب داروں کو پکڑ کر لے گئے۔ تانا شاہ نے کئی دن انہیں مہمان رکھا اور غلہ اور رسد کے سامان جو انبار در انبار، بھرے پڑے تھے سب دکھائے۔ بعد اس کے خلعت دے کر رخصت کیا اور بادشاہ کے لئے عرضی بھی دی۔ خلاصہ اس کا یہ تھا کہ اختیار یا بے اختیاری سے جو کچھ خطا ہوئی فدوی اس کی سزا کو پہنچا۔ اب امیدوار معافی کا ہوں اور قلعے کا حال یہ ہے کہ اگر حضور نے فتح کیا تو آخر یہ پامال ملک کسی جان نثار کو عطا کر کے تشریف لے جائیں گے وہ جاں نثار آپ فدوی ہی کو تصور فرمائیں۔ حضور پر روشن ہے کہ لشکر منصور کے اس قدر قیام کرنے سے یہ ملک آشیانہ چغد و بوم سے بدتر ہو گیا ہے۔ جس کو آپ مقرر کریں گے وہ اپنے اور اپنے منصب داروں اور فوج اور دفتر کے لئے سال ہا سال تک یہاں کی آمدنی کے علاوہ

لاکھوں روپیہ خزانہ شاہی سے لے گا۔ میں اپنا خراج معمولی بدستور دیتا رہوں گا اور اس کے علاوہ جب آپ تشریف لائیں تو ہر کوس پر لاکھ روپیہ داخل کروں گا۔ بلکہ جتنی دفعہ کہ اب تک حضور مورچے پر آئے اور گئے یا ادھر کی سمت کو قدم رنجہ فرمایا ہے، اس کے شکریے میں معمولی نذرانہ الگ حاضر کروں گا۔ یہ سب باتیں فقط اس لئے ہیں کہ طرفین کے مسلمان اور بندگان خدا ناحق نہ مارے جائیں اور حضور کی سپاہ کے لوگ جو برسوں سے گھر کو ترس گئے ہیں، یہ عیال و اطفال کی جدائی کا رنج نہ اٹھائیں۔ اگر یہ عرض بھی قبول نہ ہو تو اتنی اجازت ضرور ہو کہ پانچ چھ لاکھ من غلہ جو جلال غلام نمک حلال حضور کا خود دیکھ گیا ہے وہ لدوا کر بھیج دوں کیونکہ سنتا ہوں حضور کے لشکر میں رسد کی طرف سے بڑی تکلیف ہے۔

تمام لشکر جو کئی برس سے یہاں پڑا تھا، اس مضمون کو سن کر خوش ہو گیا اور تانا شاہ کی تعریفیں کرنے لگا مگر بادشاہ نے اس کا جواب کچھ نہ لکھا۔ ہاں زبانی بہت سی باتیں کہیں۔ خلاصہ ان کا یہ تھا کہ اگر فرماں بردار بنا ہے تو دروازے کھول دے کہ ہمارے آدمی جائیں اور طوق و زنجیر پہنا کر لے آئیں۔ بلکہ برخلاف اس کے برار کے حاکم کے نام حکم بھیجا کہ پچاس ہزار تھیلے ٹاٹ کے بھیج دو کہ دوبارہ خندق کو بھر کر قلعے پر حملہ ہو۔ اہل فوج سن کر کہنے لگے کہ کاش تانا شاہ کا پانچ لاکھ من غلہ آنے دیا ہوتا کہ بھوکوں کی جانیں بچ جاتیں اور تھیلے خندق کے کام آتے۔

لشکر کے دل شکستوں کے دل بڑھانے کے لئے ایک دن خود بدولت نے وضو کر کے نماز پڑھی اور سجادے پر بیٹھ کر پہلا تھیلا دست مبارک سے سیا، اپنے ہاتھ سے اس میں خاک بھری اور حکم دیا کہ پہلے اسے خندق میں ڈالیں اور ساتھ ہی سرنگیں لگانی شروع کیں۔ چند روز کے بعد ایک دن رپٹ گزری کہ سرنگیں تیار ہو گئیں اور باروت فتیلے سب درست ہیں۔ اسی وقت حکم پہنچا کہ بھیر بنگاہ کے لوگ رات کو قلعے کے پیچھے جا کر چھپ جائیں اور صبح ہوتے خوب دلیرانہ غل مچائیں تاکہ قلعے والے ادھر فصیل پر جھکیں اور یہاں سرنگوں کو آگ دکھائی جائے۔ چنانچہ اسی وقت حکم کی تعمیل ہوئی اور دوسری

طرف کو تمام فوج ہتھیار سجا کر حملے کو تیار کھڑی ہو گئی۔ مگر جب فتیلوں کو آگ دی تو سرنگ باہر کی طرف سے اڑ کر رہ گئی اور مصیبت یہ ہوئی کہ جو خاک پتھر اڑے وہ ادھر ہی آئے۔ چنانچہ لشکر منصور کے صد ہا بہادر اور نامی منصب دار ضائع ہو گئے۔ آخر بادشاہی جاسوسوں نے پھر حق نمک ادا کیا اور سراغ نکالا کہ قلعہ والوں کو خبر ہو گئی تھی وہی چوٹے اندر سے سرنگیں توڑ کا باروت پر الے گئے اور نہر کاٹ کر پانی ادھر توڑ دیا۔ چنانچہ باہر کا حصہ خشک باقی تھا وہ اڑ گیا۔ یہی سبب تھا کہ ملبہ اس کا ادھر ہی زور کر کے آیا اور لشکر کے بہادروں کو تباہ کیا۔ یہاں بادشاہی مورچوں کے لوگ قلعے کی دیوار کی طرف حیران دیکھ رہے تھے کہ کب گرے اور ہم آگے بڑھیں۔ اندر سے قلعے کی فوج بھی آن گری اور مار مار کے مورچوں میں ایک قیامت برپا کر دی۔ آخر بہت سی جانیں دیں اور ان سینہ زوروں سے پیچھا چھڑایا۔ ادھر تو ابھی مردوں اور مجروحوں کو سنبھال رہے تھے کہ دوسرے سردار نے اپنی نقب کو آگ دے دی۔ وہاں بھی دغاباز اپنا کام کر گئے تھے۔ وہ نقب جس قدر اڑی اس سے بھی آفت بری اور پہلے سے بھی دو چند بہادروں کا خون ہوا۔ یہ حال سن کر قہر بادشاہی کے دریا میں طوفان آیا اور خود ہوا دار[38] پر سوار ہو کر مورچے پر آئے اور دھاوے کا حکم دیا۔ بے ادب گستاخوں نے بادشاہ کا بھی خیال نہ کیا۔ ایسی توپیں ماریں کہ کئی گولے چتر شاہی پر تصدق ہوئے اور کئی پاؤں میں گرے۔ برابر سے ایک خواص کا ہاتھ اڑ گیا۔ اس پر بھی شاہ مستقل مزاج شوق فتح میں برابر حملے کا حکم دیے جاتا تھا۔ مگر غضب یہ ہوا کہ باران بے محل آسمان سے نازل ہوا۔ اس نے سارا کام مٹی کر دیا کہ توپ بندوق سے لے کر کمان تک بے کار ہو گئی۔ وہ دمدمے جو لاکھوں روپیہ اور ہزاروں آدمی کی جانفشانی سے تیار ہوئے تھے۔ سب بیٹھ گئے اور جو تھیلا حضور نے بعد نماز کے باوضو سیا تھا وہ بھی بہہ گیا۔ سواری خاصہ کا ایک ہاتھی کہ مبصروں نے چالیس ہزار روپے اس کی قیمت آنکی ہوئی تھی، وہ بھی ساتھ تھا، گولا کھا کر بھاگا اور کیچڑ میں پاؤں پھسل کر حضور کے سر پر قربان ہوا۔ اتنے میں قلعے والے باغی پھر شیر ہو کر اندر سے نکلے۔ حضور فوج کو سنبھال کر نہایت شجاعت اور کمال احتیاط سے پیچھے

ہٹے۔ مگر انہوں نے دمدموں پر آ، توپیں اور بہت سا سامان جو ہزار مشکل سے وہاں تک پہنچایا تھا، آسان لے لیا اور خاطر جمع سے قلعے میں چلے گئے۔ توپیں جو چل سکیں وہ لے لیں، باقی میں میخیں مار گئے۔ دوسرے دن پھر حضور سوار ہوئے اور بہادر حملے کے لئے تیار ہوئے۔

ایسی ایسی باتوں سے جب بادشاہ بہت تنگ ہوئے تو ابوالحسن تانا شاہ کی عملداری کی خلاف شرع باتوں سے ناراض ہو کر حیدر آباد کا نام دارالجہاد رکھا اور جنگ دین کی نیت سے لڑائی شروع کی۔ مگر اپنے لشکر اسلام کے لوگ ایسے بداعتقاد تھے کہ خلیفۃ اللہ کے فتویٰ پر ذرا خیال نہ کرتے تھے بلکہ جہاد تو درکنار لڑنا گناہ محض سمجھتے تھے، جو ادھر کے لوگ ادھر ٹوٹ کر آئے تھے اور انہیں تالیف قلوب کے لئے عہدے ملتے تھے، اسے اپنی حق تلفی سمجھتے اور جو قحط اور بے سامانی اور اہل و عیال کی جدائیوں سے تکلیفیں ہوتی تھیں، انہیں بادشاہ کی بے تدبیری کہتے تھے اور جب اپنی جانفشانی اور حملے ناکام ہوتے تو بادشاہ کی بدنیتی خیال کرتے تھے۔ اگر بادشاہ سازش کی احتیاط کر کے ان کا عہدہ گھٹاتا تو باوجودیکہ خانہ زاد قدیم تھے، پھر بھی برا مانتے تھے اور آپس میں شکایتیں کرتے تھے بلکہ اس کی بدتدبیریوں پر مل کر ہنستے تھے۔ مگر اس پر بھی خود بادشاہ اور اس کے سردار باوفا تدبیر کے رستے میں بال بھر بھی کوتاہی نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ اور سامان جنگ کے ساتھ عاملوں اور ساحروں کے عمل بھی کام میں آتے تھے۔

ایک قلعے کو فوج شاہی گھیرے ہوئے پڑی تھی۔ کوئی مکار عامل بن کر لشکر شاہی میں آیا اور تسخیر کواکب کے دعوے سے قلعے کے فتح کروا دینے کا بیڑا اٹھایا۔ سپاہ اور سپہ سالار بھوکوں کے مارے تنگ آ گئے تھے۔ سب نے غنیمت سمجھا اور اس کی طرف رجوع کیا۔ اس نے عجیب عجیب پکھنڈ باندھے اور بڑے بڑے دعوے کئے۔ بموجب اس کے کہنے کے مورچے کے پاس ایک بڑا کٹ گھڑ تیار ہوا اور اس متفنی نے ایک موٹا روئی دار دگلہ اور ریشم کا بھرا ہوا چغا پہنا۔ اس پر ربر کا لبادہ اوڑھا اور ایک زنجیر طلائی کہ وزن میں سوا دو سیر سے کم نہ تھی۔ ہاتھ میں لے کر بڑے گھمنڈ سے کھڑا ہوا۔ چند الفاظ بے معنی

منتر کے طور پر پڑھنے شروع کیے اور کہہ دیا کہ جس وقت ہم اشارہ کریں اسی وقت حملہ کر دینا۔ اگر چہ اس جعل ساز نے تیر وتفنگ کا بندوبست پکا کر لیا تھا مگر کوئی ٹھنڈا گولا یا پتھر ایسا آ کر لگا کہ خود کٹ گھڑ سے گرا اور گرتے ہی ٹھنڈا ہو گیا۔ آخر دو تین دن کے بعد فتح سے ناامید ہو کر محاصرہ اٹھالیا۔ چنانچہ سب سردار لباس بدل بدل کر چلے اور چلتے ہوئے کسی نے جل کر اس کٹ گھڑ کو بھی آگ لگا دی۔ قلعہ والے پیچھے دوڑے اور چلانے لگے کہ اپنے کٹ گھڑ کو تو جل لینے دو۔ اس کی راکھ منہ پر مل کے جانا کہ اچھی طرح صورت بدل جائے۔

یہ سب باتیں تو تھیں مگر بادشاہ باتدبیر نے جو خفیہ سازشوں کی سرنگیں لگائی تھیں وہ سب سے زیادہ کارگر ہوئیں۔ فی الحقیقت ایسی مردآزمائی کے وقت میں راہ رفاقت پر ثابت قدم رہنا مردوں کا کام ہے۔ چنانچہ بہت سے نامرد نمک حرام اپنے ولی نعمت کو چھوڑ کر ادھر سے ادھر آن ملے اور چونکہ وہ اس ملک کے عادات اور سلطنت کے معاملات سے بخوبی واقف تھے اس لئے تانا شاہ کو کہ بے یار و مددگار دشمن کے منہ کا شکار رہ گیا تھا بالکل ضعیف کر دیا۔ باوجود اس کے وہ استقلال کی تصویر اپنی جگہ سے نہ ہلی اور باوفا نمک حلال اس کے اس طرح لڑتے اور جانیں فدا کرتے رہے کہ جانبازی اور جاں فشانی قیامت تک ان کے نام کی قسم کھایا کرے گی۔ مگر ساری مہم کا خون ایک نمک حرام بے ایمان کی گردن پر ہوا۔ یعنی قلعے میں ایک دروازے پر کسی افغان سردار کے ماتحت فوج تھی، وہ بے وفا مل گیا اور آقا کا گھر لگاڑ کر آخرت کا عذاب اپنی گردن پر لیا۔ چنانچہ دن کو بڑے زور سے لڑائی ہوئی اور دن بھر اہل قلعہ نے اس زور و شور سے فوج شاہی کے حملوں کو دفع کیا کہ سب کے منہ پھر پھر گئے۔ شام کو طرفین کے بہادر اپنی اپنی فوجیں لے کر اسی دروازے کی طرف پہنچے۔ جدھر افغان مذکور کا مورچہ تھا۔ چنانچہ اس نمک حرام نے چپکے سے دروازہ کھول دیا۔ فصیلوں میں بھی جا بجا سوراخ ہو گئے تھے۔ تمام فوج شاہی سیلاب کی طرح قلعے میں گھس گئی اور دفعۃً ایک غل اٹھا کہ تمام قلعے میں ہل چل پڑ گئی۔ جو جان ہار تمام دن توپ وتفنگ سے سینہ بہ سینہ رہے تھے پھر دوڑے اور

باقی رات اس طرح کی تلواریں مار مار کر کاٹی کہ وفاداری کے چہرے گلزار اور جان نثاری کے پھول شاداب ہو گئے۔ غرض جب صبح نے رات کا گریبان چاک کیا اور تاروں نے آنکھوں میں آنسو ڈب ڈبا کر دامن سحر میں منہ چھپایا تو فتح یابوں نے اور بھی زور دیا اور تانا شاہ کو موت سامنے دکھائی دی۔ ساتھ ہی حرم سرا سے فریاد و زاری کا غل اٹھا۔ اس وقت دیوان خاص سے اٹھ کر گھر میں گیا۔ در و دیوار پر اداسی اور سوگواری برس رہی تھی۔ ہر طرف نظر حسرت سے دیکھا۔ ہر ایک کو سامنے بلا کر تشفی اور دلاسا دیا اور ایک ایک سے حق بخشوا کر رخصت ہوا۔ بعد اس کے باہر آیا اور اسی صبر و وقار سے مسند پر بیٹھ گیا۔ خبردار نے خبر کر دی کہ چند سردار فوج عالمگیری کے شاہزادے کے دربار سے اس طرف رخصت ہوئے ہیں۔ چونکہ اس کے کھانے کا بھی وقت تھا اس واسطے بموجب معمول کے بکاول کو حکم بھیجا اور بن بلائے مہمانوں کے انتظار میں توقف کیا۔ باوجود اس کے چہرے پر وہی بشاشت تھی اور تیوری پر بل تک نہ تھا۔ اتنے میں سرداران مذکور ہتھیار سجے، ننگی تلواریں ہاتھوں میں لئے پہنچے۔ اس صاحب اخلاق نے خود سلام علیک میں سبقت کی، پھر بھی تانا شاہ تھا بادشاہی آن بان کو نہ چھوڑا۔ یعنی ہاتھ سر پر نہ رکھا۔ مگر نہایت گرم جوشی اور تپاک سے اور آداب ریاست کے لحاظ سے بات کی۔ اس کی نیک نیتی نے ایسا رعب ڈالا کہ وہ بھی کچھ کہہ نہ سکے اور آ کر خاموش بیٹھ گئے۔ اتنے میں روز روشن ہو گیا تھا۔ بکاول نے عرض کی کہ خاصہ تیار ہے۔ تب ان سے اجازت چاہی اور انہیں بھی چلنے کے لئے کہا۔ اگرچہ کئی عالمگیری نمک خوار اجازت کے روادار نہ تھے مگر کچھ انسانیت کے نمک پروردہ بھی ان میں تھے۔ چنانچہ انہوں نے اشارہ کیا کہ جو کچھ ہونا تھا وہ ہو چکا۔ ایسی ادنیٰ بات پر حکومت جتانی تنگ ظرفی معلوم ہو گی۔ چنانچہ کھانے کی اجازت دی اور خود بھی شریک ہوئے۔ ایک سردار نے طعن سے کہا کہ یہ کیا وقت کھانے کا ہے۔ تانا شاہ نے نہایت بے تکلفی سے کہا کہ ہاں میں اسی وقت کھانا کھایا کرتا ہوں۔ اس نے کہا یہ تو میں جانتا ہوں مگر اس حال میں آپ کا جی کھانے کو کیونکر چاہتا ہے۔ جواب دیا کہ البتہ علی العموم تو لوگوں کا یہی حال اور خیال ہے مگر انسان کو خدا

پر بھی نظر رکھنی چاہیے۔ جو شاہ و گدا دونوں کا خالق ہے۔ باپ دادا نے نہایت فارغ البالی سے عمر گزاری۔ میں نے چند روز نہایت فقیری اور تنگ دستی اٹھائی۔ پھر خدا کی عنایت ہوئی تو اس بے مقدار کو اس درجے پر پہنچا دیا کہ جس کا وہم وگمان بھی نہ تھا یعنی ایک دم میں بادشاہ ہو گیا۔ الحمد للہ کہ اب کوئی آرزو باقی نہیں لاکھوں حاصل کیے اور لاکھوں ہی دیے۔ عالم سلطنت میں جو ناشائستہ عمل ہوئے اس کی تنبیہ و تادیب کے لئے خداوند عالم نے بادشاہت لے لی۔ مگر الحمد للہ کہ استقلال اور اختیار کا سر رشتہ اس طرح میرے ہاتھ میں رکھا ہے غرض کھانا کھا کر پھر آیا۔ آپ پان کھایا اوروں کو کھلایا، عطر لگایا اور اسی آن بان اور دل کے اطمینان سے سوار ہو کر چلا۔ قلعے کے دروازے پر اعظم شاہ ایک مختصر خیمے میں بیٹھا تھا اور دم دم کی خبریں پہنچ رہی تھیں۔ اس کے پاس لے گئے ملاقات کے وقت گلے سے نایاب موتیوں کی ایک مالا اتار کر شاہ زادے کو تحفہ کے طور پر دی۔ بعد اس کے دربار شاہی میں آیا۔ یہاں سوائے ذلت و خواری کے اور کیا توقع تھی۔ چنانچہ قید ہو کر دولت آباد کے قلعے میں گیا اور وہاں سے عالم بقا کو پہنچا۔

عالمگیر دکن کے ملکوں کا انتظام کر رہا تھا کہ بڑھاپے کے سبب سے بیمار ہوا۔ جب وقت قریب آیا تو ملک کو تین حصوں میں تقسیم کر کے تینوں بیٹوں کے لئے وصیت نامہ لکھ دیا اور آپ اس ملک فنا سے رخصت ہوا۔

عالمگیر کے بلند ارادے اور مستحکم استقلال اکثر موقع پر قابل تعجب تھے۔ چنانچہ اکبر کے عہد سے یہ آئین مقرر تھا کہ بادشاہ ہفتے میں دو دفعہ ہاتھیوں کی لڑائی کا تماشا دیکھا کرتے تھے۔ شاہجہان کے سامنے ایک دفعہ دو مست ہاتھی لڑ رہے تھے، خود بادشاہ جھروکوں میں بیٹھے ہوئے تھے اور اکثر شاہزادے و امراء وغیرہ خاص و عام نیچے تماشا دیکھ رہے تھے۔ عالمگیر کی چودہ برس کی عمر تھی اور گھوڑے پر سوار کھڑا تھا۔ اتفاقاً ایک ہاتھی بھاگا اور جدھر یہ کھڑا تھا ادھر ہی آیا۔ سب بھاگ گئے مگر یہ اسی طرح اڑا رہا اور جب ہاتھی حملہ کر کے آیا تو ایک برچھا کان میں مارا کہ سر میں غرق ہو گیا۔ ہاتھی نے چاہا کہ گھوڑے کو سونڈ میں لپیٹ کر دے مارے۔ گھوڑا اس طرح چمکا کہ یہ پشت سے گرا اور

پھر اٹھ کر تلوار سونت ایک ہاتھ سونڈ پر مارا۔ اس عرصے میں اور جان نثار آ پہنچے اور ہاتھی بھاگ گیا۔ بادشاہ نے ہزاروں روپے تصدق کیے اور سمجھایا کہ نور چشم ایسے موقع پر اس طرح اڑنا نہیں چاہیے۔ ہٹ جانا چاہیے تھا۔ اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا کہ غلام ہٹنے کو پیدا نہیں ہوا۔ اس استقلال نے سخت مزاجی کو پہنچ کر یہاں تک نوبت پہنچائی کہ غیر تو درکنار سگے بھائیوں کا وہ حال کیا۔ باپ کو ایسا قید کیا کہ قید زندگی سے چھوٹ کر اس کی قید سے چھوٹا۔

مشہور ہے کہ عالم قید میں ایک دن باپ نے کہلا بھیجا کہ خالی بیٹھے بیٹھے جی گھبراتا ہے چند لڑکے ہی بھیج دیا کرو کہ انہیں سبق پڑھا کر دل بہلایا کروں۔ عالمگیر نے سن کر کہا کہ اب تک حکومت سے حضرت کا جی نہیں بھرا؟

عالمگیر کو ہر قسم کے لہو ولعب سے، یہاں تک کہ شعر وسخن سے بھی بالکل رغبت نہ تھی۔ چنانچہ دیوان حافظ کا درس مکتبوں سے موقوف کروا دیا تھا مگر باوجود اس کے گلستان اور دیوان حافظ ہر وقت سرہانے دھرا رہتا تھا۔ بعض مصاحبوں نے اس کا سبب پوچھا۔ جواب دیا کہ لوگوں کی طبیعتیں خام ہیں۔ حافظ کے اصل معنی پر خیال نہیں کرتے۔ ناحق شراب گلنار اور معشوق گل رخسار کے نام سن کر مست ہو جاتے ہیں۔ اس لئے انہیں اس کا دیکھنا جائز نہیں۔

شاعروں کا بازار اس کے عہد میں سرد ہو گیا تھا مگر دربار میں اکثر امیر بھی موزوں طبع اور عالی دماغ تھے۔ بعض دفعہ ایسے ایسے قصیدے کہہ کر لائے کہ خود بھی محظوظ ہو کر مکرر ان کے اشعار کو پڑھتا رہا۔ مگر جب وہ پڑھ چکے تو ان سے فہمائش میں یہ کہا کہ آئندہ ایسے بے فائدہ کام میں اوقات ضائع نہ کرنا۔ باوجود اس کے کبھی کبھی خود بھی شعر کہتا تھا۔ چنانچہ اسی کا شعر ہے:

غم عالم فراوان ست و من یک غنچہ دل دارم
چساں در شیشہ ساعت کنم خاک بیاباں را

لطیفہ۔ حالت شہزادگی اور عالم نوجوانی میں ایک حرم سے محبت تھی وہ قضائے الٰہی

سے مرگئی۔ چنانچہ نہایت رنج ہوا اور جی بہلانے کے لئے دوسرے دن شکار کو سوار ہوا۔ جنگل میں جا کر جب خواص خدمت گار ادھر ادھر پھیل گئے تو عاقل خاں نام ایک امیر۔ چپکے سے عرض کی کہ اس رنج و ملال میں شکار کی تکلیف فرمائی۔ آبدیدہ ہو کر یہ شعر پڑھا

نالہائے کلبہ احزاں تسلی بخش نیست
در بیاباں میتواں فریاد خاطر خواہ کرد،

عاقل خاں نے اپنا شعر پڑھا:

عشق چہ آساں نمود آہ چہ دشوار بود
ہجر چہ دشوار بود یار چہ آساں گرفت

یہ سن کر زار زار آنسو جاری ہو گئے۔ جب دل ٹھیرا تو پوچھا کہ یہ کس کا شعر ہے اس نے عرض کی ایسے شخص کا ہے جو حضور کے سامنے اپنے تئیں شاعر نہیں کہہ سکتا۔ مسکرائے اور کئی دفعہ پڑھوایا۔

قدیم سے قاعدہ تھا کہ جب بادشاہ تخت پر بیٹھتا تھا تو سب شعرائے پائے تخت اس کا سکہ کہہ کر لاتے تھے اور جس کا سکہ پسند آتا تھا اسے ایک لاکھ روپیہ انعام ملتا تھا۔ ان کے لئے بھی لوگ سکے کہہ کر لائے۔ انہوں نے کہا کہ ہم نے خود بھی اپنا سکہ کہا ہے۔ تم سب دیکھو اور اپنی رائے ظاہر کرو۔ چنانچہ روپیہ کے لئے ہے کہ:

سکہ زد در جہاں چو بدر منیر
شاہ اورنگ زیب عالمگیر

اور اشرفی پر:

سکہ زد در جہاں چو مہر منیر
شاہ اورنگ زیب عالمگیر

سب نے متفق اللفظ اقرار کیا کہ حقیقت میں اس سے بہتر سکہ نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ وہی سکہ جاری ہوا۔

سیوا جی

کہتے ہیں کہ دکن کے ملکوں میں مالو جی نام ایک سردار تھا۔ خاندان اس کا بھوسلا کہلاتا ہے اور چند خود اسپہ سواروں سے بیجاپور کے دربار کا ملازم تھا۔ انہی ممالک میں لکھ جی جادو راؤ بھی ایک نامی سردار تھا کہ دربار مذکور سے دہ ہزاری منصب رکھتا تھا اور مالو جی کی نسبت ذات میں بالا دست شمار ہوتا تھا۔ ایک دن جادو راؤ کے گھر میں کسی تہوار کی تقریب سے بڑا جلسہ ہوا۔ تمام ٹھاکر سردار آ کر جمع ہوئے۔ مالو جی بھی اس جلسے میں آیا اور ساتھ اپنے چھوٹے سے بیٹے کو بھی لایا بچے کی پانچ برس کی عمر تھی اور ساہجی نام تھا۔ محفل میں کھیلتا پھرتا تھا۔ اتفاقاً جادو راؤ کی چھوٹی سی بیٹی بھی کھیلتی ہوئی وہیں آ گئی۔ چونکہ صحبت بے تکلف تھی۔ جادو راؤ نے دونوں بچوں کو دونوں زانوؤں پر بٹھا لیا اور باتوں میں کہنے لگا کہ بچپنے کا زمانہ عجب زمانہ ہے اور اس عمر میں اگر بہار زندگی پوچھو تو ان کا بیاہ رچانا ہے۔ مالو جی سنتے ہی بول اٹھا کہ ساری سبھا گواہ رہے میرے فرزند کا رشتہ جادو راؤ جی کی بیٹی سے ہو گیا۔ اگرچہ جادو راؤ کی عالی خاندانی اور بلند نظری اس بات کی برداشت نہ کر سکتی تھی مگر مالو جی کا اقبال بھی اب اوج موج دکھانے لگا تھا، اس لئے بدمزہ ہو کر چپکا ہو رہا۔ چند روز کے بعد مالو جی کا ستارہ اور بھی چمکا اور احمد نگر کے دربار سے پنج ہزاری کا منصب اور ملک حاصل کیا جس کا راج گدی مقام پونا تھا۔ مگر اس سگائی کا دعویٰ اس نے اب بھی نہ چھوڑا۔ اور فی الحقیقت اب یہ دعویٰ کچھ بے جا بھی نہ تھا۔ چنانچہ جادو راؤ بھی راضی ہو گیا۔ چند روز کے بعد ادھر ساہجی جوان ہو گیا، ادھر لڑکی نے ہوش سنبھالا۔ غرض دونوں کی سنجوگ نے ایسا زور کیا کہ خاندان کی

ریت رسوم کے بموجب شادی ہوگئی۔ بڑے بڑے حاکم اور فرماں روا بیاہ میں آئے۔ احمد نگر کا بادشاہ اپنے دربار سمیت براتیوں میں شامل ہوا لیکن عجب شبھ لگن اور مبارک گھڑی سے یہ بیاہ رچا تھا جس کا گل مراد یہ کھلا کہ چند سال کے بعد سیوا جی پیدا ہوئے جن کے قدم سے مرہٹے کے خاندان میں حکومت کی بنیاد پڑی۔ سیوا جی ۳ برس کا تھا جو ساہجی اس کے باپ نے ایک اور شادی کر لی اور بیٹے کو ماں کے پاس بھیج دیا۔ وہاں دادا جی نام ایک نامی گرامی پنتھ کا گرو تھا۔ تعلیم و تربیت کے لئے اس کے سپرد کر دیا۔ یہ ہونہار لڑکا وہاں پرورش پاتا رہا اور وہ تربیت پائی جو ایسے ہونہار اولوالعزم کے لئے چاہیے تھی۔ پڑھنے لکھنے کی طرف تو خیال نہ کیا مگر تیر اندازی، نیزہ بازی، شمشیر زنی، شہسواری وغیرہ جنگیوں کے ہنر سب حاصل کئے۔ جب ہوش سنبھالا تو استاد کی تربیت اور جوہر ذاتی سے ایک جتی ستی پکے عقیدے کا ہندو نکلا۔ اسے اپنی زبان میں ساکھے اور کہانیاں اور نظم کی داستانیں سننے کا بہت شوق تھا۔ چنانچہ ان کے جوش کلام نے دل میں اور بھی خروش پیدا کیا اور یہ شوق ہوا کہ جو مضامین ان کہانیوں میں سوئے ہوئے ہیں انہیں میں میدان جنگ میں للکار کر بیدار کروں۔ جب ۱۶ برس کا ہوا تو جوان، جوان پہاڑی اور جنگلی اہل وطن موجود تھے۔ وہیں کے جنگل اور پہاڑوں میں چرند و پرند کے شکار کی مشق کرتے کرتے آدم شکاری اور راہ ماری کے میدانوں میں جا پڑا۔ اس اتفاقی تعلیم نے اس ملک کے تمام رستے اور گھاٹیوں کے مقاموں سے آگاہ کیا گویا جنگل اور پہاڑوں کے بن اس کے دل کی امنگ کے لئے پرورش کا پنگوڑا ہو گئے۔ جب ۱۹ برس کا ہوا تو لوٹ مار کرتے کرتے ایک قلعہ مار لیا۔ دو برس کے بعد ایسا ہو گیا کہ خود ایک جنگی قلعہ بنا کر برج و خندق سے خاطر خواہ مستحکم کیا۔

بیجاپور کا بادشاہ یہ خبر سن کر صبر نہ کر سکا اور دادا جی ان کے استاد گرو سے جواب طلب کیا۔ اگرچہ دادا جی اپنے نونہال کو پھلتا دیکھ کر دل میں تو پھولا نہ سماتا تھا مگر ظاہر میں صاف انکار کر گیا اور لکھا کہ لڑکے نے جو کچھ کیا اپنی شوخ مزاجی سے کیا ہوگا مجھے اس معاملے سے مطلق علاقہ نہیں۔ چند روز کے بعد دادا جی بیمار ہوا۔ جب حال اپنا غیر دیکھا

تو سیواجی کو بستر مرگ پر بلا کر پاس بٹھایا اور کہا کہ اے فرزند ہمیں قضائے آسمانی سے وہ سفر پیش آیا ہے جس سے کسی فرد بشر کو چارہ نہیں اور رستہ اس کا ایسا ہے جہاں سے پھرنے کا گزارا نہیں تجھے اس دریائے بے بقا میں پار اترنا ہے اور بڑی بڑی مہموں کو سر کرنا ہے۔ مگر دیکھتا ہوں کہ اکیلا ہے اور دنیا کا ابھی کچھ دیکھا نہیں ہے اس لئے چند نصیحتیں کرتا ہوں اور خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ سب سے اول یہ کہ دھرم گیان پر قائم رہنا اور گائے برہمن کا ادب رکھنا۔ پھر خاندان کی حمایت کو لازم سمجھنا۔ سپاہی کو جان سے پیارا سمجھ کر اس کی دلداری اور پرورش میں ساعی رہنا۔ ٹھاکر اور ٹھاکر دوارے کی حفاظت فرض عین سمجھنا اور جس میدان میں قدم مارا ہے پیچھے نہ ہٹانا آگے جو کرے سو خدا۔ داداجی نے تو یہ کہہ کر قضا کی۔ سیواجی نے فرزندی دعوئی سے اس کی جاگیر اور مال ومتاع پر قبضہ کیا۔ لیکن جو روپیہ خزانے اور علاقے سے ہاتھ آیا اسے تمام فوج پر تقسیم کر دیا اور ملک گیری کے میدان میں دل کھول کر گھوڑے دوڑانے شروع کر دیے۔ پہلا شکار تو یہی مارا کہ کوئی بادشاہی سردار تین لاکھ اشرفی کا خزانہ بیجاپور کو لئے جاتا تھا، اس پر جا گرا اور سارا خزانہ لے کر پہاڑوں میں گھس گیا۔ چند روز کے بعد ایک انبوہ کثیر کے ساتھ لے نکلا جن کے نقاروں سے گیان دھرم کی گونج اٹھی اس حکمت سے تمام گرد و پیش کے علاقوں میں ایک طوفان بچ گیا۔ چنانچہ اکثر قلعے فتح کئے اور قلعہ داران کے گرفتار کر لئے۔ مگر جب انہیں سامنے بلایا تو بہت عزت سے پیش آیا اور انعام واکرام دے کر رخصت کیا۔

سیوائی کی طبیعت جس طرح گیان دھرم کی طرف راغب تھی، اسی طرح مسلمانوں کے رسم ورواج سے متنفر تھی اور اس سے زیادہ حمایت قومی کے حق میں سرگرم تھی۔ چنانچہ یہ سب باتیں اس وقت کی چالوں کے لئے ایسی موافق پڑیں کہ خاص وعام ہنود کے دلوں میں شوق کے ولولے جوش مارنے لگے اور ترقی کے دریا لہرانے لگے اور جب مضامین جمع ہو گئے تو شاعری آسان ہو گئی۔ چنانچہ اس نے بھی جتی ستی ہو کر بھگتوں کی صورت بنائی اور اس قسم کے اشارے کرنے لگا جس سے معلوم ہو کہ اس کے حال پر اوتاروں اور دیوی دیوتاؤں کی طرف سے ضرور دیا کی نگاہ ہے۔

بیجاپور کا بادشاہ یہ ہتھکنڈے دیکھ کر آگ بگولا ہو گیا۔ ساہجی یعنی سیواجی کا باپ بادشاہ مذکور کی طرف سے کرناٹک کا صوبہ تھا۔ اس سے بدعملی کا جواب طلب ہوا مگر بابا جی نے وہی معمولی جواب دیا جو داداجی نے دیا تھا۔ چنانچہ بادشاہ نے کسی بہانے سے اسے دربار میں بلا کر قید کر لیا اور کہا کہ اگر تمہارا بیٹا اپنی حرکتوں سے باز نہ آئے گا تو قید خانے کا دروازہ تیغہ کر دیا جائے گا کہ پھر جیتے جی نکلنا نصیب نہ ہو گا۔ سیواجی اس وقت بائیس برس کا نوجوان تھا یہ خبر سن کر رنج تو بہت ہوا۔ مگر ذرا نہ گھبرایا بلکہ تدبیر کے رستے پر متوجہ ہوا اور سوچا کہ اس کڑے وقت میں بادشاہ دہلی کی طرف رجوع کرنی چاہیے۔ چنانچہ یہ منصوبہ اس کا نہایت ٹھیک پڑا اور انتہائے مطلب یہ ہے کہ شاہجہان کے دربار سے پنج ہزاری کا منصب حاصل کر لیا۔ اس عرصے میں ساہجی کے بوڑھے نصیبے نے بھی آنکھ کھولی یعنی اس کے علاقے پر کوئی غنیم آ کر گرا۔ اس وقت دربار بیجاپور میں صلاح ہوئی کہ ساہجی کو رہا کر کے اس کے علاقے پر بھیج دینا چاہیے۔ چنانچہ اسے طوق و زنجیر سے نکال بحالی کا خلعت پہنا دیا اور وہ کہن سال بوڑھا موچھوں پر تاؤ دیتا پھر اپنی حکومت پر آ قائم ہوا۔ سیواجی کا زور اور اطمینان دوبالا ہو گیا۔ چنانچہ پونا کے راجہ کو جا مارا۔ کئی قلعے تسخیر کیے۔ کئی قلعے خود تعمیر کیے۔ اورنگ زیب شاہزادگی کے عالم میں دکن کی طرف ملک گیری کر رہا تھا۔ اس سے مل کر سند شاہی کو تازہ کیا اور اپنے ملک مقبوضہ کے زور کو زیادہ تر پختہ کر کے خدمت گزاری کے لئے ساتھ ہو گیا۔ لیکن تھوڑے دنوں کے بعد جو ایک موقع ہاتھ آیا تو اس کے علاقے میں بھی کئی جگہ ہاتھ مارا اور پھر ایسا صاف اڑ گیا کہ اورنگ زیب بھی دیکھتا رہ گیا۔ چند روز کے بعد شاہ جہان کی بیماری کے سبب سے شاہزادے کو ہندوستان کی طرف پھرنا پڑا۔ اس نے پھر موقع پایا اور وکیل بھیجا کہ میری پہلی خدمتوں پر لحاظ ہو اور قصور معاف ہو۔ چونکہ وقت نازک تھا اس لئے شاہزادے نے فرمان معافی بھیج کر لکھا کہ قصور معاف، ملک برقرار۔ لیکن اپنی فوج ہمارے ہمراہ رکاب کر دو۔ جب تک شاہزادہ ادھر رہا سیواجی زبانی باتوں میں ٹالتے رہے۔ مگر فوج کے بھیجنے کو صاف اڑا گئے۔ جب اورنگ زیب ادھر آیا اور ہندوستان اور

پنجاب کی مہموں میں لگ گیا تو دکن کا میدان خالی ہوا۔ انہوں نے پھر بادشاہ بیجاپور کو دق کرنا شروع کیا۔ چنانچہ وہاں سے افضل خاں نام ایک سردار بادشاہی دھوم دھام میں جلو میں لے کر روانہ ہوا اور حکم ہوا کہ سیواجی کا خاطر خواہ علاج کر کے پھرے۔

افضل خاں پرانا سپہ سالار بڑی آن بان سے اپنے نمود کے زور میں بھرا چلا آتا تھا۔ اس نوجوان کو جب خبر پہنچی تو اپنی کمزور حالت کو اور بھی خوف زدہ بنا کر اپنے قلعہ میں ہو بیٹھا اور عذر معذرت کے خطوط بھیجنے شروع کر دیے۔ خان ایک تو پہلے ہی ہوا میں بھرے ہوئے تھے، اب اور بھی پھولے مگر سیواجی نے بڑا پیچ یہ کھیلا کہ افضل خاں کا دیوان ایک برہمن تھا اسے بلا لیا۔ اس نے خاندان مذکور کو بالکل منقوش خاطر کر دیا کہ لڑکے میں اصلاً تاب مقابلے کی نہیں۔ ایک قلعے میں پناہ پکڑ کر بیٹھ گیا ہے اور اپنے حال میں سخت پریشان ہے کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے۔ افضل خاں شیر ہو کر اور آگے چلا اور انہی پیغام سلاموں میں بہت سے بن اور کوہستان دشوار گزار طے کرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ جب قلعے کے نیچے دامن کوہ میں پہنچے تو سیواجی نے وکیل بھیجا اور کہا کہ آپ بزرگ ہیں، آپ کو میرے حال پر شفقت اور مرحمت کرنی چاہیے۔ اگر آپ کی بدولت دربار سے میری عزت میں فرق نہ آئے تو مجھے اطاعت اور جان نثاری میں کچھ عذر نہیں۔ مگر چند باتیں زبانی کہنی ہیں۔ آپ ادھر سے خود تشریف لائیے ادھر سے میں حاضر ہوتا ہوں۔ بالمواجہ ان کا فیصلہ ہو جائے۔ خان مذکور چند سپاہیوں کو ساتھ لے کر دامن کوہ سے قلعے کی طرف بڑھا تھا جو دیوان مذکور کی معرفت پھر عرض ہوئی کہ مجھ بے مقدار کو اس جمعیت سے بھی اندیشہ آتا ہے۔ میں حاضر ہوتا ہوں میرے ساتھ بھی خدمت گار سے زیادہ نہیں۔ آپ بھی اپنی جمعیت کو وہیں چھوڑ دیں خان بہادر نے اپنی خانی کے گھمنڈ میں انہیں بھی وہیں چھوڑا۔ فقط ایک خدمت گار ساتھ، گلے میں تن زیب کا جامہ، ہاتھ میں ایک سیدھی سیف کہ وہ بھی کسی اور ارادے سے نہ تھی۔ فقط نمائش اور زیبائش کی غرض سے لی تھی، خراماں خراماں قلعہ کی طرف چلے۔ ادھر سے سیواجی ایک روئی دار زرد وگلہ پہنے اس کے نیچے فولادی زرہ، بغل میں تلوار دبائے، سکڑے سمٹے

نمودار ہوئے مگر اس طرح کہ گویا ڈرے جاتے ہیں اور خان کے رعب کے مارے چل بھی نہیں سکتے۔ خان بہادر نے اس کی سوکھی سہمی صورت کو تیوری بدل کر ترچھی نگاہ سے دیکھا اور بڑے فخر کے ساتھ گلے ملنے کو ہاتھ بڑھائے۔ سیواجی نے دونوں ہاتھوں پہ فولادی بگ نونہ [39] چڑھائے ہوئے تھے، گلے ملتے ہی اس طرح چبھوئے کہ اس کی پیٹھ کے پار ہو گئے۔ خان بے چارہ ابھی حیران ہی تھا کہ یہ بلا کیا ہوئی؟ جو اس نے ایک بچھوے سے اس کا کام تمام کر دیا۔ اگرچہ افضل خاں نے بھی ایک ہاتھ مارا مگر سیواجی کے خود نے بچا لیا۔ سیواجی نے کمال یہ کیا تھا کہ جنگل کی جھاڑیوں میں جا بجا اپنے سوار لگا رکھے تھے۔ چنانچہ اسی وقت انہیں ہرکارے دوڑا دیے۔ خان کا لشکر جہاں جہاں بے فکر اور بے خبر پڑا تھا یہ چاروں طرف سے گھر کر اس طرح اس پر گرے کہ سب تتر بتر ہو گئے اور بے شمار لوٹ ہاتھ آئی۔ چند روز کے بعد جب ادھر سے پیٹ بھر کر خاطر جمع کر لی تو عالمگیر کو دق کرنا شروع کیا۔

عالمگیر اب بالاستقلال بادشاہ ہو گیا تھا اور سیواجی اس عرصے میں کھلا میدان پا کر چاروں طرف دوڑتا پھرتا تھا۔ چنانچہ اس کے بندوبست کے لئے عالمگیر نے شائستہ خاں حاکم اورنگ زیب آباد کے نام فرمان جاری کیا۔ شائستہ خاں نے اس کی دست درازیوں کی روک تھام شروع کی اور فوج لے کر مارتا پیٹتا آگے بڑھا۔ اچھے اچھے میدان ہوئے۔ اور مرہٹے ان میں ایسے ایسے اڑے کہ مر مر کے ہٹے۔ آخر شائستہ خاں نے بڑھتے بڑھتے خاص پونا میں جا کر مقام کیا اور اتفاق یہ کہ اس محل میں سکونت اختیار کی جہاں سیواجی نے بچپنے میں پرورش پائی تھی۔ الغرض یہاں بیٹھ کر ادھر ادھر فوج پھیلا دی اور اس طرح کا کڑا بندوبست کیا کہ اکیلا دکیلا آدمی بھی بے خبر نہ نکلنے پاتا تھا۔ لشکر شہر کے گرد پڑا تھا اور آپ خاطر جمع سے محلوں میں بیٹھا تھا۔ چونکہ پونا کی سرزمین وہی میدان تھے جہاں سیواجی شیر نے بچپن میں کود پھاند کر ملک گیری کی مشق کی تھی، اس لئے باوجودیکہ شاہی فوج ہر طرف پھیلی تھی مگر آس پاس داؤں گھات میں لگا ہوا تھا۔ چنانچہ سوچ سوچ کر یہ رستہ نکالا کہ شائستہ خاں کی فوج میں ایک سپاہی نوکر تھا اس سے سازش

کی اور وہ اس کی صلاح سے ایک برات بنا کر شہر کو لے چلا۔ اس نے سوسو پچاس پچاس پیادے کچھ کچھ فاصلے سے راہ میں چھوڑے اور آپ پچیس جانبازوں کے ساتھ براتیوں میں مل گیا۔ سر شام برات شہر کے قریب پہنچی اور بے تکلف لشکر کے بیچ سے گزر شہر میں داخل ہوئی۔ شیر دلیر نے محل کے نیچے کھڑے ہو کر دم لیا اور چاروں طرف نگاہ دوڑائی، دیکھا کہ سب اپنے اپنے کاروبار میں بے خبر ہیں۔ یہ پچھواڑے کے دروازے سے اندر داخل ہو کر دفعتہً بادل کی طرح گرجا اور ایسا بلائے ناگہانی کی طرح پہنچا کہ شائستہ خاں حیران رہ گیا۔ ایسے وقت میں جان بچا کر نکل جانا فتح عظیم سمجھا۔ چنانچہ گھبرا کر ایک کھڑکی سے کود کر بھاگا بلکہ اپنے ہاتھ کی دو انگلیاں بھی وہیں چھوڑ گیا۔

شائستہ خاں تو ناشائستگی کا داغ پیشانی پر لے کر بھاگا مگر اس کا بیٹا اور بہت سے رفیق مارے گئے اور سیوا جی اپنا کام کر، جس طرح آیا تھا اسی طرح پاک صاف نکل گیا۔ راہ میں جہاں جہاں سپاہی چھوڑ آیا تھا وہ بیٹھے اس کی سیوا کر رہے تھے۔ چنانچہ انہیں لیتا اور نقارے پر فتح کا ڈنکا دیتا اپنے مورچوں میں جا پہنچا۔ اس کامیابی کی اس کے لشکر میں بڑی بڑی خوشیاں ہوئیں اور ایسی روشنی کی کہ ۱۲ میل کے فاصلے پر بادشاہی لوگ پڑے تھے مگر تمام چراغاں دکھائی دیتے تھے۔ حقیقت میں کل قوم کے لئے یہ معرکہ باعث فخر اور سرمایہ عزت ہوا۔ چنانچہ اب تک بھی مرہٹے اس کارنامے کو بڑی دھوم دھام سے فخریہ بیان کرتے ہیں۔ مرہٹے کا فرقہ طبیعت کا محنت کش، بدن کا ایسا چالاک اور پھرتیلا تھا کہ دکن کی سرکاروں میں پلٹنوں اور سواروں میں بھرتی ہو کر دھاووں اور یلغاروں میں خوب کام دیتے تھے۔ چنانچہ سیوا جی نے اپنی قوم کے آدمیوں کو اس کام کا اوزار دیکھ کر ان سے کام لینا چاہا۔ سب کو سمیٹ کر لشکر میں بھرتی کر لیا اور اپنے نمک کے زور سے قومی حرارت کو دلوں میں اور بھی اشتعال دی۔ چنانچہ اب قدم ہمت کو آگے بڑھایا اور بڑھتے بڑھتے یہاں تک ہوا کہ سورت جیسے مالا مال شہر اور پرزر بندر کو جا مارا اور چونکہ مقام مذکور کھلا میدان اور بے آڑ جگہ تھی، اس لئے خوب جی کھول کر لوٹا اور دولت اور مال بے قیاس باندھ باندھ کر اپنے ٹھکانے لے گیا۔

چند روز کے بعد ساہجی کی سنائی آئی۔ اب سیوا جی اور بھی کھل کھیلے۔ چنانچہ نام پر راجگی کا طرہ اور روپیہ اشرفی پر سکہ لگایا اور سلطنت کی صورت بنا کر راج قائم کر دیا۔ ادھر بیجا پور سے لڑائی شروع کر دی۔ ادھر ایک بیڑا کشتیوں کا بنوا کر دریا میں دوڑایا اور لوٹ مار سے تر و خشک کو یکساں کر دیا۔ مگر مشکل یہ ہوئی کہ ان میں چند کشتیاں وہ بھی لوٹ لیں جن پر حاجی لوگ ممالک ہندوستان سے جاتے تھے اور بادشاہ دہلی کی رعایا تھے۔ اورنگ زیب کو انتقام لینے کے لئے اس سے بہتر موقع نہ ہاتھ آیا اور اس قدر غصہ ہوا کہ گویا آپے سے باہر ہو گیا۔ فوراً جہاد کا فتویٰ لگایا اور لشکر جرار روانہ کیا۔ فوج شاہی جاتے ہی چاروں طرف پھیل گئی اور جابجا اس کے قلعوں پر محاصرے ڈال دیے۔ سیوا جی جب سب طرف سے تنگ ہوا تو دیکھا کہ اورنگ زیب کو دکن کے قلعوں کی تسخیر کا بڑا شوق ہے، مصلحت یہ ہے کہ اس وقت اس سے مل کر بیجا پور پر چلیے اور فوج کو لوٹ کی چاٹ دیجیے۔ جب بادشاہی فوج کا ٹڈی دل دلی چلا جائے گا پھر جیسا ہوگا دیکھا جائے گا۔ 9

راجہ جے سنگھ، عالمگیر کا سپہ سالار تھا اس سے خط و کتابت جاری کی اور چند ہمراہیوں کے ساتھ بے تکلف آن موجود ہوا۔ سپہ سالار مذکور بڑی خاطر داری سے پیش آیا اور اس نے بھی بڑی عاجزی سے جاں نثاری اور وفاداری کے قول قرار کیے۔ راجہ کی سفارش سے اکثر درخواستیں اس کی دربار شاہی میں منظور ہوئیں اور عزت و توقیر کی سرخی سے فرمانوں کی پیشانی نے رونق پائی۔ چنانچہ سیوا جی اپنی فوج کو لے کر راجہ جے سنگھ کے ساتھ لشکر میں شامل ہو گیا اور فوج شاہی نے بیجا پور پر علم اٹھائے۔ ان میدانوں میں مرہٹوں نے ایسی ایسی جانبازیاں دکھائیں کہ اورنگ زیب بھی قائل ہو گیا۔ چنانچہ اس نے خود اپنے خطوط میں لکھ کر فرزندوں اور نمک خواروں کو ان کی جراتیں جتائیں۔ سیوا جی کو راجہ کی رفاقت اور بادشاہ کی عنایت نے بڑا دھوکا دیا یعنی علاقے پر اپنے معتبر کو چھوڑا اور آپ سنبھاجی بیٹے کو مع پانسو سوار اور سو پیادے مرہٹے کے ساتھ لے کر دلی کو چلا۔ مگر افسوس کہ دلی کے تخت پر اس وقت نہ اکبر تھا نہ شاہجہان جو اس اولوالعزم بہادر کو

دل و جان سے بندۂ احسان بنالیتا۔ یہاں اورنگ زیب تھا اور سیواجی کی ساری اگلی پچھلی باتوں کو دل کے اندر امانت لئے بیٹھا تھا۔ کھلم کھلا سزا دینی تو مناسب نہ سمجھی۔ یہ چاہا کہ اس کی کم ذاتی کا داغ اور بے حقیقی کا رنگ لوگوں کو دکھا کر بے عزت کرے اور جو جو حرکتیں اس نے کی ہیں ان کا بخار نکالے۔ چنانچہ جب سیواجی دلی کے پاس پہنچے تو راجہ جے سنگھ کے بیٹے کے ساتھ ایک بے حقیقت سے آدمی کو لینے کے لئے بھیجا۔ سیواجی کو یہ امر ناگوار گزرا مگر پھر بھی دربار میں آیا اور نذرانہ گراں بہا پیش کر کے بڑے حوصلے کے ساتھ دعا و ثنا کے فقرے ادا کرتا ہوا آگے بڑھا کہ بادشاہ نظر عنایت سے دیکھیں۔ شاہ عالی دماغ نے آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا اور چوب دار نے اسے تیسرے درجے کے امیروں میں لے جا کر کھڑا کر دیا۔ سیواجی کو اس بات کا ایسا رنج ہوا کہ چہرے کا رنگ بدل گیا اور صف سے کچھ پیچھے کو ہٹا اس پر بھی دل کو تاب نہ آئی اور غش کھا کر گر پڑا۔ جب ہوش میں آیا تو جے سنگھ کے بیٹے کو سرہانے کھڑا پایا۔ جے سنگھ کو بہت برا بھلا کہا کہ اس کی بدولت یہ ذلت و خواری مجھے نصیب ہوئی۔ خیر جب بادشاہ نے میری آبرو کو خاک میں ملایا تو جان کو کس کے لئے چھوڑا ہے اس کا بھی فیصلہ کر دے۔ غرض ایسی جلی بھنی باتیں کر کے دربار سے بے رخصت اپنی فرودگاہ کو چلا گیا۔ اورنگ زیب ایسی باتیں خدا سے چاہتا تھا۔ اس حرکت کو ایسا ٹال گیا گویا گستاخی سمجھا ہی نہیں۔ کہا تو یہ کہا کہ خیر جے سنگھ نے جو اس سے وعدہ وعید کئے ہیں ہمیں معلوم نہیں اس سے دریافت کیا جائے گا۔ مگر اس کی فرودگاہ پر پہرے بیٹھ جائیں۔

سیواجی سمجھے قید تو ہو لئے مگر اس پھندے سے کسی طرح نکلنا چاہیے۔ چنانچہ اس کا رستہ یہ نکالا کہ پہلے اپنے ساتھیوں کو بیمار ڈالا اور ہوا کی ناموافقت کا بہانہ کر کے ان کے وطن جانے کی اجازت مانگی۔ سیانا بادشاہ چوکا اور اس کی جمعیت گھٹنی غنیمت سمجھ کر خوشی خوشی منظور کر لیا۔ وہ لوگ یہاں سے نکلے، مگر کچھ تو بھیس بدل کر شہر ہی میں رہ گئے اور کچھ منزل بہ منزل وطن تک پھیل کر بیٹھ گئے۔ بعد اس کے خود سیواجی بھی بستر بیماری پر پڑ گیا۔ عالمگیر نے بید حکیم بھیجے۔ ان کا علاج شروع ہوا۔ روز نسخے لکھے جاتے اور

دوائیں تیار ہوتیں، مگر یہ عالمگیر کا بھی استاد تھا، اس نے روپیہ کی چاٹ پر لگا کر حکیموں کو گانٹھ لیا اور مٹھائی وغیرہ کھانے پینے کی چیزیں غریب فقیروں کو بانٹنے کے لیے منگانی شروع کیں۔ اشیائے مذکور بڑے بڑے ٹوکروں میں رکھ کر اور کسنوں میں کس کر آنے لگیں۔ چنانچہ اول اول پہریداروں نے روکا، جب دیکھا کہ اس میں کھانے کے سوا کچھ نہیں تو انہوں نے بھی روک ٹوک موقوف کر دی۔ سیواجی ایک دن سر شام سے منہ لپیٹ کر لیٹ رہا، جب کچھ رات گئی تو ایک نوکر کو اپنی جگہ سلا دیا اور ایک ٹوکرے میں آپ بیٹھ کر دوسرے میں جا بیٹے کو بٹھایا۔ رازدار نمک حلال موجود تھے، بے تکلف سر پر دھر پہرے داروں کے سامنے سے لئے چلے گئے۔ کسی کو خبر نہ ہوئی۔ باہر جاں نثار منتظر بیٹھے تھے اور گھوڑا تیار تھا۔ اسی وقت سوار ہو اس طرح نکل گیا گویا یہاں تھا ہی نہیں۔ ادھر کچھ دیر کے بعد پہرے داروں کو کھٹکا گزرا دیکھا تو بستر پر نوکر پڑا پایا۔ داروغہ بے چارہ بہت گھبرایا۔ ادھر ادھر دیکھنا شروع کیا۔ جتنے میں بادشاہ کو خبر ہو اور حکم احکام جاری ہوں، اتنے میں وہ ایک بے خطرہ رستہ لے کر متھرا کو سیدھا ہوا اور پل کے پل میں کہیں کا کہیں نکل گیا۔

متھرا میں سیواجی کے سیوک دن رات بیٹھے ان کی سیوا کر رہے تھے۔ چنانچہ وہاں پہنچ کر ڈاڑھی موچھ کو صفائی بتائی۔ سادھوؤں کی صورت بنائی۔ بدن پر بھبوت رمائی اور ایسے رستے سے دکن کو نکل گئے جہاں سے کسی کے وہم و گمان کا بھی گزر نہ ہوا۔ بیٹے کو ایک برہمن کے سپرد کر گئے کہ خاطر جمع سے ہمارے پاس پہنچا دینا۔ دکن میں پہنچتے ہی سیواجی وہی تھے اور ان کے ہتھکنڈے وہی تھے۔ وہاں جا کر خوب دل کا بخار نکالا اور تمام اضلاع کو زیر و زبر کر کے قیامت برپا کر دی۔

ادھر جب عالمگیر کو خبر ہوئی تو بہت پیچ و تاب کھایا اور ولی عہد سلطنت کو مع دو اور جنگ آزمودہ سرداروں کی فوجیں دے کر بڑی دھوم دھام سے روانہ کیا۔ ادھر سیواجی بھی ایک آفت تھے۔ انہوں نے ولی عہد اور سرداران مذکور سے سازش کرنی شروع کر دی۔ ادھر عالمگیر بھی قیامت تھے، انہوں نے پہلے ہی پٹی پڑھا دی کہ سپاہیانہ پیچوں میں

کسی طرح دریغ نہ کرنا۔ بے شک مل جانا مگر جس وقت موقع پر چڑھے تو خواہ قید، خواہ قتل کسی بات میں نہ چوکنا۔ چنانچہ چند روز لڑائیاں بھی ہوتی رہیں اور اس طرح کے وار بھی چلتے رہے۔ آخر سیواجی کا وار پورا پڑا کہ عالمگیر اپنے بیٹوں اور سرداروں کی جانب سے بدگمان ہوگیا اور انہیں بلا کر اور سرداروں کو بھیج دیا۔ مگر سیواجی کی خوش نصیبی یہ کہ بادشاہ خود پنجاب کی سرحد پر افغانوں کو دبا رہا تھا۔ چنانچہ وہ تو کئی برس تک ادھر ادھر مصروف رہا۔ دکن کا فساد ادھر خاطر جمع سے پرورش پاتا رہا اور جو سپہ سالار وہاں تھا اس کا یہ حال ہوگیا کہ خود حملہ کرنا تو بالائے طاق، غنیم کا روکنا بھی اسے مشکل ہوگیا۔

سیواجی اب اپنے جی کے راجہ ہو گئے۔ جب چاہتے اٹھتے اور کوئی نہ کوئی قلعہ مارے لیتے اسی عرصے میں ان کی سال گرہ کا دن آیا۔ انہوں نے راج تلک کا جشن کیا اور تمام راج گانہ رسمیں برت کر وہ زرق برق دکھائی کہ بکرماجیت اور راجہ بھوج کے دربار گرد ہو گئے۔ تل بیٹھ کر سونے کا تلادان کیا۔ سونا روپا جواہرات نچھاور کئے۔ سرداروں کو خلعت، منصب اور بڑے بڑے انعام اور جاگیریں عطا کیں۔ فارسی خطابوں کی جگہ سنسکرت لفظوں کے خطاب دیے اور وہ حکمتیں برتیں جس سے مذہبی جوش اور قومی خروش مل کر ایک عجیب ہیولا کھڑا ہوگیا۔

سیواجی اس عرصے میں اپنے ملک کو پھیلاتا اور ملکی زور کو بڑھاتا رہا۔ چند روز کے بعد عالمگیر بادشاہ نے فوج کثیر کے ساتھ ایک سپہ سالار گولکنڈہ پر چڑھایا اور پیچھے اس کے ولی عہد کو بھیجا کہ بیجاپور کا محاصرہ کرے۔ بیجاپور کا مسند نشین تو خردسال تھا، اس کے وزیر نے گھبرا کر سیواجی سے مدد مانگی۔ اس نے غنیمت سمجھ کر اسی وقت سواری کا حکم دیا۔ ہزاروں برچھیت مرہٹا، بھالے اور برچھے سنبھال کر اٹھ کھڑے ہوئے اور یہ اس نیستان رواں کو لے کر روانہ ہوا مگر پورا سپاہی تھا۔ اپنے بازوؤں میں عالمگیری لشکر کے مقابلے کی طاقت نہ دیکھی۔ اس لئے لشکر سے بچ کر علاقوں پر آن گرا اور جہاں گزر ہوا تمام ملک کو ستیاناس کر دیا۔ عالمگیر بھی انتظام میں یکا اور بندوبست کا پکا تھا۔ چاروں طرف احکام جاری کئے اور ہیر پھیر کر ایسی جگہ لا ڈالا جہاں سیواجی چاروں طرف سے

گھر گئے۔ادھر یہ بھی بقول عالمگیر کے پہاڑی چوہا تھا، اس طرح دبک کر نکل گیا کہ اہل لشکر دیکھتے کے دیکھتے رہ گئے۔ عالمگیر تو اپنے کارگزاروں پر غصہ اور عتاب کے فرمان جاری کرتے رہے یہ چند ہی روز کے بعد نکلے اور ایسی کڑک دمک سے نکلے کہ پہلے سے دہ چند زیادہ۔ اس عرصے میں عالمگیری فوج نے بیجاپور کو نہایت تنگ کر رکھا تھا۔ چنانچہ اب کی دفعہ وزیر بیجاپور نے سیواجی کو بڑی منت سماجت سے مراسلہ لکھا اور اخیر میں یہ بھی لکھا کہ زیادہ تحریر کی گنجائش نہیں لیکن آنا ہے تو اس وقت سے پہلے کام آؤ کہ بعد اس کے آنا بے کار ہو۔ بہادر کو پھر سپاہگری کا جوش آ گیا اسی وقت لشکر جرار پیادہ اور سوار کا لے کر دکھنی گھوڑی کی باگ اٹھائی یلغار کرتا جاتا تھا جو رستے میں پرچہ لگا کہ سنباجی یعنی راج کنور آپ کا سپہ سالار عالمگیر سے جاملا۔ سیواجی سنتے ہی گھبرا گیا مگر پھر بھی ہوش و حواس کو قائم رکھ کر فوج کشی کے کاروبار بدستور جاری رکھے۔ ادھر سنباجی جب سپہ سالار کے پاس آیا تو بڑی آؤ بھگت سے اس کا استقبال ہوا اور خیمہ گاہ میں پہنچا تو سپہ سالار سروقد کھڑا ہو گیا۔ نہایت تپاک سے ہاتھ کھول کر بغلگیر ہوا اور اعزاز و احترام سے خیموں اور سراپردوں میں اتارا۔ سپہ سالار مذکور نے تدبیر یہ سوچی تھی کہ جب بیٹے کو فوج وحشم اور طبل و علم سے ساتھ لے کر آگے بڑھائیں گے تو باپ کی جمعیت خاندانی میں تفرقہ پڑ جائے گا۔ مگر سیواجی کا ستارہ اوج پر تھا۔ اول تو لڑکے نے باپ کے اطوار و خصائل میں سے خودسری اور سرشوری کے سوا کچھ نہ لیا تھا۔ دوسرے یہ بیچ پڑا کہ سپہ سالار مذکور نے جو عالمگیر کو یہ سارا عرض حال لکھا تو وہاں سے حکم آیا کہ اسے فوراً قید کر لو اور پابزنجیر کر کے ہمارے پاس بھیج دو۔ سپہ سالار نے ایسی اطاعت کو عہد مروت کے برخلاف دیکھ کر اسے چھوڑ دیا اور وہ چھوٹتے ہی سیدھا باپ کے پاس پہنچا۔ اب سیواجی نے لشکر شاہی کو دن رات دھاوے کر کے اور جابجا رسدوں پر چھاپے مار کے ایسا تنگ کیا کہ سپہ سالار کو بیجاپور سے محاصرہ اٹھا لینے کے سوا کچھ نہ بن آیا۔ یہ مدد جو عین فتح یابی کا تاج تھی اس کے صلہ میں دربار بیجاپور سے سیواجی کے بڑے شکر یے ہوئے بلکہ مبارک باد کے خلعت اور تحفوں کے ساتھ باپ کے سارے حقوق عنایت ہوئے۔ اب

شان وشوکت کے سامان اور زور وشور کے نشان ایک سے ہزار ہو گئے۔ اور وہ وقت آ گیا کہ جو جو آرزوئیں دل کی ہیں انہیں جی کھول کر پورا کرے، یعنی اپنے حریفوں سے سینہ بہ سینہ مقابلے کر کے ملک کو خاطر خواہ پھیلائے۔ یہ ان فکروں میں تھا جو دفعۃً پیام اجل آیا اور ایسی یکایک طبیعت بگڑی کہ ۵۳ برس کی عمر میں سارے ارمان سینے میں لئے ہوئے دنیا سے چلا گیا۔

محمد شاہ کی تمہید سلطنت

بہادر شاہ یعنی عالمگیر کے بیٹے نے باپ کے بعد سوا پانچ برس بادشاہت کی۔ مگر اس کے بعد امیروں کے کئی جتھے ہو گئے اور تخت کے وارثوں میں ایسی تلوار چلی کہ برس دن میں کئی دعویدار شاہزادے مارے گئے۔ آخر فرخ سیر تخت پر بیٹھا، مگر وہ عیش و عشرت میں ایسا مست و مدہوش ہوا کہ تاج شاہی کو سر پر سنبھال نہ سکا بلکہ وزیر اور سپہ سالار کو جو اس کے باعث تقویت ہوئے تھے انہی کے مارنے کے درپے ہوا۔ چنانچہ مستی کا وار تو پورا نہ پڑا، ہشیاری اپنا کام کر گئی۔ انہوں نے چھ مہینے میں پے در پے دو اور شاہزادے بھولے بھالے ڈھونڈ کر تخت پر بٹھائے، شہزادے تو بہت سے نظر بند پڑے تھے مگر انہیں ایسا عقل کا پورا چاہیے تھا جو کٹ پتلی کی طرح ان کے اشارے پر چلے۔ آخر ایک شہزادہ بہادر شاہ کا پوتا سلیم گڑھ میں قید تھا، اس کے نام پر مصلحت کا قرعہ پڑا۔ دربار اور اہل دربار اس وقت آگرے میں تھے، چنانچہ امیر اس کے لینے کو روانہ ہوئے۔

محمد شاہ کا زمانہ اور نادر شاہ کا آنا

روشن اختر شاہزادہ اگرچہ قید خانے میں تھا لیکن دنیا کی آفتوں سے محفوظ ماں کے پہلو میں نچنت بیٹھا تھا۔ دفعتۂ ستارۂ اقبال اوج پر آیا۔ چند امیروں نے آکر مجرا کیا اور دست بستہ عرض کی کہ تخت حاضر ہے، چل کر اپنے قدم سے رونق دیجیے۔ شاہزادہ تو لڑکا تھا اور برسوں سے قید خانے میں آنکھیں بند کیے پڑا تھا۔ مگر ماں دیکھ رہی تھی کہ جو بادشاہ ہوتا ہے وہی تخت کی قربانی ہوتا ہے، اس لیے ہاتھ جوڑتی پردے سے نکل آئی کہ برائے خدا مجھے تاج نہیں چاہیے۔ اس یتیم کا سر سلامت رہنے دو اور سلطنت سے معاف رکھو۔ امیروں نے ہر طرح عہد و پیمان سے اس کی تشفی کی۔ بعد اس کے خود چتر لگا کر شاہانہ عظمت سے لے گئے اور تاج سر پر رکھ محمد شاہ بادشاہ غازی بنا دیا۔ شہزادہ یا تو قید خانے کی کوٹھڑی میں بند پڑا تھا یا دفعتۂ تمام ہندوستان کا شہنشاہ ہو گیا۔ اکبری اور جہانگیری دربار میں سارے امیروں وزیروں کو سامنے ہاتھ باندھے دیکھا۔ آنکھیں کھل گئیں۔ مگر دل میں حیران تھا کہ یہ عجب بادشاہت ہے۔ محل سے نکلنا ہے تخت پر آ بیٹھنا ہے۔ تخت سے اٹھنا ہے، اندر چلا جانا ہے۔ معلوم نہیں کہ دربار کیا ہے؟ اور ملک میں کیا ہو رہا ہے؟ ماں کے سوا کوئی اپنا نظر نہیں آتا۔ جس سے دل کا حال کہے اور کچھ مشورہ کرے۔ وزیر اور سپہ سالار دونوں دربار کے مالک تھے، جو چاہتے تھے سو کرتے تھے اور انہی کے بھائی بند سارے کاروبار میں پھیلے ہوئے تھے۔ باقی سب امیر برائے نام تھے۔

محمد شاہ تو لڑکا ہی تھا۔ ماں نے پھر بھی زمانے دیکھے ہوئے تھے وہ سمجھی کہ وزیر اور

سپہ سالار کے پنجے سے رہائی ممکن نہیں مگر اتنی بات ہے کہ یہ سید ہیں اور باقی جو دربار کے امیر ہیں اکثر ترک ہیں اور ہر چند وہ بھی بڑے بڑے حوصلے والے ہیں مگر اتفاق وقت سے دب گئے ہیں اور ان دونوں فریقوں کا آپس میں بگاڑ ہے بلکہ مذہب میں بھی اختلاف ہے۔ غرض ماں نے بیٹے کو سمجھایا کہ ترکوں سے جوڑ کر سیدوں کو توڑ دو تو بات بن جاتی ہے۔ چنانچہ بادشاہ نے بھی اس بات کا خیال شروع کیا۔ ساتھ ہی زور طالع یہ ہوا کہ وزیر اور سپہ سالار کو بعض کاموں کے لئے دربار سے دور ہونا پڑتا تھا۔ کاروبار میں بادشاہ سے گفتگو کرنے کے لئے اور امراء کو بھی رستے ملنے لگے۔ اگرچہ ان دونوں کے معتبر آدمی ہر وقت موجود رہتے تھے، مگر بڑی بات یہ ہوئی کہ محمد شاہ ترکی زبان جانتا تھا۔ چنانچہ ان سے اسی زبان میں باتیں کیا کرتا اور اس پردے میں جو نکتے مطلب کے ہوتے وہ بھی ہو جاتے۔ رقیبوں کے آدمی کھڑے دیکھا کرتے، نہ کچھ سمجھتے نہ کہہ سکتے۔

رفتہ رفتہ بادشاہ کی حمایت سے ترکوں نے زور پایا اور ان کے زور سے بادشاہ کی بادشاہت میں زور آیا۔ چنانچہ وزیر اور سپہ سالار مارے گئے اور ان کی قوم کا نام دربار سے مٹ گیا۔ اگرچہ صوبوں میں اب بھی فساد تھے مگر جب دربار غبار سے صاف ہوا تو بادشاہ کی رنگین طبیعت نے اپنا اصلی رنگ دکھانا شروع کیا۔ چنانچہ ملک کا انتظام امیروں وزیروں پر چھوڑا اور خود ناچ رنگ، شراب کباب سے ایسا عیش کے دریا میں ڈوبا کہ کسی بات کی خبر نہ رہی۔ رعیت بھی پشتوں سے امن چین کے ساتھ انعام واکرام سے مالا مال ہوتی چلی آتی تھی۔ گھر گھر عیش وعشرت سے دن عید رات شب برات ہو گئی۔ ایسی قدردان اور عالی شان سلطنتوں میں علماء، شعراء اور عالم اہل کمال کا کیا ٹھکانا تھا۔ ہزاروں آدمی جمع تھے مگر بادشاہ کی طبیعت کو رنگینی پر مائل دیکھ کر سب رنگین ہو گئے۔ موزوں طبع، لطیفہ گو نوجوان آ کر مصاحبت میں داخل ہو گئے بلکہ پرانے پرانے بڈھے سر سے پاؤں تک خضاب ہو گئے۔ اسی عالم میں بادشاہ خود بھی شعر کہتے تھے۔ چنانچہ فارسی کا شعر ہے:

یار در بر صبح بر سر فکر بر جالیش کنید

عاشقاں شب میرود زنجیر در پایش کنید

اور اردو کا شعر ہے:

پیری میں نہ کس طرح کروں سیر جہاں کی
دن ڈھلتے ہی ہوتا ہے تماشا گزری کا

عمدۃ الملک نواب امیر خاں ایک قدیم الخدمت اور خاندانی امیر زادہ تھا کہ دلیرانہ ہمت اور امیرانہ دماغ رکھتا تھا۔ ساتھ اس کے لطیفہ گوئی اور بذلہ سنجی کا یہ عالم تھا کہ پھلجھڑی کی طرح منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ خلوت و دربار میں ایسی گل افشانیاں کرتا تھا کہ تمام دربار لوٹ لوٹ جاتا تھا۔

لطیفہ۔ ایک دن بادشاہ نے پوچھا کہ امیر خاں یہ جو پوت، سپوت، کپوت، لوگوں میں زبان زد چلے آتے ہیں اب بھی کچھ ان کی اصل ہے؟ عرض کی کہ حضور اسی دربار میں سب موجود ہیں۔ بادشاہ نے کہا کیونکر؟ کہا۔ پوت تو یہی جیسے حضور یعنی سلطان ابن سلطان اور سپوت برہان الملک کہ محمد امین نام ایک مغل ایران سے آیا۔ یہاں حضور کے تصدق سے وہ مرتبہ پایا کہ باپ دادا کا فخر ہو گیا اور کپوت یہ خانہ زاد کہ باپ دادا حضور کے بزرگوں کی جاں نثاری میں اعلیٰ اعلیٰ عہدوں پر ممتاز رہے اور فدوی اس حالت میں گرفتار ہے۔

لطیفہ۔ ایک دن امیر خاں حضور میں اپنے بزرگوں کی جان نثاریاں اور شاہجہان اور عالمگیر کی قدر دانیاں بیان کر رہا تھا۔ اس میں یہ بھی کہا کہ میرا باپ کابل میں ناظم تھا اور اپنی عقل و تدبیر سے اس قدر مورد عنایت تھا کہ کئی مہمیں دکن میں فتح ہوئیں اور عالمگیر نے ان کی فتح اس کے نام پر لکھی۔ یہ ننگ خاندان اس حال میں حضور کے سامنے حاضر ہے۔ برہان الملک نے کہا:

پسر نوح با بداں بنشست
خاندان نبوتش گم شد

امیر خاں نے کہا کہ دوسرا شعر بھی تو پڑھیے کہ:

سگ اصحاف کہف روزے چند
پے نیکاں گرفت و مردم شد

لطیفہ۔ جب امیر خاں صوبہ الہٰ آباد سے آئے تو بادشاہ نے پوچھا کہ امیر خاں ہمارے لئے کیا لائے؟ عرض کی کہ دو ہزار احمق۔ بعد اس کے اپنے باوفا سپاہیوں کو جو وہاں سے ساتھ آئے تھے، موجودات کے لئے حاضر کیا۔ بادشاہ نے جب وہ سجیلے جوان اور ان کی وردیاں اور سامان دیکھے تو بہت خوش ہوئے اور کہا کہ انہی لوگوں کو تم احمق کہتے تھے؟ عرض کی کہ حضور نہ میرے پاس خزانہ، نہ ملک، فقط زبانی بات پر تین سو کوس چلے آئے۔ یہ احمق نہیں تو اور کون ہیں۔ بادشاہ نے کہا کہ خیر ان کو اپنی رفاقت میں رکھو۔ تنخواہ حضور سے مجرا ہوا کرے گی۔

غرض ایسے ایسے لوگوں کی صحبتیں تھیں اور عیش و عشرت کے ہجوم تھے۔ مہتاب باغ اور حیات بخش کے باغوں کو سجا کر طلسمات کا نمونہ کر دیا۔ نہروں میں تواڑے پڑے رہتے تھے۔ بادشاہ ان میں بیٹھتے۔ ناچ رنگ کے جلسے جمتے اور شراب کے دور چلتے۔ جب برسات آتی تو ان کے ہاں بہار آتی۔ قطب صاحب کے جنگل سبزے سے ہرے بھرے ہو جاتے۔ یہ شہر کو چھوڑ کر وہاں جا رہتے۔ حکم تھا کہ ابر سیاہ ہمارا نقیب ہے۔ جب گرجنے کی آواز آیا کرے اسی وقت کمر بندی ہو جایا کرے۔

تمام امرا ایک ایک ملک اور علاقے پر تعینات تھے، مگر بہار دربار کے لطف اٹھانے کو نائب اپنے وہاں چھوڑے اور خود دربار میں چلے آئے۔ ظاہر ہے کہ جہاں اہل دربار ایسے ایسے خیالات میں ہوں، وہاں ملک کے انتظام کا کیا ٹھکانا۔ مگر تازہ گل یہ کھلا کہ وزیر اور سپہ سالار کے توڑنے کے لئے سب نے تجویز کی کہ نظام الملک آصف جاہ کو دکن سے بلانا چاہیے۔ چنانچہ وہ آیا۔ کل کاروبار اس کے سپرد ہو گئے اور ہر مقدمہ اس کی صلاح سے طے ہونے لگا۔ مگر اس دیرینہ سال نے عالمگیر کے عالم دیکھے ہوئے تھے۔ دربار کے رنگ دیکھ کر بہت گھبرایا اور بادشاہ کو صلاحیت پر لانا چاہا۔ یہاں کے رنگین مزاج بھی اس سے گھبرائے اور اپنے توڑ جوڑ مارنے لگے۔ لیکن چونکہ آصف جاہ

ایک رتبے کا شخص تھا۔ ان کے وار اس کے مقابلے کے قابل تو نہ ہوتے تھے البتہ دق کرتے تھے۔ چنانچہ ایک دن بادشاہ نے اسے ملبوس خاص کا خلعت اور وزارت کا عہدہ دیا۔ اہل دربار کو اس بات کا داغ ہوا۔ چنانچہ توڑ اس کا یہ کیا کہ اسی رات کو ناچ کے جلسے میں ایک بھانڈ نے بادشاہ کو بہت خوش کیا۔ یاروں نے اسے بھی ملبوس خاص کا خلعت دلوا دیا۔ اس پر بھی اس دل شکستہ نے جو طریقے اور آئین بادشاہی درباروں کے ہیں، وہ جاری کرنے شروع کئے۔ خلوت اور جلوت میں بادشاہ کے وقتوں کی تقسیم کی اور کاروبار ملک کے پیش کرنے لگا۔ رنگین مزاجوں نے اس کی ہنسی اڑانی شروع کر دی۔ رنگیلے بادشاہ کو کچھ تو خود یہ کام وبال معلوم ہوتے تھے، کچھ امیروں نے بہکایا۔ چنانچہ آصف جاہ کی عرض و معروض پر بادشاہ کی بھی وہ توجہ نہ رہی۔ ایک امیر نے اپنی جگہ یہ بھی کہا کہ کیسا بندر کی طرح بادشاہ کے سامنے اچھلتا پھرتا ہے۔ آصف جاہ کو بھی دم دم کی خبر لگتی تھی۔ سن کر کہا اگر یہی حال ہے تو فصیل قلعہ کے ایک کنگرے پر بندر ناچے گا۔ آخر تنگ ہو کر کسی بہانے سے اپنے علاقے پر چلا گیا کہ ایسے مسخروں میں رہ کر وزیر ہندوستان کہلانے سے حیدر آباد کی صوبہ داری بہتر ہے۔ اتفاقاً انہی دنوں میں نادر شاہ افغانوں کو ایران سے نکالتا ہوا قندھار تک آیا اور افغان ادھر سے نکل کر تمام کوہستان کابل میں پھیل گئے تھے۔ چونکہ کابل میں دربار دہلی کی طرف سے صوبہ رہتا تھا۔ اس لئے نادر شاہ نے محمد شاہ کے پاس اپنا ایلچی بھیجا کہ تم بھی اپنے صوبے کے نام حکم بھیج دو تا کہ دونوں طرف سے دبا کر اس فرقہ کو قرار واقعی گوشمالی دیں۔ یہاں ان دنوں میں عیش و عشرت کے غل سے آواز تک بھی سنائی نہ دیتی تھی۔ چنانچہ ایلچی راہ میں مارے گئے اور کسی نے خبر بھی نہ لی۔ کہتے ہیں کہ آصف جاہ خود تو دکن کو گیا تھا۔ مگر نادر شاہ کو خفیہ ایلچی بھیج کر سنکارگیر کہ آپ بے تکلف چلے آئیں۔ یہاں دلی تک میدان صاف ہے۔ چنانچہ چند روز کے بعد نادر شاہ نے ایلچیوں کی تباہی سن کر پھر مراسلہ لکھا اور اخیر کو خطوں کی بے جوابی نے خود اسے بھی ہندوستان کی طرف کھینچا۔ مگر یہاں یہ حال تھا کہ عام خبروں کے علاوہ کابل، لاہور وغیرہ کے حاکموں کی عرضیاں بھی آتی تھیں اور کوئی خبر نہ

ہوتی تھی بلکہ جب لوگ نادر شاہ کے آنے کی خبریں دیتے تو امرائے دربار سن کر خفا ہوتے اور کہتے کہ لوگوں کے گھر بہت بلند ہیں۔ دور سے نادر شاہ کا لشکر دکھائی دیتا ہے۔ جب ناچار ہو کر نادر شاہ نے کابل کو آن گھیرا تو وہاں کے حاکم نے نہایت اضطراب سے عرضی لکھی۔ چنانچہ جس وقت خریطہ پہنچا بادشاہ مہتاب باغ میں عالم آب کا تماشا دیکھ رہے تھے اور سامنے ناچ ہو رہا تھا۔ چونکہ اس وقت نہایت سرور کا عالم تھا۔ عرضی کو لے کر گوشہ اس کا شراب میں ڈبویا اور یہ مصرع پڑھا کہ:

ایں دفتر بے معنی غرق مئے ناب اولیٰ

چونکہ آصف جاہ کی دانائی اور تجربہ کاری کو اس کے حریف بھی مانتے تھے، اس لئے نادر شاہ کی آمد سن کر اسے بھی دکن سے بلوایا۔ ادھر نادر شاہ نے کابل فتح کر کے پھر نامہ لکھا اور اپنا دوسرا ایلچی جو دربار دہلی میں رکا ہوا تھا اسے طلب کیا۔ یہاں دربار میں یہ مقدمہ الجھ رہا تھا کہ کئی اور خط اور کئی ایلچی آئے اور ادھر سے جواب بھی نہیں گیا۔ اب جواب کیا لکھیں؟ اور لکھیں تو اس میں القاب کیا لکھیں؟ کیونکہ وہ اصل میں نادر قلی ہے، کوئی خاندانی بادشاہ نہیں ہے۔ اتنے میں خبر آئی کہ اس کا لشکر اٹک اتر آیا۔ یہاں بھی کوچ کی تیاریاں ہونے لگیں اور چلتے چلتے دو مہینے میں کرنال پہنچے۔ سب نہر کے کنارے برات کی طرح پڑے تھے اور جس طرح لوگ شہر سے عیدگاہ کو جاتے ہیں، اس طرح آتے تھے اور لشکر میں شامل ہوتے جاتے تھے۔ برہان الملک کا انتظار ہو رہا تھا کیونکہ اس کی فوج توپ خانے کی پشت گرمی سے ان دنوں بہت نامور تھی۔ اتفاقاً جس دن وہ آ کر لشکر میں شامل ہوا اس دن نادر شاہ بھی پاس پہنچ گیا تھا اور یہاں کسی کو خبر بھی نہ تھی۔ برہان الملک نے دربار کی بے پروائی کی شکائتیں کر کے کوچ کی تاکید شروع کی۔

اسی دن گھسیارے کچھ زخمی کچھ بدحواس دوڑے آئے کہ ہم جنگل میں گھاس کھودنے گئے تھے۔ نادری قراولوں[40] نے کئی آدمیوں کو گرفتار کر لیا اور ہم نے بھاگ کر اپنے تئیں یہاں پہنچا دیا ہے۔ امراء نے جمع ہو کر پھر گفتگو شروع کی۔ اتنے میں خبر آئی کہ چند قزلباش نادری برہان الملک کے ڈیروں پر ہاتھ مار گئے۔ برہان الملک تلوار

ٹیک کر اٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ صاحب اب کون سی بات ہے جس کا انتظار کیا جائے۔ اسی وقت فوج لے، لڑنے کو روانہ ہوا مگر خان دوراں نے بادشاہ کو اطلاع دی، انہوں نے آصف جاہ کو خبر کی۔ آصف جاہ بولا کہ پہر دن باقی ہے۔ برہان الملک کو روکنا چاہیے کیونکہ لشکر ان کا منزلیں مارتا ہوا آیا ہے، اس وقت بے موقع جرات کرنی مناسب نہیں۔ کل توپ خانہ سامنے رکھ کر اور سب لشکر کو ترتیب دے کر بندوبست سے لڑیں تو مناسب ہے۔ بادشاہ نے یہی بات خان دوراں کو کہلا بھیجی۔ خان دوراں سنتے ہی بگڑ کر اٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ بڑے حیف کی بات ہے کہ ایسا جوانمرد سردار آقا کے نمک پر نثار ہونے جائے اور ہم پہلو میں بیٹھے اس کے مرنے کا تماشا دیکھیں۔ چنانچہ بادشاہ کو کہلا بھیجا کہ برہان الملک اب مقابلے میں جا پڑے ہوں گے۔ اس لئے واپس بلانا مصلحت نہیں۔ ساتھ ہی خود ہاتھی پر بیٹھ فوج کو لے روانہ ہوا اور آدھ کوس کا فاصلہ دے کر برہان الملک کے پہلو میں فوج جما دی۔

نادر شاہ بھی سنتے ہی اٹھ کھڑا ہوا اور فوج کے تین حصے کر کے ایک اپنے ساتھ رکھ، دو کو دونوں کے مقابلے میں ڈالا۔ قزلباشوں نے برابر حملے پر حملہ کرنا شروع کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں عیش پروردہ فوجیں پریشان ہو گئیں۔ بہت سے سردار مارے گئے اور خان دوراں زخمی ہو کر میدان سے پھرے۔ یہاں شکست کی ہوا اڑتے ہی خان دوراں کے خیمے ڈیرے لٹ کر سب کارخانوں کی خاک اڑ گئی تھی۔ اتنا بھی نہ تھا کہ نیم جان لاشے کو سائے میں رکھیں۔ غرض ایک بے چوبہ کہیں سے لے کر اس میں اتارا۔ اتنے میں بادشاہ کی طرف سے چند خواجہ سرا آئے اور آصف جاہ وغیرہ بھی عیادت کو پہنچے۔ تھوڑی دیر میں اس بے چارے نے ذرا آنکھ کھولی اور آہستہ سے اتنا کہا کہ خیر ہم نے تو اپنا کام کر لیا اب تم جانو اور تمہارا کام جانے۔ مگر اتنا کہتے ہیں کہ بادشاہ کو نادر کے پاس اور نادر کو شہر میں نہ لے جانا۔ جس طرح ہو سکے اس بلا کو یہیں سے ٹال دینا۔

ادھر برہان الملک اور اس کے چند رفیق میدان میں رہ گئے تھے۔ وہ جوانمرد ہاتھی پر بیٹھا تیر مار رہا تھا کہ قزلباش چاروں طرف سے گھر آئے۔ ایک جوان نیشاپوری اس

کا ہم وطن گھوڑا اڑا کر پہنچا اور آواز دی کہ اے محمد امین دیوانہ شدۂ۔ بکہ جنگ میکنی و بچہ اعتماد جنگ میکنی ؟ برہان الملک نے ہاتھ روک دیا۔ قزلباش نے نیزہ زمیں پر گاڑ گھوڑے کی باگ دوڑ اس سے باندھی اور جھپٹ کر رسا پکڑ ہودج کے اندر جا بیٹھا۔ برہان الملک ایران کے دستوروں سے واقف تھا۔ کمان ہاتھ سے رکھ دی اور اپنے تئیں پنجہ تقدیر کے حوالے کیا۔ قزلباش ہاتھی کو گھیر کر اپنے لشکر میں لے گئے۔ نادر شاہ نے جرم بخشی کر کے عنایت فرمائی اور چونکہ شام ہوگئی تھی فوج لے کر اپنے خیمہ گاہ کی طرف پھرا برہان الملک کو اپنے ساتھ دستر خوان پر بٹھایا۔ چنانچہ اس نے مصلحت آمیز باتیں کر کے نادر شاہ کو اس بات پر راضی کر لیا کہ حضور ایک معقول نذرانہ لیں اور یہیں سے واپس تشریف لے جائیں۔ نادر شاہ اس بات پر راضی ہو گیا۔ برہان الملک نے ایک عریضے میں یہ سب حال اپنے بادشاہ کو لکھا اور رقعہ آصف جاہ کو بھیجا کہ تم آؤ اور اس امر کا فیصلہ کر دو۔ یہاں سب دریائے حیرت میں غرق بیٹھے تھے کہ دیکھیے اب کیا ہوتا ہے! اور حیران تھے کہ کیا کرنا چاہیے؟ یہ خبر سنتے ہی خوش ہو گئے۔ محمد شاہ نے فوراً آصف جاہ کو روانہ کیا۔ اس نے برہان الملک کے ذریعہ سے نادر کی ملازمت حاصل کی اور بعد گفتگو کے یہ ٹھہرایا کہ دو کروڑ روپیہ نعل[41] بہا لیجیے اور یہیں سے تشریف لے جایئے۔ نادر شاہ نے یہ بات منظور کی اور آصف جاہ عہد و پیمان کر کے وہاں سے رخصت ہوا۔ مگر محمد شاہ کے سامنے جا کر ان کاموں کو اپنی کارگزاری اور دولت خواہی کے لباس میں ظاہر کیا۔ یعنی برہان الملک کی حسن خدمت کو اڑا دیا۔ حضور سے خان دوران اور امیر الامرائی کا خطاب اور خلعت بیش بہا آصف جاہ کو عنایت ہوا۔ برہان الملک کا ذکر بھی کسی نے نہ کیا۔ دوسرے دن محمد شاہ کی ملاقات کی ٹھیری۔ بادشاہ ادھر سے بڑے تزک و احتشام کے ساتھ روانہ ہوئے۔ ادھر سے نادر نے اپنے بیٹے کو استقبال کے لئے بھیجا۔ وہ رستے میں آ کر ملا۔ بادشاہ نے تخت رواں کو زمین پر رکھوا کر ملاقات کی۔ اس نے فرزندانہ طور سے معانقہ کیا اور ہمرکاب ہو کر نادر شاہ کے پاس لے گیا۔ نادر شاہ اب فرش تک استقبال کو آیا اپنی مسند پر نہایت تعظیم سے بٹھایا بعد اس کے بزادرانہ اور دردمندانہ

باتیں شروع کیں۔ چائے آئی اس کا دور چلنے لگا۔ نادر شاہ اس وقت برق کی قباء اس پر قراقلی یعنی سیاہ پوست برہ کا خفتان، اس پر ایک برکی چغہ پہنے بیٹھا تھا۔ سر پر کلاہ پا پاخ42 تھی۔ ادھر محمد شاہ شبنم کا کرتہ، ڈھاکے کی ململ کا جامہ پہنے تھے اور سر پر جو دستار تھی، اس سے بھی گھبراتے تھے۔ برابر پنکھا ہوتا تھا۔ نادر شاہ سے کہا کہ رخت شما بسیار گرم ست، برتن گرانی نمیکند؟ نادر شاہ نے آہ سرد بھر کر کہا کہ برادر جان من! ہمیں رخت گرم ست کہ مارا از ایران تا بانیجا رسانید۔ لطافت لباس شماست کہ نگزاشت از دہلی تا بانیجا حرکت کنید۔ غرض بادشاہ نے ہنسی خوشی یہاں سے مراجعت کی۔ برہان الملک وہاں امیر الامراء کے منصب کو اپنا حق سمجھے بیٹھا تھا۔ اس نے جب آصف جاہ کے خلعت وخطاب کا حال سنا تو بہت بگڑا اور نادر شاہ سے کہا کہ حضور نے کیا غضب کیا جو ہندوستان کے قارونی خزانے چھوڑ کر دو کروڑ روپیہ پر رضامند ہو گئے۔ یہ رقم تو فقط غلام ادا کر سکتا ہے اور بادشاہی خزانے اور امراء اور مہاجنوں کے گھرانوں کے کیا ٹھکانے ہیں۔ البتہ شہر یہاں سے چالیس کوس ہے حضور وہاں تک تکلیف فرمائیں۔ نادر شاہ خوش ہو گیا اور اسی وقت آصف جاہ کو بلا بھیجا وہ خوشی خوشی پھر حاضر ہوا۔ اسے حکم ملا کہ تم ٹھہرو اور اپنے بادشاہ کو بلا لو۔ آصف جاہ نے کہا کہ عہد نامے میں یہ نہیں ٹھہرا تھا۔ نادر نے کہا کہ ملک وسلطنت اور بادشاہ کی عزت وآبرو سے ہمیں کچھ تعرض نہیں۔ ہم فقط ایک ملاقات اور کرنی چاہتے ہیں۔ آصف جاہ نے ناچار بادشاہ کو لکھا۔ بہت سے امراء اور نوکر چاکر ادھر سے ساتھ چلنے کو تیار ہوئے، مگر وہ فقط عمدۃ الملک وغیرہ چند امیروں اور چند خواجہ سراؤں کو لے کر آئے۔ نادر شاہ نے عزت واحترام کے ساتھ الگ خیمے میں اتروایا اور کہا کہ بھائی محمد شاہ سلطنت اور کاروبار کا سامان مع حرم سرا کے منگوا لو اور خاطر جمع سے یہیں رہو۔ لشکر میں بھی حکم بھیج دیا کہ جو چاہے ہمارے لشکر میں آ جائے اور جو چاہے دلی چلا جائے۔ بعد اس کے اپنا فرمان اور بادشاہ کا شقہ ایک اپنے سردار کو دے کر شہر کو روانہ کیا۔ اس نے جاتے ہی قلعہ دار سے کنجیاں لیں اور سب کارخانوں پر قبضہ کر لیا۔ لشکر کے لوگ پریشان ہو کر بھاگے۔ بہتوں کو ولایتیوں نے لوٹ کر باندھ لیا۔ جوان

سے بچے وہ رستے کے گوجروں نے مارے۔ جیتے بچے تو ننگ لچے گھر پہنچے۔ دوسرے دن نادر شاہ بھی شاہ کو لے کر چلے اور دلی میں داخل ہوئے۔ پانچ چار دن کے بعد عید قربانی آئی۔ مسجد میں خطبہ نادر شاہ کے نام سے پڑھا گیا اور چونکہ دوہرا دربار تھا اس لئے بڑی دھوم کا تزک واحتشام ہوا۔ مگر قربانی اس عید کی عجیب وغریب ہوئی یعنی عصر کے وقت تک تمام شہر میں امن امان سے عیش وعشرت ہو رہی تھی جو دفعتہً بھنگڑ خانے میں بیٹھے بیٹھے ایک بھنگڑ بولا کہ واہ محمد شاہ رنگیلے، آخر بادشاہی پیچ کھیل ہی گیا۔ دوسرا بولا، کیا؟ اس نے کہا کہ حرم سرا میں موقع تاک کر ایک قلماقنی[43] سے مغلیے[44] کو مروا دیا۔ یہ ہوا دفعتہً اڑی اور ہوا کی طرح تمام شہر میں پھیل گئی غضب یہ ہوا کہ نادری سپاہی جو ایک ایک دو دو گلی کوچوں میں بے تکلف پھرتے تھے انہیں لوگوں نے بے وارثا سمجھ کر قتل کرنا شروع کر دیا۔ رات کو نادر کو خبر پہنچی۔ اس نے فوج کو حکم دیا کہ اپنی جگہ پر قائم رہو۔ اگر تم پر چڑھ کر آئیں تو جواب دو، نہیں تو چپ چاپ بیٹھے رہو۔ رات بھر برابر تلوار چلتی رہی اور صبح تک سات سو ولایتی شہر میں کٹ گیا۔ افسوس یہ کہ ارکان دربار چپکے تماشا دیکھا کئے بلکہ چند اشخاص کو جن کو یہ نادر شاہ سے کہہ کر اپنے گھر لے گئے تھے وہ بھی مارے گئے۔ نادر نے صبح اٹھ کر پوچھا تو وہی حال سنا۔ حیران ہوا کر کرنال کے معرکہ جنگ میں کل تین ولایتی مریں اور بیس آدمی زخمی ہوں! اور شہر میں میرا صدہا سپاہی اس طرح ضائع ہو جائے! دنیا آنکھوں میں اندھیر معلوم ہونے لگی۔ اسی وقت نکلا اور گھوڑے پر سوار ہو کر شہر کو دیکھتا ہوا چلا کہ شاید مجھے زندہ وسلامت دیکھ کر یہ طوفان تھم جائے اور دہلی کے قتل وعام کا دھبہ میرے نام پر نہ آئے۔ مگر شہر کے لوگوں نے اس پر بھی پتھر پھینکنے شروع کر دیے بلکہ بندوقیں بھی ماریں۔ یہاں تک کہ ایک مصاحب کا پہلو زخمی ہوا۔ ساتھ ہی دیکھا کہ جابجا ایرانی غریب الوطنوں کے لاشے پڑے ہیں۔ یہ دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا اور قتل عام کا حکم دے کر کہہ دیا کہ جہاں تک کوئی قزلباش مرا ہوا نظر آئے ایک آدمی جیتا نہ رہے یہ کہہ کر ترپولیے تک آیا اور روشن الدولہ[45] کی مسجد میں آ کر قتل عام کی علامت ظاہر کی یعنی تلوار کھینچ کر مسجد میں بیٹھ گیا۔

کوچوں میں خون کے نالے بہہ گئے اور گھروں میں آگ لگ کر زمیں سے آسماں تک دھواں دھار ہو گیا۔ نادر شاہ کا غصہ خدا کا قہر بادشاہ اور امیر سب دیکھتے تھے اور دم نہ مار سکتے تھے۔ ایک بڈھا خواجہ سرا محمد شاہ کے پاس روتا ہوا آیا اور کہا کہ حضور کے باپ دادا کی رعیت سب قتل ہو گئی۔ بادشاہ بھی آبدیدہ ہوئے اور اتنا کہا کہ:

دیدۂ عبرت کشا قدرت حق را ببیں
شامت اعمال ما صورت نادر گرفت

دوپہر کے قریب جب عالم میں کہرام مچ گیا تو پھر سب نے آصف جاہ سے رجوع کی۔ وہ تلوار گلے میں ڈالے سر برہنہ کئے، خاموش نادر کے سامنے جا کھڑا ہوا اور رونے لگا۔ نادر شاہ کے دل میں بھی خدا نے رحم ڈالا پوچھا کہ چہ میخواہی؟ اس نے یہ شعر پڑھا:

کسے نماند کہ دیگر بہ تیغ ناز کشی
مگر کہ زندہ کنی راو باز کشی

نادر نے شرما کر سر جھکا لیا، تلوار میان میں کی اور کہا کہ بریش سفیدت بخشیدم۔ اسی وقت شہر میں ایرانی نقیب اور چاؤش امان امان کہتے ہوئے دوڑے اور پل کے پل میں امن ہو گیا۔ سلطنت کے کاروبار کے ساتھ دونوں بادشاہوں کی صحبتیں پھر بدستور جاری ہو گئیں۔ ایک دن بادشاہ نے نادر کی دعوت کی۔ ایک ایک خدمت ایک ایک امیر کے سپرد ہوئی۔ کھانے کے بعد جب چائے آئی تو عمدۃ الملک نے پیالی چائے کی بھری مگر جب دینے لگا تو سوچا کہ اگر پہلے اپنے آقا کو دوں تو ادھر نادر ہے ایسا نہ ہو ابھی سر اڑا دے اور اگر نادر کو پہلے دوں تو آئندہ بھی اپنے دربار میں منہ دکھانا ہے۔ یہاں اس کی تیزی طبع کا جوہر کام آیا۔ یعنی محمد شاہ کے سامنے پیالی کر کے کہا کہ شاہاں بشاہاں مید ہند۔ یعنی فدوی کی لیاقت نہیں کہ اس عالی جاہ بادشاہ کو چائے دے۔ آپ اپنے دست مبارک سے دیجیے۔ چنانچہ دونوں بادشاہ خوش ہوئے اور دونوں کے اہل دربار نے اس انداز خوشنما پر تحسین و آفرین کی۔

لطیفہ۔ ایک دن نادر شاہ کو پیٹ میں گرانی معلوم ہوئی۔ محمد شاہ سے حال بیان کیا۔ اسی وقت علوی خاں حکیم آیا اور نبض دیکھ کر دواخانے کے داروغہ کو اشارہ کیا۔ چنانچہ کشتی مرصع پر زرنگار خوان پوش پڑا ہوا آیا۔ خوان پوش اٹھایا تو ایک مرصع مرتبان میں گلقند۔ الماس کا چمچہ برابر دھرا، گنگا جمنی کا نارتی ماشے سمیت وزن کے اندازے کے لئے ساتھ موجود تھا اور حکیم سوچتا تھا کہ کس قدر گلقند اس میں سے نکالے اور وزن کر کے کھانے کو دے نادر شاہ نے خود مرتبان کو اٹھالیا اور کھول کر دیکھا۔ بعد اس کے دو انگلیاں اندر ڈال کر چار نوالوں میں مرتبان خالی کر دیا۔ چونکہ اس میں خوشبودار دوائیں بھی ملی ہوئی تھیں۔ اچھا معلوم ہوا اور کہا کہ۔۔۔ حلوائے خوبست دیگر بیارید۔

لطیفہ۔ ایک دن نادر شاہ ہوا کھانے کو سوار ہوا۔ محمد شاہ نے کہا کہ ایران میں ہاتھی نہیں ہوتا۔ آج انہیں ہاتھی پر سوار کرو۔ جب ہودج میں جا کر بیٹھا تو اگلے فیل بان کو دیکھا پوچھا: ایں کیست۔ لوگوں نے کہا: فیل بانست۔ ایں را میراند۔ فیلبان سے کہا کہ عنانش بمن بدہ۔ اس نے عرض کی کہ قبلہ عالم فیل عنان ندارد باشارۂ سر پایم راہ میرود۔ ناک چڑھا کر بولا: بنشانید کہ فرآئیم[46]۔ مرکبے کہ عنانش بدست غیر باشد سواری را نشاید۔

لطیفہ۔ محمد شاہ کے اہل نشاط میں ایک کنچنی تھی نور بائی اس کا نام تھا اور ناچ گانے کے علاوہ حاضر جوابی اور لطیفہ گوئی کا یہ عالم تھا کہ گویا منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ ایک دن نادر شاہ نے بھی اس کا گانا سنا۔ چنانچہ بہت محظوظ ہوئے کچھ انعام دیا اور کہا کہ نور بائی روئے ہندرا سیاہ کن بیا کہ بہ ایرانت بریم۔ یہ سنتے ہی بائی جی کا دم بند ہو گیا اور ساری لطیفہ گوئیاں بھول گئیں۔ دل میں ڈریں کہ خوش ہو کر ساتھ لے چلا ہے۔ اگر ذرا خفا ہوا تو خدا جانے ناک کاٹ لے۔ آنکھ نکال لے۔ پیٹ چاک کر ڈالے۔ غرض اسی وقت یہ غزل گائی:

من شمع جانگدازم تو صبح دلکشائی
سوزم گرت نہ بینم میرم چو رخ نمائی

نزدیکت ایں چنینم دور آنچنا نکہ گفتم
نے تاب وصل دارم نے طاقت جُدائی

نادر شاہ بہت خوش ہوا اور اس کا مطلب سمجھ کر اپنے ارادے سے درگزرا۔

اسی عرصے میں نصر اللہ مرزا اپنے بیٹے کی ایک شاہزادی سے شادی کی۔ دو مہینے وہاں رہ کر خاطر خواہ نقد وجنس اور جواہر جس قدر سمیٹ سکا یہاں تک کہ تخت طاؤس تک بھی اٹھالیا اور سونے چاندی کے چکی کے پاٹ ڈھلوا کر اونٹوں پر لدوا دیے۔ غرض کل تیس کروڑ روپیہ کا اثاثہ لے کر روانہ ہوا۔ اور ڈیرہ جات کابل اور پنجاب کے ان علاقوں کو جن کا روپیہ کابل کی فوج میں لگا ہوا تھا انہیں ہندوستان سے نکال کر ایران کی سلطنت میں داخل کیا۔ محمد شاہ دولہا پھر یہاں رنگ رلیاں کرنے لگے اور چند سال کے بعد اسی عیش وعشرت سے ۳۰ برس سلطنت کر کے عالم بقا کو روانہ ہوئے۔

بابا نانک صاحب

سکھوں کا فرقہ اگرچہ بابر بادشاہ کے عہد سے پیدا ہوا مگر مدت دراز تک یہ لوگ فقیرانہ وضع اور صلح کل کے لباس میں نشو ونما پاتے رہے۔ عالمگیر کے عہد میں وضع ان کی بدلنی شروع ہوئی۔ یہاں تک کہ فرخ سیر اور محمد شاہ کے عہد میں ملک گیری کے ہاتھ پاؤں نکال کر تلوار سنبھالی۔ چونکہ اصل بانی اس فرقے کے گرو نانک صاحب تھے اس لئے مناسب معلوم ہوا کہ ان کا حال بھی اس کتاب میں درج کیا جائے۔

تلونڈی گاؤں میں کالو نام ایک کھتری تھا کہ حساب کتاب گاؤں کا لکھا کرتا تھا۔ اس کے گھر ایک لڑکا پیدا ہوا کالو بہت خوش ہوا اور لڑکے کا نام نانک رکھا۔ اس کی دائی کی زبانی بیان کرتے ہیں کہ جس وقت وہ پیدا ہوا تو ایسا غل اور شور معلوم ہوا جیسے کسی بڑے امیر وزیر کی سواری کی آمد آمد میں ہوتا ہے۔ غرض جب لڑکا بڑا ہوا تو اسے فارسی زبان اور رسمی حساب کتاب سکھانا شروع کیا۔ اس نے بہت جلد سیکھ لیا لیکن باوجود اس کے دنیاوی کاروبار کی طرف اس کی طبیعت اصلاً راغب نہ تھی۔

کالو چاہتا تھا کہ بیٹے کو بنج بیوپار کے کام میں لگائے۔ چنانچہ اس خیال سے ایک دن اسے بلایا اور چالیس روپے دے کر ایک جاٹ کے ساتھ کسی گاؤں کی طرف روانہ کیا۔ رستے میں اسے چند فقیر ملے۔ نانک نے انہیں کھانے پینے سے محتاج دیکھ کر افسوس کیا اور کچھ روپے دینے چاہے۔ ان لوگوں نے کہا بابا نقدی ہمارے کس کام کی ہم تو بھوکے ہیں کچھ کھانے کو دے۔ نانک خود شہر میں گیا اور چالیس روپے کا آٹا لا کر روٹیاں پکوائیں اور سب فقیروں کو کھلائیں۔ جب اس ضیافت سے فارغ ہوا تو گھر کو پھرا۔ گھر

کے پاس ایک درخت تھا۔ باپ کے ڈر سے جا کر اس کی ٹہنیوں میں چھپ رہا۔ باپ کو جب خبر ہوئی تو ڈھونڈ کر نکالا اور پوچھا کہ تو کیونکر واپس آیا اور جو روپے میں نے دیے تھے وہ کیا کیے۔ اس نے سب حال بیان کیا اور کہا کہ تم نے روپے نفع کمانے کو دیے تھے سو میں نے آخرت کا نفع کما لیا۔ کالو کو کیا خبر تھی کہ یہ خدا پرست لڑکا ایک موحد کامل ہو کر دنیا کے غافلوں کو آخرت کے نفع کا رستہ بتائے گا۔ بیٹے کی تقریر سن کر بہت خفا ہوا اور نصیحتاً مارنے کو تیار ہوا۔ اتفاقاً ایک زمیندار مسلمان وہاں آ نکلا اس نے پہلے بھی کچھ کچھ حالات نانک کے سنے ہوئے تھے۔ چنانچہ کالو کو روکا اور اسے چھڑا لیا۔ آخر باپ کو جب معلوم ہوا کہ اس کی طبیعت دنیا کے کاموں کے ڈھب کی بالکل نہیں تو اسے بڑا رنج ہوا۔ چنانچہ اکثر اس پر غصے ہوا کرتا مگر ماں اس کی محبت مادری سے باپ کے غصے کو ٹھنڈا کیا کرتی تھی۔ ناچار ہو کر سلطان پور علاقہ کپور تھلہ میں اس کی بہن بیاہی ہوئی تھی وہاں بھیج دیا۔ وہاں کا نواب دولت خاں ذات کا پٹھان ابراہیم لودھی بادشاہ دہلی کا رشتہ دار تھا اور نانک کا بہنوئی اس کی سرکار میں نوکر تھا۔ اس نے نانک کو وہاں پہنچایا۔ چنانچہ وہ بابا نانک جنہیں فقیر کی گدی پر بیٹھ کر راج کرنا تھا چند روز کے لئے مودھی بن کر بیٹھ گئے۔ اب ان کی سخاوت نے دل کی آرزو نکالنے کے لئے اس سے بہتر موقع نہ پایا۔ دان پن کا دروازہ کھول کر رات دن سدابرت جاری کر دیا۔ انجام اس کا یہ ہوا کہ چند روز میں ان پر غبن کا الزام لگایا اور محاسبہ طلب ہوا۔ لیکن جو شخص خدا کی راہ میں صرف کرے اس کے حساب میں کمی کب آتی ہے! جب حساب ہوا تو ان کا کچھ روپیہ نواب کے ذمہ فاضل نکلا۔

ان ہی دنوں میں ان کی شادی علاقہ بٹالہ میں ایک کھتری کے گھر ہو گئی تھی۔ اگرچہ انہیں دنیاداروں کی طرح خانہ داری اور گھر بار بسانے کا شوق نہ تھا مگر چونکہ خدا کو نسل بڑھانی تھی اسی حال میں سری چند اور لکھمی داس دو بیٹے بھی ہو گئے۔ مگر بابا نانک کے دل پر نقش تھا کہ دنیا نقش بر آب ہے اور زندگی کا کچھ بھروسہ نہیں، اس لئے ہمیشہ سیاحی میں رہتے اور سفر کے پردے میں ترک دنیا کر کے یاد الٰہی کے لطف اٹھاتے اور چونکہ بنیاد

عقیدے کی توحید کے ساتھ صلح کل پر تھی، اس لئے باتیں ایسی دل نشین اور خاطر پسند تھیں کہ سب سن سن کر خوش ہوتے تھے اور ہر مذہب کے لوگ نظر عظمت سے دیکھ کر صحبت کو غنیمت سمجھتے تھے۔ اسی حال میں فقیرانہ ریاضتیں بھی کیں۔ چنانچہ ایک دفعہ سلطان پور کے پاس بیاں دریا میں تین دن رات برابر پانی میں کھڑے رہے[47] اور ایک درخت کے نیچے بیٹھ کر بھگوان کی تپیا کرتے رہے۔ غرض اسی طرح رفتہ رفتہ بالکل دنیا سے قطع تعلق ہو گیا اور گھر بار سب چھوٹ گیا۔ جب یہ حال ان کے سسر نے دیکھا تو بہت رنج ہوا۔ چنانچہ وہ نواب دولت خاں کے پاس آیا اور اس سے کہہ سن کر بابا نانک کو بلوایا۔ مگر وہ ایسے اپنی دھن کے پکے ہو گئے تھے کہ ہر چند نواب کے آدمی گئے وہ باتوں ہی میں ٹالتے رہے۔ نواب کے دربار تک بھی نہ آئے۔

کہتے ہیں کہ ایک دن بابا نانک کو نواب اپنے ساتھ مسجد میں لے گئے۔ نواب تو نماز میں مصروف ہوئے، بابا نانک الگ بیٹھے رہے۔ جب نواب نماز سے فارغ ہوا تو پوچھا کہ نانک تم خدا کی نماز میں ہمارے ساتھ شریک نہ ہوئے۔ نانک نے کہا تمہارا دل تو قندھار میں گھوڑوں کی خریداری کر رہا تھا، نماز کس کے ساتھ پڑھتا؟ نواب بھی منصف آدمی تھا اس نے صاف کہہ دیا کہ فی الواقع میرا خیال ٹھکانے نہ تھا۔

ایک دن قاضی جی نے انہیں بلا کر نماز کے لئے مجبور کیا اور جب نماز سے فارغ ہوئے تو دیکھا کہ یہ الگ کھڑے رہے۔ نماز نہیں پڑھی۔ قاضی جی بہت خفا ہوئے اور کہا کہ بابا تو نے نماز کیوں نہیں پڑھی؟ انہوں نے ہنس کر کہا کہ قاضی جی آپ لوگوں میں کھڑے ہوئے نماز پڑھتے ہیں اور دل میں کبھی یہ خیال ہے کہ بیٹا بیمار ہے۔ کبھی یہ فکر ہے کہ بچھڑا کھلا چھوڑ آیا ہوں، وہ کوئیں میں نہ گر پڑا ہو۔ سن کر قاضی جی خاموش ہو گئے۔

غرض بابا نانک نے بالکل دنیا سے کنارہ کر کے فقیری اختیار کی۔ جورو بچے ان کے باپ کے گھر جا رہے اور یہ ملک بہ ملک دیس بہ دیس پھرنے لگے۔ خدا کی یاد کیا کرتے اور آنکھیں بند کئے دل کے دروازے کھولے بیٹھے رہتے۔ اس عالم میں دو

آدمی ان کے رفیق تھے۔ ایک تو بالا نام شخص تھا کہ بچپن سے ان کے ساتھ تھا۔ یہ ہندو دھرم تھا اور دوسرا مردانہ نام ایک مسلمان تھا کہ ذات کا ڈوم تھا۔ جب بابا نانک یاد الٰہی میں بیٹھتے تھے تو مردانہ رباب بجا کر اور تصوف اور معرفت کے بھجن گا کر دل روشن کیا کرتا۔ مردانہ بھی عجب ہشیار و دانا تھا۔ ان کی رفاقت میں بھوکوں مرتا۔ جورو بچوں کو یاد کر کے تڑپتا اور اکثر بلاؤں میں بھی مبتلا رہتا۔ ظاہر میں بہت گھبراتا۔ مگر ان کا ساتھ نہ چھوڑتا اور گرو نانک اور بھائی بالا کو اپنی باتوں سے خوش کر کے دل بہلایا کرتا بابا نانک اپنی سیاحی کے عالم میں ایمن آباد[48] میں بھی چند روز آ کر رہے۔ یہاں بھی ان کی خدا پرستی اور صفائی دل نے بہت سے معتقد جمع کر لئے۔ اتفاقاً انہی دنوں میں بابر بادشاہ بھی ہندوستان میں آیا۔ جب اس کے لشکر کا گزر ایمن آباد میں ہوا تو شہر خوب لٹا اور گورو نانک مع اپنے معتقدوں کے بیگار میں پکڑے گئے۔ اس عالم میں بھی ان کے موحدانہ کلاموں نے اپنے نور کا جلوہ دکھایا۔ یعنی سپاہیوں کو جب حال معلوم ہوا تو بادشاہ مذکور کے سامنے لے گئے۔ بابر ان سے اچھی طرح پیش آیا اور ان کی باتیں سن کر بہت محظوظ ہوا۔ کہتے ہیں کہ اس وقت بابر بادشاہ اپنے مصاحبان خاص کے ساتھ بیٹھا تھا اور شراب کا دور چل رہا تھا۔ شاہ مذکور نے کہا کہ بابا کو بھی شراب دو۔ بابا نانک نے کہا کہ اس کا نشہ عارضی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد اتر جاتا ہے۔ مجھے ایک ایسا نشہ ہاتھ آ گیا ہے کہ کبھی اترتا نہیں۔ مجھے اس سے معاف رکھئے۔ بابر اس لطیفے کو سن کر بہت خوش ہوا۔ کہتے ہیں کہ اسے بابا نانک نے دعا بھی دی تھی اور کہا تھا کہ سات پشت تک تیری اولاد کی بادشاہت اس ملک میں قائم رہے گی۔

جب اسی طرح پھرتے پھرتے دنیا کے سفر کی مدت تمام ہوئی اور سفر آخری کا وقت آیا تو ضلع گورداسپور میں ایک مقام پر آئے۔ وہاں ایک دھرم سالہ بنوایا اور اس کا نام کرتار پور رکھا۔ یہاں بیٹھ کر اپنے بال بچوں کو بھی بلوایا اور جو چیلے جابجا تھے، انہیں بھی جمع کیا۔ چند روز ان لوگوں کو اپنے پند و نصائح سے فیض بخشی کی تھی کہ پیغام اجل کا آیا اور ستر برس کی عمر میں دنیا سے انتقال کیا۔

بابا نانک کی خدا شناسی اور وحدت پرستی کی باتیں خاص و عام میں زبان زد ہیں، نہایت دلچسپ اور پر تاثیر ہیں۔ ایک دفعہ بابا نانک ہردوار کے میلے میں پھر رہے تھے۔ چند برہمنوں کو دیکھا کہ اپنی رسم مذہبی کے بموجب مشرق کو منہ کئے درختوں کو پانی دے رہے ہیں کہ پتروں کو اس کا ثواب پہنچے۔ بابا جی ان کے سامنے جا کھڑے ہوئے اور مغرب کو منہ کر کے اسی طرح پانی اچھالنے لگے۔ وہ لوگ انہیں پہچانتے نہ تھے، سمجھے کہ یہ کوئی گنوار فقیر پوجاپاٹ کے طریقہ سے بالکل بے خبر ہے۔ چنانچہ ہنس کر کہا کہ بابا یہ کیا کرتا ہے؟ انہوں نے کہا کہ کرتار پور میں میرے کھیت ہیں، انہیں پانی دیتا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ بھلا یہ کیا عقل ہے؟ یہاں سے وہاں تک صدہا کوس کا فاصلہ ہے، یہ پانی اتنی دور کیونکر پہنچ سکتا ہے؟ بابا جی نے ہنس کر کہا کہ اگر اتنی دور بھی پانی نہیں پہنچ سکتا تو بھلا کیونکر تم کو امید ہے کہ یہ چار چلو پانی جو یہاں چھڑک رہے ہو دوسری دنیا میں تمہارے پتروں کو پہنچ جائے گا۔ اس کے بعد چند دہرے معرفت الٰہی کے ایسے پڑھے کہ تمام سننے والوں کے دل پانی پانی ہو گئے اور سب نے آ کر قدم لئے۔

بابا صاحب کے معتقدان کی سیاحی اور صفائے باطنی کی باتیں اس طرح بیان کرتے ہیں کہ جو لوگ تاریخ اور علوم ظاہری کے پابند ہیں انہیں سن کر حیران رہ جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کا بیان ہے کہ وہ اکثر عالم ہوا میں پرواز کرتے تھے اور جس مقام پر چاہتے تھے دم کے دم میں جا پہنچتے تھے۔ بلکہ جس مقام کو چاہتے تھے اپنے پاس بلا لیتے تھے۔ یہاں تک کہ عربستان کی بھی سیر کی اور مکہ میں بھی گئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ گرو صاحب ایک دن حرم کعبہ کی طرف پاؤں کر کے سو رہے۔ وہاں کے لوگوں نے جب یہ حال دیکھا تو بہت غصے ہوئے اور انہیں جگا کر لعنت ملامت کرنے لگے۔ انہوں نے کہا کہ ایسا کیا گناہ مجھ سے ہوا جو تم اتنا خفا ہوتے ہو۔ انہوں نے کہا کہ اے بے عقل بابا تو خدا کے گھر کی طرف پاؤں کر کے سوتا ہے اور پھر پوچھتا ہے کہ گناہ کیا ہوا؟ انہوں نے کہا کہ میں تو جدھر خیال کرتا ہوں خدا ہی کا گھر معلوم ہوتا ہے۔ تمہارے نزدیک جدھر خدا کا گھر نہ ہو ادھر میرے پاؤں کر دو۔ یہ نکتہ سن کر وہ خاموش ہو گئے۔

اس حق شناس نے اپنی اولاد میں سے کسی کو گدی پر نہ بٹھایا بلکہ اپنے چیلوں میں سے میاں لہنا کھتری کو اپنا جانشین کیا اور ان کا نام انگد گرو رکھا، یعنی ذات ایک اور جسم و جان ایک۔ ان کی بی بی نے جب یہ حال دیکھا تو انہیں بہت رنج ہوا اور آخر کو اصرار کر کے کہا کہ اپنے فرزندوں کے ہوتے غیر شخص کو جانشین کرنے سے کیا حاصل ہے؟ جو کچھ تم کہتے ہو یہ تمہاری اطاعت کریں گے۔ اتفاقاً ان ہی دنوں میں ایک دفعہ فرش پر چوہا نیم جان پڑا تھا۔ انہوں نے بیٹوں سے کہا کہ اسے اٹھا کر پھینک دو۔ بیٹوں میں سے کسی نے اسے ہاتھ نہ لگایا۔ گرو صاحب نے لہنا کو اشارہ کیا اس نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور چوہے کو اٹھا کر پھینک دیا۔ گرو صاحب بہت خوش ہوئے اور اسے دعائیں دیں بلکہ یہ بھی فرمایا کہ میرا اصلی بیٹا یہی ہے جس نے میرے حکم کی تعمیل کی۔ اسی طرح ایک دن کا ذکر ہے کہ جنگل میں چلے جاتے تھے دیکھا کہ ایک مردار لاشہ پڑا ہے۔ بابا جی نے کہا کہ جو میرا صدق دل سے چیلہ ہے وہ اس مردار کو کھالے۔ چنانچہ اور سب کو نفرت آئی مگر میاں لہنا اسی وقت جھک کر منہ مارنے لگے۔ پھر دیکھا تو وہ صرف موہن بھوگ یعنی ترحلوا تھا لاشہ مردار کچھ نہ تھا۔

چونکہ بابا نانک کے خیالات توحید مطلق کے نور سے نورانی اور صلح کل کے عطر سے معطر تھے، اس لئے ہندو مسلمان ہر مذہب کے لوگ ان کے ساتھ محبت اور اعتقاد رکھتے تھے۔ چنانچہ ان کی نعش پر آ کر جھگڑا ہوا یعنی مسلمان کہتے تھے کہ ہم بموجب مذہب اسلام کے تجہیز و تکفین کریں گے اور نماز جنازہ پڑھ کر دفن کریں گے۔ ہندو کہتے تھے کہ ہم کریا کرم کر کے جلائیں گے۔ اس تکرار نے ایسا طول کھینچا کہ لڑائی تک نوبت پہنچی۔ لیکن جب نعش پر سے چادر اٹھائی تو وہاں کچھ 49 بھی نہ تھا۔ آخر فیصلہ یہ ہوا کہ آدھی چادر ہندوؤں نے لے کر جلائی اور آدھی مسلمانوں نے لے کر قبر میں دفن کر دی۔ مگر زمانے کی گردش ان سب پر غالب ہے۔ چونکہ مقام مذکور دریائے راوی کے کنارے پر تھا اس لئے پانی کی طغیانی قبر اور سمادھ دونوں کو بہا کر لے گئی۔

گورو نانک کے بعد گورو انگد تیرہ برس اپنے چیلوں کو ہدایت کر کے فوت

ہوئے۔ وہ لاولد تھے۔ گرو امرداس اپنے چیلے کو گدی سپرد کر گئے۔ بائیس برس کے بعد وہ بھی مر گئے۔ انہوں نے باوجود اولاد کے گرو رام داس اپنے داماد کو گدی سپرد کی۔ وہ سات برس کے بعد مر گئے اور گرو ارجن ان کے بیٹے جانشین ہوئے۔ پچیس برس کے بعد وہ بھی مر گئے اور گرو ہرگوبند ان کے بیٹے جانشین ہوئے۔ اڑتیس برس کے بعد انہوں نے بھی قضا کی اور گرو ہررائے ان کے پوتے قائم ہوئے۔ سترہ برس اپنے مریدوں کو رہنمائی کر کے ان کا بھی انتقال ہوا۔ چیلوں نے ان کے بعد گرو ہرکشن کو کہ نہایت خورد سال تھے۔ گدی پر بٹھایا مگر وہ تین برس کے بعد مر گئے۔ ان کے بعد گرو تیغ بہادر چھوٹے بیٹے گورو ہرگوبند گدی پر بیٹھے۔ مگر چونکہ انہوں نے جمعیت بہت سی بہم پہنچائی تھی اور عالمگیر کا عہد تھا، بادشاہ مذکور نے انہیں قید کیا اور مروا ڈالا۔ ان کے بعد ان کے بیٹے گورو گوبند مسند نشین ہوئے۔ لیکن چونکہ گرو تیغ بہادر نے معتقد بہت پیدا کر لئے تھے۔ اس کے علاوہ گورو گوبند کے دل میں خیالات ملک گیری کے سمائے ہوئے تھے اور دلی کی سلطنت نہایت ضعف پر تھی۔ انہوں نے بڑا اقتدار بہم پہنچایا۔ ہزاروں سکھوں کی فوج پیادہ اور سواروں کی رکاب میں رہنے لگی اور بادشاہی لشکر سے بھی مقابلے ہونے لگے۔ ان کے بعد گرو بنداجی جانشین ہوئے۔ چنانچہ انہوں نے گرو تیغ بہادر اور گرو گوبند کے خیالات کو زیادہ تقویت دی اور بادشاہی صوبوں کو بھی نہایت تنگ کیا۔ یہ محمد شاہ کا زمانہ تھا دربار سے لاہور اور کشمیر کے صوبوں کو حکم پہنچا اور اکثر مقاموں پر لڑائیاں ہوئیں مگر انجام یہ ہوا کہ گرو بنداجی بہت سے ہمراہیوں کے ساتھ قید ہو کر دلی گئے اور وہاں سب کے سب مارے گئے۔ یہ تینوں گرو اپنے معتقدوں کے دلوں میں ایسا جوش و خروش پیدا کر گئے کہ وہ فرقہ جس کی بنیاد فقط فقر اور صلح کل پر رکھی گئی تھی، ایک بہادر ملک گروہ ہو گیا اور ایک دن وہ ہوا کہ کل ملک پنجاب سالہا سال کے لئے اس فرقے کے قبضہ و تسلط میں آ گیا۔

حواشی

1- تاریخ فرشتہ کا مصنف گیارہویں صدی ہجری میں لکھتا ہے کہ اب تک وہ ٹکڑا مقام مذکور پر پڑا ہے۔

2- اس زمانے میں اسے ترائین کہتے تھے۔

3- کروہ۔

4- اس زمانے میں ۳۰۔۳۰۔۴۰، ۴۰۔ ہزار تاتاری مغل کابل کشمیر ڈیرہ جات کی گھاٹیوں سے اتر کر اکثر یہاں لوٹ مار کر جاتے تھے۔

5- یعنی جس کی ماں کا بابر نے دودھ پیا تھا۔

6- ایک غلہ ہے جیسے باجرا مگر لوچ اس میں اتنا بھی نہیں ہوتا۔ اسی واسطے گلے میں اٹکتا ہے بلکہ ایک قسم کی بو اور تلخی اس سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔

7- آش گویا ہندوستان کا ہریرہ ہوتا ہے مگر نمکین۔

8- ملک وہاں ایسا ہوتا ہے جیسے یہاں اعلیٰ ذیلدار۔

9- برفانی پہاڑوں میں جب چوٹیوں پر بہت سی برف جمع ہو جاتی ہے تو دفعتاً وہاں سے نیچے گرتی ہے۔ اوپر تو ایسی آواز ہوتی ہے گویا کئی توپیں برابر داغ دیں اور نیچے قافلے بلکہ گاؤں کے گاؤں دب جاتے ہیں۔

10- کابل کے قلعہ کا نام بالا حصار ہے۔

11- طوغ ایک قسم کا نشان ترکوں کے لشکر میں ہوتا ہے اور یہ عمل بھی وہ لوگ شگون کے

طور پر کرتے ہیں۔

12- اس وقت چنگیزی آئین کے بموجب فوج کے شمار کا یہی قاعدہ چلا آ رہا تھا۔

13- ایک سکہ تھا جو شاہرخ مرزا، امیر تیمور کے بیٹے کے نام سے شاہرخی کہلاتا تھا اور مقدار میں سات آنے کے قریب ہوتا تھا۔

14- قدیم زمانے میں بنگالہ کا دارالخلافہ تھا۔

15- ان ملکوں کے پہاڑ اور جنگلوں میں بغیر قافلے کے رستہ نہیں چل سکتا۔ ایک شخص اجرت پر ساتھ لے لیتے ہیں کہ جو رستہ بھی جانتا ہے اور ہر طرح کے خطرے کا ذمہ دار ہوتا ہے اسے بدرقہ کہتے ہیں۔

16- ہمایوں کے نام کی رعایت سے اس میں یہ شعر لکھا تھا:

ہمائے اوج سعادت بدام ما افتد
اگر ترا گزرے بر مقام ما افتد

17- صورت اس کی یہ ہوتی ہے کہ دامن کوہ میں پندرہ بیس کوس کا ایک جنگل جال اور جھاڑیوں سے گھیرتے ہیں۔ پچاس پچاس، ساٹھ ساٹھ کوس کے گردے سے وحشی جانور گھیر کر اس میں ڈالتے ہیں اور گزرگاہوں کو شکاری خود روک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ بیچ میں بلند بلند مقام، شاہ اور خاص خاص شہزادوں کے لئے بناتے ہیں۔ بعد اس کے بادشاہ اور شاہزادے اور امیران دربار اسلحہ شکار اور بہت سے شکاری کتے لے کر وہاں پہنچتے ہیں۔ پہلا شکار بادشاہ مارتا ہے۔ پھر درجہ بدرجہ شاہزادے اور امراء کھیلتے ہیں۔ پھر حکم عام ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ہمایوں کی خاطر کئی معرکے ایسے ہوئے۔

18- ضلع گورداسپور۔

19- ترکوں میں دستور ہے کہ ایسے موقع پر ضیافت عام کرتے ہیں اور دولت مند لوگ اپنے نوکروں کو جوڑے دیتے ہیں بلکہ جو پہلے آ کر خوش خبری دے تو جو کپڑے پہنے بیٹھے ہوتے ہیں وہ اسے اتار کر دے دیتے ہیں۔

20- ابوالفضل، فیضی، خان خاناں، کوکلتاش، حکیم ہمام، حکیم ابوالفتح، بیربل، راجہ ٹوڈرمل

وغیرہ امیر رکن دربار تھے۔ یہی اکبری نورتن کہلاتا تھا۔

21- اکبر نے بچپن میں اس کا دودھ پیا تھا۔ اس لئے پیار سے جی جی کہا کرتا تھا۔

22- چندروز کے بعد یہی خان خاناں ہو گیا۔ چنانچہ ابوالفضل میں جو رقعے ہیں اور اکثر سخاوتیں جو خاص و عام میں مشہور ہیں وہ اسی سے متعلق ہیں۔

23- ایک قسم کا نقارہ سمجھنا چاہیے۔

24- فتح پور آگرہ سے کئی کوس پر ایک مقام تھا اکبر نے خود عمارات شاہی سے اور امراء کے مکانات عالی سے باغ ارم کی طرح آراستہ کیا تھا۔ عجیب اتفاق یہ ہے کہ اس کے سامنے ہی سب عمارتیں خاک میں مل کی نیست و نابود ہو گئیں۔

25- شاستر میں حکم ہے کہ جو شخص شاستر کا فیض ملیکش کو روئے زمین پر پہنچائے وہ بڑا گنہگار ہے۔ چنانچہ اسی واسطے یہ بندوبست کیا تھا۔

26- یہ ایک رسم جشن ہنود کی ہے۔

27- یعنی اے خدا کہ تیرا نام جیزس کرائسٹ ہے اور جیزس کرائسٹ سے عیسیٰ مسیح مراد ہے۔

28- یہ وظیفہ خاص اہل خلوص کے لئے تھا۔

29- یہ وظیفہ خاص اہل خلوص کے لئے تھا۔

30- اس حکم کی تعمیل بہت کم ہوتی تھی فقط زبانی دھمکی تھی۔

31- اس کے بعد بھی شاہان دہلی نے یہ بات رسوم سلطنت میں داخل رکھی تھی کہ ہفتے میں دو دفعہ ہاتھیوں کی لڑائی دیکھا کرتے تھے۔

32- یہ ایک عہدہ ہے جس سے ۳۶ کارخانے بادشاہی متعلق ہوتے ہیں۔

33- جہانگیر کا مقبرہ جہاں ہے پہلے یہ مہدی قاسم خاں کا باغ کہلاتا تھا۔

34- ۱۰۴۸ھ ۱۶۳۸ء میں بنیاد رکھی گئی۔ ۱۰۵۸ھ ۱۶۴۸ء میں تیار ہوا۔ تاریخ ہوئی کہ:

شد شاہجہاں آباد از شاہجہاں آباد

35- چنیوٹ علاقہ جھنگ کا رہنے والا تھا اور ایک غریب گمنام کا بیٹا تھا۔ لاہور میں علم حاصل کیا اور فقط علم کی برکت نے اس مرتبے تک پہنچایا کہ شہنشاہ ہند کا وزیر اعظم ہو گیا۔ چنانچہ ۱۰۵۰ھ میں ملازم ہوا۔ ۱۰۵۵ھ میں دیوان خالصہ ہوا۔ اس کے بعد وزیر اعظم ہو گیا۔ اس کی مسجد مقام چنیوٹ میں اب بھی موجود ہے، جس کے دو مینار سنگ لرزاں کے ہیں، ہلانے سے حرکت کرتے ہیں۔

36- یعنی مرد خدمت گار بھی مطلوب نہیں کہ تم کسی سے سازش دوڑانے کا خیال کرو۔

37- یہ حالات سیر المتاخرین اور خافی خاں کی تاریخ سے لئے گئے۔

38- ایک شاہانہ سواری کا نام ہے۔

39- دکن کے سپاہی فولادی پنجے ہاتھوں پر چڑھا لیتے تھے جس سے مخالفوں کو نوچتے تھے اور انہیں بگھونہ کہتے تھے یعنی پنجہ شیر۔

40- قراول چند سرداروں کا مجموعہ ہوتا ہے جو فوج سے آگے بڑھ کر کئی کئی کوس تک گھوڑے مارتا پھرتا ہے تاکہ دشمن کی فوج اور گردوپیش کے حالات کی خبر رہے اور موقع پاتا ہے تو دست برد بھی کر جاتا ہے۔

41- مصارف جنگ اور خرچ راہ کے روپیہ کو نعل بہا یا نعل بندی کا روپیہ کہتے ہیں۔

42- یہ لمبی ٹوپی بھی پوست برہ یعنی سیاہ دنبے کی کھال کی ہوتی ہے۔

43- ہندوستان میں قلماقنی اور اردا بیگنی ان عورتوں کو کہتے تھے جو اسلحہ جنگ سے بھی رہتی تھیں اور حرم سرا میں سپاہیوں کی طرح پہرے وغیرہ کا کام کرتی تھیں۔

44- یعنی نادر شاہ کو مروا ڈالا۔

45- یعنی شہری مسجد۔

46- فرود آئیم کا مخفف ہے یعنی ہاتھی کو بٹھا دو کہ ہم اتر آئیں۔

47- اب بھی سکھ اس مقام کو متبرک شمار کرتے ہیں اور اس کا نام سنت گھلٹ رکھا ہے۔ سکھ اسے بابا کی بیری کہتے ہیں۔

48- یہاں جس ویرانے میں گرو نانک صاحب ٹھہرے تھے وہاں ادھر ادھر سے لے کر

پتھر برابر چن لے کہ زمین ہموار ہو جائے، چنانچہ اس جگہ کو سکھ روڑی کہتے ہیں۔

49- قیاس معلوم ہوتا ہے کہ کوئی گرو کا خالصہ نکال لے گیا۔

نیرنگِ خیال

مولانا محمد حسین آزاد

فہرست

دیباچہ

تماشہ گاہ عالم میں جو اہل نظر ایک نگاہ سے میدان ماضی اور ایک سے حال و استقبال کی سیر دیکھ رہے ہیں' انہیں صاف نظر آتا ہے کہ ملک ہمارا عنقریب آفرینش جدید کے وجود میں قالب تبدیل کیا چاہتا ہے۔ نئے نئے علوم ہیں' نئے نئے فنون ہیں' سب کے حال نئے ہیں' دل دل کے خیال نئے ہیں۔ عمارتیں نئے نئے نقشے کھینچ رہی ہیں' رستے نئے خاکے ڈال رہے ہیں۔ اس طلسمات کو دیکھ کر عقل رسا حیران ہے۔ مگر اسی عالم حیرت میں ایک شاہراہ پر نظر جاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ سولزیشن (تہذیب) کی سواری' شاہانہ چلی آتی ہے۔ ہر شخص اپنے اپنے ویرانے کو جھاڑ بہار رہا ہے' اور جس حال میں ہے، اس کی پیشوائی کو دوڑا جاتا ہے۔

جو نقشے کھینچ رہے ہیں اور جو بنیادیں پڑ رہی ہیں' اگرچہ ابھی تک کچھ اصل نہیں رکھتیں' لیکن جو نظرباز تجربے کی عینک سے دیکھ رہے ہیں' وہ سمجھ رہے ہیں کہ اب وہ وقت آن پہنچا ہے کہ یہ بنیادیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں گی اور آبادیاں روئے زمین پر چھا جائیں گی۔ وہ بنیادیں کیا ہیں؟ اور نقشوں سے کیا مراد ہے؟ ہاں' نقشے کتب علوم و فنون ہیں اور بنیادیں تصانیف ہو قلموں کہ جو کچھ سود و بہبود ہماری قسمت میں ہے' انہی پیمانوں اور اندازوں پر ہمیں ملے گا۔

اب تک اس ملک نے اپنی غریب حالت کے بموجب بہت سا سرمایہ تصنیف کا بہم پہنچایا' اور آج سے پچاس ساٹھ برس پیچھے ہٹ کر دیکھیں تو ہمارے عام مطالب و اغراض بلکہ بات بات میں زمین و آسمان کا فرق آ گیا ہے' جس سے ثابت ہوتا ہے کہ علوم و فنون انگریزی جس طرح لباس' مکانات' حالات' خیالات اور معلومات سابقہ میں ترمیم کر رہے ہیں' اسی طرح اس کی انشاپردازی بھی ہماری انشاء میں اصلاح دیتی جاتی ہے۔ لیکن علم زبان میں اس فرق کا امتیاز کرنا ہر شخص کا کام نہیں' جنہیں ان کا مذاق ہے'

وہی سمجھتے ہیں' ظاہر ہے کہ ہمارے ہاں جو کچھ اردو کا رنگ نکلا تھا' سبزۂ خودرو کی طرح نکلا تھا۔ خاص و عام کے دلوں کی امنگ تھی' جدھر جھک گئے ادھر جھک گئے۔ خاص شخص کی یا خاص اصول کی کوشش نہیں ہوئی۔ اور اب تک یہ حال ہے کہ تاریخ' فروع ریاضی وغیرہ اکثر علوم کی کتابیں ترجمہ اور تصنیف ہوئیں' مگر فنِ انشاء کی طرف کسی نے خیال نہ کیا۔

زبان اردو ایک لاوارث بچہ تھا کہ اردوئے شاہجہانی میں پھرتا ہوا ملا۔ کسی کو اس غریب کے حال کی پروا نہ ہوئی۔ اتفاقاً شعراء نے اٹھالیا اور محبت سے پالنا شروع کیا۔ اس نے انہی کے کھانے سے خوراک پائی' انہی کے لباس سے پوشاک پہنی' انہی سے تعلیم کا سرمایہ لیتا رہا۔ اسی واسطے انہی کی زبان سے بولنا سیکھا' انہی کے قدموں پر چلنا سیکھا' انہی کے خیالات اس کے دل و دماغ میں سمائے۔ حالت اس کی یہ رہی کہ علما تو درکنار' ادنیٰ ادنیٰ آدمی اردو میں لکھنا ہتک سمجھتے تھے۔ جب 1835ء میں اس نے دفاتر سرکاری میں دخل پایا' ساتھ ہی اخباروں پر قبضہ ہوگیا' تب لوگوں کی نظروں میں عزت ووقار ہوا' اور رفتہ رفتہ کل ہندوستان پر قبضہ ہوگیا۔

غرض کہ زبان اردو کے پاس جو کچھ اصل سرمایہ ہے' وہ شعرائے ہند کی کمائی ہے۔ جنہوں نے فارسی کی بدولت اپنی دکان سجائی ہے۔ یہ مفلس زبان علمی الفاظ میں تو اس لیے تہی دست رہی کہ یہ ملک کی علمی زبان نہ تھی افسوس یہ ہے کہ عام مطالب کے ادا کرنے میں بھی مفلس ہے۔ چنانچہ اگر تاریخ یا کسی قسم کی سرگذشت اس زبان میں لکھیں تو جو اصلی حالت یا اپنے دل کا ارمان ہے' وہ نہیں نکل سکتا۔ اسی واسطے اس کا اثر بھی' جیسا کہ جی چاہتا ہے' پڑھنے والے کے دل تک نہیں پہنچتا۔ بات یہ ہے کہ اس کی سرزمین کی ہوا بگڑی ہوئی ہے۔ جو کچھ ہے وہ اتنا ہی ہے کہ فارسی کے پروں سے اُڑی' لفاظی اور مبالغوں کے زور سے آسمان پر چڑھ گئی' وہاں سے جو گری تو استعاروں کی تہہ میں ڈوب کر غائب ہوگئی۔

اس کی طبع آزمائی کا زور اب تک فقط چند مطالب میں محصور ہے۔ مضامین عاشقانہ گلگشت مستانہ' نصیبوں کا رونا' امید موہوم پر خوش ہونا' امرا کی ثناخوانی' حسن خفا

ہوئے اس کی خاک اُڑائی۔ البتہ ان رنگوں میں اس نے لطافت اور نازک خیالی کو اس درجے تک پہنچایا کہ حد سے گزار دیا۔ اور اس قسم کے الفاظ و مطالب کا عمدہ ذخیرہ اس کے پاس ہے۔ فارسی میں صدہا نظم و نثر کی کتابیں ہیں جن کے خیالات، باریکی اور تاریکی عبارات میں جگنو سے اُڑتے نظر آتے ہیں۔ لیکن کیا حاصل؟ اس انداز میں اصلی ماجرا ادا کرنا چاہو تو ممکن نہیں۔ ایسی ماں کا دودھ پی کر اُردو نے پرورش پائی تو اس کا کیا حال ہوگا؟

اے اہل وطن! آج وہ دن ہے کہ علوم کے ایوان شاہانہ میں دربار لگا ہوا ہے۔ ہر ایک زبان اپنے اپنے ملک کی خدمتیں لے کر حاضر اور قدرت اور عظمت کے درجوں پر قائم ہے۔ تمہیں کچھ معلوم ہوتا ہے کہ تمہاری زبان کس درجہ پر کھڑی ہے؟ صاف نظر آتا ہے کہ نہایت ادنیٰ درجے پر ہے۔ وہ آگے بڑھنا چاہتی ہے مگر کوئی بڑھانے والا نہیں۔ ہاں اس کا بڑھنا تمہارے ہاتھ میں ہے۔

زبان انگریزی بھی مضامین عاشقانہ، قصہ و افسانہ اور مضامین خیالی سے مالا مال ہے، مگر کچھ اور ڈھنگ سے۔ اس کا اصل اصول یہ ہے کہ جو سرگذشت بیان کرے، اس طرح ادا کرے کہ سامنے تصویر کھینچ دے، اور نشتر اس کا دل پر کھٹکے۔ اسی واسطے خیالی پھول پتے اتنے ہی لگاتے ہیں جتنے اصل ٹہنیوں پر سجتے ہوں، نہ کہ شاخ و شجر سب غائب ہو جائیں، فقط پتوں کا ڈھیر ہی رہ جائے۔ بے شک فن انشاء اور لطف زبان تفریح طبع کا سامان ہے، لیکن جس طرح ہمارے متاخرین نے اسے ایک ہی مرض کی دوا سمجھ لیا ہے، انگریزی میں ایسا نہیں۔ اہل فرنگ نے جس طرح ہر امر کی بنیاد ایک منفعت پر رکھی ہے، اسی طرح اس میں بھی موقع موقع سے مختلف منافع مد نظر رکھے ہیں۔ زبان انگریزی میں نظم کا طور کچھ اور ہی ہے، مگر نثر میں بھی خیالی داستانیں یا اکثر مضامین خاص خاص مقاصد پر لکھے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی وسعت خیال اور پرواز فکر اور تازگی مضامین اور طرز بیان کا انداز قابل دیکھنے کے ہے۔ میں نے انگریزی انشاء پردازوں کے خیالات سے اکثر چراغ شوق روشن کیا ہے۔ بڑی بڑی کتابیں ان مطالب پر مشتمل ہیں جنہیں یہاں جواب مضمون (Essay) کہتے ہیں۔ ان میں انواع و اقسام کی غرضیں ملحوظ ہیں۔ مگر بہت سے مضامین ایسے ہیں جن کی روشنی ابھی ہمارے دل و دماغ تک نہیں

پہنچی۔ بعض مضامین وہ ہیں جن میں انسان کے قوائے عقلی یا حواس یا اخلاق کو لیا ہے۔ انھیں انسان یا فرشتہ یا دیو یا پری تصور کیا ہے' اور ان کے معاملات اور ترقی و تنزل کو سرگذشت کے طور پر بیان کیا ہے۔ ان میں شگفتگی طبع کے علاوہ یہ غرض رکھی ہے کہ پڑھنے والے کو کسی صفت پسندیدہ پر رغبت اور کسی خلق بد سے نفرت ہو' یا کسی حصول مطلب کے رستے میں جو نشیب و فراز آتے ہیں' ان سے واقف ہو۔ اگرچہ اس میں طرز بیان کا وہ طور نہیں جو ہم اردو' فارسی میں پڑھتے ہیں' لیکن اس میں شک نہیں کہ اگر کوئی فصیح اردو زبان پر قادر ہو تو انھیں پڑھے اور ان کے رنگ سے اپنے کلام کے چہرۂ حال کو ایسے خدو خال سے آراستہ کرلے کہ خاص و عام کی نظر میں کھب جائے۔ البتہ ایسی قدرت حاصل ہونی مشکل ہے' اور مشکل تر یہ ہے کہ انگریزی میں یہ یونان اور روما کے مضامین کے ساتھ وہاں کے مذہب اور رسوم قدیم کی باتیں اب تک انشاء پردازی کا جزو ہیں۔ رومی و یونانی ستارہ ہائے فلکی اور اکثر قوائے روحانی کو دیوتا مانتے تھے۔ چنانچہ انگریزی میں بڑے انشاپردازوہی کہلاتے ہیں جن کی چشم سخن ہر بات میں ان کے قصوں پر اشارے کرتی جائے۔ مگر اردو کے باغ نے فارسی اور عربی کے چشموں سے پانی پایا ہے' وہاں دیوی دیوتا کا گزر نہیں۔ اور یہ سخت دشواری ہے' کیونکہ اگر لکھنے میں کچھ تصرف کریں تو ترجمہ نہ رہا' اور اصل کی رعایت کی تو کتاب معمائے دقیق ہو گئی' نہ کہ رفیق تفریح۔

حق یہ ہے کہ مجھ نا قابل کو ایسے موقع پر قلم اٹھانا ان مضامین کو ذبح کرنا ہے۔ لیکن اب وہ زمانہ بھی نہیں کہ ہم اپنے لڑکوں کو ایک کہانی طوطے یا مینا کی زبانی سنائیں' ترقی کریں تو چار فقیر لنگوٹ باندھ کر بیٹھ جائیں' یا پریاں اڑائیں' دیو بنائیں اور ساری رات ان کی باتوں میں گنوائیں۔ اب کچھ اور وقت ہے۔ اسی واسطے ہمیں بھی کچھ اور کرنا چاہیے۔ علوم و فنون کے علاوہ ایسی تصنیفیں بھی چاہئیں جو صاف شفاف تصویریں رسوم و اخلاق کی ہماری بزم کلام میں سجائیں۔ ان میں جو ہمارے داغ دھبے ہیں' سب نظر آئیں' اور آب تاثیر سے دھوئے جائیں۔ تم دیکھتے ہو! بے جان مورتیوں میں جان پڑنے کی ساعت آگئی ہے۔ قریب ہے کہ شائستہ زبانوں کی طرح ہماری زبان بھی جان

نقشی کی تاثیر پیدا کرے۔ اس تقریر سے یہ غرض نہیں کہ زبان کے کپڑے اتار کر ننگا منگا کر دو' استعارہ اور تشبیہ کا نام نہ رہے۔ ہاں ایسے کپڑے پہناؤ کہ اصلی حسن کو روشن کر دیں' نہ کہ اندھیرا چھا جائے۔ کیونکہ اور زبانوں میں کیا ہے جو ہماری زبان میں نہیں' ہاں طرز بیان کا ایک ڈھب ہے' وہ تقریر میں آجانا چاہیے' فقط اتنی ہی کمی ہے۔

اے جوہر زبان کے پرکھنے والو! میں زبان انگریزی میں بالکل بے زبان ہوں' اور اس ناکامی کا مجھے بھی افسوس ہے۔ اردو کے میدان میں بھی سوار نہیں پیادہ ہوں' اس لیے یہاں بھی درماندہ ہوں' پھر بھی بوالہوسی دیکھو کہ شہسواروں کے ساتھ دوڑنے کو آمادہ ہوں۔ جتنا نالائق ہوں' اتنا ہی شائق ہوں۔ دل سے لاچار ہوں کہ باوجود موانع مذکور کے جو لطف طبیعت کو بعض مضامین انگریزی سے حاصل ہوا' نہ چاہا کہ اپنے پیارے اہل وطن کو اس میں شامل نہ کروں۔ جس قدر ہو سکے اور جس طرح ہو سکے ایک پرتو اردو میں دکھانا چاہیے۔ بالفرض مجھ سے بیان کا حق ادا نہ ہوگا' ایک رستہ تو نکل آئے گا۔ زبان کے اہل ذوق بڑے بڑے صاحب قدرت ہیں اور ہوں گے۔ کوئی نہ کوئی منزل مقصود تک پہنچے گا۔

یہ چند مضمون جو لکھے ہیں' نہیں کہہ سکتا کہ ترجمہ کیے ہیں۔ ہاں جو کچھ کانوں نے سنا اور فکر مناسب نے زبان کے حوالے کیا' ہاتھوں نے اسے لکھ دیا۔ اب حیران ہوں کہ نکتہ شناس اسے دیکھ کر کیا سمجھیں گے۔ اکثر نازک دماغ تو کہہ دیں گے کہ واہیات ہے۔ بہت کہیں گے: "کوئی کہانی کہی ہے مگر مزا نہیں"۔ جو بڑے مبصر ہیں' وہ کہیں گے کہ "ہے' مگر غور طلب ہے"۔ بے شک یہ کہنا ان کا اصلیت سے خالی نہیں' کیونکہ خیالی تصویریں حکمت و اخلاق کی ہیں۔ فکر کے قلم نے خاکہ ڈالا ہے اور استعارہ و تشبیہ نے رنگ دیا ہے۔ طبیعتیں رستے سے آشنا نہیں۔ سبب یہ کہ ملک میں ابھی اس طرز کا رواج نہیں۔ خیر' آزاد! ناامید نہ ہونا چاہیے:

تمہاری سینہ فگاری کوئی تو دیکھے گا
نہ دیکھے اب تو نہ دیکھے' کبھی تو دیکھے گا

(محمد حسین آزاد)

اردو' انگریزی انشا پردازی پر کچھ خیالات

اگر زبان کو فقط اظہار مطالب کا وسیلہ ہی کہیں تو گویا وہ ایک اوزار ہے کہ جو کام ایک گونگے بچارے یا بچہ نادان کے اشارے سے ہوتے ہیں' وہی اس سے ہوتے ہیں۔ لیکن حقیقت میں اس کا مرتبہ ان لفظوں سے بہت بلند ہے۔ زبان حقیقت میں ایک معمار ہے کہ اگر چاہے تو باتوں باتوں میں ایک قلعہ فولادی تیار کر دے جو کسی توپ خانے سے نہ ٹوٹ سکے' اور چاہے تو ایک بات میں اسے خاک میں ملا دے' جس میں ہاتھ ہلانے کی بھی ضرورت نہ پڑے۔ زبان ایک جادوگر ہے جو کہ طلسمات کے کارخانے الفاظ کے منتروں سے تیار کر دیتا ہے' اور جو اپنے مقاصد چاہتا ہے' ان سے حاصل کر لیتا ہے۔ وہ ایک نادر مرصع کار ہے کہ جس کی دستکاری کے نمونے کبھی شاہوں کے سروں کے تاج اور کبھی شہزادیوں کے نو لکھے ہار ہوتے ہیں۔ کبھی علوم و فنون کے خزانوں سے زر و جواہر اس کی قوم کو مالا مال کرتے ہیں۔ وہ ایک چالاک عیار ہے جو ہوا پر گرہ لگاتا ہے اور دلوں کے قفل کھولتا اور بند کرتا ہے۔ یا مصور ہے کہ نظر کے میدان میں مرقع کھینچتا ہے یا ہوا میں گلزار کھلاتا ہے اور اسے پھول' گل' طوطی و بلبل سے سجا کر تیار کر دیتا ہے۔ اس نادر دستکار کے پاس مانی اور بہزاد کی طرح مو قلم اور رنگوں کی پیالیاں دھری نظر نہیں آتی ہیں' لیکن اس کے استعاروں اور تشبیہوں کے رنگ ایسے خوشنما ہیں کہ ایک بات میں مضمون کو شوخ کر کے لال بھبھوکا کر دیتا ہے۔ پھر بے اس کے کہ بوند پانی اس میں ڈالے' ایک ہی بات میں اسے ایسا کر دیتا ہے کہ کبھی نارنجی' کبھی گلناری' کبھی آتشی' کبھی ایسا بھینا بھینا گلابی رنگ دکھاتا ہے کہ دیکھ کر جی خوش ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بو قلموں اور رنگا رنگ اور پھر سر تا پا عالم نیرنگ۔ جس زبان میں ہم تم باتیں کرتے ہیں اس میں بڑے

بڑے نازک قلم مصور گزر گئے' جن کے مرقعے آج تک آنکھوں اور کانوں کے رستے سے ہمارے اور تمہارے دلوں کو تازہ کرتے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ آج کل گویا ان کے قلم گھس گئے ہیں اور پیالیاں رنگوں سے خالی ہو گئی ہیں جس سے تمہاری زبان کوئی نئی تصویر یا باریک کام کا مرقع تیار کرنے کے قابل نہیں رہی' اور تعلیم یافتہ قومیں اسے سن کر کہتی ہیں کہ یہ ناکامل زبان ہر قسم کے مطالب ادا کرنے کی قدرت نہیں رکھتی۔

میرے دوستو! یہ قول ان کا حقیقت میں بے جا نہیں ہے۔ ہر ایک زبان تعلیم یافتہ لوگوں میں جو عزت پاتی ہے تو دو سبب سے پاتی ہے: اول یہ کہ اس کے الفاظ کے خزانے میں ہر قسم کے علمی مطالب ادا کرنے کے سامان موجود ہوں' دوئم اس کی انشاء پردازی ہر رنگ اور ہر ڈھنگ میں مطالب کے ادا کرنے کی قوت رکھتی ہو۔ ہماری زبان میں یہ دونوں صفتیں ہیں مگر ناتمام ہیں اور اس کے سبب ظاہر ہیں۔

علمی مطالب ادا کرنے کے سامانوں میں جو وہ مفلس ہے' اس کا سبب یہ ہے کہ تم جانتے ہو کل ڈیڑھ سو برس تخمیناً اس کی ولادت کو ہوئے۔ اس کا نام "اردو" خود کہتا ہے: کہ میں علمی نہیں' بازار کی زبان ہوں۔ اُٹھتے بیٹھتے' لین دین کی باتوں کے لیے کام میں آتی ہوں۔ سلاطین چغتائیہ کے وقت تک اس میں تصنیف و تالیف کا رواج نہ تھا' مگر خدا کی قدرت دیکھو کہ ایک بچہ شاہجہاں کے گھر میں پیدا ہوا اور انگریزی اقبال کے ساتھ اس کا ستارہ چمکا۔ جب صاحب لوگ یہاں آئے تو انہوں نے ملکی زبان کو سمجھ کر اس کے سیکھنے کا ارادہ کیا' مگر سوائے چند دیوانوں کے اس میں نثر کی کتاب تک نہ تھی۔ ان کی فرمائش سے کئی کتابیں کہ فقط افسانے اور داستانیں تھیں' تصنیف ہوئیں اور انہیں کے ڈھب کی صرف و نحو بھی درست ہوئی۔ 1835ء سے دفتر بھی اردو ہونے شروع ہوئے۔ 1836ء میں ایک اردو اخبار جاری ہوا۔ 1842ء سے دہلی کی سوسائٹی میں علمی کتابیں اسی زبان میں ترجمہ ہونے لگیں' اور اردو نے برائے نام زبان کا تمغہ اور سکہ پایا۔ اب خیال کرنا چاہیے کہ جس کی تصنیفی عمر کل 72-70 سال کی ہو' اس کی بساط کیا اور اس کے الفاظ کے ذخیرے کی کائنات کیا۔ پس اس وقت ہمیں اس کی کمی الفاظ سے دل شکستہ نہ ہونا چاہیے۔

میرے دوستو! کسی زبان کو لفظوں کے اعتبار سے مفلس یا صاحب سرمایہ کہنا بے جا ہے۔ ہر زبان اہل زبان کے باعلم ہونے سے سرمایہ دار ہوتی ہے' اور کسی ملک والے کا یہ کہنا کہ علمی تصنیف یا بات چیت میں اپنے ہی ملک کے الفاظ بولیں' بالکل بے جا ہے۔

عربی زبان بھی ایک علمی زبان تھی' مگر دیکھ لو' اس میں سارے لفظ تو عربی نہیں۔ صدہا رومی' صدہا یونانی' صدہا فارسی کے الفاظ ہیں' وغیرہ وغیرہ۔ اور زبان فارسی کا تو کچھ ذکر نہیں' انگریزی زبان آج علوم کا سرچشمہ بنی بیٹھی ہے' مگر اس میں بھی غیر زبانوں کے لفظوں کا طوفان آ رہا ہے۔ زبان کا قاعدہ یہ ہے کہ پہلے اہل ملک میں علم آتا ہے' پھر علمی اشیاء کے لیے الفاظ یا تو اس علم کے ساتھ آتے ہیں یا وہیں ایجاد ہو جاتے ہیں۔ علمی الفاظ کا ذخیرہ خدا نے بنا کر نہیں بھیجا' نہ کوئی صاحب علم پہلے سے تیار کر کے رکھ گیا ہے؛ جیسے جیسے کام اور چیزیں پیدا ہوتی گئیں' ویسے ہی ان کے الفاظ پیدا ہوئے اور ہوتے جاتے ہیں۔ اول خاص و عام میں علم پھیلتا ہے' ساتھ ہی اس کے الفاظ بھی عام ہوتے ہیں۔ مثلاً ریل کا انجن اور اسکے ساتھ کارخانے کے صدہا الفاظ ہیں کہ پہلے یہاں کوئی نہیں جانتا تھا۔ جب وہ کارخانے ہوئے تو اونیٰ اونیٰ ناخواندے سب جان گئے۔ اگرچہ بے اس کے وہ الفاظ یہاں ڈھونڈتے' یا پہلے یاد کرواتے تو کسی کی سمجھ میں بھی نہ آتے۔ اسی طرح مثلاً میجک لینٹرن اس وقت یہاں کوئی نہیں جانتا۔ خواہ اس کا وہی نام لیں' خواہ فانوس جادو کہیں' خواہ اچنبھے کا تماشہ کہیں' ہرگز کوئی نہیں سمجھے گا۔ لیکن اگر وہ مشاہدے میں عام ہو جائے اور گھر گھر میں جاری ہو جائے تو الٹے سے الٹا اس کا نام رکھ دیں' وہی بچے بچے کی زبان پر مشہور ہو جائے گا اور وہی سب سمجھیں گے۔ انگریزی میں جو علمی الفاظ ہیں' مثلاً ٹیلی گراف' یا الیکٹریسٹی وغیرہ وغیرہ' ان میں بھی بہت سے الفاظ ایسے ہیں کہ وہ اپنے اصل معانی پر پوری دلالت نہیں کرتے۔ مگر چونکہ ملک میں علم عام ہے اور وہ چیزیں عام ہیں' اس لیے الفاظ مذکور بھی ایسے عام ہیں کہ سب بے تکلف سمجھتے ہیں۔ پس لفظوں کی کوتاہی ہماری زبان میں اگر ہے تو اس سبب سے ہے کہ وہ بے علمی کے عہد میں پیدا ہوئی اور اسی عہد میں پرورش اور تربیت پائی۔ اب اس کی تدبیر ہو سکتی ہے تو اہل ملک ہی سے ہو سکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ خود علوم و فنون حاصل کرو' اپنے

ملک میں پھیلاؤ اور بھائی ہندوں کو اس سے آگاہ کرو۔ جب اس میں سب قسم کے کاروبار ہوں گے تو ان کے الفاظ بھی ہوں گے۔ ملک کے افلاس کے ساتھ زبان سے بھی افلاس کا داغ مٹ جائے گا۔

تمہاری انشاء پردازی پر جو نقص کا الزام ہے' وہ بھی کچھ درست ہے اور کچھ قابل چشم پوشی کے ہے۔ یہ تو ابھی بیان ہوا کہ زبان مذکور علمی زبان نہیں۔ سو برس ہوئے کہ ہندوستان کے رنگین مزاجوں نے فقط اس حب الوطنی سے کہ ہماری زبان بھی اور زبانوں کی طرح نظم سے خالی نہ ہو' اس میں اپنی مرصع کاری اور نقش و نگاری دکھانی شروع کی' اور حق یہ ہے کہ 1215ھ تک جو کچھ زور اس نے پایا' انہی کی بدولت پایا۔ انشاء پردازی کا قاعدہ ہے کہ ابتداء میں جو مطالب کسی زبان میں ادا ہوتے ہیں تو ان میں سیدھی سادی تشبیہیں اور قریب قریب کے استعارے خرچ ہوتے ہیں۔ اسی واسطے جو مطالب اس میں ادا کیے جاتے ہیں وہ سنتے ہی سمجھ میں آجاتے ہیں' کیونکہ ان کے پاس پاس کے استعارے اور ان چیزوں کی تشبیہیں' جو آنکھوں کے سامنے ہمارے آس پاس موجود ہیں' وہ فقط مطلب مذکور کو سمجھاتے ہی نہیں بلکہ اپنی رنگینی اور لطافت سے اس کے لطف کو روشن کر کے دکھاتے ہیں۔ اور چونکہ سادگی اور آسانی کے سبب سے انہیں سب سمجھتے ہیں' اس لیے سب کے دل اس کی تاثیر سے اثر پذیر ہوتے ہیں۔ چند روز کے بعد قریب قریب کی تشبیہیں اور استعارے تو خرچ ہو جاتے ہیں اور آس پاس کی تشبیہیں عام تام ہو کر تمام ہو جاتی ہیں۔ نئی نسلیں دستمال تشبیہوں اور استعاروں کو برتنا چبائے ہوئے نوالے کا چبانا سمجھتی ہیں۔ لیکن علم اور مشق' جو مختلف رستوں سے آگاہ کر دیتے ہیں' اس لیے ان کے فکر کبھی دائیں بائیں پھیلتے ہیں اور کبھی بلند ہونا شروع کرتے ہیں' اور دور دور ہاتھ بڑھاتے ہیں۔ فارسی اور اردو زبان میں جو کیفیت اس کی گزری ہے' اس وقت اسی کا اشارہ کرتا ہوں کہ شعراء نے مستعمل استعاروں سے بچنے کے لیے استعارہ در استعارہ نکالا اور اسے ایک ایجاد دلپذیر تصور کر کے نازک خیالی نام رکھا۔ چونکہ دنیا میں ہر ایک نئی چیز بہت مزہ دیتی ہے اس لیے اوروں نے بھی اسے پسند کیا' اور علم کی مشکل پسندی نے اسے زیادہ قوت دی' اور یہ معاملہ روز بروز زور پکڑتا گیا۔ چنانچہ ان

بلند خیالوں میں دنیا کے کاروبار' مثلاً خط و کتابت یا تاریخی مقاصد یا علمی مقاصد یا علمی مطالب کا ادا کرنا تو بہت دشوار تھا' مگر ایک فرقہ پیدا ہوا جنھوں نے خیال بند کا خطاب حاصل کیا۔ ان ہی کی نثر میں پنج رقعہ' مینا بازار' چار عنصر وغیرہ اور نظم میں جلال اسیر' قاسم مشہدی' بیدل' ناصر علی اور ان کے مقلدوں کے دیوان موجود ہیں۔ چنانچہ دونوں کے امتیاز کے لیے دو شعر بھی اس مقام پر لکھتا ہوں۔ پہلے طریقے میں ایک استاد کہتا ہے:

سحر خورشید لرزاں بر سر کوئے تو می آید
دل آئینہ را نازم کہ بر روئے تو می آید

دیکھو ناصر علی سرہندی اسی مضمون کو اپنی نازک خیالی کے زور سے الگ کرتے ہیں:

نیارد چشم بیدل تاب حسن بے حجابش را
کہ باشد صافی آئینہ شبنم آفتابش را

چوں کہ اردو نے فارسی کا دودھ پی کر پرورش پائی تھی' اس لیے چند روز کے بعد یہی دقت اسے بھی پیش آئی۔ میر سوز' میر تقی' سودا' جرات وغیرہ کے زمانے تھے۔ ان میں اگرچہ مضامین شاعرانہ تھے' مگر زبان میں ابتدائی خوبی موجود تھی۔ بعد ان کے وہی استعاروں کے ایچ پیچ اور خیالوں کی معمولی ترقی شروع ہوئی۔ البتہ خال خال آدمی ایسے تھے جو بزرگوں کی تقلید سے صفائی اور سادگی کی لکیر پر فقیر رہے۔ مثلاً قدما میں خواجہ میر درد کہتے ہیں:

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں

متاخرین میں غالب نازک خیال اس سے الگ ہو کر کہتے ہیں:

دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک
میرا سر دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

بہر حال ہمیں ممنون ہونا چاہیے کہ جو کچھ لطافت یا زور ہماری زبان میں پیدا ہوا'

انھی شعراء کی برکت سے ہوا۔ مگر وہ عاشقانہ مضامین کے ادا کرنے کے سامان اور تغزل کے خوشنما انداز اور اس کے الفاظ اور ترکیبوں کی دل آویز تراشیں تھیں۔ بھلا خیالات فلسفہ کے سامان، علوم کی اصطلاحیں، مختلف مضامین تاریخی کے ادا کرنے کی طاقت، دلائل و براہین کے لڑانے کے زور اس میں کہاں سے آتے؟ اگرچہ ابتدا میں جو کچھ تھا یہ رنگ بہت خوشنما تھا، مگر اب دیکھتا ہوں تو زمانے کے انداز نے اسے بھی پھیکا کر دیا ہے۔ اور تمھاری انشاء پردازی کا یہ حال ہو گیا ہے کہ غیر قومیں تو جو کچھ کہیں بجا ہے، میں خود دیکھتا ہوں اور شرماتا ہوں، کیونکہ مستعمل چیز میں شگفتگی اور تازگی دکھائی بہت مشکل ہے۔ پھر بھی خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ ایک خزانہ مصوری کا تمھارے ہاتھ آ گیا ہے۔ مگر اتنا ہے کہ وہ انگریزی قفلوں میں بند ہے۔ جس کی کنجی انگریزی زبان ہے۔

اس سے میرا یہ مطلب نہیں کہ جس طرح ہم فارسی، عربی کے الفاظ اردو میں بولتے ہیں، اسی طرح انگریزی الفاظ بولنے لگیں یا ان کے محاوروں اور اصطلاحوں کے ترجمے اردو میں استعمال کرنے لگیں، لیکن تم خیال کرو کہ عبارت اور الفاظ حقیقت میں انسان کے خیالات اور مقاصد کے لباس ہیں، اور چونکہ طبعی خیالات فرقہ ہائے انسان کے ہمیشہ قریب قریب ہوتے ہیں، اس لیے وہ جس ملک میں چاہیں رنگ ظہور دکھائیں، اصلیت میں کچھ نہ کچھ ملتے جلتے ہی ہوں گے، بلکہ ان میں بعض ڈھنگ ایسے ہوں گے کہ ذرا رنگ پلٹ کر چاہیں گے تو دوسری طرف آ جائیں گے اور نئی بہار دکھلائیں گے۔ چنانچہ جب بہ نظر غور دیکھیں گے تو معلوم ہو گا کہ دو قوموں کے ارتباط سے ہمیشہ ایک زبان دوسری زبان سے پر تولتی رہی ہے۔ دیکھو لو بھاشا پر جب فارسی عربی آ کر گری تو اس کا کیا اثر ہوا، اور اب انگریزی کیا اندرونی اثر کر رہی ہے۔ فارسی اردو میں تم نے وقت کے باب میں دیکھا ہو گا کہ زمانے یا زندگی کو عمر رواں یا آب گزراں کہتے ہیں۔ اسی طرح کہتے ہیں کہ زمانہ عمر کی کھیتی کو یا رسن عمر کو کاٹ رہا ہے۔ اور یہ بھی کہ:

گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں

اسی طرح غصے کے باب میں دیکھا ہو گا کہ اسے آتش غضب کہہ کر آگ سے تعبیر

کرتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ "ہمچو مار سیاہ بر خود پیچید" اور کبھی جوش غضب کے لیے کہتے ہیں کہ "آتش از چشمش پرید' دود از نہادش بر آمد" اور "ہمچو سپند از جا بر جست" پس انگریزی میں متھالیجی ایک خاص علم ہے کہ اس میں ان سب قوتوں یا جذبوں کو ایک ایک مجسم دیبی یا دیوتا مقرر کیا ہے' اور ان ہی سامانوں سے سجایا ہے جو ان کے لیے لازم اور شایان شان ہیں۔ چنانچہ :

وقت :

ایک پیر کہن سال کی تصویر ہے' اس کے بازوؤں میں پریوں کی طرح پر پرواز لگے ہیں کہ گویا ہوا میں اڑتا چلا جاتا ہے۔ ایک ہاتھ میں شیشہ ساعت ہے کہ جس سے اہل عالم کو اپنے گزرنے کا انداز دکھاتا جاتا ہے اور ایک میں درانتی ہے کہ لوگوں کی کشت اُمید یا رشتہ عمر کو کاٹتا جاتا ہے۔ یا ظالم خون ریز ہے کہ اپنے گزرنے میں ذرا رحم نہیں کرتا۔ اس کے سر پر ایک چوٹی بھی رکھی ہے کہ جو دانا ہیں اسے پکڑ کر قابو میں کر لیتے ہیں۔ لیکن اوروں کی چوٹیاں پیچھے ہوتی ہیں' اس کی چوٹی آگے رکھی ہے۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ جو وقت گزر گیا وہ قابو میں نہیں آسکتا۔ ہاں جو پیش بیں ہو وہ پہلے ہی سے روک لے۔

غصہ :

ایک عورت ہے : کالا رنگ' ڈراؤنی صورت' تمام بدن پر بال کھڑے ہیں' جیسے لوہے کی سلاخیں' سر پر اور بازوؤں پر ہزاروں سانپ پھن اُٹھائے لہرا رہے ہیں' اور آنکھوں سے خون برستا ہے۔

بعض تصویروں میں اس کے دو پر ہیں کہ اڑائے لیے جاتے ہیں' اور اس کے ہاتھ میں شعلہ آتش ہے کہ دم بدم بھڑکتا چلا جاتا ہے' اور ایک ہاتھ میں خون ریزی کا برچھا ہے۔

عشق :

ایک موقع پر اسے نوجوان، خوبصورت لڑکا فرض کیا ہے کہ خوش ہے اور اپنے عالم میں اچھلتا کودتا ہے، مگر آنکھوں سے اندھا رکھا ہے۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ بھلائی برائی کو نہیں سوچتا۔
کبھی ایک جوان آدمی بنایا ہے اور ہاتھ میں چڑھی ہوئی کمان میں تیر جوڑ رکھا ہے کہ جدھر چاہتا ہے مار بیٹھتا ہے، اس کی پناہ نہیں۔
ایک موقع پر ایسی تصویر کھینچی ہے کہ پہلو میں تیروں کا ترکش لٹکتا ہے اور ہاتھ سے تیر کا پیکان سان پر تیز کر رہا ہے۔
یہ تصویر ایک ہیرے پر کھدی ہوئی ہاتھ آئی تھی، خدا جانے کس عہد میں کھدی ہوگی اور کیا طلسم اس میں باندھا ہوگا۔

افواہ یا شہرت :

اس کی تصویر دیکھی : ایک بڑھیا عورت ہے، اس کے تمام بدن پر زبانیں ہی زبانیں ہیں۔ پہلے اس کے منہ میں زبان ہلتی ہے، ساتھ ہی ساتھ ساری زبانیں سانپوں کی طرح لہرانے لگتی ہیں۔ اشارہ یہ ہے کہ جو بات اس کی زبان سے نکلتی ہے، وہی عالم میں ایک ایک کی زبان پر آتی ہے۔

حُسن کی پری :

سمندر کے کف سے پیدا ہوئی ہے۔ شاید اس سے جوش و خروش کے ساتھ اس کی لطافت اور نزاکت کا بھی اشارہ ہو۔ وہ خود بھی محبت رکھتی ہے مگر لڑائی کے دیوتا پر عاشق ہے۔ جس کو وہ نصیب ہو جائے وہ اس کے پرتو جمال سے کامیاب ہو۔ پھولوں میں مہندی، گلاب، سیب، لالہ، نافرمان وغیرہ سے اس کی درگاہ میں نذر چڑھتی ہے۔ فاختہ، ہنس، ابابیل، ہدہد، وغیرہ اس کے تخت کو اڑاتے ہیں۔ خوشبوؤں کی دھونی اور پھولوں کا

ہار اس کا متبرک چڑھاوا ہے۔ انگریزی میں انھیں گاڈز کہتے ہیں' اور ہر ایک جذبہ انسانی بلکہ خزاں اور بہار اور موسیقی وغیرہ کے لیے مختلف گاڈز تیار کئے ہیں۔ زمانے کی گردشوں نے ہمارے علوم کو مٹا دیا' اس لیے آج یہ باتیں نئی معلوم ہوتی ہیں' ورنہ سنسکرت میں بھی اکثر اشیاء کے لیے ایک ایک دیبی یا دیوتا ہیں۔

مسلمانوں کے دماغ بھی اس خیال سے خالی نہیں تھے ان کی تصنیفات میں فلاسفہ کا قول منقول ہے کہ اگر ایک مور کے پر کو دیکھیں' اور اس کے صنائع بدائع پر نظر کریں' تو عقل حیران ہوتی ہے کہ کون سا صانع ہو گا جو ایسی دستکاری کر سکے۔ پھر مور کے تمام جسم کو دیکھو اور اسی نسبت سے عالم موجودات اور اس کے جزئیات کو دیکھو کہ پھر جب دیکھتے ہیں "الواحد لا یصدر عنہ الا الواحد" یعنی ایک فاعل سے ایک وقت میں ایک ہی کام ہو سکتا ہے' تو ضروری ہے کہ کائنات کے مختلف کارخانوں کے لیے ایک ایک رب النوع فرض کیا جائے' جو اپنے اپنے کارخانے کا سربراہ ہو' اور سب کا مالک رب الارباب جامع جمیع صفات کمال۔ اہل شریعت نے اسی کو ہر ایک سلسلے کا ایک فرشتہ موکل مانا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ فقط زبان کا فرق ہے ورنہ دیبی یا دیوتا وہی گاڈز' وہی رب النوع' وہی فرشتہ موکل۔ یہ خیال مدت سے دل میں کھٹکتا تھا' چند روز ہوئے کہ شاہ ایران نے جو سفر نامہ یورپ کا آپ لکھا ہے' وہ میری نظر سے گزرا۔ فرانس کے معنی آفرینوں نے ایک جگہ باغ رنگین میں ایک نقلی پہاڑ بنایا ہے اور اس پر بہار کی گاڈس سجائی ہے۔ چنانچہ شاہ نے وہاں پہنچ کر اسے دیکھا اور اپنے بیان میں اسے رب النوع ہی لکھا ہے۔

غرض یہ ہے کہ خیالات کے اتفاقوں کو غور سے دیکھو کہ فقط طبیعت کی تاثیر ہے جس نے مختلف ملکوں میں مختلف طور پر طبیعتوں کے جوش ظاہر کیے ہیں' مگر سب کا راستہ کسی قدر قریب قریب ہو کر نکلا ہے اور اس میں بھی شک نہیں کہ جب ایک جذبہ موہوم کو مجسم فرض کرتے ہیں اور اس کی صفات اور لوازمات کو آنکھوں کے سامنے سجاتے ہیں' تو اس پر طبیعت کی تاثیر پوری پوری قائم ہوتی ہے' اور جو خیالات اس پر نکلتے ہیں' ٹھیک درستی کے ساتھ ہوتے ہیں' اور برجستہ الفاظ میں ادا ہوتے ہیں کہ یہی

انشاء پردازی کا ایمان ہے۔ خلاصہ مطلب یہ ہے کہ اگر ہمارے پہلے انداز پرانے اور مستعمل ہو گئے' تو ہمیں چاہیے کہ انگریزی باغ میں سے نئے پودے لے کر اپنا گلزار سجائیں' البتہ دونوں زبانوں میں ایسی مہارت ہونی چاہیے کہ یہ تصرف خوبصورتی کے ساتھ ہو سکے' جیسا کہ ابتدا میں ہماری اردو فارسی کے انشاء پرداز کر گئے۔ اور پھر کہتا ہوں کہ یہ مطلب جب کبھی ہو گا' ان انگریزی دانوں سے ہو گا جو دونوں زبانوں میں پوری مہارت رکھتے ہوں گے' کیونکہ ان کی دو آنکھیں روشن ہیں۔ اردو اپنی زبان ہے' اور انگریزی کنجی خدا نے دی ہم اور ہمارے ساتھی' پرانی لکیروں کے فقیر' جو کچھ کرنا تھا سو کر چکے۔ نہ ان میدانوں میں اب ہم سے کچھ ہو سکے۔ چقماق کے دونوں جزوں کو ٹکراؤ کہ آگ نکلے۔ اون اور شیشے کو رگڑو کہ الیکٹریسٹی کے فوائد حاصل ہوں۔ لیکن فقط پتھر ہو تو پتھر ہی ہے اور فقط شیشہ ڈر کا گھر۔ اپنی زبان کے زور سے اس میں اس طرح جان ڈالو کہ ہندوستانی کہیں سودا اور میر کے زمانے نے عمر دوبارہ پائی۔ اس پر انگریزی روغن چڑھا کر ایسا خوش رنگ کرو کہ انگریز کہیں : ہندوستان میں شیکسپیئر کی روح نے ظہور کیا۔

آغاز آفرینش میں باغ عالم کا کیا رنگ تھا اور رفتہ رفتہ کیا ہو گیا

سیر کرنے والے گلشن حال کے اور دوربین لگانے والے ماضی و استقبال کے روایت کرتے ہیں کہ جب زمانے کے پیراہن پر گناہ کا داغ نہ لگا تھا' اور دنیا کا دامن بدی کے غبار سے پاک تھا تو تمام اولاد آدم مسرت عام اور بے فکری مدام کے عالم میں بسر کرتی تھی۔ ملک ملک فراغ تھا' اور خسرو آرام رحمدل' فرشتہ مقام گویا ان کا بادشاہ تھا۔ وہ نہ رعیت سے خدمت چاہتا تھا' نہ کسی سے خراج باج مانگتا تھا۔ اس کی اطاعت و فرمانبرداری اسی میں ادا ہو جاتی تھی کہ آرام کے بندے قدرتی گلزاروں میں گلگشت کرتے تھے' ہری ہری سبزے کی کیاریوں میں لوٹتے تھے' آب حیات کے دریاؤں میں نہاتے تھے۔ ہمیشہ وقت صبح کا اور سدا موسم بہار کا رہتا تھا۔ نہ گرمی میں تہہ خانے سجانے پڑتے' نہ سردی میں آتش خانے روشن کرتے۔ قدرتی سامان اور اپنے جسموں کی قوتیں ایسی موافق پڑی تھیں کہ جاڑے کی سختی یا ہوا کی گرمی معلوم ہی نہ ہوتی تھی۔ ٹھنڈے اور میٹھے پانی نہروں میں بہتے تھے۔ چلتے چشموں پر لوگ جھکتے اور منہ لگا کر پانی پیتے تھے۔ وہ شربت سے سوا مزہ' دودھ سے زیادہ قوت دیتے تھے۔ جسمانی طاقت قوت ہاضمہ کے ساتھ رفیق تھی۔ بھوک نے ان کی اپنی ہی زبان میں ذائقہ پیدا کیا تھا کہ سیدھے سادھے کھانے اور جنگلوں کی پیداواریں' رنگا رنگ نعمتوں کے مزے دیتے تھے۔ آب و ہوا قدرتی غذائیں تیار کر کے زمین کے دسترخوان پر چن دیتی تھی۔ وہ ہزار مقوی اور مفرح کھانوں کے کام دیتی تھی۔ صبا و نسیم کی شمیم میں ہوائی خوشبوؤں کے عطر مہک

رہے تھے۔ بلبلوں کے چہچے' خوش آواز جانوروں کے زمزمے سنتے تھے۔ خوبصورت خوبصورت چرند پرند آس پاس کلیل کرتے پھرتے تھے۔ جابجا درختوں کے جھرمٹ تھے' انھی کے سایے میں سب چین سے زندگی بسر کرتے تھے۔ یہ عیش و آرام کے قدرتی سامان اس بہتات سے تھے کہ ایک شخص کی فراوانی سے دوسرے کے لیے کمی نہ ہوتی تھی اور کسی طرح ایک سے دوسرے کو رنج نہ پہنچتا تھا۔ سب کی طبیعتیں خوشی سے مالامال اور دل فارغ البال تھے۔

دیکھو اب انسان کی نیت میں فرق آتا ہے
اور کیا جلد اس کی سزا پاتا ہے:

اتفاقاً ایک میدان وسیع میں تختہ پھولوں کا کھلا کہ اس سے عالم مہک گیا' مگر بو اس کی گرم اور تیز تھی۔ تاثیر یہ ہوئی کہ لوگوں کی طبیعتیں بدل گئیں' اور ہر ایک کے دل میں خود بخود یہ کھٹک پیدا ہوئی کہ سامان عیش و آرام کا جو کچھ ہے' میرے ہی کام آئے' اور کے پاس نہ جائے۔ اس غرض سے اس گلزار میں گلگشت کے بہانے کبھی تو فریب کے جاسوس اور کبھی سینہ زوری کے شیاطین آکر چالاکیاں دکھانے لگے۔ پھر تو چند روز کے بعد کھلم کھلا ان کی ذریات یعنی غارت' تاراج' لوٹ مار آن پہنچے اور ڈاکے مارنے لگے۔ جب راحت و آرام کے سامان یوں پیدا ہونے لگے تو رفتہ رفتہ غرور' خود پسندی' حسد نے اس باغ میں آکر قیام کر دیا۔ ان کے اثر صحبت سے لوگ بہت خراب ہوئے' کیونکہ وہ اپنے ساتھ دولت کا پیمانہ لائے۔ پہلے تو خدائی کارخانے فارغ البالی کے آئین اور آزادی کے قانون کے بموجب کھلے ہوئے تھے' یعنی عیش وافر اور سامان فراواں' جو کچھ درکار ہو' موجود تھا اور اسی بے احتیاطی کو لوگ تونگری کہتے تھے۔ پھر یہ سمجھنے لگے کہ اگر ہمارے پاس ہر شے ضرورت سے زیادہ ہو اور ہمیں اس کی حاجت بھی ہو یا نہ ہو' لیکن تونگر ہم جبھی ہوں گے جب کہ ہمسایہ ہمارا محتاج ہو۔ ہر چند اس بے چارے ضرورت کے مارے کو خرچوں کی کثرت اور ضرورتوں کی شدت سے زیادہ سامان لینا پڑا ہو' مگر انھیں جب ہمسائے خوش حال نظر آتے تھے تو جل جاتے تھے' اور اپنے تئیں محتاج خیال

کرتے تھے۔

جہاں لوٹ مار اور غارت و تاراج کا قدم آئے'
وہاں احتیاج و افلاس نہ ہو تو کیا ہو:

اس بدنیتی کی سزا یہ ہوئی کہ احتیاج و افلاس نے بزرگانہ لباس پہنا اور ایک پیر زادہ بن کر آئے۔ حضرت انسان کہ طمع خام کے خمیر تھے' خسرو آرام کی عقیدت کو چھوڑ کر ان کی طرف رجوع ہوئے۔ چنانچہ سب ان کے مرید اور معتقد ہو گئے اور ہر شخص اپنے تئیں حاجت مند ظاہر کر کے فخر کرنے لگا۔ مقام افسوس یہ ہے کہ اس بدنیت 'نحس قدم کے آنے سے ملک فراغ کا رنگ بالکل بدل گیا' یعنی انواع و اقسام کی حاجتوں نے لوگوں کو آن گھیرا۔ سال میں چار موسم ہو گئے' زمین بنجر ہو گئی' میوے کم ہونے لگے' ساگ پات اور موٹی قسم کے نباتات پر گزران ٹھہری۔ خزاں کے موسم میں کچھ برے بھلے اناج بھی پیدا ہونے لگے' لیکن جاڑے نے بالکل ناچار کر دیا۔ کبھی کبھی قحط سالی کا ٹڈی دل چڑھ آتا۔ اسی لشکر میں وبا اور امراض کے غول' بیماریاں اپنے ساتھ لے کر آتے اور تمام ملک میں پھیل جاتے۔ غرض عالم میں ایسا تہلکہ پڑا کہ اگر ملک فراغ کے انتظام میں نئی اصلاح نہ کی جاتی تو یک قلم برباد ہو جاتا۔ سب دکھ تو سہہ سکتے تھے مگر قحط کی مصیبت غضب تھی۔ چونکہ یہ ساری نحوستیں احتیاج اور افلاس کی نحوست سے نصیب ہوئی تھیں' اس لیے سب اپنے کیے پر بہت پچھتائے۔

اب پچھتانے سے کیا حاصل ہے' ہاں ہمت کرو
اور محنت پر کمر باندھو:

عالم کا رنگ' بے رنگ دیکھ کر تدبیر اور مشورہ دو تجربہ کار دنیا سے کنارہ کش ہو گئے تھے' اور ایک سیب کے درخت میں جھولا ڈالے' الگ باغ میں جھولا کرتے تھے۔ البتہ جو صاحب ضرورت ان کے پاس جاتا' اسے صلاح مناسب بتا دیا کرتے تھے' یہ سب مل کر ان کے پاس گئے کہ برائے خدا کوئی ایسی راہ نکالیے جس سے احتیاج و افلاس کی بلا سے

بندگان خدا کو نجات ہو۔ وہ بہت خفا ہوئے اور کہا کہ اپنے کیے کا علاج نہیں۔ خسرو آرام ایک فرشتہ سیرت بادشاہ تھا، تم نے اس کا حق شکرانہ ادا نہ کیا اور اس آفت کو اپنے ہاتھوں سر پر لیا۔ یہ افلاس ایسی بری بلا ہے کہ انسان کو بے کس اور بے بس کر دیتی ہے۔ مانگے تانگے کے سوا خود اس کا کچھ پیشہ نہیں۔ دیکھو! اسی نے ملک فراغ کو کیسا تباہ کر دیا ہے کہ دلوں کے باغ ہرے بھرے ویران ہوئے جاتے ہیں۔ اب اس کے نکلنے کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی، مگر یہ کہ ہم نے سنا ہے، احتیاج و افلاس کا ایک بیٹا بھی ہے جس کا نام محنت پسند خرد مند ہے۔ اس کا رنگ ڈھنگ کچھ اور ہے، کیونکہ اس نے امید کا دودھ پیا ہے، ہنر مندی نے اسے پالا ہے، کمال کا شاگرد ہے، ہو سکے تو جا کر اس کی خدمت کرو۔ اگرچہ اسی کا فرزند ہے، لیکن اول تو سلطنت کا مقدمہ درمیان ہے، دوسرے ماں کے دودھ کا زور اس کے بازوؤں میں ہے، استاد کی پھرتی اور چالاکی طبیعت میں ہے، شاید کچھ کر گزرے۔ تدبیر اور مشورے کا سب نے شکریہ ادا کیا اور سیدھے محنت پسند خرد مند کے سراغ پر آئے۔ دامن کوہ میں دیکھا کہ ایک جوان، قوی ہیکل کھڑا ہے۔ چہرہ اس کا ہولے جھریایا ہوا، دھوپ سے تمتمایا ہوا، مشقت کی ریاضت سے بدن اینٹھا ہوا، پسلیاں ابھری ہوئی، ایک ہاتھ میں کچھ کھیتی کا سامان اور ایک ہاتھ میں معماری کے اوزار لیے ہانپ رہا ہے، اور ایسا معلوم ہوا کہ ابھی ایک برج کی عمارت[1] کی بنیاد ڈالی ہے۔ سب نے جھک کر سلام کیا اور ساری داستان اپنی مصیبت کی سنائی۔

وہ انہیں دیکھتے ہی ہنسا اور ایک قہقہہ مار کر پکارا کہ آؤ انسانو! نادانو! آرام کے بندو، عیش کے پابندو! آؤ آؤ! آج سے تم ہمارے سپرد ہوئے۔ اب تمہاری خوشی کی امید اور بچاؤ کی راہ اگر ہے تو ہمارے ہاتھ ہے۔ خسرو آرام ایک کمزور، کام چور، بے ہمت، کم حوصلہ، بھولا بھالا، سب کے منہ کا نوالا تھا، نہ تمہیں سنبھال سکا، نہ مصیبت سے نکال سکا، بیماری اور قحط سالی کا ایک ریلا بھی نہ ٹال سکا۔ پہلے ہی حملے میں تمہیں چھوڑ دیا اور ایسا بھاگا کہ پھر مڑ کر نہ دیکھا۔ سلطنت کو ہاتھ سے کھویا اور تم کو منجھ دھار میں ڈبویا۔ آج سے تم ہماری خدمت میں حاضر رہو اور ہماری آواز پر آیا کرو۔ ہم تمہیں ایسی ایسی تدبیریں سکھائیں گے جس سے یہ شوریت زمین کی دور ہو جائے گی، ہوا کی شدت اعتدال پائے

گی گرمی سے سردی کی خوراک نکل آئے گی۔ ہم تمہارے لیے پانی سے مچھلی ٗ ہوا سے پرندے ٗ جنگل سے چرندے نکالیں گے۔ زمین کا پیٹ چاک کر ڈالیں گے اور پہاڑوں کی انتڑیاں نکال لیں گے۔ ایسے ایسے دھات اور جواہرات دیں گے کہ تمہارے خزانوں کے لیے دولت ہو ٗ ہاتھوں میں طاقت ہو اور بدن کی حفاظت ہو۔ زبردست حیوانوں کے شکار کرو گے اور ان کے آزاروں سے محفوظ رہو گے۔ جنگل کے جنگل کاٹ ڈالو گے ٗ پہاڑ کے پہاڑ اکھاڑو گے۔ تم دیکھنا ٗ میں زمانے کو وابستہ تدبیر اور تمام عالم کو اپنے ڈھب پر تسخیر کر لوں گا۔ غرض ان باتوں سے سب کے دلوں کو لبھالیا۔ وہ بھی سمجھے کہ محنت پسند خردمند بنی آدم کا خیر خواہ اور ہمارا دلی دوست ہے۔ ہاتھ جوڑ جوڑ اس کے پاؤں پر گرے۔ ہمت اور تحمل اس کے پہلو میں کھڑے تھے ٗ اسی وقت انھیں جماعت مذکور پر افسر کر دیا۔

اے حضرت انسان! قدرتی گلزاروں کی بہار تو دیکھ چکے ٗ
اب اپنی دستکاریوں کی گل کاری دیکھو:

الغرض ہمت اور تحمل ان سب کو جنگلوں اور پہاڑوں میں لے گئے۔ کانوں کا کھودنا ٗ اتار چڑھاؤ کا ہموار کرنا ٗ تالابوں سے پانی سینچنا ٗ دریاؤں کی دھاروں کا رخ پھیرنا سب سکھایا۔ لوگوں کے دلوں پر اس کی بات کا ایسا اثر ہوا تھا کہ سب دفعتہً کمریں باندھ ٗ آنکھیں بند کر ٗ دیمک کی طرح روئے زمین کو لپٹ گئے۔

عالم صورت چند روز میں رنگ نکال لایا مگر نئے ڈھنگ سے ٗ یعنی ساری زمین ٗ شہر ٗ قصبوں اور گاؤں سے بھر گئی۔ کھیت اناج سے اور باغ میووں سے مالا مال ہو گئے۔ شہروں میں بازار لگ گئے ٗ عمارتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں ٗ گھر آباد ہو گئے۔ جدھر دیکھو ٗ ڈالیوں اور گلزاروں میں میوے دھرے ٗ دستر خوان گھروں میں سجے ٗ ذخیرے غلوں سے بھرے ٗ کیا گھر کیا باہر ٗ اس کے سوا اور کچھ نظر ہی نہ آتا تھا۔ غرض محنت پسند خردمند نے اس فرماں بردار رعیت کی بدولت یہ کامیابیاں اور فتوحات نمایاں حاصل کر کے سلطان محنت پسند کا لقب حاصل کیا ٗ اور جابجا ملک اور شہر قائم کر کے اپنی سلطنت

جمائی۔

اے محنت کشو! محنت کی بھی ایک حد ہے،
آخر ایسا تھکو گے کہ گر پڑو گے:

سلطان محنت پسند اپنے ملک میں ہمیشہ دورہ کرتا رہتا تھا۔ اتفاقاً اس کی سواری ایک کوہستان میں گزری۔ وہاں میووں کی بہتات' پانی کے چشمے جیسے آب حیات' ہرے ہرے سبزے' درختوں کے سائے' ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں' خوبصورت خوبصورت جانور کلیلیں کر رہے تھے۔ یہ جگہ بہت بھائی' چاہا کہ کوئی دم ٹھہرے اور دم لے۔ اتفاقاً وہاں ایسی ایک قوم سے سامنا ہو گیا جن کی کثرت وانبوہ کا کچھ ٹھکانا نہ تھا' مگر سب کے سب ضعف وناطاقتی سے زمین سے بچھے جاتے تھے۔ ان میں تھکن اور سستی کی وبا پھیلی ہوئی تھی اور ناتوانی ان پر سردار تھی' صورت اس کی یہ کہ آنکھیں بیٹھی ہوئی' چہرہ مرجھایا ہوا' رنگ زرد' منہ پر جھریاں پڑی' کمر جھکی' گوشت بدن کا خشک' ہڈیاں نکلی ہوئی۔ غرض دیکھا کہ سب ہانپتے کانپتے' روتے بسورتے' آہ آہ کرتے چلے آتے ہیں۔ ان کی آوازیں ہی سن سن کر لوگوں کے دل مردہ اور جی افسردہ ہوئے جاتے تھے۔

تحمل اور ہمت کو جونہی ان کی صورت نظر آئی' دفعتہً غش کھا کر گر پڑے۔ اس جنگل کی ہوا میں عجیب تاثیر تھی کہ بھلے چنگے آدمیوں کے جی چھوٹے جاتے تھے اور حوصلے پست ہوئے جاتے تھے۔ سب کے ہتھیار' اوزار ہاتھوں سے چھٹ پڑے۔ بہتیرا دلوں کو سنبھالتے تھے مگر دل قابو میں نہ آتے تھے۔ اس حال کو دیکھ کر سب کی عقلیں جاتی رہیں۔ اور پھر نئے سرے سے اپنے حال پر افسوس کرنے لگے کہ ہائے ملک فراغ کو کیوں چھوڑا اور خسرو آرام کی اطاعت سے کیوں منہ موڑا۔ آپس میں صلاح کی کہ اب کیا کرنا چاہیے۔ آخر مصلحت یہ ٹھہری کہ چلو پھر اپنے قدیمی بادشاہ خسرو آرام کی خدمت میں چل کر سلام کرو اور باقی زندگی جس طرح ہو اس کی اطاعت میں بسر کر دو۔

جو آسائش کے قدرتی سامان تھے وہ اپنے ہاتھوں کھوئے' اب محنت

کے بنائے ہوئے سامانوں سے آرام چاہتے ہو؟ نہ ہوگا نہ ہوگا:

خسرو آرام بھی دنیا کے پردے سے اٹھ نہ گیا تھا' ایک پل میں اس کے پاس جا پہنچے۔ عذر تقصیر میں عرض کیا کہ جو کچھ ہم نے محنت کی مدد سے حاصل کیا ہے' وہ سب نذر ہے۔ ہمیں حضور اطاعت میں قبول فرمائیں۔ یہاں خسرو آرام نے بھی اب دربار کا آئین کچھ اور کر دیا تھا۔ تکلف' آرائش' بناؤ سنگار' عیش آرام' بہت سے لوگ رکن دربار ہو گئے تھے۔ قدرتی سبزہ زار اور خدائی مرغزاروں کو چھوڑ کر محلوں میں جا بیٹھا تھا' بالاخانوں اور دیوان خانوں میں رہتا تھا' خانہ باغوں کی روشوں پر گل گشت کرتا تھا' جاڑوں میں نرم نرم بستر اور گرم گرم مکانوں میں سوتا تھا۔ گرمیوں میں تکلف کے تہہ خانوں میں بیٹھتا اور بناوٹ کے فوارے سامنے چھٹا کرتے۔ باوجود اس کے کوئی نعمت مزہ نہ دیتی تھی اور کوئی غذا انگ نہ لگتی تھی۔ سب کچھ موجود تھا مگر خاطر خواہ خوشی ایک بات سے بھی حاصل نہ ہوتی تھی۔ غرض ملک فراغ میں جو اس کے انتظام اور آزادی کا لطف تھا' وہ نہ رہا تھا۔ کیونکہ سلطان محنت پسند کے زیر حکم رہ کر لوگ خالی بیٹھنے سے بھی گھبراتے تھے اور جسے خوش حالی اور فارغ البالی کہتے ہیں' وہ کسی طرح حاصل نہ ہوتی تھی۔

آرام کے بندو! دیکھو' بہت آرام بہت سی خرابیاں پیدا کرتا ہے:

آرام شاہ کے وزیر اعظم عیش اور نشاط نام دو شخص ہوئے تھے' مگر عیش نے دغا کی' کیونکہ مرض ایک بڑا غنیم سلطنت کا تھا' وہ مدت سے ملک آرام کے درپے تھے۔ چنانچہ مرض نے عیش سے سازش کی اور ایک رات یکایک قلعہ جسم پر کمند ڈال کر شبستان شاہی میں آن پہنچا۔ جب مرض آیا تو آرام کجا' آرام نے دشمن کو آرام ناگہانی کی طرح سر پر دیکھا' گھبرا گیا اور ناچار بھاگنا پڑا۔

ان دونوں نمک حراموں نے سلطنت پر قبضہ کر لیا اور عیش و نشاط کی بدولت تمام عالم اجسام امراض اور بیماریوں میں مبتلا ہو گیا۔ مرض کے سوا کئی اندرونی مفسد اور بھی سلطنت کے بدخواہ تھے۔ چنانچہ ایک سیری 2 تھی' دوسرے اکتاہٹ۔ وہ بھی ملک کے

دعوے سے ملکہ بننا چاہتی تھیں۔ دیکھنے کو بڑا سا پیٹ بہت پھولا تھا لیکن حقیقت میں کچھ نہیں' فقط پھونس کا پولا تھا۔ انہیں کوئی چیز مزہ ہی نہ دیتی تھی اور ہمیشہ ہر چیز سے دل بیزار اور جی بھرا رہتا تھا۔ ان کی مصاحبت میں ایک بد دماغی اور دوسری بیزاری تھی کہ آٹھ پہر منہ بنائے اور تیوری چڑھائے الگ کرسی پر بیٹھی رہتی تھیں ۔ جو نعمت انہیں ملتی' شکریے کا حق خفگی اور بد مزاجی کے ہاتھوں ادا ہوتا۔ ملکہ مذکور کی نگاہ میں یہ تاثیر تھی کہ ایک نظر میں ساری دنیا کی نعمتیں خاک میں مل جاتی تھیں۔ کیسی ہی سہانی خوشبوئیں' ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں' ہرے ہرے سبزہ زار بہار پر ہوتے' مگر جب اس کے سامنے آتے' سب مٹی ہو جاتے۔ اس سے آرام کا لطف زندگی بالکل نہ رہا اور اس کے سبب سے رعایا کا بھی جی بیزار ہونا شروع ہوا۔

عیش کے بندے جب حد سے زیادہ دق ہوئے

تو طبیب کیا خوب ڈھونڈا :

رفتہ رفتہ سب ہمراہی آرام شاہ سے کنارہ کش ہو گئے۔ بعض بے مروت تو عیش سے گھل مل گئے اور عیش نے بھی وعدہ کیا کہ میرے پاس دو حکیم ہیں' جن کے پانی کی بوند تیزاب اور خاک کی چٹکی اکسیر ہے۔ سیری کی خاک اڑ جائے گی' ہر ایک چیز مزا دینے لگے گی اور ہر ایک بات کا لطف آئے گا۔ ان حکیموں کا نام حرص و ہوس ہے۔ یہ سن کر بہت لوگ تو عیش کے پھسلاوے میں آکر حرص کے پیچ میں پھنس گئے' اور جو عاقبت اندیش دانا تھے وہ پھر تدبیر اور مشورے کے پاس پہنچے۔ سارے دکھ سنائے اور جو جو مصیبتیں گزری تھیں' سب کی داستان بیان کی۔ انہوں نے بہت افسوس کیا اور کہا کہ خسرو آرام کی بدولت تم نے بہت آرام کیے' نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ کسی کام کے نہ رہے۔ محنت سے اس کا تدارک کیا۔ اس کی تمہیں برداشت نہ ہوئی اور ضعف اور ناتوانی سے فریاد کرنے لگے۔ عیش و نشاط سے تفریح کا بندوبست کیا' اس سے بہت لطف اٹھائے' مگر انہوں نے یہ سلوک کیا کہ امراض کے حوالے کر دیا اور آپ الگ ہو گئے' جس سے سب کی زندگی کا مزہ جاتا رہا۔ ہم تمہارے معاملے میں حیران ہیں کہ کیا کریں۔ سب

نے بہت منت اور التجا کی' آخر ان دونوں کو ساتھ لے کر پھر سلطان محنت پسند کے پاس گئے اور خسرو آرام کی طرف سے پیغام سلام دوستانہ پہنچا کر صلح کی تدبیر کی۔

محنت کش ہزار ہمت کرے مگر کوئی نہ کوئی دشمن
اس کے پیچھے بھی لگا ہوا ہے:

جس طرح خسرو آرام سیری کے ہاتھ سے عاجز آگیا تھا' اسی طرح سلطان محنت پسند کاہلی کے ہاتھ سے تنگ تھے' کیونکہ وہ ہمیشہ ان کی سرحد پر گھات لگائے بیٹھی رہتی تھی۔ چنانچہ دونوں نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ باہم اتفاق کر لیں۔

حق یہ ہے کہ آرام کا مزہ بھی محنت کے بغیر نہیں۔
اب ذرا محنت کا لطف دیکھو:

غرض تدبیر اور مشورے کی صلاح سے دونوں نے متفق ہو کر ملک فراغ اور کشور راحت کو باہم تقسیم کر لیا۔ محنت پسند خردمند کو دن کی سلطنت ملی اور خسرو آرام کو رات کی۔ دونوں سلطنتوں میں عہد نامہ ہو کر بنیاد محبت کے استحکام کے لیے بندوبست ہونے لگے۔ چند روز کے بعد مشورت کی وکالت سے یہ تجویز ٹھہری کہ خسرو آرام کی شادی سلطان محنت پسند کے خاندان میں ہو جائے۔ محنت پسند نے کہا کہ آپ کے اہل دربار میں بعض اشخاص سلطنت کے خلاف مصلحت ہیں' اس واسطے جب تک آپ انہیں خارج نہ کریں گے' مجھے یہ امر منظور نہیں۔ خسرو آرام نے کہا کہ جس کو تم کہو' اسی وقت جلاوطن کر دوں۔ چنانچہ مشورت وغیرہ مشیروں کی صلاح سے راحت' تکلف' بناؤ سنگار وغیرہ سب نکالے گئے۔ ایک دن رسم شادی کہ وہ بھی سیدھی سادی تھی' سرانجام ہو گئی اور دونوں سرکاروں کا انتظام ایک ہو گیا۔

جب آرام و محنت دونوں اعتدال سے ہوں
تو کیوں صحت حاصل نہ ہو:

اتفاق کو خدا نے بڑی برکت دی ہے' چند روز کے بعد خسرو آرام کے ہاں ایک بیٹا

پیدا ہوا جس کا نام صحت شاہ رکھا گیا۔ بڑی خوشیاں ہوئیں۔ دونوں طرف رسوم مبارک بادی کی ادا ہوئیں۔ گنہگاران سلطنت' یعنی نشاط اور عیش کی خطائیں بھی اس خداداد خوشی کے شکرانے میں معاف ہوئیں' مگر اس شرط پر کہ بے طلب سامنے نہ آنے پائیں' نہ بے تقریب بلائے جائیں۔ غرض صحت شہزادہ' ملی سلامت خاتون کا دودھ پیتا تھا' خواجہ پرہیز اسے پرورش کرتے تھے' انہی کی تعلیم و تربیت میں بڑا ہوا۔ چونکہ دو گھروں میں ایک چراغ تھا' خسرو آرام اور سلطان محنت پسند دونوں آنکھوں کا نور سمجھتے تھے۔ صحت شہزادہ بھی دونوں بزرگوں کی برابر اطاعت اور دونوں سلطنتوں کی برابر رعایت رکھتا تھا۔ اتفاق کی برکت سے خدا نے دونوں گھر روشن اور سلطنت آباد کی اور خدا کے بندوں کو بھی آئے دن کی مصیبتوں سے نجات دی۔

سچ اور جھوٹ کا رزم نامہ

عہد قدیم کے مؤرخ لکھتے ہیں کہ اگلے زمانے میں فارس کے شرفا اپنے بچوں کے لیے تین باتوں کی تعلیم میں بڑی کوشش کرتے تھے' شہسواری' تیر اندازی اور راست بازی۔ شہسواری اور تیر اندازی تو بے شک سہل آجاتی ہو گی' مگر کیا اچھی بات ہوتی اگر ہمیں معلوم ہو جاتا کہ راست بازی کن کن طریقوں سے سکھاتے تھے اور وہ کون سی سپر تھی کہ جب دروغ دیو زاد آکر ان کے دلوں پر شیشہ جادو مارتا تھا تو یہ اس چوٹ سے اس کی اوٹ میں بچ جاتے تھے۔

اس میں شک نہیں ہے کہ دنیا بری جگہ ہے۔ چند روزہ عمر میں بہت سی باتیں پیش آتی ہیں جو اس مشت خاک کو اس دیو آتش زاد کی اطاعت کے لیے مجبور کرتی ہیں۔ انسان سے اکثر ایسا جرم ہوتا ہے کہ اگر قبولے تو مرنا پڑتا ہے' ناچار مکرنا پڑتا ہے۔ کبھی ابلہ فریبی کر کے جاہلوں کو پھنساتا ہے' جب لقمہ رزق کا پاتا ہے۔ اس کے علاوہ بہت مزے دنیا کے ہیں کہ مکر و دغا ان کی چاٹ لگاتی ہے اور جزوی جزوی خطائیں ہو جاتی ہیں' جن سے مکرتے ہی بن آتی ہے۔ غرض بہت کم انسان ہوں گے جن میں یہ حوصلہ و استقلال ہو کہ راستی کے راستے میں ہر دم ثابت قدم ہی رہیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ انسان کے سچ بولنے کے لیے سننے والے بھی ضرور ہیں' کیونکہ خوشامد' جس کی دکان میں آج موتی برس رہے ہیں' اس سے زیادہ جھوٹ کیا ہو گا اور کون ایسا ہے جو اس کی قید کا زنجیری نہیں۔ ڈرپوک بچارا ڈر کا مارا خوشامد کرتا ہے۔ تابعدار' امید کا بھوکا' آقا کو خوش کر کے پیٹ بھرتا ہے۔ دوست' محبت کا بندہ ہے' اپنے دوست کے دل میں اسی سے گھر کرتا ہے۔ بہت سے ایسے بھی ہیں کہ نہ غلام ہیں' نہ ڈرپوک

ہیں' انھیں باتوں ہی باتوں میں خوش کر دینے کا شوق ہے۔ اسی طرح جب جلسوں میں نمودیے گدھوں کے دعوے 'بل ڈاگ[3] کی آواز سے کئی میدان آگے نکل جاتے ہیں تو ان میں وہ لوگ بھی ہوتے ہیں جنہیں کچھ امید' کچھ ڈر' کچھ مروت سے' غرض چار و ناچار کبھی ان کے ساتھ' کبھی پیچھے پیچھے دوڑنا پڑتا ہے۔

آج کل تو یہ حال ہے کہ جھوٹ کی عمل داری دور دور تک پھیل گئی ہے' بلکہ جن صاحب تمیزوں کو قوت عقلی جھوٹ نہیں بولنے دیتی' اور خود اس مردار سے متنفر ہیں' وہ بھی اس کے حامی ہو کر اوروں کے اخلاق خراب کرتے ہیں۔

سچ کا عجب حال ہے کہ اتنا تو اچھا ہے' مگر پھر لوگ اسے ہر وقت اچھا نہیں سمجھتے۔ چنانچہ جب کسی شے پر دل آجاتا ہے اور سچ اس کے بر خلاف ہوتا ہے تو اس وقت سچ سے زیادہ کوئی برا نہیں معلوم ہوتا۔ اصل یہ ہے کہ حضرت انسان کو حقیقت اور واقعیت سے کچھ غرض نہیں۔ جس چیز کو جی نہیں چاہتا اس کو جاننا بھی نہیں چاہتے' جو بات پسند نہیں آتی اس کا ذکر بھی نہیں سنتے۔ اس کان سنتے ہیں اس کان سے نکال دیتے ہیں۔

حکیموں نے جھوٹ سے متنفر ہونے کی بہت سی تدبیریں نکالی ہیں اور جس طرح بچوں کو کڑوی دوا مٹھائی میں ملا کر کھلاتے ہیں' اسی طرح انواع و اقسام کے رنگوں میں اس کی نصیحتیں کی ہیں' تاکہ لوگ اسے ہنستے کھیلتے چھوڑ دیں۔

واضح ہو کہ ملکہ صداقت زمانی سلطان آسمانی کی بیٹی تھی' جو کہ ملکہ دانش خاتون کے پیٹ سے پیدا ہوئی تھی۔ جب ملکہ موصوف نے ہوش سنبھالا تو اول تعلیم و تربیت کے سپرد ہوئی۔ جب انھوں نے اس کی پرورش میں اپنا حق ادا کر لیا تو باپ کے دربار میں سلام کو حاضر ہوئی۔ اسے نیکی اور نیک ذاتی کے ساتھ خوبیوں اور محبوبیوں کے زیور سے آراستہ دیکھ کر سب نے صدق دل سے تعریف کی۔ عزت و دوام کا تاج مرصع سر پر رکھا گیا اور حکم ہوا کہ "جاؤ' اولاد آدم میں اپنا نور پھیلاؤ۔" عالم سفلی میں دروغ دیوزاد ایک سفلہ نابکار تھا کہ حمق تیرہ دماغ اس کا باپ تھا اور ہوس ہوا پرست اس کی ماں تھی۔ اگرچہ اسے دربار میں آنے کی اجازت نہ تھی۔ مگر جب کسی تفریح کی صحبت میں تمسخر اور ظرافت کے بھانڈ آیا کرتے تھے' تو ان کی سنگت میں وہ بھی آجاتا تھا۔ اتفاقاً

اس دن وہ بھی آیا ہوا تھا' اور بادشاہ کو ایسا خوش کیا تھا کہ اسے ملبوس خاص کا خلعت مل گیا تھا۔ یہ منافق دل میں سلطان آسمانی سے سخت عداوت رکھتا تھا۔ ملکہ کی قدر و منزلت دیکھ کر اسے حسد کی آگ نے بھڑکایا۔ چنانچہ وہاں سے چپ چپاتے نکلا اور ملکہ کے عمل میں خلل ڈالنے کو ساتھ ساتھ روانہ ہو۔ جب یہ دو دعویدار نئے ملک اور نئی رعیت کے تسخیر کرنے کو اُٹھے' تو چونکہ بزرگان آسمانی کو ان کی دشمنی کی بنیاد ابتدا سے معلوم تھی' سب کی آنکھیں ادھر لگ گئیں کہ دیکھیں ان کی لڑائی کا انجام کیا ہو؟

سچ کے زور اور طاقت کو کون نہیں جانتا۔ چنانچہ ملکہ صداقت کو بھی حقیقت کے دعوے تھے' اٹھی اور اپنے زور میں بھری ہوئی' اُٹھی اسی واسطے بلند اٹھی' اکیلی آئی اور کسی کی مدد ساتھ نہ لائی۔ ہاں آگے آگے فتح و اقبال نور کا غبار اُڑاتے آتے تھے اور پیچھے پیچھے ادراک پر پرواز تھا۔ مگر صاف معلوم ہوتا تھا کہ تابع ہے' شریک نہیں۔ ملکہ کی شان شاہانہ تھی اور دبدبہ خسروانہ تھا۔ اگرچہ آہستہ آہستہ آتی تھی مگر استقلال رکاب پکڑتے تھا اور جو قدم اُٹھتا تھا دس قدم آگے بڑھتا نظر آتا تھا۔ ساتھ اس کے جب ایک دفعہ جم جاتا تھا تو انسان کیا فرشتے سے بھی نہ ہٹ سکتا تھا۔

دروغ دیوزاد بہروپ بدلنے میں طاق تھا۔ ملکہ کی ہر بات کی نقل کرتا تھا اور نئے نئے سوانگ بھرتا تھا' تو بھی وضع اس کی گھبرائی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ دنیا کی ہوا و ہوس ہزاروں رسالے اور پلٹنیں اس کے ساتھ لیے تھیں' اور چونکہ یہ ان کی مدد کا محتاج تھا' اسی لالچ کا مارا' کمزور' تابعداروں کی طرح ان کے حکم اُٹھاتا تھا۔ ساری حرکتیں ان کی بے معنی تھیں اور کام بھی الٹ پلٹ' بے اوسان تھے' کیونکہ استقلال ادھر نہ تھا' اپنی شعبدہ بازی اور نیرنگ سازی سے فتح یاب تو جلد ہو جاتا تھا' مگر تھم نہ سکتا تھا۔ ہوا و ہوس اس کے یار وفادار تھے' اور اگر کچھ تھے' تو وہی سنبھالے رہتے تھے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہو جاتا تھا کہ دونوں کا آمنا سامنا ہو کر سخت لڑائی آپڑتی تھی' اس وقت دروغ دیوزاد اپنی دھوم دھام بڑھانے کے لیے سر پر بادل کا دھواں دھار پگڑ لپیٹ لیتا تھا۔ لاف و گزاف کو حکم دیتا کہ شیخی اور نمود کے ساتھ آگے جا کر غل مچانا شروع کر دو۔ ساتھ ہی دغا کو اشارہ کر دیتا تھا کہ گھات لگا کر بیٹھ جاؤ۔ دائیں ہاتھ میں طراری کی

تلوار بائیں میں بے حیائی کی ڈھال ہوتی تھی۔ غلط نما تیروں کا ترکش آویزاں ہوتا تھا۔ ہوا و ہوس دائیں بائیں دوڑتے پھرتے تھے۔ دل کی ہٹ دھرمی بات کی پچ پیچھے سے زور لگاتے تھے' غرض کبھی مقابلہ کرتا تھا تو ان زوروں کے بھروسے پر کرتا تھا' اور باوجود اس کے ہمیشہ یہی چاہتا تھا کہ دور دور سے لڑائی ہو۔ میدان میں آتے ہی تیروں کی بوچھاڑ کر دیتا تھا' مگر وہ بھی باد ہوائی' انکل پچو بے ٹھکانے ہوتے تھے۔ خود ایک جگہ پر نہ ٹھہرتا تھا' دم بدم جگہ بدلتا تھا' کیونکہ حق کمان سے جب تیر نظر اس کی طرف سر ہوتا تھا تو جھٹ تاڑ جاتا تھا۔ ملکہ کے ہاتھ میں اگرچہ باپ کی کڑک بجلی کی تلوار نہ تھی' مگر تو بھی چہرہ ہیبت ناک تھا اور رعب خداداد کا خود سر پر دھرا تھا۔ جب معرکہ مار کر ملکہ فتح یاب ہوتی تھی' تو یہ شکست نصیب اپنے تیروں کا ترکش پھینک' بے حیائی کی ڈھال منہ پر لے' ہوا و ہوس کی بھیڑ میں جا کر چھپ جاتا تھا۔ نشان لشکر گر پڑتا تھا اور لوگ پھریرا پکڑے زمین پر گھسیٹتے پھرتے تھے۔

ملکہ صداقت زمانی کبھی کبھی زخمی بھی ہوتی تھی' مگر سانچ کو آنچ نہیں۔ زخم جلد بھر آتے تھے۔ اور وہ جھوٹا نابکار جب زخم کھاتا تھا تو ایسے سڑتے تھے کہ اوروں میں بھی وبا پھیلا دیتے تھے۔ مگر ذرا انگور بندھے اور پھر میدان میں آن کودا۔

دروغ دیوزاد نے تھوڑے ہی تجربے میں معلوم کر لیا تھا کہ بڑائی اور دانائی کا پردہ اسی میں ہے کہ ایک جگہ نہ ٹھہروں' اس لیے دھوکہ بازی اور شعبدہ کاری کو حکم دیا کہ ہمارے چلنے پھرنے کے لیے ایک سڑک تیار کرو! مگر اس طرح کہ اینچ پیچ اور ہیر پھیر دے کر بناؤ کہ شاہراہ صداقت' جو خط مستقیم میں ہے' اس سے کہیں نہ ٹکرائے۔ چنانچہ جب اس نابکار پر کوئی حملہ کرتا تھا' تو اسی راستے سے جدھر چاہتا تھا' نکل جاتا تھا اور جدھر سے چاہتا تھا' پھر آن موجود ہوتا تھا۔

ان رستوں سے اس نے ساری دنیا پر حملے کرنے شروع کر دیے اور بادشاہت اپنی تمام عالم میں پھیلا کر دروغ شاہ دیوزاد کا لقب اختیار کیا۔ جہاں جہاں فتح پاتا تھا' ہوا و ہوس کو اپنا نائب چھوڑتا اور آپ فوراً کھسک جاتا۔ وہ اس فرماں روائی سے بہت خوش ہوتے تھے' اور جب ملکہ کا لشکر آتا تھا تو گھاتوں سے مقابلہ کرتے تھے۔ جھوٹی قسموں کی

ایک لمبی زنجیر بنائی تھی' سب اپنی کمریں اس میں جکڑ لیتے تھے کہ ہر گز ایک دوسرے کا ساتھ نہ چھوڑیں گے۔ مگر سچ کے سامنے جھوٹ کے پاؤں کہاں؟ لڑتے تھے اور متابعت کر کے ہٹتے تھے۔ پھر ادھر ملکہ نے منہ پھیرا' ادھر باغی ہو گئے۔

ملکہ جب آسمان سے نازل ہوئی تھی تو سمجھی تھی کہ بنی آدم میرے آنے سے خوش ہوں گے۔ جو بات سنیں گے اسے مانیں گے اور حکومت میری تمام عالم میں پھیل کر مستقل ہو جائے گی۔ مگر یہاں دیکھا کہ گزارا بھی مشکل ہے۔ لوگ ہٹ دھرمی کے بندے ہیں اور ہوا و ہوس کے غلام ہیں۔ اور اس میں شک نہیں کہ ملکہ کی حکومت آگے بڑھتی تھی' مگر بہت تھوڑی تھوڑی۔ اس پر بھی یہ دشواری تھی کہ ذرا اس طرف سے ہٹی اور پھر بد عملی ہو گئی' کیونکہ ہوا و ہوس جھٹ بغاوت کا نقارہ بجا' دشمن کے زیر علم جا موجود ہوتی تھی۔

ہر چند ملکہ صداقت زمانی ان باتوں سے کچھ دبتی نہ تھی' کیونکہ اس کا زور کسی کے بس کا نہ تھا' مگر جب بار بار ایسے پاجی کمینے کو اپنے مقابلے پر دیکھتی تھی اور اس میں سوائے مکر و فریب اور کمزوری اور بے ہمتی کے اصالت اور شجاعت کا نام نہ پاتی تھی' تو گھٹتی تھی اور دل ہی دل میں پیچ و تاب کھاتی تھی۔ جب سب طرح سے ناامید ہوئی تو غصے ہو کر اپنے باپ سلطان آسمانی کو لکھا کہ آپ مجھے اپنے پاس بلا لیجیے۔ دنیا کے لوگ اس شیطان کے تابع ہو کر جن بلاؤں میں خوش ہیں' انہی میں رہا کریں' اپنے کیے کی سزا آپ پا لیں گے۔ سلطان آسمانی اگرچہ اس عرضی کو پڑھ کر بہت خفا ہوا' مگر پھر بھی کوتاہ اندیشوں کے حال پر ترس کھایا اور سمجھا کہ اگر سچ کا قدم دنیا سے اٹھا' تو جہاں اندھیر اور تمام عالم تہ و بالا ہو جائے گا' چنانچہ اس خیال سے اس کی عرضی نامنظور کی۔ ساتھ اس کے یہ بھی گوارا نہ ہوا کہ میرے جگر کا ٹکڑا جھوٹے بد اصلوں کے ہاتھوں یوں مصیبت میں گرفتار رہے۔ اسی وقت عالم بالا کے پاک نہادوں کو جمع کر کے ایک انجمن منعقد کی' ان میں دو امر تنقیح طلب قرار پائے: (1) کیا سبب ہے کہ ملکہ کی کارروائی اور فرماں روائی دنیا میں ہر دلعزیز نہیں؟ (2) کیا تدبیر ہے کہ جس سے اس کے آئین حکومت کو جلد اہل عالم میں رسائی ہو' اور اسے بھی ان تکلیفوں سے رہائی ہو؟

کمیٹی میں یہ بات کھلی کہ در حقیقت ملکہ کی طبیعت میں ذرا سختی ہے اور کارروائی میں تلخی ہے۔ صدر انجمن نے اتفاق رائے کر کے اس قدر زیادہ کہا کہ ملکہ کے دماغ میں اپنی حقیقت کے دعووں کا دھواں اس قدر بھرا ہوا ہے کہ ہمیشہ ریل گاڑی کی طرح سیدھے خط میں چل کر کامیابی چاہتی ہے، جس کا زور طبیعتوں کو سخت اور دھواں آنکھوں کو کڑوا معلوم ہوتا ہے۔ بعض اوقات لوگوں کو اس کی راستی سے نقصان اُٹھانے پڑتے ہیں۔ کبھی ایسے فساد اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں جن کا سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے، اور یہ زمانہ ایسا ہے کہ دور اندیشی اور صلاح وقت کے بغیر کام نہیں چلتا۔ پس اسے چاہیے کہ جس طرح ہو سکے، اپنی سختی اور تلخی کی اصلاح کرے۔ جب تک یہ نہ ہو گا، لوگ اس کی حکومت کو رغبت سے قبول نہ کریں گے، کیونکہ دیو دروغ کی حکومت کا ڈھنگ بالکل اس کے بر خلاف ہے۔ اول تو اس میں فارغ البالی بہت ہے لو جو لوگ اس کی رعایا میں داخل ہو جاتے ہیں انھیں سوائے عیش و آرام کے دنیا کی کسی بات سے خبر نہیں ہوتی۔ دوسرے وہ خود بہروپیا ہے، جو صورت سب کو بھائے وہی روپ بھر لیتا ہے، اور اوروں کی مرضی کا جامہ پہنے رہتا ہے۔ اہل انجمن نے صلاح کر کے ملکہ کے طرز لباس کو بدلنے کی تجویز کی، چنانچہ ایک ویسا ہی ڈھیلا ڈھالا جامہ تیار کیا، جیسا کہ جھوٹ پہنا کرتا تھا اور وہ پہن کر لوگوں کو جل دیا کرتا تھا۔ اس جامے کا "مصلحت زمانہ" نام ہوا۔ چنانچہ اس خلعت کو زیب بدن کر کے ملکہ پھر ملک گیری کو اٹھی۔ جس ملک میں پہنچتی اور آگے کو راستہ مانگتی، ہوا و ہوس حاکم وہاں کے اسے دروغ شاہ دیوزاد سمجھ کر آتے اور شہر کی کنجیاں نذر گزرانتے۔ ادھر اس کا دخل ہوا، ادھر ادراک آیا اور جھٹ وہ جامہ اُتار لیا۔ جامے کے اترتے ہی اس کی اصلی روشنی اور ذاتی حسن و جمال پھر چمک کر نکل آیا۔

چنانچہ اب یہی وقت آ گیا ہے، یعنی جھوٹ اپنی سیاہی کو ایسا رنگ آمیز کر کے پھیلاتا ہے کہ سچ کی روشنی کو لوگ اپنی آنکھوں کے لیے مضر سمجھنے لگتے ہیں۔ اگر سچ کہیں پہنچ کر اپنا نور پھیلانا چاہتا ہے تو پہلے جھوٹ سے کچھ زرق برق کے کپڑے مانگ تانگ کر لاتا ہے۔ جب تبدیل لباس کر کے وہاں جا پہنچتا ہے، تو وہ لفافہ اُتار کر پھینک دیتا ہے، پھر اپنا اصلی نور پھیلاتا ہے کہ جھوٹ کی قلعی کھل جاتی ہے۔

گلشن امید کی بہار

انسان کی طبیعت کو خدا نے انواع واقسام کی کیفیتیں عطا کی ہیں، مگر یہ زمین جس قدر تخم امیدؔ کو پرورش کرتی ہے، اس کثرت سے کسی کیفیت کو سرسبز نہیں کرتی۔ اور اور کیفیتیں خاص خاص وقت پر اپنا اثر کرا اٹھتی ہیں، یا بمقتضائے سن خاص خاص عمروں میں ان کے اثر ظاہر ہوتے ہیں، مگر امید کا یہ حال ہے کہ جس وقت سے اس بات کی تمیز ہونے لگی کہ حالت موجودہ ہماری کچھ خوش حال یا بدحال بھی ہو سکتی ہے، اسی وقت سے اس کی تاثیر شروع ہو جاتی ہے۔ امید ایک رفیق ہمدم ہے کہ ہر حال اور ہر زمانے میں ہمارے دم کے ساتھ رہتا ہے، دمبدم دلوں کو بڑھاتا ہے اور سینے کو پھیلاتا ہے، خیالات کو وسعت دیتا ہے اور نئی نئی کامیابیوں کی ترغیبیں دیتا ہے۔ غرض ہمیشہ کسی نہ کسی خوش حالی کا باغ پیش نظر رکھتا ہے کہ یا اس سے کوئی کلفت رفع ہو یا کچھ فرحت زیادہ ہو۔ خدائی کی نعمتیں اور ساری خوش نصیبی کی دولتیں حاصل ہو جائیں۔ پھر بھی یہ جادو نگار مصور ایک نہ ایک ایسی تصویر سامنے کھینچ دیتا ہے، جسے دیکھ کر یہی خیال آتا ہے کہ بس یہ بات ہو جائے گی تو ساری ہوسیں پوری ہو جائیں گی، اور پھر سب آرزوؤں سے جی سیر ہو جائے گا۔

اس میں بھی شک نہیں کہ امید کا ہونا ہر حال میں ضرور ہے۔ مفلسی، بیماری، قید، مسافرت، بہت سے دنیا کے دکھ درد ہیں کہ امید نہ ہو تو ہرگز نہ جھیلے جائیں۔ آسا جیے نراسا مرے۔ یہ نعمت جو بظاہر ہر کس و ناکس میں عام ہو رہی ہے، وہ ضروری شے ہے کہ دنیا کی بہتر سے بہتر حالت بھی ہم کو اس ضرورت سے بے نیاز نہیں کر سکتی۔ کیونکہ حقیقت میں یہ مشغلے زندگی کے بہلاوے ہیں۔ اگر ان کا سہارا ہمارا دل نہ بڑھاتا رہے تو

ایک دم گزارنا مشکل ہو جائے اور زندگی وبال معلوم ہونے لگے :

ایک دم بھی ہم کو جینا ہجر میں تھا ناگوار
پر امید وصل پر برسوں گوارا ہو گیا

اس میں بھی شک نہیں کہ امید دھوکے دیتی ہے' اور ان باتوں کی توقع پیدا کرتی ہے جو انسان کو حاصل نہیں ہو سکتیں' مگر وہ دھوکے اصلی نعمتوں سے سوا مزہ دیتے ہیں' اور موہوم وعدے قسمت کی لکھی ہوئی دولتوں سے گراں بہا اور خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔ اگر کسی معاملے میں ناکام بھی کرتی ہے تو اسے ناکامی نہیں کہتی' بلکہ قسمت کی دیر کہہ کر ایک اس سے بھی اعلیٰ یقین سامنے حاضر کر دیتی ہے۔

میں ایک رات انہی خیالات میں حیران تھا اور سوچ رہا تھا کہ انسان کے دل میں یہ شوق کہاں سے پیدا ہو جاتا ہے' جس سے اپنے تئیں آپ دھوکہ دیتا ہے' اور زمانہ آئندہ پر رنگ آمیزیاں چڑھا کر خود اپنے لیے امید وبیم اور نفع و نقصان کے سامان تیار کر لیتا ہے ؟ یکایک آنکھ لگ گئی' دیکھتا ہوں کہ میں ایک باغ نوبہار میں ہوں جس کی وسعت کی انتہا نہیں۔ امید کے پھیلاؤ کا کیا ٹھکانا ہے۔ آس پاس سے لے کر جہاں تک نظر کام کرتی ہے' تمام عالم رنگین و شاداب ہے۔ ہر چمن رنگ روپ کی دھوپ سے چمکتا' خوشبو سے مہکتا' ہوا سے لہکتا نظر آتا ہے۔ زمین فصل بہار کی طرح گلہائے گوناگوں سے بوقلموں ہو رہی ہے' اور رنگارنگ کے جانور درختوں پر چہچہے بھر رہے ہیں۔ یہ سماں بہار کا دیکھ کر دل پر ایک عالم طاری ہوا کہ سر تاپا محو ہو گیا۔ جب ذرا ہوش آیا تو ان چمن ہائے دل کشا کو نظر غور سے دیکھنے لگا اور ایسا معلوم ہوا کہ اگر آگے چلوں تو شگفتگی اور تفریح کا لطف 4 زیادہ ہو۔

پھر دیکھا کہ تھوڑی ہی دور آگے رنگیلے چکیلے پھول کھلے ہیں۔ آب زلال کے چشمے دھوپ کی چمک سے جھلمل جھلمل کر رہے ہیں۔ لونچے اونچے درخت جھنڈ کے جھنڈ چھائے ہوئے ہیں۔ جو جانور دھیمی دھیمی آواز سے بولتے سنائی دیتے تھے' یہاں خوب زور شور سے چہکار رہے ہیں۔ چاروں طرف ہرے ہرے درخت لہلہاتے ہیں اور پھول اپنی خوشبو سے مہک پھیلاتے ہیں۔ مگر پھر یہاں سے جو نظر اُٹھائی تو اور ہی طلسمات

نظر آیا' یعنی دیکھا کہ سامنے جو درخت جھوم رہے ہیں ان کے تیار میوے زمین کو چوم رہے ہیں۔ اس لطف نے اور آگے بڑھنے کو للچایا ۔ چنانچہ قدم اٹھایا ' مگر جوں جوں آگے بڑھتا گیا زیادہ حیران ہوتا گیا ' کیونکہ جو ہریاول سامنے سے لہلہاتی دکھائی دیتی تھی ' پاس پہنچ کر اس کی رنگت پھیکی پڑ گئی اور میوے تو گر ہی چکے تھے[5]' بلبلیں جو چہچے بھر رہی تھیں وہ آگے آگے اڑتی چلی جاتی تھیں۔ اگرچہ میں بہت پھرتی سے پہنچا تھا اور جو بہاریں تھیں ' وہ ہر ہر قدم پر سامنے ہی تھیں ' مگر تو بھی ہاتھ نہ آسکیں[6]۔ گویا میرے شوق آرزو کو ڈہکاتی تھیں کہ جوں جوں میں آگے بڑھتا تھا وہ اور بھی آگے بڑھتی جاتی تھیں۔

اگرچہ بار بار خوش اور دمبدم غمگین ہوتے ہوتے میں دق ہو گیا تھا ' مگر دل کے کان میں کوئی یہی کہے جاتا تھا کہ چلے چلو جو نعمتیں ڈہکا رہی ہیں ' کبھی نہ کبھی ہاتھ بھی آئیں گی۔ آخر چلتے چلتے ایک جمگھٹا نظر آیا کہ جس میں زن و مرد ' خورد و کلاں بہت سے آدمی اچھلتے کودتے چلے جاتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب کسی مجلس یا میلے میں جاتے ہیں ' یا کسی نشاط عام کے جشن میں شامل ہوتے ہیں۔ کیونکہ ہر ایک کے منہ پر یقین کا رنگ چمک رہا تھا ' اور ایک ایک آنکھ سرمہ شوق سے روشن نظر آتی تھی۔ ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا تھا کہ ہر ایک کی خوشی کچھ ایک خاص قسم کی ہے کہ وہ اسی کے دل میں ہے۔ سب ملے جلے ساتھ ہی چلے جاتے تھے ' مگر نہ کوئی اپنا ارادہ دوسرے کو بتانا چاہتا تھا ' نہ اپنے فکر کا راز دوسرے کو جتانا گوارا کرتا تھا[7]۔ بہت لوگوں کی گرمی رفتار سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اگر کوئی آرزو مند ' شوق کی پیاس سے تڑپتا ہو تو انہیں اس کے بجھانے کی بھی فرصت نہیں[8]۔ اس واسطے ان کے روکنے کو جی نہ چاہا اور تھوڑی دیر تک غور سے دیکھا کیا۔ آخر ایک بڈھا نظر آیا کہ باوجود بڑھاپے کے انھی میں شامل تھا۔ ہاتھ پاؤں بہت مارتا تھا مگر کچھ نہ ہو سکتا تھا[9]۔ میں نے خیال کیا کہ بڈھے کو اب کیا ہوس ہو گی، اسے تو شاید کچھ جواب دینے کی فرصت ہو۔ چنانچہ اسے سلام کیا۔ بڈھے نے تیوری بدل کر منہ پھیر لیا اور کہا "صاحب! دق نہ کیجیے، آپ جانتے ہیں؟ جس وقت کی کہ ہم عمروں سے آرزو کر رہے تھے وہ وقت آن پہنچا ہے۔ اب ایک عہد آیا ہے کہ تمام عالم فارغ البالی سے مالا مال ہو جائے گا۔ افلاس زدہ اور طالب روزگار، بچارے نیکس اور

محصولوں کے مارے، آئے دن کی جاں کنی سے خلاص ہو جائیں گے، بلکہ فلک کے سیمرغ جو اہل عالم کے کاروبار میں رات دن سر گرداں ہیں، وہ بھی بازو ڈال، آرام سے بیٹھ جائیں گے"۔ میں نے بڈھے کو اس کی خشکی دماغ کے حوالے کیا اور وہیں ٹھہر گیا۔ اتنے میں ایک شخص سامنے آیا۔ جس کی ملائمت شکل اور آہستگی رفتار سے معلوم ہوا کہ شاید یہ کچھ اخلاق سے پیش آئے۔ مگر جب میں اس کی طرف بڑھا تو اس نے جھک کر ایک سلام کیا اور کہا "اگر آپ کی خدمت کی فرصت ہوتی تو میں بہت خوش ہوتا مگر اب اس خوشی کا ہوش نہیں، کیونکہ بیس برس سے میں ایک عہدے کی امیدواری کر رہا تھا، اب وہ خالی ہوا چاہتا ہے"۔ میں نے اسے بھی چھوڑا اور ایک اور کو جا لیا۔ وہ گھبرایا ہوا جاتا تھا کہ چچا کی میراث پر قبضہ کرے، کیونکہ اس کی بیماری کی خبر سننے میں آئی تھی۔ اس کے پیچھے ایک اور شخص دیکھا کہ بے تحاشا بھاگا چلا آتا ہے۔ اس نے ایک غوطہ خوری کی کل ایجاد کی تھی، اس کے دریائے منافع میں غوطہ مارا چاہتا تھا، یعنی اگر کچھ اور نہ ہو تو ایجاد کا انعام ہی ہاتھ آجائے۔

ایک شخص کو دیکھا کہ تھوڑی دیر چلتا ہے اور ٹھہر جاتا ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ طول بلد اور عرض بلد کے خیالات پھیلا رہا ہے اور سرکار علم سے انعام کا امیدوار ہے۔

جب جا بجا سے ٹکریں کھائیں تو سوچا کہ اوروں سے دریافت کرنا بے حاصل ہے، اب جو اپنی آنکھ کہے وہ ٹھیک ہے۔ آگے بڑھو اور آپ دیکھو، کہ اتنے میں ایک نوجوان شوقین، بے پروا سا نظر آیا۔ وہ آزادی کے عالم میں مسکراتا چلا جاتا ہے۔ اسے دیکھ کر دل میں کہا کہ بھلا ایک دفعہ تو اسے بھی ٹٹولنا چاہیے۔ چنانچہ معمولی سوال کا سبق اسے بھی سنایا۔ وہ ہنسا اور کہا: "صاحب! جہاں آپ کھڑے ہیں، یہ ملکہ امید کا باغ ہے، وہ ملکہ آرزو کی بیٹی ہے۔ ذرا سامنے دیکھو! بہت سی پریاں خوشنما اور نفیس نفیس چیزیں لیے کھڑی ہیں۔ جن لوگوں کو تم نے زور شور مچاتے دیکھا، یہ انہی کے اشارے پر للچائے ہوئے دوڑے جاتے ہیں۔ آنکھ اٹھا کر دیکھوں تو فی الحقیقت سامنے ایک ایوان عالی شان ہے اور اس کے صدر میں ایک پری، جس کا گلزار جوانی عین بہار پر ہے، سر تخت جلوہ گر ہے۔ مسکراہٹ اس کے زیر لب، پارے کی طرح لوٹتی ہے۔ لعل و جواہر، تاج مرصع،

موتیوں کے ہار، خلعت زر نگار، کشتیوں میں چنے آگے دھرے ہیں۔ قسمت اور نصیب جہان کی نعمتیں سجائے اس کے دائیں بائیں دست بستہ حاضر ہیں اور بہار زندگی کے پھولوں کا فرش سامنے بچھا ہے۔ عیش مدام اور فرصت دوام سے چہرہ روشن ہے۔ اس کے لبوں کی مسکراہٹ اور آنکھ کی لگاوٹ عام سے خاص تک برابر سب کی حق شناسی کر رہی ہے۔ اس سے ہر شخص یہی سمجھ رہا ہے کہ ملکہ میری ہی طرف متوجہ ہے، اور اسی بھروسے پر ہر ایک فخر اور ناز کے مارے، پھولا نہیں سماتا۔ رستے کے دونوں طرف کہیں کہیں ایک آدھ جھونپڑی نظر آتی تھی۔ وہ دیکھنے میں پست اور بے حقیقت تھی، مگر پرے درختوں نے سایہ کر رکھا تھا۔ دیواریں لپی ہوئی، دروازے پر روشن حرفوں میں لکھا تھا "قناعت کا آرام گھر"۔ بعضے تھک ماندے ان میں چلے جاتے اور پاؤں پھیلا کر بیٹھ جاتے۔ رہتے والے دیکھ کر غل مچاتے کہ بھاگ گئے اور ہمت کے میدان ہار گئے۔

باغ امید کے دو دروازے:

یہ دیکھ کر میں ایک ٹیلے پر چڑھ گیا کہ وہاں سے ہر جگہ نظر پہنچ سکتی تھی اور اس جمگھٹ کے بھی ایک ایک آدمی کا حال خوب خیال میں آتا تھا۔ وہاں سے معلوم ہوا کہ باغ امید کے اندر جانے کے دو دروازے ہیں، ایک داروغہ دانش کے اختیار میں ہے، دوسرا داروغہ خیال کے تحت میں ہے۔ داروغہ دانش ایک تند مزاج اور وسواسی شخص ہے کہ جب تک بہت سے سوال اور الٹی سیدھی حجتیں نہیں کر لیتا، تب تک قفل کی کنجی کو جنبش نہیں دیتا۔ مگر داروغہ خیال خلیق اور ملنسار شخص ہے۔ وہ اپنا دروازہ کھلا ہی رکھتا ہے، بلکہ جو اس کی حد میں جائے، اس سے بڑی عزت و توقیر کے ساتھ پیش آتا ہے۔ چنانچہ جو لوگ داروغہ دانش کی حجتوں سے گھبراتے تھے، یا جنہیں اس نے جانے نہیں دیا تھا، ان لوگوں کی بھیڑ اس کے دروازے پر لگ رہی تھی۔ داروغہ دانش کے دروازے سے ملکہ کی تخت گاہ خاص کو رستہ جاتا تھا، مگر اس راہ کی زمین پھسلنی، سڑک پتھریلی، رستے ایسے اینچ پیچ کے تھے کہ کٹھن گھاٹی اس کو کہتے ہیں۔ جب کسی قسمت والے کو داروغے سے اجازت مل جاتی تھی تو اس کی کٹھن گھاٹی میں دکھ بھرنے پڑتے تھے،

اگرچہ چڑھنے والے پہلے سے بھی رستے کے اینچ پیچ اچھی طرح جانچ لیتے تھے، اور جو جو چاؤ کے مقام تھے، ان میں قدم قدم پر نشان کر لیتے تھے، مگر پھر بھی اکثر ایسی مشکلیں پیش آتی تھیں جن کا سان و گمان بھی نہ ہوتا تھا۔ بلکہ جہاں صاف سیدھا رستہ سمجھے ہوئے تھے، وہاں کچھ ایسا تہلکہ پیش آتا تھا کہ یکایک تھم جانا پڑتا تھا۔ ہزاروں الجھاووں میں الجھتے تھے، صدہا ریٹنوں میں رپٹتے تھے، بہتیرے ٹھوکریں کھا کھا کر گرتے تھے، اکثر خس پوش گڑھوں میں جا پڑتے تھے۔ غرض ایسی ایسی خطرناک وارداتیں اور ناکامی کے صدمے تھے کہ بہت آدمی تو پہلے ہی دھاوے میں الٹے پھر آتے تھے، بہتیرے رستے میں غش کھا کر رہ جاتے تھے، بعض بعض ایسے بھی تھے کہ ان کی استقلال سے راہ تھی، وہ اس کی دستگیری سے ملکہ کے ایوان تک جا پہنچتے تھے۔ ان میں اکثر ایسے ہوتے تھے جو صلے کو دیکھ کر پچھتاتے تھے کہ ہائے ہماری محنت تو اس سے بہت زیادہ تھی، یہ تو کامیابی نہیں ہوئی، حق تلفی ہوئی ہے۔ باقی جو لوگ اخیر انعام لے کر پھرتے تھے، ان کا انجام یہ ہوتا تھا کہ دانائی داروغہ دانش کی بی بی کی مصاحب تھی، وہ ان کا ہاتھ پکڑتی تھی۔ اس کی رہنمائی سے وہ لوگ گوشہ قناعت میں جا بیٹھتے تھے۔

اے راہ امید کے مسافرو! چونکہ داروغہ دانش کی حجتیں اور ان کے رستے کی مشکلیں مجھے بہت سخت معلوم ہوئیں اس لیے میں نے داروغہ خیال کی طرف رخ کیا۔ یہاں بارگاہ کی طرف جانے کو کوئی معمولی سڑک نظر نہ آئی، مگر ملکہ صاف سامنے کھڑی تھی۔ وہ یہاں سے سرتاپا ساری نظر آتی تھی اور اپنی عجائب و غرائب، نایاب اور بیش قیمت چیزوں پر سب کو برابر حسن طلب کے انداز دکھاتی تھی۔ پھر بھی لطف یہ تھا کہ ایک ایک دل کو اپنی ہوا میں جدا جدا انداز سے اڑا رہی تھی جس سے ہر شخص یہ جانتا تھا کہ جو نگاہ مجھ پر ہے وہ کسی پر نہیں اور مجھ سے زیادہ کسی کو کامیابی کی امید نہیں۔ اسی واسطے بجائے خود کسی کا دماغ پایا نہ جاتا تھا۔ پہاڑ اس خیالی رستے کی طرف سے ایسا ڈھلوان تھا کہ قدم نہ ٹھہر سکتا تھا، کیونکہ وہمی باتوں میں پائیداری کہاں؟ باوجود اس کے آمد و رفت کے نشان بہت کثرت سے تھے، کیونکہ اس راستے میں چلنے والے بہت ہیں۔ اس کی سڑک سایہ دار درختوں سے ایسی چھائی ہوئی تھی کہ کسی کو جانا مشکل نہ معلوم ہوتا

تھا۔ ساتھ ہی اس کے ہر شخص یہ جانتا تھا کہ جو رستہ میں نے پایا ہے وہ کسی کے ہاتھ ہی نہیں آیا۔

یہ بلانصیب لوگ بہتیرے جتن کر رہے تھے۔ بعضے تو ایسے کلدار پر لگانے کی فکر میں تھے کہ جن کی حرکت کبھی تھمے ہی نہیں۔ بعضے کہتے تھے "جو ہو سو ہو، انہی قدموں میں چلے جاؤ، بلا سے مر جاؤ"۔ یہ سب حکمتیں کرتے تھے، اس پر بھی زمین سے اٹھ نہیں سکتے تھے، اور اٹھے بھی تو وہیں گر پڑے۔ مگر یہاں پڑے تھے، تاک ادھر ہی لگی تھی۔ اور اس حال تباہ پر خود پسندی کا یہ عالم تھا کہ جو لوگ سامنے عقل کی کٹھن منزل میں ہاتھ پاؤں مار رہے تھے، ان پر پڑے پڑے ہنستے تھے۔

اکثر خیال کے پیارے اور وہم کے بندے ایسے بھولے بھالے تھے جنہوں نے اس باغ میں آ کر اوروں کی طرح چڑھنے کا بھی ارادہ نہ کیا تھا، یوں ہی ایک جگہ پڑ رہے تھے۔ یہ مقام کاہل گھاٹی کہلاتا تھا اور ایک سنسان اور بے آزار موقع پر تھا۔ مگر ملکہ یہاں سے بھی سامنے تھی۔ یہ اس یقین میں خوش پڑے تھے کہ کوئی دم میں وہ خود یہاں آیا چاہتی ہیں۔ اگرچہ اور لوگ ان وہمیوں کو احمق اور کاہل وجود سمجھتے تھے، مگر انہیں کچھ پرواہ بھی نہ تھی، بلکہ یہ غم غلط لوگ اس دعوے میں خوش بیٹھے تھے کہ سب سے پہلے ہم پر نظر عنایت ہو گی۔

ان ہی بے پرواؤں میں، میں بھی پڑا پھرتا تھا۔ ان میں اتنا لطف پایا کہ اگر کوئی بات کرے تو اس کا جواب دیتے تھے، اور اپنی باتوں سے بھی دل خوش کرتے تھے۔ اسی خیال میں یکایک نظر پھیر کر جو دیکھا تو معلوم ہوا کہ دو دیو ڈراؤنی صورت، بھیانک مورت اس گھاٹی میں چلے آتے ہیں کہ ان کو کسی کی خبر نہیں۔ ایک تو میں جانتا تھا کہ عمر ہے مگر دوسرا افلاس تھا۔ ان کے دیکھتے ہی سارے باغ اور چمن آنکھوں میں خاک سیاہ ہو گئے اور یہ معلوم ہوا کہ بس عیش و آرام کا خاتمہ ہو گیا۔ دلوں پر خوف و ہراس چھا گیا۔ لوگ جو ڈر کے مارے چیخیں مار مار کر چلائے تو گویا عالم میں ایک کہرام مچ گیا۔ اسی سے میں بھی چونک پڑا اور دیکھا تو کچھ نہ تھا۔

سیر زندگی

ایک حکیم کا قول ہے کہ "زندگی ایک میلہ ہے" اور اس عالم میں جو رنگارنگ کی حالتیں ہم پر گزرتی ہیں، یہی اس کے تماشے ہیں۔ لڑکپن کے عالم کو پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھے تو جوان ہوئے اور پختہ سال انسان ہوئے، اس سے بڑھ کر بڑھاپا دیکھا اور حق پوچھو تو تمام عمر انسانی کا عطر وہی ہے[10]۔

جب اس فقرے پر غور کیا اور آدمی کی اولتی بدلتی حالت کا تصور کیا تو مجھے انواع و اقسام کے خیال گزرے۔ اول تو وقت بوقت اس کی ضرورتوں اور حاجتوں کا بدلنا ہے کہ ہر دم اونی اونی چیز کا محتاج ہے۔ پھر اس کی طبیعت کا رنگ پلٹتا ہے کہ ابھی ایک چیز کا طلب گار ہوتا ہے، ابھی اس سے بیزار ہوتا ہے اور جو اس کے برخلاف ہے، اس کا عاشق زار ہوتا ہے۔

پھر غفلت ہے کہ وقت کے دریا میں تیراتی پھرتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ سب خرابیاں دیکھتا ہے اور چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ میرا دل ان خیالات میں غرق تھا کہ دفعتہ درد و مصیبت کی فریاد خوشی کے ولولے، ڈر کی چیخیں، ہواؤں کے زور، پانی کے شور ایسے اٹھے کہ میں بے اختیار اچھل پڑا[11]۔ اول تو دل بہت حیران ہوا، بعد تھوڑی دیر کے حواس ٹھکانے ہوئے تو آس پاس کچھ لوگ نظر آئے۔ پوچھنے لگا کہ ہم کس عالم میں ہیں اور کہاں جاتے ہیں اور اس غل کا کیا سبب ہے؟

ایک شخص برابر سے بولا کہ صاحب کہاں جاتے ہیں، دریائے حیات میں تیر رہے ہو۔ پہلے تو لڑکپن کی نہر تھی کہ جس میں کشتیوں[12] کی کمزوری سے، کچھ ملاحوں[13] کی غفلت سے، کچھ ان کی بے وقوفی سے، لاکھوں بھائی بند غارت ہو گئے۔ وہ نہر تو ہم اتر

آئے ہیں، اب منجھدار سمندر ہے اور ہم ہیں۔ کبھی طوفان ہے، کبھی گرداب ہے، کبھی موجوں کے تھپیڑے[14] کھا رہے ہیں۔ یہاں ملاحوں کی ہوشیاری اور چالاکی کے سوا کوئی صورت بچاؤ کی نہیں۔ ملاح بھی اس لاکھوں کے انبوہ میں سے انتخاب کیے ہیں، جو رستہ بتانے اور پار اتار دینے کے دعوے باندھے بیٹھے تھے، مگر حقیقت میں نہ یہاں ناخدا کی پیش جاتی ہے، نہ ملاح[15] کی، فقط خدا کی آس ہے اور بس:

جہاز عمر رواں پر سوار بیٹھے ہیں
سوار خاک ہیں، بے اختیار بیٹھے ہیں

یہ سن کر میں نے ادھر ادھر غور سے دیکھنا شروع کیا، اور دل نے کہا کہ پہلے نظر اٹھا کر تو دیکھ لو۔ دیکھا تو فی الحقیقت ایک نہر خوش نما گلزار کے بیچ میں لہراتی چلی جاتی ہے۔ ہمراہی میرے دیکھتے تھے اور خوش ہوتے تھے۔ اس کی لہروں میں بظاہر نہ کچھ زور تھا نہ شور تھا، مگر جو شخص ذرا ہاتھ ڈالتا تھا، وہ اسے بلبلے کی طرح بہالے جاتی تھی۔ ان گلزاروں کا کچھ حال دیکھنا چاہو تو بالکل اندھیر تھا اور کوئی نہ کہہ سکتا تھا کہ باغ کہاں سے شروع[16] ہوتا ہے، یعنی جس نے آنکھ کھولی تھی، اپنے تئیں باغ ہی میں دیکھا تھا۔ دائیں بائیں اور سامنے بھی پانی ہی پانی تھا کہ اپنی لہر بہر میں بہتا چلا جاتا تھا، اور دھند اتنی چھائی ہوئی تھی کہ تیز سے تیز نظر بھی کام نہ کرتی تھی[17]۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس دریا میں بڑے بڑے پتھروں کی چٹانیں ہیں اور جابجا گرداب[18] پڑتے ہیں۔ بہت سے لوگ ایسے[19] تھے کہ اپنی اپنی کشتیوں میں باد مراد کے مزے لیتے چلے جاتے تھے، اور جو بے چارے پیچھے رہ گئے تھے ان پر قہقہے اڑاتے چلے جاتے تھے۔ مگر یہ بھی ہنستے ہنستے انہی گرداہوں میں ڈوبتے جاتے تھے۔ دلوں کا اضطراب اور آنکھوں کا اندھیرا یہ غضب تھا کہ چالاک سے چالاک آدمی بھی مشکل سے سنبھل سکتا تھا۔ انہی میں ایسے لوگ بھی تھے کہ ناواقفیت[20] و نادانی کے سبب سے اپنے ساتھیوں کو گرداہوں میں ڈال دیتے تھے، اور موجوں کے تھپیڑے انہیں چٹانوں پر ٹکرا کر مار ڈالتے تھے۔ پانی برابر لہریں مارتا چلا جاتا تھا اور کشتی کو اس کی ٹکر پر چڑھالانے کا تو کیا ذکر ہے، اتنی مجال نہ تھی کہ کوئی پہلو کاٹ کر بھی دھارے کے سامنے سے چڑھ آئے، یا کاش کہ جہاں سے چلا تھا پھر وہیں آجائے۔

سب اپنی اپنی کشتیوں کو برابر روک تھام سے سنبھالے چلے جاتے تھے اور لطف یہ کہ ہر شخص کے دل میں یہی خیال تھا کہ مجھے کچھ خطرہ نہیں، اگر ہے تو اور ہم سفروں کو ہے۔ اوروں کے انجام دیکھ رہے تھے اور اپنی بد انجامی نہ معلوم ہوتی تھی۔ خود اسی مصیبت میں مبتلا تھے اور اپنا خیال نہ کرتے تھے۔ جب موجوں کا زور ہوتا تھا تو قسمت اور بد اعمالی، جو پر سے پر ملائے برابر عالم ہوا میں اڑتی چلی جاتی تھیں، وہ لوگوں کو بہلا لیتی تھیں۔ ہر شخص[21] خوش ہوتا تھا اور دل میں اپنے تئیں مبارک باد دیتا تھا کہ الحمد للہ میری کشتی کو کچھ خطرہ نہیں ہے۔ جو گرداب اوروں کو نگل گیا، میں اس سے بچ جاؤں گا، اور جن چٹانوں نے اور کشتیوں کو ٹکرا کر ڈبو دیا، میں انہیں بھی بے لاگ پھاند جاؤں گا۔ غفلت نے ایسا پردہ آنکھوں پر ڈالا تھا کہ ساتھ کے جہازوں کی تباہی بھی دیکھتے تھے مگر اسی رستے چلے جاتے تھے۔ اس[22] بے پروائی کا یہ حال تھا کہ دم بھر اور طرف متوجہ ہوتے تھے تو چپو بھی ہاتھ سے رکھ کر بھول جاتے تھے۔ پھر ناچار ہو کر اپنے تئیں قسمت پر چھوڑ دیتے تھے۔

یہ سستی اور بے پروائی ان کی کچھ اس لیے نہ تھی کہ ایسی زندگی سے سیر ہو گئے تھے، کیونکہ جب ڈوبنے لگتے تھے تو سب چلاتے تھے، داد بیداد کرتے تھے اور اپنے اپنے دوستوں کو چیخیں مار مار کر پکارتے تھے کہ برائے خدا کوئی آؤ اور ہمیں سنبھالو۔ اور اکثر اخیر وقت میں لوگوں کو نصیحتیں[23] بھی کرتے تھے کہ ہم تو اپنی حماقتوں کی بدولت ان حالتوں کو پہنچے، تم بچے رہنا۔ چنانچہ ان کی اس ہمدردی اور محبت پرستی پر بہت سی تعریفیں بھی ہوتی تھیں، مگر ذرا سی دیر میں پھر بھول جاتے تھے۔ نہ وہ آپ سمجھتے تھے، نہ ان کی نصیحت پر کوئی اور عمل کرتا تھا۔ ادھر ادھر جزیروں کے کناروں پر کشتیاں اور جہاز ٹوٹے پھوٹے پڑے تھے۔ بہت سے مسافروں کی ہڈیاں پڑی تھیں، بہتیرے نیم جان، بہتیرے ایسی بے کسی اور تکلیف کی حالتوں میں تڑپتے تھے کہ دیکھا نہ جاتا تھا۔ ایک دوسرے کو ان کی مصیبت دکھا کر عبرت دلاتا تھا، مگر اپنے دل پر ذرا اثر نہ لاتا تھا۔ جس کشتی[24] پر ہم سوار تھے، حق یہ ہے کہ اس کے جوڑ بند بھی دریائے حیات کی موجوں کے صدمے اٹھانے کے قابل نہ تھے، بلکہ رستے ہی میں ٹوٹتے نظر آتے تھے اور سب

ساتھیوں کو یقین تھا کہ کیسی ہی پھرتی کریں یا زور لگائیں، ڈوبنے سے بچتے نہیں۔

جب ان آفتوں کا باہم چرچا ہوا تو جو جو مست غفلت زندگی کے نشے سے سرخوش بیٹھے تھے، وہ بھی غمگین ہو گئے۔ اچھے اچھے دلیروں کے دل ڈر گئے اور بزدلے نامردوں کو زندگی عذاب موت ہو گئی بلکہ رنج و غم کے بعد جن راحتوں کی امید ہوتی ہے، اس سے بالکل مایوس ہو گئے۔ مگر لطف یہ ہے کہ جن لوگوں کو اس آفت میں زیادہ خطرہ[25] تھا وہی زیادہ تر بے پروا تھے۔ بلکہ سب کا جی یہی چاہتا تھا کہ کسی طرح اس خطر کا خیال دور دور رہے۔ اور جو جانتے تھے کہ آگے ایسی مصیبتیں آئیں گی جو اٹھائی نہ جائیں گی، وہ سامنے نگاہ بھر کے نہ دیکھتے تھے۔ اس وقت کے لیے کچھ نہ کچھ مشغلے نکال لیتے تھے[26]۔ امید تو ہمیشہ اس رستے میں ساتھ ہی رہتی تھی، اس سے ہنس کھیل کر دل بہلاتے رہتے تھے۔

جن لوگوں کی امید سے بہت راہ تھی، ان سے اس نے رفاقت کے بڑے بڑے وعدے کر رکھے تھے، مگر اس میں اتنی سکت بھی نہ تھی، جس کے سہارے سے بھاگ کر تو بچ جاتے۔ فقط اتنا وعدہ تھا کہ اوروں سے کچھ پیچھے ڈوبو گے اور یہ بھولے بھالے احمق اتنے ہی وعدے پر راضی تھے۔ درحقیقت امید کی باتیں ان سے مسخرے پن کے طور پر تھیں، کیونکہ جتنی ان کی کشتیاں پرانی ہوتی جاتی تھیں، اتنی ہی بے خبری کے عہد نامے تازے کرتی تھیں۔ اور تعجب یہ ہے کہ جنھیں ڈوبنے کا یقین تھا وہی کاروبار کے لیے زیادہ کمر کستے تھے۔

دریائے زندگی میں ایک بہت بڑا جزیرہ نظر آیا۔ اس کے کنارے پر دریا سے لگا ہوا ایک بلند منارہ تھا۔ اس پر سونے کے حرفوں سے لکھا تھا: "بد اعتدالیوں کا گلزار"۔ جہاں تک جزیرے کی حد تھی، وہاں تک پہاڑ سی بڑی بڑی چٹانیں بلند تھیں۔ اسی واسطے ایسے ہیبت ناک گرداب پڑتے تھے جہاں سے کشتی کا نکلنا ممکن نہ تھا۔ یہ چٹانیں پانی میں ڈوبی ہوئی تھیں اور جتنی کھلی تھیں، نہایت سرسبز اور خوشنما تھیں۔

جو ان ان مرغزار، یعنی ہرے بھرے درخت، ایک دوسرے کے گلے میں ہاتھ ڈالے جھوم رہے تھے، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں آتی تھیں۔ وہیں آرام اپنی پلنگڑی بچھائے لیٹا تھا اور خوشی میٹھے میٹھے سروں میں پڑی ایک ترانہ لہرا رہی تھی۔ یہ مقام رہ گزر عام کا

تھا، اس لیے جو لوگ ادھر سے گزرتے تھے، یہاں کی سر سبزی ان کی آنکھوں میں ضرور طراوت دیتی تھی۔ اور اک کا ناخدا داہنے ہاتھ پر دوربین لگائے کھڑا تھا کہ مسافروں کو اسی سکڑے رستے سے نکال لے جاتا تھا۔ مگر خرابی یہ تھی کہ وہ کشتی[27] کھیلنے کے لیے ان سے ڈانڈ مانگتا تھا کہ صحیح سلامت یہاں سے نکال دے۔ یہ اس باغ سبز پر ایسے محو ہو رہے تھے کہ جواب بھی نہ دیتے[28] تھے، خواہ وہ خفا ہو کر کہے، خواہ منتوں سے مانگے۔ تھوڑے ہی ہوں گے جو اس کا کہنا بھی مانتے ہوں گے اور دیتے تھے تو اس شرط پر دیتے تھے کہ ان سبزہ زاروں کے پاس سے ہو کر نکلنا کہ ذرا دیکھ کر ہی دل خوش کر لیں، اور عہد لے لو کہ پھر رستے بھر ہم کہیں نہ اٹکیں گے۔ نہ سمجھتے تھے کہ برتنا تو در کنار، ان بلاؤں کے پاس نکلنا بھی غضب ہے، چھوا اور موا۔

میں نے دیکھا کہ آخر اور اک چابکدست ان کے تقاضوں اور منتوں سے دق ہو گیا اور جزیرۂ مذکور کی طرف لے چلا۔ اس جزیرے نے کشتی کو اس طرح کھینچا جیسے مقناطیس[29] سوئی کو۔ کھینچے جانے والے بھی گئے تو سہی مگر بہت پچھتائے اور جتنا زور تھا سب لگا دیا، لیکن پانی کے آگے ایک نہ چلی۔ غم غلط مسافر اس عالم میں بھی ناچ کود کر خوشیاں مناتے رہے اور مفت جان گنوا بیٹھے۔ ہاں جن[30] لوگوں پر اور اک چابکدست کی چالاکی تدبیر کارگر ہوئی، وہ بچے، مگر بڑے دکھ اٹھا کر بچے، اور نکلے تو جس طرح پہلے چلے جاتے تھے، اسی طرح موجوں کے تھپیڑوں میں پڑ گئے۔ پانی کے طلاطم کا یہ عالم تھا کہ کشتی چل نہ سکتی تھی، اور یہ بھی باد مخالف اور طغیانی کے ڈر کے مارے ڈرتے ڈرتے کشتی کو لیے جاتے تھے۔ آخر ادھر ان کے زور گھٹتے گئے، ادھر کشتی حیات کے جوڑ بند خراب ہوتے گئے۔ خلاصہ یہ کہ رفتہ رفتہ سب ڈوب گئے۔ مگر جو ڈوبتا تھا، اپنی کوتاہ اندیشی پر بہت پچھتاتا تھا اور اوروں کو نصیحت کرتا جاتا تھا کہ:

من نہ کردم شما حذر بکنید

خبردار! کوئی جزیرہ بے اعتدالی کے سامنے نہ آنا۔

خدا کی قدرت کہ جو ایسی ٹوٹی پھوٹی کشتیوں کی مرمت کرتے تھے، ان کے کاریگر بھی وہیں موجود[31] تھے۔ بہت لوگوں کو اپنے کاریگروں پر بڑا بھروسا تھا اور بعض کشتیاں

بھی ایسی تھیں کہ انہیں تھوڑا ہی صدمہ پہنچا تھا۔ مگر معلوم ہوا کہ جنہوں نے تھوڑا صدمہ اٹھایا تھا، وہ بھی کچھ بہت نہ جیے۔ روز بروز مرض بڑھتا گیا، آخر ڈوب ہی گئے۔ بلکہ تعجب یہ ہے کہ بعض ضرب رسیدہ ایسے تھے کہ کاریگروں نے خود ان کی مدد میں پہلو بچایا[32]۔ مگر بہتیرے کاریگر خود ضرب رسیدوں سے پہلے ڈوب گئے کہ وہ خود اپنی آفتوں میں مبتلا تھے۔

غرض سیر زندگی میں چالاک لوگوں نے اگر پایا تو اتنا ہی پایا کہ یہ کچھ پیچھے ڈوبے، وہ پہلے ڈوبے۔ بہتیرے مسافر ایسے بھی تھے کہ لڑکپن سے جن ہمراہیوں کے ساتھ چلے آتے تھے، انہیں غوطے کھاتے دیکھتے جاتے تھے اور آگے بڑھتے جاتے تھے، یعنی باد مخالف برابر غرق کیے جاتی تھی۔ نہ ان بے چاروں کو محنت تدبیر کرنی پڑتی تھی، نہ غم انتظار اٹھانا پڑتا تھا۔ جو لوگ خوشی کی ٹکر کھا کر بچ نکلے تھے، وہ بھی آہستہ آہستہ ضعیف ہی ہوتے گئے۔ اگرچہ ہاتھ پاؤں مار مار کر پانی سے بہت لڑے، مگر جو اوروں پر پہلے گزری تھی وہ ان پر پیچھے گزری۔ آخر معلوم ہوا تو یہی ہوا کہ امید کو بھی کنارۂ کامیابی تک پہنچنا مشکل ہے۔ یہ حالت دیکھ کر میرا دل ایسا زندگی سے بیزار ہوا کہ جی میں آیا آنکھیں بند کر کے اس دریا میں کود پڑوں۔ اتنے میں دیکھتا ہوں کہ ایک شخص نورانی صورت سبز لباس پہنے سامنے کھڑا ہے، اور اپنے عصا سے اشارہ کر کے پاس بلاتا ہے۔ میں نزدیک گیا تو اس نے اپنا ہاتھ میرے منہ پر پھیر اور عصا اٹھا کر سامنے اشارہ کیا۔ خدا جانے دور بین الٰہی سے میری آنکھیں روشن کر دیں یا کہر، جو دھواں دھار ہو رہی تھی، اسے اپنی برکت سے اڑا دیا، دیکھوں تو سبحان اللہ! صبح سعادت کا وقت ہے، چمن کے لہلہے، مرغان سحر کے چہچہے، پھولوں پر شبنم، صبا اور نسیم کم کم، جزیرے کے جزیرے میووں سے جھومتے اور پھولوں سے لہلہاتے ہیں۔ ان کے بیچ میں سمندر کا پانی جگمگ جگمگ لہریں مار رہا تھا۔ بڑے بڑے امراء شرفاء خلعت ہائے فاخرہ اور زرق برق کے لباس پہنے، پھولوں کے طرے سر پر، ہار گلے میں ڈالے، ادھر ادھر درختوں میں شعر پڑھتے پھرتے ہیں، کچھ فواروں کے نیچے حوض میں پاؤں لٹکائے بیٹھے ہیں، کچھ پھولوں کی کیاریوں میں بے تکلف لوٹتے ہیں اور گانا سن رہے ہیں۔ غرض کہ ہجوم بہار اور رسیلی آوازوں کے

ستاروں نے وہ جمگھٹ کر رکھا تھا کہ شور قیامت بھی آئے تو خبر نہ ہو۔ اس عالم کو دیکھ کر میرا ساغر دل خوشی سے چھلک گیا اور بے اختیار یہی جی چاہا کہ اگر باز کے پر ہاتھ آ جائیں تو اڑوں اور اس باغ فرح بخش میں جا پڑوں۔ لیکن اس پیر بزرگ نے کہا کہ وہاں جانے کا کوئی رستہ نہیں، الا دروازۂ موت کہ جس سے تم ڈرتے ہو۔ دیکھو وہ سرسبز اور رنگین جزیرے جو سامنے نظر آتے ہیں اور سمندر کے قالین پر گل کاری کر رہے ہیں، حقیقت میں اس سمندر سے بھی زیادہ پھیلاؤ رکھتے ہیں۔ جہاں تک تمہاری نظر کام کر سکے بلکہ جہاں تک تمہارا خیال دوڑ سکے، اس سے بھی آگے تک لاانتہا چلے جاتے ہیں۔ مرنے کے بعد نیک مردوں اور صاحب دلوں کے گھر یہی ہوں گے۔ جن جن لذتوں کو دل چاہے اور طبیعت کیفیت اٹھائے، سب یہاں موجود ہیں۔ ہر جزیرہ باغ جنت کا مکان ہے کہ اپنے اپنے مکین کے لائق شان ہے۔ کیوں آزاد! کیا یہ مقام اس لائق نہیں کہ جان تک بھی ہو تو دے دیجیے اور انہیں لیجیے؟ کیا اس زندگانی کو مصیبت سمجھنا چاہیے جس کی بدولت یہ نعمتیں حاصل ہوتی ہیں؟ کیا موت سے ڈرنا چاہیے؟ کیا ملک عدم کو خوش ہو کر نہ چلنا چاہیے، جس کی بدولت ایسی ایسی نعمتیں حاصل ہوں؟ نہیں نہیں، ہرگز نہیں۔ اور سنتے ہو! نہ سمجھنا کہ انسان، جس کے لیے یہ بے زوال سامان ہیں، اسے یوں ہی پیدا کر دیا ہے؟ دنیا مقام امتحان ہے، ہم تم یہاں امتحان دینے آئے ہیں۔ امتحان کا نام سنتے ہی چونک پڑا، آنکھ کھول کر دیکھا تو کچھ نہ تھا۔ 4

انسان کسی حال میں خوش نہیں رہتا

سقراط حکیم نے کیا خوب لطیفہ کہا ہے کہ اگر تمام اہل دنیا کی مصیبتیں ایک جگہ لا کر ڈھیر کر دیں اور پھر سب کو برابر بانٹ دیں، تو جو لوگ آپ اپنے تئیں بدنصیب سمجھ رہے ہیں، وہ اس تقسیم کو مصیبت اور پہلی مصیبت کو غنیمت سمجھیں گے۔

ایک اور حکیم اس لطیفے کے مضمون کو اور بھی بالاتر لے گیا ہے، وہ یہ کہتا ہے کہ اگر ہم اپنی اپنی مصیبتوں کو آپس میں بدل بھی سکتے تو پھر ہر شخص اپنی پہلی ہی مصیبت کو غنیمت سمجھتا۔

میں ان دونوں خیالوں کو وسعت دے رہا تھا اور بے فکری کے تکیے سے لگا بیٹھا تھا کہ نیند آگئی: خواب میں دیکھتا ہوں کہ سلطان افلاک کے دربار سے ایک اشتہار جاری ہوا ہے، خلاصہ جس کا یہ ہے کہ تمام اہل عالم اپنے اپنے رنج والم اور مصائب و تکالیف کو لائیں اور ایک جگہ ڈھیر لگائیں۔ چنانچہ اس مطلب کے لیے ایک میدان کہ میدان خیال سے بھی زیادہ وسیع تھا، تجویز ہوا اور لوگ آنے شروع ہوئے۔ میں بیچوں بیچ کھڑا تھا اور ان کے تماشے کا لطف اٹھا رہا تھا، دیکھتا تھا کہ ایک کے بعد ایک آتا ہے اور اپنا بوجھ سر سے پھینک جاتا ہے۔ لیکن جو بوجھ گرتا ہے، مقدار میں اور بھی بڑا ہوتا جاتا ہے، یہاں تک کہ وہ مصیبتوں کا پہاڑ بادلوں سے بھی اونچا ہو گیا۔

ایک شخص سوکھا سہما، دبلاپے کے مارے فقط ہوا کی حالت ہو رہا تھا، اس انبوہ میں نہایت چالاکی اور پھرتی سے پھر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک آئینہ تھا جس میں دیکھنے سے شکل نہایت بڑی معلوم ہونے لگتی تھی۔ وہ ایک ڈھیلی ڈھالی پوشاک پہنے تھا جس کا دامن، دامن قیامت سے بندھا ہوا تھا۔ اس پر دیوزادوں اور جنات کی تصویریں زر

دوزی کڑھی ہوئی تھیں، اور جب وہ ہوا سے لہراتی تھیں، تو ہزاروں عجیب و غریب صورتیں اس پر نظر آتی تھیں۔ اس کی آنکھ وحشیانہ تھی مگر نگاہ میں افسردگی تھی اور نام اس کا وہم تھا۔ ہر شخص کا بوجھ بندھواتا تھا اور لدواتا تھا اور مقام مقررہ پر لے جاتا تھا۔ میں نے اپنے ہم جنسوں اور ہم صورت بھائیوں کو جب بوجھوں کے نیچے گڑگڑاتا دیکھا اور ان مصیبتوں کے انبار کو خیال کیا تو بہت گھبرایا اور دل میں ایسا ترس آیا کہ بیان نہیں ہو سکتا۔ اس عالم میں بھی چند شخصوں کی حالت ایسی نظر آئی کہ اس نے ذرا میرا دل بہلایا۔ صورت بہلاوے کی یہ ہوئی کہ دیکھتا ہوں ایک شخص پرانے سے چکن کے چغے میں ایک بھاری سی گٹھڑی لیے آتا ہے۔ جب وہ گٹھڑی انبار میں پھینکی تو معلوم ہوا کہ افلاس کا عذاب تھا۔ اس کے پیچھے ایک اور شخص دوڑا آتا تھا، بدن سے پسینہ بہتا تھا اور مارے بوجھ کے ہانپتا جاتا تھا۔ اس نے بھی وہ بوجھ سر سے پھینکا اور معلوم ہوا کہ اس کی جورو بہت بری تھی، اس نے وہ بلا سر سے پھینکی ہے۔

ان کے بعد ایک بڑی بھیڑ آئی کہ جس کی تعداد کا شمار نہ تھا، معلوم ہوا کہ یہ عاشقوں کا گروہ ہے۔ ان کے سروں پر دود آہ کی گٹھڑیاں تھیں کہ انہی میں آہوں کے تیر خیالی اور نالوں کے نیزۂ وبالی دیے ہوئے تھے۔ اگرچہ یہ لوگ مارے بوجھ کے اس طرح درد سے آہیں بھرتے تھے کہ گویا اب سینے ان کے پھٹ جائیں گے، لیکن تعجب یہ ہے کہ جب اس انبار کے پاس آئے تو اتنا نہ ہو سکا کہ ان بوجھوں کو سر سے پھینک دیں، کچھ کچھ جدوجہد سے سر ہلایا مگر جس طرح لدے ہوئے آئے تھے، اسی طرح چلے گئے۔ بہت بڑھیاں دیکھیں کہ بدن کی جھریاں پھینک رہی تھیں۔ چند نوجوان اپنی کالی رنگت، کچھ کچھ موٹے موٹے ہونٹ، اکثر ایسے میل جمے ہوئے دانت پھینکتے تھے جنہیں دیکھ کر شرم آتی تھی۔ مگر مجھے یہی حیرت تھی کہ اس پہاڑ میں سب سے زیادہ جسمانی عیب تھے۔ ایک شخص کو دیکھتا ہوں کہ اس کی پیٹھ پر بھاری سے بھاری اور بڑے سے بڑا بوجھ ہے، مگر خوشی خوشی اٹھائے چلا آتا ہے۔ جب پاس آیا تو معلوم ہوا کہ یہ ایک کبڑا ہے اور آدم زاد کے انبار رنج والم میں اپنے کبڑے پن کو پھینکنے آیا ہے کہ اس کے نزدیک اس سے زیادہ کوئی مصیبت نہیں۔ اس انبار میں انواع و اقسام کے سقم اور امراض بھی تھے جن

میں بعض اصلی تھے اور بعض ایسے تھے کہ غلط فہمیوں نے خواہ مخواہ انہیں مرض سمجھ لیا تھا۔ ایک بوجھ مجھے اور نظر آیا، جو امراض آدم زاد پر عارض ہوتے ہیں، ان سب کا مجموعہ تھا۔ یعنی بہت سے حسین نوجوان تھے کہ اپنے ہاتھوں کی کمائی یعنی امراض نوجوانی اپنے ہاتھوں میں لیے آتے تھے، مگر میں فقط ایک ہی بات میں حیران تھا، اور وہ یہ تھی کہ اتنے بڑے انبار میں کوئی بے وقوفی یا بد اطواری[33] پڑی ہوئی دکھائی نہ دی۔ میں یہ تماشے دیکھتا تھا اور دل میں کہتا تھا کہ اگر ہوس ہائے نفسانی اور ضعف جسمانی اور عیوب عقلی سے کوئی نجات پانی چاہے تو اس سے بہتر موقع نہ ہاتھ آئے گا۔ کاش کہ جلد آئے اور پھینک جائے۔ اتنے میں ایک عیاش کو دیکھا کہ اپنے گناہوں کا بوجھ اٹھائے، بے پروا چلا آتا ہے۔ اس نے بھی ایک گٹھڑی پھینک دی۔ مگر جب دیکھا تو معلوم ہوا کہ گناہوں کے عوض اپنی عاقبت اندیشی کو پھینک گیا۔ ساتھ ہی ایک چھٹے ہوئے شہدے آئے، میں سمجھا کہ یہ شاید اپنی کوتاہ اندیشی کو پھینکیں گے، مگر وہ بجائے اس کے اپنی شرم و حیا کو پھینک گئے۔

جب تمام بنی آدم اپنے بوجھوں کا وبال سر سے اتار چکے تو میاں وہم کہ جب سے اب تک اس مصروفیت میں سرگرداں تھے، مجھے الگ کھڑا دیکھ کر سمجھے کہ یہ شخص خالی ہے۔ چنانچہ اس خیال سے میری طرف جھکے، ان کو اپنی طرف آتے دیکھ کر میرے حواس اڑ گئے، مگر انہوں نے جھٹ اپنا آئینہ سامنے کیا، مجھے اپنا منہ اس میں ایسا چھوٹا معلوم ہوا کہ بے اختیار چونک پڑا۔ برخلاف اس کے، بدن اور قد و قامت ایسا چوڑا چکلا نظر آیا کہ جی بیزار ہو گیا، اور ایسا گھبرایا کہ چہرے کو نقاب کی طرح اتار کر پھینک دیا۔ اور خاص خوش نصیبی اس بات کو سمجھا کہ ایک شخص نے اپنے چہرے کو بڑا اور اپنے بدن پر ناموزوں سمجھ کر اتار پھینکا تھا۔ یہ چہرہ حقیقت میں بہت بڑا تھا، یہاں تک کہ فقط اس کی ناک میرے سارے چہرے کے برابر تھی۔

ہم اس انبوہ پر آفات پر غور سے نظر کر رہے تھے اور اس عالم ہیولانی کی ایک ایک بات کو تاک کر دیکھ رہے تھے، جو سلطان افلاک کی بارگاہ سے حکم پہنچا کہ اب سب کو اختیار ہے جس طرح چاہیں اپنے اپنے رنج و تکلیف تبدیل کر لیں، اور اپنے اپنے بوجھ

لے کر گھروں کو چلے جائیں۔ یہ سنتے ہی میاں وہم پھر مستعد ہوئے اور پھر بڑی ترت پھرت کے ساتھ اس انبار عظیم کے بوجھ باندھ باندھ کر تقسیم کرنے لگے۔ ہر شخص اپنا اپنا بوجھ سنبھالنے لگا اور اس طرح کی ریل پیل اور دھکم دھکا ہوئی کہ بیان سے باہر ہے۔ چنانچہ اس وقت چند باتیں جو میں نے دیکھیں وہ بیان کرتا ہوں۔

ایک پیر مرد کہ نہایت معزز و محترم معلوم ہوتا تھا، درد قولنج سے جاں بلب تھا اور لاولدی کے سبب سے اپنے مال و املاک کے لیے ایک وارث چاہتا تھا۔ اس نے درد مذکور کو پھینک کر ایک خوبصورت نوجوان لڑکے کو لیا، مگر لڑکے ناہنجار کو نافرمانی اور سرشوری کے سبب سے دق ہو کر اس کے باپ نے چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ اس نالائق نوجوان نے آتے ہی جھٹ بڈھے کی داڑھی پکڑلی اور سر توڑنے کو تیار ہوا۔ اتفاقاً برابر ہی لڑکے کا حقیقی باپ نظر آیا کہ اب وہ درد قولنج کے مارے لوٹنے لگا تھا۔ چنانچہ بڈھے نے کہا کہ برائے خدا میرا درد قولنج مجھے پھیر دیجیے اور اپنا لڑکا لے لیجیے کہ میرا پہلا عذاب اس سے ہزار درجے بہتر ہے۔ مگر مشکل یہ ہوئی کہ یہ مبادلہ پھر نہ ہو سکتا تھا۔

ایک بچارا جہازی غلام تھا کہ اس نے قید زنجیر اور جہازی محنت کی تکلیف سے دق ہو کر اس عذاب کو چھوڑا تھا اور جھولے کے مرض کو لے لیا تھا۔ اسے دیکھا کہ دو قدم چل کر بیٹھ گیا ہے اور سر پکڑے منہ بسور رہا ہے۔

غرض اس طرح کئی شخص تھے کہ اپنی اپنی حالت میں گرفتار تھے اور اپنے اپنے کیے پر پچھتا رہے تھے۔ مثلاً کسی بیمار نے افلاس لے لی تھی، وہ اس سے ناراض تھا۔ کسی کو بھوک نہ لگتی تھی، وہ اب جوع البقر کے مارے پیٹ پیٹ رہا تھا۔ ایک شخص نے فکر سے دق ہو کر اسے چھوڑا تھا، اب وہ درد جگر کا مارا لوٹ رہا تھا، اور اسی طرح بر عکس۔ غرض ہر شخص کو دیکھ کر عبرت اور پشیمانی ہی حاصل ہوتی تھی۔

عورتیں بے چاری اپنے ادل بدل کے عذاب میں گرفتار تھیں۔ کسی نے تو سفید بالوں کو چھوڑا تھا، مگر اب پاؤں میں ایک پھوڑا ہو گیا تھا کہ لنگڑاتی تھی اور ہائے ہائے کرتی چلی جاتی تھی۔ کسی کی پہلے کمر بہت پتلی تھی، مگر چونکہ سینہ اور بازو بھی دبلے تھے اس لیے پتلی کمر کو چھوڑا تھا۔ اب گول گول بازوؤں کے ساتھ بڑی سی توند نکالے چلی

جاتی تھی۔ کسی نے چہرے کی خوبصورتی لی تھی مگر اس کے ساتھ بے آبروئی کا داغ اور بدنامی کا ٹیکہ بھی چلا آیا تھا۔ غرض ان سب میں کوئی ایسا نہ تھا کہ جسے پہلے نقص کی نسبت نیا نقص گراں نہ معلوم ہو رہا ہو۔ ان سب کی حالتوں کو دیکھ کر یہ میری سمجھ میں آیا کہ جو مصیبتیں ہم پر پڑتی ہیں، وہ حقیقت میں ہمارے سہارے کے موجب ہوتی ہیں، یا یہ بات ہے کہ سہتے سہتے ہمیں ان کی عادت ہو جاتی ہے۔

مجھے اس بڈھے کے حال پر نہایت افسوس آیا کہ ایک خوبصورت بجیلا جوان بن کر چلا، مگر مثانے میں ایک پتھری ہو گئی کہ اب بھی سیدھی طرح نہ چل سکتا تھا۔ اس سے بھی زیادہ اس نوجوان کے حال پر افسوس آتا تھا کہ بچارا لکڑی ٹیکتا گرتا پڑتا چلا جاتا تھا، کمر جھکی ہوئی، گردن بیٹھی ہوئی تھی، کھوے سر سے لو نچے نکل آئے تھے، اور جو عورتیں پہلے اس کی سج دھج پر جان دیتی تھیں، ان کا غول گرد تھا، یہ انھیں دیکھتا تھا اور پانی پانی ہوا جاتا تھا۔ جب سب کے مبادلے بیان کیے ہیں تو اپنے مبادلے سے بھی مجھے صاف نہ گزرنا چاہیے۔ چنانچہ اس کی صورت حال یہ ہے کہ بڑے چہرے والے یار میرے چھوٹے چہرے کو لے کر ایسے بدنما معلوم ہونے لگے کہ جب میں نے ان کی طرف دیکھا، تو اگرچہ میرا ہی چہرہ تھا، مگر میں ایسا بے اختیار ہنسا کہ میری اپنی صورت بھی بگڑ گئی، اور صاف معلوم ہوا کہ وہ بچارا میرے ہنسنے سے شرما گیا۔ مگر مجھے بھی اپنے حال پر کچھ کم فخر کی جگہ نہ تھی، کیونکہ جب میں اپنی پیشانی سے عرق ندامت پونچھنے لگا تو وہاں تک ہاتھ نہ پہنچ سکا۔ چہرہ اتنا بڑا ہو گیا تھا کہ ہاتھ رکھتا کہیں تھا اور پڑتا کہیں تھا۔ ناک اتنی بڑی ہو گئی تھی کہ جب چہرے پر ہاتھ پھیرا تو کئی دفعہ ہاتھ نے ناک سے ٹکر کھائی۔ میرے پاس دو آدمی اور بھی تھے کہ جن کے حال پر تمسخر کرنا واجب تھا۔ ایک تو وہ شخص تھا کہ پہلے تو ٹانگوں کے مٹاپے کے سبب سے چھدرا کر چلتا تھا۔ اس نے ایک لم ٹنگھ سے مبادلہ کر لیا تھا کہ جس میں پنڈلی معلوم ہی نہ ہوتی تھی۔ ان دونوں کو جو دیکھتا تھا وہ ہنستا تھا۔ ایک تو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا دو بلیوں پر چلا جاتا ہے۔ سر کا یہ حال تھا کہ گویا ہوا میں اڑا چلا جاتا ہے اور دوسرے کا یہ حال تھا کہ چل ہی نہ سکتا تھا۔ کمال کوشش سے قدم اٹھاتا تھا، مگر یہ حال تھا کہ دونوں طرف دو دائرے کھنچے چلے جاتے تھے۔ میں نے

اس عجیب الخلقت کی حالت غریب کو دیکھ کر کہا کہ "میاں اگر دس قدم سیدھے چلے جاؤ تو سوا دمڑی کی ریوڑیاں کھلاتے ہیں"۔

غرض وہ سارا انبار عورتوں اور مردوں میں تقسیم ہو گیا، مگر لوگوں کا یہ حال تھا کہ دیکھنے سے ترس آتا تھا، یعنی جان سے بیزار تھے اور اپنے اپنے بوجھوں میں دبے ہوئے اوپر تلے دوڑے پھرتے تھے۔ سارا میدان گریہ و زاری، نالہ و فریاد، آہ و افسوس سے دھواں دھار ہو رہا تھا۔ آخر سلطان افلاک کو بے کس آدم زاد کے حالِ دردناک پر رحم آیا اور حکم دیا "اپنے اپنے بوجھ اتار کر پھینک دیں، پہلے ہی بوجھ انھیں مل جائیں"۔ سب نے خوشی خوشی ان وبالوں کو سر و گردن سے اتار کر پھینک دیا۔ اتنے میں دوسرا حکم آیا کہ "وہم جس نے انھیں دھوکے میں ڈال رکھا تھا، وہ شیطان نابکار یہاں سے دفع ہو جائے"۔ اس کی جگہ ایک فرشتہ رحمت آسمان سے نازل ہوا۔ اس کی حرکات و سکنات نہایت معقول و باوقار تھیں اور چہرہ بھی سنجیدہ اور خوشنما تھا۔ اس نے بار بار اپنی آنکھوں کو آسمان کی طرف اٹھایا اور رحمت الٰہی پر توکل کر کے نگاہ کو اسی کی آس پر لگا دیا۔ اس کا نام صبر و تحمل تھا۔ ابھی وہ اس کوہ مصیبت کے پاس آ کر بیٹھا ہی تھا، جو کوہ مذکور خود بخود سمٹنا شروع ہوا، یہاں تک کہ گھٹتے گھٹتے ایک ثلث رہ گیا۔ پھر اس نے ہر شخص کو اصلی اور واجبی بوجھ اٹھا اٹھا کر دینا شروع کیا، اور ایک ایک کو سمجھاتا گیا کہ نہ گھبراؤ اور بردباری کے ساتھ اٹھاؤ۔ ہر شخص لیتا تھا اور اپنے گھر کو راضی رضامند چلا جاتا تھا۔ ساتھ ہی اس کا شکریہ ادا کرتا تھا کہ آپ کی عنایت سے مجھے اس انبار لاانتہا میں سے اپنا بار مصیبت چھانٹنا نہ پڑا۔

علوم کی بد نصیبی

تمہید

تمام صاحب جوہر اور کل اہل کمال ہمیشہ سے ان نالائقوں اور غلط نما باکمالوں کے ہاتھ سے نالاں ہیں، جو فلک کی سفلہ پروری یا قسمت کی یاوری سے ہوائے مراد کے بیلون میں بیٹھے ہیں اور ترقیوں کے آسمان پر سیر کرتے پھرتے ہیں۔ اس معاملے میں اہل علوم سے زیادہ کوئی واجب الرحم نہیں۔ صدیوں کے بعد تو کوئی صاحب صنعت پیدا ہوتا ہے۔ اگرچہ ہر شخص کے کام کی ترقی خاص اور عام کی قدردانی پر منحصر ہے، لیکن بنیاد اس کی حکام یا اہل دول کی بدولت قائم ہوتی ہے۔ اسی واسطے اس کی رونق بازار کی عمر بہت تھوڑی ہوتی ہے، اور ان خرابیوں کا بیان کرنا حد قلم سے باہر ہے، اول تو اہل کمال ہمیشہ کم اور بے کمال انبوہ در انبوہ ہیں۔ ان کی بھیڑ بھاڑ ایسی خاک اڑاتی ہے کہ ان کے کمال پر خاک پڑ جاتی ہے۔ ناچار دل شکستہ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ جو ثابت قدم رہتے ہیں، ان کی بد نصیبی یہ کہ جن قدردانوں پر مدار کار ہے، کبھی کثرت کار سے، کبھی بے پروائی سے، غرض تھوڑے ہی دنوں میں وہ اپنے شوق کو ان لوگوں کے حوالے کر دیتے ہیں جو اس کام کے لائق نہیں۔ اس صورت میں اگر قسمت سے ہوا چلی اور خود بخود کسی کی گود میں ثمر مراد آ پڑا تو آ پڑا، نہیں تو ذلت، تباہی اور

دربدری کے سوا کچھ حاصل نہیں۔ ان ناگوار باتوں کو غلط نما باکمال گوارا کر لیتے ہیں، مگر اہل کمال مرنے کو اس سے بہتر سمجھتے ہیں، پھر بھی ناچار گوارا کرنی پڑتی ہیں۔ سفارشیں اٹھاتے ہیں، دربدر پھرتے ہیں، خوشامدیں کرتے ہیں۔ غرضیکہ اس راستے کی منزلوں میں جو جو مصیبتیں پیش آتی ہیں، وہ ایک افسانے کے استعارے میں بیان ہوتی ہیں۔

آغاز مطلب :

علوم و فنون نے دیکھا کہ مدت گزر گئی، ہمارے مرید اور خدمت گزار فقط اپنی ارادت دلی سے انسان کے فائدوں کے لیے محنت کر رہے ہیں، اور جس صدق دل سے جانفشانی اور عرق ریزی کرتے ہیں، اس کا صلہ کچھ بھی نہیں ملتا۔ بلکہ جن بے لیاقتوں کو جوہر کمال سے کچھ واسطہ نہیں، اور انسان کی نفع رسانی کی کچھ بھی پروا نہیں رکھتے، وہ کامیابی اور عیش و عشرت کی بہاریں لوٹ رہے ہیں۔ سب کو اس بات کا بہت رنج ہوا اور سلطان آسمانی کے دربار میں عرض کی۔ خلاصہ جس کا یہ کہ "انصاف، عزت اور دولت کے انعام مرحمت ہونے واجب ہیں"۔ دربار میں مشتری صدر اعلیٰ تھا اور عطارد میر منشی۔ جب یہ عرضی پڑھی گئی تو جو جو خدمتیں اور ادائے خدمت میں مشقتیں تھیں، سب جتائی اور دکھائی گئیں، اور حق تلفیوں کا دعویٰ کیا گیا۔ معلوم ہوا کہ فی الحقیقت عالم خاک میں علوم و فنون کی کوششوں اور کارگزاریوں کا شکریہ کسی نے ادا نہیں کیا۔ اب وہ آئے دن کے دکھ بھرتے بھرتے ایسے دق ہو گئے ہیں کہ یقین ہے چند روز میں دنیا کو چھوڑ کر عالم بالا کی طرف چلے آئیں۔ اور اگر وہ دنیا میں نہ رہے تو حضرت انسان، جنہوں نے یہ شوکت و شان بنائی ہے، حیوانوں سے بدتر رہ جائیں گے۔ پھل پھلاری، گھاس پات چرتے پھریں گے، جنگلوں کے جانور بن جائیں گے اور جو ان سے زیادہ وحشی ہوں گے وہ انہیں پھاڑ کھائیں گے۔ اس کے فیصلے کے لیے عالم بالا میں کمیٹی ہوئی۔ قاعدہ ہے کہ جو ارکین دربار کا رنگ ہوتا ہے، وہی کل دربار کا رنگ ہوتا ہے۔ چنانچہ سب کا اتفاق

رائے اس بات پر ہوا کہ ضرور کسی کو بھیجنا چاہیے۔ ملکہ کو کب جمال کی ایک بیٹی تھی کہ باپ اس کا عالم خاکی سے تھا، مگر اس کے نور جمال اور حسن کمال نے تمام عالم بالا کو روشن کر رکھا تھا، اور صداقت و حقیقت کے مدرسے میں تعلیم پائی تھی۔ اسے حضور سے ملکہ عالم افروز کا خطاب عطا ہوا اور عقل کا تاج سر پر رکھا گیا، جس میں آفتاب کی طرح فہم و ادراک کی شعاعیں جگمگاتی تھیں۔ رفعت کا تخت پھولوں سے سجایا۔ اس ملکہ موصوفہ کو جلوہ گر کر کے اس طرف روانہ کیا۔ آسمان نے تارے اتارے اور زمین نے بجائے غبار کے نور اڑایا۔ اس نے بھی عالم میں آ کر باپ کی طرف سے وہ شان و شوکت کی لیاقت دکھائی، جس سے تمام بے لیاقت تھرا گئے، اور ماں کی طرف سے وہ روشنی پھیلائی کہ کرہ خاک نور کی قندیل ہو گیا۔ دن رات دربار جاری تھا۔ علوم کے مسائل اور ان کی تصنیفات کے مقدمات پیش ہوتے تھے۔ استاد، یعنی صداقت کی طرف سے متانت اور خاموشی مصاحبت میں آئی تھی، چنانچہ علوم و فنون جن لوگوں کی سفارش کرتے تھے، وہ ان ہی کے ذریعے آ کر پیش ہوتے تھے۔

عالم بالا کے لوگ علم کے عاشق تھے۔ سب اس کی فرمانروائی دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ جلوس دربار کے لیے ہر طرح کے سامان بھیجے اور بارگاہ شاہی نے عجب شان و شکوہ حاصل کی۔ جب دربار میں آ کر بیٹھتی تو عدل و انصاف کھوٹے کھرے کے پرکھنے کو کھڑے رہتے، امید سامنے ناچا کرتی، قدردانی دست راست پر کھڑی رہتی اور سخاوت کے اشارے کے بموجب ہر ایک کو انعام دیتی کہ قسمت کے ہاتھوں لوگوں تک پہنچ جاتے تھے۔

ایک دن ملکہ عالم افروز اپنے رفعت کے تخت ہوادار پر سوار ہو کر ہوا کھانے نکلی۔ اتفاقاً ایک پہاڑ کی طرف گزر ہوا۔ کوہ مذکور پر جہالت ایسی چھائی ہوئی تھی کہ دامن کوہ سے لے کر چوٹی تک تمام دھواں دھار سے گھٹ رہا تھا۔ اس کے قدم سے سیاہی کے دھوئیں اڑ گئے اور تمام تاریکی برطرف ہو گئی۔ یہاں اگر چھاؤں بھی تھی تو نہ بارش کی سیرابی سے، بلکہ گھٹاؤں کے پسینے سے سیل 34 رہی تھی۔ اب اس نے اپنی سرسبزی کو ہرا کیا۔ کچھ پھول تھے جو روشنی بغیر ٹھٹھر رہے تھے، وہ بھی چمک کر رنگ

نکال لائے۔ غرض ہر شے کی طبیعت اپنی اصلیت پر آکر شگفتگی کے جوش سے کھل گئی اور خوشبوؤں سے عالم مہک گیا۔

روئے زمین پر بہار کا یہ عالم دیکھ کر سلطان آسمانی نے بھی حکم دیا کہ سامنے سے پردے اٹھا دو۔ عالم بالا کے پاک نہادوں نے گلدستے ہاتھوں میں لے لیے اور خوش ہو کر پھول اچھالنے لگے۔

جب اس پہاڑ کو گلوں سے گلزار اور شادابی سے تو بہار دیکھا تو علم تعمیر وہاں آیا۔ اپنے کمال سے ایک محل عالیشان تیار کیا۔ بہار نے کوسوں تک گلزار لگایا، طرح طرح کے اوزار کام میں آئے، سڑکیں نکالیں، اتار چڑھاؤ درست کیے، ریلیں جاری کیں، جابجا فرودگاہیں اور ان میں مہمان خانے اور آرام خانے بنائے۔ غرض عجائبات و غرائبات سے سجا کر ایسا طلسمات کر دیا کہ جس کے دیکھنے سے آنکھوں کو طراوت اور خیالات کو بلندی و وسعت حاصل ہو، اور تصنیفات میں ایجاد اور مضمون آفرینی کے لیے سامان بہم پہنچیں۔ چنانچہ ملکہ نے یہیں سکونت اختیار کی۔ قسمت نے آکر انعاموں کا دروازہ کھول دیا۔ صداقت جانچتی تھی اور عدل بے رو رعایت دیے جاتا تھا۔ یہ دروازہ رات دن کھلا رہتا تھا۔ امید دروازے پر بیٹھی رہتی تھی، اور جن کے لیے علوم و فنون سفارش کرتے تھے، انہیں بلا لیتی تھی۔ تمام دربار کثرت خلائق سے بھرا رہتا تھا، اور ہر چند اکثر اشخاص ناکام بھی جاتے تھے مگر شکایت کوئی نہ کر سکتا تھا، کیونکہ خود ملکہ کی آنکھ کسی سے غافل نہ تھی۔ جو لوگ وہاں سے ناکام پھرتے تھے، ان کا نام بھی نالائقوں کی فہرست میں درج ہو جاتا تھا، پھر وہ عالم شہرت سے خارج ہو کر یا تو گمنامی کے گوشے میں بیٹھ جاتے تھے کہ کوئی انہیں پوچھتا نہ تھا یا ہیچ و پوچ اور واہیات کاموں پر جھک پڑتے تھے۔ بعض ایسے تھے کہ محنت سے مدد لیتے تھے اور پھر اپنے نقص کی تکمیل میں کوشش کرتے تھے۔

اب اہل نظر غباری عینکیں لگالیں کہ بے کمالوں کے دلوں کے غبار آندھی ہو کر اٹھتے ہیں۔ ان کے اقبال کا دور آیا:

ناکاموں میں اکثر نااہل ایسے بھی تھے کہ نہ اپنی ناکامی پر شرمندہ ہوتے تھے، نہ شرمندگی کے گوشے میں بیٹھتے تھے۔ چند روز کے بعد ان کی تعداد بہت بڑھ گئی۔ ایک دن سب نے محل کو گھیر لیا اور باغ میں آکر بستر ڈال دیے۔ ہر چند ملکہ مذکور کا جوہر افلاکی تھا، مگر باپ کی طرف سے پیوند خاکی تھا، اس لیے تجویز میں کچھ نہ کچھ چوک بھی ہوتی تھی۔ اور اگرچہ اس خطا کی اصلاح بھی بہت جلد ہو جاتی تھی، مگر پھر بھی حریف تاک میں لگے ہوئے تھے۔ انھیں کہیں نہ کہیں موقع گرفت کا ہاتھ لگ ہی گیا۔ چنانچہ انھوں نے کچھ اپنے رفیقوں کے گھروں میں کمیٹیاں شروع کر دیں، اور آپس ہی میں نالش اور اپیل کے سے ڈھنگ ڈال دیے۔ تمام عالم میں رفاہ عام، رفاہ عام اور اصلاح اصلاح کا نام کر کے فریاد مچا دی، جس سے جمعیت بے شمار اکٹھی ہو گئی۔ صبح و شام جمع ہوتے، لمبی لمبی تقریریں کرتے، مگر اس میں مطلب کا نام نہیں، جھوٹ موٹ کی ہوائیں کرتے جنھیں دلیل سے کام نہیں۔ کوئی سرو قد بن کر رائے دیتا، کوئی شمشاد ہو کر رائے شامل کرتا، کوئی تائید کرتا، کوئی تسلیم کرتا، آپ ہی اتفاق رائے کر لیتے، آپ ہی واہ واہ کر لیتے۔ اسی تودۂ طوفان کو لکھتے اور پروسیڈنگ (روئداد) نام رکھتے تھے، جسے مشتہر کر کے بڑے فخر کیا کرتے۔

ان ناکاموں کی امید سے راہ تھی اور بے حیائی ان کی بڑی خیر خواہ تھی۔ چنانچہ وہ ہمیشہ ان کو ملکہ کے دربار کی طرف ڈھکیلتی رہتی تھی، کہ چلو اور دوبارہ دعوے پیش کرو۔ اگرچہ وہاں سے دھکے کھاتے تھے اور جب جاتے نکالے جاتے تھے، اس پر بھی امید کا یہ حال تھا کہ ان کی رفاقت چھوڑتی نہ تھی، اور بے حیائی برابر زور لگائے جاتی تھی۔ غرض ان اندرونی راہوں کے ساتھ انھوں نے ایک اور راستہ نکالا، یعنی خیال کیا کہ یہ جمعیت ہماری جو امید کی حمایت اور بے حیائی کی عنایت سے روز افزوں ہے، اس کی کثرت ہمیں ضرور فتح یابی بخشے گی۔ پس جس طرح ہو سکے اپنی بھیڑ بھاڑ کو بڑھانا چاہیے۔

جب پروردگار کسی بندہ خاص کو عزت کی نظر سے دیکھتا ہے اور
اپنے بندوں کے کام اس کے سپرد کرتا ہے، تو خواہ مخواہ کے

خیر خواہ مشورت دینے کو بہت پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر ان باتوں میں آکر حقیقت اور واقعیت کو نہ بھول جانا چاہیے۔ خیال کر کے سنو، یہ خیر خواہ کیسے کیسے ہوتے ہیں:

ادھر تو بے لیاقت اہل فساد نے یہ سامان بہم پہنچائے، ادھر یہ قدرتی پیچ پڑا کہ ملکہ کو آسمان سے اترے ہوئے مدت ہوئی تھی۔ عالم خاک میں آکر نیت اس کی پستی کی طرف زیادہ مائل ہونے لگی اور عدل و انصاف کی نصیحتیں سب بھول گئیں۔ یا تو صحبت اس کی علوم و فنون سے تھی، یا غرور سے دوستی ہو گئی، آرام اور غفلت کو مصاحبت میں لے لیا اور رفتہ رفتہ غرور سے ایسی رسم وراہ بڑھی کہ اس سے شادی ہو کر دو لڑکیاں بھی پیدا ہو گئیں۔ ایک ان میں سے خوشامد اور دوسری خام خیالی۔ خوشامد نے فیاضی سے فیض تعلیم پایا تھا اور خام خیالی نے قسمت سے۔

غرور کے محل میں بی بی خود پسندی بھی تھیں جن کا اس نے دودھ پیا تھا۔ دوسری دایہ خود رائی تھی، اس نے پالا تھا۔ ملکہ علم افروز نے یہ غضب کیا کہ ساری خو بو خاوند کی اختیار کر لی۔ رفتہ رفتہ خود رائی کی صلاح سے فیصلے اور خود پسندی کے دستخط سے احکام جاری ہونے لگے۔ صداقت نے جو سبق پڑھائے تھے، سب بھلا دیے، اور عدل تو بیکار ہی ہو گیا۔ جب ان مصاحبوں کے اختیار اور لڑکیوں کی محبت زیادہ ہوئی تو علوم کا زور بالکل گھٹ گیا۔ اس کے رفیق اور قدردان دربار سے بند ہو گئے۔ وہ بے چارے بجھے چراغوں کی طرح طاقوں میں پڑے رہتے، ملکہ کا منہ دیکھنا بھی نصیب نہ ہوتا۔ انجام اس کا یہ ہوا کہ علوم و فنون کے خدمت گزار محنتیں کر کے، راتوں کو صبح اور صبحوں کو رات کرتے۔ برسوں کی دست کاریوں میں اپنے کمال ظاہر کرتے، مگر صلے کے نام خاک بھی نہ پاتے۔ البتہ ان میں بھی جو چالاک ہوتے اور خام خیالی اور خوشامد کی وساطت سے وہاں تک جا پہنچتے، ان کے لیے سب کچھ موجود تھا۔

جب ارکان سلطنت کی بے اعتدالیاں حد سے گزر جائیں، تو اہل فساد کیوں سر نہ اٹھائیں:

جب دربار کا رنگ اس طرح بے رنگ ہوا، نہ علوم کے قدردان وہاں رہے، نہ فنون کے جوہر شناس، تو چرچے اس کے جابجا پھیلے، اور ان نالائقوں کو بھی خبریں پہنچیں، جن کی علوم سفارش نہ کرتے تھے۔ چنانچہ یہ خبریں سن سن کر ان کے ہاں بڑی خوشیاں ہوتی تھیں۔ وہ ملکہ کے دل سے دشمن و بد خواہ تھے۔ ان باتوں کو اس کے زوال دولت کے آثار سمجھ کر اپنی کامیابی کی تدبیروں میں زیادہ سرگرم ہوئے۔ ادھر ملکہ کے دربار کا یہ حال تھا کہ امید، خام خیالی کے آنے سے خوش تھی۔ ادھر بے حیائی اپنے یاروں کو خوشامد کے سپرد کرتی جاتی تھی۔ دشمن مخفی، جو شیطان کی طرح لپٹے ہوئے تھے، ملکہ کو ان کا خیال بھی نہ تھا۔

حضرت انسان کا قاعدہ ہے جب اپنے اوج پر آتے ہیں تو اصلیت کو بھول جاتے ہیں۔ اچھوں کو گھٹاتے ہیں، بروں کو بڑھاتے ہیں، ویسے ہی اپنے کیے کی سزا پاتے ہیں:

مقام افسوس یہ ہے کہ ملکہ کی شان شاہی نہ رہی، دکھاوے کی رسموں پر آگئی۔ زبانی خرچ بہت، باقی ندارد۔ مبالغے، استعارے، بلند پروازیاں، لفاظیاں حد سے زیادہ، مضمون و مدعا غائب۔ کتابیں جلدیں کی جلدیں، مطلب پڑھو تو ایک حرف نہیں، یا تعریف اور خوشامد یا بے لطف اور بے معنی عبارتیں۔ انجام یہ ہوا کہ فقط اوپر اوپر کے تزک واحتشام تھے، اندر کچھ نہ تھا۔ یا تو ہر عرضی فوراً سنی جاتی تھی۔ اور ہر بات پر خاطر خواہ توجہ ہوتی تھی، یا باہر ایک ایوان بنا کر اس کا نام منتظر خانہ رکھا گیا کہ امیدوار وہاں جا کر حاضر ہوا کریں۔ جن لوگوں کو بے حیائی خوشامد کے سپرد کرتی تھی، وہ بے روک اس گھر میں چلے جاتے تھے، کوئی مزاحم نہ ہوتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ رنگ برنگ کا آدمی دربار میں آ کر بھر گیا۔ ملک ملک کے لوگ چلے آتے تھے اور فقط حمایتوں کے بھروسے پر اس جوش و خروش سے اظہار کمال اور امتحان دینے کو بڑھتے تھے کہ ایک پر ایک گرتا تھا۔

جب دربار کا رنگ بگڑتا ہے تو غرضمندوں کے خیالات

اس سے بجھو جاتے ہیں۔ مگر تم یہ خیال کرو کہ اس عالم
میں غریب غرض مندوں پر کیا گزرتی ہے:

جو لوگ اس دربار عام میں شریک ہوتے تھے، وہ سمجھتے تھے کہ ہم ملکہ کی خدمت میں پہنچ گئے، کیونکہ ان کے لیے بڑا قوی وسیلہ تھا، یعنی خوشامد۔ خوشامد کے ہاں حقیقت اور واقعیت دونوں کو دخل نہیں۔ مگر اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہاں سے معاملہ قسمت پر جا پڑا تھا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اندر کا دروازہ خام خیالی کے سپرد تھا، اور وہ اپنے دل کی رانی تھی۔ جب چاہتی کھول لیتی تھی، جب چاہتی تھی بند کر دیتی تھی۔ غرضیکہ بد نصیب غرضی دار اپنی ساری عمر عزیز اس بدحالی میں برباد کرتے تھے کہ کبھی آس کبھی بے آس، ابھی خوش ابھی اداس۔ اس ایوان کے اندر جو اس داروغہ تھا اور امیدواروں کا یار بنا ہوا تھا۔ وہ دم بدم آتا تھا اور ایسی ایسی باتیں کان میں پھونک جاتا تھا کہ جن کا پورا ہونا قیامت تک ممکن نہ ہو، اور امید کہتی تھی کہ ہاں ہاں اب حسن قبول کا خلعت دلواتی ہوں۔

ساتھ ہی اس کے رشک ڈیوڑھی کا داروغہ تھا۔ اس کے گھر میں رات دن آگ پڑی دہکتی تھی۔ یہ سب اس کی سپردگی میں تھے، اور باوجودیکہ اس حال تباہ میں گرفتار تھے، مگر بدقسمتی یہ کہ اب بھی اتفاق نہ کرتے تھے۔ ایک ایک کو دیکھتے تھے اور جلے مرتے تھے اور آپس میں لڑتے تھے۔ عمارت مذکور میں اندھیرا چھایا تھا، دیواروں پر الو بول رہے تھے، گرد بدنامی کی چمگادڑیں اڑتی پھرتی تھیں، ان کی آنکھوں میں علم کی شعاعیں سوئیاں ہو کر چبھتی تھیں، اور پروں [35] سے ایسی خرابی و خواری کی بوندیں جھاڑتی تھیں کہ جس پر گرتی تھیں، داغ پڑ جاتا تھا۔

حق داروں کا حق کچھ نہ کچھ زور رکھتا ہے، مگر نہ اس قدر کہ
طوفان نوح کا مقابلہ کر سکے:

ہر چند جس شخص کے داغ لگتا تھا، نیک نامی بھی اس کے پیچھے پیچھے ہو لیتی تھی۔ مگر خدا جانے بڑھاپا یا بیماری کا ضعف تھا کہ بہت آہستہ آہستہ چلتی تھی۔ یہ بے چاری

ہر چند کوشش کرتی تھی کہ کسی طرح اپنا رنگ پھیر کر اس دھبے کو چھپا دے، لیکن خرابی یہ تھی کہ اس کا رنگ بہت کچا تھا، ذرا پانی لگنے سے یا دھوپ میں رہنے سے اڑ جاتا تھا کہ اس سے دھبے اور بھی روشن ہو جاتے تھے اور بدنامی کے داغ کبھی نہ مٹتے تھے۔ البتہ صداقت کے تخت کے نیچے ایک چشمہ جاری تھا، اس کے پانی سے خوب دھوئے جاتے تھے، مگر وہاں سے اس پانی کا آنا مشکل تھا۔ ہاں، اگر لاتا تھا تو وقت ہی لاتا تھا[36]۔

طوفان بے تہذیبی میں قدم رکھنے کو جگہ ملے
تو بھی گوشہ گیری ہی بہتر ہے:

چونکہ علوم کا دل گوارا نہ کرتا تھا کہ اپنے معتقدوں کو اس طرح تباہی کی حالت میں دیکھیں، اس لئے اکثروں کو لے لیتے تھے۔ چنانچہ وہ بھی تاک میں لگے رہتے تھے، اور جب موقع پاتے، کسی نہ کسی ڈھب سے ملکہ کی خلوت میں جا پہنچاتے تھے۔ ملکہ دیکھ کر فقط ابرو کا اشارہ کر دیتی تھی، یعنی منتظر خانے میں حاضر ہوں۔ وہاں کوئی ان کی سنتا نہ تھا، کیوں کہ ان بے چاروں کو نہ فقط رشک بلکہ وسواس بھی ستاتا تھا۔ بے حیائی ایک چیخ مار کر کہتی تھی کہ کیوں خواہ مخواہ گھس آئے، اور بدنامی کو اشارہ کرتی تھی کہ جاؤ داغ لگا دو، اخباروں میں چھاپ دو، اشتہار دے دو، سارے جہاں میں رسوا کر دو۔ یہ بچارے گھبرا کر گرتے پڑتے بھاگتے تھے۔ کسی کی کتاب چھٹ پڑتی تھی، کسی کا عمامہ رہ جاتا تھا، مگر اکثر داغ بھی کھاتے تھے۔ جو جو داغ لگ جاتے تھے، وہ نہایت مشکل سے دھوئے جاتے تھے، اور جن کے وہ داغ لگا ہوا تھا، لوگ دور ہی سے تاڑ جاتے تھے کہ ضرور کبھی نہ کبھی منتظر خانے کی ہوا کھا آئے ہیں۔

غرض مند بچارے ہر طرح ادائے خدمت کو حاضر ہیں، کاش کہ وہاں قبول ہوں۔ باقی امیدوار اس مبارک گھڑی کے انتظار میں بیٹھے رہتے تھے کہ کب خام خیالی اندر آنے کا اشارہ کرے، اور کب ہم حضور میں باریاب ہوں۔ یہ غرض مند بچارے احتیاج کے مارے اسے خوش بھی کرتے تھے، مگر نہ فصاحت اصلی یا اشعار واقعی، یا خیالی عالی سے، بلکہ برخلاف اس کے جھوٹی داستانیں، عاشقانہ افسانے، زٹلیات، ڈھکوسلے کہ

ان میں ملکہ کی بھی تعریف ہوتی تھی اور اس کے شوہر، یعنی غرور کی بھی خوشامد ہوتی تھی۔ غضب یہ تھا کہ وہاں یہ بھی ایک آدھ ہی دفعہ سنی جاتی تھی۔ کچھ تو خوش طبعی چٹکیوں میں اڑا دیتی تھی، کچھ بد دماغی کی چھیں جبیں میں چلے جاتے تھے، بعض اشخاص خام خیالی کی بدولت دربار تک پہنچ بھی گئے اور ملکہ نے قسمت سے انعام بھی ایسے ایسے دلوائے جن کی انہیں خود بھی امید نہیں تھی۔ مگر تخت کے پانداز میں کچھ سونے کی زنجیریں پڑی تھیں، جھٹ گلے میں ڈالیں اور وہیں باندھ دیا کہ ہر دم زیر نظر رہو، مگر اشاروں پر کام کرو اور اسی طرح زندگی بسر کر دو۔ لطف یہ تھا کہ لوگ ان زنجیروں کو پہن کر فخر کرتے تھے، اور کیسے ہی نازیبا اور بے عزتی کے کام لے، بلکہ گالیاں بھی دے، تو پیشانی پر بل نہ لاتے تھے۔ اس پر خام خیالی جب چاہتی تھی، پکڑ لیتی تھی اور زیور و لباس اتار، پھر ختنظر خانے میں دھکیل دیتی تھی۔

یہ لوگ وہاں آ کر پھر طوفان بے تمیزی کی بھیڑ میں مل جاتے تھے۔ وہاں بعض اشخاص جنہیں تجربے کی نصیحت نے کچھ اثر کیا تھا، وہ تو کسی اور راستے سے ہو کر نکل گئے اور کوئی اور خوش حالی کی راہ ڈھونڈلی۔ باقی وہیں پڑے رہے، عمر گذار گئے اور خوشامد کے ذریعے سے خام خیالی کو خوش کرتے رہے۔ اتنے میں ایک اور بھیڑ کا ریلا آ گیا۔ چنانچہ جب جگہ نے تنگی کی تو گرد مکان مذکور کے بہت سے کمرے تھے، ان میں سے ہر ایک کو حیثیت کے بموجب بیماری، کاہلی، سستی، شرمندگی، مایوسی کے کمروں میں ڈال دیا کہ وہاں وعدے اور وعدہ شکنی، خوشی اور ناخوشی، امید اور ناامیدی میں زندگی کے دن پورے کرتے رہیں اور آخر ملک عدم کو چلے جائیں۔

دیکھو! صبح کے راستہ بھولے ہوئے شام کو گھر آتے ہیں:

علوم و فنون نے بہت سے دھکے کھا کر معلوم کیا کہ اب اس جہان میں رہنا عزت نہیں، بلکہ بے عزتی ہے۔ ملکہ کے محل سے نکلے، تمام دنیا میں پھرے، تکلیف و مصیبت کے سوا کچھ نہ پایا۔ اتفاقاً ایک سبزہ زار میں گزر ہوا۔ ایک بہتے چشمے کے کنارے پر کچھ چھوٹے چھوٹے مکان اور کئی جھونپڑیاں نظر آئیں۔ معلوم ہوا کہ آزادی کی آرام گاہ یہی

ہے۔وہ تحمل کی بیٹی تھی اور قناعت کی گود میں پلی تھی۔ چنانچہ سب سے الگ اس گوشہ عافیت میں پڑی رہتی اور کنج عافیت اس کا نام رکھا تھا۔ یہ مقام علوم وفنون کو بھی گزران کے قابل معلوم ہوا۔وہاں جا کر دیکھا تو دانائی، دور اندیشی، کفایت شعاری بھی موجود ہیں۔ علوم نے چند روز تک ان کی صحبت کو غنیمت سمجھا اور آزادی کے دامن کے نیچے اپنی عزت اور آسائش کو چھپا کر زندگی بسر کرنے لگے۔اے اہل علم! اب وہی زمانہ ہے، عزت چاہو تو اس طرح گزارا کرو۔

کیوں آزاد! مجھے تو ان لوگوں پر رشک آتا ہے جو شہرت کی ہوس یا انعاموں کی طمع پر خاک ڈال کر گوشہ عافیت میں بیٹھے ہیں اور سب بلاؤں سے محفوظ ہیں۔ نہ انعام سے خوش، نہ محرومی سے ناخوش، نہ تعریف کی تمنا، نہ عیب چینی کی پروا۔ اے خدا! دل آزاد دے اور حالت بے نیاز۔

علمیت اور ذکاوت[37] کے مقابلے

تمہید:

جو لوگ علم و کمال کی مسندیں بچھا کر بیٹھے ہیں، ان کی مختلف قسمیں ہیں: اول وہ اشخاص ہیں کہ جس طرح علم کتابی اور درس و تدریس میں طاق ہیں، اسی طرح حسن تقریر اور شوخی طبع میں براق ہیں۔ دوسرے وہ کہ ایک دفعہ کتابوں پر عبور کر گزرے ہیں، مگر پھر خالی ہڈیاں سمجھ کر ان کے درپے نہ ہوئے۔ ہاں ایجاد و اختراع پر مرتے ہیں، کبھی تقریر کرتے ہیں، کبھی تحریر کرتے ہیں، مگر اپنے اپنے موقع پر یہ عالم ہوتا ہے کہ قلم سے موتی برستے ہیں اور منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ تیسرے ایسے بھی ہیں کہ پیٹ کی الماری میں جہان کی کتابیں بھرے بیٹھے ہیں، لیکن تقریر کے میدان اور ایجاد کے موقع پر دیکھو تو فقط مٹی کا ڈھیر ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ اخیر کے دونوں باکمال ایک دوسرے پر حرف رکھتے ہیں، بلکہ حریف کو خاطر میں نہیں لاتے۔ ان دونوں کی ہمیشہ چوٹیں چلتی رہتی ہیں، اور مناظرے اور مباحثے جو آئے دن جاری رہتے ہیں، ان میں مختلف منزلیں پیش آتی ہیں، جن کے اُتار چڑھاؤ سے اپنی غلطیوں کے سبب سے بار بار رفتار کے ڈھنگ بدلنے پڑتے ہیں۔ تعجب یہ ہے کہ دیکھنے والوں کی طبیعتیں بھی مختلف ہیں، اسی واسطے دونوں کے طرف داروں سے دو جتھے ہو جاتے ہیں اور ان

کے مباحثوں اور مقابلوں میں عجیب لطف دیکھنے میں آتے ہیں، جن کے نشیب و فراز کو نظر غور سے دیکھنا اقلیم علم کے سیاحوں کے لیے ایک عجیب تماشہ ہوتا ہے۔ یہ ایسا ہے کہ جیسے تمہیں کسی گلزار ملک کی سیاحی کا شوق پیدا ہو، اور ادھر کے کسی مسافر کا ایک سفر نامہ مل جائے، یا اس سر زمین کا ایک نقشہ ہاتھ آجائے کہ گھر بیٹھے وہ لطف حاصل ہو جائے۔ داستان مفصلہ ذیل ان معرکوں کا ایک مرقع کھینچ کر دکھاتی ہے۔

صورت معرکہ:

کہتے ہیں کہ اقلیم خیال میں ایک وسیع ولایت تھی جس کا نام ملک فصاحت اور وہاں کے بادشاہ کا لقب ملک الکلام تھا۔ بادشاہ مذکور کے محلوں میں دو بیبیاں تھیں: ایک کا نام فرحت بانو اور دوسری کا نام دانش خاتون تھا۔ دانش خاتون کا ایک بیٹا تھا؛ یہ سیدھا سادا شخص حسن متانت میں باپ کا خلف الرشید اور تمکنت اور سنجیدگی میں ماں کی تصویر تھا۔ اسے علم کہتے تھے۔ فرحت بانو کی بیٹی ذکاوت تھی کہ باپ کے سبب سے خوش بیانی میں اسم با مسمیٰ اور ماں کے اثر سے زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی میں گلاب کے تختے کو شرمندہ کرتی تھی۔ چونکہ فرحت بانو اور دانش خاتون دونوں سوکنیں تھیں، دونوں بچوں نے بگاڑ کا دودھ پیا تھا اور بگاڑ ہی میں پرورش پائی تھی، یعنی ابتداء سے ایسی باتیں دل پر نقش ہوئی تھیں کہ ایک ایک کو خاطر میں نہ لاتا تھا، بلکہ ہر ایک دوسرے کی صورت سے بیزار تھا۔ باپ نے دیدہ دور اندیش سے ان کی نااتفاقی کے نتیجے پہلے ہی دیکھ لیے تھے۔ اس لیے بہت کوشش کی کہ کسی طرح ان کے دل اپنائیت کی گرمی محبت سے ملائم ہوں۔ آخر صورت یہ نکالی کہ اپنی نظر محبت کو دونوں میں برابر تقسیم کر دیا۔ مگر باپ کی شفقت منصفانہ نے کچھ اثر نہ کیا، کیونکہ ماؤں کی طرف کی عداوت دور تک جڑ پکڑے ہوئے تھی، اور بچپنے کے خیالات کے ساتھ مل کر آہستہ آہستہ بہت دور تک پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ نئے نئے موقع جو پیش آتے تھے، ان میں عداوت مذکور اور بھی پختہ ہوتی جاتی

تھی۔ مگر اس میں شک نہیں کہ دونوں کے دونوں خوبی و کمال کی جان اور تعلیم و تہذیب کے پتلے تھے۔ جب ذرا ہوش سنبھالا تو عالم بالا کے پاک نہادوں کی نظر ان پر پڑنے لگی اور وہاں کی مہمانیوں میں آنے جانے لگے۔ چند روز کے بعد ذکاوت نے باپ کے اشارے سے اپنے نشاط محل میں بڑے بڑے اہل کمال کو جمع کر کے رقاصہ فلک، یعنی زہرہ کی ضیافتیں کرنی شروع کیں مگر ان جلسوں میں علم کا سانگ بھرا، اور اس میں اس خوبی سے اس کی ہجو کی کہ محفل کو لٹا لٹا دیا۔ علم نے بہت برا مانا۔ چنانچہ اس کے توڑ پر قاضی افلاک یعنی مشتری کی ضیافت کی اور اپنے زور علم سے شہزادی ذکاوت کی بے اصل سخن سازی اور بے علم طرازیوں کی قلعی کھولنی شروع کی۔ اور مشتری نے عطارد کے اتفاق رائے سے عمامہ فضیلت اس کے سر پر باندھ دیا۔ اسے تدبیر اور تقدیر کا انقلاب کہتے ہیں کہ ماں باپ نے جن لوگوں کو موید سمجھ کر فہمائش اور اصلاح کے لیے کہا تھا وہی چمکانے لگے، اور نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ عداوت کی آگ اور بھی بھڑک اٹھی۔ اسی عالم میں دونوں بڑے ہوئے اور اب انہیں عالم قدس کے دربار میں جانے کا شوق پیدا ہوا۔ مگر وہ بھی اس لئے نہ تھا[38] کہ خود کچھ عزت و حرمت حاصل کریں، بلکہ ہر ایک کی غرض یہ تھی کہ اپنے حریف کی عزت خاک میں ملائے، اور جو کچھ اپنے ڈھنگ میں اس نے زور پکڑا ہے، اسے آگے نہ بڑھنے دے۔ آخر کار دونوں کے جمال و کمال کی بدولت وہ دن آ پہنچا کہ رسم و رواج کے بموجب دربار آسمانی میں پہنچے۔ اول علم نے تخت کے سامنے کھڑے ہو کر دونوں ہاتھ اٹھائے اور چند فقرے ثنائے الٰہی اور دعائے بادشاہی میں اس حسن تاثیر سے ادا فرمائے کہ سب کی آنکھیں آسمان کو لگ گئیں، اور سینہ ہائے گرم کے جوش سے محفل میں ایک گونج پیدا ہوئی۔ بعد اس کے ذکاوت آگے بڑھی، زمین خدمت کو بوسہ دیا، مگر جب سر اٹھایا تو چند شعر پڑھ کر ایک تبسم زیر لب کیا کہ گویا ایک چمن بھر زعفران لوگوں پر برسا دی۔ انعام یہ ہوا کہ دونوں عالم بالا کے پاک نہادوں میں داخل ہو گئے۔ اور خواجہ خضر نے اپنے مبارک ہاتھ سے آب حیات کا جام بھر کر دیا کہ جب تک آسمان پر چاند اور سورج کا چاندی سونا ہے، تمہارا سکہ روئے زمین پر چلتا رہے۔ دربار آسمانی میں قدیم سے ملنساری اور اخلاق کا انتظام تھا، افسوس یہ

ہے کہ اس وقت اس میں خلل آگیا، کیونکہ دربار میں داخل ہو کر دونوں نوجوانوں کے دماغ بجوے، اور دل نمود اور افتخار کے جوش سے بھڑک اٹھے۔ پھر اس پر ساتھ والوں کی واہوا! غضب تھی کہ ادھر اسے بڑھاتے تھے ادھر اسے چڑھاتے تھے۔ مگر ان حملوں کی بوچھاڑیں دونوں کے جی چھڑائے دیتی تھیں جن کا تار نہ ٹوٹتا تھا۔ اور فتح کا یہ حال تھا کہ اول بدل کرتی تھی، کبھی ادھر کا پلہ جھکا دیتی تھی کبھی ادھر کا۔ ایک بالکل مغلوب نہ ہو جاتا تھا کہ دوٹوک ہو کر فیصلہ ہو جائے۔

جس وقت کہ بحث شروع ہوتی تھی تو ذکاوت اس زرق برق اور طمطراق سے آتی تھی کہ سب کو اس کی جیت نظر آتی تھی۔ بلبل کی طرح چہکتی اور پھولوں کی طرح مہکتی۔ پہلے ہی حملے میں تمام محفل مارے خوشی کے اس طرح چمک اٹھتی تھی کہ گویا کبھی نہ بجھے گی۔ اور علم روکھی پھیکی صورت بنائے، اپنے زور کو ذرا دبائے رکھتا تھا، یہاں تک کہ تعریفوں کا جوش و خروش بجولے کی طرح گزر جاتا۔ مگر اس کے بعد جو ٹھہراؤ شروع ہوتا وہی علم کی طرف سے پکارتا تھا کہ اب ذرا ٹھہرو گے تو خاطر جمعی سے سنو گے۔ پھر علم بھی دفعیے شروع کرتا۔ یہ عالمانہ دفعیے روکھے سوکھے تو ہوتے تھے، مگر وہ یا تو حریف کے اعتراضوں کو آپس میں لڑا کر اس کی باتوں سے اسی کو جھوٹا کر دیتے تھے، یا یہ ذہن نشین کر دیتے تھے کہ ذکاوت کے دلائل اصلا قابل وقار و اعتبار نہیں، ایک ٹکڑا توڑ کر اس پر باتوں کا طومار باندھ دیا ہے۔ اس تقریر کو سن کر سب آپس میں تصدیق و تسلیم کی نگاہوں سے دیکھتے، مگر پھر جب ذکاوت کی رسیلی آواز نکلتی تو سب کے کان ادھر ہی لگ جاتے۔ شور و غل، چپ چاپ اور ساری محفل ایسی خموش ہوتی کہ سناٹے کا عالم ہو جاتا۔ اس میں بھی جہاں جہاں موقع پاتی، حریفانہ لطیفوں اور ظریفانہ چٹکلوں سے علم کو ایسا چٹکیوں میں اڑا جاتی کہ سننے والوں کے منہ میں تحسین و آفرین کا ایک حرف نہ چھوڑتی۔ پھر ادھر سے علم اپنے ہدایت نامہ کا طومار لے کر کھڑا ہوتا۔ اول تو ذکاوت کو اس کے کلام کا سفلہ پن دکھاتا کہ یہ متانت سے خالی ہے۔ جو رنگ اس نے جمائے تھے، انہیں حقیقی اور تحقیقی دلیلوں، بلکہ آیتوں اور روایتوں سے اس طرح مٹاتا کہ کہ اہل نظر کو سوائے سر ہلانے اور بجا و برحق کہنے کے کچھ بن نہ آتی۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ

اہل محفل نے اپنی غلط فہمی کو چھوڑنا شروع کیا۔ اور جب محفل کا خاتمہ کر کے اٹھے تو علم کے دلائل صادقہ کے لیے عظمت دلوں میں لیے اٹھے۔ مگر جتنی اس کی عظمت لیے اٹھے، اتنی ہی اس کی شوخی و شگفتہ بیانی کے لیے مہر و محبت لیے اٹھے۔

جب دونوں کے کمال اپنی اپنی اعزاز و قدردانی کے لیے اہل نظر سے سفارش کرتے تھے تو حسن طلب کے انداز بالکل الگ الگ تھے۔ ذکاوت تیز اور بے باک ہو کر ایسی چمک دمک سے آتی تھی کہ دیکھنے والوں کی آنکھ نہ ٹھہرتی تھی۔ علم بھی آگے بڑھتا تھا مگر اپنے وقار و متانت میں کمال بندوبست اور نہایت روک تھام سے قدم اٹھاتا تھا۔ ذکاوت کند ذہنی اور دیر فہمی کے داغ سے بہت بچتی تھی اور علم چوک جانے اور دھوکہ کھانے کے سوا کسی تہمت سے نہیں ڈرتا تھا۔ ذکاوت کی طراری کا یہ عالم تھا کہ سمجھنے سے پہلے ہی جواب دے اٹھتی تھی کہ ایسا نہ ہو میری تیز فہمی پر حرف آئے۔ علم کی یہ قباحت تھی کہ سیدھی سی بات میں بھی اس خیال سے اٹک جاتا تھا کہ حریف نے اپنی تقریر میں جو جو توڑ جوڑ مارے ہیں، ان میں سے ایک دقیقہ بھی بے کھولے نہ رہ جائے۔ برخلاف اس کے ذکاوت علم کی ہر بحث کو جھٹ پٹ بلکہ اس گھبراہٹ سے خاک میں ملا دیتی تھی کہ وہ دیکھتا رہ جاتا تھا۔ مگر پھر علم اس کی بات میں بال بال کے فرق اس تفصیل سے دکھاتا تھا کہ سننے والے اکتا جاتے تھے، بلکہ جن باتوں کا آج تک کسی نے انکار نہ کیا تھا، ان کے ثبوتوں میں خواہ مخواہ بات کو طول دے کر وقت کو ضائع کرتا تھا۔ ذکاوت اپنی نمود کی ہوس میں ایسی باتیں بھی پیش کر دیتی تھی کہ جنہیں نہ سوچا تھا نہ سمجھا تھا، اور اس میں بھی شک نہیں کہ اکثر دلچسپ اور دل پسند خیالوں کو خوشنمائی سے دکھا کر کامیاب بھی اس قدر ہو جاتی تھی جس کی اسے خود بھی امید نہ تھی۔

برخلاف اس کے علم اکثر قدما کے قدموں میں چلتا تھا۔ وہ نئے خیالوں سے چنتا تھا اور ڈرتا تھا کہ ایسا نہ ہو کہیں ان نتیجوں میں پھنس جائے، جنہیں اس کی نظر پیش بین نہیں دیکھ سکتی۔ اکثر ڈھب ایسے آپڑتے تھے کہ اگر ذرا ہمت کامیاب کو اور آگے بڑھاتا تو دشمن کو مار ہی لیتا۔ مگر احتیاط جو اس کا جانی رفیق تھا وہ روک لیتا تھا۔

حق یہ ہے کہ غلط فہمی سے دونوں خالی نہ تھے اور اسی نے دونوں کو تیر ہائے

اعتراض کے نشانے پر رکھا ہوا تھا۔ ایجاد و اختراع تو ذکاوت کے مصاحب تھے، اور قدامت اور تقلید علم سے محبت رکھتے تھے۔ چنانچہ اسی واسطے ذکاوت کو تو وہی بات پسند آتی تھی جو کہ آج تک کسی نے دیکھی ہو نہ سنی ہو۔ علم کا قاعدہ تھا کہ بزرگان سلف کے قدم بقدم چلتا تھا، اور ان کی ایک ایک بات پر جان قربان کرتا تھا، بلکہ اس کے نزدیک جس قدر بات پرانی تھی، اسی قدر سر اور آنکھوں پر رکھنے کے قابل تھی۔ برخلاف اس کے ذکاوت پرانے پن سے بہت گھبراتی تھی اور ہر رنگ میں نیا شعبدہ دکھاتی تھی۔ اس کا قاعدہ یہ تھا کہ دلائل سے قائل نہ کر سکتی تھی تو لطائف و ظرائف ہی سہی۔ غرض واہ وا لیے بغیر نہ چھوڑتی تھی۔ اور اسے قائل کرنے کی کچھ پروا نہ تھی۔ مگر علم اپنی رائے کو ہمیشہ ایسے سنجیدہ اصول اور اپنے تلے قواعد سے سنبھالے رہتا تھا کہ اگر مقدمہ اس کے خلاف بھی فیصل ہو جائے، تو اس کے دلائل برجستہ کو یاد کر کے مدتوں تک تعریفیں ہوتی رہیں۔

مناظرے کے شوقینو! دیکھو، اب دونوں حریف
اپنی اپنی چال بھولتے ہیں:

چند روز کے بعد ان کی طبیعتوں میں ایک تبدیلی واقع ہوئی کہ دونوں نے اپنی اپنی خاصیت اصلی کو چھوڑ دیا، یعنی ہر ایک یہ سمجھنے لگا کہ جو حربہ حریف نے کیا ہے، یہی حربہ میں کروں تو دو ٹوک فتح ہو جائے: یعنی اس نے اس کے رنگ لینے شروع کر دیے اور اس نے اس کے ڈھنگ پر چلنا شروع کیا۔ چنانچہ دونوں طرف یہی چلتا ہتھیار ہو گیا، یعنی کبھی کبھی ذکاوت دلائل منطقی پر بھی طبع آزمائی کرتی تھی۔ علم ان دلیلوں کو لچر سمجھ کر فقط مسکرا دیتا تھا، مگر اس طرح کہ ان سب کی صورت بگڑ جاتی تھی۔ ساتھ ہی اس کے طرفدار چلاتے کہ واہ وا۔ دلیل کا نام بھی نہ تھا، یہ تو باتوں ہی باتوں کا مصالح تھا۔ ان تجربوں میں دونوں نقصان پاتے تھے اور خود اپنی حقیقت کو دشمن کے ہاتھوں میں ڈال کر سبک ہوتے تھے، اور ذلتیں اٹھاتے تھے۔ غرض جس طرح ذکاوت کی طبیعت میں متانت و وقار اور بات میں بوجھ بھار نہ تھا، اسی طرح علم کے کلام میں

ظرافت کا نمک اور رنگینی کا نقش و نگار نہ تھا۔ دو قدم چلتا اور گر پڑتا۔

یہ مباحثے ایسی مدت دراز تک جاری رہے کہ لازم و ملزوم ہو گئے اور عالم بالا میں بھی فرقے فرقے ہو کر دونوں طرف جتھے بندھ گئے۔ چنانچہ ذکاوت کو زہرہ نے اپنے دامن حمایت میں لے لیا اور تبسم، تمسخر، مزاح، دل لگی کو اس کے ساتھ کر کے کہا کہ حسن و جمال کی پریوں میں جا کر جلسے کیا کرو۔ ادھر علم پر مشتری کی نظر عنایت رہی، مگر وہ تو خود خشک مغز تھے، اپنے محل سے باہر ہی نہ نکلتے تھے، اور جب نکلتے تو عصمت، حرمت، عزت، محنت، اعتدال، تحمل، تقویٰ، روکھے پھیکے، کبھی کبھی کے بڈھے اور پراتم بوھیاں جلو میں لے کر نکلتے تھے، اور کسی درگاہ یا خانقاہ تک جا کر چلے آتے تھے۔

خوش بیانو! دیکھنا، طنز و تعریض کی نہ ٹھہرے، نہیں تو
خواہ مخواہ لڑائی ہو پڑے گی:

نئی بات یہ ہوئی کہ ذکاوت کے سنگار خانے میں زیور و لباس پہنانے کے لیے دو کاردانوں کی ضرورت ہوئی، اور اس میں طنز و تعریض آ کر نوکر ہو گئے۔ انہوں نے اپنی رفاقت میں ایک شخص کو رکھا تھا کہ جسے بغض و یوزاو کہتے تھے۔ اس کے ہاتھ میں کمان تھی اور پشت پر ایک ترکش آویزاں تھا، جس میں طعن و تعریض نے تیر بھرے تھے، اور عداوت کے زہر میں بجھائے تھے۔ ان تیروں کا اثر یہ تھا کہ جہاں لگتے وہاں جم کر ایسے بیٹھتے کہ نہ کسی جراح کا جتن چلتا، نہ کسی حکیم کا ہنر پیش جاتا۔ چنانچہ جب علم کسی امر مفید یا غور کے کام میں مصروف ہوتا یا اپنے معتقدوں کو فیض علم پہنچاتا، یہ اس وقت ذکاوت کی طرف سے تیر مارا کرتا۔ اس کا بندوبست اور کچھ نہ ہو سکا، فقط اتنا ہوا کہ مشتری نے نقطہ چینی اور غلط گیری کو دو ڈھالیں دے کر ساتھ کر دیا کہ اگر جواب ترکی بہ ترکی نہ ہو سکے تو اس سے روکا کرو۔ چنانچہ یہ دونوں اکثر تیروں کی نوکیں توڑ دیتے تھے، کبھی بھالا نکال کر پھینک دیتے تھے، کبھی اس پر الٹ دیتے تھے۔

جب سلطان آسمانی نے دیکھا کہ ان کے آئے دن کے رگڑوں جھگڑوں سے عالم بالا کے امن میں خلل آنے لگا، تو بہت خفا ہوا اور ارادہ کیا کہ ان دونوں جھگڑالوؤں کو عالم

خاک میں ڈال دے۔ چنانچہ آخر کار دونوں دنیا میں آپڑے اور اپنے قدیمی جھگڑے یہاں بھی جاری کر دیے۔ یہاں دونوں کے ساتھ بڑے بڑے گرم جوش معتقد جمع ہو گئے۔ ذکاوت نے اپنی خوشنمائی سے نوجوانوں اور رنگین مزاجوں کو لبھا لیا، اور علم نے اپنی متانت اور وقار سے پرانے بڈھوں کو پھسلایا۔ ان لوگوں کی بدولت تھوڑے ہی عرصے میں نئے نئے شگوفے کھلنے لگے، اور بڑے بڑے اثر اس کے ظہور میں آئے۔ چنانچہ ذکاوت کے جلوس کے لیے گلزار اور پر بہار سیر گاہیں سجائی گئیں۔ جو اس کے قدردان ہوں وہاں استقبال کو حاضر ہوں۔ اسی طرح علم کے لیے مدرسے، مسجدیں، درگاہیں اور خانقاہیں قرار پائیں۔ دونوں جتھے اس پر جان دیتے تھے کہ شان و شکوہ اور نام وری اور دریادلی میں ایک دوسرے سے بازی لے جائیں، اس طرح کہ اپنے حریف کو گرد کر دیں۔ اور اس عقیدے کے پھیلانے میں عرق ریزی کر رہے تھے کہ جو مخلوق دنیا میں پیدا ہوا سے واجب ہے کہ دونوں میں سے ایک فریق میں ضرور داخل ہو۔ ساتھ اس کے یہ بھی تھا کہ جو شخص طرفین میں سے کسی کی بارگاہ میں ایک دفعہ بھی جا نکلے، پھر اسے دوسرے کی نظر عنایت کی امید نہ رکھنی چاہیے۔ اس خاکدان ظلماتی میں ایک خاکی جماعت تھی کہ وہ دونوں میں سے ایک کو بھی نہ مانتی تھی۔ یہ لوگ رونی صورت، سونی مورت، دولت کے بندے تھے، اور اسی کی عبادت کرتے تھے۔ زر و مال کے خزانے ان کے عبادت خانے تھے۔ وہاں کیا علم کیا ذکاوت کسی کی بھی دعا قبول نہ ہوتی تھی، اور سبب اس کا یہ تھا کہ ان کی آنکھوں پر روپے کی چربی چھائی ہوتی تھی، اور کانوں میں غفلت کی روئی تھی۔ ذکاوت نے ان پر بہت بہت گل افشانیاں کیں، مگر ان کے لبوں پر کبھی تبسم کا رنگ بھی نہ آیا، اور علم نے بھی اپنی فصاحت و بلاغت سے بہت دماغ سوزی کی تھی، مگر ان کی طبع خوابیدہ نے پھریری بھی نہیں لی تھی۔ البتہ کبھی کبھی کسی کی آنکھیں روشن بھی ہو جاتی تھیں، مگر دولت کا ایک مرید خاص ان پر تعینات تھا۔ وہ اسی وقت آ کر ان کی آنکھوں میں ایک سرمہ دے جاتا تھا کہ ہر چیز انہیں چھوٹی اور حقیر ہی نظر آتی تھی۔ غرض ان کی کم نظری اور بے اعتنائی علم اور ذکاوت دونوں کو بری معلوم ہوئی۔ چنانچہ یہ دونوں متفق ہو گئے اور اپنے اپنے معتقدوں کو چڑھا کر بھیجا۔ انہوں نے اسی وقت دولت

پرستوں کے عبادت خانوں کا رخ کیا، اور جاتے ہی کسی کے پہلو میں اشاروں کی کنایوں کی چٹکیاں لیں، اور کسی کی بغل میں ظرافت کی گدگدیاں شروع کر دیں۔ اس وقت سارے دولت پرست چونک پڑے اور جب کچھ بن نہ آیا، تو گھبرا کر روپے کو مدد کے لئے بلایا۔ روپے کے پاس بڑے نقش اور منتر تھے۔ وہ آیا، اپنے سارے ہتھکنڈے چلتر کام میں لایا، مگر کوئی پیچ اس کا چل نہ سکا۔ پھر بھی اتنا ہوا کہ ذکاوت اور علم نے جو اپنے معتقد بھیجے تھے، ان میں پھوٹ ڈال دی اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے اپنے آقاؤں کے راز کھولنے شروع کر دیے، یعنی جو کچھ ذکاوت اور علم تحریر کرتے، یہ جھٹ دولت پرستوں کو خبر پہنچاتے۔ بلکہ جب کچھ تجویز دولت پرستوں کی ذات کے لیے عمل میں آتی تو یہ رشوت خوار کارگزار دل میں برا مانتے۔ اور اگر کچھ حکم لے کر جاتے بھی تو دولت پرستوں کے سامنے خوشامد کے پیرائے میں ظاہر کرتے۔ وہ باوجود اس کے دل میں انہیں بھی حقیر ہی سمجھتے تھے۔ جب یہ خوشامدی رفتہ رفتہ دولت اور دولت پرستوں کے درجہ عنایت تک جا پہنچے تو خوشامد کی بدولت بڑے بڑے انعام اور جاگیریں حاصل کیں۔ چند روز کے بعد ایسے بد دماغ ہوئے کہ جو اہل عزت خود ان کے آقاؤں کے مصاحب تھے، ان سے پہلو مار کر چلنے لگے اور ان کے مقابلے میں اپنے تئیں بہ نظر فضیلت دیکھنے لگے۔

القصہ جب ذکاوت اور علم دونوں نے دیکھا کہ اہل دنیا کا یہ حال ہے، اور جو نوکر اپنے تھے سب نمک حرام ہو گئے، تو دونوں نے مل کر دو عرضیاں تیار کیں جن میں دولت اور دولت پرستوں کی زیادتیاں اور اپنے نمک حراموں کی بد ذاتیاں سب لکھیں، اور سلطان آسمانی کی خدمت میں بھیج کر التجا کی کہ ہمیں ہماری قدیمی آرام گاہ میں جگہ مل جائے۔ یہ عرضی سن کر سلطان آسمانی داہنے ہاتھ کو بڑے زور شور سے گرجے۔ اس کے یہ معنی کہ ان سب کا روسیاہ کرو اور دونوں ہمارے پاس چلے آؤ۔ اس حسن طلب کو نہایت غنیمت سمجھے اور خوشی خوشی شکریے کرتے ہوئے چلنے کو تیار ہوئے۔ ذکاوت نے جھٹ بازو پھیلائے اور غبار سے دامن جھاڑتی ہوئی آسمان کو اڑی۔ لیکن اس فضائے لاانتہا میں کہ جہاں راہ نہ راہنما، نظر دور تک کام نہ کر سکتی تھی، اس لیے چند ہی قدم پر

رستہ بھول گئی۔ علم رستے خوب جانتے تھے، چنانچہ انہوں نے بھی پر خوب ہلائے، مگر انکے بازوؤں میں زور نہ تھا، چھوٹی چھوٹی اڑانیں کیا کرتے تھے۔ غرض کہ ہاتھ پاؤں مار کر دونوں زمین پر آپڑے۔ اس وقت ایک دوسرے کی مصیبت کو خیال کر کے سمجھے کہ اب اتفاق کے سوا گزارا نہیں۔ ناچار دونوں نے ہاتھ ملائے اور پھر اڑے۔ علم کو تو ذکاوت کی قوت پرواز کا سہارا ملا اور ذکاوت کو علم دوربیں نے رستہ بتایا۔ پلک مارتے سلطان آسمانی کے دربار میں جا داخل ہوئے۔ چونکہ بگاڑ کے مزے دونوں نے خوب چکھ لیے تھے، اس لیے اب کی دفعہ دونوں میں بہت محبت اور اخلاق ہوا۔ مگر ذکاوت نے علم کو صلاح دی کہ بھائی تم ذرا حسن اور ظرافت اور اس کی سہیلیوں سے نشست و برخاست رکھا کرو۔ اسی طرح انہوں نے ذکاوت کو سمجھایا کہ تم ذرا اصلاح و اعتدال کی خدمت میں بھی حاضر ہوا کرو۔ ان صحبتوں نے دونوں کی طبیعتوں میں بڑا اثر کیا۔ علم کی خشک دماغی کو حسن اور ظرافت کی طراوت پہنچی، ذکاوت کی شوخی و طراری نے صلاح سے اصلاح پائی۔ دونوں آہستہ آہستہ عالم بالا کے پری زادوں میں ایسے ہر دلعزیز ہو گئے کہ جس جلسے میں نہ ہوں، اس میں رونق ہی نہ معلوم ہوتی تھی۔ چند روز کے بعد سلطان آسمانی کے ایماء سے دونوں نے شادیاں کر لیں اور ان کی نسلوں سے علوم و فنون کی اولاد کے سلسلے جاری ہو گئے۔

شہرت عام اور بقائے دوام کا دربار

اے ملک فنا کے رہنے والو! دیکھو اس دربار میں تمہارے مختلف فرقوں کے عالی وقار جلوہ گر ہیں۔ بہت سے حب الوطن کے شہید ہیں، جنھوں نے اپنے ملک کے نام پر میدان جنگ میں جا کر خونی خلعت پہنے۔ اکثر مصنف اور شاعر ہیں جنھیں اسی ہاتف غیبی کا خطاب زیبا ہے۔ جس کے الہام سے وہ مطالب غیبی ادا کرتے رہے اور بے عیبی سے زندگی بسر کر گئے۔ ایسے زیرک اور دانا بھی ہیں جو بزم تحقیق کے صدر اور اپنے عہد کے باعث فخر رہے۔ بہت سے نیک بخت نیکی کے رستے بتاتے رہے جس سے ملک فنا میں بقا کی عمارت بناتے رہے۔

بقائے دوام دو طرح کی ہے، ایک تو وہی جس طرح روح فی الحقیقت بعد مرنے کے رہ جائے گی کہ اس کے لیے فنا نہیں، دوسری وہ عالم یادگار کی بقا جس کی بدولت لوگ نام کی عمر سے جیتے ہیں اور شہرت دوام کی عمر پاتے ہیں۔ حق یہ ہے کہ اچھے سے اچھے اور بڑے سے بڑے کام جن جن سے ہوئے یا ثواب آخرت کے لیے یا دنیا کی ناموری اور شہرت کے لیے ہوئے۔ لیکن میں اس دربار میں انہی لوگوں کو لاؤں گا جنھوں نے اپنی محنت ہائے عرق فشاں کا صلہ اور عزم ہائے عظیمہ کا ثواب فقط دنیا کی شہرت و ناموری کو سمجھا۔ اسی واسطے جو لوگ دین کے بانی اور مذہب کے رہنما تھے، ان کے نام شہرت کی فہرست سے نکال دیتا ہوں۔ مگر بڑا فکر یہ ہے کہ جن لوگوں کا ذکر کرتا ہوں، ان کی حق تلفی نہ ہو جائے، کیونکہ جن بچاروں نے ساری جان فشانی اور عمر بھر کی محنتوں کا اجر فقط نام کو سمجھا، ان کے حصے میں کسی طرح کا نقصان ڈالنا سخت ستم ہے۔ اسی لحاظ سے مجھے تمام مصنفین اور مورخین سے مدد مانگنی پڑی۔ چنانچہ اکثروں کا نہایت احسان مند ہوں

کہ انھوں نے ایسے ایسے لوگوں کی ایک فہرست بنا کر عنایت کی، اور مجھے بھی کل دوپہر سے شام تک اسی کے مقابلے میں گزری۔ ناموران موصوف کے حالات ایسے دل پر چھائے ہوئے تھے کہ انھوں نے مجھے سوتے سوتے چونکا دیا۔ میں اس عالم میں ایک خواب دیکھ رہا تھا۔ چونکہ بیان اس کا لطف سے خالی نہیں، اس لیے عرض کرتا ہوں۔

39 خواب میں دیکھتا ہوں کہ گویا میں ہوا کھانے چلا ہوں اور چلتے چلتے ایک میدان وسیع الفضا میں جا نکلا ہوں، جس کی وسعت اور دلفزائی میدان خیال سے بھی زیادہ ہے۔ دیکھتا ہوں کہ میدان مذکور میں اس قدر کثرت سے لوگ جمع ہیں کہ نہ انھیں محاسب فکر شمار کر سکتا ہے، نہ قلم تحریر فہرست تیار کر سکتا ہے اور جو لوگ اس میں جمع ہیں وہ غرض مند لوگ ہیں کہ اپنی اپنی کامیابی کی تدبیروں میں لگے ہوئے ہیں۔ وہاں ایک پہاڑ ہے جس کی چوٹی گوش سحاب سے سرگوشیاں کر رہی ہے۔ پہلو اس کے جس طرف سے دیکھو، ایسے سر پھوڑ اور سینہ توڑ ہیں کہ کسی مخلوق کے پاؤں نہیں جمنے دیتے۔ ہاں حضرت انسان کے ناخن تدبیر کچھ کام کر جائیں تو کر جائیں۔ میرے دوستو! اس رستے کی دشواریوں کو سر پھوڑ اور سینہ توڑ پہاڑوں سے تشبیہ دے کر ہم خوش ہوتے ہیں، مگر بڑی ناانصافی ہے۔ پتھر کی چھاتی اور لوہے کا کلیجہ کرلے تو ان بلاؤں کو جھیلے۔ جن پر وہ مصیبتیں گزریں وہی جانیں۔ یکایک قلعہ کوہ سے ایک شہنائی کی سی آواز آنی شروع ہوئی۔ یہ دل کش آواز سب کو بے اختیار اپنی طرف کھینچتی تھی، اس طرح کہ دل میں جان اور جان میں زندہ دلی پیدا ہوتی تھی، بلکہ خیال کو وسعت کے ساتھ ایسی رفعت دیتی تھی جس سے انسان مرتبہ انسانیت سے بڑھ کر قدم مارنے لگتا تھا، لیکن یہ عجیب بات تھی کہ اتنے میں انبوہ کثیر میں تھوڑے ہی اشخاص تھے جن کے کان اس کے سننے کی قابلیت یا اس کے نغموں کا مذاق رکھتے تھے۔

ایک بات کے دیکھنے سے مجھے نہایت تعجب ہوا اور وہ تعجب فوراً ہی جاتا بھی رہا، یعنی دوسری طرف جو نظر جا پڑی تو دیکھتا ہوں کہ کچھ خوبصورت عورتیں ہیں اور بہت سے لوگ ان کے تماشائے جمال میں محو ہو رہے ہیں۔ یہ عورتیں پریوں کا لباس پہنے ہیں۔ مگر یہ بھی وہیں چرچا سنا کہ درحقیقت نہ وہ پریاں ہیں نہ پریزاد عورتیں ہیں۔ کوئی ان میں

غفلت، کوئی عیاشی ہے، کوئی خود پسندی، کوئی بے پروائی ہے۔ جب کوئی ہمت والا ترقی کے رستے میں سفر کرتا ہے تو یہ ضرور ملتی ہیں۔ انہی میں پھنس کر اہل ترقی اپنے مقاصد سے محروم رہ جاتے ہیں۔ ان پر درختوں کے جھنڈ سایہ کیے تھے، رنگ بہ رنگ کے پھول کھلے تھے، گونا گوں میوے جھول رہے تھے، طرح طرح کے جانور بول رہے تھے۔ نیچے قدرتی نہریں، اوپر ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ وہیں وہ دانش فریب پریاں پتھروں کی سلوں پر پانی میں پاؤں لٹکائے بیٹھی تھیں اور آپس میں چھینٹے لڑ رہی تھیں۔ مگر ایسے ایسے الجھاوے بلندی کوہ کے ادھر ہی ادھر تھے۔ یہ بھی صاف معلوم ہوتا تھا کہ جو لوگ ان جعلی پریوں کی طرف مائل ہیں، وہ اگرچہ اقوام مختلفہ اور عہد ہائے متفرقہ، عمرہائے متفاوتہ رکھتے ہیں، مگر وہی ہیں جو حوصلے کے چھوٹے، ہمت کے ہیٹے اور طبیعت کے پست ہیں۔

دوسری طرف دیکھا کہ جو بلند حوصلہ، صاحب ہمت، عالی طبیعت تھے وہ ان سے الگ ہو گئے اور غول کے غول شہنائی کی آواز کی طرف بلندی کوہ پر متوجہ ہوئے۔ جس قدر یہ لوگ آگے بڑھتے تھے، اسی قدر وہ آواز کانوں کو خوش آئند معلوم ہوتی تھی۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ بہت سے چیدہ اور برگزیدہ اشخاص اس ارادے سے آگے بڑھے کہ بلندی کوہ پر چڑھ جائیں اور جس طرح ہو سکے، پاس جا کر اس نغمہ آسمانی سے قوت روحانی حاصل کریں۔ چنانچہ سب لوگ کچھ کچھ چیزیں اپنے ساتھ لینے لگے۔ معلوم ہوتا تھا کہ گویا آگے کے راستے کا سامان لے رہے ہیں۔ سامان بھی ہر ایک کا الگ الگ تھا۔ کسی کے ایک ہاتھ میں شمشیر برہنہ علم تھی، ایک ہاتھ میں نشان تھا، کسی کے ہاتھ میں کاغذوں کے اجزاء تھے، کسی کی بغل میں ایک کپاس تھی، کوئی چشلیں لئے تھا، کوئی جہازی قطب نما اور دوربین سنبھالے تھا، بعضوں کے سر پر تاج شاہی دھرا تھا، بعضوں کے تن پر لباس جنگی آراستہ تھا۔ غرضکہ علم ریاضی اور جر ثقیل کا کوئی آلہ نہ تھا جو اس وقت کام نہ آ رہا ہو۔ اسی عالم میں دیکھتا ہوں کہ ایک فرشتہ رحمت میرے داہنے ہاتھ کی طرف کھڑا ہے اور مجھے بھی اس بلندی کا شائق دیکھ کر کہتا ہے کہ یہ سرگرمی اور گرم جوشی تمہاری ہمیں نہایت پسند ہے۔ اس نے یہ بھی صلاح دی کہ ایک نقاب منہ پر ڈال

لو۔ میں نے بے تامل تعمیل کی۔ بعد اس کے گروہ مذکور فرقے فرقے میں تقسیم ہو گیا۔ کوہ مذکور پر رستوں کا کچھ شمار نہ تھا۔ سب نے ایک ایک راہ پکڑلی۔ چنانچہ کچھ لوگوں کو دیکھا کہ چھوٹی چھوٹی گھاٹیوں میں ہو لیے۔ وہ تھوڑی ہی دور چڑھے تھے کہ ان کا رستہ ختم ہو گیا اور وہ تھم گئے۔ مجھے معلوم ہوا کہ ان پست ہمتوں نے صنعت گری اور دست کاری کی راہ لی تھی کہ روپے کے بھوکے تھے اور جلد محنت کا صلہ چاہتے تھے۔ میں ان لوگوں کے پیچھے تھا جنھوں نے دلاوروں اور جاں بازوں کے گروہ کو پیچھے چھوڑا تھا اور خیال کیا تھا کہ چڑھائی کے رستے ہم نے پا لیے۔ مگر وہ رستے ایسے پیچ در پیچ اور درہم برہم معلوم دیے کہ تھوڑا ہی آگے بڑھ کر اس کے ہیر پھیر میں سرگرداں ہو گئے۔ ہر چند برابر قدم مارے جاتے تھے مگر جب دیکھا تو بہت کم آگے بڑھے تھے۔ میرے فرشتہ رحمت نے ہدایت کی کہ یہ وہی رستے ہیں جہاں عقل صادق اور عزم کامل کام دیتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ فقط چالاکی سے کام کر جائیں۔ بعضے ایسے بھی تھے کہ بہت آگے بڑھ گئے تھے، مگر ایک ہی قدم ایسا بے موقع پڑا کہ جتنا گھنٹوں میں بڑھے تھے، اتنا دم بھر میں نیچے آن پڑے۔ بلکہ بعضے ایسے ہو گئے کہ پھر چڑھنے کے قابل ہی نہ رہے۔ اس سے وہ لوگ مراد ہیں کہ جو روزگار سے ترقیاں[40] حاصل کرتے چلے جاتے ہیں مگر کوئی ایسی حرکت ناشائستہ کرتے ہیں کہ دفعتہً گر پڑتے ہیں اور آئندہ کے لیے بالکل اس سے علاقہ ٹوٹ جاتا ہے۔ ہم اتنے عرصے میں بہت اونچے چڑھ گئے اور معلوم ہوا کہ جو چھوٹے بڑے رستے پہاڑ کے نیچے سے چلتے ہیں، اوپر آ کر دو شاہراہوں سے ملتے ہیں۔ چنانچہ وہاں آکر تمام صاحب ہمت دو گروہوں میں تقسیم ہو گئے۔ ان دونوں شاہراہوں میں ذرا اور آگے بڑھ کر ایک بھوت ڈراؤنی صورت، ہیبت ناک مورت، کھڑا تھا کہ آگے جانے سے روکتا تھا۔ ان میں سے ایک ہاتھ میں ایک درخت خاردار کا ٹہنا تھا۔ بھوت کا نام دیو ہلاکت تھا اور کانٹے وہی ترقی کے مانع اور موت کے بہانے تھے، جو اولوالعزموں کو راہ ترقی میں پیش آتے ہیں۔ چنانچہ جو سامنے آتا تھا، ٹہنے کی مار منہ پر کھاتا تھا۔ دیو کی شکل ایسی خونخوار تھی گویا موت سامنے کھڑی ہے۔ ان کانٹوں کی مار سے غول کے غول اہل ہمت کے بھاگ کر پیچھے ہٹتے تھے، اور ڈر ڈر کر چلاتے تھے کہ "ہے ہے موت!

ہے ہے موت!" دوسرے رستے پر جو بھوت تھا اس کا نام حسد تھا۔ پہلے بھوت کی طرح کچھ اس کے ہاتھ میں نہیں تھا لیکن ڈراؤنی آواز اور بھونڈی صورت اور مکروہ و معیوب کلمے جو اس کی زبان سے نکلتے تھے، اس لیے اس کا منہ ایسا برا معلوم ہوتا تھا کہ اس کی طرف دیکھا نہ جاتا تھا۔ اس کے سامنے ایک کیچڑ کا حوض بھرا تھا کہ برابر چھینٹیں اڑائے جاتا تھا، اور ہر ایک سفید پوش کے کپڑے خراب کرتا تھا۔ جب یہ حال دیکھا تو اکثر اشخاص ہم میں سے بے دل ہو کر رہ رہ گئے، اور بعضے اپنے یہاں تک آنے پر کمال نادم ہوئے۔ میرا یہ حال تھا کہ یہ خطرناک حالتیں دیکھ دیکھ کر دل ہراساں ہوا جاتا تھا اور قدم آگے نہ اٹھتا تھا۔ اتنے میں اس شہنائی کی آوز اس تیزی کے ساتھ کان میں آئی کہ بجھے ہوئے ارادے پھر چمک اٹھے۔ جس قدر کہ دل زندہ ہوئے، اسی قدر خوف و ہراس خاک ہو ہو کر اڑتے گئے۔ چنانچہ بہت سے جانباز، جو شمشیریں علم کیے ہوئے تھے، اس کڑک دمک سے قدم مارتے آگے بڑھے، گویا حریف سے میدان جنگ مانگتے ہیں، یہاں تک کہ جہاں دیو کھڑا تھا، یہ اس دہانے سے نکل گئے اور وہ موت کے دانت نکالے دیکھتا رہ گیا۔ جو لوگ سنجیدہ مزاج اور طبیعت کے دھیمے تھے، وہ اس رستے پر پڑے جدھر حسد کا بھوت کھڑا تھا، مگر اس آواز کے ذوق شوق نے انہیں بھی ایسا مست کیا کہ گالیاں کھاتے، کیچڑ میں نہاتے، مرچ کر یہ بھی اس کی حد سے نکل گئے۔ چنانچہ جو کچھ رستے کی صعوبتیں اور خرابیاں تھیں، وہ بھی ان بھوتوں ہی تک تھیں، آگے دیکھا تو ان کی دسترس سے باہر ہیں، اور رستہ بھی صاف و ہموار بلکہ ایسا خوش نما ہے کہ مسافر جلد جلد آگے بڑھے اور ایک سپاٹے میں پہاڑ کی چوٹی پر جا پہنچے۔ اس میدان روح افزا میں پہنچتے ہی ایسی جاں بخش اور روحانی ہوا چلنے لگی جس سے روح اور زندگانی کی قوت دوامی حاصل ہوتی تھی۔ تمام میدان، جو نظر کے گرد و پیش دکھائی دیتا تھا، اس کا رنگ کبھی نور سحر تھا اور کبھی شام شفق، جس سے قوس قزح کے رنگ میں کبھی شہرت عام اور کبھی بقائے دوام کے حروف عیاں تھے۔ یہ نور و سرور کا عالم دل کو اس طرح تسلی و تشفی دیتا تھا کہ خود بخود پچھلی محنتوں کے غبار دل سے دھوئے جاتے تھے، اور اس مجمع عام میں امن و امان اور دلی آرام پھیلتا تھا جس کا سرور لوگوں کے چہروں سے پھولوں کی شادابی ہو کر

عیاں تھا۔ ناگہاں ایک ایوان عالی شان دکھائی دیا کہ اس کے چار طرف پھاٹک تھے۔ اس پہاڑ کی چوٹی پر دیکھا کہ پھولوں کے تختے میں ایک پری حور شمائل چاندی کی کرسی پر بیٹھی ہے اور وہی شہنائی جاری ہے جس کے میٹھے میٹھے سروں نے ان مشتاقوں کے انبوہ کو یہاں تک کھینچا تھا۔ پری ان کی طرف دیکھ کر مسکراتی تھی، اور سروں سے اب ایسی صدا آتی تھی گویا آنے والوں کو آفرین و شاباش دیتی ہے اور کہتی ہے کہ "خیر مقدم، خیر مقدم، خوش آمدید، صفا آوردید"۔ اس آواز سے یہ خدائی لشکر کئی فرقوں میں منقسم ہو گیا۔ چنانچہ مورخوں کا گروہ ایک دروازے پر استادہ ہوا تاکہ صاحب مراتب اشخاص کو حسب مدارج ایوان جلوس میں داخل کرے۔ یکایک وہ شہنائی، جس سے کبھی شوق انگیز، جوش خیز اور کبھی جنگی باجوں کے سر نکلتے تھے، اب اس سے ظفریابی اور مبارکبادی کی صدا آنے لگی۔ تمام مکان گونج اٹھا اور دروازے خود بخود کھل گئے۔

جو شخص سب سے پہلے آگے بڑھا، معلوم ہوا کہ کوئی راجوں کا راجہ مہاراجہ ہے۔ چاند کی روشنی چہرے کے گرد ہالہ کیے ہے، سر پر سورج کی کرن کا تاج ہے۔ اس کے استقلال کو دیکھ کر لنکا کا کوٹ پانی پانی ہوا جاتا ہے۔ اس کی حق داری جنگل اور پہاڑوں کے حیوانوں کو جاں نثاری میں حاضر کرتی ہے۔ تمام دیوی دیوتا دامنوں کے سایے میں لیے آتے ہیں۔ فرقے فرقے کے علما اور مورخین اسے دیکھتے ہی شاہانہ طور پر لینے کو بڑھے اور وہ بھی متانت اور انکسار کے ساتھ سب سے پیش آیا۔ مگر ایک شخص کہن سالہ، رنگت کا کالا، ایک پوتھی بغل میں لیے ہندوؤں کے غول سے نکلا اور بآواز بلند چلایا کہ "آنکھوں والو! کچھ خبر ہے؟ دیکھو! دیکھو! ترتیب کے سلسلے کو برہم نہ کرو اور نرنکار کے نور کو اجسام خاک میں نہ ملاؤ"۔ یہ کہہ کر آگے بڑھا اور اپنی پوتھی نذر گزرانی۔ اس نے نذر قبول کی اور نہایت خوشی سے اس کے لینے کو ہاتھ بڑھایا، تو معلوم ہوا اس کا ہاتھ بھی فقط سورج کی کرن تھا۔ سب ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ کوئی کچھ سمجھا کوئی کچھ سمجھا[41]۔ اس وقت ایک بمان یعنی تخت ہوا دار آیا، وہ اس پر سوار ہو کر آسمان کو اڑ گیا۔ معلوم ہوا کہ یہ رام چندر جی ہیں اور یہ والمیک ہے جس نے "رامائن" نذر دی۔

سب لوگ ابھی والمیک کی ہدایت کا شکریہ ہی ادا کر رہے تھے کہ اتنے میں ایک اور

آمد آمد ہوئی۔ دیکھا کہ ایک تخت طلسمات کو بتیس پریاں اڑائے لیے آتی ہیں۔ اس پر ایک اور راجہ بیٹھا ہے مگر نہایت دیرینہ سال۔ اسے فرقے فرقے کے علماء اور مورخ لینے کو نکلے، مگر پنڈت اور مہاجن لوگ بہت بے قراری سے دوڑے۔ معلوم ہوا کہ راجہ تو مہاراجہ بکرماجیت تھے اور تخت "سنگھاسن بتیسی"۔ پریاں اتنی بات کہہ کر ہوا ہو گئیں کہ جب تک سورج کا سونا اور چاند کی چاندی چمکتی ہے، نہ آپ کا منہ بٹے گا نہ سکہ مٹے گا۔ برہمنوں اور پنڈتوں نے تصدیق کی اور انہیں لے جا کر ایک مسند پر بٹھا دیا۔

ایک راجہ کے آنے پر لوگوں میں کچھ قیل و قال ہوئی، کیونکہ وہ چاہتا تھا کہ اپنے دو مصاحبوں کو بھی ساتھ لے جائے اور اراکین دربار کہتے تھے کہ یہاں تمکنت اور غرور کا گزارا نہیں۔ اتنے میں وہی بتیس پریاں پھر آئیں۔ چنانچہ ان کی سفارش سے اسے بھی لے گئے۔ جس وقت راجا نے مسند پر قدم رکھا، ایک پنڈت آیا، دونوں ہاتھ اٹھا کر اشیرباد کہی، اور بقائے دوام کا تاج سر پر رکھ دیا، جس میں ہیرے اور پنے کے نو دانے ستاروں پر آنکھ مار رہے تھے۔ معلوم ہوا کہ یہ راجہ بھوج تھے اور بتیس پریوں کا جھرمٹ وہی کتاب 'سنگھاسن بتیسی' تھی جو ان کے عہد میں تصنیف ہوئی، اور جس نے تاج سر پر رکھا وہ کالیداس شاعر تھا، جس نے ان کے عہد میں نو کتابیں لکھ کر فصاحت و بلاغت کو زندگی جاوید بخشی ہے۔

اس طرف تو برابر یہی کاروبار جاری تھا، اتنے میں معلوم ہوا کہ دوسرے دروازے سے بھی داخلہ شروع ہوا۔ میں اس طرف متوجہ ہوا، دیکھتا ہوں کہ وہ کمرہ بھی فرش فروش، جھاڑ فانوس سے بقعہ نور بنا ہوا ہے۔ ایک جوان چیل پیکر، ہاتھ میں گرز گاؤ سر، نشہ شجاعت میں مست جھومتا جھامتا چلا آتا ہے۔ جہاں قدم رکھتا ہے ٹخنوں تک زمین میں ڈوب جاتا ہے۔ گرد اس کے شاہان کیانی اور پہلوانان ایرانی موجود ہیں کہ درفش کاویانی کے سایہ بے زوال میں لیے آتے ہیں۔ حب قوم اور حب وطن اس کے دائیں بائیں پھول برساتے تھے۔ اس کی نگاہوں سے شجاعت کا خون ٹپکتا تھا، اور سر پر کلہ شیر کا خود فولادی دھرا تھا۔ مورخ اور شعرا اس کے انتظار میں دروازے پر کھڑے تھے۔ سب نے بہ چشم تعظیم دیکھا۔ ان ہی میں سے ایک پیر مرد، دیرینہ سال، جس کے

چہرے سے مایوسی اور ناکامی کے آثار نمایاں تھے، وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے گیا، اور ایک کرسی پر بٹھایا، جسے بجائے پایوں کے چار شیر کندھوں پر اٹھائے کھڑے تھے۔ پھر پیر مرد نے اہل مجلس کی طرف متوجہ ہو کر چند اشعار نہایت زور شور سے پڑھے۔ نہیں، بلکہ اس کے کارناموں کی تصویر صفحہ ہستی پر ایسے رنگ سے کھینچی جو قیامت تک باقی رہے گی۔ بہادر پہلوان نے اٹھ کر اس کا شکریہ ادا کیا اور گل فردوس کا طرہ اس کے سر پر آویزاں کر کے دعا کی کہ "الٰہی! یہ بھی قیامت تک شگفتہ وشاداب رہے"! تمام اہل محفل نے آمین کہی۔

معلوم ہوا کہ وہ بہادر ایران کا حامی، شیر سیستانی رستم پہلوان ہے، اور کہن سال مایوس فردوسی ہے جو 'شاہنامہ' لکھ کر اس کے انعام سے محروم رہا۔

بعد اس کے ایک نوجوان آگے بڑھا جس کا حسن شباب نوخیز اور دل بہادری اور شجاعت سے لبریز تھا، سر پر تاج شاہی تھا مگر اس سے ایرانی پہلوانی پہلو چراتی تھی۔ ساتھ اس کے حکمت یونانی سر پر چتر لگائے تھی۔ میں نے لوگوں سے پوچھا، مگر سب اسے دیکھ کر ایسے محو ہو گئے کہ کسی نے جواب نہ دیا۔ بہت سے مؤرخ اور محقق اس کے لینے کو بڑھے، مگر سب ناواقف تھے۔ وہ اس تخت کی طرف لے چلے جو کہانیوں اور افسانوں کے ناموروں کے لیے تیار ہوا تھا۔ چنانچہ ایک شخص، جس کی وضع اور لباس سب سے علیحدہ تھا، ایک انبوہ کو چیر کر نکلا۔ وہ کوئی یونانی مؤرخ تھا۔ اس نے اس کا ہاتھ پکڑا اور اندر لے جا کر سب سے پہلی کرسی پر بٹھایا۔ فرشتہ رحمت نے میرے کان میں کہا کہ تم اس گوشے کی طرف آجاؤ تاکہ تمہاری نظر سب پر پڑے اور تمہیں کوئی نہ دیکھ سکے۔ یہ سکندر یونانی ہے جس کے کارنامے لوگوں نے کہانی اور افسانے بنا دیے ہیں۔

اس کے پیچھے ایک بادشاہ آیا کہ سر پر کلاہ کیانی اور اس پر درفش کاویانی جھومتا تھا، مگر پھریرا علم کا پارہ پارہ ہو رہا تھا۔ وہ آہستہ آہستہ اس طرح آتا تھا گویا اپنے زخم کو چھپائے ہوئے آتا ہے۔ رنگ زرد تھا اور شرم سے سر جھکائے تھا۔ جب وہ آیا تو سکندر بڑی عظمت کے ساتھ استقبال کو اٹھا اور اپنے برابر بٹھایا۔ باوجود اس کے جس قدر سکندر زیادہ تعظیم کرتا تھا، اس کی شرمندگی زیادہ ہوتی تھی، وہ دارا بادشاہ ایران تھا۔

دفعتہً سکندر نے آواز دی: 'انہیں لاؤ!" جو شخص داخل ہوا، وہ ایک پیر مرد بزرگ صورت تھا کہ مقیشی ڈاڑھی کے ساتھ بڑھاپے کے نور نے اس کے چہرے کو روشن کیا تھا۔ ہاتھ میں عصائے پیری تھا۔ جس وقت وہ آیا، سکندر خود اٹھا، اس کا ہاتھ پکڑ کر لایا، اپنے برابر کرسی پر بٹھایا اور پانچ لڑی کا سہرا اس کے سر پر باندھا۔ معلوم ہوا کہ یہ نظامی گنجوی ہیں اور اس سہرے میں "خمسہ" کے مضامین سے پھول پروئے ہوئے ہیں۔ سکندر پھر اٹھا اور تھوڑا سا پانی اس پر چھڑک کر کہا: "اب یہ کبھی نہ کملائیں گے"۔

بعد اس کے جو شخص آیا، اگرچہ سادہ وضع تھا مگر قیافہ روشن اور چہرہ فرحت روحانی سے شگفتہ نظر آتا تھا۔ جو لوگ اب تک آچکے تھے، ان سب سے زیادہ عالی رتبے کے لوگ اس کے ساتھ تھے۔ اس کے داہنے ہاتھ پر افلاطون تھا اور بائیں پر جالینوس۔ اس کا نام سقراط تھا۔ چنانچہ وہ بھی ایک مسند پر بیٹھ گیا۔ لوگ ایسا خیال کرتے تھے کہ ارسطو اپنے استاد، یعنی افلاطون سے دوسرے درجے پر بیٹھے گا، مگر اس مقدمے پر کچھ اشخاص تکرار کرتے نظر آئے کہ ان کا سرگروہ خود ارسطو تھا۔ اس منطقی زبردست نے کچھ شوخی اور کچھ سینہ زوری سے مگر دلائل زبردست اور براہین معقول کے ساتھ سب اہل محفل کو قائل کر لیا کہ یہ مسند میرا ہی حق ہے، اور یہ کہہ کر اول سکندر کو آئینہ دکھایا اور پھر نظامی (گنجوی) کو سلام کر کے بیٹھ ہی گیا۔

ایک گروہ کثیر بادشاہوں کے ذیل میں آیا۔ سب جبہ و عمامہ اور طبل و دمامہ رکھتے تھے، مگر باہر رو کے گئے، کیونکہ ہر چند ان کے جبے دامن قیامت سے دامن باندھے تھے اور عمامے گنبد فلک کا نمونہ تھے، مگر اکثر ان میں طبل تہی کی طرح اندر سے خالی تھے۔ چنانچہ دو شخص اندر آنے کے لیے منتخب ہوئے۔ ان کے ساتھ ایک انبوہ کثیر علماء و فضلاء کا ہو لیا۔ تعجب یہ کہ روم و یونان کے فلسفی ٹوپیاں اتارے ان کے ساتھ تھے، بلکہ چند ہندو بھی تقویم کے پترے لیے اشیرباد کہتے آتے تھے۔ پہلا بادشاہ ان میں ہارون رشید اور دوسرا مامون رشید تھا۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ ایک اور تاج دار سامنے سے نمودار ہوا۔ ولایتی استخوان اور ولایتی لباس تھا اور جامہ خون سے قلمکار تھا۔ ہندوستان کے بہت سے گراں

بھاری زیور اس کے پاس تھے، مگر چوں کہ ناواقف تھا، اس لیے کچھ زیور ہاتھ میں لیے تھا، کچھ کندھے پر پڑے تھے۔ ہر چند یہ جواہرات اپنی آبداری سے پانی ٹپکاتے تھے، مگر جہاں قدم رکھتا تھا، بجائے غبار کے آہوں کے دھوئیں اٹھتے تھے، وہ محمود غزنوی تھا۔ بہت سے مصنف اس کے استقبال کو بڑھے مگر وہ کسی اور کا منتظر اور مشتاق معلوم ہوتا تھا۔ چنانچہ ایک نوجوان حور شمائل آیا اور فردوسی کا ہاتھ پکڑ کر محمود کے سامنے لے گیا۔ محمود نے نہایت اشتیاق اور شکر گزاری سے ہاتھ اس کا پکڑا۔ اگرچہ برابر بیٹھ گئے مگر دونوں کی آنکھیں شرم سے جھک گئیں۔ نوجوان ایک عجیب ناز و انداز سے مسکرایا اور چلا گیا، وہ ایاز تھا۔ اسی عرصے میں ایک اور شخص آیا کہ لباس اہل اسلام کا رکھتا تھا، مگر چال ڈھال یونانیوں سے ملاتا تھا۔ اس کے داخل ہونے پر شعراء تو الگ ہو گئے، مگر تمام علماء و فضلاء میں تکرار اور قیل و قال کا غل ہوا۔ اس سینہ زور نے سب کو پیچھے چھوڑا، ارسطو کے مقابل میں ایک کرسی بچھی تھی، اس پر آ کر بیٹھ گیا، وہ بو علی سینا تھا۔

ایک انبوہ کثیر ایرانی تورانی لوگوں کا دیکھا کہ سب معقول اور خوش وضع لوگ تھے، مگر انداز ہر ایک کے جدا جدا تھے۔ بعض کے ہاتھوں میں اجزا اور بعض کی بغل میں کتاب تھی کہ اوراق ان کے نقش و نگار سے گلزار تھے۔ وہ دعوے کرتے تھے کہ ہم معانی و مضامین کے مصور ہیں۔ ان کے باب میں بڑی تکراریں ہوئیں۔ آخر یہ جواب ملا کہ تم مصور بے شک اچھے ہو، مگر بے اصل اور غیر حقیقی اشیاء کے مصور ہو۔ تمہاری تصویروں میں اصلیت اور واقعیت کا رنگ نہیں، البتہ انتخاب ہو سکتا ہے، یہ لوگ فارسی زبان کے شاعر تھے۔ چنانچہ انوری، خاقانی، ظہیر فاریابی وغیرہ چند اشخاص منتخب ہو کر اندر آئے، باقی سب نکالے گئے۔ ایک شاعر کے کان پر قلم دھرا تھا، اس میں سے آب حیات کی بوندیں ٹپکتی تھیں، مگر کبھی کبھی اس میں سے سانپ کی زبانیں بھی لہراتی نظر آتی تھیں، اس لیے اس پر پھر تکرار ہوئی۔ اس نے کہا کہ بادشاہوں کو خدا نے دفع اعدا کے لیے تلوار دی ہے، مگر ملک مضامین کے حاکم سوائے قلم کے کوئی حربہ نہیں رکھتے۔ اگر چند بوندیں زہر آب کی بھی نہ رکھیں تو اعدائے بد نہاد ہمارے خون عزت کے بہانے سے کب چوکیں۔ چنانچہ یہ عذر ان کا قبول ہوا، یہ انوری تھا جو باوجود گل

افشانی فصاحت کے بعض موقعے پر اس قدر ہجو کرتا تھا کہ کان اس کے سننے کی تاب نہیں رکھتے۔ خاقانی پر اس معاملے میں اس کے استاد کی طرف سے دعوئے پیش ہوئے۔ چوں کہ اس کی بنیاد خانگی نزاع پر تھی، اس لیے وہ بھی اس کی کرسی نشینی میں خلل انداز نہ ہو سکا۔ اسی عرصے میں چنگیز خاں آیا۔ اس کے لیے گو علماء اور شعراء میں سے کوئی آگے نہ بڑھا، بلکہ جب اندر لائے تو خاندانی بادشاہوں نے اسے چشم حقارت سے دیکھ کر تبسم کیا۔ البتہ مؤرخوں کے گروہ نے بڑی دھوم دھام کی۔ جب کسی کی زبان سے نسب نامے کا لفظ نکلا تو اس نے فوراً شمشیر جوہر دار سند کے طور پر پیش کی، جس پر خونیں حرفوں سے رقم تھا: "سلطنت میں میراث نہیں چلتی۔" علماء نے غل مچایا کہ جس کے کپڑوں سے لہو کی بو آئے وہ قصاب ہے، بادشاہوں میں اس کا کام نہیں۔ شعراء نے کہا جس تصویر کے رنگ میں ہمارے قلم یا مصوران تصانیف کی تحریر نے رنگ بقا نہ ڈالا ہو، اسے اس دربار میں نہ آنے دیں۔ اس بات پر اس نے بھی تامل کیا اور متاسف معلوم ہوتا تھا۔ اس وقت ہاتف نے آواز دی کہ اے چنگیز! جس طرح ملک و شمشیر کے جوش کو قوم کے خون نے حرکت دی، اگر علوم و فنون کا بھی خیال کرتا، تو آج قومی ہمدردی کی بدولت ایسی ناکامی نہ اٹھاتا۔ اتنے میں چند مؤرخ آگے بڑھے، انہوں نے کچھ ورق دکھائے کہ ان میں طورۂ چنگیز خاں، یعنی ملکی انتظام کے قواعد لکھے تھے۔ آخر قرار پایا کہ اسے دربار میں جگہ دو، مگر ان کاغذوں پر کچھ لہو کے چھینٹے دو اور ایک سیاہی کا داغ لگا دو۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ ایک جوان اسی شکوہ و شان کا اور آیا، اس کا نام ہلاکو خان تھا۔ اس کے لیے چند علماء نے بھی مؤرخوں کا ساتھ دیا۔ جس وقت اندر لائے تو اس کے لیے بھی تکراروں کا غل ہوا چاہتا تھا، مگر ایک مرد بزرگ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھایا، جس کی وضع متشرع عالموں کی تھی، لیکن کمر میں ایک طرف اصطرلاب، دوسری طرف اقلیدس کی شکلیں لٹکتی تھیں، بغل میں فلسفے اور حکمت کے چند اجزا تھے، ان کا نام محقق طوسی تھا۔ چنانچہ انہیں دیکھ کر کوئی بول نہ سکا۔ اسے تو بادشاہوں کی صف میں جگہ مل گئی۔ محقق کو بو علی سینا نے یہ کہہ کر پاس بٹھا لیا کہ آپ نے میری کلاہ شہرت میں بقائے دوام کے آب دار موتی ٹانکے، شکریہ ادا کرتا ہوں۔

تھوڑی دیر نہ گزری تھی کہ امیر تیمور کی نوبت آئی۔ بہت سے مؤرخوں نے اس کے لانے کی التجا کی مگر وہ سب کو دروازے پر چھوڑ گیا اور اپنا آپ رہبر ہوا، کیوں کہ وہ مؤرخ تھا، رستہ جانتا تھا اور اپنا مقام پہچانتا تھا۔ لنگڑاتا ہوا گیا اور ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ تیمور کرسی پر بیٹھتے ہی تلوار ٹیک کر اٹھ کھڑا ہوا اور کہا کہ اے اہل تصنیف! میں تم سے سوال کرتا ہوں کہ ہماری شمشیر کے عوض خدا نے جو تمھیں قلم تحریر دیا ہے، اسے اظہار واقعیت اور خلائق کی عبرت اور نصیحت کے لیے کام میں لانا چاہیے یا اغراض نفسانی اور بد زبانی میں؟ تمام مؤرخ ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے کہ یہ کس پر اشارہ ہے۔ اس پر امیر تیمور نے ابن عرب شاہ کے بلانے کو ایما فرمایا۔ معلوم ہوا کہ وہ کہیں پیچھے رہ گیا۔ چنانچہ اس کا نام مصنفوں کی فہرست سے نکالا گیا۔

اسی حال میں دیکھتے ہیں کہ ایک بزرگ، آزاد وضع، قطع تعلق کا لباس بر میں، خاکساری کا عمامہ سر پر، آہستہ آہستہ چلے آتے ہیں۔ تمام علماء و صلحاء مؤرخ و شاعر سر جھکائے ان کے ساتھ ہیں۔ وہ دروازے پر آکر ٹھہرے۔ سب نے آگے بڑھنے کو التجا کی تو کہا: "معذور رکھو، میرا ایسے مقدموں میں کیا کام ہے" اور فی الحقیقت وہ معذور رکھے جاتے، اگر تمام اہل دربار کا شوق طلب ان کے انکار پر غالب نہ آتا۔ وہ اندر آئے، ایک طلسمات کا شیشہ مینائی ان کے ہاتھ میں تھا کہ اس میں کسی کو دودھ کسی کو شربت، کسی کو شراب شیرازی نظر آتی تھی۔ ہر ایک کرسی نشین انھیں اپنے پاس بٹھانا چاہتا تھا، مگر وہ اپنی وضع کے خلاف سمجھ کر کہیں نہ بیٹھے۔ فقط اس سرے سے اس سرے تک ایک گردش کی اور چلے گئے۔ وہ حافظ شیراز تھے اور شیشہ مینائی ان کا دیوان تھا، جو فلک مینائی کے دامن سے دامن باندھے ہے۔

لوگ اور کرسی نشین کے مشتاق تھے کہ دور سے دیکھا، بے شمار لڑکوں کا غول غل مچاتا چلا آتا ہے۔ بیچ میں ان کے ایک پیر مرد، نورانی صورت، جن کی سفید داڑھی میں شگفتہ مزاجی نے کنگھی کی تھی اور خندہ جبینی نے ایک طرہ سر پر آویزاں کیا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں گل دستہ، دوسرے میں ایک میوہ دار ٹہنی پھلوں پھولوں سے ہری بھری تھی۔ اگرچہ مختلف فرقوں کے لوگ تھے جو باہر استقبال کو کھڑے تھے، مگر انھیں

دیکھ کر سب نے قدم آگے بڑھائے۔ کیوں کہ ایسا کون تھا جو شیخ سعدی اور ان کی گلستان اور بوستان کو نہ جانتا تھا۔ انہوں نے کمرے کے اندر قدم رکھتے ہی سعد زنگی کو پوچھا۔ اس بیچارے کو ایسے درباروں میں بار بھی نہ تھی، لیکن اور کرسی نشین کہ اکثر ان سے واقف تھے اور اکثر اشتیاق غائبانہ رکھتے تھے، وہ ان کے مشتاق معلوم ہوئے۔ باوجود اس کے یہ ہنسے اور اتنا کہہ کر اپنے لڑکوں کے لشکر میں چلے گئے: "دنیا دیکھنے کے لیے ہے، برتنے کے لیے نہیں"۔

بعد اس کے دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ چنانچہ ایک اولوالعزم شخص آیا جس کے چہرے سے خودسری کا رنگ چمکتا تھا اور سینہ زوری کا جوش بازوؤں میں بل مارتا تھا۔ اس کے آنے پر تکرار ہوئی اور مقدمہ یہ تھا کہ اگر علماء کی نہیں تو مؤرخوں کی کوئی خاص سند ضرور چاہیے ہے۔ بلکہ چغتائی خاندان کے مؤرخ صاف اس کی مخالفت پر آمادہ ہوئے۔ اس نے باوجود اس کے ایک کرسی، جس پر تیموری تمغہ بھی لگا تھا، گھسیٹ لی اور بیٹھ گیا۔ ہمایوں اسے دیکھ کر شرمایا اور سر جھکالیا، مگر پھر تاج شاہی پر انداز کجکلاہی کو بڑھا کر بیٹھا اور کہا کہ بے حق بے استقلال ہے۔ اس نے داڑھی پر ہاتھ پھیر کر کہا کہ مجھے اتنا فخر کافی ہے کہ میرے دشمن اور ان کی اولاد میرے رستے پر قدم بقدم چلیں گے اور فخر کریں گے۔

تھوڑی دیر کے بعد ایک خورشید کلاہ آیا جس کو انبوہ کثیر ایرانی، تورانی اور ہندوستانیوں کے فرقہ ہائے مختلفہ کا بیچ میں لیے آتا تھا۔ وہ جس وقت آیا، تمام اہل دربار کی نگاہیں اس کی طرف اٹھیں اور رضامندی عام کی ہوا چلی۔ تعجب یہ ہے کہ اکثر مسلمان اس کو مسلمان سمجھتے تھے، ہندو اسے ہندو جانتے تھے، آتش پرستوں کو آتش پرست دکھائی دے رہا تھا، نصاریٰ اس کو نصاریٰ سمجھتے تھے، مگر اس کے تاج پر تمام سنسکرت حروف لکھے تھے۔ اس نے اپنے بعض ہم قوموں اور ہم مذہبوں کی شکایت کر کے بدایونی پر خون کا دعویٰ کیا کہ اس نے میری حیات جاودانی کو خاک میں ملانا چاہا تھا، اور وہ فتح یاب ہوتا اگر چند منصف مصنفوں کے ساتھ ابوالفضل اور فیضی کی تصنیف میری مسیحائی نہ کرتی۔ سب نے کہا، نیت کا پھل ہے۔

اس کے بعد ایک اور بادشاہ آیا جو اپنی وضع سے ہندو راجہ معلوم ہوتا تھا۔ وہ خود مخمور نشے میں چور تھا۔ ایک عورت صاحب جمال اس کا ہاتھ پکڑے آتی تھی اور جدھر چاہتی پھراتی تھی۔ وہ جو کچھ دیکھتا تھا اس کے نور جمال سے دیکھتا تھا اور جو کچھ کہتا تھا اس کی زبان سے کہتا تھا۔ اس پر بھی ہاتھ میں ایک جزو کاغذوں کا تھا اور کان پر قلم دھرا تھا۔ یہ سانگ دیکھ کر سب مسکرائے۔ مگر چونکہ دولت اس کے ساتھ اور اقبال آگے آگے اہتمام کرتا آتا تھا اس لیے بدمست بھی نہ ہوتا تھا۔ جب نشے سے آنکھیں کھلتی تھیں تو کچھ لکھ بھی لیتا تھا۔ وہ جہانگیر تھا اور بیگم نور جہاں تھی۔

شاہجہاں بڑے جاہ و جلال سے آیا۔ بہت سے مؤرخ اس کے ساتھ کتابیں بغل میں لیے تھے اور شاعر اس کے آگے آگے قصیدے پڑھتے آتے تھے۔ میر عمارت ان عمارتوں کے فوٹوگراف ہاتھ میں لیے تھے جو اس کے نام کے کتابے دکھاتی اور سینکڑوں برس کی راہ تک اس کا نام روشن دکھاتی تھیں۔ اس کے آنے پر رضامندی عام کا غلغلہ بلند ہوا چاہتا تھا، مگر ایک جوان آنکھوں سے اندھا، چند بچوں کو ساتھ لیے آیا کہ اپنی آنکھوں کا اور بچوں کے خون کا دعویٰ کرتا تھا۔ یہ شہریار، شاہجہاں کا چھوٹا بھائی تھا اور بچے اس کے بھتیجے تھے۔ اس وقت وزیر اس کے آگے بڑھا اور کہا کہ جو کیا گیا، بدنیتی اور خود غرضی سے نہیں کیا، بلکہ خلق خدا کے امن اور ملک کا انتظام قائم رکھنے کو کیا۔ بہر حال اسے دربار میں جگہ ملی اور سلاطین چغتائیہ کے سلسلے میں معزز درجے پر ممتاز ہوا۔

ایک تاجدار آیا کہ جبہ اور عمامہ سے وضع زاہدانہ رکھتا تھا۔ ایک ہاتھ سے تسبیح پھیرتا جاتا تھا، دوسرے ہاتھ میں جو فرد حساب تھی، اس میں غرق تھا۔ اور معلوم ہوتا تھا کہ اس کی میزان کو پرتاتا ہے۔ سب نے دیکھ کر کہا کہ انھیں خانقاہ میں لے جانا چاہیے، اس دربار میں ان کا کچھ کام نہیں، لیکن ایک ولایتی کہ بظاہر مقطع اور معقول نظر آتا تھا، وہ دونوں ہاتھ اٹھا کر آگے بڑھا اور کہا کہ اے اراکین دربار! ہمارے ظل سبحانی نے اس کمبخت سلطنت کے لیے بھائی سے لے کر باپ تک کا لحاظ نہ کیا اس پر بھی تمہارے اعتراض اس دربار میں اسے جگہ نہ دیں گے۔ یہ لطیفہ اس نے اس مسخرہ پن

سے ادا کیا کہ سب مسکرائے اور تجویز ہوئی کہ تیموری خاندان کے سب سے اخیر میں انہیں بھی جگہ دے دو۔ معلوم ہوا کہ وہ عالمگیر بادشاہ اور ساتھ اس کے نعمت خاں عالی تھا۔

اس کے ساتھ ایک پیڈا جوان، دکھنی وضع، جنگ کے ہتھیار لگائے راجگی کے سکے تمغے سے سجا ہوا آیا۔ اس کی طرف لوگ متوجہ نہ ہوئے بلکہ عالمگیر کچھ کہنا بھی چاہتا تھا مگر وہ کرسی کھینچ کر اس کے سامنے ہی بیٹھ گیا اور بولا کہ صاحب! ہمت کو جگہ دو یا نہ دو، وہ آپ جگہ پیدا کر لیتا ہے، یہ سیوا جی تھا جس سے مرہٹہ خاندان کی بنیاد قائم ہوئی ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد دور سے گانے جانے کی آواز آئی اور بعد اس کے ایک بادشاہ آیا۔ اس کی وضع ہندوستانی تھی۔ مصنفوں اور مؤرخوں میں سے کوئی اس کے ساتھ نہ تھا۔ البتہ چند اشخاص تھے کہ کوئی ان میں گویا اور کوئی بھانڈ، کوئی مسخرہ نظر آتا تھا۔ یہ سب گھبرائے ہوئے آئے تھے کیونکہ ایک ولایتی دلاور ان کے پیچھے پیچھے شمشیر برہنہ علم کیے تھا۔ اس کی اصفہانی تلوار سے لہو کی بوندیں ٹپکتی تھیں۔ مخمل رومی کی کلاہ تھی جس پر ہندوستان کا تاج شاہی نصب تھا اور اسپ بخارائی زیر ران تھا، وہ ہندوستانی وضع بادشاہ محمد شاہ تھا۔ اسے دیکھتے ہی سب نے کہا کہ نکالو نکالو، ان کا یہاں کچھ کام نہیں، چنانچہ وہ فوراً دوسرے دروازے سے نکالے گئے۔ ولایتی مذکور نادر شاہ تھا جس نے سرحد روم سے بخارا تک فتح کر کے تاج ہندوستان سر پر رکھا تھا۔ اسے چنگیز خاں کے پاس جگہ مل گئی۔

تھوڑی دیر ہوئی تھی جو ایک غول ہندوستانیوں کا پیدا ہوا ان لوگوں میں بھی کوئی مرقع بغل میں دبائے تھا، کوئی گلدستہ ہاتھ میں لیے تھا۔ انہیں دیکھ کر آپ ہی آپ خوش ہوتے تھے اور وجد کر کے اپنے اشعار پڑھتے تھے۔ یہ ہندوستانی شاعر تھے۔ چنانچہ چند اشخاص انتخاب ہوئے۔ ان میں ایک شخص دیکھا کہ جب بات کرتا تھا، اس کے منہ سے رنگا رنگ کے پھول جھڑتے تھے، لوگ ساتھ ساتھ دامن پھیلائے تھے۔ مگر بعض پھولوں میں کانٹے ایسے ہوتے تھے کہ لوگوں کے کپڑے پھٹے جاتے تھے۔ پھر بھی مشتاق

زمین پر گرنے نہ دیتے تھے، کوئی نہ کوئی اٹھا ہی لیتا تھا، وہ مرزا رفیع سودا تھے۔

میر بد دماغی اور بے پروائی سے آنکھ اٹھا کر نہ دیکھتے تھے۔ شعر پڑھتے تھے اور منہ پھیر لیتے تھے۔ درد کی آواز دردناک دنیا کی بے بقائی سے جی بیزار کیے دیتی تھی۔ میر حسن اپنی سحربیانی سے پرستان کی تصویر کھینچتے تھے۔ میر انشاء اللہ خاں قدم قدم پر نیا روپ دکھاتے تھے۔ دم میں عالم، ذی وقار متقی و پرہیزگار، دم میں ڈاڑھ چٹ، ہنگ کا سونٹا کندھے پر۔

جرات کو اگرچہ کوئی خاطر میں نہ لاتا تھا مگر جب وہ میٹھی زبان سے ایک تان اڑاتا تھا تو سب کے سر ہل ہی جاتے تھے۔ ناسخ کی گل کاری چشم آشنا معلوم ہوتی تھی اور اکثر جگہ قلم کاری اس کی عینک کی محتاج تھی۔ مگر آتش کی آتش زبانی اسے جلائے بغیر نہ چھوڑتی تھی۔ مومن کم سخن تھے مگر جب کچھ کہتے تھے، جرات کی طرف دیکھتے جاتے تھے۔

ایک پیر مرد، دیرینہ سال، محمد شاہی دربار کا لباس جامہ پہنے، کھڑکی دار پگڑی باندھے، جریب ٹیکتے آتے تھے۔ مگر ایک لکھنو کے بانکے پیچھے گالیاں دیتے تھے۔ بانکے صاحب ضرور ان سے دست و گریباں ہو جاتے، لیکن چار خاکسار اور پانچواں تاجدار ان کے ساتھ تھا، یہ بچا لیتے تھے۔ بڈھے میر امن دہلوی "چار درویش" کے مصنف تھے اور بانکے صاحب مرزا سرور "فسانہ عجائب" والے تھے۔ ذوق کے آنے پر پسند عام کے عطر سے دربار مہک گیا۔ انہوں نے اندر آکر شاگردانہ طور پر سب کو سلام کیا۔ سودا نے اٹھ کر ملک الشعرائی کا تاج ان کے سر پر رکھ دیا۔ غالب اگرچہ سب سے پیچھے تھے، پر کسی سے نیچے نہ تھے۔ بڑی دھوم دھام سے آئے اور ایک نقارہ اس زور سے بجایا کہ سب کے کان گنگ کر دیے۔ کوئی سمجھا اور کوئی نہ سمجھا مگر سب واہ واہ اور سبحان اللہ کرتے رہ گئے۔

اب میں نے دیکھا کہ فقط ایک کرسی خالی ہے اور بس اتنے میں آواز آئی کہ آزاد کو بلاؤ۔ ساتھ ہی آواز آئی کہ شاید وہ اس جرگے میں بیٹھنا قبول نہ کرے۔ مگر پھر وہیں کوئی بولا کہ اسے جن لوگوں میں بٹھادو گے بیٹھ جائے گا۔ اتنے میں چند اشخاص نے غل مچایا

کہ اس کے قلم نے ایک جہان سے لڑائی باندھ رکھی ہے، اسے دربار شہرت میں جگہ نہ دینی چاہیے۔ اس مقدمے پر قیل و قال شروع ہوئی۔ میں چاہتا تھا کہ نقاب چہرے سے الٹ کر آگے بڑھوں اور کچھ بولوں کہ میرے ہادی ہمدم یعنی فرشتہ رحمت نے ہاتھ پکڑ لیا اور چپکے سے کہا کہ ابھی مصلحت نہیں۔ اتنے میں آنکھ کھل گئی۔ میں اس جھگڑے کو بھی بھول گیا، اور خدا کا شکر کیا کہ بلا سے دربار میں کرسی ملی یا نہ ملی، مردوں سے زندوں میں تو آیا۔

خاتمہ:

اگرچہ خیالات کے جلسے جمے ہوئے ہیں اور اشخاص تصوری زبان ہائے بے اجسام سے طلسم کاری کر رہے ہیں، لیکن سو کے قریب صفحے سیاہ ہو چکے۔ اب جلسہ ختم اور کچھ عرصے کے لیے کلام کا دروازہ بند۔ اے اہل انجمن! آپ کا آنا، مبارک آنا، قدم بر چشم۔ مگر جلسہ آیندہ کی ابھی سے گزارش قبول ہو کہ حصہ دویم کا سامان بہم پہنچے۔

جنت الحمقا

تمہید:

مضمون مفصلہ ذیل ایک مرقع خاص کی تصویر کا خاکہ ہے جس کی صورت یہ ہے کہ ہم اور ابنائے جنس ہمارے کچھ اپنی غلط فہمی سے اور کچھ کوتاہ اندیشی سے اعمال قبیحہ یا حرکات ناپسندیدہ میں مبتلا ہیں، اور باوجودیکہ اس کے حال و مآل کی قباحتوں سے آگاہ ہیں، بلکہ اور ہم صورتوں کو ان کے خمیازے بھرتے دیکھتے ہیں، پھر بھی کنارہ کش نہیں ہوتے۔ تعجب یہ ہے کہ جب اپنی جگہ بیٹھتے ہیں تو اس ارتکاب کو داخل حسن سمجھ کر اس میں افراط اور زیادتی کرنی سرمایہ فخر سمجھتے ہیں۔ ایک شراب خوار آدمی یاروں میں بیٹھ کر فخریہ بیان کرتا ہے کہ میں کئی کئی بوتلیں اڑا جاتا ہوں اور حواس میں بالکل فرق نہیں آتا۔ دوسرا اس سے بڑھ کر اچھلتا ہے کہ میں پانی تک نہیں ملاتا مگر آواز میں اصلاً تغیر نہیں ہوتا۔ اسی طرح ایک عیاش تماش بین اپنی روسیاہیوں کو کہتا ہے اور نہیں شرماتا۔ دوسرا اس میں اپنی شدتیں اور افراطیں بیان کرتا ہے اور خوشی سے رنگ رخ چمکاتا ہے۔ ایک دغاباز منشی یا دیوان غبن کر کے آقا کے گھر کو برباد اور اپنا گھر آباد کرتا ہے اور جو جو غل فصل حساب کتاب میں کیے، انہیں مسائل افلاطون کی طرح فخریہ سمجھتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جیسا کرتے ہیں ویسا بھرتے ہیں، مگر خدا جانے

وہ کیا شے ہے جس نے ایسا پردہ غفلت آنکھوں پر ڈال رکھا ہے کہ نہ وہ برائیاں بری معلوم ہوتی ہیں، نہ ان سے باز آتے ہیں۔ یہی کوتاہ اندیشی کبھی ایک غلط فہمی کے لباس میں ظہور پاتی ہے، یعنی اکثر اشخاص خاص خاص امور میں اپنے کمال پر مفتخر اور نازاں ہوتے ہیں۔ ہر چند امور مذکور بجائے خود قابل فخر و ناز کے ہیں، مگر بشرطیکہ ان میں کمال نصیب ہو۔ فی الحقیقت اسے غلط فہمی کہنا چاہیے جو کہ نتیجہ حماقت اور ایک قسم کی کوتاہ اندیشی کا ہے۔ چنانچہ یہ لوگ بھی ابتدا میں ناواقفیت عوام کے سبب سے رونق بازار پاتے ہیں، مگر چند درجے طے کر کے گر پڑتے ہیں اور سخت ندامت اٹھاتے ہیں۔ افسوس کہ کوئی زمانہ اس قسم کے گناہوں سے خالی نہیں بلکہ روز بروز حال ابتر نظر آرہا ہے۔ اس لیے یہ مضمون ابنائے جنس کی عبرت کے لیے ایک استعارے اور کنایے کے رنگ میں لکھا جاتا ہے۔ ہر چند یہ رنگ صورت مضمون کے منہ پر ایک باریک نقاب ہے، لیکن اگر اہل نظر چند ساعت کے لیے نظر غور کو تکلیف دیں گے تو یہ استعارے صراحت اور وضاحت کے پہلو میں رکھے ہوئے پائیں گے:

دل تیرا آپ پردہ ہے دلدار کے لیے
ورنہ کوئی نقاب نہیں یار کے لیے

(آزاد)

دنیا میں اکثر قباحتیں اور حماقتیں ایسی ہیں کہ ہم سب ان میں آلودہ ہیں مگر معلوم نہیں ہوتیں۔ درحقیقت وہ ہماری رسائی فہم سے بہت اونچے طاق پر رکھی ہیں، اور کچھ ایسے ڈھب سے سجائی گئی ہیں کہ ہر بدی عین خوبی نظر آتی ہے۔ لطف یہ ہے کہ وہ آلودگی ہمیں کچھ بری بھی نہیں معلوم ہوتی، بلکہ بجائے اس کے رفع کرنے یا چھپانے کے خود دکھاتے ہیں اور آرزوئیں کرتے ہیں کہ اپنی قباحتوں میں ترقیاں کریں اور انہی

میں ہماری قدر دانیاں ہوں۔ چنانچہ سینکڑوں واہیات، ہزاروں لغو خیالات، مسخراپن، ظرافتوں کے چمن ہیں کہ وہی ہماری تفریح طبع اور خوش دلی کا سرمایہ ہو رہے ہیں اور یہ رنگینیاں ہمیں ایسے ایسے رنگوں میں رنگین کر کے ابنائے جنس کے سامنے جلوہ دیتی ہیں کہ ہم بھی انہی میں خلعت افتخار لیتے ہیں۔ اس فخر بے ہودہ اور خیال بے بنیاد کی خوشی میں خدا جانے کیا لطف دیکھا ہے کہ سیانے دنیاداروں نے اس کی دل فریبیوں کا اشارہ کرنے کے لیے ایک لطیف اصطلاح چھانٹی ہے، یعنی "جنت الحمقا"۔

لفظ آخر میں شاید لوگوں کو کچھ غلطی کا خیال ہو اور جو کچھ میں نے کہا انہی کی نسبت کچھ اور وضع دکھائی دیتی ہو۔ لیکن مجھے اب اس کا امتحان کرنا بے جا ہے، کیونکہ میں جو اس وقت آنکھیں مل رہا ہوں، تو یہی خواب دیکھ رہا تھا۔

ابھی سوتے سوتے ایسا معلوم ہوا گویا کسی نے مجھے ایک پہاڑ پر پھینک دیا ہے۔ مگر عجیب پہاڑ ہے کہ سبزے سے لہلہاتا، پھولوں سے چہچہاتا، جا بجا پانی لہراتا ہے۔ چڑھائی اس کی ہمت بلند کا نمونہ ہے۔ مگر باوجود اس کے اعتدال پر ہے کہ دم نہیں چڑھنے دیتی، بلکہ ساعت بہ ساعت سینے کو قوت حاصل ہوتی ہے، میں ادھر ادھر پھرنے لگا۔ اتنے میں ایک پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا تو میدان فراغ پایا اور دور سے نظر آیا کہ ایک جگہ آب رواں میں پاؤں لٹکائے کوئی شہزادی بیٹھی ہے کہ زیور و لباس سے طاؤس مرصع کا عالم ہے۔ مگر آنکھ سے بھینگی ہے اور اس بھینگی آنکھ پر رنگین عینک بھی لگائے ہے کہ اسی سبب سے اسے کوئی شے حالت اصلی پر نظر نہیں آتی۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ ملکہ غلط فہمی یہی ہے اور کل اہل عالم کی غلط فہمی گویا اسی کی نگاہ پر منحصر ہے۔

برابر اس کے ایک اور عجوبہ روزگار نظر آئی کہ اس کے بے انتہا سر ہیں اور دھڑ ایک۔ جس بات کی پسند اور ناپسند پر سر ہلاتی ہے، تمام جہان کے سر اسی طرح ہل جاتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ پسند عام اسی کا نام ہے۔ ان میں سے ایک غلط نمائی کرتی ہے اور دوسری دل ربائی کر کے جس شے پر چاہتی ہے، سب کو شیفتہ و فریفتہ کر لیتی ہے۔ یہ دونوں رات دن جادوگری میں مصروف ہیں اور تسخیر خلائق کے عمل میں شہرہ آفاق ہو گئی ہیں۔

لوگوں کا یہ حال دیکھا کہ چاروں طرف سے انبوہ در انبوہ امڈے چلے آتے ہیں، اور اگرچہ آمد کے رستے بھی دو ہیں، مگر ہر رستہ انہی دونوں کی طرف جاتا ہے۔ آنے والوں میں بعض آدمی، جو خود آرائی کے رنگ سے رخ چمکائے ہوئے اور زیبائی کے روغن سے سر چکنائے ہوئے تھے، انہیں کچھ ہدایت یا اشارات کی حاجت نہ تھی۔ خود بخود غلط فہمی کی طرف چلے جاتے تھے، اور وہ عالم فریب ایک ایک شخص کو اس کی طبیعت کے موافق اس طرح لبھاتی تھی کہ لٹو ہو جاتا تھا۔ بعد ازاں کچھ ایسی کل مروڑتی تھی کہ خود پسند عام کے پھندے میں جا کر گلا رکھ دیتا تھا۔

غرضکہ اسی طرح پھرتے پھرتے ہم ایک میدان جانفزا میں جا نکلے۔ وہاں دیکھیں تو پسند عام چہل قدمی کر رہی ہے اور بہت سے لوگ، جو ہم سے بھی پہلے وہاں پہنچے ہوئے تھے، انہیں پھسلا رہی ہے۔ آواز اس کی ایسی رسیلی تھی کہ دل مست ہوئے جاتے تھے۔ جب بات کرتی تھی تو منہ سے پھول جھڑتے تھے، بولتی تھی تو سانس کے ساتھ خوشبو کی لپٹیں آتی تھیں۔ لطف یہ تھا جس شخص سے بات کرتی تھی، جدا زبان اور جدا طرز بیان تھا۔ اور جو سنتا تھا یہی خیال کر رہا تھا کہ وہ جواہر بے مثل جو خاص میری ذات باکمال میں قابل قدر ہے، اسی کی بابت یہ گفتگو ہو رہی ہے۔ پس گویا اس جنت بے زوال کا فرمان ملا جس کے انعام کا استحقاق کلی مجھ میں موجود ہے۔

غرض اسی حال میں ہم سب کچھے کچھے اس کے پیچھے چلے جاتے تھے۔ اور مسافت راہ میں یا تو اپنی خوبیوں کی خود آپس میں تعریفیں کرتے جاتے تھے، یا اپنی خیالی خوبیوں پر آپ ہی اتراتے تھے یا جنہیں اپنی وضع کا نہ پاتے ان کی ہجو کرتے جاتے تھے۔ کچھ اپنے اپنے مدارج کمال پر آپس میں لڑتے جھگڑتے چلے جاتے تھے۔

غرض اسی عالم میں چلے، چلتے چلتے ایک باغ نظر آیا جو کہ اسم با مسمی اندھیریا باغ تھا۔ اس کے دروازے پر دیکھیں تو غلط فہمی بیٹھی ہے۔ مگر جس مکان میں وہ بیٹھی تھی، اسے عمداً ایسی حکمت سے بنا لیا تھا کہ صورت اس کی دھندلی سی نظر آتی تھی۔ اس نے کچھ سفید سا لباس پہن رکھا تھا کہ جس سے دیکھنے والوں کو ملکہ صداقت کا دھوکا ہوتا تھا۔ اور چونکہ شہزادی صداقت پری ایک مشعل بھی ساتھ رکھا کرتی ہے، جس سے اپنے

عاشقوں کو حسن خدا آفریں کی خوبیوں کا جلوہ دکھاتی ہے، اس نے اس کے جواب میں داہنے ہاتھ پر شیشہ جادو اور بائیں ہاتھ پر سحر سامری کی چھڑی رکھی تھی۔ ان ہی ٹونے ٹوٹکوں سے لوگوں کو لبھاتی تھی اور دھوکے دغا سے سب کو پرچاتی تھی۔ چنانچہ کبھی کبھی بڑی تمکنت سے ہاتھ بڑھا کر اس چھڑی کو اٹھاتی اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتی جاتی تھی۔ اس کے علاوہ نرگس جادو بھرے ناز و انداز کے پھول اور نمود و نمائش کی کلیاں گود میں بھرے کھڑی تھی۔ انہیں اہل اشتیاق کے سامنے بکھیرتی جاتی تھی۔

دفعتہً عصا کا اشارہ آسمان کی طرف ہوا اور ساتھ ہی اس کے سب کی نگاہیں اوپر اٹھ گئیں۔ ایک نیلا قطعہ آسمان کا ایسا صاف و مصفا دکھائی دیا جیسے صبح بہار سے فلک فیروزی کا رنگ نکھرا ہوا ہو۔ اسی فضائے دلکشا میں ملکہ خام خیالی کا محل نظر آیا کہ آسمان سے باتیں کرتا تھا، مگر معلوم نہ ہوتا تھا کہ کون سی بنیاد ہے جس پر یہ قائم ہے۔ فقط پیچ در پیچ بادلوں کا ایک زنجیرہ تھا کہ جادو کے زور سے ادھر کھڑا تھا۔ اس کی چڑھائی کا راستہ جو ہمارے زیر قدم تھا، قوس قزح کی طرح خوش رنگ و خوشنما تھا۔ نسیم جاں بخش جو ادھر ادھر سبزے پر لوٹتی تھی، ہر جھونکے میں عقل و حواس پر جادو کی پڑیاں مارتی تھی۔ تمام دیواریں طلسمات کے رنگ سے دم میں سنہری تھیں اور دم میں روپہلی۔ سب سے نیچے کے درجے کے ستون اگرچہ باغ ارم والی تراش پر اتارے تھے مگر برف کے تراشے تھے۔ چھت کا گنبد نہایت عالی شان تھا لیکن برج کی جگہ ایک ایسے شیشے کا بلبلہ دھرا تھا اور اس کے کلس پر طائر خیال کا ہما پر پھیلائے تھر تھرا رہا تھا۔

مسافروں نے وہاں پہنچ کر نہ کوئی دربان پایا، نہ کسی کا انتظار کیا، جو آیا اپنے جوہر قابلیت کو پروانہ اجازت سمجھے ہوئے بے دھڑک اندر داخل ہو گیا۔ دربار کے کمرے میں پہنچے تو دیکھتے ہیں کہ بہت سی نمود بے بود صورتیں ہیں کہ ہم ہی میں ملی جلی اہتمام کرتی پھرتی ہیں اور اس انبوہ بے تمیزی میں اپنے سے خیالات کے بموجب ایک ایک کر کے درجے قائم کر کے صفیں ترتیب دیتی پھرتی ہیں۔ مدارج عزت بھی وہاں روشن ہوتے ہیں مگر ساعت بہ ساعت دھوپ کی طرح ڈھلتے جاتے ہیں اور لوگ تھے کہ بتاسے کی طرح بیٹھے جاتے تھے۔ استحقاق پوچھو تو دادا پردادا کے وقت کا ایک پھٹا پرانا سا

چغہ تھا، اس کے سوا کچھ نہیں۔

ایک طرف لاف گزاف تھی، جس نے اپنی ذات خوش صفات کا ایک قصیدہ بنا رکھا تھا۔ آپ ہی اس اعمال نامے کو پڑھتی تھی اور خوش ہوتی تھی۔ اسے اپنے سوا دوسرا ذکر نہ تھا۔ اکڑ تکڑ تھی کہ پنجوں کے بل چلتی تھی اور اینٹھتی پھرتی تھی۔ خود پرستی ایک طرف آئینے کے سامنے کھڑی تھی۔ آپ ہی اپنے تئیں دیکھتی اور پھولی نہ سماتی تھی۔ کمرے کے صدر میں تخت شاہانہ اور آگے ایک شامیانہ اس شان و شوکت سے سجا ہوا تھا کہ جس قدر سجاوٹ کے گمان میں گنجائش اور حوصلہ آرائش میں وسعت تھی، سب اس میں خرچ ہو گئی۔ تخت پر ہالہ و ماہ کا چتر، اس کے نیچے ملکہ خام خیالی[43] مہتاب آتشبازی کے دو پر لگائے پری بنی بیٹھی تھی۔ جو اس کے خیال پرست تھے وہ اسے پری حسن آفریں کہتے تھے اور زہرۂ ثانی اعتقاد کرتے تھے۔ ایک نوجوان تخت کے پہلو میں کھڑا تھا اور ہر ایک کو سامنے لا کر سجدے کرواتا تھا۔ معلوم ہوا کہ وہ اس کا رشید بیٹا ہے اور شہزادہ خود پرست اس کا نام ہے۔ اس کی خود پسندی اور خود بینی کا یہ عالم تھا کہ اپنی نظر اپنے ہی بیچ میں غرق ہوئی جاتی تھی۔ اودھر اودھر کی شے اسے اصلاً نظر نہ آتی تھی۔ اس پر بھی لوگوں کا یہ حال تھا کہ ملکہ سے زیادہ اس کی طرف جھکتے تھے۔ ایک گلاب پاش اس کے ہاتھ میں تھا، بقدر حیثیت ہر شخص کے سر پر چھڑک دیتا تھا کہ خود پسندی اور بلند نظری کے خمار سے دماغ ان کے آسمان تک پہنچ جاتے تھے۔ تماشا یہ تھا کہ شہزادہ جو جو ہتھیار فتوحالت کے لیے کام میں لاتا تھا، وہ انہی لوگوں سے لیے تھے جن کو شکار کرتا تھا۔ چنانچہ جس بہادر کو اپنے تیر کا نشانہ کرتا تھا، اسی کے سر کی کلغی نوچ کر اپنے تیر کی پر گیری لگاتا تھا۔ جس نیزے سے اہل علم پر وار کرتا تھا، وہ انہی کے لکھنے کا قلم تھا، جس تلوار سے دولتمندوں کو دوپارہ کرتا تھا، اس کے قبضے پر انہی کے خزانوں سے لے کر سونا چڑھاتا تھا۔ ناظمان ملک کے لیے دام تزویر بناتا تھا کہ پھندے اس کے انہی کی بندش تدبیر سے اڑائے ہوئے تھے۔ صاحب جمالوں کے رخساروں سے گرمی حسن لیتا تھا اور عاشقوں کے ساتھ اسی میں انہیں بھی گرماتا تھا۔ یہاں تک کہ حسن کے پھول خود بخود کملا کر رہ جاتے تھے۔ فصیحوں کی زبانوں سے تجلی کی تڑپ نکالتا تھا کہ اپنی

آگ میں آپ ہی جل کر خاک ہو جاتے تھے۔

تخت کے نیچے تین چڑیلیں پریوں کا بھیس بھرے حاضر تھیں۔ اول تو خوشامد تھی کہ بڑی خوش ادائی سے رنگ آمیزی کا خود سنبھالے کھڑی تھی۔ دوسری ظاہرداری آئینہ سامنے رکھے اپنے فن کی مشق کر رہی تھی۔ بعد اس کے خوش رواجی تھی جسے خوشنمائی کا خطاب ملا تھا۔ اس کا یہ عالم تھا کہ ہر نگاہ میں گرگٹ کی طرح نیا رنگ بدلتی تھی اور ہزاروں شکاروں کو ایک جال میں کھینچتی تھی۔

غرضکہ شہزادہ خود پرست شمشیر کے زور اور تدبیر کے لاگ سے برابر فتوحات حاصل کیے جاتا تھا اور یہ تینوں دولت خواہ اس کے استحکام اور محافظت میں برابر مصروف تھے۔ ہر کام کا مہتمم اپنا حق صدق دل سے ادا کر رہا تھا۔ چنانچہ خوشامد جس شے پر ضرورت دیکھتی تھی نئے سے نیا رنگ چڑھا دیتی تھی کہ ہر دل کی آنکھ کو خوش آتا تھا۔ ظاہرداری ایسے ایسے ڈھنگ سے نمائش دیتی تھی کہ کیسی ہی بدنما شے ہو، خوشنما ہو جاتی تھی۔ خوش رواجی کا یہ عالم تھا کہ موٹے سے موٹے عیب بھی ہوتے تو انھیں ڈھانک دیتی، بلکہ ان پر ایسی خوبیاں چپکاتی کہ جنھیں اس سے کچھ لگاؤ بھی نہ ہوتا۔

میں ان حالات کو نگاہ غور سے دیکھ رہا تھا جو ایک آواز دردناک کان میں آئی، گویا کہتا ہے: "ہائے آدم زاد! ہائے تیری غفلت! خود آرائی سے ہدایت پاتا ہے، غلط فہمی کے دام میں آجاتا ہے، خود پسندی کی اشتعالک سے چمک اٹھتا ہے، خام خیالی کے قدموں پر چل کر تعلیم پاتا ہے، یہاں تک کہ مفلسی اور خواری کی زنجیروں میں گرفتار ہو جاتا ہے"۔ یہ کلمے ابھی ابھی زبان بہ زبان پھیلنے نہ پائے تھے جو دفعتہً ایسی ہلچل پڑی کہ تمام انبوہ تہ و بالا ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد ایک طرف سے رستہ کھلتا ہوا معلوم ہوا۔ دیکھوں تو ایک بڈھا نورانی صورت، معقول وضع ہے جس کے چہرے پر سنجیدگی اور متانت برستی تھی۔ اسے گرفتار کیے لاتے ہیں اور جو کلام عبرت انگیز نصیحتہً اس نے زبان سے نکالا تھا، اس کی سزا دینے کو لیے جاتے ہیں، کیوں کہ وہ ان کے آئین حکومت میں سراسر باعث خرابی تھا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اس نے جو کچھ کہا تھا، فقط بری الذمہ ہونے کو کہا تھا۔ اس کا نام ناصح دانش ہے۔

مگر لوگ ایسے بپھرے ہوئے تھے کہ اس بچارے کی بات سننی بھی گوارا نہ تھی، بلکہ اسے ایسی خواری اور زاری میں دیکھ کر خام خیالی بھی مسکراتی تھی، خود پسندی تیوری چڑھاتی تھی۔ خوشامد ذرا اسے راست باز سمجھتی تھی، اس نے اتنا لحاظ کیا کہ برقع اوڑھ کر برابر سے نکل گئی۔ ظاہر داری نے اپنے پنکھا اٹھا کر اس کی اوٹ میں منہ چڑا دیا۔ کسی نے اس بچارے کا نام حاسد رکھا، کسی نے عیب جو کا خطاب دیا۔ رواج نے دھوم مچا دی کہ بد اطوار، سلطنت کے برخلاف بغاوت پھیلائی چاہتا ہے۔ غرض اس پیر دیرینہ سال نے ہر طرف سے ذلت ہی ذلت اٹھائی اور اس جرم میں کہ ایسے ایسے لائق و فائق معزز کے حق میں گستاخی کی، چاروں طرف سے دھکے کھائے، بلکہ تحقیق خبر لگی کہ اگرچہ اس طرح نکالا گیا ہے مگر حکم ہے کہ آئندہ اگر کہیں صورت دکھائی تو اس کے حق میں بہت برا ہو گا۔

بڈھے بے چارے نے جو کچھ کہا، اس میں بہت کچھ تو میں آنکھوں سے دیکھ چکا تھا، باقی باتوں کے لیے سوچ رہا تھا کہ دیکھیے کس رنگ سے پوری ہوں۔ اتنے میں باہر کی طرف سے ایک غل اٹھا اور ظلم و ستم اور بے انصافیاں چڑیوں کے برن میں اس طرح اڑنے لگیں گویا آندھی آئی۔ انہوں نے اس کثرت سے ہجوم کیا کہ دروازہ تیرہ و تار ہو گیا۔ بے وقوفی اور بے اعتباری نمودار ہوئی۔ تکلیف، شرم، رسوائی، حقارت، مفلسی سب آگے پیچھے حاضر ہوئیں۔ ان کے آتے ہی ادھر تو خام خیالی، جو سونے کی چڑیا بنی بیٹھی تھی، ادھر شہزادہ خود پرست، ان کے ساتھ ساری پریاں دم کے دم میں ہوا ہو گئیں۔ ادھر تمام معتقد اور ہوا خواہ ان کے بھاگ بھاگ کر کونے گوشے اور سوراخوں میں گھس گئے۔ مگر ایک شخص میرے پاس کھڑا تھا، اسے کہیں سے دوربین ہاتھ آ گئی، چنانچہ اس نے دیکھا اور دفعتہ بولا کہ وہ گرفتاری کا حکم ہوا۔ وہ سو آدمیوں کا غول جیل خانے کو چلا، دو ہزار آدمی تہ خانے میں قید ہونے کو چلے، وہ سب اندھیری کوٹھڑیوں میں بند ہو گئے۔ مراد اس قید سے زندگی کے عذاب، دنیا کے دھندے، مکر و فریب کے جھگڑے تھے۔ جن مکانوں میں وہ لوگ ڈالے گئے ان کی خرابی دیکھنی چاہو تو دل ہائے پریشان کو دیکھ لو۔ وہ لوگ اگرچہ یہاں ہائے وائے بہت سی کرتے تھے مگر نکلنے کے رستے

کی طرف کبھی خیال نہ کرتے تھے۔ چنانچہ اس شخص نے ناک چڑھا کر کہا کہ یہ کمبخت اپنی حماقت اور شامت اعمال سے آپ یہاں پڑے ہیں، نہیں تو نہ یہ مکان ان کی شان کے قابل ہیں، نہ یہ اخراجات ان کے سامان کے لیے کافی ہیں۔ خیر ہم نے ایسے تماشے بہت دیکھے ہیں، اب یہ ہل چل ہو چکے گی تو پھر وہی بہار کا سماں ہو گا۔

جب میں نے یہ سنا تو اس کارخانے کی ناپائداری نے میرا دل بیزار کر دیا۔ میرے رفیق نے جو خبر دی تھی، میں نے اس کا شکریہ ادا کیا۔ جب دیکھا کہ بغیر گرفتار ہوئے یہاں سے نہ سرکے گا، تو میں چپکے سے دروازے کی طرف کھسکا اور چند شخصوں میں جا ملا کہ جو صداقت اور واقعیت کو مانتے تو نہ تھے مگر ان شامت اعمال کے گرفتاروں کو دیکھ کر ڈر گئے تھے۔ جب ہم دروازے کی دہلیز پر پہنچے تو دل پر صدمۂ عظیم گزرا، یعنی وہاں آ کر غلط نمائی کا پردہ آنکھوں سے اٹھ گیا۔ تب معلوم ہوا کہ اس محل کی بنیاد بالکل نہیں، معلق ہوا میں کھڑا ہے۔ اول تو ہم نے سوائے اس کے چارہ نہ دیکھا کہ موت کا کنواں ہے، آنکھیں بند کرو اور کود پڑو۔ مگر اس پہلی ہوس بے حاصل پر دل کو ہزار لعنت ملامت کی، جس نے اس عذاب میں گرفتار کیا۔

اب مقام تعجب یہ ہے کہ جس قدر یہ سب اپنے اپنے دل میں غور کرتے جاتے تھے، اتنا ہی وہ محل ہمیں نیچے اتارتا جاتا تھا۔ یہاں تک جو حالت ہم اپنے مناسب حال دیکھتے تھے، اسی انداز پر آ کر ٹھہر گیا۔ رفتہ رفتہ تھوڑی دیر میں جہاں ہم کھڑے تھے، وہ مقام زمین سے لگ گیا۔ ہم سب نے نکل کر اپنا اپنا رستہ لیا اور محل آنکھوں سے غائب ہو گیا۔ اب یہ نہیں کہہ سکتے کہ جو لوگ اس میں رہے ان پر کیا گزری اور انھیں ہمارے اتر جانے کی خبر بھی ہوئی یا نہیں۔ میں تو جانتا ہوں کہ نہیں ہوئی۔ خیر جو ہو سو ہو، اس سوچ میں دفعتہً میری آنکھ کھل گئی۔ خواب تو خواب و خیال ہو گیا، مگر نصیحت ہوئی کہ اب خام خالی کے اشاروں پر کبھی نہ چلوں گا، اس راہ خطرناک میں پھر قدم نہ دھروں گا۔

خوش طبعی

خوش طبعی کی تعریف میں یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ وہ کیا شے ہے۔ البتہ یہ کہنا آسان ہے کہ وہ کیا شے نہیں ہے۔ میں اگر اس کی نسبت کچھ خیالات بیان کروں تو افلاطون حکیم الٰہی کی طرح کنایے اور استعارے سے بیان کروں اور ظرافت کو ایک شخص قرار دے کر اس سے وہ صفتیں منسوب کروں جو کہ نسبت نامہ مندرجہ ذیل میں درج ہیں؛ یہ واضح ہو کہ سچ، خوش طبعی کے خاندان کا بانی مبانی ہے۔ اس گھرانے میں حسن ادب ایک نہایت معقول شخص تھا، اس کا بیٹا حسن بیان ہوا۔ اس نے ایک اپنے برابر کے خاندان میں شادی کی، اس کی دلہن کا نام خندہ جبیں تھا کہ آٹھ پہر ہنستی رہتی تھی۔ چنانچہ ان کے گھر میں میاں خوش طبع پیدا ہوئے۔

چونکہ خوش طبع سارے خاندان کا لب لباب تھا اور بالکل مختلف طبیعت کے والدین سے پیدا ہوا تھا، اس لیے اس کی طبیعت بوقلموں اور گوناگوں تھی۔ کبھی تو نہایت سنجیدہ اور معقول وضع اختیار کر لیتا تھا اور کبھی رنگین بانکا بن جاتا تھا۔ کبھی ایسا بن کر نکلتا گویا قاضی القضات یا شیخ الاسلام چلے آتے ہیں اور کبھی ایسے مسخرے بن جاتے کہ بھانڈوں کو بھی طاق پر بٹھاتے۔ لیکن چونکہ ماں کے دودھ کا بڑا اثر ہوتا ہے، اس لیے کسی حالت میں وہ اہل محفل کو ہنسائے بغیر نہ رہتا تھا۔ اسی کے ہمسایے میں ایک مکرباز، جعل ساز بھی رہتا تھا کہ اس نے بھی خوش طبع اپنا نام رکھ لیا اور لوگ بھی اس بدذات کو اسی کا قائم مقام سمجھتے تھے۔ پس اس خیال سے کہ نیک مرد، ناواقف اس کے دھوکے میں نہ آئیں، میں چاہتا ہوں کہ اس کتاب کے پڑھنے والے اگر کبھی ایسے شخص سے ملیں، تو اس کی اصل نسل کو اچھی طرح سمجھ لیں اور غور سے دیکھیں کہ دور نزدیک کچھ رشتہ اس کا سچ کے قبیلے سے جا ملتا ہے یا نہیں۔ وہ حسن ادب کے گھرانے سے پیدا ہوا ہے یا کسی

اور سے ؟ اگر یہ نہ ہو تو وہی جعل ساز بہروپیا سمجھیں۔

ایک پہچان اس کی یہ بھی تھی کہ جب کسی محفل میں بیٹھا ہوتا ہے تو اسی کے قہقہے کان میں آتے ہیں اور گرد اس کے متین اور معقول لوگ خاموش بیٹھے نظر آتے ہیں۔ اور جب ظرافت اصلی محفل آرا ہوتی ہے تو آپ کمال سنجیدگی سے بیٹھی رہتی ہے، گرد اس کے سب ہنستے ہیں۔ بلکہ اتنی بات اور بھی کہتا ہوں کہ اگر اس کے خاندان میں خوش طبعی یا خندہ جبینی یا خوش بیانی کی کسی کو بو نہ آئے تو اسے بھی وہی جعل ساز بہروپیا سمجھنا چاہیے۔ جس بہروپیے بھانڈ کا میں نے ذکر کیا ہے، وہ اصل میں جھوٹ کی اولاد سے ہے، اور جھوٹ حقیقت میں زٹل کا باپ تھا۔ زٹل سے ایک بیٹا پیدا ہوا کہ اس کا نام سڑی مستان تھا۔ اسی طرح حماقت ایک پھوہڑ عورت تھی اور اس کی ایک بیٹی تھی جسے مسخرن دیوانی کہتے تھے۔ اس سے سڑی مستان نے شادی کی۔ ان دونوں سے عجب طرفہ معجون بچہ پیدا ہوا جسے تم بہروپیا بھانڈ سمجھتے ہو۔ بعض اشخاص کو بعض اوقات اس کے کلام میں بھی خوش طبعی یا خوش بیانی کی بو آتی ہے، مگر وہ حقیقت میں ظرافت بد اصل ہے۔ اب میں ان دونوں کا نسب نامہ لکھتا ہوں۔

جھوٹ

زٹل

سڑی مستان — مسخرن دوانی

ظرافت بد اصل یا نقل

یعنی بہروپیا بھانڈ

سچ

حسن ادب

حسن بیان

خوش طبع خاوند — خندہ جبینی بی بی

ظرافت اصل یا خوش طبعی

میں اس استعارے کو زیادہ تفصیل دیتا اور ظرافت بداصل یعنی بہروپیے بھانڈ کی اولاد، جو ریگ بیاباں سے زیادہ ہے، سب کا حال نام بنام بیان کرتا، خصوصاً ان لڑکے لڑکیوں کا کچھ حال لکھتا جن سے ملک وجود میں اس نے اپنی ناپاک نسل پھیلائی ہے۔ مگر اس سے جا بجا حسد کی آگ بھڑک اٹھتی، اس لیے جی نہیں چاہتا۔ پھر بھی اتنا ضرور کہوں گا کہ ظرافت اصلی اور ظرافت نقلی میں اتنا ہی فرق ہے جتنا آدمی اور بندر میں۔ سب سے پہلے تو یہ ہے کہ اسے بندر کی طرح جھوٹ موٹ کی دغابازیاں اور ویسے ہی نقلیں کرنے کی عادت ہے۔ دوسرے اس قسم کے کام کر کے نہایت خوش ہوتا ہے؛ بلکہ دونوں باتیں اسے یکساں ہیں، خواہ خلعت پہنا دے خواہ رسوا کرا دے۔ ابھی ایک شخص کو باعظمت واحترام بنا دے، ابھی چٹکیوں میں اڑا دے۔ کسی کی نافہمی وبد عقلی دکھا دے، کسی کی دانش و دانائی سنا دے۔ ابھی دولت و نعمت کی مسند پر بٹھا دے، ابھی کنگال اور فقیر بنا دے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ جھوٹ کی تھیلی ہر وقت بھری ہے، کبھی خالی نہیں ہوتی۔ تیسرے ایسا کم بخت ہے کہ جو ہاتھ اسے رزق دیتا ہے اس کو کاٹ کھاتا ہے اور دوست دشمن دونوں کی برابر خاک اڑاتا ہے۔ سبب اس کا یہ ہے کہ انسانیت سے خارج ہے، اس لیے خوش طبعی کیے جاتا ہے، جیسی ہو سکے اور جہاں ہو سکے، نہ یہ کہ جیسی ہونی چاہیے اور جہاں ہونی چاہیے۔ چوتھے، چونکہ عقل سے بالکل محروم ہے، اس واسطے اخلاق یا صلاحیت کی نصیحت پر ذرا کان نہیں دھرتا۔ پانچویں، چونکہ فہمی، چہل کے سوا اور کسی قابل نہیں اور ہر شخص پر فوقیت کی ہوس رکھتا ہے، چنانچہ اس کا تمسخر ہمیشہ ذاتی ہوتا ہے، یعنی کسی صاحب معاملہ یا کسی صاحب تصنیف کی ذات سے منسوب ہوتا ہے، نہ کہ فقط اس کی برائی یا تصنیف سے۔

نکتہ چینی

نکتہ چین نا انصاف کی بدولت تصنیف کا کیا حال ہوتا ہے:

مصنف اپنی تصنیف میں یا تو نئے نئے مطالب اور تازہ مضامین سے دلوں کو شگفتہ کرتا ہے، یا مطالب معلوم کو بنا سنوار کر نئی آرائش و زیبائش سے سامنے لاتا ہے، کبھی نئی روشنی کا جلوہ دے کر دیدہ نظر باز کو عجائب و غرائب تماشے دکھاتا ہے، کبھی دیکھی بھالی چیزوں کو نئے رنگ دے کر اور موقع مقام بدل کر انہی میں تازگی اور دلربائی کے انداز پیدا کرتا ہے۔ بلکہ ایسے رنگ برنگ کے گل پھولوں سے سجاتا ہے کہ ہر چند ایک دفعہ طبیعت ان کی گلگشت کر چکی ہو، مگر خواہ مخواہ پھر دیکھنے کو جی چاہتا ہے۔ اور جن چمنوں پر عقل سبک سیر جلدی گزر گئی ہو، یا سرسری نظر کر گئی ہو اس کا دوبارہ دل میں اشتیاق پیدا ہو جاتا ہے۔

در حقیقت ان محنتوں میں سے جس محنت کو دیکھو، مشکل سے مشکل ہے، کیونکہ تصنیف مذکور کے مفید اور کار آمد ہونے کے لئے اتنی ہی بات کافی نہیں ہے کہ لوگوں کو ان کی غلط فہمی یا عیب و صواب سے آگاہ کر دے، بلکہ ایک انداز برتنا چاہیے جس سے ان کے دلوں میں اپنے رہنما یعنی مصنف کا انس اور اس کے کلام کا اشتیاق پیدا ہو، اور اس کے سبب سے، وہ فقط اپنی ناواقفیت کا اقرار ہی نہ کریں، بلکہ ایک اس سے بھی کڑوا گھونٹ ہے، اسے گوارا کریں، یعنی یہ بھی سمجھیں کہ یہ دل آگاہ خیر خواہ ہم سے زیادہ تر دانا ہے۔

جو شخص مراتب مذکورہ بالا پر نظر کرے گا، وہ خود سمجھ لے گا کہ ہر ایک بات ان میں سے پرلے سرے کی خطرناک اور نہایت جانکاہی کا کام ہے۔ پھر ایسا بے درد کینہ ور کون ہو گا کہ قارون بے چارہ، جو خود عذاب خدا کا مارا ہے، اس کے بوجھ میں پتھر بھر

دے اور اسے ایک دل لگی سمجھے۔
کیسی بے درد کوششیں ہوں گی جو ایسے آرزو مند کا دل توڑنا گوارا کریں، کہ نہ ان سے کسی شے کا طالب ہے، نہ ان کے کام میں کچھ حارج ہے۔ فقط اتنی بات ہے کہ اپنی یا اپنے کلام کی شہرت چاہتا ہے۔ اسی کے لیے یہ مصیبتیں ہیں کہ وقت عزیز کو صرف کرتا ہے۔ آرام کو تکلیف سے بدلتا ہے، چراغوں کے دھوئیں کھاتا، دماغ کا عرق پیشانی سے ٹپکاتا ہے اور ان سب منزلوں کا پہلا قدم یہ ہے کہ اکثر تو کامیابی کی جگہ ناکامی اٹھاتا ہے اور کامیاب ہو تو فائدہ قلیل۔ یہ بے چارہ ان مصیبتوں پر بھی صبر کرتا ہے اور اپنے شوق کو پورا کرتا ہے۔
ہاں ایک نسل کے آدمی ایسے بھی ہیں کہ یا تو اسی خلل اندازیوں کو فرض الٰہی سمجھے ہوئے ہیں یا اپنے دل کا بہلاوا سمجھتے ہیں۔ جو ہمیشہ اسی تاک میں رہتے ہیں کہ ایسا نہ ہو کہ کسی صاحب کمال کا جوہر قابل لوگوں کی نظر چڑھ جائے۔ ہاں یہ وہی لوگ ہیں کہ قلعہ شہرت کے دروازے پر عصائے منصب داری لیے کھڑے ہیں اور فخر اپنا اس بات میں سمجھتے ہیں کہ جہالت اور عداوت، جو چنگیز وہلاکو کے تیر و تلوار لیے بیٹھے ہیں، یہ ان کے دربار میں سب سے پہلے عرض پہنچائیں کہ حضور کا شکار حاضر ہے۔ جو لوگ تصنیف کا ارادہ کریں، انھیں ابتدا میں اتنا ضرور چاہیے کہ جو اشخاص نکتہ چینی کے خطاب والقاب سے شہرہ آفاق بنا چاہتے ہیں، ان کی خدمت میں ایک سفارش کا بندوبست کریں، کیونکہ ان مردم آزاروں میں بڑے سے بڑا بے درد تھوڑا بہت نرم ہو سکتا ہے، یا کچھ عرصے کے لیے طبیعت کی نیش زنی کو چھوڑنا بھی گوارا کر سکتا ہے۔ میں نے اس تدبیر کی تلاش میں طبع سلیم کی طرف رجوع کی اور عہد قدیم کے بہت پرانے دفتر الٹے، آخر دیکھتے دیکھتے یہ معلوم ہوا کہ کالا ناگ راگ سے پرچ جاتا ہے اور بھونکتا کتا بھی ہڈی سے چپ ہو جاتا ہے۔ آج کل کے نکتہ چیں اگرچہ سانپ جتنے دانت بھی نہیں رکھتے مگر اس سے بھی سوا زہر اُگلتے ہیں، اور کتے کے برابر بھی نہیں کاٹ سکتے مگر بھونکنے میں اس سے بھی کئی میدان پرے نکل جاتے ہیں۔
پس یقین ہے کہ اس قسم کے طریقوں سے وہ بھی بند ہو جائیں گے۔ چند اشخاص

کے باب میں میں نے سنا کہ بعض تو ایک گلاس شراب اور ایک سیخ کباب پر راضی ہو گئے اور بعض ان میں خوشامد کے راگوں کی چار تانیں سن کر قابو میں آ گئے۔

لیکن شوق ہمت نے بے ڈھب کام پر کمر ہمت باندھی ہے۔ اگرچہ عقل نصفت اندیش اسے دلائل یقینی سے قائل کرتی ہے اور سمجھاتی ہے کہ اس بد اندیش نسل کے حملہ ہائے متواتر سے ڈرنا چاہیے، مگر وہ اپنی جگہ پر ڈٹا ہوا ہے۔ اب تک صلح کی تدبیر یا راہ گریز کا خیال بھی نہیں کیا۔ وہ سمجھ گیا ہے کہ جس مخالف کا انھوں نے دعوئی باندھا ہے کہ وہ انھیں قانون مصلحت کی رو سے جائز نہیں بلکہ یہ ان کی جعلی حکومت جس کی نہ سند ہے نہ شہادت، اور اسی دعوے پر انھوں نے استاد نکتہ چین کے خطاب سے حاکم دارا لعدالت کی طرح فیصلے کیے ہیں، حق پوچھو تو مجھے یہ بھی صاف دھوکا نظر آتا ہے۔

داستان :

حقیقت حال یہ ہے کہ نکتہ چینی، جس کی بدولت ان لوگوں نے مصنفوں کی قسمت کے فیصلے کرنے کا اختیار پایا ہے، اصل میں خواجہ حق پرست اور محنت خاتون کی سب سے بڑی بیٹی تھی۔ جب وہ پیدا ہوئی تو پرورش کے لیے انصاف کے سپرد ہوئی۔ چنانچہ اس نے دانش کے محلوں میں پال کر تربیت کیا۔ وہاں دن رات علوم کی جواہر کاری اور فنون کی مرصع نگاری کو دیکھا کرتی اور صبح و شام عقل آرائی کے باغوں میں جی بہلایا کرتی۔ جب بڑی ہوئی تو عالم بالا کے بزرگوں نے اسے حسن کمال اور کمال حسن میں بے مثال دیکھ کر ملک خیال کا تاج سر پر رکھ دیا کہ چند روز کے بعد مملکت خیال کی ملکہ ہو کر عالم بالا کی پریوں میں داخل ہو گئی۔ وہاں کی پریاں موسیقی، ناچ رنگ، سانگ، شاعری، افسانہ، تاریخ وغیرہ اپنے اپنے فن کی مالک تھیں۔ چونکہ انھیں بھی ملک خیال سے تعلق تھا، اس لیے ملکہ نکتہ چینی نے ان کے کلام میں بھی دخل پیدا کر لیا۔ جب انھوں نے عالم خاک کی طرف نزول کیا تو ملکہ نکتہ چینی کہ خود فرماں روائے ملک خیال تھی، وہ بھی ان کے ساتھ روئے زمین پر آئی۔ محل سے چلتے وقت انصاف یعنی اس کے استاد نے ایک پھولوں کی چھڑی دے دی تھی کہ اسے تمغائے شاہی کی طرح ہر وقت

اپنے داہنے ہاتھ میں رکھا کرے۔ عالم بالا کے دربار میں دستور تھا کہ جس رات کوئی پری اکھاڑا جیتا کرتی تھی تو اس کی مبارکباد میں اسے ایک ہار ملا کرتا تھا، جس میں گل ہائے جنت کی کلیاں اور امرت کے درخت کی کونپلیں پروئی ہوتیں۔ چنانچہ عصائے مذکور کے ایک سرے پر وہی ہار اور طرے سجا کر انھیں آب حیات کے چشمے سے شاداب کیا جاتا اور دوسرے میں سروبے ثمر کی پتیاں اور پوست کے ڈوڈے باندھ دیے جاتے۔ یہ دریائے محویت کے پانی میں ڈوبی ہوئی تھی جن سے افیون کا گھولوا اور پوست کا پانی ٹپکتا تھا۔ ملکہ موصوفہ کے بائیں ہاتھ پر ایک مشعل بھی تھی کہ اس کی روشنی کبھی بجھتی نہ تھی۔ اس مشعل کو خود محنت خاتون نے بنایا تھا اور حق پرست نے روشن کیا تھا۔ بڑا جوہر اس میں یہ تھا کہ چیز کیسی ہی مخفی ہو، بلکہ ہنر کی الجھاوٹ اور حمق کی خرابی کام کو کیسا ہی درہم برہم کر کے الجھا دے، مشعل حق کی روشنی پڑتے ہی اس کی سدھاوٹ کا حال بال بال روشن ہو جاتا تھا۔ ظاہر آرائی اور غلط نمائی کے پیچوں میں اس کی شعاع سوئی کی طرح بیٹھ جاتی تھی اور جن جن اینچ پینچ میں ان کے لغویات پیچیدہ تھے، انھیں دفعتہً کھول دیتی تھی۔ بہت سے زرق برق کے لباس کہ فصاحت اور عبارت آرائی نے جھوٹ کے ہاتھ بیچ ڈالے تھے، یہ ان کے بھی بخیے کھول دیتی تھی اور گھٹنت بڑھت کی پتلیاں، جو بناوٹ کے کپڑے پہن کر ٹھیک ٹھاک بن بیٹھتی تھیں، انھیں بھی جھٹ پکڑ لیتی تھی۔

غرض ملکہ موصوفہ ایسے ایسے شاہانہ سنگاروں سے سج کر آسمان سے نازل ہوئی تاکہ جو لوگ ان صاحب کمال پریوں کے دم بھرتے ہیں اور اعتقاد کا حق زبان قلم سے ادا کرتے ہیں، ان کی جانکاہی اور محنتوں کی قدر دانی کرے۔ چنانچہ جو کچھ اس کے سامنے پیش ہوتا تھا، اس پر مشعل حق کی روشنی سے نظر کرتی تھی اور جب سب طرح دیکھ بھال سے جمع کر لیتی تھی، اور سمجھ لیتی تھی کہ اس تحریر میں قانون درستی پر کماحقہ عمل ہوا ہے تو عصا کا آب حیات والا سرا چھو کر اجرائے دوامی کا حکم چڑھا دیتی تھی۔ اس سے آب حیات کی شبنم برستی تھی اور تصنیف مذکور کو خاص و عام میں رواج دوام ہو جاتا تھا۔ لیکن اکثر ایسا بھی ہوتا تھا کہ جو کتابیں اس کے سامنے پیش ہوئیں، ان میں دیکھا کہ بہت سے مضامین بے اصل ہیں، بلکہ دغل فصل کے مطالب خرچ ہوئے ہیں۔ البتہ محنت

نے ان پر جھوٹ موٹ کے رنگ و روغن چڑھا کر رنگ آمیزی کی ہے۔ مگر پھر بھی الفاظ و مطالب ٹھیک ٹھیک مطابق نہیں بیٹھے یا فکر صحیح نے مطلب اصلی سے درست جوڑ نہیں کھایا۔ یا کچھ کچھ واہیات زٹلیں احمقوں کے خوش کرنے کو لکھ دی ہیں، یا کتاب کی ضخامت بڑھانے کے لیے بے قاعدہ مطالب درج کر دیے ہیں کہ ان میں لطف مضامین ہے نہ بات کی چٹخنی ہے (اور ایسی چوک اس پر کھل تو جاتی ہی تھی) پس وہاں ملکہ نکتہ چینی اس سرے کے چھوانے سے انکار کرتی تھی، جس سے تصنیف مذکور کے رواج کو استقلال دوام ہو جائے، بلکہ جس میں بہت سی موٹی موٹی غلطیاں دیکھیں تو اس عصا کے دوسرے سرے سے ٹھکرا کر ہٹا دیا۔ یہ پوست کے ڈوڈے اور سرو کے پتے ایسا زہر بیا تے تھے کہ اسی وقت سے کتاب مذکور آہستہ آہستہ محو ہونے لگتی تھی اور جس طرح کوئی افیونی نشے کے رنگ میں اونگتے اونگتے تحت الثریٰ پہنچ جائے اسی طرح تھوڑے ہی عرصے میں بالکل نیست و نابود ہو جاتی تھی۔ چند روز کے بعد کسی کو خبر بھی نہ رہتی تھی کہ کیا تھی اور کیا ہو گئی۔ کئی کتابیں ایسی بھی نکلیں کہ انہیں دیکھ کر ملکہ متردد ہوئی اور اپنی چھڑی کہ در حقیقت عدل کی ترازو تھی، بیچوں بیچ سے پکڑے کھڑی رہی اور دیر تک سوچتی رہی۔ چنانچہ رفتہ رفتہ ایسی کتابیں اس کثرت سے جمع ہو گئیں کہ ملکہ ان کے مشکوک دعووں اور بے جا سفارشوں پر توبہ کرتے کرتے تھک گئی۔ آخر بہ نظر احتیاط کہ مبادا انصاف کی چھڑی بے جا کام میں آئے، ان کے مقدمے کو وقت کے حوالے کر دیا، کہ وہ خود بخود ان کے برے بھلے کی حقیقت کھول دے گا۔ مطلب اس سے یہ تھا کہ تصانیف مذکورہ دعووں کے زور اور سفارشوں کی قوت سے چار دن کی چاندنی کی طرح چند روز رہیں گی۔ مگر ایک زمانے کے بعد خود بخود سب کو معلوم ہو جائے گا کہ کتنا اندھیرا اور کتنا اجالا ہے۔

وقت کے کاروبار بست تو تھے اور شروع میں کچھ باتیں واہیات بھی معلوم ہوتی تھیں، مگر اور سب باتوں میں اس کی رائے بالکل انصاف سے متفق ہوئی۔ بعض اشخاص ایسے بھی تھے کہ ان کی تصنیفات پر جو چھڑی کے چھوانے میں کچھ توقف ہوا تو اس سے انہوں نے سمجھ لیا کہ ہم بالکل کامیاب ہو گئے۔ میں نے دیکھا کہ وہ اپنی کتابیں بغل میں مارے رواج دوام کے یقین میں خوشی خوشی زمان آئندہ کی طرف بھاگے جاتے تھے۔

مگر زمانہ گزراں کی درانتی کے نیچے انہیں بھی گھسا کھانا پڑا اور ایک زمانہ معمودہ کے بعد خود بخود کٹ کر گر پڑے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ ان میں سے بعض تصنیفات تو آہستہ آہستہ کٹ کر برباد ہوئیں اور بعض ایک ہی رگڑے میں دو ٹکڑے ہو کر فنا ہو گئیں۔

ملکہ نکتہ چینی بہت دیر تک وقت کے عمل درآمد کو دیکھتی رہی اور آخر کار اس کے کاروبار سے مطمئن ہو کر اپنے استاد خداوند انصاف کے ساتھ دنیا سے چلی گئی۔ مگر یہ غضب ہوا کہ غلط فہمی اور ہٹ دھرمی کو عداوت، دغا اور خرابی کی رفاقت میں کھلا چھوڑ گئی کہ جس کی محنت اور جانکاہی کو چاہیں بے دھڑک برباد کیا کریں۔ بلکہ اب تو ملکہ نے اتنی ہی بات پر اکتفا کیا ہے کہ وہ دور سے بیٹھی تماشا دیکھا کرتی ہے۔ مگر اس میں بھی شک نہیں کہ جو دل علم کے فیض اور نیکی کے نور سے اثر پذیر ہیں، ان تک اپنا فیض پہنچاتی ہے۔

اکثر نالایقوں کی بد تمیزی کے سبب سے ملکہ چلتے وقت خفا بھی ہوئی اور اپنے عصا کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے اچھال دیا۔ چنانچہ آب حیات والا ٹکڑا تو خوشامد اور چاپلوسی نے اچک لیا تھا اور دوسرا سرا جو آب محویت سے آلودہ ہو رہا تھا، وہ عداوت نے لپک لیا تھا۔ چاپلوسی جسے آب حیات والا سرا ہاتھ آیا تھا، اس کے مرید اور غلام بہت سے موجود تھے، مگر ان کے پاس نہ تو روشنی موجود تھی، نہ وہ روشنی چاہتے تھے۔ اسی واسطے اچھے برے کا خیال نہ کیا۔ کبھی تو زبردست کے دباؤ سے، کبھی دنیا کی طمع سے، کبھی اپنے لطف طبع کے لیے جو کچھ کوئی پیش کرتا اسے آب حیات والا سرا چھوا دیتے۔ ادھر عداوت کے چغل خوروں سے بڑی راہ تھی۔ انہوں نے ایک لالٹین تیار کر دی تھی، کہ روشنی اس کی ایک رخی تھی، یعنی فقط برائیوں پر ہی پڑتی تھی، خوبیاں بالکل نظر نہ آتی تھیں۔

دشمنان تیرہ دل کی تیرگی کو کیا لکھوں
جس قدر دیکھو سوا، اتنا سوا اندھیر ہے

غرض چاپلوسی اور عداوت دونوں کے مرید اپنے اپنے سونٹے کے زور پر اپنی اپنی ملکہ کے اجرائے احکام کے لیے عالم میں پھیل گئے کہ جسے چاہیں عمر دوام بخشیں اور جسے چاہیں ایک دم میں فنا کر دیں۔ مگر اب اس ٹوٹی پھوٹی چھڑی کی بھی طاقت بدل کل جاتی رہی ہے، وقت ان کے فیصلے کا ذرا لحاظ نہیں کرتا، جو چاہتا ہے بے لاگ حکم چڑھا دیتا اور وہی تمام عالم میں حاوی ہو جاتا ہے۔ آؤ میرے دوستو! اسی کی راہ انتظار پر بیٹھ جاؤ۔

مرقع خوش بیانی

خوش بیانی کا مرقع اور فصاحت اصلی و نقلی کی جنگ :

جس شغل میں مدت تک انسان کی دل لگی رہی ہو، اس سے بالکل دل کا اٹھا لینا بہت دشوار ہے۔ ہر چند دل کو اس کی یاد سے حرکت نہ دیں مگر اس میں آپ ہی آپ خیالات پیدا ہوتے ہیں، جیسے سمندر میں مدوجزر آ کر ٹھہر جاتا ہے اور ہوا کے جھونکے بھی تھم جاتے ہیں، مگر پانی گھڑیوں پڑا لہرایا کرتا ہے۔ اسی طرح آج مجھے خیال ہوا، یعنی پچھلی رات باقی تھی جو بیٹھے بیٹھے نیند آگئی۔

اس عالم خواب میں خوش بیانی کا ایک مرقع مسلسل میری آنکھوں کے سامنے سے گزرا۔ نہیں کہہ سکتا کہ وہ خوش بیانی اصلی یا نقلی یا دونوں سے مرکب تھی۔ مگر ایسا معلوم ہوا گویا مجھے ایسی سرزمین میں لے گیا ہے جو دنیا کے عجائب و غرائب سے مالا مال، بلکہ سحر کاری اور نیرنگ سازی سے بھری ہوئی ہے۔ اس ملک میں ایک ملکہ کی حکمرانی تھی جسے وہاں کے لوگ ملکہ سخن آرا سمجھتے تھے، مگر دنیا کے لوگ خوش بیانی بے معنی مشہور کرتے تھے۔ دیکھتا ہوں کہ باغ سے شہر اور شہر سے اجاڑ تک بلکہ کھیت سے جنگل اور جنگل سے پہاڑ تک، کوئی شے ایسی نظر نہیں آئی جو ذرا اصلیت کا رنگ رکھتی ہو۔ بعضے درختوں پر سونے روپے کے پتے لہلہاتے تھے، بعضوں پر تاش تمامی کے پھول جگمگاتے تھے، ٹہنیوں میں گوہر یکتا اور جوہر بے بہا آویزاں تھے، فواروں میں گلاب اور بید مشک پڑا اچھلتا تھا اور اس کی دھاروں میں سریلی آوازیں لہراتی تھیں۔ جنگل کی گود کے پالے، ہرنیاں اور پاڑے صحرا کے دامن میں لوٹ رہے تھے۔ دریا کے پیارے یعنی آبی جانور اور رنگین مچھلیوں کے لچھے نہروں میں جھلملا رہے تھے۔ پرندے بھی

بے شمار تھے مگر اکثروں کی چونچیں سنہری تھیں، اکثروں کے بازو ہیرے یاقوت سے تراشے تھے۔ اس پر نغمہ سنجی کا یہ عالم تھا کہ ان کے سامنے شعراء کی غزل خوانی کا دم بند ہوتا تھا۔ پھولوں نے ہوا کو عبیر ولوبان، مشک وزعفران سے بسا رکھا تھا۔ عطر کی لپٹیں چلی آتی تھیں اور یہ ملی جلی خوشبوئیاں الگ الگ ایسی کیفیتیں دیتی تھیں گویا روشن ہوا پر گل کاری کے تختے کھلے ہوئے ہیں۔ باوجود اس کے صبا و نسیم کے دامن عاشقان مجبور کی آہوں سے بھرے ہوئے تھے اور جو موج ہوا تھی، حسرت زدوں کے پیاموں میں الجھی ہوئی تھی۔

میں اس دشت سحر نگار میں ادھر ادھر پھرتا رہا۔ آخر ان عجائبات کو دیکھ کر مجھ سے بولے بغیر نہ رہا گیا اور آپ ہی آپ باتیں کرنے لگا، مگر یہ معلوم ہوتا تھا کہ جو میری آواز گونج کر پلٹتی تھی، وہی میری باتوں کا جواب ہوتی تھی۔ باوجود اس کے کبھی اتفاق کرتی تھی، کبھی تردید کرتی۔ غرض ان دیکھے ہمراہیوں کے ساتھ باتیں کرتا چلا جاتا تھا جو ایک غار کے سرے پر پہنچا۔ دیکھوں تو اندھیر گھپ ہے، آگے بڑھا تو ذرا آنکھیں روشن ہوئیں اور معلوم ہوا کہ ایک عمارت عالی شان بنی ہوئی ہے۔ اس کے دروازے پر جو اشعار سونے کے حرفوں سے لکھے ہوئے تھے، ان سے معلوم ہوا کہ یہ خیال پرستوں کا مندر ہے اور ایک دیوتا مہاراج اس کے دروازے پر بیٹھے ہیں کہ عالم حماقت کے فرماں روا ہیں۔ سر پر دستار سرگردانی ہے اور تاج کی جگہ ایک سرو سر پر باندھ لیا ہے۔ قلندرانہ لباس پہنے ہیں۔ ایک ہاتھ میں کتاب لیے ہیں، دوسرے میں جھنجھنا ہلاتے ہیں۔ داہنے ہاتھ کی طرف محنت بیٹھی عرق ریزی کر رہی ہے اور آگے چراغ جل رہا ہے۔ بائیں ہاتھ پر تلون مزاجی کھڑی ہر دم نیا رنگ بدل رہی ہے۔ کندھے پر ایک عجیب الحرکات یعنی بندر بیٹھا اچھل رہا ہے۔ وہ کبھی جھک جھک کر سلام کرتا ہے، کبھی منہ چڑانے لگتا ہے، کبھی ٹہنیاں ہلانے لگتا ہے۔ اس کے پیش قدم بھینٹ چڑھانے کی جگہ عجیب ڈھنگ کی بنائی تھی اور پیچھے معلوم ہوا کہ فی الحقیقت وہ ایسی ہی تھی، جیسا اس کے گرد لکھا ہوا تھا۔ بہت سی بھینٹ اور قربانیاں وہاں چڑھی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ اکثر صورت ہائے بے معنی کے جانور وہاں لٹکتے تھے جن کا نام ان کے معتقدوں نے نازک

خیالی اور رنگین بیانی رکھا تھا۔ یہ جانور حروف بے آواز اور آواز بے حروف کے زمزمے بھرتے تھے، جن کا خلاصہ یہ تھا کہ سراسر مضمون بدعا غائب۔ بہت سے متشابہ صورت کی طوطیاں اور غلط نما بلبلیں تھیں کہ کبھی نظر آتی تھیں، کبھی غائب ہو جاتی تھیں۔ اکثر نیم بسمل پڑے تڑپتے تھے۔ معلوم ہوا کہ تشبیہوں اور استعاروں کا گنج شہیداں یہی ہے۔ وہیں ایک مجلس نظر آئی جس کے اہل محفل میں کسی کی ایک آنکھ، کسی کی دونوں آنکھیں بھینچی تھیں، جو بھینچے نہ تھے وہ طاق تھے۔ معلوم ہوا کہ انہوں نے تجنیس اور ایہام وغیرہ صنعتوں پر اپنی آنکھیں قربان کر دی ہیں۔ ایک طرف زمین شعر میں درخت بنا کر کھڑے کر دیے تھے مگر ثمر اصلاً نہ تھا اور ثمر تھا تو مزے دار نہ تھا۔ یہ مندر ان کے پجاریوں اور مہنتوں سے بھرا ہوا تھا، جن کی آنکھیں تو بند تھیں مگر وہم و وسواس انگلی پکڑے انہیں لیے پھرتے تھے اور جن شغلوں میں لگا دیتے تھے انہی میں لگ جاتے تھے۔ ایک طرف ایک پلٹن تھی، فقط ہیرے پھیرے کرتی تھی، اس کا نام قواعد رکھا۔ کبھی ننگے سر ہو جاتے تھے، کبھی ننگے پاؤں ہو جاتے تھے، کبھی ایک ننگے سر اور ایک ننگے پاؤں ہو کر گنڈے دار ہو جاتے تھے۔ کبھی اکہرے ہو جاتے تھے، کبھی دوہرے ہو جاتے تھے، کبھی سب گلے میں باہم ہاتھ ڈال کر لوٹ جاتے تھے۔ اضطراب اور گھبراہٹ نے ایک غلط سلط کتاب بنا کر ان کے ہاتھ میں دے دی تھی۔ اسی کے بموجب ان کی قواعد تھی۔ آگے دیکھتا ہوں کہ ایک مجمع ایسا کھڑا ہے گویا دربار کو جاتا ہے۔ اتنے میں ایک ننگا آدمی آیا اور برابر سب کی پگڑیاں اتارتا چلا گیا کہ اپنے لیے کپڑے بنائے۔ معلوم یہ ہوا کہ شاعر ہے، ابجد کا عمل کر کے کسی بادشاہ کا نام نکال رہا ہے۔ ان سے آگے اور بھی اعلیٰ درجے کے لوگ نظر آئے۔ دیکھتا ہوں کہ بہت سی کرسیاں بچھی ہیں، ان پر کچھ اشخاص کھڑے ہیں۔ کسی کے ہاتھ میں ایک ریت گھڑی ہے کہ وقت کا اندازہ بتائے، کسی نے ایک دائرہ کھینچ کر ہاتھ میں لے لیا ہے اور منہ سے نفیری بجا رہا ہے۔ مگر بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی۔ معلوم ہوا کہ ایک امیر کا بیاہ ہوا ہے اور ایک کے گھر لڑکا پیدا ہونے والا ہے۔ یہ ان کی تاریخیں کہہ رہے ہیں اور ایک طرف دیکھتا ہوں کہ دور نے انسان بیٹھے ہیں مگر منہ سے کچھ نہیں بولتے۔ معلوم ہوا کہ یہ ایسے فقرے اور شعر ہیں جو الٹے

سیدھے دونوں طرف سے پڑھے جاتے ہیں مگر لطف معنی ندارد۔

مندر کی مغربی جانب میں دیکھا کہ چند اشخاص نہایت محنت کے کام میں مصروف ہیں اور بہت سے ڈھیر ان کے آگے پیچھے پڑے ہیں۔ ان سے میں نے پوچھا کہ صاحب! کیا کر رہے ہو؟ بولے کہ معموں کا ذخیرہ تیار کر رہے ہیں، کیونکہ دیوتا کو اس سے زیادہ کوئی بھینٹ نہیں بھاتی۔ ان ڈھیروں میں ایسی طرح بہ طرح کی چیزیں تھیں کہ ایک کو دوسری سے نسبت نہ تھی۔ بہت سی گڈیاں بھی بندھی تھیں اور لکڑی کے انبار کی طرح اوپر تلے پڑی تھیں۔ انہی میں ایک جگہ لنگر لنگوٹے، ایک طرف جبے اور عمامے، پھر انہی میں پشواز اور پاؤں کے گھنگرو، چھوٹی بڑی تھیلیوں اور پوٹلیوں میں بندھے انم لگے ہوئے تھے۔ ایک گٹھڑی میں سے ایک کاٹھ کے گھوڑے کا سر بھی نکلا ہوا تھا۔ میں وہاں سے گھبرا کر چلا۔ اتنے میں ایک کاری گر نے مجھے متحیر دیکھ کر پکارا کہ جناب! ایک ایک پوٹلی میں گنج کے گنج نازک خیالیاں ہیں، اگر آپ کہیں تو دکھاؤں؟ میں نے سلام کے ساتھ اس کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ معاف کیجیے، اس وقت مجھے ایک نہایت ضروری کام ہے۔

میں مندر سے باہر جاتا تھا، جو دیکھا بہت سے آدمی آگے پیچھے، بے ترتیب ایک جگہ جمع ہیں، مگر آمنے سامنے بیٹھے پٹاپٹ قافیہ بازی کر رہے ہیں۔ اپنی تک بندی پر آپ ہی خوش ہوتے ہیں اور تفاخر کی ٹوپیاں اچھالتے ہیں۔ ابھی ان کے پاس ہی تھا جو دیکھا کہ آگے دوہری دوہری تہری تہری تک بندیاں ہو رہی ہیں۔ انہیں سن کر میں بے اختیار ہنس پڑا۔ ان کے پاس ہی دیکھا کہ بہت سے خندہ جبیں لوگ بیٹھے ہوئے ہیں، مگر جسے دیکھتے ہیں، اسے کوئی اور شخص سمجھ کر ہنسنے لگتے ہیں، اور ایسی مسخرے پن کی غلطیاں کرنے کے لیے جوڑی جوڑی ہو گئے ہیں۔ ہر جوڑی سر سے پاؤں تک ایک ہی لباس پہنے ہے مگر اصل میں ایک کو دوسرے سے مناسبت بھی نہیں۔ کبھی کبھی بوڑھے پراتم کو لڑکا فرض کر لیتے ہیں، کبھی مرد کو عورت سمجھ لیتے ہیں اور اس پر آپ ہی آپ خوش ہو ہو کر واہ واہ کرتے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ معموں کا جمگھٹ ہے۔

جب ان طلسمات کو دیکھتے دیکھتے میرا سر پھر گیا تو گھبرا کر وہاں سے نکلا۔ باہر دو

چار کھیت آگے بڑھا تھا جو دفعتہ ایک ہیبت ناک غل اور ساتھ ہی طبل جنگ کی آواز آئی اور ایسا معلوم ہوا گویا کوئی فوج جنگی چڑھی آتی ہے۔ آخر جو میں نے قیاس کیا تھا وہی نکلا، یعنی دور سے ایک روشنی کا غبار نمودار ہوا۔ اس کے درمیان میں ایک مرد باوقار صاحب شکوہ سر پر اعزاز کا تاج رکھے، گھوڑے پر سوار چلا آتا ہے۔ جو اسے دیکھتا تھا، کہتا تھا کہ سچ ہے اور برحق ہے۔ اس کے دائیں ہاتھ پر اس کا فرزند دلبند خراماں خراماں آتا تھا۔ پشت پر بہت سے ترکش لٹکتے تھے، ہاتھ میں چڑھی کمان اور کمان میں تیر جوڑ رکھا تھا، اس کا نام حسن بیان تھا۔ جوں ہی ان دونوں کے آنے کی خبر اڑی، ظرافت بے معنی کے تمام ملک میں ایک تہلکہ پڑ گیا۔ عالم حماقت کے دیوتا یعنی اوت مہابھوت بذات خود اپنی ایک کالی گھٹا کے رنگ میں فوج لے کر اٹھے۔ بادل کی طرح گرجتے اور مینہ کی طرح برستے سرحد پر آن موجود ہوئے اور جن جن نامعقولوں کو میں نے مندر میں دیکھا، وہ انبوہ بے تمیزی اندھیری رات کی طرح ایک لشکر کی صورت میں نمودار ہوئے، اور جھٹ صفیں باندھ لیں کہ دشمن کا آگا روکیں۔ جو جو معتقد جان نثار تھے، انہیں حکم پہنچا کہ گھوڑے اڑا اڑا کر سامنے اچھلو اور لغات کی لفاظی اور مبالغوں کی دھوم دھام سے غل مچاؤ کہ حریف سنتے ہی ڈر کر بھاگ جائے۔ چونکہ حریف بہت آہستہ آہستہ کوچ کر رہا تھا اس لیے یہاں کے سرحدی لوگوں کو بھی موقع مل گیا کہ اپنی بھیڑ اکٹھی کر کے الگ کھڑے ہو جائیں اور اس وقت کے منتظر رہیں کہ اخیر کو میدان کس کے ہاتھ رہتا ہے۔

شائقین سخن ذرا اس بات کا خیال رکھیں کہ یہ سرحدی ملک خوش بیانی مرکب کے فرقہ ہائے مختلفہ سے آباد تھا، یعنی کچھ اصل کچھ بد اصل۔ چنانچہ ان کی فوج کی عجیب شان تھی، مردوں کے جسموں پر برچھیاں چبھی ہوئی تھیں، عورتوں کی آنکھوں کی جگہ آتشی شیشے لگے ہوئے تھے۔ اگر مردوں کے دل انگارے تھے، تو عورتوں کی چھاتیاں برف کی تھیں۔ غرض کہ جیسے عجائب و غرائب مخلوقات سے یہ لشکر آراستہ تھا، اس حالت کی رنگارنگی بیان کے احاطے میں محصور نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ جس وقت حریف کا نشان نمودار ہوا دفعتہ ان میں ایک ہلچل مچی اور فوراً دو حصے ہو کر، ایک حصہ سچ کے سایہ علم میں جا کھڑا ہوا، دوسرا اوت مہابھوت یعنی جھوٹ دیوتا کے نشان کے نیچے

ہو گیا۔ دیو دروغ اپنا کالا پہاڑ سا ڈیل ڈول لیے چند قدم آگے بڑھا مگر جونہی سچ کی روشنی اس پر پڑنی شروع ہوئی، وہ اس طرح بے معلوم تحلیل ہونا شروع ہوا کہ تھوڑی ہی دیر میں اصلی جسم کی جگہ فقط ایک پرچھائیں سا نظر آنے لگا۔ آخر ادھر سے سچ بھی آگے بڑھا۔ جب اس کی روشنی پاس آئی تو وہ دیو روسیاہ بالکل نیست و نابود ہو گیا اور جہاں کالا پہاڑ تھا وہاں خاک سی اڑ کر رہ گئی۔

تم نے آفتاب کو دیکھا ہو گا کہ، جوں جوں نکلتا آتا ہے، چھوٹے موٹے تارے برابر چھپتے ہیں، یہاں تک کہ ان کا نقش وجود سامنے کے نصف کرے سے بالکل محو ہو جاتا ہے۔ اسی طرح یہاں معلوم ہوا کہ دیو دروغ یعنی اوت مہابھوت تو بالکل نیست و نابود ہو گئے اور نہ فقط دیو دروغ بلکہ سارا لشکر شیطان جو ہمدردی اور جاں نثاری کو حاضر تھا، دم میں ہوا ہو گیا۔ طلسم باطل کا مندر زمین میں غرق ہو گیا، مچھلیاں دریاؤں میں چلی گئیں، پرندے چڑیوں کی طرح اڑ گئے، جنگلی حیوان جنگلوں میں چلے گئے اور اب زمانے نے نئے سرے سے اصلی رنگ بدلا، یعنی چشموں کی روانی، مرغ خوش الحان کے چہچے، پھولوں کی خوشبوئیاں، روئے زمین کی سرسبزی نے سچا رنگ نکالا، اگرچہ میں ابھی پڑا سوتا تھا، مگر اس عالم میں ایسا معلوم ہوا کہ اب خواب غفلت سے میری آنکھ کھل گئی اور ان طلسمی عجائب و غرائب کی جگہ پر سرسبز جنگل، اصلی نہریں، ہری بھری کیاریاں ہو گئیں۔

جن شعبدوں کے اچنبھے نے میری عقل و حواس کو درہم برہم کر دیا تھا، جب وہ سامنے سے دور ہوا تو میں نے خوش بیانی اور صداقت کے جلوے کو نظر غور سے مشاہدہ کیا، کیونکہ انسان ایک چیز سے نظر اٹھائے بغیر دوسری چیز کو نہیں دیکھ سکتا۔ چنانچہ ان کے بعد مجھے ایک انبوہ نظر آیا جن میں شاہنامہ کی بحر تقارب، فردوس کے پھولوں کا تاج سر پر رکھے شمشیر برہنہ علم کیے کھڑی تھی۔ خاقانی قصائد کے تاتار میں خاقان چین بنا ہوا تھا۔ پہلو میں انوری اور بدر چاچی مضامین سے نور اڑا رہے تھے۔ خاص خاص قسم کی مثنویاں، غزلیں اور رباعیاں اپنے اپنے درجے سے اس کے دائیں بائیں اور پس و پیش آراستہ تھیں۔ نثر اپنے پیادوں کی صفیں باندھ رہی تھیں۔ مرثیوں کی نظم و نثر

غمناک، سنبل سے بال بکھیرے، جامہ خون آلود پہنے خاموش کھڑی تھی۔ ہجو کے ہونٹوں پر تبسم تھا، مگر خنجر زیر قبا لیے کھڑی تھی کہ جدھر موقع پاؤں گی، ہرگز نہ چوکوں گی۔ فصاحت کا علم نصرت بلند تھا اور اس سے پہچانا جاتا تھا کہ جائے پھریرے کے اس پر بجلی کوندرہی تھی۔ اس سارے مرقع کے پیچھے لطائف وظرائف بھی نسیم و صبا کی طرح خراماں خراماں پھر رہے تھے اور درحقیقت مہم کے شروع ہونے سے پہلے انھیں یہاں جمایا تھا کہ ایسا نہ ہو دشمن سے جا ملیں۔ کیونکہ وہ دلوں سے ایک نگاہ ادھر بھی رکھتے تھے، انہی کے پہلو میں مشاعرہ کا جلسہ تھا اور حافظ اور سعدی کی غزلوں سے شراب شیرازی کا دور چل رہا تھا۔ سلطان خوش بیان کے ظہور سے میرے دل پر ایک ہیبت طاری ہوئی، مگر ساتھ ہی خوشی کا بھی اثر ہوا۔ اس کی نگہ موہنی تھی کہ دل سے پیار آتا تھا۔ مگر ساتھ ہی ایسی تیز تھی کہ دل کانپا جاتا تھا۔ میں اس کی طرف نظر غور سے دیکھ رہا تھا کہ اس نے اپنے تیروں کا ترکش لے کر مجھے دھوکا دینے کا اشارہ کیا۔ میں نہایت خوش ہوا اور اس کے لینے کے لیے گھبرا کر ہاتھ بڑھایا۔ مگر ہاتھ جو کرسی سے ٹکرایا، دفعۃً آنکھ کھل گئی۔

سیر عدم

مسافران عدم کے پسماندوں کی سرگزشت :

جب کوئی نہایت چاہتی چیز ہمارے ہاتھ سے نکل جائے اور معلوم ہو کہ اب ہاتھ نہ آئے گی، تو کیا دل بے قرار ہوتا ہے، جان صحرائے تصور میں کیسی اس کے پیچھے بھٹکتی پھرتی ہے، مگر جب تھک کر ناچار ہو جاتی ہے تو اداس بے آس ہو کر آتی ہے اور اپنے ٹھکانے پر گر پڑتی ہے۔ عقل و فہم البتہ دل غمگین کو سہارا دے سکتے ہیں، مگر دل ایسا بھولا بھالا شخص ہے کہ ذرا نہیں سمجھتا اور جو غذا اس کے جی کو بھاتی ہے، اسی کو ڈھونڈتا ہے۔ در حقیقت یاد، جو دل کی ہمسائی ہے، وہ ہمیشہ غم کو خانہ دل میں بلاتی ہے اور ایام گزشتہ میں جو مزے اٹھائے ہیں، یا دولت کھو کر عیش اڑائے ہیں، ان کی گزری ہوئی بہاروں کے افسانے سناتی ہے۔ کسی کی سواری گزر گئی۔ کسی کو اقربا کی آوازیں اور دوستوں کی باتیں سناتی ہے جو شہر خموشاں میں پڑے سوتے ہیں۔ کبھی عزیزوں کی صورتوں اور ان کی طبیعتوں کی تصویریں دکھاتی ہے، کبھی پیاروں کے پیار اور ان کی محبتوں کے افسانے سناتی ہے۔ دل نے حسرت و اشتیاق کو بھی اپنے گوشے میں رکھ چھوڑا ہے۔ وہ ان باتوں سے ایسے پھولتے اور پھلتے ہیں کہ دل پھٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے، مگر زمانہ اور اس پر وقت کا گزر جانا حالات مذکورہ کو کچھ کچھ کمزور کرتا ہے۔ ساتھ اس کے یا تو عقل و فہم آ کر حسرت و اشتیاق کو دباتے ہیں، کوئی اور باہر کا شوق ان سے بھی زبردست آتا ہے، وہ ان کا زور گھٹاتا ہے۔

میں انہی خیالات میں پڑا ہوا تھا جو نیند آ گئی۔ دیکھتا ہوں کہ گویا ایک چٹیل میدان، صحرائے بیابان، سمندر کا کنارہ ہے اور میں وہاں بہت سے لوگوں میں کھڑا ہوں کہ جن

کے سوگوار چہرے ان کے دل کے غم واندوہ کی گواہی دیتے ہیں۔ ہمارے سامنے جو دریا بہہ رہا تھا، اس کا چپ چاپ بہاؤ اور سناٹے کا چڑھاؤ پکار رہا تھا کہ یہاں تھاہ کا پتا نہیں۔ اس دریا کو دریائے اشک کہتے ہیں۔ اسی دریا میں ایک ٹوٹی پھوٹی سی کشتی بھی پڑی ہوئی تھی۔ چنانچہ معلوم ہوا کہ بہت سے مسافر پار جانے والوں نے اضطراب اور بے صبری سے اس میں بیٹھ کر اسے خراب کر دیا ہے۔ مصیبت اس کشتی پر ملاحی کرتی تھی۔ چنانچہ وہ فوراً ہمارے پاس لے آئی۔ ہم بھی سوار ہونے کو تیار تھے کہ اتنے میں ایک بی بی دیرینہ سال شرم وحیا کا برقع اوڑھے، حلم کی لاٹھی ٹیکتی آئی۔ شفقت مادرانہ سے ایک ایک کا نام لے کر پکارا اور سفر دریا کے خطر بیان کرنے لگی تاکہ ہم کسی طرح اپنے ارادے سے باز رہیں۔ اکثر لوگوں نے اسے پہچان لیا کہ بی بی صابرہ خاتون ہیں۔ چنانچہ بعض اشخاص جو رو رو کر آنکھوں سے دریا بہا رہے تھے، انھوں نے اس کا کہنا مانا اور پیچھے ہٹ آئے۔ باقی ہم میں سے سوار ہوئے۔ بڑھیا بے چاری کی نیک ذاتی اور اس کے دل کی دردخواہی نے مصیبت زدوں کا ساتھ چھوڑنا گوارا نہ کیا اور کہا "اے فرزندو! اگر تم کہو تو میں بھی تمھارے ساتھ سوار ہو لوں کہ بھلا اگر سفر میں وقت پڑے تو تمھیں تسکین یا صلاح مناسب تو دے سکوں"۔

غرض کہ ہم کشتی میں سوار ہو کر سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ کشتی چل نکلی اور بادبان کھل گئے، مگر ان بادبانوں میں فقط آہوں کا دھواں بھرا تھا، کیونکہ اس ملک کی ہوا یہی تھی۔ رستے میں اگرچہ بہت سے صدمے جھیلے اٹھائے مگر اکثر لوگ ہم میں ایسے تھے کہ انھیں اس کی پروا بھی نہ تھی۔ غرض بہ ہزار دقت کشتی کنارے پر لگی۔ جب پار اترے تو دیکھا کہ ایک جزیرہ ہے مگر وہاں ایسی دھند چھائی ہوئی تھی کہ سورج نے اپنی شعاعوں کے ہزاروں تیر مارے، ایک پار نہ جا سکا۔ سامنے ایک بھیانک اندھیرا اس طرح پھیلا ہوا تھا کہ جو لوگ ہم میں ذرا دلوں کے نرم تھے وہ اس مقام کو دیکھ کر سخت گھبرائے اور ناچار ہو کر صبر کے دامن کو ہاتھ لگایا۔ چنانچہ اس نے ایک طرف کو اشارہ کیا۔ وہ ہمیں وہیں چھوڑ کر ادھر اترے۔ پھر یہ بھی ہم نے سنا کہ اس کے پتے کے بموجب جزیرے کی سرحد پر پہنچ کر انھیں ایک پایاب مقام ہاتھ آگیا۔ میں ابھی تک

انہیں لوگوں کے ساتھ تھا جن کا یہ ارادہ تھا کہ جزیرے کے بیچوں بیچ میں ہی جا کر دم لیں گے، چنانچہ وہ سب نہایت آہستگی اور سنجیدگی سے، جیسے کوئی جنازے کو لیے جاتا ہے، چلے جاتے تھے۔ انہی ہم سفروں کے حلقہ رفاقت میں میں بھی چلا جاتا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہم ایک سرسبز بن میں جھاڑیوں کے اندر اندر چلے جاتے ہیں اور ان درختوں کو قبرستان پر ہی سایہ کرنے کا عشق ہے۔ یہاں کچھ آدمی بھی رہتے ہوئے معلوم ہوتے تھے مگر وہ بھی نالہ وزاری میں مصروف تھے کہ کسی طرح انہیں تسکین نہ ہوتی تھی۔ کوئی شاخ درخت کو پکڑے کھڑا تھا اور زار زار روتا تھا، کوئی اپنے ہاتھ کو مروڑتا تھا اور دل مسوس کر رہ جاتا تھا، کوئی چھاتی پیٹتا تھا اور بال نوچتا تھا، کوئی خاموش تھا مگر ایسا معلوم ہوتا تھا گویا صدمہ غم سے سکتے کا عالم ہو گیا ہے۔ ان حالات کو دیکھ کر اور آوازوں کو سن کر ہمارا غم اور بھی زیادہ ہوا بلکہ ایک رفیق تو ایسا بیتاب ہوا کہ رستے پر ایک درخت کا ٹہنا جھکا ہوا تھا، اس نے ارادہ کیا کہ اس میں لٹک کر رہ جائے، مگر ساتھیوں نے تسلی دلاسا دے کر سنبھالا۔

اب ہم چلتے چلتے ایسے مقام پر پہنچے کہ زمین آسمان اندھیرا اور بالکل سنسان مقام تھا۔ جنگل کی سائیں سائیں، ٹہنی ٹہنی سے رونے کی آواز، ہوا کا گھٹاؤ، دلوں کے دھڑکنے سے جب ہمارا حال بہت ابتر ہوا تو سب کو یقین ہو گیا کہ اب ہم کنج غم کے پاس آ پہنچے۔ ایک گہری گھاٹی کے بیچ میں اندھیرا گھپ ایک لمبا غار تھا۔ اسی کے رستوں کے اینچ پینچ میں کچھ کچھ پانی بھر رہا تھا، مگر عجب رنگت پائی تھی کہ نہ کالی نہ لال، وہی نیلا پیلا کیچڑ پانی تھا کہ نالہ وزاری کی آوازوں پر آہستہ آہستہ سرسراتا تھا اور مارے غم کے دل کے لہو کو پانی کر کے بہاتا تھا۔ غار مذکور کے اندر ایک تہہ خانہ تھا جس کے دروازے پر آہ کے قلم اور تیرہ بختی کی سیاہی سے لکھا تھا کہ "کلبہ احزان کا دہان غم یہی ہے"۔ اندر اس غار مصیبت کے دیو غم انجام کا وجود بدنمود نظر آتا تھا۔ اس کے رستے میں کوڑا، کانٹے اور سانپ بچھوؤں کے ڈنک بکھرے ہوئے تھے۔ جس تخت پر اس کا جلوس حاکمانہ تھا وہ ایک ٹوٹی پھوٹی پہاڑی کی چٹان تھی۔ تکیوں کی جگہ پیچھے اور پہلوؤں میں کئی کٹ ھنگے بے ڈھنگے پتھر ڈال دیے تھے۔ سر پر تاج بے کلاہی دھرا تھا، جس پر اندھا دھند

اندھیرا چھایا ہوا تھا اور بار غم کے مارے سر کو بازو پر سہارا دیے ہوئے تھا۔ اس شان سے اپنی غم پرست و غم آئین رعایا پر حکمرانی کرتا تھا اور افسردہ، پژمردہ، چپ چاپ، خاموش خود اپنے خیال میں گم ہو کر حماقت کی تصویر بن گیا تھا۔

اس کے ایک طرف ملامت وافسردگی کھڑی تھی کہ مارے ضعف کے جھکتے جھکتے نقش زمین ہو گئی تھی، لوگ کہتے تھے کہ غش آگیا۔ دوسری طرف فکر تھا کہ دمبدم کی سرگوشی سے ہزاروں وہم وسوسوں کے عذاب میں گرفتار تھا۔ زردی سر پر کھڑی رومال ہلاتی تھی کہ رنگ دھواں ہو کر اڑائے جاتے تھے۔ پہلو میں درد بیٹھا تھا کہ جونک کی طرح اندر لہو پیے جاتا تھا۔ تمام غم خانے میں ویرانی بربادی چھائی ہوئی تھی اور اس کھنڈر کے چھیدوں میں کئی چراغ سحری بھی ٹمٹما رہے تھے، جن کے نیلے نیلے شعلے اٹھتے تھے اور اپنی ہی نیلاہٹ میں بیٹھ کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے کہ وہ غم کی حالت اصلی کو اور بھی زیادہ خوف سے روشن کرتے تھے۔ جب ہم وہاں پہنچے تو اکثر لوگ رستے کے دکھوں کے مارے جاتے ہی گر پڑے۔ چنانچہ جو ظالم ستمگار تخت کے آس پاس کھڑے تھے ان کے حوالے ہو گئے۔ بعض تو خوش نصیب تھے کہ رنج وعذاب سہتے سہتے دروازے کی طرف بھاگے۔ وہاں بی بی صابرہ خاتون ان کے استقبال کے لیے منتظر کھڑی تھیں۔ کیونکہ جب ہم اندر گئے تو اس بے چاری کو چھوڑ گئے تھے۔ اس کی رفاقت ایسے وقت میں نہایت غنیمت معلوم ہوئی۔ چنانچہ اس نے ہمیں اس کلبہ احزان کے گرد ایک چکر دیا۔ جب پچھواڑے کی طرف آئے تو ایک بلندی نظر آئی۔ اس پر چڑھ کر دفعتہً معلوم ہوا کہ گویا ہم اس ماتم درہ کی نکاس کی راہ پر آگئے۔ اس بلندی پر اس نے کہا کہ فرزندو! یہاں ذرا ٹھہر کے دم لے لو کہ تمہارے ہوش وحواس ٹھکانے آجائیں۔ چنانچہ فی الحقیقت خمار غم کی سرگرانی سے آنکھیں ہماری جو زمین پر لگی ہوئی تھیں، اب ذرا کھلتی معلوم ہوئیں اور ایک قسم کی خوشی محسوس ہوئی، جس نے زبانوں پر تسکین کا مزہ دیا۔ یا تو دنیا اندھیر معلوم ہوتی تھی یا ایسا معلوم ہوا گویا ہم چھاؤں میں ہیں۔ یہاں ہم نے اپنے ہمراہیوں کے شمار پر بھی خیال کیا کہ کتنے لوگ جزیرے میں داخل ہوئے تھے۔ چنانچہ ان کی کثرت نے دل کو ایک اور قسم کی خوشی ہوئی جس کو تسلی سمجھنا چاہیے۔ ہر چند کہ

یہ خوشی، جو اوروں کو مبتلائے غم دیکھ کر حاصل ہوئی تھی، معیوب ہے مگر اس وقت قابل عذر تھی، کیونکہ وقت کو خیال کرو، یعنی دیکھو کہ ہم خود کس آفت میں مبتلا تھے۔ اسی واسطے ہم کو فقط ان کے حال زار پر رحم نہ آیا۔ ہاں یہ افسوس آیا کہ ہائے ہم سب کیسی بے کسی اور بے چارگی کی حالت میں گرفتار ہیں، بلکہ اس میں کچھ انس انسانیت اور رحم ہمدردی بھی شامل تھا۔

اگرچہ دل اس وقت ایسے اندھیرے اور عالم مدہوشی میں تھا کہ اسے کسی بات کا ہوش نہ تھا، مگر جوں جوں آگے بڑھے، ہوش میں آتا گیا۔ تھوڑی دور چل کر ایک دوسرے کو پہچاننے لگے، بلکہ ایک ایک کو غمگین دیکھ کر پوچھنے لگا کہ ہم کب ملے تھے اور وہ کیا مصیبتیں تھیں کہ جن کے لیے ہم سب جمع ہوئے تھے؟ ہر ایک نے اپنی سرگزشت بیان کی۔ سارے ماجرے سن کر سب نے ایک دوسرے کی تکلیف کو تولا اور باہم مقابلہ کیا۔ پھر آپس میں ہی رحم کر کے ایک دوسرے کے حال پر بہت افسوس کیے۔ غرض اس طرح غمناک قافلے نے رفیقوں کو صبر و تسلی کے توشے دے کر، تھوڑی سی مصیبت کی راہ قطع کی۔ آخر ان درختوں کا تنگ رستہ ذرا کھلنا شروع ہوا اور ہوا بھی کچھ کچھ صاف ہونے لگی۔ تھوڑی دور سے صبح کا سفیدہ غبار کی طرح اڑتا نظر آیا۔ وہ ایسا رہ رہ کر ابھرتا تھا جیسے کہیں دور بجلی چمکتی ہو۔ چمکارے ذرا اس کے مانند تھے مگر باوجود اس کے دل کو فرحت بخشتے تھے۔ چنانچہ اس ملک میں اسے دل کا بہلاوا کہتے تھے۔ تھوڑی دیر میں یہ روشنی زیادہ نظر آنے لگی اور پھر زیادہ تر روشن اور دیر تک ٹھہرنے لگی۔ بعد اس کے وہ آہیں جنھوں نے اب تک زمین و آسمان کو دھواں دھار کر رکھا تھا، نسیم صبح کی سرسراہٹ بن گئیں اور تمام جزیرے پر جو دیو ہیبت کا سایہ چھایا ہوا تھا، وہ بھی کم ہونے لگا۔

اب ہم چلتے چلتے اس پایاب مقام پر پہنچے جہاں سے ہمیں پار اترنا تھا۔ یہاں دیکھیں تو وہ ماتم زدہ بھی بیٹھے ہیں جو پہلے ہمارے ساتھ ادھر اترے تھے اور پھر کلبۂ احزان کے دروازے سے گھبرا کر بھاگے تھے، لیکن یہاں بیٹھے انتظار کر رہے تھے کہ جس طرح ساتھ ادھر آئے تھے، ساتھ ہی پھر دنیا میں دوبارہ پیدا ہوں، جس سے معلوم ہو کہ یہ

بھی کلبہ احزان کی تکلیفوں میں شریک حال تھے۔ اگرچہ اور طرف پانی بڑا گہرا تھا مگر اودھر بالکل پایاب تھا۔ جب ہم دریا اترے تو تمام دوست آشنا استقبال کو آئے، کیونکہ انھیں ہماری عمر دوبارہ کی مبارکباد کے لیے تسلی بلا کر لائی تھی۔ ان میں سے بعض تو ہمیں اتنے دن تک جدا رہنے کے لیے ملامت کرتے تھے، بعض کہتے تھے کہ خیر جو ہوا سو ہوا، پھر اودھر جانے کا ارادہ نہ کرنا۔ بعض دانشمندوں نے سفر کا حال بھی نہ پوچھا کہ مبادا پھر رنج تازہ ہو جائے، مگر یہ ہر شخص نے کہا کہ اگر تقدیر سے ایسا سفر پیش آئے تو صبر سے بہتر کوئی رفیق راہ نہیں۔ یہاں صبر نے چاروں طرف سے اپنی تعریفیں اور شکریے سن سن کر ہمیں تسلی کے سپرد کر دیا۔ تسلی نے اس پر تبسم کیا، تبسم کے ساتھ ہی اودھر سے آسمان کا رنگ ارغوانی ہو گیا اور شب ماتم صبح ہو کر روز روشن بن گئی۔

حواشی

1- اس عمارت سے گویا وہی کاروبار مراد ہیں، انہی میں آیندہ یہ لوگ گزران کر کے اپنی قسمت کا لکھا پورا کریں گے۔

2- کیسی ہی نعمت ہو، جب برابر ملے جائے تو آخر دل سیر ہو جاتا ہے۔

3- ایک قسم کا شکاری کتا ہے جسے ہندوستانی زبان میں "بل ڈاگ" کہتے ہیں۔

4- دیکھ لو، دنیا میں جوں جوں انسان کامیاب ہوتا ہے، اس سے آگے کی کامیابیوں کی ہوس دل میں پیدا ہوتی جاتی ہے۔

5- انسان کی طبیعت کا عجیب حال ہے، جو ہوس پوری ہو جاتی ہے، وہ مزہ نہیں دیتی، اس سے آگے کے لطف دل میں ارمان اور ذوق پیدا کرتے ہیں۔

6- جوں جوں حصول مراد میں دیر لگتی ہے، شوق زیادہ ہوتا جاتا ہے، اور امید بھی اس کے ملنے کے سامان سامنے دکھاتی جاتی ہے۔

7- انسان جس مقصد کے لیے کوشش کرتا ہے، کسی سے کب کہتا ہے، اندر ہی اندر تدبیریں کرتا ہے۔

8- اپنے کام کے آگے کسی اور کی احتیاج کی کون پروا کرتا ہے۔

9- سچ ہے، بڈھوں کو جوانوں سے زیادہ ہوس ہوتی ہے۔

10- بہت سے گرم و سرد زمانے کے دیکھتا ہے، نشیب و فراز عالم کے طے کرتا ہے، بچپن سے لے کر ساری جوانی تجربوں میں گزارتا ہے۔ جب گھس پس کر بڈھا ہو لیتا ہے تو ذرا آدمی بنتا ہے اور اس قابل ہوتا ہے کہ جو سنے یا دیکھے اسے کچھ سمجھ بھی سکے۔

11- ابھی ایک طرف ناچ رنگ، شادی اور مبارکبادی ہے، ابھی دوسری طرف سے

رونے پیٹنے کی آواز آتی ہے۔ ابھی ایک گھر میں دولت واقبال کا جوش وخروش ہے، ابھی ایک صدمہ ایسا پڑا ہے کہ ساری خوشیاں مٹی ہو گئی ہیں۔ ادھر آبادی ہے ادھر بربادی ہے، ادھر ہوائے ترقی اور جوش واقبال ہے، ادھر ادبار کی آندھی ہے، ابھی عمر کا جہاز صحیح سلامت باد مراد پر چلا جاتا ہے، ابھی طوفان طلاطم میں غوطے کھا رہا ہے۔

12- کمزور کشتیاں بچوں کے نازک جسم اور دھان پان سے بدن ہیں۔

13- اس سے بچوں کے ماں باپ اور طبیب یا تیماردار مراد ہیں۔

14- یہ جوانی کا عالم ہے اور دنیا کے حادثے ہیں جو کہ تلاش معاش اور راہ ترقی میں اسے پیش آتے ہیں۔

15- یہ بڑے بڑے عالم فاضل، ڈاکٹر، پروفیسر، مولوی، پنڈت ہیں جو ہماری تعلیم میں مصروف ہیں۔

16- فی الحقیقت دنیا کی ابتدا اس نے دیکھی ہے، جو آیا یہی چلتا ہوا کارخانہ دیکھا اور چلتا ہوا ہی چھوڑ جائے گا۔

یہ چمن یوں ہی رہے گا اور ہزاروں بلبلیں
اپنی اپنی بولیاں سب بول کر اڑ جائیں گی

17- خدا کے معاملے غیب کے اندھیرے میں ہیں، کسی کی عقل نہیں دیکھ سکتی ہے۔

18- انہیں دنیا کے مکروہات، جسمانی بیماریاں، دشمنوں کی بدخلاقیاں اور اپنی بدپرہیزیاں اور بے اعتدالیاں سمجھو۔

19- یہ بااقبال اور کامیاب لوگ ہیں جن کی دنیا میں بن آئی ہے۔

20- نادانوں اور جاہل دوستوں سے خدا بچائے۔

21- افسوس دنیا کے مزے ہمیں کیسا اندھا کر دیتے ہیں کہ انجام کے مکروہات اور خوف وخطر کچھ معلوم نہیں ہی ہوتے۔

22- بھلا عمر رفتہ کب آسکتی ہے اور جوان یا بڈھا آدمی بچہ کیونکر ہو سکتا ہے۔

23- انہیں پرانی عمارتیں، بڑے بڑے فاضلوں اور مصنفوں کے تذکرے اور نامی گرامی لوگوں کی یادگاریں سمجھو یا پرانی عمارتیں، قدیمی مقبرے اور پرانے قبرستان۔

24- یعنی تمہارا جسم خاکی ہے جسے تم اچھی اچھی غذائیں کھلاتے ہو، ورزشوں سے تیار کرتے ہو، نہلاتے دھلاتے ہو، گرم سرد ہواؤں سے بچاتے ہو اور جوں جوں بڈھے ہوتے ہو وہ ناطاقت ہوتا جاتا ہے۔

25- دولت مند عیاش یا بڈھے زیادہ خطر کی حالت میں ہیں، مگر انہی کو غفلت زیادہ ہوتی ہے بلکہ مرنے کی بات سننے کو بھی جی نہیں چاہتا۔

26- راگ رنگ، قصے کہانیاں، کھیل کود کی باتیں کرنے میں ایسے لوگ دل بہلایا کرتے ہیں۔

27- عمر رواں کا جہاز چلا جاتا ہے، دنیا گزرگاہ عام ہے، راگ رنگ، حسن و جمال، عیش و نشاط کے یہاں جمگھٹ ہیں، دیکھنا کہیں ان کے مزوں میں آکر کود نہ پڑنا، ایسی چوٹ کھاؤ گے کہ ہسپتالوں تک جانے کے قابل بھی نہ رہو گے۔

28- عقل و ادراک تمہیں ہر وقت بے اعتدالیوں اور بد پرہیزیوں سے بچنے کو اشارہ کرتے رہتے ہیں مگر ان بے چاروں کی کون سنتا ہے۔

29- یہاں سوئی اور مقناطیس کو نہ دیکھو، اپنے اشتیاق اور رغبت کی بد اعتدالی پر خیال کرو۔

30- بڈھوں کو زندگی بہت پیاری ہوتی ہے، کیسے پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں۔

31- یہ کاریگر حکیم جی ہیں یا ڈاکٹر صاحب ہیں۔

32- حکیموں نے کہا سیانے کا علاج کرو، اس نے کہا حکیم کا علاج کرو۔

33- مراد اس سے یہ ہے کہ اپنی بے وقوفی یا بد اطواری کو کوئی برا نہیں سمجھتا، اسے واسطے اسے کسی نے نہیں پھینکا۔

34- بند اور گھٹی ہوئی جگہ میں نہ نباتات بڑھتے ہیں، نہ ان کے پھول کھلتے ہیں، نہ پھل لگتے ہیں۔ سورج کی روشنی اور چلتی ہوا کو اس میں بڑا دخل ہے، یہ نہ ہو تو سب ٹھٹھر کر رہ جاتے ہیں۔

35- یہ بے ہودہ، بے دل اور نکتہ چیں معترض ہیں۔ ہنر مندوں کے ہنر ان کی آنکھوں میں چبھتے ہیں اور خواہ مخواہ عیب لگا کر ان کی تصنیفوں کو خراب کرتے ہیں۔

36- زمانہ کے ہنر دشمن ہے، کیسا ہی اندھیر مچاوے مگر خود بخود ایک وقت ایسا آجاتا ہے کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جاتا ہے۔

37- انگریزی میں وٹ اور لرننگ کا مباحثہ تھا، میں نے وٹ کے واسطے بہت خیال کیا، کوئی لفظ نہ ملا، ناچار ذکاوت لکھ دیا۔ اس میں جو لفظی قباحت اور معنوی کوتاہی ہے سو ظاہر ہے، مگر اور لفظ اتنا بھی نہ تھا۔ مجبوراً سب قباحتوں کو برداشت کیا، کیونکہ غرض مطلب کے سمجھانے سے ہیں۔

38- دیکھو ہمارے بھائی بند جب آپس میں مباحثہ کرتے ہیں یا لوگوں پر اپنا کمال ظاہر کرتے ہیں تو زیادہ تر حریف پر اعتراض کرتے ہیں اور اس کے خراب کرنے میں کوشش کرتے ہیں اور تصنیف و تالیف دکھا کر اپنے کمال کی تقویت نہیں کرتے۔

39- اس میدان کو میدان دنیا سمجھ لو۔

40- فی الحقیقت جو ناموری اور ترقی کے خواہاں ہیں، اگر سلطنت، حکومت، دولت، شجاعت، علمیت وغیرہ کے رستے سے جاتے ہیں تو خوف جان ہے اور اگر فنون کمال کے رستے لیتے ہیں تو حاسد انواع واقسام کی بدذاتیوں سے سدراہ ہوتے ہیں۔

41- کوئی اوتار کہتا ہے، کوئی بادشاہ بااقبال۔

42- اس کے عہد میں علوم و فنون نے بڑی ترقی کی تھی، خصوصاً علم ہیئت کی کتابیں اور رصد خانے کی تعمیر اس کی شاہد حال ہے۔

43- بات تو سچ ہے "خام خیالی سے خود پرستی پیدا ہوتی ہے"۔

44- یعنی بے نقطہ یا منقوط، یا فقط اوپر ہی نقطے ہوں یا نیچے ہی نقطے ہوں، یا حروف اس کے ایک ایک الگ الگ تحریر ہوں، یا سب کے سب ملا کر لکھے جا سکتے ہوں۔

سخن دانِ فارس

مولانا محمد حسین آزاد

سُخن ورانِ فارس

فہرست

حصہ اول

حصہ دوم

پہلا لیکچر:

دوسرا لیکچر:

تیسرا لیکچر:

چوتھا لیکچر:

پانچواں لیکچر:

چھٹا لیکچر:

ساتواں لیکچر:

آٹھواں لیکچر:

ابتدائیہ

ہے انساں صانع قدرت کا اک صندوق سربستہ
ولیکن یہ نہیں کھلتا کہ اس میں بولتا کیا ہے

قارئین! زیر نظر کتاب "سخن دان فارس" منفرد اردو نثر نویس محمد حسین آزاد کے قلم کا شہکار ہے۔ بنیادی طور پر یہ کتاب لسانیات سے علاقہ رکھتی ہے۔ اس لئے کتاب کا جائزہ لینے سے قبل یہ جان لینا ضروری ہے کہ جس طرح ماہرین بشریات نے کرہ ارض پر بسنے والے انسانوں کو کھوپڑی کی ساخت اور دیگر جسمانی خصائص کی بنیاد پر مختلف نسلی گروہوں (جیسے آریہ، منگول اور نیگرو وغیرہ) میں تقسیم کیا ہے اسی طرح لسانیات کے علماء نے دنیا بھر میں لکھی، بولی اور سمجھی جانے والی زبانوں کو بھی مختلف حلقوں میں بانٹ رکھا ہے، ہر حلقہ کی مزید کئی شاخیں ہیں۔ یہ تقسیم اتفاقی یا غیر عقلی نہیں بلکہ دقیق تحقیقی اور علمی کاوشوں کے بعد ٹھوس نتائج کی بنیاد پر استوار کی گئی ہے۔ نکتہ اس میں یہ ہے کہ جو ایک نسل کی زبانیں ہیں، ان کے الفاظ کی نسل ایک ہی حلقہ میں ملے گی، دوسرے حلقہ میں نہ جائے گی۔ اس حلقہ بندی اور تقسیم نے لسانیات کے شعبہ میں بڑی آسانی کردی کہ الفاظ کے سراغ رساں کو اپنی مطلوبہ چیز زبانوں کے جنگل میں بھٹک کر نہ ڈھونڈنی پڑے بلکہ ایک مخصوص محلّے میں مل جائے۔ ظاہر ہے کہ جنگل کی نسبت کسی چیز کو ایک محلّہ میں ڈھونڈنا زیادہ دشوار نہیں۔

لسانیات دانوں کے مطابق دنیا کی تمام زبانوں کے تین بڑے حلقے ہیں۔

(1) پہلے حلقہ کو ایرین کہا جاتا ہے۔ ہندوستانی، ایرانی، یونانی، لاطینی، فرنچ اور روسی وغیرہ اس کی شاخیں ہیں۔

(2) شیمیٹک: یہ دوسرا حلقہ ہے اور اسکی شاخیں عربی، عبرانی اور کلدانی وغیرہ ہیں۔

(3) تیسرا حلقہ تیورینین ہے۔ یہ متفرق زبانوں کا حلقہ ہے، جس کی شاخیں تاتار، سیام، برما، کمبجا اور پیگو وغیرہ کی بے علم اور بے قاعدہ زبانیں ہیں۔

شمس العلماء مولانا محمد حسین آزاد نے "سخن دان فارس" نامی اس کتاب میں پہلے حلقہ کی دو شاخوں ہندوستانی اور ایرانی کو موضوع تحریر بناتے ہوئے سنسکرت اور فارسی کے لسانی روابط نمایاں کرنے کی شاندار اور کامیاب کوشش کی ہے۔

بنیادی طور پر یہ کتاب مولانا کے لیکچرز پر مشتمل ہے۔ کتاب کے متن کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ دو لیکچرز اور دوسرا حصہ گیارہ لیکچرز پر مشتمل ہے۔ حصہ اول کا پہلا لیکچر "فیلالوجیا: لغات اور زبانوں کی فلسفی تحقیقات کے اصول" کے عنوان سے ہے۔ اس میں لسانیات کے علم کی تاریخ پر مختصراً روشنی ڈالنے کے علاوہ دنیا میں زبانوں کے تدریجی ارتقاء پر بحث کی گئی ہے۔ اس مقام پر آزاد اپنے مخصوص انداز میں رقم طراز ہیں:

> "راہ تہذیب کے مسافرو! ذرا ابتدائے آفرینش کی طرف مڑ کر نگاہ کرو کہ انسان پیدا ہوا ہے۔ اس میں دل ہے، دماغ ہے، خیالات ہیں اور سب طرح کی ضرورتیں بھی ہیں، مگر اظہار مطلب کا اوزار نہیں۔ وہ کیونکہ گزارہ کرتا ہوگا؟ اچھا، آج جو انسان بے زبان ہیں اور پہلے سے سو درجے زیادہ ضرورتیں رکھتے ہیں، انہیں دیکھو کیا کرتے ہیں؟ وہ کون؟ گونگے کہ اپنے اشاروں میں دنیا کی کوئی بات نہیں چھوڑتے، سب کچھ کہہ دیتے ہیں۔ اور گونگوں پر کیا منحصر ہے، تم خود اکثر نہیں بولتے، سر کو آگے کو ہلا کر ہاں ظاہر کر دیتے ہو۔ دونوں شانوں کی طرف ہلا کر نہیں۔ اور

غور کرو تو یہ طبعی حرکت ہے۔ گھوڑے، ہاتھی وغیرہ چارپائے جب مالک کا ارادہ ماننا نہیں چاہتے تو کس طرح سر جھڑ جھڑا کر سرکشی سے انکار دکھاتے ہیں۔ شوق سیاحت مجھے خود کئی ملکوں میں لے گیا، جہاں میں گونگا تھا۔ کیونکہ نہ میں کسی کی سمجھتا تھا، نہ کوئی میری۔ وہاں گزارہ کا وسیلہ اشارے ہی تھے۔ انسان جوش ہائے مختلف کا تھیلا ہے۔ جب کسی بات میں ناراض یا خفا ہوتا ہوگا تو اس کی طبیعت سخت آواز نکالتی ہوگی۔ نہیں، غراتا ہوگا۔ تم جانتے ہو کہ سمجھ بھی اپنے اپنے درجہ میں ہر جاندار کو ملی ہے۔ کتے، بلی کو دیکھو۔ جب تمہیں خوش کرنا چاہتے ہیں، تو کن کن حرکتوں اور جنبشوں سے لگاوٹ کرتے ہیں اور کیسی مہین مہین نرم نرم آوازیں سناتے ہیں۔ اسی طرح ابتدائی انسان بھی دوسرے کا غصہ دھیما کرنے کو عجز و نیاز کی حرکات کام میں لانے لگا ہوگا۔ گونگوں کو بھی دیکھ لو، اپنے اشاروں کو رنگ برنگ کی آوازوں سے مدد پہنچاتے ہیں۔

تم اب بھی کتے، بلی سانپ وغیرہ جانوروں کے ڈرانے یا ہٹانے کے لئے لکڑی کھٹ کھٹا کر کام لیتے ہو۔ کبھی دوسرے شخص کو ہشیار یا آگاہ یا اپنی طرف متوجہ کرنے کو تالی بجا کر، چچکار کر، کھنکھار کر آگاہ کرتے ہو۔ آواز کا سمجھ جانا جاندار مخلوق کی طبیعت میں داخل ہے۔ جو جو بولیاں بول کر آپس میں سمجھتے سمجھاتے ہوں گے وہ تو خدا ہی جانے۔ مگر بلی کو دیکھو، کسی ملک کی ہو، خواہ غافل سوتی ہو، خواہ کسی طرف جاتی ہو۔ جب پھش پھش کر کے آواز دو گے، فوراً دیکھنے لگے گی۔ کتا کسی ولائت کا ہو

جب تم چس چس کر کے آواز دو گے، ضرور چوکنا ہو کر دیکھنے لگے
گا۔ بلکہ محبت کی دم بھی ہلانے لگے گا۔ یہ عموماً بازاری کتوں کا حال
ہے اور جو تعلیم یافتہ ہیں ان کا تو کیا کہنا!"

کتاب کے اس اولین لیکچر میں مولانا محمد حسین آزاد نے بتایا ہے کہ انسان ابتداء میں دل کے خیالات اپنے چہرے کے تاثرات، منہ سے بے اختیار خارج ہونے والی متنوع آوازوں اور اشاروں کی مدد سے دوسروں تک پہنچاتا تھا۔ پھر انہی آوازوں نے الفاظ کی صورت بدل لی اور باہمی اتفاق سے کچھ لفظ آپس کے سمجھنے سمجھانے کے لئے مقرر ہو گئے۔ جب آفرنیش بڑھی اور آبادی پھیلی تب یہی لفظ ادائے مطلب کے لئے استعمال میں لائے گئے۔ آزاد اسی بات کو بڑھاتے ہوئے لکھتے ہیں: "اب کوئی پوچھے کہ تقریر کیونکر پیدا ہوئی، تم صاف کہہ دو گے کہ انسان میں جو چیخنے یا چلانے کی خاصیت ہے وہ باہمی ضرورتوں اور آپس کے برتاؤ سے اصلاح اور ترقی کرتے کرتے تقریر ہو گئی اور رفتہ رفتہ یہ رتبہ پیدا کیا کہ جس طرح ایک مصور کامل کسی انسان یا باغ یا محل کا نقشہ کھینچ کر اس کی کیفیت آنکھوں کے رستے سمجھاتا ہے، صاحب زبان اپنے مافی الضمیر اور حرکت اعضاء کے مجموعہ کو آواز کے رنگ میں کانوں کے رستے سمجھاتا ہے۔ پس گویائی گویا ایک عمدہ آلہ ادائے خیال کا ہے۔۔۔۔۔"

اس کے بعد مولانا محمد حسین آزاد اپنے اصلی موضوع اور مقصد کی طرف بتدریج رجوع کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"عزیزان وطن! ولادت الفاظ اور آفرنیش زبان کے خیالات مجملاً آپ کے تصور میں آگئے ہوں گے۔ اب یہ سنیں کہ فلسفی زبان کا منصب کیا ہے؟ اس کا منصب ہے، تقریر کے ہر لفظ کو کریدنا، جس سے کہ زبان مرکب ہے۔۔۔۔۔ ماہر زبان فقط ایک لفظ کو لیتا ہے۔۔۔۔۔ عقل۔۔۔۔ سے حرفوں کے جوڑ بند

کھولتا ہے۔ اور معنوں کو سوچ کر اس کی ساری اصل نسل دریافت کر لیتا ہے۔

میرے دوستو! تم حیران ہو گے کہ لفظ کی ولادت اور نسل کیا؟ ہاں، لفظ کی بھی ولادت اور نسل ہوتی ہے۔ اور وہ اس طرح معلوم ہوتی ہے کہ فلسفی لفظ کے جز جز کو الگ کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ وقت بوقت ان کی اصل کس کس ملک اور کس کس قوم میں پہنچتی آئی ہے۔ ان میں کیا رشتے ہیں۔ اور وہ رشتے کیونکر پیدا ہوئے ہیں؟ اور ملک بہ ملک ان کے معنوں یا حرفوں میں کیا تغیر پیدا ہوئے ہیں۔ پھر اور زبانوں کے لحاظ سے اپنی باتوں پر غور کرتا ہے، ان کے نتائج کو بھی جانچتا ہے اور مطابقت اور مقابلہ کرتا ہے۔ یعنی ایک زبان کے لفظ دوسری زبان سے کن کن باتوں میں متفق ہیں اور کون سی باتیں ہیں کہ ایک ہی کے لئے خاص ہیں۔ پھر ان سبھوں کی جستجو کرتا ہے، جو زبان میں تبدیلی کا عمل کر رہے ہیں۔ اور یہ غیر منقطع کام ہے، کبھی ترقی کے رنگ میں ہوتا ہے، کبھی تنزل میں، مگر جاری ہمیشہ رہتا ہے اور اسی کو زبان کی اصل نسل کہتے ہیں۔ (مثلاً) گریبان کو زبان کے فلسفی نے دیکھا۔ بان پر جوڑ معلوم ہوا۔ اس نے گرے کو دیکھا تو فارسی قدیم میں بہ معنی گلو پایا۔ سمجھ گیا کہ اس جزو لباس کا گلے پر قبضہ ہے، اس لئے اس کا نام گریبان رکھا ہو گا کہ مالک گلو ہے۔ سنسکرت میں دیکھا تو وہاں گریوا انہی معنوں میں آیا ہے۔ اور بان سنسکرت میں وان ہے۔ ثابت ہو گیا ہے کہ ایک گھرانے کی نسل ہے۔ ملک اور مدت کے انقلاب سے آواز بدل گئی۔ یہاں مر گیا، وہاں جیتا ہے"۔

"سخن دان فارس" کے حصہ اول کا دوسرا باب محمد حسین آزاد نے بعنوان "سنسکرت اور فارسی زبان کی فیلا لوجیا" باندھا ہے۔ یہ دراصل پہلے حصے کا دوسرا اور آخری لیکچر ہے۔ اس میں صاحب کتاب نے لاتعداد مثالوں اور بے شمار حوالوں کے ذریعے سنسکرت اور فارسی زبان کے ان گنت الفاظ کے لسانی رشتے تلاش کر کے انھیں قارئین کے سامنے نمایاں کیا ہے۔ دونوں مذکورہ زبانوں کے باہمی روابط کی تفہیم کے سلسلہ میں یہ باب ایک نمایاں اہمیت رکھتا ہے۔ مولانا نے دونوں زبانوں میں نہایت قریبی رشتہ داروں کے نام، اعضائے بدن کے نام، قدرتی اشیاء کے اسماء، زرعی اجناس، جانوروں کے نام، بنیادی اعداد اور اعداد فاعلی کے لیے مستعمل الفاظ کا آپس میں تقابل کر کے نہایت گہری اور اہم مماثلتیں دریافت کی ہیں جو اس بات کو روز روشن کی طرح عیاں کرتی ہیں کہ فارسی اور سنسکرت زبانیں "دو سگی بہنیں" ہیں اور لسانیات کے ایک ہی خاندان سے تعلق رکھتی ہیں۔ اسی لیکچر میں انھوں نے الفاظ کے اصول مبادلہ بھی بتائے ہیں۔ ابتدائی حصہ کے دونوں لیکچر اپنے موضوع اور طرز تحریر کے علاوہ مولانا کی تحقیقی قابلیت کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ ان ضمن میں صاحب کتاب کو جتنی عرق ریزی سے محنت کرنا پڑی ہو گی، اس کا اندازہ اس حصہ پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے بخوبی ہو جاتا ہے۔ بلاشبہ یہ مولانا آزاد کا اردو زبان پر ایک گراں قدر احسان ہے کہ وہ ایک ایسے موضوع پر کام کر گئے جسے اس وقت تک ارباب فکر و دانش در خور اعتناء نہ سمجھتے تھے۔

اس کے بعد کتاب کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے۔ یہ حصہ گیارہ لیکچرز پر مشتمل ہے۔ پہلا لیکچر قدیم فارس کی تاریخ کا احاطہ کرتا ہے، اس میں صاحب کتاب نے فارس کے حالات پر روشنی ڈالتے ہوئے فارسی زبان کے ابتدائی اولیٰ خیالات کا جائزہ لیا ہے۔ اس لیکچر میں بتایا گیا ہے کہ کسی ملک کی تاریخ، جغرافیہ اور آب و ہوا سے کٹ کر وہاں کی زبان میں ہونے والے ارتقاء کے تدریجی عمل اور لسانی تبدیلیوں کو سمجھنا نا

ممکن ہے۔ مولانا اس بارے میں یوں رقم طراز ہوتے ہیں :

"کسی زبان کی نکتہ فہمی کا حق ادا نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے ملک کی تاریخ، جغرافیہ، ملکی حالات اور اہل ملک کے عادات و اطوار سے بخوبی واقفیت نہ ہو۔ زبان فارس میں زیادہ خصوصیت یہ ہے کہ اس کی شیرینی گفتار نے اس میں بہت سے نازک اور باریک لطف پیدا کر دیئے ہیں۔ اسی سبب سے اس کی اصطلاحوں اور اشاروں کنایوں کا کچھ شمار نہیں۔ مختلف زبانوں کے پرکھنے والوں نے زبان مذکور میں یہ جوہر خاص پایا ہے کہ اس کے ہر فقرے میں ایک نکتہ ہے"۔

دوسرا لیکچر ملک فارس کی پرانی زبانوں کے حالات پر مشتمل ہے اس میں انہوں نے فارسی کی قدیم کتابوں ژند، پاژند اور اوستا کا تفصیلی جائزہ لے کر ان کی زبان اور مروجہ فارسی کے درمیان موجود فرق کو واضح کیا ہے۔ علاوہ ازیں خوردہ اوستا اور دساتیر نامی کتب کے بارے میں بھی مولانا کے تحقیقی خیالات اس لیکچر کے ابتدائی حصہ کی زینت ہیں۔ بعد ازاں انہوں نے زبان فارسی کے متعلق مقامی درسی کتب میں پائی جانے والی معلومات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فارس کی زندہ زبان اپنی تاریخ کے بتانے میں مردہ زبان سے کم نہیں۔ بڑے بڑے محقق گزرے۔ مگر جو ہیں، یہی لکھتے ہیں کہ فارسی زبانیں سات قسم کی ہیں۔

(i) فارسی : جو زندہ ہے اور اپنا کام کر رہی ہے۔

(ii) دری : فارسی زبان کی بدولت برائے نام زندہ ہے۔

(iii) پہلوی : فارسی زبان کی بدولت برائے نام زندہ ہے۔

(iv) ہروی : ہرات اور اس کے علاقہ کی زبان ہوگی۔

(v) سکری : سیستان کو عہد قدیم میں سکری کہتے تھے، یہاں کی زبان ہوگی۔

(vi) زاولی : قندھار اور غزنی وغیرہ شہرہائے خراسان کی زبان ہو گی۔

(vii) سغدی : سمرقند کے قرب وجوار کی زبان سغدی کہلاتی ہو گی۔

اس کے بعد مولانا محمد حسین آزاد نے بالترتیب دری، پہلوی اور فارسی زبانوں، ان کے ادبیات اور لسانی تبدیلیوں سے بحث کی ہے۔ انہوں نے مذکورہ زبانوں میں باہمی مماثلتیں بھی دیدہ ریزی سے تلاش کر کے تشنگان علم وادب کے سامنے لا رکھی ہیں۔ یہ لیکچر فارسی زبان اور خطہ فارس کی قدیم تاریخ پر مولانا کی گہری نظر اور دستگاہ کا آئینہ دار رہے۔ اس بحث کو مولانا عربوں کے ایران پر حملوں کے عہد تک لے کر آئے ہیں۔

حصہ دوم کا لیکچر سوم فارسی نثر کی زبان کی ان تبدیلیوں کی نشاندہی کرتا ہے، جو اسلامی حملوں کے بعد رونما ہوئیں۔ ابتداء میں مولانا اپنی زبان کے جوہر کچھ یوں دکھاتے ہیں :

"عزیزان وطن ! گذشتہ لیکچر میں آپ نے سن لیا کہ جب اسلام کا قدم زمین فارس پر آیا تو فارس کی زبان کیا تھی ـــــ تقریباً تین سو برس تک مذکورہ زبان موت کی نیند سوتی رہے۔ لیکن دوسری صدی ہجری سے عباسیہ کا دور تھا کہ عیاشی نے خلافت کو سلطنت بنایا اور غفلت نے سلطنت کو ضعیف کرنا شروع کیا۔ خلفاء فقط دارالاسلام بغداد میں تبرک بن کر رہ گئے ـــــ زبان فارس کے لئے قدرتی سامان یہ ہوا کہ سامانیوں نے قومی سلطنت کا نشان قائم کیا۔ امیر اسماعیل سامانی نے ترکستان، خراسان، اصفہان وغیرہ پر حکومت پھیلادی۔ جب تک خاص عرب حاکم تھے تب تک عربی زبان ملکی زبان کو دبائے رہی۔ اب حاکم وقت خود اسی خاک کا پتلا ہوا۔ وہ بہرام چوبیں کی اولاد تھا۔ جس طرح عرب کو اپنی عربی کی محبت تھی۔ اسی طرح اسے اپنے

باپ دادا کی زبان کی محبت ضرور ہوگی۔ غرض خواہ اس محبت سے، خواہ ملکی مصلحت سے اس نے عربی زبان کی وہ پابندی نہ رکھی ہوگی، جواب تک تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔342 ہجری میں تمام دفتر فارسی ہوگئے۔"

350 ہجری میں منصور سامانی کا وزیر نے تاریخ طبری کا فارسی میں ترجمہ کیا۔ فارسی شاعری کا باوا آدم رودکی غزلیں اور قصیدے لکھتا نظر آنے لگا۔ کچھ عرصہ بعد محمود کے دور میں بہت سے کتابیں تصنیف و تالیف و ترجمہ ہوئیں، جیسے تاریخ بہیقی وغیرہ۔ اس دور میں عسجدی، عنصری اور فرخی جیسے شاعروں نے درباروں میں فارسی شاعری کے پرچم لہرائے۔ اس دور کی نثر میں عرب بالادستی کے تین سو برس گزرنے کے بعد بھی چھوٹے چھوٹے فقرے مطلب کو ادا کرتے ہیں۔ تصانیف میں رنگ آمیزی مطلق نہیں، جو ہیں، مطلب کی باتیں ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد کے اس لیکچر سے معلوم ہوتا ہے کہ 400 ہجری کے بعد فارسی میں فلسفہ و حکمت کے حوالہ سے بھی کافی کام ہوا۔ اس عہد میں بو علی سینا اور 450 ہجری کے قریب شاہ ناصر خسرو جیسے نامور علماء اور مفکر پیدا ہوئے۔ صاحب کتاب نے اس لیکچر میں تاریخ بہیقی، چہار مقالہ مقامات حمیدی، تاریخ جہانکشا، گلستان اور اخلاق ناصری جیسی نادرو مشہور کتب کی زبان کا مطالعہ پیش کرنے کے علاوہ 700 ہجری تک کی لسانی تبدیلیوں کا احاطہ بھی کیا ہے۔

"سخن دان فارس" کا چوتھا لیکچر "فارس کی زبان مروجہ میں دوسرا انقلاب" کے نام سے ہے۔ اس لیکچر میں مولانا نے اس تبدیلی کا ذکر کیا ہے جس کے تحت فارسی زبان میں عربی کی آمیزش اور صنائع وبدائع کی بھرمار ہوئی علاوہ ازیں زبان دانی کے جوہر دکھانے کی شعوری کوشش نے مطالب کا فقدان اور الفاظ کی بھرمار کردی۔ اس عہد کی فارسی نثر میں رنگین الفاظ تو نظر آتے ہیں لیکن مطالب ندارد۔ ایک بات کو درجنوں فقروں میں بڑے اہتمام اور تکلف کے ساتھ بیان کیا جانے لگا۔ یہ تبدیلی 700 ہجری

سے 800 ہجری کے دوران رونما ہوئی اور اس کا تسلط آئندہ کئی صدیوں تک رہا۔ اس لسانی انقلاب نے فارسی زبان سے قدیم عمدہ اوصاف چھین کر اسے تکلفات کی نذر کر دیا۔ بعد میں تیرہویں صدی ہجری کے آخر میں دوبارہ فارسی زبان کو عربی اثر سے نکالنے کی تگ ودو شروع ہوئی۔

پانچویں لیکچر میں ملک فارس کے رہنے والوں کے اعتقادات اور رسوم ورواج کے علاوہ توہمات، مقامی نفسیات، روایات اور قصہ جات وغیرہ کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ جائزہ فارسی تہذیب وتمدن کے تناظر میں فارسی انشاء پردازی کی ساخت اور اس میں بتدریج نمایاں ہونے والی مثبت ومنفی تبدیلیوں کو سمجھنے میں نمایاں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

چھٹے لیکچر میں مولانا نے واضح کیا ہے کہ اسلام کی ایران میں آمد کے بعد مقامی لوگوں کے رہنے سہنے کے طریقوں، اطوار، عادات، روزمرہ کے وظائف، باہمی تعلقات، رسومات، آداب، طریق نشست وبرخاست، خیالات اور تفکرات میں کیا کیا اہم تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ انہوں نے جس عہد کا جائزہ لیا ہے اس عہد کے ادبی نمونوں کی زبان سے جاری یا وقوع پذیر ہو چکی تبدیلیوں کی مثالیں بھی فراہم کی ہیں۔ یہاں وہ اس نظریہ کو واضح کرتے نظر آتے ہیں کہ سماجی، معاشرتی، سیاسی، تمدنی اور تہذیبی طور پر اجتماعی تبدیلیاں شخصی طور پر بھی افراد کو متاثر کرتی ہیں اور ادب کا ان کی دست برد سے بچے رہنا ناممکنات میں سے ہے۔ وہ اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ زبان بولنے والوں کے مزاج میں ذرا سی تبدیلی بھی زبان پر اثر انداز ہونے کی بھرپور طاقت رکھتی ہے۔ اس لئے کسی عہد کی زبان کا مطالعہ کرنے کے لئے اس عہد کا مطالعہ کرنا ناگزیر امر ہے۔

ساتویں لیکچر میں مولانا محمد حسین آزاد نے واضح کیا ہے کہ کسی خطہ کے موسم اور سرزمین اس کی انشاپردازی اور زبان پر کیسے اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس حوالہ سے انہوں نے عرب، فارس اور ہندوستان کے علاوہ دیگر کئی ممالک کے موسموں اور ساخت ارض کی مثالیں ادبی نمونوں سے بہم پہنچا کر اپنی بات کا ثبوت فراہم کیا ہے۔

زبان فارسی کا انداز اور زبانوں کے انداز سے کیا نسبت رکھتا ہے۔ اس حوالہ سے آٹھویں لیکچر میں مولانا نے اپنی تحقیقی تحریر کے جلوے دکھائے ہیں، لکھتے ہیں :

"۔۔۔۔ جو لیکچر اب تک دیئے گئے وہ گویا فرش، میزیں، کرسیاں اور لیمپ تھے کہ ان پر آج کا مضمون جلوۂ زیبائی دکھائے۔ اس زبان کی تعریف میں (فارسی مراد ہے) ایشیائی زبانوں کے اہل ذوق کبھی کہتے ہیں کہ "فارسی شیریں زبانیست۔" کبھی کہتے ہیں "فارسی شکراست، ترکی ہنراست، ہندی نمک است۔" لطف یہ ہے کہ یورپ کے زبان دانوں نے بھی اس کی منفرد طرز ادا کو مانا ہے"۔

یہاں مولانا یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ فارسی نے دوسری زبانوں سے اگر الفاظ لئے بھی ہیں تو انہیں متعدد صورتیں اور شکلیں دیکر اپنی زیبائی کا معاون بنایا ہے اور یہ خصوصیت کسی اور زبان میں کم ہی نظر آتی ہے۔

نواں لیکچر ان تبدیلیوں کی نشاندہی کرتا ہے جو عرب زبان سے فارسی کے اختلاط کے باعث ظہور میں آئیں جبکہ دسواں لیکچر وہ رنگ ہمارے سامنے بکھیرتا ہے جو ہندوستان میں آمد کے بعد فارسی زبان پر چڑھے۔

"نظم فارسی کی تاریخ" کتاب مذکورہ میں شامل گیارہواں اور آخری لیکچر ہے۔ جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے اس میں مولانا محمد حسین آزاد کی تیز رو قلم نے ابتداء سے لے کر عہد جاریہ تک فارسی نظم کے ارتقاء اور زبان کے مدو جزر پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے فارسی شعراء کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ دور اول میں رودکی، اسدی طوسی اور فردوسی وغیرہ۔ دور دوم میں خاقانی، انوری اور نظامی وغیرہ۔ دور سوم میں سعدی اور حافظ جبکہ دور چہارم میں جلال اسیر، قاسم مشہدی اور قاسم دیوانہ وغیرہ شامل ہیں۔ مولانا نے ان چاروں ادوار کے شعراء کے کلام کا لفظ بہ لفظ جائزہ لے کر عہد

بہ عہد نظم میں آنے والی لسانی تبدیلیوں کی نشاندہی کی ہے۔

ممتاز نقاد ڈاکٹر محمد صادق مولانا محمد حسین آزاد اور سخن دان فارس کے بارے میں یوں اظہار رائے کرتے ہیں:

> ۔۔۔ ایک اعتبار سے آزاد جدیدیت کا پیش رو ہے۔۔۔ سخن دان فارس کے بارے میں میری آخری رائے یہی ہے کہ اسلوب اور مضامین کے لحاظ سے یہ ایک وقیع تخلیق ہے۔ اس کے مطالب کی گہرائی اور گیرائی کے باوجود اس کی دلچسپی میں ذرا فرق نہیں آتا اور قاری بے تکان پڑھے جاتا ہے۔ گویا وہ گہرے مضامین کی کھتونی نہیں بلکہ ایک افسانہ ہے"۔

قارئین! حقیقت تو یہ ہے کہ نہ مولانا محمد حسین آزاد باذوق علمی حلقوں میں تعارف کے محتاج ہیں اور نہ ان کی تخلیقات۔ "سخن دان فارس" بھی ان کی ایسی ہی تخلیق ہے، جس کی اہمیت ہر نئے دن کے ساتھ مزید بڑھتی جائے گی۔ امید ہے کہ یہ مختصر تحریر آپ کو "سخن دان فارس" کے تفصیلی مطالعے کے لئے ضرور آمادہ کرے گی۔

نعیم احسن

تمہید

سخندان فارس مدت سے پھٹے پرانے کپڑوں میں پڑا سوتا تھا۔ کم فرصتی وقت کو ٹالتی تھی۔ یہاں تک کہ کل سے پرسوں اور مہینوں سے برسوں ہو گئے۔ جب بندہ آزاد ایران سے آیا تو ہم زبانی کے جذبوں نے زور کیا۔ مصلحت نے کہا کہ اس وقت ادھر کے خیالات تازے ہیں۔ سب سے پہلے اس پورا کرنا چاہیے۔ ناچار نظر ثانی شروع کی۔ فرصت کم، کام بہت۔ کئی مہینے گزر گئے۔ پھر بھی جس طرح جی چاہتا ہے سرانجام نہ کر سکا۔ جانتا ہوں کہ حالت موجودہ اس کی مشتہر کرنے کے قابل نہیں۔ مگر کیا کروں اِنتظار فرصت میں 15 برس گزر گئے۔ اب اہل طلب کے تقاضے غالب اور دل مغلوب مروت ہے۔ خدا کے سپرد کر کے مطبع کے حوالے کرتا ہوں۔ الٰہی حسن قبول روزی کر۔

دعا کا محتاج

بندۂ آزاد محمد حسین عفی عنہ

5 اگست 1887ء

حصہ اوّل

سخندانِ فارس

یورپ میں علم زبان کے شوقینوں نے ملک ملک کی زبانیں سیکھ کر انواع و اقسام کے فائدے حاصل کیے۔ ایک ان میں سے یہ ہے کہ مختلف زبانوں کے معائنے اور مقابلہ سے ان کی قوموں، نسلوں اور ان کے باہمی رشتوں کے پتے نکال لیے۔ اس دریافت کا سلسلہ دیکھنے کے قابل ہے کہ کہاں سے سراغ نکلا اور کیونکر قدم بہ قدم آگے چلا۔ افسوس کہ عزیزان وطن کو ان باتوں کا شوق نہیں۔ نہ زمانہ فرصت دیتا ہے۔ جن لوگوں نے اس کام میں مہارت پیدا کی ہے، وہ لفظوں کو دیکھ کر صاف پہچان لیتے ہیں کہ یہ فلاں زبان کا لفظ ہے۔ جس طرح کوئی سیاح مردم شناس ناواقف شخص کو دیکھ کر کہہ دیتا ہے کہ فلاں ولایت کا آدمی ہے۔

خیالات کی ترقی نے قدم آگے بڑھایا تو نظر آیا کہ جن جن قوموں کے الفاظ ملتے جلتے ہیں، اگرچہ آج جدا جدا ہیں اور دور دراز ملکوں میں رہتی ہیں اور ان کی زبانیں بھی غیر زبان کہلاتی ہیں، مگر ایک زمانہ ضرور ہوگا کہ جس میں ان کی ایک زبان ہو گی۔ اسی کے الفاظ ایک گھرانے کے آدمی ایک گھر میں رہ سہ کر بولتے ہوں گے اور ایک ہی الفاظ گھروں کے کاروبار میں کام دیتے ہوں گے۔ یا یہ دونوں زبانیں ایک زبان سے اس طرح نکلی ہوں گی جس طرح ایک ماں باپ کی دو بیٹیاں جدا ہو گئیں۔ قسمت کی گردش نے بھائی بندوں کو کہیں سے کہیں پھینک دیا۔ پھر جس طرح ملکوں کی آب و ہوا آدمیوں کے رنگ روپ، ڈیل ڈول، رسم و رواج بدل دیتی ہے۔ اسی طرح لہجوں، آوازوں اور تلفظ کے فرق سے ان کے لفظوں کے ڈیل ڈول اور عبارتوں کے جوڑ توڑ میں فرق آ گیا۔ تم روز دیکھتے ہو کہ ایک دادا کی اولاد سے لڑکے بالے پھیل کر رنگ برنگ کے اشخاص ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح سمجھ لو کہ ان کی زبان کی ایک اصل تھی جن سے لفظوں کی اولاد

اور نسلیں پھیل کر نئی مخلوقات پیدا ہو گئی جو ایک الگ زبان معلوم ہوتی ہے۔

میری غرض یہاں اس مبارک نسل سے متعلق ہے کہ کسی زمانے میں ایک گھرانے کی ولادت، ایک گھر کے رہنے سہنے والے، ایک بولی کے بولنے والے، ایک مذہب کے ماننے والے، ایک ریت رسم کے برتنے والے گروہ گروہ اور انبوہ انبوہ وطن چھوڑ کر روانہ ہوئے۔ ایک قطار نے ہند کا رخ کیا، ایک نے ایران کا۔ ان دونوں کی زبانیں گویا ایک ماں کی دو بیٹیاں۔ جو بہن ہند میں پلی ہندو ہو گئی، جس نے ایران میں پرورش پائی ایرانی کہلائی۔

باوجودیکہ ہزاروں برس کی جدائی اور سلطنتوں کے انقلاب نے رشتوں کو فرسودہ کر دیا۔ سب رنگ خاک میں مل گئے اور فارسی قدیم کو فارسی حال سے مقابلہ کرو تو ایسی ہو گئی جیسے سنسکرت بھاشا اور اردو۔ اس پر بھی جب ژند پاژند، پہلوی، دری اور پھر سنسکرت میں آگاہی پیدا کرتے ہیں، تو قیافہ شناسوں کو بہت لفظوں کے چہروں پر ایک نسل کے خط و خال جھلکتے معلوم ہوتا ہے گویا ایک خاندان کے لوگ ہیں۔ ہاں قد و قامت اور رنگوں میں فرق آ گیا ہے۔ اپنی اپنی وضع کے لباس پہنے سامنے پھرتے ہیں۔

ڈیڑھ سو برس ہوئے کہ ٹیک چند بہار اور خان آرزو دو فلسفی لغت فارسی کے دلی میں پیدا ہوئے۔ یہ فارسی زبان کے ماہر تھے۔ اور ہندی ان کے وطن کی زبان تھی۔ دونوں زبانوں کے مقابلہ کرنے کا آسان موقع تھا۔ اس لئے ہزاروں برس کا مٹا ہوا سراغ صاف نکل آیا۔

1783ء میں سر ولیم جونس نے ہندوستان میں آکر سنسکرت اور فارسی پڑھی۔ خدا جانے صاحب نے اپنی طبیعت کے لگاؤ سے یا ان دونوں کی تصنیفات سے یہ نکتہ پایا۔ غرض انہوں نے ولایت میں جا کر چرچا پھیلایا اور وہاں کے زباں دانوں سے نئی دریافت کا تمغا حاصل کیا۔

مجھے اس تحقیقات کا شوق نہیں، جنون ہے۔ لڑکپن میں بھی لفظوں کے حروف کو ہیر پھیر، اول بدل کر فارسی اور سنسکرت کے لفظوں کو ملایا کرتا تھا۔ اس زبان میں تھوڑی تھوڑی معلومات بھی پیدا کی۔ بڑی کوشش سے ژند، پہلوی اور دری کی کتابیں جو

مل سکیں بہم پہنچائیں۔ انہی کے لئے بمبئی گیا پھر ایران تک سفر کیا۔ کئی موبدوں اور دستوروں سے ملا۔ ایک برس وہاں رہا لیکن افسوس یہ ہے کہ فائدہ بہت کم حاصل ہوا۔

اہل یورپ نے اس تحقیقات کو بہت پھیلایا ہے۔ شرم کی بات ہے کہ اتنی دور کے لوگ اتنی کوششیں کریں اور ہم اپنے پیارے وطن اور عالی نژاد بزرگوں کی زبان سے ایسے بے غرض اور بے پروا رہیں۔ جو کچھ آزاد کی ناتمام تحقیق نے میدان تلاش میں دانہ دانہ چن کر سرمایہ بنایا ہے قلم کی معرفت کاغذ کے حوالہ کرتا ہے۔ یہ سینہ صاف امانت دار ہے۔ دیانت سے اہل طلب تک پہنچادے گا۔ اور چونکہ اس ضروری مطلب کی بنیاد فن فیلالوجیا (زبانوں کی فلسفی تحقیقات) پر ہے، جو ابھی اکثر عزیزان وطن تک نہیں پہنچا، اس لئے پہلے اس کے ضروری اصول لکھتا ہوں۔ اس طرح کہ بیان فضول اور خیالات کو طول نہ ہو لیکن مطلب کی بات رہ بھی نہ جائے۔

فیلالوجیا

لغات اور زبانوں کی فلسفی تحقیقات کے اصول

یہ ایک قدیمی فن فلاسفہ یونان کا ہے۔ اس سے مختلف زبانوں کی اصلیں اور ان کا تعلق ایک دوسرے سے معلوم ہو جاتا ہے۔ عرب اور فارس جہاں سے پہلے ہمیں علوم کے ذخیرے ملے۔ ان میں اس کے اصول و فروغ کا پھیلاؤ بہت نہیں ہوا اور جس قدر ہوا گم ہو گیا۔ اب جو کچھ ہے انگریزی میں ہے۔ وہ اسے فلولوجی کہتے ہیں لیکن اگر کوئی رسالہ اس کا ترجمہ ہو تو امید نہیں کہ ہموطن بھائیوں کا دل روشن کر سکے کیونکہ انگریزی کے مصنف کئی کئی زبانوں کے ماہر ہوتے ہیں وہ ہر زبان کی طاقت اس میں خرچ کرتے ہیں اور انگریزی، یونانی، لاطینی، عبرانی وغیرہ پر بنیاد رکھتے ہیں۔ یہاں ان طرفوں میں اندھیرا ہے۔ ہم لوگوں کو کچھ نظر نہیں آتا۔ اس لئے میں فارسی اور سنسکرت لفظوں کی چقماق سے آگ نکالوں گا۔ امید ہے کہ کچھ نہ کچھ اجالا ہو گا۔ ایشیائی زبانوں میں تحقیقات فلولوجی کا ابھی تک رواج نہیں ہوا۔ اہل یورپ نے اسے یونان سے لیا تھا۔ اس واسطے علم مذکور کا نام فلولوجی چلا آتا ہے (فلسفۃ اللسان) اب میرے دوست مجھے چند منٹ کے لئے اجازت دیں کہ اول چند مطالب بیان کروں جن سے معلوم ہو کہ زبان جس سے تقریر یا گویائی مراد ہے وہ کیا شے ہے؟

وہ اظہار خیال کا وسیلہ ہے کہ متواتر آوازوں کے سلسلہ میں ظاہر ہوتا ہے جنہیں تقریر یا سلسلہ الفاظ یا بیان یا عبارت کہتے ہیں اسی مضمون کو ایک شاعرانہ لطیفہ میں ادا کرتا ہوں کہ زبان (خواہ بیان) ہوائی سواریاں ہیں جن میں ہمارے خیالات سوار ہو کر دل سے نکلتے ہیں اور کانوں کے رستے اوروں کے دماغوں میں پہنچتے ہیں۔ اس سے رنگین تر مضمون یہ ہے کہ جس طرح تصویر اور تحریر قلم کی دستکاری ہے، جو آنکھوں سے نظر آتی، اسی طرح تقریر ہمارے خیالات کی زبانی تصویر ہے جو آواز کے قلم نے ہوا پر کھینچی

ہے۔ وہ صورت ماجرا، کام، مقام اور ساری حالت کانوں سے دکھاتی ہے۔

خیالات کا مرتبہ زبان سے اول ہے لیکن جب تک وہ دل میں ہیں ماں کے پیٹ میں ادھورے بچے ہیں تقریر میں آ کر پورے ہوتے ہیں اور تحریر کا لباس پہن کر بھر پور۔ لوگ جو خیالات سے مطلب نگاری اور نکتہ پردازی میں جان کھپاتے ہیں اس نکتہ کو انہی کا دل جانتا ہے۔

دنیا میں اظہار مراتب کی کارروائی تین طرح سے ہو سکتی ہے۔ اشارات، تقریر اور تحریر۔ ان میں زبان یعنی تقریر اپنی توضیح کی زیادتی اور محنت کی کمی سے اول لمبر ہو گئی ہے اور حق پوچھو تو کارروائی کے لئے سب برابر ہیں۔ اب یہ کہو کہ زبان کیونکر پیدا ہوئی؟ سبحان اللہ! ہر مذہب کی کتاب یہی خبر دیتی ہے کہ ہماری زبان خاص خدا کی طرف سے نازل ہوئی ہے یہ ہمیں ساتھ لے کر بہشت میں جائیگی اور اسی کے ذریعے سے ہم اہل جنت سے باتیں کریں گے[1]۔ لیکن غور کر کے دیکھو تو صانع مطلق نے اپنی صنعت کاملہ سے انسان ایک ایسا طلسم قدرت بنایا ہے کہ وہ خود زبان پیدا کر سکتا ہے اور یہ راز خیال کو وسعت دینے سے کھلتا ہے۔

ہے انساں صانع قدرت کا اک صندوق سر بستہ
ولیکن یہ نہیں کھلتا کہ اس میں بولتا کیا ہے

راہ تہذیب کے مسافرو! ذرا ابتدائی آفرینش کی طرف مڑ کر نگاہ کرو کہ انسان پیدا ہوا ہے۔ اس میں دل ہے، دماغ ہے، خیالات ہیں اور سب طرح کی ضرورتیں بھی ہیں، مگر اظہار مطلب کا اوزار نہیں۔ وہ کیونکر گزارہ کرتا ہوگا؟ اچھا آج جو انسان بے زبان ہیں اور پہلے سے سو درجے زیادہ ضرورتیں رکھتے ہیں انہیں دیکھو کیا کرتے ہیں؟ وہ کون؟ گونگے کہ اپنے اشاروں میں دنیا کی کوئی بات نہیں چھوڑتے، سب کچھ کہہ دیتے ہیں۔ اور گونگوں پر کیا منحصر ہے تم خود اکثر نہیں بولتے، سر کو آگے کو ہلا کر ہاں ظاہر کر دیتے ہو۔ دونوں شانوں کی طرف ہلا کر نہیں اور غور کرو تو یہ طبعی حرکت ہے۔ گھوڑے، ہاتھی وغیرہ چارپائے جب مالک کا ارادہ ماننا نہیں چاہتے، تو کس طرح سر جھٹر جھٹرا کر سر کشی سے انکار دکھاتے ہیں۔ شوق سیاحت مجھے خود کئی ملکوں میں لے گیا جہاں میں گونگا

تھا کیونکہ نہ میں کسی کی سمجھتا تھا، نہ کوئی میری۔ وہاں گذارہ کا وسیلہ اشارے ہی تھے۔ انسان جوش ہائے مختلف کا تھیلا ہے۔ جب کسی بات میں ناراض یا خفا ہوتا ہوگا تو اس کی طبیعت سخت آواز نکالتی ہو گی۔ نہیں، غراتا ہو گا۔ تم جانتے ہو کہ سمجھ بھی اپنے اپنے درجہ میں ہر جاندار کو ملی ہے۔ کتے، بلی کو دیکھو جب تمہیں خوش کرنا چاہتے ہیں، تو کن کن حرکتوں اور جنبشوں سے لگاوٹ کرتے ہیں اور کیسی مہین مہین نرم نرم آوازیں سناتے ہیں۔ اسی طرح ابتدائی انسان بھی دوسرے کا غصہ دھیما کرنے کو عجز و نیاز کی حرکات کام میں لانے لگا ہو گا۔ گونگوں کو بھی دیکھ لو اپنے اشاروں کو رنگ برنگ کی آوازوں سے مدد پہنچاتے ہیں۔

تم اب بھی کتے، بلی اور سانپ وغیرہ جانوروں کے ڈرانے یا ہٹانے کے لئے لکڑی کھٹ کھٹا کر کام لیتے ہو۔ کبھی دوسرے شخص کو ہشیار یا آگاہ یا اپنی طرف متوجہ کرنے کو تالی بجا کر، چچکار کر، کھنکھار کر آگاہ کرتے ہو۔ آواز کا سمجھ جانا جاندار مخلوق کی طبیعت میں داخل ہے۔ جو جو بولیاں بول کر آپس میں سمجھتے سمجھاتے ہونگے، وہ تو خدا ہی جانے۔ مگر بلی کو دیکھو، کسی ملک کی ہو، خواہ غافل سوتی ہو، خواہ کسی طرف جاتی ہو۔ جب پچش پچش کر کے آواز دو گے، فوراً دیکھنے لگے گی۔ کتا کسی ولایت کا ہو جب تم چس چس کر کے آواز دو گے، ضرور چوکنا ہو کر دیکھنے لگے گا، بلکہ محبت کی دم بھی ہلانے لگے گا۔ یہ عموماً بازاری کتوں کا حال ہے اور جو تعلیم یافتہ ہیں ان کا تو کیا کہنا!

جب یہ بات قرین قیاس ٹھیری کہ انسان بھی ابتدائے آفرینش میں اشاروں سے سمجھتا سمجھاتا تھا تو یہ بھی ظاہر ہے کہ سوچنے اور ایجاد کرنے کی لیاقت اسے خدا نے دی تھی۔ برس دو برس کے بچوں دیکھو فقط چیخیں ہی مارتے ہیں یا مہمل آوازیں کام میں لاتے ہیں۔ جس بات کو جی چاہتا ہے یا کچھ مانگتے ہیں یا نہیں کرنا چاہتے ہیں تو انگلیوں کے اشاروں سے سر کے ہلانے سے اور اٹھ اٹھ نے کر کے تمہیں اپنی خواہشیں جتا دیتے ہیں۔ رفتہ رفتہ کچھ کچھ اور آوازیں بھی ٹھیرا لیتے ہیں۔ مثلاً پانی کے لئے مم مم اور کھانے کو پہ پہ یا ہپہ وغیرہ وغیرہ۔ تم نے دیکھا! اعضائے تکلم میں ہونٹ سب سے زیادہ نرم ہیں۔ ذرا سے ارادہ میں ہل جاتے ہیں۔ انہی سے یہ صدائیں نکلی ہیں، نہ کہ مسوڑوں

سے یا ناک سے یا کان سے۔ رفتہ رفتہ کچھ اور آوازیں نکالنے لگتے ہیں یا سیکھ جاتے ہیں۔ البتہ ان کے استاد یار ہنما بھی ہوتے ہیں (وہ کون؟ یہی گھر والے) اور یہ آوازیں بھی اول ان چیزوں اور ان آدمیوں پر کام آتی ہیں جو ان کے آس پاس ہوتے ہیں۔

اسی طرح فرض کرو کہ آفرینش عالم طفولیت میں ہے اور ایک جگہ دو چار ہی آدمی رہتے ہیں۔ اس وقت ان کے کیا معاملات؟ اور کیا سامان ہیں؟ ایک پہاڑ کے بن مانس یا صحرا کے حبشی پر خیال کرو کہ اس کے پاس ایک ہڈی ہے وہ اس میں سے گوشت نوچ نوچ کر کھا رہا ہے۔ فرض کرو ایک ویسا ہی جنگلی اس پر ہاتھ بڑھا کر، آنکھیں نکال کر، گردن کو اینٹھا کر غرایا تو پہلا جنگلی ضرور سمجھ گیا ہوگا کہ یہ ہڈی چھیننی چاہتا ہے۔ اگر بر خلاف پہلی حالت کے اوں اوں کر کے، زم زم مہین آواز نکالی اور غریبی کا رنگ دکھا کر آنکھیں چندھیائیں اور آہستہ آہستہ ہاتھ بڑھایا تو وہ سمجھ گیا ہوگا کہ یہ بے چارا بھوکا ہے۔ عاجزی سے ہڈی مانگتا ہے۔ اور یہ حالتیں تم روز اکثر حیوانوں میں مشاہدہ کرتے ہو۔ بعد اس کے کھانے پینے کے علاوہ اور چیزوں کے لئے بھی آوازیں مقرر ہو گئی ہوں گی۔ پھر رفتہ رفتہ لفظ پیدا ہو گئے ہوں گے۔

تاریخی لطیفہ: اکبر کے دربار میں گفتگو ہوئی کہ انسان کی اصلی زبان کیا ہے؟ ایک مکان عالیشان شہر سے الگ تجویز ہوا۔ چند حاملہ عورتوں کو وہاں رکھا۔ گونگی انائیں مامائیں، گونگے خدمتگار باہر کے لئے نوکر کئے۔ جب بچے پیدا ہوئے تو ماؤں کو الگ کر کے بے زبانوں کو گونگی اناؤں کے سپرد کر دیا۔ پرورش کی ضروریات سب حاضر اور حکم تھا کہ کوئی بولتا آدمی ان کے پاس نہ پھٹکنے پائے۔ جب بچے چار چار پانچ پانچ برس کے ہوئے تو بادشاہ خود گئے۔ بچوں کو سامنے لا کر چھوڑ دیا۔ سب جنگلی جانوروں کی طرح غائیں پائیں کرتے تھے، ایک بات سمجھ میں نہ آتی تھی۔

تم ننھے ننھے بچوں کو دیکھتے ہو؟ جو چیزیں انہیں نظر آتی ہیں اور انہی سے کام پڑتے ہیں انہی کے لئے سب سے پہلے اشارے اور آوازیں بھی قرار دیتے ہیں۔ ان میں سے سب سے اول پیاری ماں اور پیارا باپ ہوتا ہے یہ بھی ظاہر ہے۔ بچوں کے اعضا کا جز جز قابو میں نہیں ہوتا کہ حروف میں امتیاز اور فرق پیدا کر سکیں۔ سب سے آگے وہی ہونٹ

ہیں، انھیں میں حرکت پیدا ہوتی ہے اور بچہ کہتا ہے م م ب ب اس بات کو میں بھی تسلیم کرتا ہوں کہ اختلاف وطن اور آب وہوا کے فرق سے طبیعتوں میں بھی فرق ہوتا ہے لیکن چونکہ انسانیت کے لحاظ سے سب ایک تھے، اس لئے دیکھو! طبیعت کے استاد نے سب کو ایک ہی نام سکھایا اگرچہ ذرا ذرا سا فرق ہو گیا ہے۔

لیکن تقریباً سب زبانوں میں ماں باپ کے نام سے جو بچہ سب سے پہلے سیکھتا ہے ایسے اصوات سے مرکب ہیں جن کا تلفظ ہونٹوں کی جنبش یا محض منہ کھول کر آواز نکالنے سے ہوتا ہے۔ مثلاً:

انگریزی میں باپ کو پاپا کہتے ہیں، ماں کو ماما
عربی میں باپ کو اب۔ یا ابا کہتے ہیں، ماں کو ام
فارسی میں باپ کو بابا کہتے ہیں، ماں کو مام

اشارات میں دیکھ لو، طبیعت انسانی کا اتحاد ہر ملک کے بچہ سے اشارہ کے لئے پہلے انگلی اٹھواتا ہے پھر آواز سے کہلواتا ہے یہ یہ۔ پھر پاس کے لئے یہ اور دور کے وہ ہو جاتا ہے۔

بچہ پہلے چیزوں کے نام یعنی اسماء سیکھتا ہے۔ اسی واسطے جب کوئی چیز لینی چاہتا ہے، تو فقط اسی کا نام لے کر پکارتا ہے۔ بھوکا ہوتا ہے تو دو دو دو دو دو کہتا ہے۔ پیاسا ہوتا ہے تو فقط مم مم کہتا ہے۔ مٹھائی کو جی چاہتا ہے تو چیجی بلکہ چی کہتا ہے۔ جب گویائی میں ذرا زور رفتار پیدا ہوتا ہے تو فعل بھی لگانے لگتا ہے مگر غلط سلط۔ رفتہ رفتہ حروف لگا کر باتیں کرنے لگتا ہے۔ زبان کے انجان پردیسیوں کو دیکھا اور خود سیاحتوں میں تجربہ ہوا کہ غیر ملک میں جا کر لین دین کام کاج میں پہلے فقط اسموں سے کام نکالنا پڑتا ہے۔ مثلاً روٹی چاہئے تو پیسے دکھاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نان، یعنی پیسے موجود ہیں روٹی دو۔ دکاندار روٹی دکھاتا ہے اور انگلی کا اشارہ کرتا ہے یعنی ایک پیسا یا دو پیسے۔ اسی طرح گھی، نمک وغیرہ چند روز کے بعد کچھ فعل یاد ہو جاتے ہیں، حرف سیکھ لیتا ہے۔ اسی کہنے سننے میں آدھے سارے جملے جوڑنے لگتا ہے۔ باعتبار ولادت کے اشارت کا نمبر اول تھا، لیکن کلام بہت اچھی کارگزاری کرتا ہے۔ اس لئے زبان اس پر چرب ہوئی اور ادائے مطلب کا کام

اٹھالیا۔

الفاظ جن سے زبان کا کام چلتا ہے کیونکر پیدا ہوئے؟

ایک گروہ کثیر ایک ہی دادا کی اولاد ہو، لیکن کنبہ کنبہ ایک ایک پہاڑی یا قطعہ زمین پر الگ الگ بستے ہوں تو ضرور ہے کہ ضرورت وقت یا قدرتی اتفاق ان میں نئی چیزیں پیدا کریں اور ظاہر ہے کہ ہر مقام میں ایک ہی چیز کا جدا جدا نام پکارا جائے گا۔ کچھ عرصہ کے بعد ایک ہی چیز کے لئے مختلف مقاموں کے نام جمع کریں تو ہر چیز کے لئے کئی کئی نام ہوں گے۔ پھر جب کہ سلطنت کا امن یا باہمی ارتباط آمدورفت کے نسا جال پھیلائے اور تعلیم و تربیت عام ہو جائے تو بہت سے نام خود بخود گر جائیں گے اور ہر شے کے لئے ایک نام رہ جائے گا۔ وہ کبھی تو مناسبت کے سبب سے زیبا و برجستہ ہو گا اور کبھی جو بندھ گیا وہی موتی۔ اس وقت یہ ضرور ہے کہ ہر شے کو نام خاص سے پکارنے کے لئے سب کا اتفاق ہو گا۔ اب اگر کوئی پوچھے کہ لفظ کیا شے ہے؟ تو تم کہہ سکتے ہو کہ وہ ایک زبانی تصویر ہے یا پتا نشان ہے کسی چیز کا یا فعل کا۔

دنیا ہمیشہ ترقی کے رستہ میں رواں ہے۔ کیسی ہی ابتدائی حالت ہو، شائستگی پھیلے جائے گی۔ علوم اور فنون کی دستکاری نئی چیزیں پیدا کرے گی۔ لین دین جسے ترقی نے تجارت کا خطاب دیا ہے۔ ایک جگہ کی چیزیں دوسری جگہ پہنچائیں گے کیونکہ چیزیں اور کام نئے ہیں۔ دیکھ لو! یہی سبب ہے کہ دیہات میں الفاظ کم ہوتے ہیں، شہروں میں بہت اور شہری الفاظ کی خوش آوازی، خوش ادائی، اور لطافت گاؤں والوں کو اپنی شاگردی پر مجبوری اور مشتاق کرتی ہے۔ اس کو خاص و عام کا اتفاق کہتے ہیں اور اس سے الفاظ اور اصلاحیں پیدا ہوتی ہیں۔

اب کوئی پوچھے کہ تقریر کیونکر پیدا ہوئی؟ تم صاف کہہ دو گے کہ انسان میں جو چیخنے یا چلانے کی خاصیت ہے، وہ باہمی ضرورتوں اور آپس کے برتاؤ سے اصلاح اور ترقی کرتے کرتے تقریر ہو گئی اور رفتہ رفتہ یہ رتبہ پیدا کیا کہ جس طرح ایک مصور کامل کسی انسان یا باغ یا محل کا نقشہ کھینچ کر اس کی کیفیت آنکھوں کے رستے سمجھاتا ہے صاحب

زبان اپنے مافی الضمیر اور حرکت اعضا کے مجموعہ کو آواز کے رنگ میں کانوں کے رستے سمجھاتا ہے۔ پس گویائی گویا ایک عمدہ آلہ ادائے خیال کا ہے لیکن ناکمل کیونکہ کونسا قادر الکلام ہے جو دل کے خیال کو جوں کا توں پورا پورا اپنے لفظوں میں ادا کر دے۔ عمدہ سے عمدہ کلام دل کے خیالات کی تصویر ہے لیکن ایسے پانی میں ہے جو گدلا ہے، یا عکس ہے ایسے آئینہ میں جو دھندلا ہے۔

تم نے خیال کیا؟ زبان یعنی تقریر گویا انسان کے دل، انسان کی خواہش اور اس کے حرکات اعضائی کا مجموعی خلاصہ ہے۔ اس خیال سے زبان عرب کے ابتدائی محققوں میں عباد بن سلیمان ضمیری نے کہہ دیا کہ "الفاظ اپنے حروف، اعراب اور آوازوں کے ذریعے سے خود بخود اپنے معنی بتلاتے ہیں" مگر یہ رائے عموماً درست نہیں۔ اصفہانی نے شرح منہاج بیضاوی میں لکھا کہ جمہور اہل لغت اس پر اعتراض کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔ اگر یہی بات ہوتی تو ہر شخص ہر لفظ کے معنی سمجھتا۔ بتانے اور لغت میں دیکھنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔ دوسرے اکثر دیکھا جاتا ہے کہ ایک لفظ کے دو معنی ہوتے ہیں۔ جو باہم مخالف ہیں۔ اگر الفاظ بالطبع اپنے معنوں پر دلالت کرتے تو یہ کیونکر ہو سکتا تھا۔ البتہ لفظ بھی بعض جگہ اپنے معنوں پر آپ اشارہ کرتا ہے۔ دیکھو:

تندر (رعد) کو خیال کرو۔ اس لفظ میں گرج زور و شور سنائی دیتا ہے یا نہیں؟

درشت کو دیکھو۔ کرخت پر خیال کرو سختی اور کھر دراپن نہیں پایا جاتا؟

تیر کی ی کو مدّ کشش میں دیکھو۔ صاف نظر آتا ہے کہ کوئی تیز چیز تیز رو ہے کہ سیدھی چلی جاتی ہے۔

خم یا خنب بولنے میں بھی اپنی پھلاوٹ اور گلاوٹ کی تصویر دکھاتا ہے۔

یورپ کے دانا کہتے ہیں کہ پہلے طبیعت کی تاثیر نے حالت کے مناسب آوازیں نکالی تھیں۔ پھر استعمال اور تہذیب نے انہی کو لفظ بنا دیا۔ یہ رائے قرین قیاس معلوم ہوتی ہے۔

چہچہہ۔ بلبل کی آواز کا نام ہوا۔

گوگو۔ فاختہ کی آواز متواتر کا۔

غرش۔ جانوروں کی خفگی کی آواز۔
قہقہہ۔ انسان کی ہنسی۔
غوغا۔ غلغلہ، شوروغل انسان کا ہوا۔

کوہستان خراسان وایران کے کوّے دیکھے۔ چیل سے ذرا چھوٹے ہوتے ہیں اور بولنے میں صاف کلغ کلغ آواز دیتے ہیں۔ کلاغ ان کا نام ہو گیا۔ چغوک اسی آواز کے سبب سے چڑے کا نام ہوا (یعنی چڑیا کا نر)۔

تم ضرور کہو گے کہ اپنے رنگ، آواز، اور ادا کے انداز اور دل کی حالت کو ملا کر جو معنی چاہو پیدا کر لو، اصلی لفظ میں تو ہمیں کچھ بھی نہیں معلوم ہوتا۔ یہ بھی درست ہے۔ لیکن میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ زبان انسان کی آواز، دل اور اشارات اعضائی کا مجموعہ ہے۔ اس صورت میں کسی جز کو روکنا نہیں چاہیے[2]۔

ولادت زبان کی بنیاد تم نے دیکھ لی؟ پہلے کچھ اشارے تھے۔ پھر کچھ آوازیں، پھر باہمی اتفاق سے کچھ الفاظ آپس کے سمجھنے سمجھانے کے لئے مقرر ہو گئے۔ پس جب آفرینش بڑھے اور آبادی پھیلے، تب بھی واجب ہے کہ وہی الفاظ کام میں لائیں کہ سب کی سمجھ میں آئیں اور عام فہمی کے سبب سے انہیں سب سے پہلے کام لائیں[3]۔

زبان میں کسی کو اپنی طرف سے ایک لفظ بھی ایجاد کرنے کا اختیار نہیں ہے! یہ ہو سکتا ہے کہ میں شادی کہوں اور اس کے معنی رکھوں آدمی۔ اسے شاید میرے نوکر چاکر یا دوست آشنا سمجھنے بھی لگیں مگر اور سب کب مانیں گے! اور مانیں کیا؟ اگر چند لفظ ایسے تصنیف کر لوں تو کوئی میری بات بھی نہ سمجھے گا[4]۔

اسی بنیاد پر عرب کے اہل تحقیق نے کہا کہ لغت وہ ہے کہ جس پر جمہور کا اتفاق ہو۔ اصطلاح وہ ہے جس پر خاص گروہ کا اتفاق ہو۔ البتہ کوئی علمی مصنف یا صاحب ایجاد قادر الکلام شخص بھی الفاظ ایجاد کر سکتا ہے لیکن ان کے قیام عمر کے لئے اسے بھی جمہور کا حسن قبول حاصل کرنا پڑے گا۔

عزیزان وطن! ولادت الفاظ اور آفرینش زبان کے خیالات مجملاً آپ کے تصور میں آگئے ہوں گے۔ اب یہ سنئے کہ فلسفی زبان کا منصب کیا ہے؟ اس کا منصب ہے

تقریر کے ہر لفظ کو کریدنا جس سے کہ زبان مرکب ہے۔ اس سے شاید تم یہ سمجھے ہو گے کہ فلسفی زبان کو اکثر زبانوں کے لفظ اور معنی خوب آتے ہوں گے۔ وہ عبارت میں مبتدا، خبر مضاف، مضاف الیہ، صلہ، موصول وغیرہ وغیرہ کو خوب سمجھتا ہوگا۔ نہیں! یہ تو بہت ادنیٰ کام ہے۔ وہ لفظ کی اصل و نسل ولادت سے وقت موجود تک دریافت کرتا ہے۔ تم نے کسی نیاریئے یا تیزابئے کو دیکھا ہے؟ جب ایک دھات کی ڈلی اس کے ہاتھ میں آتی ہے تو وہ اسے دیکھتا ہے اور جانچتا ہے کہ ایک مادہ ہے یا کئی مادے گتھے ہوئے ہیں۔ تب کبھی تیزاب سے، کبھی آنچ کے زور سے گلا کر ان کا جوڑ جوڑ کھول لیتا ہے کہ اس کی اصل کہاں پہنچی ہے۔ اسی طرح ماہر زبان ایک لفظ کو لیتا ہے۔ وہ تیزاب یا آنچ کام میں نہیں لاتا، فقط عقل کے تیزاب سے حرفوں کے جوڑ بند کھولتا ہے اور معنوں کو سوچ کر اس کی ساری اصل نسل دریافت کر لیتا ہے۔

میرے دوستو! تم حیران ہو گے کہ لفظ کی ولادت اور نسل کیا؟ ہاں لفظ کی بھی ولادت اور نسل ہوتی ہے اور وہ اس طرح معلوم ہوتی ہے کہ فلسفی لفظ کے جز جز کو الگ کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ وقت بوقت ان کی اصل کس کس ملک اور کس کس قوم میں پہنچتی آئی ہے۔ ان میں کیا رشتے ہیں؟ اور کیونکر وہ رشتے پیدا ہوئے ہیں؟ اور ملک ملک ان کے معنوں یا حرفوں میں کیا تغیر پیدا ہوئے ہیں۔ پھر اور زبانوں کے لحاظ سے اپنی باتوں پر غور کرتا ہے، ان کے نتائج کو بھی جانچتا ہے اور مطابقت اور مقابلہ کرتا ہے یعنی ایک زبان کے لفظ دوسری زبان سے کن کن باتوں میں متفق ہیں اور کونسی باتیں ہیں کہ ایک ہی کے لئے خاص ہیں۔ پھر ان سببوں کی جستجو کرتا ہے جو زبان میں تبدیلی کا عمل کر رہے ہیں اور یہ غیر منقطع کام ہے کبھی ترقی کے رنگ میں ہوتا ہے کبھی تنزل میں، مگر جاری ہمیشہ رہتا ہے اور اسی کو زبان کی اصل نسل کہتے ہیں۔ اب چند مثالیں توضیح مطلب کے لئے لکھتا ہوں:

گریبان کو فلسفی زبان نے دیکھا۔ بان پر جوڑ معلوم ہوا۔ اس نے گرے کو دیکھا تو فارسی قدیم میں بہ معنی گلو پایا۔ سمجھ گیا کہ اس جزو لباس کا گلے پر قبضہ ہے، اس لئے اس کا نام گریبان رکھا ہوگا کہ مالک گلو ہے۔ سنسکرت میں دیکھا تو وہاں گریوا نہی معنوں میں

آیا ہے۔ اور بان سنسکرت میں وان ہے۔ ثابت ہو گیا کہ ایک گھرانے کی نسل ہے۔ ملک اور مدت کے انقلاب سے آواز بدل گئی۔ یہاں مر گیا وہاں جیتا ہے۔

کلابتون کو سب پہنتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ فلسفی زبان اس کا بل کھولتا ہے اور دیکھتا ہے کہ کلابہ، کلاوہ (سوت کا لچھا) آلتون ترکی میں سونے کو کہتے ہیں وہی سنہرا لچھا ہوا۔

نیلوفر کو بے خبر آدمی ایک گل۔ خود رو سمجھے گا۔ فلسفی زبان دیکھے گا کہ نیلوپر، نیلوفل، نیلوپل، نیلپر سب طرح مستعمل ہوا ہے۔ تب ادھر ادھر نظر دوڑائے گا اس وقت معلوم ہو گا کہ سنسکرت میں نیل نیلا۔ ات پل پنکھڑی ہے، یعنی نیلی پنکھڑی والا پھول۔ فارسی میں اول بدل ہو کر کچھ سے کچھ ہو گیا۔

ناہار اور نہار ہندستان میں بھی سب جانتے ہیں۔ فلسفی زبان نے دیکھا تو "ن" پر جوڑ معلوم ہوا۔ اہار کو دیکھا تو فارسی بلکہ سنسکرت میں بھی بہ معنی خورش آیا ہے سمجھ گیا کہ صبح سے جب تک کچھ نہ کھایا ہو اس وقت تک ناہار یا نہار ہے[5]۔

خربزہ کو سونگھا تو بو آئی کہ مرکب ہے۔ خر کو دیکھا بہ معنی کلاں بھی آتا ہے۔ بزہ کو دیکھا تو فارسی قدیم میں بہ معنی ثمر ہے۔ سمجھ گیا کہ بڑا پھل تھا، اس لئے خربزہ نام رکھا ہو گا۔ سنسکرت میں بھی بعینہ یہ دو جز اور یہی معنی ہیں۔

میرے دوستو! تم دل میں کہتے ہو گے کہ اس توڑ جوڑ اور لفظوں کے رگ پٹھے چیرنے سے کیا فائدہ؟ جب ہم ایک زبان سیکھتے ہیں تو اس میں یہی غرض ہوتی ہے کہ اور کی بات سمجھ لیں اپنی بات سمجھا دیں۔ اس کے لئے اتنا کافی ہے کہ لفظوں کے معنی آ گئے، عبارت کا مطلب معلوم ہو گیا، والسلام۔ میں بھی کہتا ہوں کہ بے شک زبان سیکھنی ہو تو اس سے زیادہ کاوش کرنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن ذرا خیال کر کے دیکھو۔ جب تم کوئی شکل اقلیدس کی حل کرتے ہو یا ایک حساب کے سوال کا جواب نکال لیتے ہو یا ایک بچہ کوئی پہیلی بوجھتا ہے تو کیا خوشی ہوتی ہے! ہزاروں پھول پھل، بوٹیاں، نباتات، جمادات ہیں۔ اگر ان کے مزے اور اصلی تاثیریں معلوم کر کے تمہیں خوشی حاصل ہوتی ہو گی تو لفظوں کی اصلیت دریافت کر کے بھی ضرور خوشی ہو گی۔ جن الفاظ کی

توضیح میں نے بیان کی۔ انھیں سن کر کس کے دل کو فرحت نہیں ہوئی؟ البتہ بدمزہ، بے مغزے کہ الفاظ کو فقط منہ کی بھاپ یا پیٹ کا سانس سمجھتے ہیں، انھیں خبر بھی نہیں ہوتی۔ ہونٹ سے لفظ نکلے ہوا ہو گئے۔ ان کے نزدیک کچھ بات ہی نہیں۔

الفاظ ظاہر میں ہوائی جنبشیں ہیں لیکن حقیقت میں مستقل چیزیں ہیں۔ تم ضرور پوچھو گے کہ الفاظ مستقل چیزیں کیونکر ہو سکتے ہیں؟ ہم کہتے ہیں کہ جب تمھیں کوئی چیز مثلاً چاکو یا قلم درکار ہوتا ہے، اگر ایک لڑکے سے بھی کہتے ہو تو فوراً اٹھا لاتا ہے دور ہو یا پاس۔ حالانکہ تم نے فقط لفظ کہا تھا۔ چاکو یا قلم کی تصویر بنا کر نہیں دی تھی۔ لفظ نے اس کے دل پر اصل شے کا کام دیا۔

تم لفظوں میں فقط اتنا ہی نہ سمجھو کہ برائے نام خاص خاص چیزوں پر اشارے کرتے ہیں۔ غور کرو گے تو پاؤ گے کہ وہ بھی اور چیزوں کی طرح پیدا ہوتے ہیں، ترقی و تنزل کرتے ہیں، سفر کرتے ہیں اور اس میں طبیعت اور رنگ بدلتے ہیں اور مر بھی جاتے ہیں۔ ان کے حالوں، چالوں اور انقلابوں کو دیکھو گے تو معلوم ہو گا کہ جس طرح قوموں کی تاریخیں اپنے حالات و مقالات سے کملائے ہوئے دلوں کو شگفتہ کرتی ہیں، لفظوں کی تاریخیں اپنے لطف و خوبی کے ساتھ ان سے زیادہ دماغوں کو شاداب کرتی ہیں۔ اس سے زیادہ اور کیا فائدہ ہو گا کہ لفظوں کے مقابلہ اور مطابقت میں قوموں، نسلوں اور ان کے خاندانی رشتوں کے سررشتے نکل آئے۔

الفاظ کے تغیر طبیعت اور ان کے رنگ بدلنے پر تمھیں ضرور کھٹکا گزرے گا کہ اسماء حقیقت میں اشیاء کے نام ہیں۔ جب چیزیں نہیں بدلیں اور نام ان کے بدل گئے تو الفاظ اور معانی میں عجب خلط ملط پیدا ہو گا۔ میرے دوستو! یہ تغیر ضرور ہوتے ہیں اور وہ قباحت نہیں پیدا ہوتی جس کا تمھیں خطر ہے۔ دیکھو؟

جیب: عرب میں اول سینہ کو اور دل کو بھی کہتے تھے، پھر گریبان کو کہنے لگے کہ سینہ پر ہوتا ہے۔ بعض اہل لغت کہتے ہیں کہ جوب بہ معنی قطع ہے۔ گریبان کترا ہوا ہوتا ہے اس لئے اس کا نام جیب رکھا۔ عرب کے لوگ جبہ یا کرتہ کے گریبان میں ایک تھیلی ٹانک کر اس میں چیز رکھ لیا کرتے تھے۔ مدت کے بعد اسی کا نام جیب ہو گیا۔

فارس میں وہ تھیلی گریبان سے ڈھلک کر کمر کے نیچے آگئی اور نام وہی جیب رہا۔ تماشا یہ کہ گھڑی کے شوقینوں نے چھاتی کے بائیں طرف جگہ دی اور کوٹ پتلون والوں نے کہیں کا کہیں پہنچا دیا۔ پھر بھی وہی جیب ہے اور عرب میں جیب وہی گریبان ہے۔

جب عرب میں علم ریاضی کا چرچا اور علم مثلث کا یونانی سے ترجمہ ہوا تو جو خط کسی قوس یا اس کے زاویہ کا اندازہ بتائے اسے جیب کہنے لگے کیونکہ وہ بھی قوس کے لئے ایسا ہے جیسے سینہ کے لئے گریبان۔

شمع عرب میں موم کو کہتے ہیں۔ پھر موم کی شمعیں بننے لگیں۔ ان کا نام بھی شمع ہی رہا۔ فارس میں آکر چربی کے قالب میں ڈھلیں۔ یہاں شمع عام ہو گئی۔ موم کی بتی ہو خواہ چربی کی۔ عرب میں شمع وہی موم ہے۔

اسباب عربی میں جمع سبب کی ہے۔ فارسی میں اسباب خانہ داری کو کہتے ہیں۔

شراب عرب میں پینے کو اور اس چیز کو کہتے ہیں جو پینے میں آئے۔ فارس میں مرادف بادہ ہو گیا۔

(1) بعض الفاظ سفر کر کے آتے ہیں اور ملک غیر میں بے عزت ہو جاتے ہیں[6]۔

غلام عرب میں نوخط لڑکے کو کہتے ہیں۔ فارس میں لونڈی کا نر غلام۔

مہتر فارسی میں سردار کو کہتے ہیں۔ ہندوستان میں چوڑھا ہو گیا۔

خلیفہ کا رتبہ عرب میں نائب پیغمبر اور خلیفہ الٰہی تک پہنچا ہوا ہے۔ ہندوستان میں نائی کو کہتے ہیں۔ اس زمانہ میں لفظ ایجاد نہیں ہوتے۔ نئے خیالات کے ادا کرنے میں پرانے الفاظ مدد کرتے ہیں۔ مثلاً :۔

نفط رال کا مرادف ہے۔ اب مٹی کے تیل کو بھی کہتے ہیں۔

مداد پہلے سیاہی کو کہتے تھے، اب پنسل کو بھی کہتے ہیں۔ پہلے قلم سرمہ اور کلک فرنگی کہتے تھے یہ لفظ مر گئے۔

بوقلموں۔ چند سال سے فیل مرغ (پیرو) وہاں پہنچا ہے۔ اسے بوقلموں کہتے ہیں۔

(2) کبھی دو لفظ مرکب کر لیتے ہیں۔ مثلاً :۔

سیب زمینی آلو کو کہتے ہیں۔ یہ بعینہ ترجمہ ہے پوٹے ٹوکا۔ پس معلوم ہوا کہ فرانس کے رستہ سے پہنچا ہے۔

آبجوش سوڈا واٹر کو کہتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ ہزاروں لفظ پیدا ہو گئے ہیں۔

(3) کبھی مشتق کر لیتے ہیں۔ وہاں بھی اب برف کوزوں میں جماتے ہیں۔ اسے بستنی کہتے ہیں۔

(4) کبھی جو شے آتی ہے اپنا نام ساتھ لاتی ہے۔ تلگراف ایران میں تار کے پیغام کو کہتے ہیں۔ اس میں تصرف کرتے ہیں اور کہتے ہیں "ہشت روز است خط نوشتہ بودم۔ جواب نیامد۔ ناچار امروز تیل زدہ ام" (آج میں تار دیا ہے)۔

منات نوٹ کو کہتے ہیں۔ روسی لفظ ہے۔

پرتغال۔ ایک قسم کا رنگترہ ہوتا ہے۔ اس کا پودہ پرتگال سے آیا تھا۔ وہی نام ہو گیا۔

کالسکہ بگی کو کہتے ہیں۔ یہ بھی روسی لفظ ہے۔ ایسے سینکڑوں لفظ ایران میں زبان زد خاص و عام ہیں۔ اکثر چیزوں کے نام بدل گئے ہیں۔ پہلے ناموں کو سمجھو کہ مر گئے۔

چاپ چھاپے کا کام ہندوستان سے گیا۔ اسی واسطے یہ نام پایا۔

(5) علمی الفاظ اور علمی اصطلاحیں بھی پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ اکثر زندہ رہتی ہیں اور کارروائی کرتی ہیں۔ علم ہمیشہ ترقی کرتا ہے اور اصلاح پاتا ہے۔ اس لئے بعض الفاظ جلد مر جاتے ہیں۔ نئے پیدا ہو جاتے ہیں۔ آج سے 30 برس پہلے کی ریاضی یا جغرافیہ کی کتاب اردو زبان میں دیکھو تو یہ تعجب جاتا رہے گا۔

(6) خوش ایجاد نام بھی اکثر کم عمر اور ناپائدار ہوتے ہیں۔

محمود غزنوی جب ہندوستان میں آیا اور آم کھایا تو بہت بھایا۔ مگر نام سن کر ہنسا اور کہا۔ سخت ستم ہے کہ ایسا لطیف میوہ اور نام میں یہ فحش! اسے نغزک کہنا چاہئے کہ اسم بامسمے ہو۔ چنانچہ بعض فارسی کی کتابوں میں نغزک، بعض میں انبہ لکھتے ہیں۔ امیر خسرو نے قران السعدین میں ہندوستان کے میوؤں کی تعریف کرتے کرتے آم کے باب میں

بھی چند اشعار لکھے ہیں۔

نغزک خوش مغزکن بوستاں خوب تریں میوۂ ہندوستاں

نعمت خان عالی نے اپنے دوست حسن خاں کو آموں کی رسید لکھی۔ اس کی نظم میں ایک شعر ہے کہ نہیں بھولتا۔

انبہ فرستاد حسن خاں بمن لنبتہ اللہ نباتاً حسن

اکبر نے صدہا چیزوں کو ناموں کے خلعت دیئے۔ کوئی باقی ہے کوئی پرانا ہو کر پھٹ گیا۔ ایک دن اصطبل خاصہ میں گھوڑوں کے دیکھنے کو آیا۔ ہلاک خور ٹوکرے بھر بھر کر کثافتیں اٹھا رہے تھے۔ فرمایا کہ بڑی محنت کی روٹی کھاتے ہیں۔ انھیں حلال خور کہنا چاہیے۔ آج تک وہی نام چلا آتا ہے۔

ہار کو کہا کہ سنگار کی چیز اور مبارک چیز پر ہار کا نام آنا بد شگونی ہے۔ اسے پھول مال کہا کرو۔ یہ سرسبز نہ ہوا۔

اسی خیال سے گھوڑے کی اندھیری کا اجیاری نام رکھا۔ یہ پیش نہ گئی اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جسے اب ہم اندھیری کہتے ہیں اس وقت اسے بھی اندھیاری کہتے تھے۔

جہانگیر نے شراب کا نام رام رنگی رکھا مگر رنگ نہ جما۔

جمعرات کا نام مبارک شنبہ رکھا کہ جو خوشی ہمیں ہوتی ہے اکثر اس دن ہوتی ہے۔ پیر کا نام گم شنبہ رکھا۔ لکھتا ہے کہ مجھے جو غم یا فکر ہوتا ہے اسی دن ہوتا ہے اس کا نام ایام ہفتہ سے گم ہونا چاہیے۔

محمد شاہ نے بلبل ہندوستان کا نام گلدم رکھا تھا۔ اب تک اسی طرح چلا آتا ہے۔ رنگترہ کو پہلے سنگترہ کہتے تھے۔ محمد شاہ نے کہا کہ اس لطیف میوہ کو پتھر مارنا سخت ستم ہے۔ رنگترہ کہا کرو کہ خوش رنگ بھی ہے، تر و تازہ بھی ہے۔

شاہ عالم نے سرخاب کو گلسرہ کہا مگر شہرت نے نامنظور کیا۔

کنجر اور کنجری ہندی میں زن رقاصہ کو کہتے تھے۔ اکبر نے ایک دن خوش ہو کر کہا کہ انھیں کنچنی کہا کرو۔

نواب سعادت علی خاں نے ملائی کا نام بالائی رکھا۔ اہل لکھنو اب بھی بالائی کہتے ہیں۔ اور شہروں میں شہرت نہ ہوئی۔

عزیزان وطن! تم ضرور کہتے ہو گے کہ زبان کی عمر کیا؟ اور اس کی تاریخ کیا؟ یہ کچھ تعجب کی بات نہیں۔ عالم میں بہت سے ملک، بیشمار اہل ملک اور ہزاروں قومیں ہیں۔ اسی طرح زبانوں کا بھی عالم گروہ در گروہ سمجھو، کہ تھا، اور ہے، اور ہوتا رہے گا۔ جس طرح قومیں بڑھیں، چڑھیں، ڈھلیں اور فنا ہو گئیں اور ہوں گی، اسی طرح زبانوں کا عالم ہے کہ اپنے الفاظ کے ساتھ آباد ہے۔ وہ اور اس کے الفاظ پیدا ہوتے ہیں، ملک سے ملک میں سفر کرتے ہیں، حروف و حرکات اور معانی کے تغیر سے وضع بدلتے ہیں، بڑھتے ہیں، چڑھتے ہیں، ڈھلتے ہیں اور مر بھی جاتے ہیں۔

تغیرات مذکورہ اکثر سلطنت کے صدمہ سے ہوتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ کم ہوتے ہیں۔ پھر بھی ضرور ہوتے ہیں کیونکہ عادت الٰہی اسی رستہ پر جاری ہے اور رہے گی اور میں عنقریب اس کی کیفیت دکھاؤں گا۔

امن و عافیت کے زمانہ بھی تغیر کی دستکاری الفاظ و عبارت پر اپنا کام کیے جاتی ہے۔ ان میں آفرینش، ترقی اور فنا کا عمل جاری رہتا ہے اور بہت چپکے چپکے چلتا ہے لیکن اسی طاقت اور اسی انداز سے جیسے دریا کا بہاؤ یا ہوا کا رخ، جس کا پھیر کسی کے اختیار میں نہیں ۔ قوم اپنے گھر میں قائم اور ملک بر قرار ہوتا ہے۔ پھر بھی تغیر مذکور اپنا کام کیے جاتا ہے۔ نثر میں شیخ بو علی سینا کی حکمت فارسیہ وغیرہ، نظم میں دیوان شاہ ناصر خسرو، شاہنامہ وغیرہ۔ دیکھ لو، صدہا لفظ ہیں کہ اب بولنے میں نہیں آتے، صدہا ہیں کہ فرہنگوں میں دیکھے بغیر معنی نہیں معلوم ہوتے۔ صدہا ہیں کہ فرہنگوں میں بھی نہیں ملتے۔ اسی کو مرنا کہتے ہیں۔

جب ایک زبان کی تصانیف مختلفہ کو عہد بعہد اور سال بسال برابر سجاتے ہیں اور تغیرات مذکورہ پر نظر کرتے ہیں تو زبان کا عالم ایک سرزمین معلوم ہوتی ہے کہ فصل بہ فصل پرانے نباتات جل کر خاک ہوتے جاتے ہیں اور نئے اگ کر ان کی جگہ کو ہرا کرتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ فلسفی زبان خواہ زمین کی طبیعت سے خواہ انسان کی ضروریات

اور کارروائی پر نظر کر کے فقط تغیرات زبان کی تاریخ ہی نہیں جان لیتا بلکہ جس طرح ایک تجربہ کار مورخ یا سلطنت کا مدبر سابق اور موجودہ حالت کو دیکھ کر آئندہ کے واقعات پر پیش بینی کرتا ہے، یہ زبان موجودہ کے حالات پر حکم لگاتا ہے اور بتاتا ہے کہ آئندہ کس طرح اور کس انداز میں بڑھے گی یا دب جائے گی۔ چنانچہ فارسی پر ایک زمانہ میں عرب کی چڑھائی تھی، اب ممالک یورپ کا زور نظر آتا ہے۔

الفاظ جو سفر و سیاحت کر کے ملک غیر سے آتے ہیں اور زبان میں گھر بناتے ہیں وہ اکثر تجارت کی وکالت یا قوموں کے ارتباط سے راہ پاتے ہیں۔ زبانوں میں عام دستور یہ ہے کہ بعض لباس، بعض کھانے، بعض اجناس، بعض علمی مطالب اور ان کے سامان ملک غیر سے آئے۔ وہ یا تو اپنے نام ساتھ لائے یہاں آکر یہیں کی زبان سے نام پائے۔ فارس میں عرب کا تسلط ہوا اور ملک، مملکت، مذہب، سکونت سب کو روک لیا کہ یہی رستے زبان کے استقلال یا انقلاب کے تھے۔ اہل ملک بہت تو مسلمان ہو گئے، بہت سے آوارہ ہو گئے اور جو بھاگنے کے قابل ہی نہ تھے، وہ گمنامی کے غاروں اور پہاڑوں میں بیٹھ رہے۔ زبان قومی کی حفاظت کون کرتا؟ علوم، فنون، کتابیں اور علمی سامان جو یونان سے پہلو مارتے تھے، اس طرح فنا ہوئے کہ نام و نشان تک نیست و نابود ہو گئے۔ پھر جو علم، ادب اور شائستگی نے رونق پھیلائی، وہ علما اور شرفائے عرب سے پھیلی یا ان نو مسلموں سے جنہوں نے عربیت اور اسلام کا جامہ پہن لیا تھا اور اسی کو فخر سمجھتے تھے۔ اقبال سلطنت ایک ایسی برکت ہے کہ جس قوم کے ماتھے کو لگ جاتا ہے، اس کی ہر چیز بلکہ بات بات دیکھنے والوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے۔ اس لئے ہزاروں فارسی کے لفظ گم ہو کر فنا ہو گئے، ہزاروں رہے مگر بے رغبتی کے سبب بے رواج ہو کر متروک ہو گئے۔

بہت سے نئے الفاظ ہیں کہ سلاطین چغتائی کے عہد میں اشیائے مختلفہ کے لئے ہندوستان کے اہل انشا یا دربار کے اراکین نے پیدا کئے۔ یہاں کی معتبر تاریخوں میں مسلسل ہیں اور ان شعراء کے کلاموں میں منظوم ہیں جو کہ ہندوستان میں تھے یا آئے اور رہ کر چلے گئے۔

رسد۔ جن معنوں میں بولتے ہیں ایران میں کہو تو کوئی نہ سمجھے گا۔ وہاں سور سات،

کہتے ہیں۔

منشی۔ ایران میں کسی کو کہیں تو اس کے لفظی معنی (یعنی انشاپرداز) سمجھے جائیں گے اور بس۔ جسے یہاں منشی کہتے ہیں، وہاں اسے میرزا کہتے ہیں۔

تمسک۔ ہندوستان میں جن معنوں میں متعارف ہے ایران میں کہیں تو کوئی نہ سمجھے گا۔

رسید۔ یہاں قبض الوصول کو کہتے ہیں۔ ایران میں کہیں تو کوئی نہیں سمجھتا۔

گاؤ تکیہ۔ ہندوستانی فارسی ہے، ایران میں متکا کہتے ہیں۔

روشنائی۔ لکھنے کی سیاہی کو کہیں تو کوئی ایرانی نہیں سمجھتا۔ وہ مرکب کہتے ہیں۔

دست پناہ۔ ہندوستانی فارسی ہے۔ وہاں آتشگیر کہتے ہیں۔

مالیدہ یا ملیدہ۔ ہندوستان میں کہتے ہیں۔ وہاں کوئی نہیں سمجھتا۔ وہ چنگالی کہتے ہیں۔

اسی طرح عطردان، پاندان وغیرہ وغیرہ۔ ہزاروں لفظ ہیں کہاں تک لکھوں۔

اکثر الفاظ ہیں کہ عربی، فارسی یا ہندی میں اپنے اپنے معنوں میں مستعمل تھے اور ہیں ہماری آنکھوں کے دیکھتے دیکھتے انقلاب زمانہ نے نئے خیالات پیدا کئے اور وہی الفاظ جون بدل کر نئے معنوں کے لئے نامزد ہوئے۔

تہذیب کے معنی لغت میں ہیں پاک کردن، اصلاح کردن۔ اب سولزیشن کے معانی کی ہیئت مجموعی جو کچھ ہے تمہارے ذہن میں ہے اور یہ خیال بھی انگریزی سے ہماری زبان میں آیا ہے۔ تم خود غور کر کے دیکھو! جن جن معنوں کی رعایت سے آج لفظ تہذیب بولا جاتا ہے اور اس میں کوٹ، پتلون اور پھندنے دار ٹوپی بھی شامل ہے، وہ حقیقی معنوں سے کس قدر علیحدہ ہیں۔ یہ خیال اور یہ لفظ دونوں ہماری آنکھوں کے سامنے پیدا ہوئے ہیں اور یہی حالت ہے شائستگی کی۔

تعلیم یافتہ کے لفظی معنی تم جانتے ہو۔ انگریزی میں جسے ایجوکیٹڈ کہتے ہیں اب ہم اسے تعلیم یافتہ کہتے ہیں، لیکن اس میں کئی صفتیں اور مقصود ہو گئی ہیں جن میں شرافت کی بربادی اور کوٹ پتلون کی فرضیت لازم کی گئی ہے، جو تعلیم یافتہ کے اصلی معنوں سے

بالکل الگ ہیں۔ یہ خیال انگریزی سے آیا اور حال ہی میں یہ لفظ بھی اس کے لئے نامزد ہوا۔

بلند نظری کے لفظی معنی ظاہر ہیں لیکن حال کی تحریروں اور انگریزی کے ترجموں میں بلند نظر ایسے عالی دماغ، ہمت والے شخص کو کہتے ہیں کہ کوئی بلند رتبہ اور عمدہ حالت اس کی خاطر میں نہ آئے۔ ہمیشہ ترقی کا طالب رہے اور اس کی تحصیل میں کسی خطرناک تدبیر سے اندیشہ نہ کرے۔ یہ لفظ تیس چالیس برس سے پیدا ہوا ہے۔

عزت طلب۔ میں یہ لفظ عالم طفولیت میں اکثر شرفا کے باب میں سنا کرتا تھا۔ جو شخص کہ سامان، لباس، اخلاق، اطوار، عادات اور معاشرت احباب میں ہمیشہ ایسی حالت کے ساتھ رہے جس سے حکام اور خاص و عام اس کے ساتھ بہ عزت پیش آئیں، اسے تعریف کے ساتھ کہتے تھے کہ فلاں شخص عزت طلب آدمی ہے۔ لفظ مذکور تحریر میں داخل نہ تھا۔ اب مدت سے متروک ہے۔ ہم سے کچھ پہلے پیدا ہوا اور ہمارے سامنے مر گیا۔

وضعدار بھی ایسے ہی شخص کو کہتے تھے اور تہذیب انگریزی سے پہلے یہ الفاظ شرفا کے لئے تعریف میں داخل تھے کہ پابندی وضع لازمہ شرافت تھی۔ دلی میں اب بھی وضعداری سے بانکپن اور حسن مراد لیتے ہیں۔

اخبار۔ جس صورت سے اب جاری ہیں پہلے یہ صورت ہی نہ تھی۔ اسی واسطے اس کے لئے نام بھی نہ تھا۔ یہ لفظ ان معنوں کے ساتھ ہندوستان میں اب پیدا ہوا ورنہ ظاہر ہے کہ اخبار جمع خبر کی ہے اور بس۔ اہل ایران نے اس کے لئے روزنامہ یا خبرنامہ پیدا کیا اور یہ مناسب تر ہے۔

صاحب لوگ۔ عرب میں صاحب بہ معنی ہم صحبت ہے۔ پھر اور لفظوں کے ساتھ مل کر فاعلیت کے معنی پیدا کرنے لگا۔ مثلاً صاحب الصولۃ والملک والدولۃ فارس میں آکر صاحب ملک، صاحب دولت، صاحب مال رہا۔ ہندوستان میں آکر لفظ تعظیمی ہوا۔ میر صاحب، مرزا صاحب، نواب صاحب۔ اسی نوے برس سے صاحبان انگریز کے نام کا جز ہو گیا۔ پھر جو کمینہ سے کمینہ کرستان ہو، وہی صاحب لوگ ہو گیا۔

کوٹھی۔ ہندوستان میں صاحب لوگ لباس تجارت میں آئے تھے چونکہ تاجروں کا رہنا سہنا، ملنا جلنا، لین دین تاجروں ہی سے ہوتا تھا۔ اول اول معاملات بھی بنگالہ کے تاجروں اور مہاجنوں ہی سے ہوتے ہوں گے۔ عالم مسافرت میں انھیں نوکر چاکر درکار ہوئے ہوں گے۔ وہ بھی انھیں سے لئے ہوں گے۔ عالیشان مہاجنوں اور سوداگروں کی دکانوں کو کوٹھی کہتے ہیں۔ چونکہ صاحب لوگ لباس تجارت میں تھے، جب کسی سے ملتے جلتے ہوں گے کوٹھی پر جا کر ملتے ہوں گے۔ وہ پوچھتے ہوں گے "آپ کی کوٹھی کہاں ہے" یہ پتا بتا دیتے ہوں گے اور سمجھتے ہوں گے کہ کوٹھی گھر کو کہتے ہیں کیونکہ مسافر تھے، ان کی دکان اور کوٹھی ایک ہی تھی۔ ان کے نوکر بھی کوٹھی ہی کہتے ہوں گے۔ کام کے موقع پر آپ کہتے ہوں گے: یہ چیز ہماری کوٹھی پر لے آؤ۔ اور لوگ کہتے ہوں گے جاؤ، یہ چیز صاحب کو کوٹھی پر دے آؤ۔ مدت کے بعد تجارت کا پردہ اٹھا دیا۔ وہی گھر دارالحکومت ہو گئے۔ جب سے کوٹھی کا نام جو محاورہ میں آ گیا تھا، وہی رہا اور یہ نیک نیتی کا پھل ہے۔

چٹھی۔ بنگالہ کے ہندو مسلمان خط کو چٹھی کہتے ہیں۔ ابتدا میں جب کوئی صاحب لوگوں کو کچھ لکھتا ہو گا۔ نوکر آ کر کہتا ہو گا۔ صاحب یہ چٹھی آئی ہے۔ یہ بھیجتے ہوں گے تو کہتے ہوں گے "یہ چٹھی فلانے مہاجن کو دے آؤ" ان سے باتیں کرتے ہوں گے، تو بھی چٹھی ہی کا لفظ محاورہ میں آتا ہو گا۔ صاحب لوگ اردو اور ہندی کے محاورہ سے واقف نہ تھے۔ چٹھی ہی کہتے رہے۔ آگے کے شہروں میں بڑھے، پھر بھی جو لفظ محاورہ میں آ گیا تھا، اسی طرح رہا۔ یہاں تک کہ اب انگریزوں کے خطوط اور ہر انگریزی خط کو چٹھی کہتے ہیں۔

بڑا دن۔ دسمبر کی 25 تاریخ کو بڑا دن کہتے ہیں، حالانکہ برس کا سب سے بڑا دن یہ نہیں۔ البتہ 25 سے بڑھنا شروع ہوتا ہے۔ لیکن محاورہ میں یہی نام ہو گیا۔ جب کہتے ہیں۔ سب سمجھ جاتے ہیں۔ ایسے ایسے ہزاروں لفظ ہیں کہاں تک لکھوں۔

زبان کا جینا اور مرنا

زبان اپنے کمال جوانی اور زور زندگانی پر شمار کی جاتی ہے۔ جبکہ اس کے ذخیرہ میں ہر علم، ہر فن کی تصنیفات ہوں اور ہر قسم کے حالات و مطالب کے ادا کرنے کے واسطے الفاظ و محاورات کے سامان حاضر ہوں۔ اس کا مضائقہ نہیں کہ الفاظ مذکورہ خاص اس کے ملک کی آفرینش ہوں خواہ غیر ملکوں سے آئے ہوں۔ زبان کا استقلال اور آئندہ کی زندگی چار ستونوں کے استقلال پر منحصر ہے:

(1) قوم کا ملکی استقلال (2) سلطنت کا اقبال (3) اس کا مذہب (4) تعلیم و تہذیب۔ اگر یہ چاروں پاسبان پورے زوروں سے قائم ہیں۔ تو زبان بھی زور پکڑتی جائے گی۔ ایک یا زیادہ جتنے کمزور ہوں گے اتنی ہی زبان ضعیف ہوتی جائیگی۔ یہاں تک کہ مر جائیگی۔ مرنا اس کا یہی کہ خواص و عوام کی زبانیں اس کے بولنے سے اور قلم اس کے لکھنے سے منہ پھیر لیں۔ یعنی نہ کہیں بولی جائے، نہ اس میں تصنیف و تالیف کا رواج رہے۔

زبان کا انقلاب کلی اکثر تاریخی سے ہوتا ہے۔ وہ طوفان اسے چاروں طرف سے تہ وبالا کر دیتا ہے اور اسی میں اکثر زبانیں فنا ہو جاتی ہیں۔ میں اس موقع پر یونان اور روما کی زبانوں کے مرنے کا ذکر نہ کروں گا۔ کیونکہ میں اور میرے ہم وطن ان کے حال سے بے خبر ہیں۔ انہی چند زبانوں کا حال سناتا ہوں جنہیں سب جانتے ہیں۔

سنسکرت کی زندگی

(1) قوم گھر میں قائم ہے اور شکر کا مقام ہے۔

(2) سلطنت کے اقبال کے ساتھ زبان کا اقبال رخصت ہوا۔ زبان کو کون سنبھالے۔ دیکھ لو تصنیف و تالیف اور زبان کی ترقی بند ہے۔

(3) مذہب فقط گھروں میں قائم ہے۔ زبان کو زور دیتا ہے مگر بہت کم۔

(4) قدیمی تعلیم، قومی تہذیب اور علوم و فنون بھی نہ رہے۔ پہلے صرف ضرورت ہائے وقت کے سبب سے مسلمانوں کی تعلیم و تہذیب پسند کرنی پڑی تھی، اب انگریزی ہے۔ دو نئے رنگوں نے (سلطنت مغلیہ و انگلشیہ) پرانے رنگ کو مدہم کر دیا ہے۔ ان باتوں پر نظر کر کے دیکھ لو زبان سنسکرت کا کیا حال ہے۔

فارس کی قدیمی زبان

(1) قوم آوارہ وطن ہو کر بد حال ہو گئی۔
(2) سلطنت نے اسے چھوڑ دیا (مصلحت وقت نے رائج الوقت فارسی اس کے منہ میں رکھ دی)۔
(3) مذہب فقط اتنا زبان کو سنبھالے رہا کہ مرنے جینے اور ریت رسوم کے کام آتی ہے۔ وہ بھی ان پڑھ لوگ بے سمجھے الفاظ میں کچھ کا کچھ کہہ لیتے ہیں، سمجھتے اصلاً نہیں۔
(4) تعلیم اور تہذیب اور علوم قدیمہ سب مٹ گئے۔ اب زبان مذکور کی حالت کو دیکھ لو کہ کیا ہے۔ ژند، پاژند، پہلوی کو کوئی جانتا بھی نہیں۔

سنسکرت اور فارسی زبان کی فیلالوجیا

عزیزان وطن! فارسی اور سنسکرت کی قرابت قدیم کا سلسلہ آج گروہ در گروہ مخلوقات الفاظ کو آپ کے سامنے حاضر کرتا ہے جن کے قیافے اور شکل و شباہت ان کے اتحاد نسل پر شہادت دینگے۔ پہلے اتنی بات اور بھی سن لو کہ یورپ میں فلسفہ زبان کے ماہروں نے بہت سی زبانوں کو پڑھا اور ہر زبان میں حرفوں کی ترکیب، لفظوں کے جوڑ بند اور عبارتوں کے انداز پر خیال کر کے کل زبانوں کو تین حلقوں میں انتظام دیا ہے۔ ہر حلقہ میں کئی کئی شاخیں لگائیں۔ نکتہ اس میں یہ ہے کہ جو ایک نسل کی زبانیں ہیں، ان کے الفاظ کی نسل ایک ہی حلقہ میں ملے گی۔ دوسرے حلقہ میں نہ جا ملے گی۔ اس تقسیم نے بڑی آسانی کر دی کہ الفاظ کے سراغ لگانے والے کو اپنی سوئی جنگل جنگل میں ڈھونڈنی نہ پڑی۔ اور ظاہر ہے کہ جنگل کی نسبت کسی چیز کو ایک محلہ میں ڈھونڈنا اتنا دشوار نہیں۔

تینوں حلقوں کی تفصیل یہ ہے:۔

(1) ایرین۔ اس کی شاخیں ہندوستانی، ایرانی، یونانی، لاطینی، فرنچ، جرمن، روسی وغیرہ وغیرہ۔

(2) شیمیٹک۔ اس کی شاخیں عربی، عبرانی، کلدانی وغیرہ وغیرہ۔

(2) تیورنین۔ اس کی شاخیں متفرقات، جن میں بہت سی بے قاعدہ اور بے علم زبانیں شامل ہیں۔ مثلاً تاتار، سیام، برما، کمچا، پچگو وغیرہ کی زبانیں۔

اب غرض اصلی پر آتا ہوں اور اسے دو فصلوں میں تقسیم کرتا ہوں :۔

(1) جب دو زبانیں ہمارے سامنے پیش ہوں تو ان کی نسل اور خاندانوں کی اصل پہچاننے کے کیا اصول ہیں، یعنی ہم ان کے رنگ و روپ اور خط و خال کو کس نظر سے دیکھیں جس سے پہچان لیں کہ دونو کی اصل نسل ایک ہے یا نہیں ہے اور سنسکرت اور فارسی بھی ان قیافوں سے ایک گھرانے کی اولاد معلوم ہوتی ہیں یا نہیں۔

(2) ان دونوں کے الفاظ جو مشابہ ہیں۔ ان میں تغیر و تبدل کن اصول کے موجب ہوئے ہیں۔

آغاز مقصد

عزیزان وطن! گزشتہ لکچر میں سن چکے ہو کہ جب ایک ملک کی اجناس و اشیا دوسرے ملک میں آتی ہیں تو اپنے نام ساتھ لاتی ہیں۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ رستہ میں سے نئے نام لیتی آتی ہیں۔ کبھی یہاں آکر نیا نام پاتی ہیں۔ اس طرح ہر ملک میں اکثر اشیا کے لئے الگ الگ نام ہوتے ہیں۔ لیکن اکثر چیزیں لازمی اور ناگزیر ہوتی ہیں جن کے برتنے اور نام لینے سے کسی وقت بلکہ ابتدائے آفرینش اور شروع انسانیت میں بھی کسی کو چارہ نہ تھا۔ ہاں جبکہ جماعت مذکور کی جمعیت پھیلی ہو گی تو جہاں جہاں لوگ پھیل گئے ہوں گے، اشیائے مذکورہ کو اپنے ناموں سمیت ساتھ لے گئے ہوں گے۔ بس جن دو زبانوں میں ایسی چیزوں یا کاموں کے نام بعینہ یا کچھ تغیر کے ساتھ ایک ہوں، تو جان لو کہ یہ دونوں قومیں ضرور کسی وقت ایک گھرانے اور ایک گھر کی رہنے والی تھیں۔ اور اسی سراغ پر چلو گے تو اور بہت سے لفظ نکل آئیں گے جن سے امر مذکور کی تصدیق ہو گی۔ یہ سراغ کئی شاخوں میں چل کر منزل آگاہی پر پہنچتے ہیں۔

(1) نہایت قریبی رشتہ داروں کے نام ہیں جن سے کوئی گھر بلکہ اولاد آدم کی

نسل خالی نہیں رہ سکتی۔ اگر دو زبانوں میں یہ ایک ہیں تو جان لو کہ بولنے والوں کی اصل بھی ایک ہی تھی۔

نام اقربا	فارسی	سنسکرت
باپ	پدر۔باب	پتری
ماں	مادر۔مام	ماتری
بھائی	برادر	بھراتری
بہن	خواہر	سوسری
بیٹا	پور	پتر
بیٹی	دختر	دہتری
داماد	داماد	جاماتا
سسر	خسر	سوسر

(2) اعضائے بدن بھی انسان سے کبھی جدا نہیں ہوتے جن دو زبانوں کے اتحاد اصل کی بابت تحقیق مد نظر ہو، ان میں اعضا کے ناموں کو دیکھو۔ اگر دونوں زبانوں میں ایک ہی نام ہے تو جانو کہ دونوں کے بزرگ ضروری کسی وقت میں ایک جگہ رہتے تھے۔

فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت
سر	شر	زبان	جوہا
تارک	تالک	گلو	گل، گوگو
چشم	چشو	گرے، گردن	گریوا
ابرو	ابھرو	(بازو یا باہو)	باہو
دند	دنت	دوش	دوشن
دست	ہست7	سرین	شرونی
مشت	مشٹک	زانو	جانو
انگشت	انگشت	پائے	پاؤ
پشت	پرشٹ	است ہستہ	استھی

کش ککشی (کوکھ) خون شونڑ

ناف نابھی

(3) قدرتی اشیاء کہ ہر جگہ موجود ہیں اور ابتدائے آفرینش سے اخیر تک دنیا ان سے خالی نہ ہو گی، ان کے ناموں کو بھی دیکھو۔ اگر وہ ایک ہیں یا قریب قریب ہیں تو جان لو کہ اس نسل کی اصل ایک تھی۔

خدا۔ سنسکرت میں سودھاتا۔

زمین۔ سنسکرت میں جماہ

سورج۔ فارسی میں ہور، سنسکرت میں سوریہ۔

چاند۔ ماہ ماس۔

تارا۔ فارسی ہے۔ وہی سنسکرت میں تارا ہے۔

روز۔ سنسکرت میں روج اور روجری روشنی ہے۔

رات۔ فارسی میں شب ہے۔ سنسکرت میں شپا ہے۔

شام۔ سنسکرت میں شائم شام کو کہتے ہیں۔

باد۔ فارسی ہے۔ سنسکرت وات ہے۔ ہوا۔ فارسی ہے۔ سنسکرت وایو، ہے۔

گرمی۔ سنسکرت میں گریشم ہے یا گریکھم۔ اور گرم گھام ہے۔

کیا عجب ہے کہ سنسکرت میں دو معنوں کے لئے جدا جدا لفظ رہے۔ فارسی میں گرم سے گرمی نکال لی۔ موسم کے لئے لفظ ہو گا وہ گم ہو گیا۔

سرد۔ سنسکرت میں شرد یا شرت ہے۔ تعجب یہ ہے کہ عربی میں شتا بہ معنی سرما ہے۔ شاید اس میں پہلوی کا شمول ہو۔

(4) جو اجناس کہ انسان کے لوازمات ضروری سے ہیں اور کوئی آبادی ان کی ضرورت سے خالی نہیں ان کے ناموں کو دیکھو۔ اگر اس قسم کی چیزوں کو دونوں زبانوں میں ایک ہی نام سے پکارتے ہیں تو جان لو کہ دونوں کے بولنے والے کسی زمانے میں ایک گھر کے رہنے والے تھے۔

فارسی	سنسکرت
آتش	ہتاش
دود	دھوم۔ دھواں
آب	آپ
آہار	اہار۔ خوراک
استا	اشت
گراس	گراس
گندم	گودھوم
جو	یو
ماش	ماش۔ ہندوستان میں جسے مونگ کہتے ہیں ایران میں ماش کہتے ہیں اور ماش کو ماش سیاہ کہتے ہیں۔
برنج	بریہی۔ اور یہی بھی کہتے ہیں۔
شالی	شالی
شیر	کھشیر۔ دود
ماست	مستو
کرپاس	کرپاس۔ روئی اور سوت کو بھی کہتے ہیں
تار	تان۔ دیکھو۔ تیدن سے مشتق ہے۔
پود	بیوتی
گرم سوت	گربھ سوت
خم	کمبھ
پیالہ	پیتا

پالنا: کیوں کہ پینے سے مشتق ہے اس لئے یقین ہے کہ فارسی میں بھی کوئی مصدر اسی ماخذ کا ہو گا، اب مر گیا۔ اور جب بات کو یہاں تک گنجائش ہوئی تو کہہ سکتے ہیں کہ عہد قدیم میں پانی بھی فارسی میں ضرور ہو گا، ورنہ کیا سبب ہے 900 برس سے گزرے، حکیم سنائی جو کبھی خراسان سے ہند میں نہیں آئے، ایک قصیدہ میں کہتے ہیں ۔

نہ دراں دیدہ قطرۂ پانی	نہ دراں معدہ جز حسد زندہ

پیمانہ۔ فارسی ہے۔ سنسکرت پرمان۔

چرم۔ فارسی ہے۔ سنسکرت چرم یعنی چمڑا ہے۔

دار۔ فارسی میں درخت، اور اس لکڑی کو بھی کہتے ہیں جس سے چھت چھائیں۔ سنسکرت میں دار اور دارو لکڑی کو کہتے ہیں۔ اسی سے ہے دار چینی۔

در۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں دوارہ اور خانہ کو کھشان کہتے ہیں۔

پوزہ۔ فارسی۔ بوز پھل کو کہتے ہیں۔

شاخ۔ شاکھا۔

تعجب یہ ہے کہ دیودار فارسی میں بھی دیو دار ہے۔ اور عرب نے "شجر الجن" ترجمہ کیا۔

دور۔ سنسکرت میں ہے۔ ضد نزدیک۔

نزد۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں نیند ہے۔

دیر۔ ضد زود۔ سنسکرت میں دھیر ہے۔

راست۔ یعنی سیدھا۔ سنسکرت میں رجو۔

سفید۔ سپیت۔

سیاہ۔ شیام۔

سنگم اور سنگار۔ فارسی میں رفیق و ہمراہی کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں سنگم ہمراہی اور رفاقت ہے۔

سنگ۔ فارسی میں پتھر کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں شن کہتے ہیں۔

(5) جانوروں کے نام جن سے کسی زمانہ میں آبادی خالی نہیں ہوتی۔ انہیں بھی دیکھو:۔

فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت
مرد	مرتپ	خر	کھر
زن	جنی	اشتر	اشٹر
نر	نر	میش۔ بھیڑ	میش
فارسی میں نر کے		سگ	شنک
مقابلہ میں مادہ کو رکھ		شغال	شری گال
دیا ناری خدا جانے کیا		خوک	شوکر
ہو گئی۔ غالباً کچھ لفظ			
اس مادہ سے ہو گا۔			
کپی، بندر		موش	موشک
گاؤ	گئو	مگس	مکھشیکا
میش	مھش	کلاغ	کاک
اسپ	اشو	چتوک چھوک	چٹکا

(6) کوئی قوم اور اس کی کوئی حالت ایسی نہیں جس میں اسے گننے کی حاجت نہ ہوتی ہو۔ اس واسطے جن دو زبانوں کا اتحاد دریافت کرنا ہو، ان کے شمار اعداد کو بھی دیکھو۔ کم سے کم دس تک۔ اور دہا کے اور صدی اور ہزار ضرور ملتے ہوں گے۔

فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت
یک	ایک	بیست	ونشتی
دو	دوی	سی	ترنشتی
سہ	تری	چہل	چتوارنشتی
چہار۔ چار	چتر	پنجاہ	پنچاشت
پنج	پنچ	شصت	ششٹی

شش	شٹ	ہفتاد	سپتتی
ہفت	سپت	ہشتاد	اشیتی
ہشت	اشٹن	نود	نوتی
نہ	نو	صد 8۔ ست	شت
دہ	دش	ہزار	سہسر

عزیزانِ وطن! ان دو زبانوں میں مدت دراز سے بے حد مسافت پڑ گئی ہے۔ مگر گنتی کو دیکھو۔ کتنی قریب ہے۔ قرابت میں اور کیا ہوتا ہے؟ باوجود اس کے 3 اور سہ کے عدد میں جو اختلاف ہے کانٹا سا کھٹکتا تھا۔ ایک دن برہان قاطع میں نظر پڑا کہ پہلوی میں 300 کو تیر ست کہتے ہیں۔ دل اس سراغ پر آگے بڑھا۔ معلوم ہوا کہ زبان ژند میں 3 کو ترایو کہتے ہیں۔ حرف اول اس کا ایسی آواز دیتا ہے۔ جو ت تھ یا س کے بیچ میں ہے۔ جیسے عربی میں ث۔ اس کا مبدل اور مخفف تراہوا۔ اور ست ژند میں وہی صد ہے جو سنسکرت میں شت ہے۔

یہ بھی معلوم ہوا کہ پہلوی میں 3 کو سہ کہتے ہیں اور س لکھتے ہیں۔ وہ بھی مخفف و مبدل ترایو کا ہے۔ کیونکہ حرف مذکور س کی بھی آواز دیتا ہے۔ تختِ جمشید کی پرانی کتابوں میں ایک جگہ ہے اتھشیا یعنی اسکیا۔ اور جس سواری کو سنسکرت میں رتھ کہتے ہیں، ژند میں رث اور پہلوی میں رس کہتے اور لکھتے تھے۔ پس برہان قاطع میں جو تیر ست کو پہلوی لکھا ہے یہ غلطی ہے۔ ژند لکھنا چاہئے تھا۔

اعداد قاعلی بھی دیکھو دونوں زبانوں میں کتنے مطابق ہیں:۔

فارسی	سنسکرت	فارسی	سنسکرت
یکم	پرتھم	ہستم	ہشتم
دوم	دویت	سی ام	ترشتم
سہ ام	ترتپ	چہلم	
چہارم	چترتھ	پنجاہم	
پنجم	پنچم	شصتم	

ششم	ششٹم	ہفتادم	
ہفتم	سپتم	ہشتادم	
ہشتم	اشٹم	نودم	نوات
نہم	نووم	صدم	شتم
دہم	دشم		

جب تم دیکھتے ہو کہ اشیائے مذکورہ کے لئے دونوں زبانوں میں ایک ہی نام ہیں تو دل تصدیق کرتا ہے کہ دونوں کے صاحب زبان بھی ضرور ایک ہوں گے۔ انہی سراغوں پر چل کر لغت کی کتابوں میں داخل ہو۔ تب پرانے لفظ قدم بقدم آگے رستہ بتائیں گے۔ اس اندھیرے میں کبھی تاریخ، کبھی جغرافیہ کی لاٹھی لے کر چلو گے تو کتب مذکورہ میں حالات قدیمہ کا گورستان نظر آئے گا۔ پھر وہ خرابے آنکھوں میں پھر جائیں گے جہاں معلوم ہوگا کہ دونوں قوموں کے باپ دادا ایک زمانہ میں یہیں رہتے سہتے، کھاتے پیتے، سوتے بیٹھتے تھے اور اسی ایک بولی میں باتیں کر کے زندگی بسر کر گئے۔

اب میں مبادلہ کے قواعد شروع کرتا ہوں، لیکن اس میں چند باتوں کا خیال رکھو۔ یعنی اتحاد الفاظ کئی قسم کا ہے۔

اول۔ اتحاد ابتدائی یعنی جب حضرت آدم نے روئے زمین پر بود و باش شروع کی ہوگی اور اولاد کا سلسلہ جاری ہوا ہوگا تو وہ سب ایک جگہ رہتے ہوں گے۔ اسی واسطے سب ایک بولی میں بات چیت کرتے ہوں گے اور اسی بنیاد پر سب کی ایک زبان ہوگی۔ کچھ مدت کے بعد آبادی کی بہتات اور جگہ کی کوتاہی سے اطراف عالم میں پھیلے ہوں گے۔ مقامات کے اختلاف سے ضرورتیں بھی بدلی ہوں گی۔ حالتوں کے اختلاف نے نئی چیزیں اور نئے کام پیدا کئے ہوں گے۔ ان کے لئے کچھ نئے لفظ پیدا ہوئے ہوں گے، کچھ پہلے لفظوں میں تبدیلیاں ہوئی ہوں گی۔ رفتہ رفتہ زبانوں میں یہ اختلاف پیدا ہوا ہوگا جو آج دیکھ رہے ہو۔ بہت سے الفاظ ادل بدل گئے، بہت سے نئے بن گئے ہوں گے۔ صرف بعض الفاظ مشترک رہ گئے، ان کا کوئی خیال نہیں کرتا۔

دوم۔ اتحاد وسطی کہ ایک قوم کے لوگ وطن سے نکل کر پھیلے۔ کچھ کہیں جا بسے کچھ

کہیں۔ کئی سو بلکہ کئی ہزار برس کے بعد دونوں کی زبانوں کو دیکھتے ہیں تو پہچانی نہیں جاتیں۔ پھر بھی جب الفاظ و لغات کا پرکھنے والا غور کرتا ہے تو تاڑ جاتا ہے کہ ایک کان کے نگینے ہیں۔ ڈول ڈھنگ، رنگ سنگ بدل گئے ہیں۔ یہ ایسے جیسے ایک آریہ سے فارسی اور سنسکرت، انگریزی، فرنچ، یونانی، جرمنی وغیرہ نکلیں اور ان میں الفاظ مختلف ملتے جلتے نظر آتے ہیں۔ ان سب کی اصل کو آریہ سمجھنا چاہئے۔

سوم۔ دو غیر قوموں کے اشخاص نے دنیاوی اتفاقات کے ذریعوں سے آمد و رفت پیدا کی اور آپس میں مل کر رہنے لگے۔ ایک نے دوسرے سے ضروریات زندگی کی چیزیں حاصل کیں۔ ایک ملک کی چیزیں دوسری جگہ جانے لگیں۔ کاروبار، اوصاف، صنائع بدائع میں الفاظ بھی خلط ملط ہو گئے۔ تم دیکھتے نہیں، عربی نے فارسی کو کتنے الفاظ دئے۔ پھر عربی فارسی نے ہندی کو کیا کچھ دیا؟ اور فارسی نے خود آ کر ہندی سے کیا کچھ لیا؟ پھر انگریزی نے عرب سے کتنے الفاظ و مطالب لئے۔ اب اردو کو کیا دے رہی ہے اور کیا کیا لے رہی ہے۔ عرب اور فارس کی طرف دیکھو! یورپ کی زبانیں وہاں کی دستکاری کر رہی ہیں۔ مجھے اس مقام پر نمبر اول سے بحث نہیں، کیونکہ پرانی ہڈیوں کے اکھیڑنے سے کچھ حاصل نہ ہوگا۔ نمبر سوم سے بھی بحث نہ کروں گا۔ جو آنکھوں کے سامنے کی باتیں ہیں، ان کی فہرست بنانے سے کیا حاصل۔ البتہ نمبر دوم تحقیق کا مقام ہے کہ ہمارے تمہارے بزرگوں کی زبانیں ہیں۔ انہیں بڑی غور سے دیکھنا چاہئے کہ سنسکرت اور فارسی کے لفظ جو اصل میں متحد ہیں، ان میں تبدیلیاں کن اصول کے موجب ہوئی ہیں۔ انہیں دیکھ کر تمہاری زبان کو ایسا ملکہ ہو جائے گا کہ جہاں اس طرح کا لفظ پاؤ گے حرفوں کو الٹ پلٹ کر فوراً معلوم کر لوگے کہ اصل دونوں کی ایک ہے۔

اب دیکھئے! یہ اتحاد اصلیت 7 رنگ میں ظاہر ہوتا ہے:۔

(۱) لفظ اور معنی میں تغیر نہیں آتا۔ مثلاً کلال۔ فارسی میں بھی کمہار کو کہتے ہیں، سنسکرت میں بھی ہے۔

کپی۔ فارسی میں بھی بندر کو کہتے ہیں، سنسکرت میں بھی ہے۔

شالی۔ دھان دونوں جگہ یکساں ہیں۔

جنگل۔ فارسی میں بھی بہ معنی صحرا مستعمل ہے، سنسکرت میں بھی ہے۔

شال۔ دونوں جگہ یکساں ہے۔

آہار۔ فارسی میں خوراک ہے، سنسکرت میں بھی ہے۔

موری۔ یعنی پانی کا نکاس، دونوں گھروں میں ایک ہے۔

نام۔ دونوں جگہ ایک ہے۔

نیل۔ دونوں زبانوں میں ایک ہی رنگ ہے۔

نو۔ (نیا) دونوں جگہ برابر ہے۔

نیک۔ دونوں زبانوں میں اچھا ہے۔

گراس۔ یعنی نوالہ دونو زبانوں پر ایک ہی مزا دیتا ہے۔

جال۔ دونوں زبانوں میں ایک ہی معنوں کو شکار کرتا ہے۔

(2) حرکت یا حرکتیں تبدیل ہوتی ہیں۔ مثلاً

وِد۔ فارسی میں حکیم عاقل و دانشمند کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں ود بہ معنی دانستن ہے۔

ہلاہل۔ فارسی میں اور ہلاہل سنسکرت میں زہر قاتل ہے۔

مہر۔ فارسی میں اور مہر سنسکرت میں آفتاب کا نام ہے۔

(3) ایک حرف یا کئی حروف میں تغیر ہوتا ہے۔ مثلاً :۔

ماہ۔ فارسی میں چاند کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں ماس ہے۔

دہ۔ فارسی میں 10 ہے۔ سنسکرت میں دش ہے۔

پائے۔ پاؤ پاو ہے۔

(4) لفظوں میں کچھ تغیر نہیں ہوتا۔ معنوں میں فرق آجاتا ہے :۔

بالا۔ فارسی میں بالا نیچے کے مقابل ہے اور قد و قامت کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں بالا اس لڑکی کو کہتے ہیں جو جوانی کی اٹھان میں ہو۔

نر۔ فارسی میں مقابل مادہ ہے۔ سنسکرت میں نر مرد، ناری عورت ہے۔ خدا جانے کہ اصل میں عام تھا، ہند میں رہ کر خاص ہو گیا۔ یا اصل میں خاص تھا، فارس میں جا کر انسان و حیوان کے لئے عام ہو گیا۔

کام۔ فارسی میں مقصد و مطلب ہے۔ سنسکرت میں خاص مطلب نفسانی کو کام کہتے ہیں۔

دیو۔ سنسکرت میں روح پاک ہے۔ فارس میں بھی عہد قدیم میں روح پاک کو کہتے تھے۔ جب زرتشت نے مذہب میں فرق ڈالا تو اہل شیطان کو دیو کہنے لگے۔

آرام۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں عیش باغ کو کہتے ہیں۔ اسی سے ہے باغ ارم۔

بن: فارسی میں باغ یا زراعت کو کہتے ہیں اور اس کے کارندہ کو بنوان کہتے ہیں۔ سنسکرت میں بن ایسے جنگل کو کہتے ہیں جہاں تمام درخت چھائے ہوں اور قدرت نے پھلے پھولے درخت لگائے ہوں۔

گنج۔ فارسی میں خزانہ کو کہتے ہیں، سنسکرت میں زر کثیر ہے۔

بال۔ فارسی میں پرندوں کے پروں کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں آدمی اور چرندوں کے بالوں کو کہتے ہیں۔

روم۔ فارسی میں آدمی کے بالوں کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں روم یا لوم آدمی کے بدن کے رونگٹوں کو کہتے ہیں۔

مایہ۔ فارسی میں اصل شے کو کہتے ہیں جس پر افزائش اور کامیابی واقع ہو سکے۔ سنسکرت میں مایا اس چیز کو کہتے ہیں جس سے نیست، ہست ہو اور نابود موجود ہو جائے۔ اسی لحاظ سے قدرت الٰہی کو کہتے ہیں اور ہیولہ یعنی مادہ کو بھی کہتے ہیں کیونکہ اسی سے دنیا موجود ہوئی ہے۔

(5) لفظوں میں کچھ تغیر نہیں ہوتا، معنوں میں فرق آجاتا ہے۔ مثلاً:۔

سمن۔ فارس میں ایک خاص پھول کا نام ہے۔ سنسکرت سمن عام پھول کو کہتے ہیں۔

آش۔ فارسی میں اس کھانے کو کہتے ہیں جو پینے میں آئے۔ کتب لغت میں مطلق طعام کو بھی لکھا ہے مگر آشامیدن سے مشتق کہا ہے۔ سنسکرت میں آش کھانا ہے۔

دام۔ فارسی میں جال کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں دام رسی کو کہتے ہیں۔

(6) فقط جو ہر لفظ میں گھٹاؤ بڑھاؤ ہوتا ہے، معنوں میں فرق نہیں آتا۔ مثلاً:۔

یک۔ فارسی میں (1) ہے، سنسکرت میں ایک ہے۔

مہ۔ فارسی میں بڑے بزرگ کو کہتے ہیں، سنسکرت میں مہا ہے۔
پور۔ فارسی میں بیٹا ہے، سنسکرت میں پتر ہے۔
انگارہ۔ فارسی میں آگ کا دھکتا ڈلا ہے۔ سنسکرت میں بھی قریب قریب یہی معنی ہیں۔
(7) کمی بیشی کچھ نہ ہو، فقط کیفیت حروف میں فرق ہوتا ہے مثلاً :۔
اشتر۔ فارسی میں اونٹ ہے۔ سنسکرت میں اشٹر اونٹ کو کہتے ہیں۔
مشت۔ فارسی میں مٹھی ہے۔ سنسکرت میں مشٹ وہی مٹھی ہے۔
(8) کبھی مبادلہ کے ساتھ حرفوں کا پس و پیش ہوتا ہے۔ مثلاً فارسی کا چرخ چخ ہو کر چکر ہو گیا۔
(9) اختلافات مذکورہ میں سے کئی اختلاف ہوتے ہیں اور ساتھ ان کے معنوں میں بھی فرق آجاتا ہے :۔
آستان۔ فارسی میں گھر کی دہلیز ہے۔ ستان کثرت ظرفی کے لئے آتا ہے۔ مثلاً :۔ گلستاں، سوستاں، کوہستان۔ سنسکرت ستھان عموماً جگہ کو کہتے ہیں۔
شنا۔ فارسی میں تیرنے کو کہتے ہیں، سنسکرت میں سنان نہانا اور ظاہر ہے کہ بے نہانے کے تیرنا کب ہو سکتا ہے۔
کف۔ فارسی میں مشہور لفظ ہے۔ سنسکرت میں کچھ ایک خلط بدن ہے کہ اصل کف ہوتا ہے۔
بستر۔ فارسی میں بچھونا ہے۔ سنسکرت میں بسرت بچھا ہوا ہے۔
بندہ۔ فارسی میں غلام کو کہتے ہیں کیونکہ بند بہ معنی قید ہے، یہ بھی قید حکم، قید اطاعت یا قید وفا میں ہوتا ہے۔ اور سب سے بڑی قید اطاعت اور قید وفا خدا کی ماننی چاہئے۔ اس لئے بندۂ خدا ہوا۔ اسی سے بندگی بہ معنی اطاعت اور عبادت ہوئی۔ اور سنسکرت میں وند بہ معنی سلام اور عجز و نیاز ہے۔ چنانچہ شاگرد جب استاد کے سامنے جاتا ہے۔ وند جگت گروں اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اصل دونوں کی ایک ہے۔
آرام بن۔ فارسی میں اس باغ کو کہتے ہیں جو آبادی میں ہو۔ سنسکرت میں آرام عیش باغ کو کہتے ہیں۔ نور فارسی میں بن ایسے باغ کو کہتے ہیں جو شہر کے باہر ہو۔ اور کھیتوں اور

زراعت کو بھی کہتے ہیں۔

(10) احتیاط: ایک قسم کے اتحاد کا پرکھنا بڑے غور کا کام ہے۔ اس کی مثالوں کو سن کر اہل نظر ہشیار ہو جائیں گے اور سمجھیں گے کہ جب تک دو زبانوں میں پوری مہارت نہ ہو، دو لفظوں میں اتحاد اصلیت پر حکم لگانا خطرناک امر ہے۔ تم دیکھو گے کہ دو زبانوں کے بعض لفظوں میں حروف و حرکات کا اتفاقی اتفاق ہوتا ہے اور حقیقت میں ایک دوسرے سے اصلاً تعلق نہیں ہوتا۔ مثلاً:۔

جاروب۔ فارسی میں مشہور لفظ ہے۔ جاروب۔ اہل فارس تخفیف دیکر جارو بھی کہتے ہیں۔ ہندی میں جھاڑو ایک مستقل لفظ ہے کہ اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ اور جھاڑنا اس کا مصدر ہے۔ ناواقف سمجھتے ہیں کہ جھاڑو، جارو اور دونوں ایک ہیں۔

جناب۔ عربی کا ایک لفظ ہے۔ جنب اس کا ماخذ ہے۔ شمنک کے دائرہ میں سے ہے۔ ایرین سے کچھ تعلق نہیں۔ سنسکرت میں انہی معنوں میں مستعمل ہے اور تعظیمی موقع پر بولا جاتا ہے۔ لیکن وہ حقیقت میں مرکب ہے جن آدمی اور "او" رکھیا کرنے والا۔ اور۔ آپت سچا، معتبر، پرورندہ اور لائق بھی ہے۔ اسی واسطے جناب، جن، آپت، ناواقف آدمی دونوں کو ایک سمجھے گا اور جو دونوں زبانوں کی اصلوں سے واقف ہوگا، وہ اس پر ہنسے گا۔

انتقال۔ عربی لفظ ہے اس کا ماخذ نقل ہے۔ معنی ہیں۔ نقل مکان۔ مجازاً مرنے کو بھی کہتے ہیں۔ بعض ناواقفوں سے میں نے خود سنا۔ کہتے ہیں انت انتہایا موت۔ کال وقت، یعنی وقت اخیر، یا وقت موت۔ اور اس لئے کہتے ہیں کہ انت کال اور انتقال ایک ہی ہیں۔

اختیار عربی لفظ ہے۔ خیر، خیار اس کا ماخذ ہے۔ فارسی میں آکر اس نے اور معنی پیدا کر لئے۔ اتفاق ہے کہ ان معنوں میں زبان سنسکرت میں ادھی کار اور ہی لفظ ہے۔ ناواقف کہتے ہیں کہ دونوں ایک ہیں۔

انتہا۔ ایک شخص نے کہا کہ یہ جو لوگ کہتے ہیں۔ انتہا کا شوق پیدا ہوا اور انتہا کی خوشی ہوئی، یہ اصل میں سنسکرت سے نکلا ہے۔ انت تہایا ان تہاہ۔ وہ گھر او ریا جس کی تہ نہ ملے، اسے کیا معلوم کہ یہ عربی لفظ ہے۔ اس کا ماخذ نہایت ہے اور اس میں نفی کا کچھ تعلق نہیں۔

اپنا تجربہ: ایک دفعہ جوانی کی ہمت اور شوق سیاحت مل کر مجھے ترکستان کے ملک میں لے گئی۔ بلخ سے چند منزل آگے بڑھ کر ہمارا قافلہ اترا۔ ان ملکوں کے لوگ کم علم، کم معلومات ہوتے ہیں۔ اپنی آرام طلبی اور رستوں کی دشواری انہیں ادھر کے سفر میں سد راہ ہوتی ہے۔ اس لئے ہمارے ملک کے آدمیوں کے ساتھ شوق سے ملتے ہیں اور ذرا سی بات معلوم کر کے خوش ہوتے ہیں۔ چنانچہ گاؤں کے لوگ آ کر قافلہ میں پھرنے لگے۔ دستور ہے کہ اہل آبادی روٹیاں، گھی، دودھ، دہی، انڈے، گوشت، مرغیاں، قالین (اپنے ہاتھ کے بنے ہوئے) لاتے ہیں۔ قافلہ والے قیمت میں کپڑا، سوئیاں، رانگ، پیتل کی انگوٹھیاں، جگنیاں، کانچ اور شیشہ کے دانے دے کر خریدتے ہیں۔ ایک ترک بچہ طالب علم میرے بستر کے پاس آ بیٹھا۔ دو سکے[9] میرے ہاتھ میں تھے۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتے کرتے اس نے پوچھا۔ در ملک شما ہمیں تنگہ رواج دارد؟ ایک افغان کا بستر برابر تھا۔ وہ بولا کہ در ہند روپیہ کلدار است فرنگی بر اں تصویر خودرا نقش میکند۔ طالب علم نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ چہ طور؟ میں نے کہا۔ راست[10] میگوید۔ روپیہ ہندسہ برابر تنگہ شماست۔ اس نے پوچھا۔ تصویر چرا نقش میکند؟ میں نے کہا۔ سکہ سلطنت است۔ در دور دائرہ نام و میانہ اش تصویر شاہ است۔ آں ہم تمام نیست۔ کلہ اش را نقش میکند۔ ترک بچہ بولا۔ آرے ہمیں سبب روپیہ را کلہ دار نام کردہ باشند۔ کلدار کو کلہ دار کا مخفف سمجھا۔ خوب سمجھا۔ مگر غلط سمجھا۔

ایک دن میں دکان میں چند اشخاص کے ساتھ بیٹھا تھا۔ چائے کا دور چل رہا تھا۔ ایک بڈھے فرتوت نے پوچھا کہ در ملک شما فرنگی سلطنت مے کند؟ میں نے کہا، بلے۔ اس نے کہا۔ او چہ نام دارد؟ میں نے کہا۔ بادشاہ در ملک فرنگ بپایہ تخت خود است۔ برائے ما نائبے فرستادہ است۔ او حکم میراند۔ بادشاہ ما ہمانست۔ پوچھا۔ آخر او چہ نام دارد؟ میں نے کہا۔ بعد ہر چند سالے عوض میشود البتہ باعتبار عہدہ و منصب آنرا لات میگویند۔ ایک بولا گو بر ناس[9] باشد (یعنی گورنر) میں نے کہا۔ بلے، ہمچنیں۔ ایک اور ترک نے کہا۔ لدت چہ معنی دارد؟ میں نے تعامل کیا کہ کیا کہوں۔ دوسرا بولا۔ ہماں لدت و منات است۔ دوسرا بولا۔ نے! فرنگ بت پرست نیست۔ بڈھے ازبک نے کہا۔ آخر کافر

است۔ کفر بہر جا نیکیست۔ لات شاں ہماں لات و منات باشد۔

اب تم غور سے خیال کرو۔ ہندوستان میں جو انگریزی روپیہ کے لئے کلدار کا لفظ پیدا ہوا، یہ بھی ایک عجیب اور اتفاقی ولادت تھی۔ پھر بھولے بھالے ترک نے جو اس کے لئے وجہ نکالی یہ عجیب در عجیب اتفاق ہے۔

لاٹھ کو اور لارڈ کے معنوں کو دیکھو کہ ہندوستان میں آکر لفظ میں کیا تغیر پیدا ہوا؟ اور معنی اس کے یہاں کیا خیال پیدا کرتے ہیں؟ پھر اس ازبک کو دیکھو کہ کیا سمجھا اور دلیل کیا خوب پیدا کی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اصلیت الفاظ کی تحقیق بہت نازک کام ہے۔ قیاس و اندازہ ہمارا ہرگز قابل اطمینان نہیں۔ اندھیرے میں تیر پھینکتے ہیں۔ لگا تو لگا ورنہ یا قسمت۔

دیکھو! پہلا قدم اس تحقیق کا یہ ہے کہ جب دو لفظ دریافت طلب تمہارے سامنے آئیں تو ان کی ملتی ہوئی آواز اور یکساں شکل و شباہت پر نہ بھولو۔ ہر ایک کے جوڑ بند کو کھولو اور ان کی اصل کی طرف پیچھے ہٹو۔ اگر دو نو بیٹھتے بیٹھتے ایک اصل میں جا پہنچیں تو جانو ایک نسل ہے اور ایک گھر کے لفظ ہیں اور اگر اصلیں جدا جدا ہوں تو جانو کہ رشتہ کچھ نہیں فقط شباہت نے شبہ ڈالا تھا۔

اشکال حروف

(تحریر بہ تصویر)

یورپ کے محقق کہتے ہیں کہ اگلے زمانہ میں دل کے مطالب تصویروں سے جتایا کرتے تھے اور جہاں اشارہ یا آواز نہ پہنچ سکے وہاں شبیہ سے کام نکالتے تھے۔ چنانچہ جب کسی سے کوئی چیز منگانی ہوتی تو اس کی تصویر کھینچ کر بھیج دیتے تھے۔ اس ترکیب نے ترقی کی کہ تصویروں کو ترکیب دے کر مطالب کی زیادہ توضیح کرنے لگے۔ مصر کی پرانی تحریریں اس کو گواہی دیتی ہیں اور وہی تصویریں یہ بھی کہتی ہیں کہ حروف مذکورہ شمار میں حروف حال سے بہت زیادہ تھے۔ وہ اشخاص، عہدہ داروں، حیوانوں اور درختوں وغیرہ کی تصویریں ہوتی تھیں۔ چین میں عہد بہ عہد کی اصلاح کے بعد اب تک ایسی

تحریر جاری ہے اور یہی سبب ہے کہ ان کی الف بے تے میں سینکڑوں حروف ہیں۔

یورپ کے اہل تحقیق یہ بھی کہتے ہیں کہ عرب نے حروف تہجی عبرانی سے لئے ہیں۔ یہ بھی حقیقت میں مختلف تحریروں کے اختصار ہیں مثلاً الف کے معنی تھے سر کنڈا یا نرسل۔ دیکھ لو، حرف مذکور سرکنڈا ہے کہ ریگستان میں کھڑا ہے۔

ب : بیت کا مخفف ہے ابتدائے آبادانی میں گھر بھی سیدھے سادے مختصر ہوتے تھے۔ ب کو غور کر کے دیکھو، عرب کے ریگستان میں جنگل میں ایک دیوار کے دو کنارے مڑے ہوئے ہیں، وہ گھر ہے۔ گھر والا دیوار کے آگے بیٹھا ہے، وہ نقطہ ہے۔

ج : جمل کا مخفف ہے، یعنی اونٹ۔ یہ پہلے اونٹ کی تصویر تھی، اصلاحیں ہوتے ہوتے یہ صورت بن گئی۔

ش : شجر کا مخفف ہے پہلے  کی شکل کھینچتے تھے کہ ایک درخت ہے۔ 3 نقطے اس پر 3 پرندے ہیں۔ کوئی بیٹھا ہے، کوئی بیٹھنے کو ہے، ہوا میں تھرا رہا ہے وغیرہ وغیرہ۔ رفتہ رفتہ تصاویر مذکورہ یہ رہ گئیں جو دیکھتے ہو، اور تلفظ میں آواز کا پہلا حصہ رہ گیا جو سنتے ہو! اصل اشیاء کا جس طرح نام اڑ گیا، اسی طرح اصل نشان مٹ گیا۔

کیا سبب ہے کہ جس زبان کو دیکھو، دوسری زبان کے بعض حرف تہجی تو اس میں نظر آتے ہیں، بعض نہیں۔ پھر یہ کہ جو حرف ایک زبان کے لئے خاص ہیں، اس حرف والا لفظ جب دوسری زبان میں جاتا ہے تو حرف مذکور کسی اور حرف سے بدل جاتا ہے۔

اول یہ سمجھو کہ حروف تہجی کیا ہیں؟ زبان و دہان کے اختلاف جنبش سے جو آوازوں میں فرق پیدا ہوتے ہیں، ان کا نام حرف ہے۔ منہ، زبان اور گلے میں بال بال بھر فرق سے نیا حرف پیدا ہو جاتا ہے[12]۔ کاغذ پر جو لکھتے ہو، یہ گویا ان آوازوں کی تصویریں ہیں۔ تم نے قواعد فارسی میں پڑھا ہو گا کہ عرب کے 8 حرف فارسی میں نہیں آتے : ث۔ ح۔ ص۔ ض۔ ط۔ ظ۔ ع۔ ق۔ سبب اسکا فلسفی زبان سے سنو۔ کہتا ہے کہ ملک کی آب و ہوا اور آفرینش خاک کے اختلاف سے جس طرح اہل فارس کے قد و قامت اور شکل و شباہت میں فرق ہے اسی طرح ان کے لب و دہان اور گلا و زبان کی ساخت میں فرق ہے، اور اسی سبب سے ان کی حرکتوں میں بھی فرق ہے۔

جب اہل عرب ایران میں آئے تو اہل ملک کے لب و لہجہ میں بعض آوازیں پائیں کہ خاک عرب کی زبان میں نہ تھیں۔ یہاں ایرانی اپنی آواز تلفظ کو اپنے حروف میں لکھتے تھے اور اعراب کے لئے ایسی عمدہ علامتیں لگاتے تھے کہ کسی زبان میں نہ تھیں۔ عرب نے جب ان کی زبانوں کو لیا تو حروف ان کے چھوڑ دیے، اپنے حرفوں میں لکھنے لگے (جس طرح تم اب ہندی کو فارسی حرفوں میں لکھتے ہو)۔ فاضل عرب جو پہلے پہل ایک ایرانی کی تقریر کو تحریر کرنے لگا ہوگا، تو دیکھا ہوگا کہ ض کی آواز بالکل کان میں نہیں آتی۔ پھر خیال کیا ہوگا تو معلوم کیا ہوگا کہ ع، ق کی آواز بھی نہیں آئی وغیرہ وغیرہ۔ جب صفحے کے صفحے لکھ گیا اور ان میں حرف مذکورہ نہ آئے تو اس نے کہ دیا کہ یہ حرف فارسی میں نہیں ہیں۔ اسی کو کتب نحو میں بطور قاعدہ کے لکھ دیا گیا کہ 8 حرف عربی میں ہیں۔ جو فارسی میں نہیں آتے، ورنہ ان کے لکھنے یا بولنے کے لئے ملک فارس میں نہ کسی سے جو لب و دہان پیدا ہوئے، ان کی ساخت ایسی واقع ہوئی تھی کہ ان کے بولنے میں یہ آوازیں نہ تھیں ورنہ انسان ہر قسم کی آواز نکال سکتا ہے۔

اس تحریر میں فاضل عرب کو ایک آواز آئی کہ ب نہ تھی، مگر اس کے قریب قریب ایک آواز تھی، اور اسی واسطے اس کے پاس آواز مذکور کے لکھنے کے لئے کوئی حرف بھی نہ تھا۔ اصل فارسی میں اس کے لکھنے کے لئے الگ صورت موجود تھی۔ فاضل مذکور نے اپنی تحریر میں اس کے لئے حرف ب لکھا اور امتیاز کے لئے نقطے کر کے پ نیا حرف پیدا کیا۔

پھر ایک آواز آئی کہ ج کی آواز نہ تھی۔ اس کے قریب قریب ایک آواز تھی اس کے لئے ج کے نیچے 3 نقطے کر کے چ پیدا کر لیا۔ اسی طرح ژ۔ گ۔ اسے لوگ کہتے ہیں کہ فارسی کے 4 حرف عربی میں نہیں آتے۔ اور بات وہی ہے کہ خاک عرب نے جو گلے اور لب و دہان اور کلہ اور گلے کی حرکت میں جو آوازیں نکلتی تھیں، ان میں پ۔ چ۔ ژ۔ گ کی آوازیں بھی مقرر کیں جنہیں ہم حرف کہتے ہیں۔

اسی طرح فارس کے منہ اور گلوں میں تھ۔ ٹ۔ ٹھ۔ دھ۔ ڈ۔ ڈھ۔ ڑ۔ ڑاں۔ کھ۔ گھ وغیرہ کی آوازیں نہیں۔ فارسی مروجہ کی کارگزاری اب عربی کے حروف کر

رہے ہیں، اس لئے ان کی صورت ہندی کے لئے حرف بھی نہیں۔ اب تک کسی عرب یا ایرانی سے باتیں کر کے دیکھ لو، حروف مذکورہ ان کی زبان سے نہیں نکلتے۔ اور خاص خاص حرفوں کے ساتھ خاص خاص ملک کے لوگوں کا یہی حال ہے۔ تم سمجھتے ہو؟ جس طرح ہر ایک ملک کے آدمی کی طبیعت جدا ہے، اسی طرح دہان اور زبان کی طبیعت بھی جدا ہے۔ بعض آوازیں بعض دہانوں سے موافق ہیں، بعض منافر۔

خاک ہندوستان کی زبانوں میں خ۔ ذ۔ ز۔ ص۔ ض۔ ط۔ ظ۔ ع۔ غ۔ ف۔ ق کی آواز نہیں ہے۔ جب کوئی ایسے حروف والا لفظ سنسکرت یا کسی ہندی زبان میں جاتا ہے تو حرف مذکور دوسرے حرف سے بدل جاتا ہے۔ جب سلسلہ کلام یہاں تک پہنچا تو ایک سوال پیدا ہوا جس کا جواب فلسفی زبان آسان طور پر سمجھاتا ہے:۔

س: کیا سبب ہے کہ جہاں ایک زبان کا لفظ دوسری زبان میں گیا ہے تو بعض حروف و حرکات اول بدل اور الٹ پلٹ ہو گئے ہیں؟

ج: عزیزان وطن ادور کیوں جاتے ہو۔ تم ایک ہی زبان میں پاؤ گے کہ:

سوفار	سوفال	چست	چغت
چنار	چنال	باغچہ	باغسہ
لبالب	لمالم	پاس	پاد۔ اسی سے ہے پادشاہ
بت	بد	خروس	خروج۔ خروہ
توت	تود	رخش	رخت
دراج	تراج	خوف	خوگ

ایسے ایسے ہزاروں لفظ ہیں کہ فارسی ہیں اور فارسی میں دونوں طرح مستعمل ہیں۔ یہ نہ سمجھنا کہ جن حرفوں کا مبادلہ کتب قواعد میں لکھا ہے، کسی شریعت کی کتاب یا ملک کے بادشاہ نے جائز کیا ہے اور باقی ممنوع۔ بات یہ ہے کہ جو حرف قریب المخرج ہیں وہ باہم بدل جاتے ہیں۔ جن حرفوں کے مخرج دور ہیں اور جن کے مقام بہت پاس پاس ہیں، وہ نہیں بدلتے۔ اس مقام پر ممکن ہے کہ ہر حرف کا مخرج لکھ کر پاس اور دور کا فرق دکھاؤں، مگر نہیں چاہتا کہ کتاب کو مشکلات کی پڑیا بنا کر طبیعتوں کو بد مزہ کروں۔ اس

لئے مطلب کی تصویر نئے رنگ سے کھینچتا ہوں۔

مثلاً ملک ایران میں قطعہ قطعہ کی آب و ہوا اور مخلوقات کے اعضا کی ساخت میں کہیں بہت کہیں تھوڑا فرق ہے۔ اسی نسبت سے ان کی جنبشوں میں فرق ہے۔ اسی کے بموجب آوازیں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک ملک کے لوگ بعض حرف صفائی اور آسانی سے بعض حرف مشکل سے نکالتے ہیں۔ جو حرف مشکل سے نکلتے ہیں، جب وہاں ٹھیک زبان نہ لگی تو ان کے پاس کا حرف پیدا ہو گیا، یعنی سوفار کا سوفال بن گیا۔

تبریز وغیرہ قطعات ایران کے لوگوں کی زبان سے گ نہیں نکلتا۔ اس ملک کے لوگ سگ کو سے اور انگور کو اینور کہتے ہیں اور اسی طرح اور صدہا الفاظ۔ اکثر صحرا نشین فرمود کو پر مود کہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ انہی حرفوں کے مبادلے جائز سمجھو۔

کشمیری تازہ وارد سے باتیں کرو۔ جن لفظوں کے اول میں آ ہے، ی بولے گا۔

مصرع: بلبلی غنچہ امید بخشا۔ اور ایران کو ییران کہے گا۔ "ل" کو تالو کے اندر سے اس طرح نکالتا ہے کہ ساری آواز گلے میں گتھل ہو جاتی ہے۔ کیفیت اس کی سننے پر منحصر ہے۔ تحریر میں نہیں آ سکتی۔ آصف الدولہ مرحوم کے عہد میں بدہ لوکنو کے درمیان موجود تھی۔ وغیرہ۔

اہل پنجاب سے باتیں کرو تو ذرا خیال رکھنا۔ گیارہ کو ہمیشہ یارہ کہتے ہیں۔

اپنے ملک میں سن لو۔ اہل شہر کے منہ سے سارے حرف کیسی صفائی سے نکلتے ہیں۔ ان کی زبان کیسی نرم اور تیز معلوم ہوتی ہے اور گلا گداز۔ باہر والے خصوصاً نا خواندوں کی زبان سخت اور موٹی معلوم ہوتی ہے۔ اس سے ہر حرف آسانی سے نہیں نکل سکتا۔ بعض حرفوں میں زبان ٹھیک جگہ پر نہیں لگتی۔ ذرا ورے پرے لگ جاتی ہے کوئی اور حرف پیدا ہو جاتا ہے۔ اس طرح کے سکر۔ سردل۔ ہزاروں لفظ بولتے ہیں۔ کہیں تشدید، کہیں کوئی حرف ہی بڑھا دیتے ہیں کہیں گھٹا دیتے ہیں۔

زبان	کو	جبان
حضور	کو	تجور
خالی	کو	کھالی

فرمانا کو پھرمانا

آنا کو اناور آنا

روٹی کو روٹی (شد کے ساتھ)

پانی کو پانڑیں

اکثر لفظوں میں حرفوں کو آگے پیچھے کر دیتے ہیں۔ کہیں کہیں شہر کے عوام بھی ان میں مل جاتے ہیں اور اس سے معلوم ہوا کہ ایسی تبدیلیاں زبان انسانی کا خاصہ ہے۔

مطلب کو مطلبل

فصیل کو صفیل

قفل کو قلف

لعنت کو نالت

اسی خیال کی تصویر ایک اور رنگ سے کھینچتا ہوں۔ ذرا ننھے ننھے بچوں کو دیکھو۔ کیا مزے سے تتلا تتلا کر باتیں کرتے ہیں ایک تکیہ پر چڑھ بیٹھا ہے اور کہتا ہے "آہا ہم دولے پل چلے" (ہم گھوڑے پر چڑھے) دوسرا کہتا ہے "ہمالی لال دیند، تمالی چھبجہ دیند. (ہماری لال گیند، تمہاری سبز گیند)۔ بگڑتے ہیں تو کہتے ہیں "ماونگا۔ مالو ندا" (ماروں گا) بھوک لگتی ہے تو کہتا ہے: "لوتی تاؤنگا"۔ کوئی کہتا ہے۔ "اوتی کھاؤنگا۔ بوت لدی ئے" (روٹی کھاؤں گا۔ بھوک لگی ہے)۔

• فلسفی زبان انہی میں سے مبادلہ حروف کے اصول نکالتا ہے۔ بچوں کے مزاج اور اعضا میں رطوبت زیادہ ہوتی ہے۔ غدود اور پٹھے پھولے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کے لب و دہان میں تیزی و بکی نہیں ہوتی کہ جب کوئی لفظ بولیں، ہر حرف کے لئے نقطہ نقطہ زبان کا منہ کے ٹھیک اسی نقطہ پر لگے۔ جو اس کا اصلی مخرج ہے۔ کبھی ذرا آگے کبھی ذرا پیچھے لگ جاتی ہے۔ نتیجہ اس کا وہی کہ اصل حرف کی جگہ اس کا قریب المخرج کوئی اور حرف نکل جاتا ہے۔ تم خود ذرا ذرا ورے پرے زبان لگا کر "د" اور "ت" کا تجربہ کر لو۔ دو چار دفعہ متواتر۔ دل۔ دل۔ تل۔ پھر۔ دل۔ تل۔ برابر۔ دل تل کہہ کر دیکھو۔ خیال کرنے سے کچھ ان کے قریب مخرج کا اثر معلوم ہوگا۔

اسی طرح دو چار دفعہ کہو بار، بال اور تار، تال۔ تمھیں معلوم ہو گا کہ راور ل قریب المخرج ہیں۔ اور ایسے ایسے چند حرف اور ہیں کہ قرب مذکور کے سبب سے بچوں اور بڑوں کی زبانوں پر اول بدل ہو جاتے ہیں۔ اور جو حرف ایسے نہیں یعنی بعید المخرج ہیں۔ ان میں اول بدل بھی نہیں ہوتی۔ انھی سے فلسفی زبان نے مبادلات حروف کے قواعد باندھے ہیں۔ مختلف زبانوں میں غور کر کے دیکھو۔ وہاں بھی اکثر انھیں حرفوں میں تبدیلی ہوتی ہو گی جو قریب المخرج ہیں۔

س : قواعد فارسی میں ایک فصل مفصل مبادلہ حروف کی کیونکر بن گئی؟

ج : عہد قدیم سے ایران کے ہر قطعہ زمین میں علم کا چرچا ہے۔ علماء خصوصاً شعراء، صاحب تصنیف ہوتے ہیں۔ ان کے تلفظ اور لہجے جدا جدا ہیں۔ جو الفاظ شعراء کے کلام، علماء کی تصنیف میں آ گئے، اہل لغت کو ان کا لکھنا اور اہل قواعد کو اپنے سلسلہ میں کھینچنا واجب ہوا۔ وہ مستقل الفاظ بن گئے اور تحریروں اور تقریروں میں دونوں طرح مستعمل ہو گئے۔ ملک اور غیر ملک کے لوگ انھیں بھی لغت جانتے اور مانتے ہیں اور ایسا ہونا چاہیے۔ کیونکہ جو الفاظ خاص و عام کے استعمال میں اور تحریر تقریر میں عام و تام ہوں اور اقسام اغراض کے پورا کرنے میں کام دیں وہی اس کے الفاظ و لغات ہیں۔

نکتہ : تجربہ اور مشاہدہ نے قانون بتایا کہ اکثر الفاظ ابتدا میں لچر اور غلط شمار ہوتے ہیں۔ پھر اگر محاورہ نے انھیں منظور کر لیا اور خواص نے زبان میں جگہ دی اور نظم و نثر نے تحریری سند دیدی تو وہی غلط سلط لفظ مستقل لغت ہو کر اجزائے زبان ہو جاتے ہیں اور جو تبدیلی کہ کوتاہی تکلم یا غلطی مخرج سمجھی جاتی تھی وہی ایک عرصہ کے بعد تعلیل و تبدیلی کا قاعدہ ہو جاتی ہے۔ اور اس سے یہ قاعدہ نکلا کہ ملک سخن میں کوئی لفظ صحیح نہیں، کوئی لفظ غلط نہیں۔ جس پر قبول عام اور رواج تام مہر کر دے، وہ ایک لفظ صحیح ہے۔ یہ نہ ہو تو صحیح بھی مردود۔

اصفہان، شیراز وغیرہ اکثر مشہور شہر ایران کے ہیں۔ وہاں کے خاص و عام ایران کو ایرون، زبان کو زبون کہتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔ مگر قافیہ میں نہیں باندھتے، نہ کتاب میں لکھتے ہیں۔ اس واسطے یہ تبدل اور اس کا تلفظ غلط ہو کر لغت سے خارج ہوا۔

نقل۔ کسی بے استعداد شاعر ایرانی کے شعر کا ایک مصرع مجھے یاد ہے ع

کار معجون کمونی[13] ے کند پیکان او

کمان کو تمام ملک ایران کمون کہتا ہے۔ یہ بے چارہ بے علمی کے سبب سے غلط کو اصلیت سمجھا اور اس سے ایک مضمون شاعرانہ پیدا کر لیا۔ کمون غلط ہے مگر لطف شعر کی بنیاد اسی پر ہے۔

لطیفہ: ایک ایرانی صاحب زبان سے کسی ہندی نے کہا: "آغا! اکثر اہل ایران را دیدم، بجاے رغ، ق میگویند "ایرانی چمک کر بولا" کے قلط گفتہ باشد۔"

فارسی اور سنسکرت کے متحد الاصل لفظوں میں کن اصول کے بموجب تبدیلیاں ہوئی ہیں۔

عزیزان وطن! اب مطلب کا میدان آیا۔ فلسفہ زبان کے تمام خیالات ایک نقشہ کی طرح سامنے کھنچے ہیں۔ ان سے تم خوب سمجھ سکتے ہو کہ دونوں زبانوں میں جو تبدیلیاں ہوئیں وہ خود بخود طبیعت ملک اور طبیعت زبان کے زور سے ہوئی ہیں میں ایک ایک حرف کا حال مثالیں دے کر تمہیں دکھاتا ہوں۔ دیکھو زبان کی طبیعت نے کن قواعد کے سلسلہ میں جنبش کی ہے۔ اس کی بعض تبدیلیوں پر تمہیں ضرور تامل ہو گا۔ اور بے شک نقطہ نقطہ پر اٹکنا چاہئے کہ تحقیق میں کسر نہ رہ جائے۔ اور شاید اسی میں کوئی نقطہ نکل آئے۔ مذکورہ بالا بیانوں میں تم نے دیکھا کہ اکثر لفظ اور معنوں میں جو تبدیلیاں ہوئیں کتابوں میں لکھی ہیں، بلکہ اکثر تغیر ہماری آنکھوں کے سامنے ہوئے ہیں۔ جبکہ وہ تغیر ان تغیروں سے کم نہیں۔ تو ان لفظوں کو ہڈیوں کی قرابت کے گوشت سے کیوں الگ کرتے ہو۔ ہزاروں برس گزر گئے۔ یہ بہنیں جدا ہوئیں۔ ہزاروں کوس کے پردیس میں جا پڑیں۔ دونوں پر اپنی اپنی جگہ مذہبوں اور سلطنتوں کے انقلاب سے طوفان نوح گزر گئے۔ ملکوں کی آب و ہوا نے آدمیوں کے گلوں اور جبڑوں کی ساخت، لب و دہان کی حرکتیں، گلوں کی آوازیں، زبان کے لہجے بدل دیئے۔ زمانہ کی گردشوں نے ان کے

لفظوں کو گھسا پسا کر کچھ کا کچھ کر دیا۔ پس جو تغیر ان کے حرفوں میں نظر آئے تھوڑا ہے اور جتنی صورتیں ملتی جلتی باقی رہیں غنیمت ہے۔ بہر حال اب میں ایک ایک حرف اور اس کے ساتھ کچھ کچھ الفاظ لکھتا ہوں۔ اس سے معلوم ہو گا کہ کس کس طرح تبدیلی نے ان پر اثر کیا ہے۔

اس مقام پر میں حرفوں کے مخرج ایک فہرست کی صورت میں لکھتا ہوں کہ ہر ایک حرف کہاں کہاں سے آواز دیتا ہے۔ تم دیکھو گے کہ جو حرف قریب المخرج ہیں وہی آپس میں ادل بدل ہوتے ہیں۔

مخرج اول۔ ء ہ : گلے کے نیچے سے نکلتے ہیں۔

دوم۔ خ۔ غ : ان سے ذرا اوپر سے نکلتے ہیں یعنی کوے کے پاس سے۔

سوم۔ ق۔ ک۔ گ : کوئے کے اوپر سے۔

چہارم۔ ش۔ ج۔ چ۔ ژ۔ ے : ان سے بھی اوپر سے یعنی وسط زبان اور تالو سے۔

پنجم۔ ل۔ ن۔ ر۔ ڑ : نوک زبان اور اوپر والے سامنے کے دانتوں سے مل کر نکلتے ہیں۔

ششم۔ ٹ۔ ت۔ د۔ ڈ : نوک زبان اور اوپر والے دانتوں کی جڑ سے مل کر۔

ہفتم۔ س ز : نوک زبان اور نیچے والے دانتوں سے مل کر۔

ہشتم۔ ب۔ پ۔ ف۔ م۔ و : دونوں ہونٹوں سے مل کر نکلتے ہیں۔

حرکات

جس طرح تینوں مقصورہ حرکتیں اَ اِ اُ اور تینوں ممدودہ حرکتیں آ۔ ای۔ او وغیرہ سنسکرت میں اجزائے حرفی کے ساتھ لکھی جاتی ہیں، اسی طرح ژند اور پہلوی میں ہیں۔ کئی قسم کے ن جس طرح سنسکرت میں خاص خاص صورتوں کے ساتھ لکھے جاتے ہیں اسی طرح ان میں لکھے جاتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ جب کتابت میں زبان مذکور نے حروف عربی کا لباس پہنا، تو پہلی صورتیں بدل گئیں۔

ابتدا بہ سکون سنسکرت میں عام ہے۔ عجب نہیں کہ فارس کی قدیم زبانوں میں بھی پہلا حرف ساکن ہوتا ہو۔ خاک عرب کی طبیعت میں ابتدا بہ سکون نہ تھا۔ عرب اسی کے عادی تھے، اور اسلام کے بعد فارس میں ابتدائی مصنف عرب ہی تھے۔ یا ان کے شاگرد۔ تم یہ بھی سنتے ہو کہ بعض الفاظ فارسی کے اول میں الف اصلی ہے۔ بعض میں زائد ہے۔ کیا عجب ہے کہ انھوں نے جس لفظ کا پہلا حرف ساکن سنا ہو، اپنے تلفظ کی آسانی کے لیے اول ایک الف متحرک لگا دیا ہو۔ وہ زائد مشہور ہو گیا۔ جیسے اشگرف، شگرف۔ اسمندر، سمندر۔ اشکم، شکم۔ اشتر، شتر۔ دونوں طرح بولتے ہیں۔ آج کون کہہ سکتا ہے کہ ان میں کہاں الف اصلی ہے اور کہاں عرب کا عطیہ ہے۔ ذرا غور کر کے دیکھو! جب لفظ کے اول سے الف گراتے ہو تو زبان کی طبیعت چاہتی ہے کہ بعد کا حرف ساکن ہو۔ ہماری زبان کو اس کی عادت نہیں، اس لیے کچھ حرکت دے دیتے ہیں۔ غرض جب ہم دیکھتے ہیں کہ طرز تحریر، اقسام حرکات وغیرہ وغیرہ بہت سی باتیں سنسکرت کے مطابق ہیں تو ابتدا بہ سکون پر تعجب کیوں کریں!

تعجب ہے تو یہ ہے کہ سنسکرت کا قلم بائیں ہاتھ سے داہنے ہاتھ کو چلتا ہے اور ژند کا دہنے سے بائیں کو اور اس کا سبب اکثر پارسیوں اور جرمن کے عالموں سے بھی پوچھا، کچھ معلوم نہ ہوا۔

الف مدہ

کہیں فارسی میں ہے سنسکرت میں نہیں، کہیں سنسکرت میں ہے فارسی میں نہیں۔

(1) بستر، فارسی میں چھوٹے سے بچھونے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں بستار بچھانے کو کہتے ہیں۔

ترس، فارسی ڈر ہے۔ سنسکرت میں تراش کے یہی معنی ہیں۔

مہ۔ فارسی میں بزرگ کو کہتے ہیں، سنسکرت میں مہا ہے۔

دو۔ فارسی میں 2 کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں دوا یا دوتیا ہے۔ زلو اور زلوک فارسی

میں جونک کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں جلوکا ہے۔

شاخ۔ فارسی ہے۔ سنسکرت شاکھا ہے۔

(2) گاؤ۔ فارسی۔ سنسکرت میں گو کہتے ہیں۔

پار۔ فارسی میں سال گزشتہ اور اس سے پہلے برس کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں پر ہے اور اس میں اس سے زیادہ وسعت ہے۔ چنانچہ پوتر بیٹا پوترپوتا ہے۔ پتامہ، دادا، پرپتامہ پردادا ہے۔

پارینہ۔ کتب فارسی میں لکھا ہے کہ منسوب بہ پار ہے۔ اسی واسطے پرانے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں پران پراتا اور پراتن اور پراچین پرانے کو کہتے ہیں۔ کیا عجب ہے کہ پراچین۔ پرائین سے پارینہ ہو گیا ہو۔ دیکھو پارینہ کا پراناپن ایک برس کا نہیں معلوم ہوتا۔

ناؤ۔ فارسی میں چھوٹی کشتی کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں نو کہتے ہیں۔

مندک۔ فارسی میں اس چیز کو کہتے ہیں جس کی فروخت کا بازار میں کم رواج ہو جائے۔ سنسکرت میں مند۔ ہوڑا، بے نصیب، برا، ست، بیمار، کمینہ، بے عقل ہے۔

کافور فارسی ہے۔ سنسکرت میں کرپور ہے۔

الف متحرک

فارسی میں اکثر اصلی ہوتا ہے۔ اس طرح کہ حذف نہیں ہو سکتا۔ جیسے اختر، ارمغان وغیرہ صدہا لفظ ہیں۔ کہیں حذف بھی ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اشتر، شتر، اسمندر، سمندر وغیرہ۔ ابھی بیان ہوا ہے کہ دونوں طرح آتے ہیں۔ کہیں اہل زبان خود زیادہ کر دیتے ہیں۔ یا یہ کہو کہ اصلی گرا دیتے ہیں۔ جیسے بر، ابر، بے، ابے، با، ابا۔ یہ زیادتی نظم میں ہوتی ہے۔ نثر میں نہیں۔ وہ بھی چھ سات سو برس پہلے ہوتی تھی۔ کئی سو برس متروک رہی۔ چالیس پچاس برس سے پھر قصائد میں استعمال کرنے لگے ہیں۔ برخلاف اس کے اگر جو حرف شرط ہے، ہمیشہ نظم و نثر دونوں میں آتا ہے اور گر فقط نظم میں آتا ہے۔ از بھی نظم و نثر دونوں میں آتا ہے۔ ز فقط نظم میں ہو جاتا ہے۔ ان الفاظ کو دیکھ کر

سمجھ میں آتا ہے کہ الف متحرک کے مزاج میں دونوں قوتیں ہیں۔ گرنا بھی اور زیادہ ہونا بھی۔ معلوم ہوگا کہ "ا" اور "ہ" قریب المخرج ہیں، اسی واسطے فارسی کے اکثر لفظوں میں "ا" عموماً "ہ" سے بدل جاتا ہے۔ مثلاً افیون، ہپیون وغیرہ اکثر الفاظ ہیں کہ اہل زبان میں دونوں طرح مستعمل ہیں۔ معلوم ہوا کہ ان دونوں حرفوں کے مزاج میں مبادلہ کا میلان ہے۔ اس صورت میں اگر کوئی لفظ ایسا ہو کہ اس کا الف متحرک ہ سے بدلیں اور لفظ مذکور سنسکرت میں جا ملے تو صاف سمجھ لو کہ اصل میں اس چیز کا ایک ہی نام تھا۔ دوسرے ملک میں جا کر جس طرح اہل ملک کے رنگ وروپ، ڈیل ڈول، وضع لباس بدلے، اسی طرح ان کے لب ودہان کی نئی جنبش نے لفظوں پر اثر کیا۔ الف کا مزاج قرب مخرج کے سبب سے ہ کی طرف مائل تھا، اس لیے ہ بن گیا۔ لفظ کی صورت بدل گئی۔ بے خبر سمجھتے ہیں کہ اس شے کو فارسی میں یہ کہتے ہیں اور سنسکرت میں وہ۔ حقیقت میں دونوں ایک ہیں۔

اب میں الف کے گرنے کی مثالیں دیتا ہوں :۔

یک، فارسی میں عدد ا ہے، وہی سنسکرت میں ایک ہے۔

ابرو، فارسی میں بھوں کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں بھرو ہے۔

ستہ۔ بفتحتین اور کبھی بہ تشدید۔ فارسی میں باسی چیز کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں استوہ کہتے ہیں۔

اب دیکھو "ا" کیونکر "ہ" سے بدلتا ہے۔

اے، فارسی میں حرف ندا ہے۔ سنسکرت میں "ہے" کہہ کر پکارتے ہیں اور اے۔

استہ اور ہستہ فارسی میں عموماً ہڈی کو کہتے ہیں اور گٹھلی کو بھی کہتے ہیں۔ مثلاً ہستہ خرما (کھجور کی گٹھلی) ہستہ شفتالو (آڑو کی گٹھلی) سنسکرت میں استھی عام ہڈی کو کہتے ہیں۔ تھ مخلوط الہا تھی۔ وہ خالص "ت" ہوگئی۔ اس کی "ہ" اخیر میں ہائے مختفی ہوگئی۔ "ی" حذف ہوگئی۔ تغیر زبان اور تغیر لہجہ سے ایسا اور اس سے بہت زیادہ ہوتا ہے۔

انگوزہ فارسی میں ہینگ کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں ہنگو ہے۔ زہ فارس میں زیادہ ہوا

یا ہند میں اڑ گیا۔

فارسی کا الف ابتدائی کبھی "ے" ہو جاتا ہے۔ جیسے آمد۔ بیامد۔ افتاد، بیفتاد وغیرہ۔ سنسکرت میں بھی یہی دیکھا جاتا ہے۔

ایدر، فارسی میں ادھر اور یہاں کے معنی دیتا ہے۔ سنسکرت میں اتر یہاں اور ان یتر غیر این جا اور تتر وہاں کو کہتے ہیں۔ وہی اتر برج میں بگڑ کر ایدھر ہوا اور اب بگڑ کر ادھر ہو گیا۔ جب ہندوستان میں رہ کر یہ تبدیلی ہوئی اور اس پر تمہیں تعجب نہیں آتا تو فارس میں جا کر جو تبدیلی ہوئی اس پر کیوں تعجب کرو۔

الف ممدودہ

فارسی میں جن لفظوں کے اول میں الف ممدودہ ہوتا ہے، کبھی گر پڑتا ہے، کبھی الف مفتوحہ رہ جاتا ہے اور لفظ کی صحت میں فرق نہیں آتا۔ اگر ایسی تبدیلی سے کوئی فارسی لفظ سنسکرت ہو جائے تو تعجب نہ کرنا چاہیے، کیونکہ یہ تغیر طبیعت میں داخل ہے۔

اورک، فارسی لفظ ہے۔ سنسکرت میں آدرک کہتے ہیں۔ الف ممدودہ کی طبیعت تمہیں معلوم ہو گئی کہ مد کسی لفظ میں فقط زبر رہ جاتا ہے۔ اس لیے کہہ سکتے ہیں کہ لفظ ایک ہے، الف کی کیفیت میں تبدیلی ہو گئی۔ مد حذف ہو گئی۔

آہار، فارسی میں بہ معنی خوراک ہے۔ سنسکرت میں آہار خوراک کو کہتے ہیں۔ فرق اتنا ہے کہ اہار اب فارس کی تحریر اور محاورہ میں نہیں۔ ناہار محاورہ اور تحریر دونوں میں ہے۔ صبح سے جب تک کھانا نہ کھاؤ، ناہار ہو (یعنی کچھ نہیں کھایا)۔

اشن۔ فارسی میں اس خوراک کو کہتے ہیں جو پی جائے۔ سنسکرت میں اشن خوراک اور اشت اس شخص کو کہتے ہیں جو کھانا کھائے ہو۔ فارسی میں ناشتا بہ معنی ناہار ہے۔ یعنی جب تک کچھ نہ کھایا ہو۔ قیاس کہتا ہے کہ عہد قدیم میں وہاں بھی اشتا بہ معنی خوراک خوردہ یا خوراک ہوگا۔ اب متروک ہو گیا۔

آتش، فارسی ہے۔ سنسکرت میں ہتاشن 14 خورندہ خود و فنا کنندہ خود ہے۔ اسی

لحاظ سے آتش کو بھی ہتاشن کہتے ہیں۔ چونکہ فارسی میں "آ" کبھی "ا" ہو جاتا ہے اور "ا" اکثر "ہ" سے بدل جاتا ہے۔ کیا عجب ہے کہ مدت دراز گذر کر تغیر لہجہ سے آنے ہ کی آواز پیدا کی ہو۔ ن زائد اور محذوف فارسی اور سنسکرت دونوں میں آتا ہے۔ حرفوں اور حرکتوں کی تبدیلی ہوتے ہوتے آتش ہو گیا ہو۔

آستان۔ فارسی میں دروازہ یا دہلیز کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں ستھان عموماً جگہ کو کہتے ہیں۔ فارسی میں ابھی دیکھ لیا کہ اپنے گھر میں الف ممدودہ کبھی فقط مفتوحہ ہی بولا جاتا ہے، کبھی حذف ہو جاتا ہے۔ یہاں اس کے ہونے یا نہ ہونے سے آپس کے اتفاق میں کیوں خلل ڈالیں۔

آغاز، فارسی میں شروع کو کہتے ہیں سنسکرت میں اگر ہے اور برج بھاشا میں آگا فارسی میں "ر" الف ہو گئی۔ "ز" زیادہ ہو گئی۔

ب

"ب" اور و قریب المخرج ہیں۔ گویا دونوں کی طبیعتیں موافق ہیں، اس لیے فارسی زبان میں بھی باہم مبادلہ ہو جاتا ہے۔ مثلاً سیب، سیو، آب، آو، باز، واز، بڑے بڑے پنڈتوں کو دیکھا، جب سنسکرت الفاظ بولتے ہیں تو نہیں کھلتا کہ "ب" بول گئے یا "و"۔ یہی سبب ہے کہ فارسی کے اکثر الفاظ جو سنسکرت سے متحد الاصل ہیں، ان میں ب و سے بدلی ہوئی ہے۔

آبستن۔ آبست۔ آبست فارسی میں زن حاملہ اور وہ زمین ہے جو کھیتی کے لیے تیار کریں۔ آبشت۔ نہفتہ و پنہاں۔ سنسکرت میں آوشت ایک چیز کا دوسری میں گھس جانا ہے۔ چونکہ نہفتگی دونوں میں آشکارا ہے اس لیے عجب نہیں کہ دونوں کی اصل ایک ہو۔

بانگ۔ فارسی میں آواز ہے۔ سنسکرت میں واک آواز ہے اور جب یہ لفظ کسی ایسے لفظ سے ملتا ہے، جس کے اول میں م یا ن ہے تو وانگ کی آواز پیدا کرتا ہے۔ دیکھو وہی فارسی میں بانگ ہے۔

بار۔ فارسی میں ایک بار، دوبارہ، سہ بار، سنسکرت میں وار کے یہی معنی ہیں۔

تاب اور تاو۔ فارسی میں گرمی اور چمک کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں تاؤ ہے اور اصل میں وہ بھی تپ ہے۔

بیوہ۔ فارسی میں رانڈ عورت کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں ودھوا ہے۔

بیو۔ بیوک۔ فارسی میں نئی بیاہی عورت کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں ودواہ اور بواہ بیاہ کو کہتے ہیں۔

باد۔ ہوا ہے۔ سنسکرت میں وات ہے۔

بند۔ اسی سے فارسی میں ہے پائے بند۔ سنسکرت میں کہتے ہیں پاد وندھ پاد یعنی پائے، وندھ بندھا ہوا۔

بندہ۔ فارسی میں خدمتگار و تابع فرمان کو کہتے ہیں۔ اسی سے ہے بندگی بہ معنی طاعت واطاعت۔ سنسکرت میں وند بہ معنی فرمانبرداری ہے۔ چنانچہ شاگرد استاد کے سامنے جاتا ہے تو کہتا ہے وندے جگت گروہمو (اطاعت ہے استاد عالم کی)۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اصل دونوں کی ایک ہے۔

بھ

عرب اور فارس کے گلے میں یہ آواز نہیں ہے۔ تم نے گفتگو میں ان ملکوں کے اشخاص کو سنا ہوگا کہ ان حرفوں کے تلفظ میں خالص ب اور پ بولے ہیں۔ اور بھائی کو بائی اور پھول کو پول کہتے ہیں۔ چنانچہ ان حرفوں کے مبادلہ سے اکثر فارسی اور سنسکرت کے لفظ مل جاتے ہیں۔

ابر۔ فارسی میں بادل ہے۔ سنسکرت میں ابھر ہے۔

ابرو۔ سنسکرت میں ابھرو ہے۔

بیم۔ فارسی میں ڈر کو کہتے ہیں۔ بھے خوف اور بھیم خوفناک امر کو کہتے ہیں۔

بار۔ فارسی میں بوجھ کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں بھار ہے۔

بخش۔ فارسی میں حصہ کو کہتے ہیں اور ژند میں بھی یہی ہے۔ سنسکرت میں بھاگ

ہے اور بجھ سے بھی ہو سکتا ہے اور شاید وہی لفظ ہو جو سنسکرت میں پکش ہے۔

بروار۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں وہی بھراتر ہے

بروت۔ فارسی میں موچھ کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں بھرودت کہتے ہیں۔ بھرو بہ معنی ابرو ہے اور دت مفید فاعلیت۔ چونکہ موچھیں بھوؤں کے مقابل واقع ہوئی ہیں، گویا بھوؤں کی صاحب رتبہ ہیں، اس لیے ان کا نام بھرودت رکھا۔

آزاد۔ عجب نہیں کہ اہل فارس کے بزرگ بھی اس اصلیت سے آگاہ ہوں۔ محاورہ میں چار ابرو زدن۔ سارے چہرہ کی صفائی سے مراد ہے۔

بوم۔ فارسی میں زمین، جگہ اور مقام کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں بھومی اور بھوم بہ معنی زمین ہے۔

بتہ۔ بتو فارسی میں خشکے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں بھکت کہتے ہیں۔ جس طرح برج کی زبان میں بھات اور بھتہ ہو گیا، اسی طرح فارسی میں تبدیلی ہو گئی ہو گی۔

پ

فارسی لفظوں کی ب کبھی سنسکرت میں پ کی آواز دیتی ہے اور یہ کچھ تعجب کی بات نہیں۔ ترک وطن اور تغیر آب و ہوا سے آواز بدل گئی۔

باب۔ فارسی میں باپ کو کہتے ہیں اور اس میں پیار کا آ لگا کر بابا کہتے ہیں۔ وہی سنسکرت اور ژند میں باپ ہے۔

شب۔ فارسی میں رات کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں شپا ہے۔

کبوتر۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں کپوت کہتے ہیں۔

کرباس۔ فارسی میں روئی اور سوت کے بنے ہوئے کپڑے کو کہتے ہیں۔ وہی سنسکرت میں کپاس ہے۔

آب۔ فارسی میں پانی ہے۔ سنسکرت میں آپ کہتے ہیں۔

تباس۔ فارسی میں بہ معنی عبادت ہے۔ سنسکرت میں تپسیا عبادت کو کہتے ہیں۔

بود۔ فارسی میں بانے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں اسے بیوتی کہتے ہیں۔ کبھی

فارسی کی پ سنسکرت میں واؤ کی آواز دیتی ہے۔

اسپ۔ فارسی میں گھوڑے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں وہی اشو ہے۔

کبھی حذف بھی ہو جاتی ہے۔

وای۔ فارسی میں باولی کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں واپی اور بھاشا میں واں یا وائیں کہتے ہیں۔ اور یہ کون کہہ سکتا ہے کہ پ اصل میں نہ تھی، سنسکرت میں زیادہ ہو گئی یا اصل میں تھی، فارسی میں فرسودہ ہو گئی۔ اب بھی عرف عام میں وائیں یا بائیں کہتے ہیں۔ دلی میں احمد کی بائیں ایک مشہور باولی ہے۔

ت

قرب مخرج اور مناسبت طبع نے اپنے گھر (یعنی فارسی) میں بھی دال کے مبادلہ پر بہت راغب کیا ہے۔ چنانچہ توت سے تو دہت سے بد ہو جاتا ہے۔ پس سنسکرت فارسی کے دو لفظ اگر ایسے مبادلہ سے متحد ہو جائیں تو ان کے ایک سمجھنے میں کیا کلام ہے۔

تاک۔ فارسی میں درخت انگور کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں دراکشا انگور کو کہتے ہیں۔

کبھی سنسکرت کی ت فارسی میں گر پڑتی ہے یا یہ کہو کہ اصل میں نہ تھی۔ سنسکرت میں زیادہ ہو گئی۔

پور۔ (بیٹا) فارسی ہے۔ سنسکرت میں پوتر کہتے ہیں۔

تھ

یہ آواز بھی خاک فارس میں نہیں۔ تم کسی ایرانی سے بات کر کے دیکھو۔ جب ایسا لفظ تقریر میں آئے کہ اس میں حرف مذکور ہو تو اس کی جگہ خالص ت بول جائے گا۔ اگر پرانے لفظوں میں کہیں ایسا اتفاق ہو تو اسے اتحاد سمجھنے میں کیا عذر ہے۔

ستیا۔ زبان ژند میں دنیا کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں ستھتی بمعنی موجود ہے۔ وہی فارسی حالؔ میں ہستی ہے۔ کچھ عجب نہیں کہ تینوں لفظوں کی اصل ایک ہو۔

است۔ فارسی ہے۔ سنسکرت استھی ہے۔

ث

یہ آواز فارس اور عرب کی خاک میں نہیں۔ جب ایران یا عرب کے لوگ اس حرف کو بولتے ہیں تو "ت" کی آواز نکلتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ :۔

انگشت۔ فارسی میں انگلی کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں یہی انگشٹ ہے اتنا فرق اور بھی ہے کہ انگوٹھے کو کہتے ہیں (یعنی زانگشت)۔

اشتر۔ فارسی میں اونٹ کو کہتے ہیں۔ وہی سنسکرت میں اشٹر ہے۔

آوشت۔ سنسکرت میں آوشٹ ہے۔

مشت۔ فارسی میں مٹھی کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں مشٹ ہے۔

بتو اور بته۔ فارسی میں بٹے کو کہتے ہیں۔ ہندی میں بٹا اور وٹا ہے کہ ورتل سے نکلا ہے۔ گول چیز کو کہتے ہیں یہ تعجب کی بات نہیں۔ ہند کی زبان نے اس طرح تبدیلی کی، ایران کی زبان نے اس طرح کی۔

تہ۔ نیچے (اوپر کی ضد)۔ سنسکرت میں تھا ہے اور اسی سے ہے تھاہ اور اتھاہ سمندر۔ جس دریا کی تہ نہ معلوم ہو سکے۔

چتوک اور چغوک۔ فارسی میں چڑے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں چٹکا ہے۔

وشت۔ فارسی میں بد اور زشت کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں وشٹ ہے۔

سرشت۔ گندھاوٹ اور اصل خلقت کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں سرشٹی ہے۔

ج

مناسبت طبعی اسے چند حرفوں سے مبادلہ کے لئے آمادہ رکھتی ہے۔ چنانچہ فارسی میں بھی کبھی گ سے بدل جاتا ہے، جیسے جہان گہان اور نارنج، نارنگ۔ کبھی ی سے بدل

جاتا ہے، جیسے جوغ، یوغ۔ اسی طرح سنسکرت اور فارسی کے الفاظ میں سمجھو۔

جوغ اور یوغ۔ خاص فارسی لفظ ہیں۔ ہل کی لکڑی کو کہتے ہیں جو بیلوں کی گردن پر رکھتے ہیں۔ سنسکرت میں جوغ کو۔ یوکتر کہتے ہیں۔ اور یہی اول بدل جوا ہو گیا۔ ایک ہی گھر کے لفظ ہیں۔ غیر ملکوں میں جا کر آوازیں بدل گئیں۔

جو۔ فارسی میں مشہور غلہ ہے۔ سنسکرت میں یو کہتے ہیں۔

جوان۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں یوا ہے اور یون جوانی کو کہتے ہیں۔ بھاشا میں جوبن ہو گیا۔

ف۔ آریا، اریا، ارین، ایران۔ جو مختلف زبانوں پر آواز دیتے چلے آتے ہیں۔ شاستر کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ جب یہ متبرک قوم ہندوستان میں پہنچی تو اس کی آبادی سے یہاں کا ملک ہماچل سے بدھیاچل تک آریہ ورت کہلاتا تھا۔ اس نے غیر قوموں سے امتیاز جتانے کو آرج اپنا نام رکھا، اور غیر قوموں کو انارج کہتے تھے۔ وہی آریا اور ان آریا ہو گئے۔ اور شاید اناڑی جو بہ معنی ناوان و بے ہنر و بے تمیز ہے وہ ان آریا ہو۔ لطف یہ ہے کہ فارس کی کتب قدیمہ میں؛ ایرائن یا ایران کے معنی شریف، دانا اور ہنر مند تھے۔

ج اور چ کی قرابت قرینہ خود ظاہر ہے۔

جنداں۔ فارسی گروہ بیہودہ اور پوچ وارزل اور شراب خوار کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں ایک کمینہ فرقہ کا نام چنڈال ہے۔ وہ لوگ پہلے اکثر شراب کھینچتے تھے۔ بعضے سور چراتے تھے اور اور اس قسم کے ذلیل کام کرتے تھے۔

پنج۔ فارسی میں پانچ کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں پنچ کہتے ہیں۔

نگر مچ۔ فارسی میں وہی آبی جانور ہے جسے سنسکرت میں مکرمچھ کہتے ہیں۔

خ

خاک ہند میں یہ آواز نہیں۔ دیکھو فارسی کی خ ہندیوں کی زبان پر ک، کھ ہو جاتی ہے۔ فارسی میں بھی اکثر حرفوں سے بدلتی ہے۔ انہی میں سے مفصلہ ذیل ہیں:۔

س سے۔ مثلاً شناخت سے شناسد۔

ش سے مثلاً افراختن سے افراشد۔ فراخیدن سے فراشیدن (رونگٹے کھڑے ہونا)۔

ک سے۔ مثلاً خمان سے کمان۔ خمند سے کمند۔

ہ سے۔ مثلاً خاگ سے ہاگ (انڈا)۔

جب اپنے گھر میں حروف مذکورہ سے اس کی آواز بدلتی ہے تو ہند میں آکر بدل جانے کا کیا تعجب ہے۔ اس واسطے جہاں سنسکرت اور فارسی کے دو لفظ آج غیر معلوم ہوتے ہیں، اور خ کو حروف مذکورہ میں سے کسی حرف کے ساتھ بدلنے سے متحد ہو جاتے ہیں، تو عجب نہیں کہ اصل میں دونوں ایک ہی ہوں۔ زمانہ کے انقلاب سے ایک گھر کے رہنے والے مسافت ملکی اور مسافت زمانی میں کہیں کے کہیں جا پڑے۔ سب باتیں بدلیں اس کی آواز بھی بدل گئی۔ پھر زمانے گذر گئے، پشتیں پلٹ گئیں، لوگوں نے جانا دو لفظ غیر ہیں۔

فارسی کی خ سنسکرت میں کبھی س کی آواز دیتی ہے۔

خور۔ فارسی میں آفتاب کو کہتے ہیں۔ اسی کو سنسکرت میں سور کہتے ہیں۔ فارسی قدیم میں جو ہور ہے۔ وہ اصل میں ژند کا لفظ ہے۔

خواب۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں سوپن کہتے ہیں اور سواپ کے بھی معنی یہی ہیں

خواہر۔ فارسی ہے سنسکرت میں سوسری کہتے ہیں۔

خوش۔ فارسی میں بہ معنی خوب آتا ہے۔ مثلاً خوش آواز، خوشبو وغیرہ وغیرہ۔ سنسکرت میں سو حرف ہے کہ دوسرے لفظ کے ساتھ مل کر خوبی کے ساتھ اسم صفت بناتا ہے۔ چنانچہ۔ سناد خوش آواز۔ سگندھ خوشبو کو کہتے ہیں۔ اور سشٹو خوب اسم صفت ہے۔ دوسرے اسم کے ساتھ ملنے کی ضرورت نہیں۔ فقط ب کی کمی زیادتی ہے اور اس قدر انقلابوں اور مدتوں کے بعد اتنا تغیر کچھ بڑی بات نہیں۔

خود۔ فارسی میں آپ کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں سو بہ معنی خود ہے اور یہ لفظ

اپنے اصل پر ہوتا ہے۔ یعنی اشتقاق یا ترکیب کے اثر سے پاک ہوتا ہے تو سوت تلفظ میں آتا ہے۔ "ت اور "د" ہمسایہ ہیں۔ مبادلہ ہو گیا۔

خوئے۔ فارسی میں پسینہ کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں سوید کہتے ہیں اور بموجب سنسکرت کے قواعد کے یہ "و" آدھی ہے، پوری نہیں۔ ایرانی پلاؤ خور ہو گئے۔ ان کی زبان بچاری دال کو کیا سمجھتی تھی، اڑا دیا۔

خسر۔ فارسی میں سسرے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں سوسر اور شوسر کہتے ہیں سنسکرت میں کبھی ش کی آواز دیتی ہے۔

خوب۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں شبھ کہتے ہیں۔

خون۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں شون سرخ اور شونت لہو ہے۔

خوک۔ فارسی میں سور کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں شوکر کہتے ہیں۔ سنسکرت کی "ر" فارسی میں اکثر اڑ جاتی ہے۔

خشک۔ فارسی ہے اور شکک سنسکرت ہے۔ اتنی کسر ہے کہ شکک سے "کھ" لکھا جاتا ہے۔ شاید کسی پرانے زمانے میں یہ اختلاف تحریر نہ ہو۔ سنسکرت میں کبھی ک یا کھ کی آواز دیتی ہے۔

خاشہ۔ خاشاک۔ فارسی ہے "اک" نسبت کا یا زائد ہو! اصل خاشہ ہو گا۔ گھاس پھوس کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں کشا ہے۔ خ کے بعد جو "الف مدہ" ہے، گر پڑا، فارسی میں زیادہ ہو گیا۔ اخیر کی ہ اور اکا مبادلہ کچھ بڑی بات نہیں ہائے مختفی فقط زیر کے ظاہر کرنے کو لگاتے ہیں۔ خود کچھ چیز نہیں۔

خر۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں کھر کہتے ہیں۔

خم اور خنب فارسی میں مٹکے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں کمبھ ہے۔

چرخ۔ فارسی ہے۔ پلٹ کر چرخ اور بدل کر چکر ہو گیا۔

خشخاش۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں کھس کھس اور کھس تل کہتے ہیں۔

شاخ۔ فارسی ہے۔ سنسکرت شاکھا ہے۔

ناخن۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں نکھ کہتے ہیں ان کی زیادتی محاورہ میں عام ہے۔

سخت۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں شکت طاقت کو کہتے ہیں۔ سخت چیز خود طاقت دار ہوتی ہے اور طاقت چاہتی ہے۔ عجب نہیں کہ لفظ ایک ہو۔ معنوں میں مجاز نے تبدیلی کر دی ہو۔

دشوار۔ فارسی میں دشوار ہے۔ سنسکرت میں دشکر کہتے ہیں۔

سنسکرت میں کبھی ہ سے بدل جاتی ہے۔

دختر۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں دہتری کہتے ہیں۔ ایک یورپین محقق لکھتے ہیں کہ یہ سنسکرت میں مشتق ہے۔ اس دہ سے جس کے معنی ہیں دودھ دہنا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ عہد قدیم میں ناکتخدا بیٹیوں کا کام اپنے گھروں میں دودھ دہنا ہوگا۔ اس لئے دہتری کہتے تھے۔ لطف یہ ہے کہ فارسی میں دوختن بہ معنی دوشیدن ہے اور اس سے دختر ہے۔ اور دوشیزہ فارسی میں دختر بکر کو کہتے ہیں یہ بھی دوشیدن (دودھ دہنا) سے مشتق ہے۔ خان آرزو کہتے ہیں کہ ابتدا میں دوشیزہ چھوٹی لڑکی کو کہتے تھے جسے دوش پر لئے پھرتے تھے۔ پھر عموماً دختر کو دوشیزہ کہنے لگے۔ پھر دختر بکر کے لئے خاص ہو گیا۔

ہزاروں برس کی باتیں ہیں، خدا جانے اصلیت کیا ہے۔ سند ایک کے پاس بھی نہیں۔

ف۔ دیکھو! انگریزی میں سپنسٹر کے معنی ہیں کاتنا۔ عہد قدیم میں یورپ کے اکثر شہروں میں ان بیاہی لڑکیاں گھروں میں بیٹھی کاتا کرتی تھیں اس لئے لڑکی کو سپنسٹر کہتے تھے۔ وہی نام اب تک چلا آتا ہے۔

خواندن سے خواں (پکارنا) فارسی ہے سنسکرت میں وہاں بلاتا ہے اور صیغہ مضارع خواہد۔ سنسکرت میں ہوایت۔

خرامیدن۔ خرام فارسی میں رفتار ناز کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں کرم دھاتو ہے اور وہی معنی ہیں۔

خریدن۔ خر فارسی میں مول لینا ہے۔ سنسکرت میں کری خریدنے کو کہتے ہیں۔

د

قرب مخرج اور موافقت طبعی کے سبب سے چند حرفوں کے ساتھ فارسی میں بھی

آواز ملاتی ہے۔ چنانچہ کبھی ت سے بدل جاتی ہے، جیسے دراج سے تراج اور کدخدا سے کتخدا۔ کبھی گ سے۔اور یہی طبیعت سنسکرت کے لفظوں میں اپنا اثر دکھاتی ہے۔

اندر۔ فارسی ہے سنسکرت میں انتر ہے۔

ایدر۔ فارسی میں ادھر یا یہاں کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں اتر کہتے ہیں۔

زاد۔ زادبوم (یعنی پیدائش) فارسی ہے۔ سنسکرت میں جات ہے۔ عربی میں ذات شے۔ نفس شے۔اس صورت میں پہلوی سے پہلو ملتا ہے۔

بادام۔ فارسی لفظ ہے۔ سنسکرت میں باتام ہے۔

باد۔ فارسی میں ہوا ہے۔ سنسکرت میں وات ہے۔

بدست۔ فارسی میں بالشت کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں وتست ہے۔

مادر۔ فارسی ہے۔ سنسکرت ماتری ہے۔

مردہ۔ فارسی ہے۔ سنسکرت مرت اور مرتک ہے۔

بید۔ فارسی میں مشہور لکڑی ہے۔ سنسکرت میں ویتر کہتے ہیں۔

پدر۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں پتری ہے۔

دند۔ فارسی میں دانت کو کہتے تھے۔ پھر واحد متروک ہوگیا۔اب واحد جمع سب کو دندان کہنے لگے۔ سنسکرت میں دنت ہے۔

سرد۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں شرد یا شرت کہتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ عربی میں شتا موسم سرما ہے۔

سد۔ فارسی میں عدد 100 ہے۔ سنسکرت میں شت ہے۔

پود۔ فارسی میں بانے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں بیوتی بانا ہے۔

کبھی ج سے بدل جاتی ہے

داماد۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں جاماتری ہے۔

کبھی گ سے بدل جاتی ہے

اژدر۔ فارسی میں بڑے سانپ کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں اجگر کہتے ہیں۔

دھ

فارسی کی زبان میں یہ حرف بھی نہیں۔ جہاں ہوتا ہے، خالص دال کی آواز دیتا ہے۔ مثلاً :۔

بند۔ فارسی میں گرہ اور رسی وغیرہ باندھنے کی چیز کو کہتے ہیں۔ کیونکہ بستن سے حاصل مصدر ہے اور مجازاً قید کو بھی کہتے ہیں۔ سنسکرت میں بندھ اسی ماخذ سے ہے اور یہی معنی ہیں۔

دود۔ فارسی میں دھوئیں کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں یہ دھوم ہے۔

دیر۔ فارسی میں زود کی ضد ہے۔ سنسکرت میں دھیر متحمل آدمی کو کہتے ہیں۔ دھیر یہ دیر اور توقف کرنے کو کہتے ہیں۔

گندش۔ فارسی میں گندھک کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں گندھک ہے۔

گندم۔ فارسی میں غلہ ہے جس کی ہم تم روٹیاں کھاتے ہیں۔ سنسکرت میں گودھوم ہے۔

دایہ۔ فارسی میں اس عورت کو کہتے ہیں جو کسی کے بچہ کو دودھ پلائے۔ سنسکرت میں دھا ہے۔

ڈ

خاک فارس اور عرب سے اس کی طبیعت موافق نہیں۔ اس لئے ہمیشہ خالص دال کی آواز دیتا ہے۔

آدہ۔ فارسی میں اس لکڑی کو کہتے ہیں جس پر پرند جانوروں کو بٹھاتے ہیں۔ سنسکرت میں اڈہ کہتے ہیں۔

دول۔ فارسی میں یہی چیز ہے۔ جس سے پانی کنوئیں سے کھینچتے ہیں۔ ہندوستان میں ڈول کہتے ہیں۔ مگر ہندی بھاشا ہے۔ سنسکرت نہیں۔ اور لطف یہ کہ عربی کا دلو۔ صاف ڈول کا مقلوب ہے۔

ڈھ

حرف اول کا بھائی ہے۔

دہل۔ فارسی میں ڈھول کو کہتے ہیں۔ مگر ہندی بھاشا ہے۔ سنسکرت نہیں۔ اور غور کرو۔ تو طبل۔ دول۔ دہل۔ ڈھول سب ایک ہیں۔ عرب اور فارس جا کر مسافروں کی آواز بدل گئی۔

ر

فارسی میں اکثر قریب المخرج حرفوں کے ساتھ بدل جاتی ہے۔ انہی میں سے یہ کہ کبھی ن سے مبادلہ ہوتا ہے۔ مثلاً استوار۔ استوان۔ کبھی ل سے جیسے سوفار۔ سوفال۔ کبھی زیادہ ہو جاتی ہے۔ کبھی گر پڑتی ہے جیسے کابک۔ کاوک۔ کاورک۔ یا کرسنہ۔ اور گشنہ۔ کبھی ہ سے جیسے آسر۔ اور آسہ۔ جوتی ہوئی زمین۔ اسی مناسبت سے سنسکرت میں آواز بدلے تو تعجب نہ کرنا چاہئے۔

آغاز۔ سنسکرت میں اگر ہے۔ ر۔ الف ہو گئی۔ ز۔ زیادہ ہو گئی۔

تار۔ فارسی لفظ ہے۔ سنسکرت میں تان اور تنتو ہے اور اسی سے ہے تانا۔

پور۔ فارسی میں بیٹے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں پتر اور پوہ بھی آیا ہے۔

تارک۔ فارسی میں تالو کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں وہی تالو ہے۔

کبھی فارسی میں نہیں ہوتی۔ سنسکرت میں ہوتی ہے

کافور۔ سنسکرت میں۔ کرپور ہے۔

شغال اور شگال۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں شری گال ہے۔

تشنہ۔ فارسی میں پیاسا ہے۔ سنسکرت میں ترشنا تشنگی کو کہتے ہیں۔

ادرک۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں آورک کہتے ہیں۔

شکر۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں شرکرا کہتے ہیں۔

آک۔ یہی درخت جنگلی ہے۔ جس کا دودھ کیمیا گر لیتے پھرتے ہیں۔ سنسکرت میں آرک کہتے ہیں۔

اشک۔ فارسی میں آنسو کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں اشرو کہتے ہیں۔

گام۔ فارسی میں گاؤں کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں گرام کہتے ہیں۔ یہی برج بھاشا میں گاؤں ہو گیا۔

پیمانہ۔ فارسی میں ماپ کے باسن کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں پرمان کہتے ہیں۔

کبھی فارسی میں ہوتی ہے سنسکرت میں نہیں ہوتی

کبوتر۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں کپوت ہے۔

کرباس۔ فارسی ہے سنسکرت میں کپاس کہتے ہیں۔

ز

مناسبت مزاج اسے اپنے گھر میں بھی چند حرفوں کے ساتھ مبادلہ پر آمادہ کرتی ہے۔ ایک ان میں سے ج ہے۔ مثلاً۔ روز۔ روج۔ دوسراج۔ جیسے پزشک۔ پچشک۔ کبھی ک۔ مثلاً مزیدن۔ مکیدن۔ کبھی ہ۔ جیسے بازو۔ باہو۔ کوزپشت۔ کوہ پشت۔ کبھی ے۔ جیسے آواز۔ آوازے۔

خاک ہند میں ز کی آواز بالکل نہیں نکلتی۔ ہمیشہ ج کی آواز بدل کر ہوتی ہے۔

کبھی کبھی۔ چ۔ گھ۔ د۔ ے بھی۔

روز۔ روج۔ فارسی میں دن ہے۔ اور آفتاب کو بھی کہتے ہیں۔ سنسکرت میں روچی روشنی کو کہتے ہیں۔ مجازاً دن کو کہنے لگے۔

ارز۔ جو بہ معنی قیمت و قدر ہے۔ فارسی میں ارج ہے۔ اور اسی سے ارجمند ہو گیا۔ سنسکرت میں ارج قدر و قیمت اور رتبہ و منزلت ہے۔

زبان۔ فارسی ہے۔ یہی سنسکرت میں جبھا ہے۔

زانو۔ فارسی ہے سنسکرت میں جانو ہے۔

زلو اور زلوک۔ فارسی میں جونک کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں جلوکا ہے۔

زمین۔ فارس کے اہل لغت کہتے ہیں کہ زم سردی کو کہتے ہیں چنانچہ اسی سے ہے۔ موسم زمستان چونکہ جوہر ارض ٹھنڈا ہے۔ اس لئے اس کا نام زمین رکھا ہے سنسکرت میں جما زمین کو کہتے ہیں۔ جما کو جنم سے مشتق سمجھا ہے کہ کل مخلوقات کا جنم

یعنی پیدائش اسی سے ہے۔

کوز۔ فارسی میں کبڑے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں کبجا کہتے ہیں۔ وہی خراب ہو کر ہندی میں کبڑا ہو گیا۔

مازو۔ ایک چھوٹا سا پھل ہے کہ سرو کے پھل سے مشابہ ہوتا ہے۔ ہندوستانی سیاہی اور بعض سیاہ رنگوں میں پڑتا ہے۔ سنسکرت میں اسے ماجو پھل کہتے ہیں۔

زن۔ فارسی میں عورت کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں جنی عورت کو کہتے ہیں۔

زنجبیل۔ یعنی سونٹھ کو سنسکرت میں شرنگ بیر کہتے ہیں شرنگ شاخ ہے اور بیر خشک۔ سوکھی شاخیں ہوتی ہیں۔ اس لئے یہ نام پایا مگر یہ اتحاد ان دو لفظوں کا نہیں جو ایک گھر کی آواز تھی۔ سونٹھ ہندوستان کی پیداوار دوا ہے۔ طبابت اور تجارت کی وکالت سے عرب میں پہنچی۔ ان کی زبان نے اپنی طبیعت کے بموجب حرفوں پر اثر کیا۔ جسے تعریب کہتے ہیں۔

زیرہ۔ مشہور دوا ہے۔ سنسکرت میں جیر یا جیرک کہتے ہیں۔

تیز۔ فارسی لفظ ہے۔ سنسکرت میں تیکشن ہے۔ اور اس وقت کشا اپنی پوری آواز دے رہا ہے وہ کئی آوازیں رکھتا ہے۔

کیا عجب ہے کہ اصل زبان میں ایک وقت فقط ش یا ک کی آواز سے یعنی تیشن یا تیکن بولا جاتا ہو۔ ن۔ دونوں زبانوں میں اکثر گر پڑتا ہے۔ جب تیش یا تیک ہوا تو تم جانتے ہو کہ ش۔ اور۔ ک۔ ز۔ سے بدل جاتے ہیں۔ کیا عجب ہے کہ اس طرح تیز ہو گیا ہو۔

بوز۔ فارسی ہے۔ بکری کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں بوج بکری یا اترے ہوئے بکرے کو کہتے ہیں۔

کبھی چ سے بدل جاتی ہے

سوزن۔ فارسی میں سوئی کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں سوچی کہتے ہیں۔

کبھی گھ سے بدل جاتی ہے

دراز۔ فارسی میں لمبے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں دیرگھ ہے۔

ہ سے بھی بدل جاتی ہے

زر۔ فارسی میں سونا ہے۔ سنسکرت میں ہرن سونے کو کہتے ہیں مگر "ن" اصلی نہیں ہے۔ہ۔اور۔ز۔کا مبادلہ عام ہے چنانچہ فارسی میں زدن کا امر ہے۔

زن۔ سنسکرت ہے۔ ہن اسی قاعدہ سے ہر کا زرن گیا۔

ے سے بھی بدل جاتی ہے

نزد۔ فارسی میں نزدیک کو کہتے ہیں سنسکرت میں نید کے یہی معنی ہیں۔

فارسی میں ز سنسکرت میں ہ ہو جاتی ہے

بازو اور باہو۔ دونو فارسی لفظ ہیں کیونکہ ان کے ہاں خود۔ ز۔ ہ۔ کا مبادلہ ہو جاتا ہے۔ دیکھو سنسکرت میں اسے باہو ہی کہتے ہیں۔

ژ

ز کی بہن ہے۔ خاص فارس کی آواز ہے۔ عرب۔ ہند وغیرہ اکثر ملکوں میں نہیں۔اپنے گھر میں بھی کبھی کبھی بعض حرفوں کی آواز میں بولتی ہے مثلاً فازہ۔ فاژہ۔ فاجہ (جمائی)۔ کژ۔ کج۔ نژند۔ نجند (غمگین)۔اب سنسکرت میں دیکھو:۔

اژدہا۔ فارسی میں بڑے سانپ کو کہتے ہیں سنسکرت میں اہی دشنک ہے۔ اہی سانپ کو کہتے ہیں۔ دشنک کاٹنے والا۔ ز۔ کا مبادلہ ہ کے ساتھ دونوں زبانوں میں عام ہے۔ ہی زیادہ ہو گئی۔ ش۔ س ہو کر ہ سے بدل گئی۔ کاف ہ سے بدل گیا۔

اژدر۔ وہی اژدہا ہے۔ سنسکرت میں اجگر ہے۔

انکژ۔ فارسی ہے سنسکرت میں انکش ہے جس سے ہاتھی کو ہولتے ہیں۔

س

قرب مخرج کے سبب سے فارسی میں بھی چند حرفوں کے مبادلہ پر زبان کو مائل کرتا ہے۔ ان میں سے ہے ج۔ ریواس۔ ریواج۔ ریباس۔ ایک جنگلی روئیدگی ہے۔ چ جیسے۔ خروس۔ خروچ۔ بانخسہ۔ بانچہ (اہل شیراز صحن کو کہتے ہیں اور وہاں ہر ایک شخص کے گھر میں صحن اور صحن میں چمن ہوتے ہیں)۔ د۔ جیسے پاس۔ پاد (حفاظت۔ اور اسی

سے ہے پادشاہ)۔ ش۔ جیسے کستی۔ کشتی (کستن۔ کوفتن۔ پہلوان بھی آپس میں ٹھونکتے پیٹتے ہیں)۔ اس لئے کشتی پہلوانی ہو گئی۔ فرستہ۔ فرشتہ (فرستادہ خدا ہوتا ہے) اس مزاج نے سنسکرت اور فارسی الفاظ میں مبادلہ پر مائل کیا ہو گا۔

راست۔ فارسی میں کج کی ضد ہے۔ سنسکرت میں رجو سیدھے اور آسان کو کہتے ہیں۔ وہی ژند میں رز ہے۔ دیکھو۔ ج۔ ز۔ ں۔ سب قریب المخرج ہیں۔ سنسکرت میں اسی سے ہے۔ رجسٹ نکلا۔ یعنی بہت سیدھا اور نہایت آسان۔ ٹ فارسی میں ت ہو جاتی ہے۔ عجب نہیں کہ راست اور رجسٹ کی اصل ایک ہو۔

سایہ۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں چھایا ہے۔

ش کی مثالیں دیکھو

اسپ۔ فارسی میں گھوڑے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں اشو ہے۔ واؤ۔ ب سے بدل کر پ ہو گیا۔

باش۔ فارسی میں فعل ہے اور سکونت کے معنی دیتا ہے۔ سنسکرت میں باس کے وہی معنی ہوتے ہیں۔

گیسو۔ فارسی میں ان بالوں کو کہتے ہیں جو زلف سے مقدار اور درازی میں زیادہ ہوتے ہیں اور ایک سرا کانوں کے اوپر نکالتے ہیں۔ سنسکرت میں کیش عموماً بالوں کو کہتے ہیں۔

لیاس۔ اہل خراسان شبنم کو لیاس کہتے ہیں۔ سنسکرت میں اوشائے اور اوش آخر شب کو کہتے ہیں اور اش وہ جو کہ آخر شب میں واقع ہو۔ شبنم آخر شب میں پڑتی ہے۔ اس لئے یہ نام پڑ گیا۔ اس رعایت سے فارسی میں شبنم نام پایا ہے۔ یہ اوش بگڑ کر برج بھاشا میں اوس ہو گیا۔

سر۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں شرس کہتے ہیں۔ اخیر کا "س" اڑ جاتا ہے "ہ" پیدا ہو جاتی ہے۔ اس وقت شرہ کہتے ہیں دیکھو۔ وہی س ہ کا مبادلہ ہے۔

سرد۔ فارسی ہے۔ مقابل گرم۔ سنسکرت میں شرت ہے۔ اور۔ شرد بھی کہتے

ہیں۔

سرون۔ فارسی میں سینگ کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں شرنگ ہے۔

سرین۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں شرونی۔

سریہ۔ فارسی قدیم میں جسم اور کالبد کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں شریر ہے۔

سد۔ وہی 100 کا عدد ہے۔ جسے اب صد لکھتے ہیں۔ سنسکرت میں شت ہے۔

مگس۔ فارسی میں مکھی کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں مکشیکا کہتے ہیں۔

سنگ۔ فارسی میں پتھر کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں شان کہتے ہیں۔

کبھی و سے بدل جاتا ہے

سال۔ فارسی میں مشابہت کے لئے ہے۔ سنسکرت میں واں بہ معنی مشابہ ہے۔

س گر بھی پڑتا ہے

وشتہ۔ محسوس چیز۔ وشتہا۔ محسوسات۔ فارسی قدیم کا علمی لفظ ہے۔ سنسکرت میں درشٹ جو چیز دیکھنے میں محسوس ہو۔ کیونکہ درشٹی نظر کو کہتے ہیں "ر" کا حال تم دیکھ چکے۔

مست۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں مد اور مت کہتے ہیں۔

ش

فارسی میں قرب مخرج کے سبب سے کئی حرفوں کے ساتھ مبادلہ قبول کرتا ہے۔ ان میں سے ہے۔ چ۔ جیسے کاچی۔ کاشی۔ اور چاچی۔ شاشی اور نخچہ۔ نخشہ کبھی س سے بدل جاتا ہے۔ جیسے شارک۔ سارک (مینا)۔

آتش۔ الف ممدودہ کے فصل میں لکھا گیا ہے کہ ہتاشن سے اس کا اتحاد ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سنسکرت میں تیج بہ معنی شعلہ۔ روشنی۔ حرارت وغیرہ ہے۔ پس تیج اور تمش متحد۔ تمش پر الف ممدودہ زائد ہو کر آتمش ہو گیا۔ پھر آتمش کم اور آتش عام مستعمل ہو گیا ہے یا سنسکرت پر پہلے جا کر آتیج اور پھر تیج ہو گیا ہو۔

سنسکرت میں فارسی کا ش کبھی ج اور کبھی چھ کی آواز دیتا ہے۔

کشف۔ فارسی میں کچھوے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں کچھ چپ کچھوا ہے۔
شاطر۔ کیا عجب ہے کہ چتر سے نکلا ہے جس طرح شطرنج چترنگ سے بنی۔ اسی طرح چاتر سے شاطر بن گیا۔
کبھی س کی آواز دیتا ہے
شام۔ سنسکرت میں سانم کہتے ہیں۔
شنا۔ فارسی میں تیرنے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں سنان فقط نہانا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جو تیرے گا وہ پہلے نہائے گا۔
نوشادر۔ سنسکرت میں نوسار ہے۔
آشتی۔ فارسی میں صلح کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں آسکتی میلان اور ملنے کی خواہش کو کہتے ہیں۔
کبھی ک سے آواز بدلتا ہے
گندش۔ فارسی میں گندھک کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں گندھک ہے۔

مبادلہ "ش" کے اصول خاص

سنسکرت میں 3 حرف ہیں کہ ذرا ذرا سے فرق کے ساتھ ش کو آواز دیتے ہیں۔
اول کہ خالص ش کی آواز دیتا ہے۔
(2) ش کے قریب ایک آواز دیتا ہے کہ کچھ "ژ" کچھ "ی" کی آواز سے ملتی ہے اور پہلے ایک ہوا "ک" کی بھی آتی ہے۔ چنانچہ ایک موقع پر کش۔ اور ایک موقع پر "کھیا" کی آواز بھی دے جاتا ہے۔ مثلاً:۔
برشا۔ برکھا بارش۔
شٹرس۔ کھٹرس شترس۔ بھوجن۔ چھ مزے والی چیز۔
منکش۔ منش۔ منکھ آدمی۔
اس قسم کے الفاظ ہندوستان کے مختلف شہروں میں مختلف تلفظ سے بولے جاتے ہیں اور بجائے خود ہر ایک صحیح ہے۔ اس سے سمجھا جاتا ہے کہ اس حرف میں تینوں

آوازوں کا مادہ ہے۔ اور جب کسی لفظ میں ہوتا ہے تو دو دو تین تین آوازوں سے بولا جاتا ہے۔ پس جب ایک سنسکرت لفظ میں ہے۔ اور ش کی آواز دے رہا ہے۔ اور فارسی میں وہی لفظ ہے۔ مگر ش کی جگہ ک کی آواز آتی ہے۔ تو اس حرف کے اختلاف سے لفظ کو غیر نہ سمجھو۔ اپنے گھر میں کئی آوازیں بدلتا ہے۔ غیر ملک میں جا کر آواز بدل گئی ہو تو تعجب کیا ہے۔

(3) بعض موقع پر اسی ش میں ک کی آواز ملی ہوتی ہے تب اس کی صورت میں ذرا سی تبدیلی ہو جاتی ہے پھر یہی چار آوازوں کا کام دے جاتا ہے کش۔ کھیا۔ چھ۔ اور کبھی خالص ش چنانچہ

لکشمی	لچھمی	لچھی	دولت
دکشنا	دکھنا	دچھنا	خیرات
لکش	لکھیے		نشان والا
رکشیا	رکھیا		حفاظت
بھکش			خوراک
		لکھے	لاکھ رقم اعدادی
شپا			رات

بدھیاوان لوگ چھ سے نہیں بولتے مگر اس سے اتنا معلوم ہو گیا کہ اس کے مزاج میں چھ کی طرف میلان ہے۔

یہ الفاظ مختلف شہرہائے ہندوستان میں الگ الگ تلفظ سے بولے جاتے ہیں اور اس سے سمجھا جاتا ہے کہ حرف مذکور میں بھی تینوں آوازوں کی طاقت ہے۔

دیکھو "ش" والے لفظ فارس میں کیسی کیسی آوازیں بدلتے ہیں :-

بارش۔ فارسی میں باریدن سے حاصل مصدر ہے۔ سنسکرت میں برشا (برکھا) ہے۔

برسات۔ فارسی میں یہی موسم کا نام ہے۔ سنسکرت میں برشارت۔ ش۔ س کا مبادلہ بہ مقتضائے طبیعت عام ہے۔ اس لئے برساہوا۔ "ر" بہہ گئی۔ برسات رہ گئی۔

برشکال۔ فارسی میں وہی موسم ہے۔ سنسکرت میں برش۔ بارش۔ اور کال۔ وقت ہے۔ اس واسطے برشاکال بارش کا موسم۔

خشک۔ فارسی لفظ ہے۔ سنسکرت میں شُشک ہے "ش" میں ک کا اثر ہے۔ فارسی میں ک ہمیشہ خ کی آواز دیتا ہے۔ انقلاب زمانہ اور انقلاب وطن سے الٹ کر اول شُخک۔ بعد اس کے خشک ہو گیا۔

تشنہ۔ فارسی میں پیاسے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں ترشنا خواہش اور ہوس ہے۔ اور ترشا اور ترکھا پیاس کو کہتے ہیں۔

خاشہ اور خاشاک۔ فارسی میں گھاس پھوس کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں کشا ہے۔

اشک۔ فارسی میں آنسو کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں اشرو کہتے ہیں "ر" گر پڑی۔

انوشہ۔ فارسی میں خوش۔ خوشا۔ خورم۔ شاہ نوجوان۔ آفرین۔ بارک اللہ ہے۔ سنسکرت میں انوکھا خوب۔ عمدہ اور اچھی چیز کو کہتے ہیں۔

کبھی سنسکرت میں ش کی آواز دیتا ہے۔ فارس میں س کی آواز دیتا ہے

ستوسر اور ستوسہ۔ فارسی میں چھینک کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں شوتھ کہتے ہیں۔ شُتھو۔ ستو ہو گیا۔ مگر یہ کون کہہ سکتا ہے۔ کہ۔ سر فارس میں جا کر بڑھ گیا ہے یا اصل میں سر تھا سنسکرت میں کٹ گیا ہے۔

کبھی فارسی میں ک ش کے عوض گ س کی آواز دیتا ہے

بخش۔ فارسی میں کسی چیز کے جزو اور حصہ کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں پکش حصہ اور مقدار کو کہتے ہیں۔ پ نے فارسی میں جا کر ب کی آواز پیدا کی۔ ک۔ نے خ کی جون بدلی۔ اس طرح بخش ہو گیا ہو گا۔ اور شائد جو سنسکرت میں بھاگ ہے۔ وہ فارسی میں بخش ہو۔

فارسی میں کبھی فقط ش کی آواز دیتا ہے۔

شیر۔ جو فارسی میں دودھ ہے۔ سنسکرت میں کشیر پڑھتے اور لکھتے ہیں۔

شہد۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں کشودر کہتے ہیں اور لکھتے ہیں۔ سنسکرت کی "ر" کو تم جانتے ہی ہو اکثر فارسی میں گر پڑتی ہے۔

کشا کو دیکھو فارسی میں کیسی کیسی آوازیں بدلتا ہے

کبھی تو اپنی اصلی آواز یعنی ک۔ ش کا حق ادا کرتا ہے۔

کشت۔ فارسی میں کھیتی کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں کشت کہتے ہیں۔ وہی بھاشا میں کھیت ہو گیا۔ ہندوستان میں آ کر یہ آواز بدلی۔ وہاں وہ بدل گئی ہوگی۔ تعجب کیا ہے؟

کش۔ فارسی میں بغل اور پہلو کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں اسی کو ککشی کہتے ہیں۔ یہی بھاشا میں بگڑ کر کوکھ ہو گیا۔ لطف یہ ہے کہ اسی کو عربی میں کشخ کہتے ہیں۔

کاہ۔ فارسی میں گھاس کو کہتے ہیں سنسکرت میں۔ ککش ہے۔ وہی تلفظ میں ککھ ہو گیا۔ اور فارسی میں آ کر کک بن گیا۔ پھر ک اور ہ کا مبادلہ عام ہے۔ جیسے آملک اور آملہ وغیرہ۔ اس لئے کہ ہوا۔ بعد اس کے الف مدہ بڑھ کر کاہ ہو گیا ہو گا۔

تاک۔ سنسکرت میں دراکشا ہے۔

غ

یہ آواز ہند کے منہ اور گلے سے بالکل مخالف ہے۔ تم خود خیال کر کے سنو۔ جن اشخاص کے لب و لہجہ کو تعلیم نے تربیت نہیں کیا۔ ان کی زبان سے غ کی جگہ گ نکلتا ہے۔ جب فارسی کے اکثر غ والے لفظ خود فارسی میں گ کی آواز دیتے ہیں۔ تو طبیب زبان سمجھ گیا۔ کہ دونوں کا مزاج یکساں ہے۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ اکثر الفاظ سنسکرت کے ایسے ہیں کہ ان میں گ موجود ہے۔ لیکن جب اسے غ سے بدلتے ہیں تو فارسی لفظ سے مطابق ہو جاتا ہے یا بہت کم فرق رہ جاتا ہے۔ اس سے ثابت ہو گیا۔ کہ دونوں کی اصل ایک تھی اختلاف ملک نے آواز بدل دی۔

داغ۔ آگ سے جل کر جو نشان پڑ جائے۔ یا عام نشان کو فارسی میں داغ کہتے ہیں۔ وہی سنسکرت میں داگھ ہے۔

کلاغ۔ فارسی میں کوے کو کہتے ہیں۔ وہی سنسکرت میں کاگ ہے فارسی میں کوے کی آواز کو کاغ کاغ بولتے ہیں۔

شغال اور شگال۔ فارسی میں گیدڑ کو کہتے ہیں۔ وہی سنسکرت میں شریگال ہے۔

میغ۔ فارسی میں ابر کو کہتے ہیں۔ وہی سنسکرت میں میگھ ہے۔

آروغ۔ فارسی میں ڈکار کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں اوگار کہتے ہیں۔

ف

زبان فارس کا جوہر ہے۔ ہندوستان میں نہیں ملتا۔ جب چاہو سن لو۔ اس کی جگہ زبانوں سے پ نکلتا ہے۔ بلکہ حرف مذکور اپنے گھر میں بھی اکثر پ کی آواز میں بولتا ہے۔ جب ہم فارسی میں سفید اور سپید۔ فرمودن اور پرمودن کو ایک لفظ سمجھتے ہیں۔ تو سنسکرت اور فارسی کے دو لفظوں کو ایسے اختلاف کے سبب سے غیر کیوں سمجھیں۔

سرشف۔ فارسی میں سرسوں کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں سرشپ کہتے ہیں۔

فرمان۔ فارسی لفظ ہے۔ سنسکرت میں پرمان سند کو کہتے ہیں۔

افیون۔ اپون۔ ہپیون۔ فارسی ہیں۔ سنسکرت میں آہی پھن کہتے ہیں۔ آہی سانپ اور پھن جھاگ یہ بھی درخت خشخاش سے جھاگ کی صورت میں نکلتی ہے۔ رنگ بھی کالا ہے اور بے ہوش بھی کر دیتی ہے۔ اس لئے یہ نام پایا۔

آفت۔ ظاہر میں عربی لفظ ہے۔ اور سنسکرت میں آپت ہے۔ در حقیقت عربی نہیں۔ فارسی قدیم یا پہلوی میں آکفت تھا۔ عرب میں جا کر آفت اور عاہۃ ہو گیا۔ دیکھو فارس میں اصل لفظ مر گیا۔ عرب سے نئی زندگی پا کر آیا۔ اور 12 سو برس ہوئے۔ اب تک زندہ ہے۔

فرتاب۔ فارسی میں فرو شکوہ کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں پرتاپ جاہ و جلال۔ اقبال اور لہر و غضب کو کہتے ہیں۔

فرشاد۔ فارسی قدیم میں تحفہ۔ نذرانہ۔ تبرک کو کہتے تھے۔ سنسکرت میں پرساد کہتے ہیں۔

فساں اور افساں وہی چیز ہے۔ جس پر تلوار۔ چھری۔ چاکو۔ تیز کرتے ہیں سنسکرت میں پاشان کہتے ہیں۔

کافور۔ کو سنسکرت میں کرپور کہتے ہیں۔

کف۔ فارسی میں جھاگ کو کہتے ہیں۔ ٹیک چند بہار کہتے ہیں کہ کچھ سنسکرت میں

مادہ بلغم کو کہتے ہیں اور اسی لئے کہتے ہیں کہ جھاگ ہوتا ہے عجب نہیں کہ دونوں اصل میں ایک ہوں۔

کشف۔ کچھوا۔ سنسکرت میں کچھ چپ کہتے ہیں۔

نیلوفر۔ کو سنسکرت میں نیلوت پل کہتے ہیں۔

کبھی سنسکرت کا پھ فارسی میں ف کی آواز سے بولتا ہے

ناف۔ فارسی لفظ ہے۔ سنسکرت میں نابھی کہتے ہیں۔

ق

عرب کا حرف ہے۔ ہندوستان کی خاک میں یہ آواز نہیں۔ سنسکرت کا ک والا لفظ عربی دان لوگوں کی زبان پر آجائے تو "ق" سے بدل لیتے ہیں۔

مقیش۔ اصل میں سنسکرت کا لفظ ہے۔ میکش کیش اس میں مکیش سورج کی کرن ہے۔ محقق ہند صاحب بہار عجم سے کہ اسے عرب کا لفظ مان کر کہتے ہیں کہ مقیش ہے۔ لیکن یہ نہیں لکھتے کہ عربی میں اس کا ماخذ اور اصل کیا ہے۔ صاحب غیاث اللغات اس کا حوالہ دیتے ہیں اور توضیح میں اس سے زیادہ زور دیتے ہیں۔ جب اصل نہیں تو زور کیا چل سکتا ہے۔

آزوقہ۔ عربی لفظ ہے اور کتب میں لکھا ہے کہ آب۔ ذقہ سے مرکب ہے مگر ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اجیو کا ہے۔

سراوق۔ عربی لفظ ہے۔ پردہ کو کہتے ہیں مگر سنسکرت میں سراد پردہ کو کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہندی سے معرب کیا ہے۔

ک

فارسی میں بھی قرب مخرج چند حروف کے مبادلہ پر مائل کرتا ہے۔ سنسکرت کے لفظوں میں اثر مذکور ظہور کرے تو بے جا نہیں ہے۔ چنانچہ سنسکرت کا کھ فارسی میں ک کی آواز دیتا ہے۔

کان۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں کھان اور کھنی بھی کہتے ہیں۔

کنج۔ فارسی میں گوشہ کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں کنج چھائی ہوئی۔ چھت پٹی ہوئی رکی ہوئی۔ اور بند جگہ کو کہتے ہیں۔

تاک۔ سنسکرت میں دراکشا ہے۔ کشا۔ اپنے گھر میں بھی کبھی کھیا کی آواز دیتا ہے۔ اگر فارسی میں ک ہو گیا تو کچھ تعجب نہیں۔

کاہ۔ سنسکرت میں کنش ہے۔

کبھی سنسکرت میں "ک" ہوتا فارسی میں گر پڑتا ہے۔

موش۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں موشک کہتے ہیں۔ زبان مذکور میں موش چور کو کہتے ہیں۔ چوہا بڑا چوتا جانور ہے۔ اس لئے یہ نام پایا۔ سنسکرت کا "ک" خصوصیت وصفی پر دلالت کرتا ہے جیسے گندھک میں۔

نال۔ فارسی میں نرسل یا نلی کو کہتے ہیں سنسکرت میں نالک کہتے ہیں۔

آفت۔ فارسی میں بہ معنی آفت تھا۔ سنسکرت میں آپت ہے۔ ک یا اصل میں تھا۔ سنسکرت میں ضائع ہوا۔ یا اصل میں نہ تھا فارسی میں زیادہ ہو گیا۔

بتو۔ بتہ۔ فارسی میں خشکی کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں بھست ہے۔

گ

بموجب بیان ہائے مذکورہ بالا کے سنسکرت کا گھ۔ فارسی میں گ خالص کی آواز دیتا ہے۔

گرم۔ فارسی میں اسم صفت ہے۔ سنسکرت میں گھرم بہ معنی گرمی ہے برج میں اسی نے آواز بدلی۔ گھام ہو گیا۔

گیسو۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں کیش ہے۔

مگس۔ فارسی ہے سنسکرت میں مکشیکا ہے۔

کبھی سنسکرت کا "ک" فارسی میں گ بولا جاتا ہے۔

شگون۔ فارسی ہے۔ سنسکرت شگن کہتے ہیں۔

ل

تلفظ کے حق میں ملائم اور صاف حرف ہے۔ قرب مخرج اور مناسبت طبع اسے "ر" کے ساتھ ہم آواز کرتی ہے۔

پالان۔ فارسی لفظ ہے۔ سنسکرت میں پریان اور پلیان بھی کہتے ہیں۔

م

قرب مخرج۔ اور ہمسائیگی کے اثر سے چند حرفوں کے ساتھ فارسی میں مبادلہ پر آمادہ رہتی ہے۔ ان میں سے ب ن جیسے بجم سے نجن اور بام سے بان۔

اس میں ن غنہ کا بھی مادہ ہے۔ چنانچہ جب ن کے بعد ب آتی ہے تو "م" کے ساتھ لکھتے ہیں۔ جیسے گنبد۔ گمبد۔ جنبش میں م کی آواز ہے۔ لکھنے میں ن آتا ہے۔ دم کی اصل دنب تھی۔ اور یہی اثر ہے کہ دھوم سنسکرت کا لفظ بگڑ کر عو برج بھاشا میں دھواں ہو گیا۔

خم او خنب۔ فارسی میں مٹکے کو کہتے ہیں سنسکرت میں کمبھ ہے۔

شام۔ فارسی میں دن کے کنارہ کو کہتے ہیں۔ جو رات سے ملتا ہے۔ سنسکرت میں سانے لکھتے ہیں اور سانگ کہتے ہیں۔ اہل دکن پنڈت سائم کہتے ہیں۔ شائد فارس میں جا کر شام ہو گیا ہو۔ یا کوئی اور ایسا لفظ ہو کہ یہاں آکر سانگ ہوا۔ فارس میں شام ہوا۔ دکن میں سائم کہلایا۔ اور اس میں تو شک نہیں کہ "س" اکثر ش کی آواز دے جاتا ہے۔

کم۔ فارسی میں زیادہ کی ضد ہے۔ سنسکرت میں کن ریزہ کو کہتے ہیں۔

گرم سوت۔ فارسی میں اس کپڑے کو کہتے ہیں۔ جس میں سوت ریشم ملا ہوا ہو۔ سنسکرت میں گربھ سوتر کہتے ہیں۔

ن

فارسی میں اس حرف کی آوازیں عجب رنگ دکھاتی ہیں۔ دیکھو جن یا جان میں جگہ

ن کو ظاہر کر کے بولیں تو ایک آواز ہے۔ لیکن جب جان میں غنہ بولیں تو کچھ اور آواز ہے۔ جنگ میں کچھ اور رنگ ہے اور جب ن ساکن کے بعد ب آجائے۔ تو خاصی م کی آواز ہوتی ہے۔ انتہا ہے کہ خنب کا خم (مٹکا) بن گیا۔ اور اب خنب کوئی جانتا بھی نہیں۔ اسی طرح دنب کی دم رہ گئی۔ اور دنب کوئی پہچانتا بھی نہیں۔ مگر سمجھنے والے تاڑ جاتے ہیں کہ یہ پھیل کر دنبہ ہو گئی ہے۔

ستنبہ بوزن شکنبہ۔ فارسی میں بد شکل آدمی اور ہیبت ناک اور ڈراؤنی چیز کو کہتے ہیں سنسکرت میں ستمبہ اس دور کی چیز کو کہتے ہیں کہ نظر تو آئے۔ مگر نہ معلوم ہو کہ کیا ہے۔ اور اس چیز کو بھی کہتے ہیں جس کے سہارے سے اور چیز کھڑی ہو اور سخت اور قوی ہیکل آدمی کو۔ اور میل کو بھی کہتے ہیں۔ جو نشان راہ کے لئے بناتے ہیں اور ستنب میں انہی معنوں میں آیا ہے۔

کبھی "ن" سنسکرت میں ہوتا ہے۔ فارسی میں نہیں ہوتا۔

دوش۔ فارسی میں کندھے کو کہتے ہیں سنسکرت میں دوشن کہتے ہیں۔

کام۔ فارسی میں مقصد و مراد کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں کامنا کہتے ہیں یا یہ کہو کہ جو کام سنسکرت میں ایک مقصد نفسانی ہے۔ وہ اب فارسی میں عام مقصد کے لئے بولتے ہیں۔

ہشت۔ فارسی ہے۔ سنسکرت اشٹن ہے۔

پر۔ فارسی میں خالی کی ضد ہے۔ سنسکرت میں پورن ہے۔

دش۔ فارسی قدیم میں بہ معنی بدی تھا۔ اسی سے ہے دشمن۔ دشنام سنسکرت میں دوش دوشہ یا دوشن عیب ہے۔

کبھی سنسکرت میں نہیں ہوتا فارسی میں ہوتا ہے

مہمان۔ فارسی ہے اور اہل لغت کہتے ہیں۔ کہ۔ مہ بہ معنی سردار او۔ مان حرف تشبیہ ہے (یعنی بزرگ وار)۔ ٹیک چند بہار کہتے ہیں کہ سنسکرت میں مہاپ بہ معنی تعظیم و توقیر ہے۔ اور کبھی تعریف کے موقع پر بھی آتا ہے۔ چونکہ مہمان کی تعظیم و توقیر۔ ہر قوم اور ہر ملک میں رسم عام ہے۔ عجب نہیں کہ مہمان کے لئے مستعمل ہو گیا ہو۔

قرب مخرج زبان فارسی میں بھی اسے بعض حرفوں کی طرف کھینچتا ہے۔ یہی اثر سنسکرت میں بھی ظاہر ہوتا ہے۔ چنانچہ اکثر ب کے ساتھ بدلا جاتا ہے۔

کوز۔ فارسی میں کبڑے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں کبجا کہتے ہیں۔

کبھی ک سے آواز بدلتا ہے۔

ہستو۔ فارسی میں معترف و اقراری ہے۔ مرکب ہے ہست۔ و سے یعنی تمہاری بات پر ہاں۔ اور درست ہے۔ کہنے والا۔ گویا ہست میں "و" نے فاعلیت کے معنی پیدا کئے ہیں۔ سنسکرت میں آستک اقراری کو کہتے ہیں۔

نستوہ اور نستو۔ فارسی میں لڑاک۔ بد اعمال۔ جھگڑالو آدمی کو کہتے ہیں اور امر تحقیقی وہی ہے کہ ن نفی کا ہے۔ اس لئے ہستو۔ اقراری۔ نستو۔ بہ معنی منکر ہے جھگڑالو آدمی بات کو نہیں مانتا۔ ہر دلیل کی نفی کرتا ہے۔ اس لئے اسے نستوہ یا نستو کہتے ہوں گے۔ سنسکرت میں ناستک بہ معنی منکر ہے اور یہی سبب ہے، کہ دہریہ منکر الٰہی کو ناستک کہتے ہیں۔

کبھی ے کی آواز دیتی ہے۔

سرون۔ فارسی میں سنگ کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں شرینگ کہتے ہیں۔

کبھی سنسکرت میں وہ ہوتا ہے۔ فارسی نہیں ہوتا۔

جی۔ زبان ژند میں بہ معنی پاک و پاکیزہ تھا۔ اس واسطے تعظیم کے لئے آتا تھا۔ سنسکرت میں جیو روح کو کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ روح سے زیادہ کیا چیز پاکیزہ ہو سکتی ہے! غالباً اصلیت دونوں کی ایک ہو گی۔

در۔ دروازہ۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں دوار کہتے ہیں۔

گری۔ فارسی میں گلے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں گریو کہتے ہیں اس سے ہے گریبان۔

پر۔ فارسی ہے۔ خالی کی ضد۔ سنسکرت میں پورن کہتے ہیں۔

تن۔ فارسی ہے ترجمہ بدن۔ سنسکرت میں تنو کہتے ہیں۔

گلو۔ فارسی میں گلے کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں گولو کہتے ہیں۔

ماست۔ فارسی میں دہی کو کہتے ہیں سنسکرت میں مستو بلوئے ہوئے دہی کو کہتے ہیں۔

وش۔ فارسی۔ دوشہ یا دوش بہ معنی عیب و بدی۔
کبھی سنسکرت میں نہیں ہوتا فارسی میں ہوتا ہے۔
گیسو۔ سنسکرت میں کیس ہے۔
پور۔ بہ معنی پسر۔ سنسکرت میں پتر ہے۔

ہ

قرب مخرج اور مناسبت طبعی فارسی میں بھی اکثر حرفوں کے ساتھ مبادلہ پر آمادہ کرتی ہے۔ ان میں سے ہے الف۔ جیسے، ایچ، اچ، ہنگام، انگام۔ کبھی س سے۔ جیسے۔ رلو۔ راس۔ کبھی ک سے جیسے راہگاں۔ رایگاں۔
یہی مناسبت طبع ہے کہ فارسی اور سنسکرت کے الفاظ میں بھی اکثر حرفوں سے آواز بدلتی ہے۔
فارسی کی ہ سنسکرت میں کبھی الف کی آواز دیتی ہے۔
ہرپاسپ۔ فارسی میں سیارہ آسمانی کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں آر بشی اندر کے اہل دربار میں سے ایک مصاحب کا نام ہے۔ ار بہ معنی بزرگ بشی عزم و آہنگ۔
ہشت۔ عدد 8۔ سنسکرت میں اشٹ کہتے ہیں۔
ہویدا۔ فارسی ہے۔ وہی سنسکرت میں ادے ہے۔
ہبچہ۔ ہلک۔ ہبہ۔ فارسی میں ہچکی کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں ہکاوہی ہے۔
فارسی کی ہ سنسکرت میں کبھی س کی آواز دیتی ہے۔
ہور۔ فارسی ہے۔ آفتاب کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں سوریے کو کہتے ہیں۔
ماہ۔ فارسی میں چاند کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں ماس مہینے کو کہتے ہیں اور یہ فرق بہت خفیف ہے۔ برہان میں لکھا ہے کہ ماس بہ معنی ماہ ہے معلوم نہیں کس زبان کا لغت ہے۔

گیاہ۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں گھاس کہتے ہیں۔
ہفت۔ فارسی میں عدد 7 ہے۔ سنسکرت میں سپت کہتے ہیں۔
نہ۔ فارسی میں حرف نفی ہے۔ سنسکرت میں نس ہے۔ فارسی قدیم میں نیا اور ژند میں نید ہے۔
ہم۔ فارسی میں بہ معنی ہمدگر ہے۔ اور فارسی قدیم اور ژند میں یہی معنی تھے۔ سنسکرت سم بہ معنی باہم ہے۔
سنسکرت میں کبھی ش کی آواز دیتی ہے۔
کروہ۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں کروش کہتے ہیں یہی خراب ہو کر کوس ہو گیا۔
دہ۔ فارسی میں 10 ہے۔ سنسکرت میں دش کہتے ہیں۔
سنسکرت میں ک کی بھی آواز دیتی ہے۔
آملہ۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں آملک کہتے ہیں۔
مردہ۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں مرتک اور مرت بھی کہتے ہیں۔
سنسکرت میں کبھی "و" کی آواز دیتی ہے۔
رجہ۔ فارسی میں انگلی کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں "رجو رسّی کو کہتے ہیں۔
شہد۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں کشودر کہتے ہیں کبھی فقط ش کی آواز بھی دیتا ہے یا فارسی میں جا کر ک گر پڑا ہو۔ ر۔ سنسکرت میں اکثر زائد ہوتی ہے۔
پیہ۔ فارسی میں چربی کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں پیور اور پین کہتے ہیں۔
نہ۔ فارسی میں 9 کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں نو ہے۔
سنسکرت میں کبھی ے کی آواز دیتی ہے۔
آہن۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں آئس کہتے ہیں۔ س۔ ہ سے بدل گئی۔ ی۔ کی جگہ ن آ گیا اور پھر قلب ہو گیا ہے۔ زمانہ کی طول مدت اور زبانوں کے انقلاب کس نے دیکھے۔ دونوں لفظوں کا کچھ نہ کچھ تعلق معلوم ہوتا ہے۔
کبھی فارسی میں ہوتی ہے۔ سنسکرت میں نہیں ہوتی۔
ہوا۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں۔ ہ۔ محذوف ہے۔ وایو کہتے ہیں۔ اخیر میں۔ د۔

زیادہ ہو گیا۔

انگارہ۔ فارسی میں آگ کے ڈلے کو کہتے ہیں۔ اسی کو سنسکرت میں انگار کہتے ہیں۔

گریوہ۔ فارسی میں پشتے اور چھوٹی پہاڑی کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں گراوپہاڑ کو کہتے ہیں۔

کبھی فارسی میں نہیں ہوتی اور سنسکرت میں ہوتی ہے۔

نے۔ فارسی میں نلی یا نرسل کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں نہو کہتے ہیں۔

ی

قرب مخرج کے سبب سے فارسی میں بھی کئی حرفوں کے ساتھ ہم آوازی کرتا ہے۔ ان میں سے ہے ج۔ چنانچہ جوغ۔ یوغ وغیرہ بہت سے الفاظ فارسی میں بھی ج اور ی۔ دونوں حرفوں سے بولے جاتے ہیں۔ کبھی و سے جیسے رویندہ۔ روہندہ۔ خوے۔ خوہ (پسینہ)۔ اگر یہ میل طبیعت سنسکرت میں بھی ظہور کرتا ہے تو بے جا نہیں۔

یار۔ فارسی میں عموماً رفیق اور دوست کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں جار عورت کے یار کو کہتے ہیں۔ اس کی بنیاد دوستی خبث پر ہے۔

پائے۔ فارسی ہے سنسکرت میں پاد کہتے ہیں اور اسی سے ہے پادک جو فارسی میں پاٹک ہے اور مخفف اس کا پیک اور پائے بند۔ سنسکرت میں پادو ندھ۔

کبھی فارسی کی "ے" سنسکرت میں "و" ہوتی ہے

بیو۔ فارسی میں دلہن کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں اسے بدھو کہتے ہیں۔ وہی اول بدل کر برج بھاشا میں بہو ہو گئی۔

مے۔ فارسی میں شراب ہے۔ سنسکرت میں مد اور مدھو کہتے ہیں۔

کبھی سنسکرت میں ہوتی ہے۔ فارسی میں نہیں ہوتی۔

کار۔ فارسی میں کردن سے حاصل مصدر ہے۔ سنسکرت میں کاریے اور کرم بھی کہتے ہیں اور اصل وہی ہے کہ افعال کے مشتقات ان دونوں زبانوں میں ایک ہیں۔

گرہ۔ فارسی ہے سنسکرت میں گرہ کہتے ہیں۔

کرم۔ فارسی میں چھوٹے چھوٹے کیڑوں کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں کری کہتے ہیں۔

ہوا۔ فارسی میں ہے۔ سنسکرت میں وایو کہتے ہیں۔

ف۔ فارسی لفظوں کے اخیر میں جو "ی" الف مدہ کے بعد لکھی نظر آتی ہے۔ کبھی تلفظ میں آتی ہے، کبھی نہیں آتی مگر اضافت اور صفت میں ظاہر ہوتی ہے۔ اکثر محقق کہتے ہیں کہ وہ "ی" اصلی ہے۔ بعضے کہتے ہیں کہ زائد ہے۔ "اضافت اور صفت کی حالت میں اظہار حرکت کے لئے لکھ دیتے ہیں۔" جو اصلی سمجھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اگر جزو لفظ نہ تھی۔ تو۔ پایہ۔ پایک۔ پیک۔ پایدار وغیرہ الفاظ میں کہاں سے پیدا ہو گئی۔ اور سنسکرت کے الفاظ ان کی تائید کرتے ہیں۔ دیکھو لوپائے کی ے۔ دال سے بدلی ہوئی ہے۔ ہوائے کی ے کو تم نے خود دیکھ لیا۔ یہ بھی سنسکرت میں جزو لفظ ہے۔

کبھی فارسی میں ہوتی ہے۔ سنسکرت میں نہیں ہوتی۔

ریشم۔ ریشہ۔ فارسی ہے۔ سنسکرت میں رشمی تار۔ ریشہ۔ رگ وغیرہ کو کہتے ہیں اور اسی مناسبت سے سورج کی کرن کو اور کبھی باگ اور باگ ڈور کو بھی کہتے ہیں۔ اور عجب نہیں کہ ریشم بھی اسی سے نکلا ہو اور ہو سکتا ہے کہ ریسمان کا رشتہ بھی اس سے جا ملتا ہو۔

فائدہ۔ عزیزان وطن! تم نے یہ قاعدہ دیکھ لیا کہ اہل تحقیق نے مختلف زبانوں کو سمجھ سوچ کر 3 حلقوں میں تقسیم کیا ہے۔ اور اصل اصول اس میں یہ رکھا ہے کہ جو ایک حلقہ کی زبانیں ہوں گی۔ انھیں کے الفاظ باہم ملتے جلتے اور آپس میں مشابہ ہوں گے۔ یہ نہ ہو گا کہ ایرین کے حلقہ کی ایک زبان ہو اور اس کے الفاظ غیر حلقہ کی کسی زبان کے الفاظ سے مشابہ ہو جائیں۔ لیکن میں تمھیں اس مقام پر اکثر الفاظ ایسے بھی سناتا ہوں کہ ظاہر میں عربی کے الفاظ معلوم ہوتے ہیں اور اسی واسطے انھیں سیمٹک کے دائرہ سے باہر نہ ہونا چاہئے تھا باوجود اس کے وہی لفظ سنسکرت میں بھی موجود ہیں جو کہ خاص ایرین زبان ہے یہ اتفاقی اتفاق ہے۔

ذات۔ عربی لفظ ہے۔ سنسکرت میں جات انھی معنوں میں موجود ہے۔ مگر یہ

اصل میں زاد کا مبدل ہے۔

دینار۔ عربی میں سونے کے سکہ کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں دینار انہی معنوں میں موجود ہے اور اس کا کچھ تعجب نہیں۔ یہ اصل میں فارسی قدیم کا لفظ ہے جس طرح ایک سکہ لین دین میں فارس سے عرب میں پہنچا اسی طرح ہندوستان میں بھی آ گیا۔

ارم۔ عربی میں باغ شداد کا نام ہے۔ سنسکرت میں آرام عیش باغ کو کہتے ہیں۔

اوج۔ عرب میں بہ معنی بلندی ہے۔ سنسکرت میں اوچ کے یہی معنی ہیں شائد پہلوی ہو۔ جس کا پہلو عرب سے ملتا ہے اور عجب نہیں کہ سنسکرت اور نجوم کی وکالت سے ہند کا مسافر عرب میں جا پہنچا ہو۔

شک۔ عربی میں یہی لفظ ہے جسے ہم تم شک وشبہ کہتے ہیں۔ سنسکرت میں اصلی لفظ شک ہے۔ لیکن یہ ایک ایسا ماخذ ہے کہ اس کے مشتقات میں ن زیادہ ہو جاتا ہے۔ انہی میں سے ہے شنک۔ جو کہ بھاشا کے محاورہ میں بھی بولا جاتا ہے۔

ناد۔ ندا۔ عربی لفظ ہے۔ اصلی آواز کا عکس جو کہ پہاڑ یا عالیشان مکانوں سے پلٹ کر آئے۔ سنسکرت میں ناد بہ معنی آواز ہے۔

بدن۔ عربی ہے۔ سنسکرت میں بدن سر و چہرہ کو کہتے ہیں۔

قبر۔ عربی ہے۔ سنسکرت میں سوبھر ہے۔

صبح۔ عربی ہے۔ شوہ سنسکرت ہے۔

دوا۔ عربی ہے۔ سنسکرت میں دوا کے یہی معنی ہیں۔

افعال

عزیزان وطن! تم جانتے ہو کہ سنسکرت کا جو کچھ رشتہ ہے۔ ژند کے ساتھ ہے جو کہ ایک زمانہ میں فارس کی زبانوں پر خدائی سلطنت کرتی تھی۔ فارسی موجودہ وہاں کے ایک قطعہ کی پراکرت (عوام کی بولی) ہے۔ جیسے تمہارے ہاں برج بھاشا۔ باوجود اس کے دونوں کے فعل اس قدر ملتے جلتے ہیں کہ اگر کوئی دونوں زبانوں کا ماہر مطابقت کرنے بیٹھے تو شائد چند فعل کا اختلاف رہ جائے۔ تم ضرور کہو گے کہ سنسکرت میں 24

صیغے ہیں اور فارسی موجودہ میں 6۔ میرے دوستو! یہ کچھ تعجب کی بات نہیں۔ پراکرت بولیوں میں زیادہ باریکیاں نہیں ہوتیں۔ اور رشتہ ان دونوں کا واسطہ درواسطہ ہے۔ وہ بھی سینکڑوں برس دور جا پڑا۔ پھر بھی صیغوں کی ساخت اور صورت میں دیکھو۔ کس قدر ملتے ہیں۔

ہست	ہستند	ہستی	ہستید
استی	سنتہ	ہسی	ستھ
	ہستم	ہستیم	
	ہسمی	سمہ	
بود	بوزند	بودی	بودید
بھوتی	بھونتی	بھوس	بھوتھ
	بودم	بودیم	
	بھوامی	بھوامہ	

یہاں پھر جتانا واجب ہے کہ است کو جو خاص وعام کتابوں میں حرف ربط لکھتے ہیں سنسکرت میں استی ہے۔ معنی ہستن ہے اور انگلستان اور جرمن کے محقق کہتے ہیں کہ است ماضی کا صیغہ ہے استن سے۔ انگریزی میں اس کی جگہ ہے۔ اِز۔ دیکھو اگرچہ is "ز" کی آواز دیتا ہے مگر s سے لکھا جاتا ہے۔ اور وہاں بھی فعل سمجھا جاتا ہے۔ لاطینی میں ایست۔ یونانی میں ایست ہے۔ المانی میں است استعمال کرتے ہیں۔

معلوم ہوتا ہے کہ ابتدا میں فارس کے عربی دانوں کی بے پروائی سے حرف لکھا گیا۔ اور اسی طرح کتابوں میں درج ہوتا چلا آیا۔ پھر کسی نے خیال نہ کیا۔ حقیقت میں فعل ہے کیونکہ تمام اوصاف وخواص فعل کے ہیں۔

(1) ضمائر فاعلی کو دیکھو۔ باوجودیہ کہ فارسی مروج علمی زبان نہیں پھر بھی کس قدر سنسکرت سے مشابہ ہیں:۔

او وا او   سوودت۔ اگر "ہ" کو بموجب رواج مندرجہ کے گرادو۔ تو صاف او ہے۔

آنہاوا وند	تے ودن
توداوی	توم اودہ تھے۔ توانگ کا مختصر تو ہے۔
شماوا وید	یوئن اودت۔ ءاور ش قریب المخرج ہیں ان غنہ اکثر میم ہو جاتا ہے گھٹ بڑھ کر شما ہو گیا ہو گا۔ دیکھ لو ضمائر مفعولی میں یشما ہو گیا ہے۔
من وادم	آہن اودم
ماداویم	دیم اودامہ

(2)ضمائر مفعولی کو دیکھو:۔

اوراواو	تن اودت
آنہاراواد	تاں اودن
تراواو	توام اودہ
شماراواو	یشماں اودت
مراواو	مام اودت
ماراواو	اسماں اودامہ

(3)حالت خبری

ایں چندت است	ایم چنڈ توستی
اینہا چنڈ تا ئند	اے چنڈ توستی
تو چنڈت استی	توام چنڈ توسی
شما چنڈت ہستید	یویم چنڈ توستھ
من چنڈ تم	اہم چنڈ توسی
ما چنڈ تائیم	دیم چنڈ توسمہ

(4) حالت اضافی کو دیکھو :۔

کار او	تسی کاریم
کار آنہا	تے شام کاریم
کار تو	توکاریم
کار شما	یشما کم کاریم
کار من	مم کاریم
کار ما	اسما کم کاریم

جس طرح دونوں زبانوں میں ترکیبیں فعل کی اور حالتیں متعلقات فعل کی ملتی جلتی ہیں۔ یہاں ان کی تفصیل بیان نہ کروں گا۔ کیونکہ میں اور میرے ہم زبان دونوں سنسکرت سے کم واقف ہیں۔ البتہ فارسی کے مختلف مصدروں کے فعل اور ان کے مقابل میں سنسکرت کے فعل دکھاؤں گا۔ دیکھو کیسے ملتے ہوئے ہیں۔ یہ پہلے سن لو کہ فارسی کے ہر مصدر یا اس کے ہر صیغہ کو سنسکرت میں ڈھونڈو گے تو پتہ نہ لگے گا۔ اکثر فارسی کا مضارع سنسکرت کے لنک سے ملتا ہوگا۔ اب چند مثالیں سنئے :۔

استادن۔ ستادن سے استد۔ سنسکرت میں ستھا صیغہ حال ہے۔

ستودن۔ ستاید ستوتی۔ صیغہ حال ہے۔

فتادن۔ فتد۔ سنسکرت میں پتتی صیغہ حال ہے۔

آمدن۔ آید۔ سنسکرت میں۔ آیاتی حال ہے۔

باریدن۔ بارش۔ سنسکرت میں ورشتی صیغہ حال ہے۔ ورش ہے۔

بردن۔ برد۔ سنسکرت میں۔ بھرتی حال ہے۔

بستن۔ بندد۔ سنسکرت میں۔ بندھن باندھنا بندھتی۔ حال ہے۔ بندھ۔ بندھا ہوا۔

پزیدن۔ پزد۔ سنسکرت میں۔ پچتی، حال ہے۔

رسیدن۔ رسد۔ پرسری پہنچنا پرسرتی۔ صیغہ حال ہے۔ پ یا تو اصلی تھا۔ فارس

میں جا کر فرسودہ ہو گیا۔ یا اصل میں نہ تھا۔ سنسکرت میں زیادہ ہو گیا۔

پتیدن۔ تپ۔ سنسکرت میں تپ گرم ہونا۔ چمکنا۔ جلنا ہے پتی حال ہے۔

تابیدن۔ تاب۔ سنسکرت میں تاب گرمی۔ روشنی ہے۔ تاب یتی حال ہے۔

چشیدن۔ چشد۔ سنسکرت میں چش بہ معنی چشیدن۔ اچو شیت چشدیا ے چشد۔

خشیدن۔ خشد۔ خش۔ سنسکرت میں۔

دادن۔ دہد۔ سنسکرت میں ددتی۔

دانستن۔ سنسکرت میں دویا دبہ معنی دانستن ہے۔

دویدن۔ دود۔ دو۔ سنسکرت میں دودھاؤ بہ معنی دویدن۔ ہے دھاوتی حال ہے۔

زدن۔ زند۔ سنسکرت میں ہنتی ہے۔ یہ تم جانتے ہو کہ سنسکرت میں ز۔ ہ کا مبادلہ ہو جاتا ہے۔ ژند میں جن بہ معنی بزن ہے۔

زادن۔ زاید۔ سنسکرت میں جوتی حال ہے۔ جو جینا۔

شنیدن۔ شنود۔ سنسکرت میں۔ شرنوتی شنومی (شنوم)۔

کردن۔ کند۔ کن۔ سنسکرت میں کروتی (کند)۔ کرد (کن)۔

گرفتن۔ سنسکرت میں گرہ یا بہ معنی بگیر ہے۔ گرنمائی صیغہ حال ہے۔

گفتن۔ گوید۔ گوئے۔ سنسکرت میں گدھیتن ہے اور گدیتی صیغہ حال ہے۔

لیسیدن۔ لیسد۔ سنسکرت میں الیشت حال ہے۔

مردن۔ میرد۔ سنسکرت میں۔ مریتی صیغہ حال اور مرتک مردہ ہے۔

آہیختن۔ فارسی میں بہ معنی کشیدن۔ محاورہ میں تلوار کے لئے خاص ہو گیا۔ آہنجد مضارع آہنجد۔ اس کا مخفف کہ کشیدہ شدہ کے معنی بھی دیتا ہے۔ سنسکرت میں ارہتی حال ہے۔ آرہت کھینچا گیا۔ "ر" کا حذف دونوں زبانوں میں آیا ہے۔ دیکھو اب متفق ہو گئے۔

سرشتن۔ سرشد۔ سرلیش۔ سنسکرت میں سرج دھاتو۔ یعنی ماخذ۔ سرش حاصل مصدر سرجیب لنگ ہے۔ س۔ ج کا بدلہ عام ہے۔

پیمودن۔ پیماید۔ پیمائے۔ سنسکرت میں ما دھاتو۔ ماپنا۔ ماپا گیا۔ قلب ہو کر دونوں ایک ہو جاتے ہیں۔

مالیدن۔ مالد۔ مال۔ سنسکرت میں مرد دھاتو۔ مردیت لنک۔

دمیدن۔ دمد۔ دم۔ سنسکرت میں دھما دھاتو ہے۔ جس کے معنی ہیں پھونکنا۔

تنیدن۔ تند۔ تن۔ سنسکرت میں تن دھاتو ہے۔

خرامیدان۔ خرام۔ فارسی میں رفتار ناز کو کہتے ہیں۔ سنسکرت میں کرم دھاتو ہے اور وہی معنی ہیں۔

خریدن۔ خر۔ فارسی میں مول لینا ہے۔ سنسکرت میں کری خریدنے کو کہتے ہیں۔

جس طرح دونوں زبانوں میں فعل فاعل مفعول وغیرہ کی حالتیں ملتی جلتی ہیں ان کی تفصیل یہاں بیان نہ کروں گا۔ کیونکہ میں اور میرے ہم زبان سنسکرت میں ایسی مہارت نہیں رکھتے۔ تقریر بجائے لذت کے وقت پیدا کرے گی۔ اس وقت جو کچھ ہو سکا اسی پر قناعت کرتا ہوں۔ اہل ذوق معاف فرمائیں۔

باب حروف

الف

فارسی قدیم میں "ا" نفی کے معنی پیدا کرتا ہے۔ سنسکرت میں اب تک نفی کے معنی دیتا ہے۔

فارسی قدیم		سنسکرت	
اجنبا	بے حرکت	ابھے	نڈر
اخواستی	بے ارادہ	انت یے	بے بقا
امیر	جو کبھی نہ مرے	امر	جو کبھی نہ مرے
		اجت	جس سے کوئی جیت نہ سکے

ت

ایشیائی زبانوں میں خطاب واحد حاضر کا جوہر اپنی ذات میں رکھتی ہے۔ مثلاً :۔
تم فارسی میں کہتے ہو۔ توبودی ؟ دانائے ہند کہتا ہے۔ توانگ ابھو۔
تم کہتے ہو۔ ترادیدم۔ یادید مت۔ وہ کہتا ہے۔ تون دورش۔
تم کہتے ہو غلام تو یا غلامت۔ وہ کہتا ہے۔ توسیوک۔

ج

فارسی میں نسبت کے معنی پیدا کرتا تھا۔ اور اسی بنیاد پر فریدون نے ایک بیٹے کا نام رکھا تھا ایرج۔ ایران والا۔ دوسرے کا تورج۔ توران والا۔ سنسکرت میں بھی یہی اثر کرتا ہے۔ چنانچہ نیر پانی کو کہتے ہیں۔ اور اسی واسطے نیرج نیلوفر کو کہتے ہیں کہ پانی میں پیدا ہوتا ہے اور اسی طرح آتج آتما والا۔ لطف یہ ہے کہ فارسی میں آبو گل نیلوفر کو کہتے ہیں۔

کہ

فارسی میں استفہام کے لئے آتا ہے۔ تم کہتے ہو کیستی ؟ سنسکرت میں کہتے ہیں۔ کرسی اور تو کیستی۔ یا کہ گفت بشما۔ وہ کہتا ہے۔ کوسی تون تو ون کہ آکھت۔

ک۔ فارسی میں بعض لفظوں کے پیچھے چپک کر نسبت کے اثر سے فاعلیت کے معنی پیدا کرتا ہے۔ مثلاً پردک (چیستان کو اس لئے کہا کہ مطلب کی بات پردہ میں ہے)۔ چوشک (ٹونٹی کو اس لئے کہا کہ چوشیدن چوسنے سے مشتق ہے)۔ سنسکرت میں رکھشک رکھوالی کرنے والا۔ بھکشک۔ کھانیوالا۔ اشٹک۔ آٹھ عدد والا مجموعہ۔ گندھک (خاص قسم کی بو والی چیز)۔

فارسی میں کاف تصغیر کے لئے بھی آتا ہے جیسے کنیزک۔ سیاہک۔ سنسکرت میں بھی یہی معنی پیدا کرتا ہے۔ جیسے بال سے بالک۔

کاف سے پہلے کبھی "ن" لگا دیتے ہیں جیسے کتھا کہانی۔ کتھانک چھوٹی کہانی۔

م

متکلم کا جوہر اس کی طبیعت میں ہے۔ تم فارسی میں کہتے ہو۔ بودم۔ دانائے ہند کہتا ہے ابھوم۔ تم کہتے ہو۔ بودیم۔ وہ کہتا ہے ابھوام۔ تم کہتے ہو مرا۔ وہ کہتا ہے مام۔ تم کہتے ہو غلامم۔ وہ کہتا ہے۔ مم سیوکھ۔

فارسی میں فاعل عددی کے معنی پیدا کرتا ہے۔ مثلاً یکم۔ دوم۔ سوم وغیرہ۔ سنسکرت میں کہتے ہیں پرتھم، پنچم، ستم، اشٹم، نوم، دشم۔ اس کے آگے کل اعداد کے ساتھ میم لگتا ہے۔

ن

اپنی طبیعت میں انکار کی تاثیر رکھتا ہے۔ فارسی میں ن۔ نہ۔ نے عام مستعمل ہیں۔ سنسکرت میں ن اور نس اور نر نفی کے لئے آتے ہیں۔

و

فارسی میں عطف کے لئے آتا ہے۔ سنسکرت میں "وا" حرف تردید کا کام دیتا ہے جس کے لئے اب فارسی میں "یا" کام دیتا ہے۔ اور غور کرو تو بعض موقع پر حرف تردید بھی عطف کا کام دے جاتا ہے۔ مثلاً تم کہتے ہو۔ از یاران درانجا شما بودید یا احمد۔ دگر ہیچکس نہ بود (اس کے کیا معنی ہیں؟ یعنی ہمارے یاروں میں وہاں کوئی نہ تھا۔ تم اور احمد تھے)۔

فارسی میں فاعلیت کے معنی بھی پیدا کرتا ہے مثلاً ہندو (ہند کا رہنے والا)۔ ریشو (ڈاڑھی والا)۔ شاشو (مشوڑا)۔ آبو (گل نیلوفر کہ پانی والا ہے) سنسکرت میں۔

ی

فارسی میں نسبت کے معنی پیدا کرتی ہے۔ مثلاً ایرانی۔ تورانی۔ آبی۔ خاکی۔

سنسکرت میں بھی یہی معنی پیدا کرتی ہے۔ مثلاً کابلی (کابل کا رہنے والا)۔ چینی (چین کا رہنے والا)۔ گنی (گن والا)۔ پکشی (پکش یعنی پروں والا)۔ پاپی (پاپ والا)۔ فارسی میں کبھی اس ی کے بعد ن بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ جیسے۔ سیمین۔ آہنیں۔ سنسکرت میں بھی ایسا ہوتا ہے۔ جیسے گرام سے گرامی اور گرامیں دونوں طرح آتا ہے۔

حروف متفرقہ

است۔ جو فارسی میں حرف ربط کہلاتا ہے۔ سنسکرت میں۔ استی ہے۔ اور فارسی میں کبھی ہے بھی اسی موقع پر آتا ہے خواجہ حافظ ؎

ساقی اگرت ہوائے ماہے   جز بادہ میار در میاں شے

(1) ترکیب مقلوبی۔ فارسی میں عام ہے۔ جیسے علم دوست۔ خرد دشمن۔ زہراب۔ نوشاب اسی طرح سنسکرت میں بھی عام ہے۔ جیسے پریم ساگر، دھرم مورت۔

(2) ترکیب تشبیہی۔ فارسی میں عام ہے آہو چشم۔ گل رخسار۔ اسی طرح سنسکرت میں کمل لوچن، مرگ نین، چندر مکھ۔

مند۔ فارسی میں اسم کے ساتھ مل کر معنی صفتی پیدا کرتا ہے۔ مثلاً ہنر مند۔ خرد مند۔

وند۔ بھی یہی فائدہ دیتا ہے۔ مثلاً خداوند۔ سنسکرت میں ونس کا یہی پھل ہے دھن ونت بلونت۔

بان۔ کا فارسی میں یہی کام ہے۔ مثلاً جہانبان۔ مہربان۔ پاسبان۔ سنسکرت میں گنوان۔ بدھیاوان۔ دھنوان۔

آن۔ فارسی میں آخر اسم پر جمع کے لئے لگاتے ہیں۔ مثلاً مردان۔ اسپان وغیرہ سنسکرت میں نر کی جمع حالت مفعولیت نران ہے۔

ہا۔ فارسی میں حرف جمع ہے۔ سنسکرت میں نر کی جمع نراہ۔ فارسی بولو گے تو نرہا اور

مردہا یا مردان کہو گے۔

بر۔ فارسی میں حرف جر ہے۔ سنسکرت میں پر اور اوپر ہے۔

سان اور سان فارسی میں تشبیہ کے لئے ہے۔ مثلاً بسان شیر حملہ آورد۔ شیر سان نعرہ زد۔ سنسکرت میں سمان ہے اور سم برابر کو کہتے ہیں اور وان بہ معنی مشابہ بھی ہے۔ چونکہ س اور وکا مبادلہ آیا ہے اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ دونو ایک ہیں۔

سار۔ فارسی میں کثرت مقامی کے لئے آتا ہے۔ شاخسار۔ کوہسار۔ نمکسار۔ سنسکرت ادھک سار ہے۔ ادھک پہاڑی کو کہتے ہیں۔

بار۔ فارسی میں کثرت کے لئے آتا ہے۔ مثلاً رودبار۔ زنگبار۔ اصفہان میں ایک محلہ قدیم کا نام ہے گلبار۔ سنسکرت میں اسیوبار جہاں پانی کی کثرت ہو۔ پشپ بار پھلواری۔

بے۔ فارسی اور سنسکرت دونو جگہ حرف نفی ہے۔ بے بھے، نڈر۔

تر اور ترین فارسی میں تفضیل کے لئے آتے ہیں۔ سنسکرت میں بھی یہی معنی پیدا کرتے ہیں اور وہی 3 درجے پیدا کرتے ہیں۔ خوب۔ خوب تر۔ خوب ترین۔

شبھ	شبھ تر	شبھ تم
لگھو (چھوٹا)	لگھو تر	لگھو تم
شلاگھے (ممدوح)	شلاگھے تر	شلاگھے تم

نشتر۔ فارسی کے اہل لغت کہتے ہیں کہ اس کی نیش یعنی نوک تیز ہوتی ہے۔ اس لئے نیشتر اور نشتر کہتے ہیں اور تر میں آبداری کا اشارہ ہے۔ مگر سنسکرت میں نشت تیز کو کہتے ہیں۔ اس صورت میں نشت تر۔ تیز تر ہو تو بے تکلف معنی نکلتے ہیں۔

مہ۔ فارسی قدیم میں بڑائی کے معنی پیدا کرتا تھا۔ اور اسی سے تھامہ آباد۔ شاہان قدیم کا سلسلہ۔ اب تک بھی زبان مذکور میں مہ بہ معنی بزرگ ہے۔ اور اسی سے ہے مہتر اور مہتری۔ سنسکرت میں دوسرے لفظ کے ساتھ مل کر بڑائی کے معنی پیدا کرتا ہے۔ مثلاً:۔

راجہ مہاراجہ

جن	مہا جن
آتما	مہاتما

کار۔ فارسی میں فاعلی کیا صفتی معنی پیدا کرتا ہے۔ مثلاً نیکوکار۔ بدکار۔ شیریں کار۔ سنسکرت میں۔

سنار	سورن کار
کمہار	کمبہ کار

پس۔ فارسی میں بہ معنی بعد ہے۔ ژند میں پسا۔ سنسکرت میں پچات کے یہی معنی ہیں۔

ہم۔ فارسی میں بہ معنی ہمگر او باہم آتا ہے۔ سنسکرت میں سم بہ معنی باہم ہے۔

ایدر۔ فارسی ہے۔ سنسکرت اتر ہے۔ یعنی یہاں

ایں۔ فارسی میں اشارہ قریب کے لئے ہے۔ سنسکرت میں ای یہ کام دیتا ہے۔

خاتمہ

شرمندہ ہوتا ہوں کہ آج کے لکچر نے طول کھینچا۔ اہل ذوق تنگ ہو گئے ہوں گے۔ مگر انصاف شرط ہے۔ منزل کڑی تھی اور راہ بے ڈھنگی زادِ راہ ٹھنڈے ہوئے الفاظ۔ زبان نے زور بہت لگایا۔ لطف و لذت نے لون مرچ بھی چھڑکا۔ مگر روکھے سوکھے چنوں میں چٹخارا کہاں سے آئے۔ خیر۔ بیزار نہ ہونا چاہئے۔ اگر دوستوں کے مزاج شگفتہ نہ ہو سکیں تو زبان میں ایک نئی تلاش کا رستہ ہی نکل آیا۔ یہ مطالب میرے عزیز طالب علموں کے کام آئیں گے۔ مجھ جیسے نکمے سے اتنا کام ہو جائے! بہت غنیمت ہے! خدا لطف ادا اور حسن قبول روزی کرے۔ اور عزیزوں کو فائدہ پہنچائے۔ آمین ثم آمین۔

حصہ دوم

سخندان فارس
پہلا لکچر

فارس قدیم کی تاریخ

عزیزان وطن! اگرچہ ہندوستان میں زبان فارسی کا آفتاب مدت سے ڈھلتا چلا جاتا ہے لیکن جب ہم عموماً ممالک ایشیا پر نظر دوڑاتے ہیں تو یہی ایک زبان نظر آتی ہے جس نے ہر ایک ملک میں تاثیر برق کی طرح اپنی حرارت دوڑائی ہوئی ہے۔ کوئی شہر ایسا نہیں جہاں کچھ نہ کچھ اس کے بولنے اور سمجھنے والے موجود نہ ہوں۔ تم ذرا اس کی برکت پر خیال کرو۔ اکثر گاؤں ایسے ہیں کہ مثلاً عرب یا ترک یا انگریز یا فرنچ یا جرمن آدمی وہاں جا پڑے تو اس کے روٹی اور پانی کی بات بھی کوئی نہ سمجھے گا۔ لیکن ایک ایرانی تازہ ولایت جہاں جا نکلے گا وہاں کوئی نہ کوئی ایسا آدمی ضرور موجود ہو گا جو اسے کھانے پینے کی ضرورتوں سے تنگ نہ ہونے دے گا۔ اور اہل ہند کے واسطے یہ زبان اس سبب سے خصوصاً قابل توجہ ہے کہ اردو کے پتلے کا ایک قوی عنصر ہے۔

اس کا خزانہ استعاروں۔ مجازوں اور کنایوں کے جواہر سے دولتمند ہے۔ سامان مذکور سے ہر مطلب کو نظم خواہ نثر، سادہ خواہ رنگین، جس قالب میں چاہتی ہے ڈھال دیتی ہے۔ ادائے مطلب میں جو اسے کمال ہے۔ اور زبانوں کو کم حاصل ہے۔ اس کی زمین انشا پردازی کی گلکاری میں جیسی نثر کے لئے موافق ہے ویسی ہی نظم کے حق میں مناسب ہے۔ ہر اقلیم کے زباں دانوں نے اسے پسند کیا ہے۔ کیونکہ سیکھنے میں سہل ہے۔ اور ادائے مطلب میں مختصر اور بولنے میں خوشگوار ہے۔

کسی زبان کی نکتہ فہمی کا حق نہیں ادا ہو سکتا ہے جب تک کہ اس کے ملک کی تاریخ

اور جغرافیہ اور ملکی حالات، اور اہل ملک کے عادات و اطوار سے بخوبی واقفیت نہ ہو۔ زبان فارسی میں زیادہ خصوصیت یہ ہے کہ اس کی شیرینی گفتار نے اس میں بہت سے نازک اور باریک لطف پیدا کر دیے ہیں۔ اسی واسطے اس کی اصطلاحوں اور اشاروں کنایوں کا کچھ شمار نہیں۔ مختلف زبانوں کے پرکھنے والوں نے زبان مذکور میں یہ جوہر خاص پایا ہے کہ اس کے ہر فقرے میں ایک نکتہ ہے اور ہر بات میں ایک لطیفہ ہے۔ وہ جن استعاروں اور تشبیہوں سے مرصع ہے۔ ان کی بنیاد ضرور کسی نہ کسی خصوصیت ملکی پر ہے۔ جس میں ملک کی حالت، سرزمین کی صورت، لوگوں کی ریت و رسوم، رہنے سہنے کے دستور، ملاپ جلاپ کے طریقے۔ طرز لباس، نشست برخاست کے قاعدے وغیرہ وغیرہ سب کو دخل ہے۔ اور انہی کی بنیاد پر وہ نمکین محاورے۔ اور رنگین استعارے چبھتے ہوئے اشارے کھٹکتے ہوئے کنایے قرار پائے ہیں جو ان کی انشا پردازی کو اور زبانوں کی فصاحت سے الگ جلوہ دے کر روشن اور ممتاز دکھاتے ہیں۔

میں آج کل دیکھتا ہوں کہ مدارس تعلیمی کی رونق اور نئی تصنیفات نے جو ایران سے آتی ہیں اس کی طرف بہت لوگوں کی طبیعتیں مائل کر دی ہیں لیکن شوقین طلبا اس کے خاص خاص حالات و خیالات سے واقف نہیں۔ اس لئے جب کوئی شعر سنتے ہیں تو بجائے اس کے کہ سن کر اس کی کیفیت سے لطف اٹھائیں اور ذوق و شوق سے وجد میں آجائیں۔ وہ اس طرح سوچتے رہ جاتے ہیں جیسے کوئی علمی بات کو غور سے سنتا ہے اور کچھ شک نہیں کہ زبان کے معاملے میں یہ حالت ہونی انشا پردازی کی جان پر سخت ستم ہے۔ ہمارے محقق اس میٹھی زبان کی تحقیقات میں کوششوں کے حقوق کو پورا پورا ادا کر گئے۔ اور شائقوں کے لئے کافی سامان دے گئے ہیں لیکن وہ وقت ایسا تھا کہ اس انداز پر کوئی تالیف لکھنے کی ضرورت انہیں نہیں معلوم ہوئی جو آج ہے۔ اس زمانے میں یہاں کے اکثر لوگ خود ولایت زا تھے۔ بہت سے ان کی اولاد تھے۔ اس طرح کہ باپ یا دا دا ولایت کے تربیت یافتہ تھے اور اہل ایران اس کثرت سے یہاں موجود تھے کہ ہر وقت ان کی صحبتوں اور گفتگوؤں سے ذخیرے خیالات کے جمع کرتے رہتے تھے۔ اس لئے وہ باتیں کتابوں میں مرتب نہ ہوئیں۔ اور یہ افسوس کا مقام ہے۔ کیونکہ وہ صاحب کمال لوگ

تھے اگر لکھتے تو شوق کی پیاس کو خوب بجھاتے اور مطالب مذکورہ کو اس جادو بیانی سے ادا کرتے کہ فقط ملک ایران کی تصویر ہی نہ کھینچتے۔ بلکہ اس کے ہرے بھرے جنگل، سرسبز پہاڑ، بہتے چشموں سے پھولے پھلے باغ لگاتے۔ اور ان میں نسیم وصبا کے گزار، پرندوں کے چہچہے، صبح کی کیفیت اور شام و شفق کی بہار سامنے دکھاتے۔ آباد شہر، چلتے بازارہ بجے سجائے گھر، سامنے نظر آنے لگتے۔ اور بلبلان شیراز یعنی میرزایان ایران ان میں پھرتے چلتے۔ بولتے چالتے نظر آتے۔ لیکن افسوس ہے بڑوں کے مرنے کا کہ جس نے مجھ چھوٹے کو بڑائی دی۔ اور میرے عزیز دوستوں اور پیارے شاگردوں نے مجھ سے یہ بارگراں اٹھانے کی درخواست کی۔

آسماں بار امانت نتوانست کشید
قرعہ فام بنام من دیوانہ زدند

میں حقیقتاً اس تحریر اور تقریر کے لئے نا قابل ہوں۔ مگر ان کے کہنے سے چارہ نہیں۔ اس لئے کچھ نہ کچھ کہے بغیر گزارہ نہیں۔ ناچار اس رستے میں قدم دھرتا ہوں۔ لیکن مناسب دیکھتا ہوں کہ مطالب مذکورہ کے بیان کرنے سے پہلے کچھ فارسی قدیم کا حال بیان کرلوں۔ جس کا سلسلہ اس ملک کی تاریخ باستانی سے الجھا ہوا ہے۔ اور وہ اس زبان کا جزاعظم ہے۔

فارس کے حالات۔ اور فارسی زبان کے خیالات

آدم زاد کی تصویر جو صانع قدرت نے اوصاف رنگارنگ سے سجائی ہے۔ اس کے جس رنگ پر عقل نظر کرتی ہے۔ دیکھتی رہ جاتی ہے۔ مگر سب میں زیادہ غور کے قابل اس کی زبان اور حسن بیان ہے۔ کیونکہ ہر ملک میں زبان ہی ایک ایسی شے ہے جس سے اس کے بولنے والوں کی لیاقت یا جہالت اور تہذیب وبے تہذیبی کا اندھیرا اجالا معلوم ہوتا ہے۔ غور کرو تو کسی قوم کی تحقیقی حالت اور حقیقی لیاقت اور طبیعت کی اصلیت ہمیں نہیں معلوم ہوتی۔

اور تاریخ بھی ہمارے دل پر تصدیقی اور یقینی نقش نہیں کرتی۔ ہاں جو باتیں خود ان

کے منہ سے نکلی ہیں۔ اور کتابوں میں لکھی گئی ہیں۔ اگر وہ ہاتھ آجائیں تو ان کے سارے کاروبار اور حالات و خیالات گویا اقراری تصدیق کو پہنچ جاتے ہیں۔ تاریخ کا عجب حال ہے۔ کسی ملک کا مسافر یا سیاح وہاں کے حال کو اپنے سفر نامے میں باتوں کا افسانہ بناتا ہے۔ یا سادہ لوح مورخ جو کچھ سنتا ہے اپنی تاریخ میں ایسی باتیں ایک قوم سے منسوب کر دیتا ہے جو اکثر خلاف عقل کہانیاں ہوتی ہیں۔ ہاں جب خود ایک زبان کے بولنے والوں کے اصلی الفاظ اور محاورے ایسے موجود ہیں جن سے ان کی خاص خاص رسومات اور سرگزشتوں کے نشان اور ان کے خیالوں کے رستے کھلے نظر آتے ہیں تو کون سی عقل ہو گی جو اس سے انکار کرے گی؟ اس تصور کا نمونہ ملک فارس اور زبان فارس کی حالت ہے۔ بہت افسوس ہے کہ اس ملک کی راہ تواریخ میں سراغ بالکل مٹے ہوئے ہیں اور جو کچھ ہیں وہ نظم میں ہیں اور افسانوں کے لباس میں چھپے ہوئے ہیں۔ ہاں یورپ میں علم زبان کے محققوں نے اپنے علم کے ذریعے سے اب اتنا پتا لگایا ہے کہ یونان کی تاریخ سے تقریباً ہزار برس پہلے وہی شرافت پناہ فرقہ جو اریا کہلاتا ہے۔ ختارا خواہ تاتار۔ غرض وسط ایشیا سے اٹھا۔ اور چاروں طرف پھیل گیا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اشخاص مذکور قدوں کے لمبے۔ رنگ روپ کے گورے چٹے۔ باپ دادا سے اولوالعزم اور ہمت والے چلے آتے تھے۔ خود شائستہ تھے اور جانتے تھے کہ شائستگی کے کام اور راحت و آرام کے سامان کیونکر حاصل ہو سکتے ہیں۔ ان کی ایک شاخ نے اپنے خیالات کو مذہبی نقش و نگار دے کر نگار خانہ چین سجایا۔ دوسرے نے یونان میں جا کر فلسفہ و حکمت کا طوفان باندھا۔ تیسرے نے روما کی بنیاد ڈال کر روئے زمین پر حکومت شاہی اور حکمت عملی کا نقارہ بجایا۔ ایک شاخ نے اندلس میں جا کر کیسہ خاک سے چاندی نکالی۔ اور انگلستان سے خبر آئی کہ پانی سے مچھلیاں بلکہ پہاڑ کے سینے کو چیر کر لوہا تک نکال لائے۔ ہندوستان میں ہمالا اتر کر آئے اور برہمن دیوتا کہلائے۔ ایران میں شمشیر و گرز سنبھالا۔ اور درفش کاویانی کو مرصع کر کے ہوا میں لہرایا۔ ممالک مذکورہ بالا میں الفاظ کا اتفاق ان کے اتحاد اصلیت پر گواہی دیتا ہے۔ ان میں بھی جو اتفاق الفاظ کا سنسکرت اور فارسی میں ہے غالباً کسی زبان میں نہ ہو گا چنانچہ گروہ در گروہ لفظوں کے انبوہ آواز بلند پکار

رہے ہیں کہ ان دو خاندانوں کا نسب نامہ ایک ہے۔ اور کہتے ہیں کہ قوم ہی کے نام سے ملک مذکور نے ایران نام پایا ہے۔ اسی کو یونان کی کتب قدیمہ آریان پکارتی ہیں۔

سیامک جسے اہل ایران شت وخشور وخشوران۔ برگزیدہ یزدان خدیو جہان۔ شاہنشاہ پیشداد کہتے ہیں (بعضے کہتے ہیں کہ شیث پیغمبر وہی تھا) نیک نیتی۔ اور داد و دانش کی برکت نے اسے پارسا خطاب دیا تھا۔ اور اسی تقدس سے ان نے ملک مذکور کا نام پارس رکھا تھا کہ پاک اور مقدس کو پارس کہتے ہیں (اور اسی سے ہے پارسا)۔

بعضے کہتے ہیں کہ پیشداد ہوشنگ جس کے بااقبال اور روشن زمانے میں پتھر سے آگ نکلی اس کا لقب بھی پارس تھا۔ اور اسے ایران شاہ بھی کہتے تھے۔ اس نے ایک شہر آباد کر کے اس کا نام ایران رکھا تھا۔ وہی اول بدل کر آج نشاپور کہلاتا ہے اور ایران کے معنے پاک اور پاکیزہ بھی آئے ہیں۔

یہ بھی لکھا ہے کہ فریدون ابن آبتین کے تین بیٹے تھے۔ جب سلطنت کی ترقی دل کے ارمان نکال چکی تو ملک کے 3 حصے کیے :۔

(1) ملک مشرقی تورج کو دیا۔ ایرانی اسے ایران کہتے تھے۔ عرب نے ماوراالنہر اس کا نام رکھا۔

(2) ملک مغربی سلم کو۔ اہل ایران اس کو ایران پژ کہتے تھے۔

(3) ملک وسطی ایرج کو دیا کہ اسی بیٹے کو بہت چاہتا تھا۔ یہ خط استوا سے جانب شمال ۔ اور ممالک ربع مسکون کے وسط میں واقع تھا اسی واسطے مملکت کے کل شہروں میں معتدل اور خوش آب وخوش ہوا تھا۔

ہر قوم کا دستور ہے کہ اپنے ملک میں ایک مقام کو مذہبی برکت سے عظمت دیتے ہیں چنانچہ موسائیوں اور عیسائیوں نے بیت المقدس۔ اور عرب میں اکثر انبیاء اور سب سے اخیر اسلام نے مکہ کو معظم تسلیم کیا۔ ہندوستان میں کاشی متھرا وغیرہ وغیرہ۔ ایران نے اس قطعہ زمین کو متبرک سمجھا۔

بعض مورخ لکھتے ہیں کہ فریدون نے بھی اسے مقدس مقام اور اپنے بااقبال بزرگوں کا قدمگاہ سمجھ کر یہ ملک پیارے بیٹے کو دیا تھا اور اس میں سے قطعہ خاص کو اعلیٰ

اور روح افزا دیکھ کر پارس نام رکھا تھا (یعنی ارض مقدس) افسوس کہ ان خوبیوں نے اور باپ کی محبت نے بھائیوں کے دلوں میں عداوت کا خنجر ڈھالا۔ اور دونے مل کر ایک بے گناہ کو مار ڈالا۔ ایرج کی ماں کا نام ایران دخت تھا۔

کرمان شاہان کے پہاڑوں میں کوسوں تک پرانے ویرانے پڑے ہیں۔ وہ شاہان قدیم کے جاہ و جلال کی مٹی ہوئی تصویریں ہیں۔ انہی میں ایک مقام طاق بستان مشہور ہے اور دستکاریوں کے نقش و نگار میں ایک جگہ شاپور ذوالاکتاف کی تصویر ہے۔ جو عبارت اس پر منقوش ہے ترجمہ اس کا یہ ہے :۔

بندہ خدا شاپور عزیز شہنشاہ ایران و ایران کہ بہ سلسلہ آسمانی پسر بندہ خدا ہرمزد عزیز شہنشاہ ایران و ایران است و آں بہ سلسلہ آسمانی پسر بزرگ شہنشاہ نرسی است۔

اس سے مراد ہے۔ شاپور عزیز شہنشاہ ایمانیاں و غیر ایمانیاں۔ کیونکہ ایر (مومن) اایر (غیر مومن) کو کہتے تھے۔ اور یہ معنے ملا فیروز پارسی نے مالکم صاحب کو بتائے تھے[15]۔

نقش رستم کے ایک کتبہ کا ترجمہ ہے دارا بادشاہ ایران کی زبانی۔ میں شاہ و شہنشاہ دارا۔ کل آباد ملکوں کا بادشاہ۔ فراخ دنیا کا سنبھالنے والا۔ ہخامنش[16] پارسا کا بیٹا۔ گشتاسپ بادشاہ اور آرج کا بیٹا آرج ہوں دیکھنا! یہ وہ دارا نہیں جسے سکندر نے مارا۔ یہ سنہ عیسوی سے 485 برس پہلے پیدا ہوا تھا۔

ہندوستان کے آریا بھی اپنے تئیں آرج[17] کہہ کر یہاں کے شودروں سے ارجمند کرتے تھے۔ اور انہی کی آبادی سے یہاں کا ملک ہماچل سے بندھیاچل تک آریاورت کہلاتا تھا اور تم ابھی سن چکے کہ فارسی قدیم کی کتابوں میں ایران کے معنے شریف و دانا و ہنرمند بھی لکھے ہیں (یہی ارجمند کا ترجمہ ہے)۔

اکثر اہل یورپ انہی تحقیقاتوں کے لئے بمبئی اور خاندیس تک آئے۔ ایران بھی پہنچے۔ پارسیوں کے دستوروں اور موبدوں سے ان کی کتب قدیمہ بہم پہنچائیں۔ ساتھ ہی سنسکرت کی معلومات حاصل کی اور دونوں کو مطابق کر کے یہ نتیجہ نکالا کہ اگر دنیا کی پرانی کتابوں میں وید سب سے پرانی کتاب تسلیم کی جائے تو پارس کے گاتھا ان سے

دوسرے یا تیسرے درجے میں ہوں گے۔ ہزار بلکہ پندرہ سو برس پہلے سنہ عیسوی سے ان کی انشاپردازی درجہ تکمیل کو پہنچی ہوئی تھی۔

اس ملک کے جاہ و جلال۔ علوم و فنون اور تہذیب و شائستگی کی طرف ہر ملک کے مورخ عظمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لیکن افسوس یہی ہے کہ وہ اپنی مسلسل تاریخ اپنے پاس نہیں رکھتا۔ کچھ مختصر بیان جن کی بنیاد شاعرانہ افسانوں پر ہے۔ مثلاً شاہنامہ۔ سکندرنامہ۔ زینت التواریخ وغیرہ وغیرہ ہیں۔ اور جب تاریخ کا یہ حال ہے تو زبان کی اصلیت اور اس کے انقلابوں کا سلسلہ کب مسلسل ہاتھ آسکتا ہے۔ باوجود اس کے یہ بالاتفاق ثابت ہے کہ ساڑھے چار ہزار برس سے کم اور چار ہزار برس سے زیادہ ملک مذکور میں اسی قوم کے بادشاہ اس دھوم دھام سے سلطنت کرتے رہے۔ جن کی تہذیب اور شمشیر اور دولتمندی نے کسی قوم کے سامنے سر نہیں جھکایا۔

صحیح بخاری میں ایک جگہ اہل فارس کا بھی ذکر آگیا ہے۔ ابن حجر صاحب فتح الباری نے اس کی شرح میں لکھا ہے کہ یہ شہسوار اور بہادر لوگ تھے۔ پھر مجوس ہو کر آتش خانے بنالئے۔ لیکن ریاست، سیاست، حسن مملکت، تدبیر جنگ، ہر چیز کو برمحل برتنا۔ فن انشا، نفاست مزاج، لذیذ کھانوں اور خوشبوؤں کے ایجاد اور خوش لباسی میں بے مثل و بے نظیر تھے۔ رسوم ملک داری میں اور لوگ ان کی پیروی کیا کرتے تھے۔

جب یہ بات ثابت ہے تو ہم پوچھتے ہیں کہ ایسی باعظمت اور قدیمی سلطنت کیا علوم سے بے بہرہ ہو گی؟ یا فنون و صنائع کی دولت سے محروم ہو گی؟ اس کی زبان علمی الفاظ کے اعتبار سے ناتمام ہو گی؟ اور نظم کے گلزار سے خالی ہو گی؟ ہرگز نہیں۔ جس آریا قوم کی ایک شاخ نے ہندستان میں آکر علم کے دریا بہادئے کیا دوسری شاخ نے وہاں جاکر بزرگوں کا نام ڈبویا ہو گا؟ نہیں نہیں۔ اور ہرگز نہیں۔ تب کیا آفت آسمانی آئی جس کے سبب سے ایسے مہذب لوگ۔ ایسے علوم و فنون کے خزینہ دار۔ جاہ و جلال کے سپہ سالار اس حالت میں نظر آنے لگے جسے اور نقصانوں کے ساتھ آج لوگ کہتے ہیں کہ "فارسی زبان، علمی زبان نہیں۔" اس کا سبب یہ ہے کہ اول تو کیانیوں کی آخر سلطنت میں زرتشت کے نئے دین اور نئے آئین نے صدہا برس کی رسوم اور علوم اور اس کی کتابوں

کو خاک سیاہ کیا۔ تم ضرور کہو گے کہ مذہب کا زبان پر کیا اثر ہو سکتا ہے۔ ہم کہیں گے کہ اس تغیر کو خیال کر لو جو کہ بودھ کے سبب سے سنسکرت پر ہوا۔ دیکھ لو سنسکرت کے دین آئین سب بدل گئے تھے۔ کتب خانے نیست و نابود ہو گئے تھے۔ غاصبوں کی زبان جو ایک پراکرت زبان تھی وہی بودھ قادر مطلق کی زبان کہلاتی تھی۔ وہی ازلی و ابدی قرار پائی تھی۔ پالی حروف دفتروں سے لے کر کتب مذہبی تک حروف الٰہی ہو گئے تھے۔ نئے کتب خانے بج گئے تھے۔ اسی طرح سمجھ لو کہ جب زرتشت نے بادشاہ وقت (یعنی گشتاسپ) اور ولی عہد (یعنی اسفندیار روئیں تن) اور تمام خاندان شاہی اور امرائے دربار کے دلوں پر آگ کی روشنی سے دین الٰہی کا جلوہ دیا ہو گا تو قدیمی رسوم و رواج سے باقی کیا چھوڑا ہو گا؟ زرتشت نے روما سے علوم حاصل کیے تھے اور اضلاع شام سے خروج کیا تھا۔ کچھ نہ کچھ مزا ضرور زبان پر آیا ہو گا۔

غرض دین زرتشت نے سلطنت کے بازوؤں سے ایسا زور پکڑا کہ تمام ایران و خراسان پر چھا گیا۔ اور تخمیناً دو سو برس تک اطراف و جوانب کو دباتا رہا۔ یہاں تک کہ یونان سے سکندر طوفان کی طرح اٹھا۔ اور کہتا ہوا اٹھا کہ ؎

نہ آتش گزارم نہ آتشکدہ
شود ہر دو از دستم آتش زدہ

جو مصیبت بودھ کے ہاتھ سے ہندوؤں پر گزری تھی وہی وہاں ژند و استا پر آئی۔ افسوس جس آگ نے زرتشت اور جاماسپ کے متبرک ہاتھوں سے آتش خانوں کو روشن کیا تھا۔ جس کے آگے گشتاسپ نے تاج کیانی سر سے اتارا۔ اسفندیار روئیں تن نے گرز و شمشیر نذر چڑھائے۔ وہ آگ آب شمشیر سے بجھائی گئی۔ ژند و پاژند کے ورق ورق برباد گئے۔ سکندر نے شراب کے نشے میں شہر اصطخر[18] کو آگ لگوا دی تاریخ کے سینے پر آج تک داغ ہے۔ اس شہر کا کہ تخت گاہ ملک جم کا تھا۔ اور پشتوں سے مقام شاہ نشین سلاطین ایران زمین کا چلا آتا تھا۔ غضب ہوا کہ اس کا عظیم الشان کتب خانہ آگ کا نذرانہ ہوا۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ یونانیوں نے جب ملک پر غلبہ پایا تو زبان نے زبانوں پر کیوں نہ زور دکھایا ہو گا۔

سکندر کے تھوڑے ہی دنوں بعد پارتھیا والوں کا عمل ہو گیا۔ جس ایران کو

ہزاروں برس سے فتح کے نشان سلامی اتارتے تھے۔ اور فتح یابی دربار میں سر جھکاتی تھی 500 برس تک نئے ظفر یابوں کے قبضے میں دبا رہا۔ اور ژند کی مقدس کتابیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر فنا کیں۔ آخر 226ء کے بعد 500 برس کے مردے میں اقبال ساسانی سے سانس پڑا۔ اور دم شمشیر سے تن بے جان میں جان آئی۔ اردشیر بابکاں خاندان مذکور کا بانی تھا۔ اس نے ملک و مملکت کی قدامت کے ساتھ بجھے ہوئے مذہب کے نور کو بھی روشن کیا۔ آتش خانے پھر تعمیر کئے۔ مذہب مٹ گیا۔ کتابیں ضائع ہو گئی تھیں۔ لوگوں کی زبانوں سے یا جن مقاموں سے پھٹے پرانے اوراق پریشاں ہاتھ آئے انھیں سمیٹ کر پھر مذہب کی شیرازہ بندی کی اور تصنیف و تالیف کا سلسلہ جاری ہوا۔ اردشیر ایسے ذوق و شوق بلکہ سخت جوش و خروش سے ملک اور قوم میں مصروف ہوا کہ اس کو تعصب اور سخت مزاجی کی تہمت لگاتے ہیں اور یہ جرم ممکن ہے کیونکہ پارتھیا والوں کے کئی سو برس کے جمے ہوئے رنگ کو مٹا کر اپنا نقشہ جمانا۔ اور ان سے بھی پہلے سکندر کی اکھیڑی ہوئی بنیادوں کو چن کر نئی عمارت کا اٹھانا۔ سختی کے بغیر کیونکر ہو سکتا تھا۔ اس خاندان نے پانسو برس بادشاہی کی۔ اہل فارس کو اس کی سلطنت کا بھی فخر ہے۔ اور فی الحقیقت اردشیر۔ شاپور۔ نوشیرواں جیسے بادشاہ جس خاندان میں نیک نامی کے نشان بلند کریں ان کی قوم جو ناز کرے بجا ہے۔

ساڑھے چار سو برس کے بعد ریگستان عرب سے ایک آندھی اٹھی۔ اس کے پیچھے گرجتا بادل بجلی چمکاتا تھا۔ خلاصہ یہ کہ ساسانی سلطنت کا اقبال شمشیر اسلام کی قربانی ہو گیا اور درفش کاویانی قادسیہ کی خاک پر سرنگوں ہوا۔ اللہ اللہ۔ یہ وہی مبارک چھڑا تھا جس کے اقبال سے ضحاک کی بلا دفع ہوئی تھی اور کیانی خاندان کا حقدار اپنے حق کو پہنچا تھا۔ وہ ہر میدان میں فتح کا ستارہ ہو کر چمکا اور اس کی برکت پر پھولوں کی جگہ جواہر اور موتی چڑھائے گئے تھے۔ اس کے شگون پر جنگ کے معرکوں میں امیدوں کی آنکھیں لگی رہتی تھیں۔ آج وہ ایسا گرا کہ پھر نہ اٹھا۔ اور دیندار بہادروں میں اس کے جواہرات اور موتی مٹھی مٹھی کھجوریں تھیں کہ بٹ گئیں۔ عالیشان آتش خانے ڈھائے گئے۔ ان کی نورانی آگ۔ خاک کے نیچے دھم ہو کر رہ گئی۔ دینی اور دنیاوی کتابیں ورق ورق اڑیں اور

جل کر خاک در خاک ہو گئیں۔ اس وقت میں میرے پارسی بھائی وہاں سے بھاگے اور جانوں کے ساتھ ایمانوں کو بھی بچا لائے۔ چنانچہ مدراس اور بمبئی کے ملکوں میں آکر پھر آتش خانے بنائے اور اپنے بزرگوں کے نام کو روشن کیا۔

یہ بات قابل لحاظ ہے کہ جو کچھ ان کے پاس موجود ہے وہ ٹوٹا پھوٹا بقیہ ہے جو کئی صدموں کے بعد بچا ہے (1) یونانیوں کا طوفان (2) پارتھیا والوں کی پانسو برس کی سلطنت۔ جس کی پریشانی کو ساسانیوں کی ہمت نے فراہم کیا تھا۔ (3) عرب کا حملہ جس کے بعد پھر پارسیوں کو جمعیت نصیب نہ ہوئی۔ اب پارسی بھائیوں نے اپنے گھروں میں آگاہی کے لیمپ جلائے تو روشن ہوا کہ ژند کے 25 باب تھے۔ ان میں سے ایک وندیداد انیسواں باقی ہے اور متفرق اوراق یا فصلیں ہیں کہ زبانوں یا سینوں میں امانت آئے تھے۔ انہی میں کتاب زورہ استا ہے۔ اس میں بہت سی دعائیں وظائف کی ہیں۔ ایک ایرانی محقق کہتا ہے کہ زورہ۔ وہی لفظ ہے جو قرآن میں سورہ ہو کر لکھا گیا ہے۔

ہماری معلومات کو پارسی بھائیوں کا شکریہ کرنا چاہیے کیونکہ جو کچھ ہم تک پہنچا ہے انہی کی برکت سے پہنچا ہے۔ اسی سے ہم پر دو پرانی نسلوں کی ایک اصل ثابت ہوئی۔ اسی سے دو زبانوں کے لغات کا رشتہ نکل آیا اور اسے ان کی خاندانی رسموں کی بلکہ اتحاد مذہب کی حقیقت معلوم ہوئی اور یہ بھی خبر ہوئی کہ سنسکرت کے بعد ژند ہی زبان ہے جو قدامت کا تمغا اپنے پاس رکھتی ہے اور وہ قوانین زبان اور اصول صرف و نحو اور طرز بیان اور سلاست اور فصاحت میں اس درجے پر پہنچی ہوئی ہے کہ یورپ کے محققوں نے بھی اس کے رتبے کو تسلیم کیا ہے۔

ان کے علوم و فنون پر بار بار ادبار کے طوفان آئے پھر بھی جو کچھ باقی ہے اس کے مطالب خبر دیتے ہیں کہ ہم کس دریا کے قطرے ہیں اور بتاتے ہیں کہ جہاں ہم تھے وہاں سب کچھ تھا۔ یہ ضرور ہے کہ ہمارے پارسی بھائی خانہ برباد ہو کر ادھر آئے اور ان کی خورجینوں میں زیادہ تر فلسفہ الٰہیات اور مذہبی کاغذات کے پرزے تھے۔ سچ ہے ایسے وقتوں میں خدا یاد آتا ہے اور ایمان والوں کے ساتھ ایمان ہی جاتا ہے۔ ان کے مطالب بھی دیکھو تو معلوم ہوگا کہ علم مذکور کس اوج رفعت پر تھا۔ ان کی علمی اصطلاحیں جب

عربی کی اصطلاحوں سے مطابق کرتا ہوں تو بازار دنیا کے لین دین کا تماشا نظر آتا ہے۔ ابھی دیکھتا ہوں کہ دارا کی لوٹ میں سکندر علم کے صندوق بھی لیے جاتا ہے۔ اور ان سے یونان و روم کے مدارس اور کتب خانوں کو افزائش دیتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد دیکھتا ہوں کہ عرب کے بہادر قطار در قطار لوٹ کچھ ادھر سے لادے لیے آتے ہیں۔ کچھ فارس سے لیے جاتے ہیں اور اس سے بیابان ریگستان کو آباد کر رہے ہیں۔ کچھ عرصہ کے بعد دیکھتا ہوں کہ انہوں نے فارس کو اپنا سرمایہ دیدیا۔ مگر امانت دار تھے۔ جو کچھ لیا۔ جوں کا توں حوالہ کردیا ہے۔ خود اپنے ریگستانوں میں ویسے ہی رہ گئے جیسے کہ تھے۔

ایران میں طلبا کو کتب الٰہیات عربی زبان میں پڑھتے دیکھ کر مجھے خیال آیا کہ دیکھو! خاک ایران کے فرزندوں کو اپنے بزرگوں کے مال کی خبر نہیں۔ یہ ان کے ہی علوم۔ ان کے ہی مطالب۔ ان کے ہی دلائل ہیں اور عرب کے استادوں سے عربی الفاظ میں سیکھ رہے ہیں۔ کسی کو خیال نہیں آتا کہ یہ ہمارے گھر کا مال ہے۔ ایک زمانہ ہوگا کہ یہ مطالب اسی خاک پر اپنے الفاظ میں پھیل رہے ہوں گے:۔

ماہیت	=ہرایند بروزن سرایند	علت غائی	= کرانی
عقل اول	= مہین ہوش	----	-- --
علت	=ایرایہ	واجب	=بایست
علت مادی	=مایئی	ممکن	=شایست
علت صوری	=پیکری	ممتنع	=نابایست
علت فاعلی	=کاری	فرض	=شمرکرف
جنس	=مہ گونہ	قدیم	=باش
نوع	=گونہ	حادث	رستہ۔ نورستہ
فصل	=باز آر	نسبت	=پرہند
خاصہ	=ویژہ	ذہن	=بارہد
بسیط	=اور۔ وہ کسی میں اور کوئی اس میں نہیں۔	دعویٰ	=خواست

مرکب	=وربست۔ دروبست۔ کاموس	برہان	=بروشنگر
مفرد	=اوربست۔ نادربست	دور	=پکپردہ
حد	=واوار	تسلسل	=رورو
جوہر	=گوہر	برہان تطبیق	=برہم روشنگر
عرض	=پیان=پے+ان	برہان سلمی	=زینہ روشنگر
اشارہ	=نماک۔ نمودن سے ہے	وغیرہ	=وغیرہ
مطلق	=آزاد=یلہ	نقطہ	=واغک
ملکہ	=راد۔ زہ	خط	=کشک

غرض کہ ان الفاظ اور ایسے ایسے دلائل سے اثبات واجب الوجود کا۔ اور ابطال ایک سے زیادہ واجب الوجود کا۔ نفس ناطہ کا بسیط ہونا۔ اس کا فانی نہ ہونا۔ وغیرہ وغیرہ صدہا مسئلے انہیات کے اور اصلاح نفس کے۔ رنگا رنگ بیانوں سے ادا کیے ہیں۔

ساسان پنجم کے فضائل و کمالات میں لکھا کہ اس کے مباحثے کے ارادے سے ایک فلسفی کامل مصر سے چلا اور ساسان آباد میں پہنچا جس مدرسے میں ساسان پنجم درس دیتا تھا وہاں کے دربان کے گھر میں ایک لونڈی تھی۔ اتفاق یہ کہ فلسفی مصری رات کو اس لونڈی کے شوہر کے گھر میں اترا۔ مگر یہ نہ جانتا تھا کہ اس گھر کو میرے حریف سے کیا علاقہ ہے۔ رات کو لونڈی کی ماں نے مہمان سے پوچھا کہ میاں مسافر تم کس شہر کے رہنے والے ہو؟ اور یہاں کس ارادے سے آئے ہو؟ چھوٹا سفر (حرکت جسمانی) بڑے سفر (سفر آخرت) کے سامان کے لیے چاہیے۔ نہ کہ دنیا کے نفع کے لیے۔ کیونکہ یہ ناپائیدار ہے اور اس کا تعلق اصلی ٹھکانے تک پہنچنے سے روکتا ہے۔ مصری فلسفی سن کر حیران ہو گیا۔ ناچار علم کی آڑ میں چھپا اور کہا کہ تلاش علم۔ پھر عورت سے پوچھا کہ "واجب کا فعل قدیم ہے یا حادث؟" عورت بولی۔ "حادث وہ ہے کہ زمانی ہو اور زمانہ فلک الافلاک کی گردش کو کہتے ہیں۔ چونکہ واجب اس سے برتر ہے تو چاہیے کہ واجب قدیم ہو اور اس کا فعل بھی قدیم ہو۔" حکیم مصری نے پوچھا کہ "واجب تک بھی فنا پہنچ سکتی ہے"؟ عورت نے کہا۔ "نہیں! اس لیے کہ ممکنات موجود ہیں اور بہ بدون فاعل

کے موجود نہیں رہ سکتے۔ کیونکہ معلول بدون علت کے نہیں رہ سکتا۔" حکیم نے اعتراض کیا کہ "باپ بیٹے کی علت ہے۔ باپ مر جاتا ہے بیٹا جیتا رہتا ہے۔" عورت نے کہا کہ "باپ بیٹے کی علت نہیں۔ وہ اس کے سبب کا ایک جز ہے نہ کہ علت! دیکھتا نہیں؟ ماں بانجھ ہوتی ہے تو باوجود باپ کے بچہ نہیں ہوتا۔ اور واجب الوجود تو علت تامہ ہے۔ جب تک وہ ہے تب تک سب کچھ ہے وہ نہیں تو کچھ بھی نہیں"۔ غرض کتب مذکورہ میں سے جو رسالے فارسی میں ترجمہ ہو گئے اور میری نظروں تک پہنچے ہیں ان میں صدہا مسائل الٰہیات اور فلسفہ کے ہیں کہ کہیں فلاسفہ یونان سے مطابق ہیں اور کہیں ان کا پہلو توڑ جاتی ہیں۔

ریاضی اور اس کی تمام شاخیں صفا صفا ہو گئیں۔ دساتیر میں ایک جگہ سیاروں کے دور وغیرہ اور ان کے شمار بتائے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ علم ہیئت تھا اور بہت بلند رتبے پر تھا۔

ان کے ہندسے کی مفلسی آج رحم کے قابل ہے کہ ہزار سے زیادہ مرتبہ اعداد بھی نہیں بنا سکتا۔ مگر دساتیر میں انہی سیارات کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مراتب اعداد کا شمار معمولی حد تک ضرور تھا اور جبکہ نقطہ کو وانک اور خط کو شک کہتے تھے تو ان کے استعمال کے مقام و محل بھی ضرور ہوں گے۔

جغرافیہ کی کوئی کتاب نہیں نظر آتی مگر تقسیم روئے زمین کے بعض مطالب جو کہیں کہیں لکھے ہیں اور ان سے اکثر اصطلاحیں معلوم ہوتی ہیں وہ سراغ بتاتی ہیں کہ ایک زمانے میں بھاری ذخیرہ ہوگا۔

کرہ زمین	گوئے چغمینی
قطب شمالی	اواختر
قطب جنوبی	دراختر
خط استوا	میانکش
دنیائے قدیم	رزہ۔ روزہ کیونکہ اس کا حال روشن ہے۔
نئی دنیا	شوہ۔ شبہ۔ اس لیے کہ اس کا حال لاعلمی کی رات میں مخفی

ہے۔

یہ اصطلاحیں اب تک بھی بہت باقی ہیں مگر ان کے بیان کا یہ موقع نہیں۔ پھر بھی یہ کہنا ضرور ہے کہ ان کے کاروبار اور نام و نشان جو باقی چلے آتے ہیں اپنے وجوہات بھی ساتھ دکھاتے ہیں چنانچہ اسی سلسلہ میں لکھا ہے کہ عہد قدیم میں سیستان کو نیمروز کہتے تھے کیونکہ جب وہاں آفتاب نصف النہار پر آتا ہے تو پورا نصف کرہ زمین کا روشن ہو جاتا ہے۔ اس وقت جزیرہ مدیر (مغربی ساحل بحر محیط) والوں کو اول طلوع۔ اور جاپان (مشرقی ساحل بحر محیط) والوں کو غروب معلوم ہوتا ہے۔ کتاب ژندواستا میں حمد الٰہی کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ جب کوہ سپند (سیستان) پر دوپہر ہوتی ہے تو 12 ہزار شہروں پر آفتاب کا نور پھیلاتا ہے۔ (لطیفہ) 12 ہزار شہروں کا حال تو اسی کو معلوم ہوگا۔ اتنا اب بھی کہہ سکتے ہیں کہ نصف کرہ زمین کا دور 12 ہزار میل ہے۔

ان کی دستکاری ان عمارات قدیمہ سے نمودار ہے جو کوہ بیستون۔ طاق بستان نواح کرمان شاہان وغیرہ وغیرہ مقامات میں کھنڈر پڑے ہیں ؎

از نقش و نگار در و دیوار شکستہ　　آثار پدید است صنادید عجم را

یا قدیمی سکوں اور پرانے نگینوں سے معلوم ہوتی ہے جو کہ خزانہ خاک سے کہیں کہیں نکل پڑتے ہیں۔ ایران سے خراسان تک انہی کی تواریخ کا گورستان ہے۔ قصر شیریں اور خرابہ شاپور۔ خرابہ استخر کہ شیراز کے پاس ہے اور اس کے علاوہ اکثر پہاڑوں میں شاہان قدیم کی شکارگاہیں اور دربار منقوش ہیں۔ سواری اور سواری کے جلوس اور فوجیں چلی جاتی ہیں۔ ان سے فقط صنعت اور دستکاری کی باریکی ہی نہیں روشن ہوتی بلکہ پلٹن پلٹن اور رسالے رسالے جو یکساں وردیاں پہنے جاتے ہیں۔ وہ خبر دیتے ہیں کہ ہمارے ملک کی جنگی فوج باقاعدہ تھی اور ہم قواعد جنگ کو علمی اصول سے کام میں لاتے تھے۔

طاق بستان کی تصویروں میں ایک مقام پر شاپور اور اس کا باپ آمنے سامنے کھڑے ہیں۔ ایک حلقے کو دونوں پکڑے ہیں۔ اس سے کرہ زمین کا اشارہ ہوگا۔ ایک طرف زرتشت کی تصویر ہے۔ اس کے چہرے سے پر نور آفتاب کا تاج شعاعیں پھیلاتا

ہے۔

کنارہ خراسان سے لیکر ادھر غزنی اور کابل تک۔ ادھر بلخ اور اس سے آگے کنار جیحوں تک عجیب و غریب یادگاریں عہد قدیم کی نظر آتی ہیں۔ شاہان کیانی کی بزمگاہوں کے نقشے اور رزمگاہوں کے معرکے خاک پر مٹے پڑے ہیں۔ کابل سے چل کر بامیان اور بلخ کے درمیان میں دونوں طرف بلند پہاڑ دیواروں کی طرح چلے جاتے ہیں۔ بیچ میں فراخ اور سیدھا شاہ راہ ہے۔ کہیں دو طرفہ کہیں دائیں کہیں بائیں دو منزلہ سہ منزلہ مکانوں کا سلسلہ چلا جاتا ہے۔ پہاڑوں کو اس طرح تراشا ہے جیسے کوئی صابون یا چربی کی ڈلی کو تراشتا ہے۔ استحکام و استواری کا تو کیا کہنا ہے۔ طرز تعمیر اور نقش و نگار دیکھ کر عقل حیران ہوتی ہے اور وہاں کے ہزاروں اور افغانوں کے کلام کو تصدیق کرنا پڑتا ہے کہ کہتے ہیں۔ یہ دیوزادوں کا کام ہے۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم سے بنائے ہیں۔ شمار میں 14-15 سو سے کم نہ ہوں گے۔ انہیں بچ کہتے ہیں۔

اسی سلسلے میں ایک عمودی پہاڑ کی سل میں ایک بت تراشا ہوا ہے۔ جس کا 40 گز کا قد ہے۔ کہتے ہیں کہ اس کا نام سلسال ہے۔

ایک عورت کی تصویر ہے اس کا قد 25 گز بلند ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ اس کی بی بی ہے اس کا نام ہے شامہ۔

ایک بچہ ہے اس کا ساڑھے 7 گز کا قد ہے۔ نام معلوم نہیں ہوا۔ ان صورتوں کے تناسب اعضاء۔ خط و خال۔ زیور اور خوشنمائی آج تک سیاحوں سے اپنے دستکاروں کے لیے تعریفیں لیتے ہیں۔

رستے سے کچھ فاصلے پر بائیں ہاتھ کو قلعہ ضحاک ویران پڑا ہے۔ اسے شہر غلغلہ کہتے ہیں۔ اس کی فرسودہ فصیلیں اور بے شمار برج و کنگرے دور سے اداسی اور مایوسی کی تصویریں دکھاتے ہیں۔ ان کے علاوہ ہزاروں خرابے اور ویرانے گمنام پڑے ہیں اور شہر کے شہر ہیں کہ زیر زمین مدفون ہیں۔ جا بجا پرانے زمانے کے پیسے۔ روپے۔ اشرفیاں اور نگینے نکلتے ہیں۔ ان پر ایرانی یونانی اور ہندوانی سکے اور تصویریں ہوتی ہیں۔ ان کے علاوہ معمولی اور غیر معمولی سینکڑوں چیزیں اگلے وقتوں کی ایسی نکلتی ہیں کہ سمجھ میں نہیں

آتیں۔ رباعی

دنیا خوابیست کش عدم تعبیر است ؎ صید اجل است گرجواں در پیر است

ہم روئے زمین پر است وہم زیر زمیں ؎ ایں صفحہ خاک ہر دو رو تصویر است

بلخ خاص دار السلطنت ان بادشاہوں کا تھا یہ باختر زمین اور ادھر مقابل میں خراسان زمین۔ باختر کو یونانیوں نے بیکٹریا بنا دیا۔

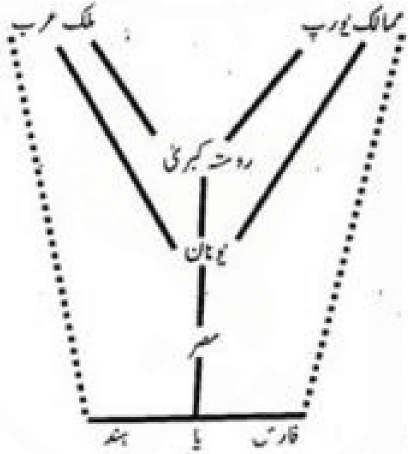
قندھار اور غزنی کا علاقہ زابلستان کہلاتا تھا۔ رستم حامی ایران کا وطن یعنی سیستان انہی علاقوں میں ہے۔ بلخ کے رستے میں بائیں ہاتھ چند کوس کے فاصلے پر ایک مقام تخت رستم کہلاتا ہے۔ وہ اس دشت میں آکر شکار کھیلا کرتا تھا۔ ایک سنگ سیاہ کی چٹان ہے۔ اسی کو تخت رستم کہتے ہیں۔ مالکم صاحب کہتے ہیں :۔

سیستان۔ خاندان رستم کا ملک موروثی ہے۔ اگرچہ تمام بیابان ہے اور اکثر نیستان ہوگیا ہے۔ لیکن کھنڈر اور خرابے اور ویرانوں کے نشان گواہی دیتے ہیں کہ دریائے ہیرمند کے کنارے کنارے دور تک آبادی کو رونق دیتا چلا جاتا تھا۔ اور مقاموں اور قبیلوں کے نام۔ وہاں کے تاریخی حالات کی تصدیق کرتے ہیں۔ ایک افسر انگریزی نے 1810ء میں علاقہ مذکور میں سیاحت کی ہے۔ اس نے سیستان کی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ شہر مذکور اپنے ویرانوں اور خرابوں کے بموجب چاہیے کہ کسی زمانے میں اصفہان کے برابر پھیلا ہوا ہو اور یہ شعر مشہور کی طرف اشارہ ہے ؎

اصفہاں نصف جہاں گفتند ؎ نصف وصف اصفہاں گفتند

ان کی مہماں نوازی۔ ان کے آداب محفل۔ ان کی تعظیم و تکریم کے طریقے۔ ان کے گھروں کی آرائش آج تک علم تدبیر المنزل کے لیے نمونہ ہیں کہ کسی آئندہ لکچر میں ان کی تصویر کھینچ کر دکھاؤں گا۔ اور اس سے خیال کر سکتے ہیں کہ جب ایسی ایسی بربادیاں اٹھا کر آج یہ حال ہے تو اس وقت کیا عالم ہوگا۔ یہی سبب ہے جو یورپ کے اہل نظر نے پیرس دار الخلافہ فرانس کی زیبائی اور خود آرائی دیکھ کر اسے خاتون دنیا خطاب دیا اور مورخوں نے کہا کہ جس طرح وہ یورپ میں خاتون ہے۔ ملک ایران ایشیا میں خاتون ہے۔

اہل تحقیق نے ایجاد علوم کی تحقیقات کی کہ یہ درخت اول کہاں سے پھوٹا اور اس کی پود کہاں سے کہاں کہاں پہنچی اور اس کا شجرہ اس اس طرح سرسبز ہوا۔ دیکھو ہند نے یا فارس نے اپنے علم کا سرمایہ مصر کو دیا۔ مصر نے دونوں سے لے کر یونان کو دیا۔ یونان نے رومیہ کو دیا۔ رومیہ اور یونان و فارس نے عرب کو دیا اور عرب سے پھر تمام یورپ اور ایشیا میں پھیلا۔



اب خیال کرنا چاہیے کہ جس قوم نے ساڑھے چار ہزار برس اس شان و شوکت کے ساتھ سلطنت کی ہو اور علوم و فنون کی ترقی اس مرتبہ پر پہنچائی ہو۔ کیا اس کی زبان ایسی مفلس، بے سکے اور بے ٹکسال ہو گی کہ جب تک اس میں آدھوں آدھ عربی لفظ نہ ملائیں تب تک زبان نہ ہلا سکیں۔

عرب کا ملک جس میں قبل اسلام نہ کبھی سلطنت کا گزر ہوا۔ نہ علوم و فنون کی ہوا لگی وہاں ایک شیر کے لیے سو سے زیادہ نام تھے اور اسی طرح شراب کے لیے۔ پھر زین اور لگام کے ایک ایک جز کے الگ الگ نام تھے۔ غرض اب تک ذرا ذرا سے فرق پر ہر شے کے لیے جدا جدا لفظ موجود ہیں۔ کیا ایسی عالی نژاد قوم اور قدیمی سلطنت کے پاس بات کرنے کو بھی الفاظ نہ ہوں گے؟ عرب کے صحرا نشین ہر دانت کے جوڑے کے لیے جدا جدا نام رکھیں اور ہر انگلی کا الگ الگ نام۔ کیا فارس جیسے شائستہ لوگوں کو سواد ندان اور انگشت کے کچھ نہ آتا ہو گا؟ کیا ان امتیازوں کی ضرورت انھیں کبھی نہ پڑتی ہو گی؟ آخر وہ

بھی علمی ضروریات رکھتے تھے۔ طب رکھتے تھے۔ تشریح رکھتے تھے۔ ملکی کاروبار رکھتے تھے۔ آپس کے معاملات و مقدمات رکھتے تھے۔ ان کے کام کیونکر چلتے ہوں گے؟

سنسکرت میں انگشٹ انگوٹھے کو کہتے ہیں۔ اب اسے فارسی میں زانگشت کہتے ہیں اور اس کے پاس والی انگلی کو انگشت شہادت کہتے ہیں۔ سبب اس کا یہ ہے کہ نماز میں ایک موقع پر اس سے اشارہ کرتے ہیں کہ وحدانیت الٰہی کا اقرار پایا جائے یہ تو اسلامی اصطلاح ہوئی اور چھنگلی یعنی سب سے چھوٹی انگلی کو اب فارس میں کالچ کہتے ہیں۔ یہ لفظ ترکی ہے۔ باقی گمنام۔

ملائی کو فارسی میں سرشیر اور ترکی میں قیماق کہتے ہیں۔ پہلا مرکب ہے۔ غالباً حالی جعلی ہے۔ دوسرا ترکی ہے۔ کیا ایسی عام کار آمد چیز کے لیے ان کے پاس ایک لفظ نہ ہوگا؟

شہد کے مہال میں جو بادشاہ ہوتا ہے اسے عربی میں یعسوب کہتے ہیں۔ فارس کے مصنف شاہ زنبوران لکھتے ہیں۔ ایران کا ملک جس کے پہاڑوں میں شہد موجیں مارتا ہے۔ کیا وہاں اس کے لیے ایک لفظ نہ ہوگا؟ ضرور ہوگا۔

سمجھنے کو یہی کافی ہے کہ ہم درہم کو عرب کا مال جانتے ہیں۔ مگر عرب میں سکہ کہاں تھا۔ تجارت کی وکالت سے دینار روم سے آیا۔ درہم فارس سے گیا۔ اور فارس میں آج کسی کو خبر نہیں کہ وہ ہمارا مال ہے۔ آج سے صدہا سال تک عہد بہ عہد کے سکے پرکھ لو۔ بیسیوں نام نکلیں گے۔ مگر کوئی عربی کوئی ترکی اور اب یوروپی۔

اس طرح آج فارس کے ملک سخن میں ہزاروں غیر ملک کے پردیسی۔ زبانوں پر چلتے پھرتے ہیں۔ خاک ایران کی آفرینش گم ہے۔ بعض الفاظ فارسی ہیں۔ مگر مرکب ہیں یا مشتق ہیں اور یہ علامت ہے اس بات کی کہ نوزائیدہ ہیں۔

تم ضرور کہو گے کہ اس کا سبب کیا ہوا؟ میں کہتا ہوں گواہان بے زبان سے سنو کہ کیا کہتے ہیں۔ وہ کون؟ تاریخی کتابیں۔ اگرچہ اس عہد کے مصنف ایسی باتوں پر اٹکتے نہ تھے۔ تو بھی قرینے کا پہلو کہیں نہ کہیں سے نکل آتا ہے۔ دولت شاہ نے اپنے تذکرے میں لکھا ہے کہ جب اسلام کا سایہ اس ملک پر آیا تو کل دفتر و دربار کی زبان عربی ہو گئی۔ بادشاہی

فرمانوں سے لیکر دفتروں کے احکام تک اسی زبان میں جاری ہونے لگے۔ اسی میں عرائض اور کل مقدمے کے فرائض طے ہوتے تھے۔ اسی میں عام خط و کتابت ہوتی تھی۔ آخر 442ھ میں الپ ارسلاں کا دور تھا کہ ملک کی خاک نے پھر زور کیا اور عمید الملوک اس کے وزیر کی تجویز سے ملکی دفتر زبان فارسی میں ہو گئے اگرچہ ملک کو بہت آسائش ہوئی مگر علما نے وزیر کو بڑا مطعون کیا بلکہ کم علمی اور بے لیاقتی کے داغ لگائے۔

خیال کرو! جہاں 3 سو برس تک کل دفتر اور تحریریں عربی زبان میں جاری رہی ہوں اور بادشاہ وقت اور اس کے اہل دربار اسی کا جامہ پہنے ہوں۔ اس کی تاثیر ملکی زبان پر کس قدر چھائی ہوگی۔ اور عربیت نے کس قدر فارسیت کو مٹایا ہوگا۔

اسی کتاب میں پھر لکھتا ہے کہ نوشیرواں کے زمانے میں حکمائے فارس نے اس کے نام پر وامق و عذرا کی داستان بہت دلچسپ طور سے لکھی تھی۔ جب ایران میں اسلام آیا تو خلفائے عباسی کے زمانے میں عبداللہ ابن طاہر حاکم خراسان تھا۔ ایک شخص نے وہ کتاب امیر کے سامنے لاکر رکھی اور اس کی فصاحت و بلاغت اور طرز بیان کی تعریف کی۔ امیر نے کہا کہ ہم تو قرآن پڑھا کرتے ہیں۔ ہمیں قرآن و حدیث کے سوا کوئی کتاب درکار نہیں۔ یہ مغان آتش پرست کی کتاب ہے۔ حسب الحکم۔ کتاب پانی میں فنا کی گئی اور تمام فارسی کی کتابیں جس جس شہر میں پائیں جلادیں۔

فارسی قدیم کی کتابیں کم وبیش جو کچھ ہیں۔ وہ سمجھنے کے لحاظ سے ہمارے حق میں قریب سنسکرت کے ہیں۔ بعض کے ترجمے انگریزی میں اور بعض کے فارسی میں دیکھے تو ان میں حمد الٰہی کے زمزمے ہیں۔ بعض کتابیں الٰہیات یا تصوف کی ہیں۔ ان کی مقدس عبارتوں کی طرف انشا پردازی کا مبصر ادب کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اور کچھ نہیں کہتا۔ کیونکہ ہر چمن کی آب و ہوا جدا ہوتی ہے۔ مذہبی تحریر کا عالم کچھ اور ہے اور انشا پردازی کا رنگ کچھ اور۔ تحقیق کی آنکھیں روتی ہیں اس گئے وقت پر جو کسی طرح نہیں آسکتا۔ ان خانہ بربادوں کے ہاں بھی یہی سیدھا سادہ بے تکلف رنگ تھا۔ افسوس افسوس آج اس عہد کو کہاں سے لائیں اور جو کچھ فنا ہو گیا کیونکر پائیں کہ دوستوں کو دکھائیں اور کچھ

فائدہ اٹھائیں۔ خیر جس بات کا پورا مزانہ لے سکیں۔ ادھورے کو چھوڑنا بھی دانائی سے بعید ہے۔ اس لیے جو سامان میری معلومات کی الماری میں مدت سے جمع ہو رہا ہے اسے نکالوں گا۔ اول قبل اسلام کی تصنیفات کے نمونے دکھاؤں گا۔ پھر بعد اسلام کی عبارتیں عہد بعہد اور صدی بصدی سجاؤں گا کہ تغیر کے رنگ خوشنما نظر آئیں۔

عزیزان وطن سے امید ہے کہ اس کے سرانجام کے لیے جلسہ آئندہ تک مہلت عنایت فرمائیں۔

دوسرا لکچر

(19 فروری 1872ء)

ملک فارس کی پرانی زبانوں کے حالات

جلسہ گزشتہ مبارک جلسہ تھا جس نے زبانوں کے سلسلے میں دلوں کو مسلسل کیا۔ مبارک شوق ہیں کہ اکیلے نہیں آئے۔ دیکھتا ہوں کہ نئے شوقینوں کو ساتھ لائے ہیں۔ بندہ آزاد اول سب صاحبوں کو خیر مقدم کہتا ہے اور جلسہ گزشتہ کا بیان یاد دلاتا ہے کہ جس سرزمین کو آج ایران یا فارس کہتے ہیں اس کی خاک کے اصلی فرزند اور لوگ تھے۔ جس طرح آریا کے پاک ذات فرقہ نے ہندوستان کے اصلی گھر والوں کو جنگل اور پہاڑوں میں دھکیل کر ملکش نام رکھ دیا اور آپ گھر والے بن بیٹھے اسی طرح جب دوسری شاخ وہاں پہنچی ہو گی تو اصلی مخلوق کو شہر چھوڑ کر پہاڑوں کی بغل اور جنگلوں کے دامن میں چھپنا پڑا ہو گا۔

جس طرح یہاں کے اصلی باشندوں کی مختلف پراکرتیں تامل، اوڈیا، تلنگو وغیرہ چلی آتی ہیں۔ اسی طرح وہاں کے فرقوں کی زبانیں ہوں گی۔ غالباً وہی نسلیں کرد۔ لک۔ لر۔ لزکی۔ زند وغیرہ ہیں۔ فارس کے سبز جنگلوں اور سیراب پہاڑوں کی سیر کرو۔ خدا کی خدائی نظر آتی ہے۔ قبائل مذکور ہزاروں بلکہ لاکھوں کے انبوہ گروہ در گروہ پھیلے پڑے ہیں۔ فقط نام کو بادشاہ کی رعایا ہیں۔ ورنہ خانہ بدوشی کے عالم میں خوش باش زندگی کرتے ہیں۔ یہ جنگلوں کے چرند اور پہاڑوں کے پرند ایسی بولیاں بولتے ہیں کہ آپ سمجھتے ہیں یا خدا۔ ان کے رسم۔ رواج۔ عادات۔ اطوار بالکل اہل ایران سے جدا ہیں۔ ان کے الفاظ ژند۔ پہلوی اور فارسی اور اس کی کسی شاخ سے ذرا لگاؤ نہیں رکھتے۔ اقوام مذکور میں نہ کبھی سلطنت آئی نہ علم و شائستگی نے راہ پائی۔ اس لیے تصنیفات کا قلم ان کی زبان کو بھی

تمغائے اعتبار نہیں دے سکا۔

میں کہہ چکا ہوں کہ سرزمین مذکور نے ایرین لوگوں کی برکت سے ایران نام پایا اور وہاں اور یہاں کے ایرین ایک خاندان کے دو بھائی ہیں۔ اس رشتے سے وہاں اور یہاں کی زبانیں بھی حقیقی بہنیں ہیں۔ یہ بھی ثابت ہو چکا کہ جو زبان اس وقت وہ پاک نسل بولتی تھی اس کا نمونہ آج ملنا ناممکن ہے۔ اگرچہ ان کی گھر کی سلطنت تھی مگر ان میں ہندی آریا کی طرح رسوم و رواج کے بند کسے ہوئے نہ تھے اس لیے ہر ایک زمانے میں مذہبوں کے اختلاط اور ملکوں کی آمد و رفت زبان پر معمولی اثر کرتی رہی ہو گی۔ یونانیوں کا طوفان گزرا ۔ پار تھیا والوں کی زبان نے اسے برباد کیا۔ سینکڑوں برس کے بعد ساسانی خاندان کی برکت سے پھر بوسیدہ ہڈیوں میں جان پڑی۔ انہوں نے غاصبوں کو دفع کیا اور برباد دفتروں کو پھر سمیٹا۔ اس کے ساتھ آئین زرتشت بھی پھر تازہ ہوا۔ اور کچھ تحریروں کچھ تقریروں سے دین کے آئین منضبط ہوئے۔ اس عالم میں وہ اپنی ملکی زبان اسی زبان کو سمجھے ہوں گے جو زمانے کے کل انقلابوں کا دست مال رہ چکی تھی۔ اور شک نہیں کہ اس وقت اس میں اور ژند کی زبان میں بھی فرق ہو گیا ہو گا۔

ژند۔ پاژند۔ استا

لغات فارسی کی فرہنگیں اور ایشیائی تاریخیں اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتیں کہ گشتاسپ کے عہد میں ابراہیم زرتشت نے کسی علمی اور درباری زبان میں ایک کتاب لکھی۔ اور اس کا نام ژندر کھا۔ ژند۔ چقماق کے اس جز کو کہتے ہیں جو آگ نکالتا ہے۔ کتاب مذکور بھی نور الٰہی کا جلوہ دکھاتی ہے اس لیے یہ برجستہ نام بہت مناسب ہوا۔ ژند سخت مشکل تھی۔ اس لیے شرح لکھنی پڑی اور اس کا نام پاژند رکھا۔ پاژند چقماق کے دوسرے حصے کو کہتے ہیں۔ جب ژند۔ پاژند سے ٹکرائے تو جلوہ حق روشن نظر آئے۔ یہ شرح متن سے مشکل ہو گئی اس لیے اس کی بھی شرح لکھنی پڑی۔ اس کا نام استار کھا۔ افسوس کہ ان میں سے کوئی کتاب پوری نہیں رہی۔ ژند کے 25 بابوں میں سے وندیداد انیسواں باب پورا ہے۔ باقی اوراق پریشان رہ گئے۔

تقریباً بیس برس سے یورپ میں علم کے طلبگاروں نے بے دریغ روپیہ اور عمر عزیز محنتیں صرف کی ہیں اور نوبہ نو تصنیفات سے وہ زور پھیلایا ہے کہ نئی نسل پارسیوں کی ان کے لکھے کو سند سمجھتی ہے۔ انہوں نے اکثر پرانی تحقیقوں کو رد کر دیا ہے لیکن مشکل یہ ہے کہ جو کتابیں چھپ کر آتی ہیں وہ دس بلکہ پانچ پانچ برس بعد کی تصنیفوں سے آپ ہی رد ہوتی جاتی ہیں۔

میں کتب مذکورہ کی زبانوں اور ان کے عہد بعہد کے تغیرات کے باب میں ہندیا فارس کی معلومات سے کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ کوئی سند ہاتھ میں نہیں البتہ ہماری کتب لغت میں بہت لفظ ہیں۔ جن کے آگے اتنا لکھا ہے۔ اس لغت ژند وپاژند است۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو لفظ استعمال میں نہیں آئے اور تراش ان کی ایسی کڈھب پائی کہ اشتقاق یا لگاؤ اس کا کسی اصل سے نہ ملا۔ اسے کہیں ژند۔ کہیں پہلوی۔ کہیں دری۔ کہیں فرس قدیم۔ لکھ دیا ہے۔ اب میں ایک فقرہ استا کا پڑھ کر اس کی زبان کا نمونہ دکھاتا ہوں :۔

استا کا فقرہ۔ اشم وہو وہستم ہتی استا ہتی استا ہمائے یداشائے وہیائے اشم راستی نعمت کبریائی ہے۔ رحمت ہے اور فراواں ہے اور مقدس سے خیر ترین اشیاء ہے۔ چاہتی ہے، کرتی ہے۔ ہوگی۔

واتو ہوزوسنپتو مزداوادھ ہویئے نو ہویئے نے پیاد

اے آفرید گار مالک۔ خوبیوں کے بڑھانے والے۔ دانائے اعظم۔ دو عالم میں خوب جائے رکھیو۔

زبان مذکور کے لیے کوئی صرف نحو یا لغت کی کتاب عہد قدیم کی تصنیف نہیں ملی۔ اہل یورپ نے کتب موجودہ کو پڑھ کر اپنی طبیعت کے بموجب قواعد باندھے اور ڈکشنریاں بنائیں۔ ہندوستانی یا پارسی شوقین انہی کو غنیمت سمجھتے ہیں۔ ان سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ زبان مذکور میں سنسکرت کی طرح حروف اعراب کا کام دیتے ہیں۔ فعلوں میں مذکر و مونث کے علاوہ کئی صیغے زیادہ ہیں اور گردانیں بھی بہت ہیں۔ فعل کا ماخذ۔ دن اور تن والا اسم نہیں۔ ایسا کچھ ہے جیسے فارسی موجودہ میں تم امر سمجھتے ہو۔ فارسی

حال میں سب امتیاز جاتے رہے۔ تعجب یہ ہے کہ ژندپاژند وغیرہ زبان ہائے مذکورہ میں تحریر کی رفتار دائیں سے بائیں طرف چلتی ہے۔ اور یہ سب جانتے ہیں کہ کل ارین زبانوں کی تحریر بائیں سے دائیں طرف ہے۔ اکثر کتابوں اور سکوں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ساسانیوں کے عہد میں یا اس سے پہلے زبان مذکور کی باریکیاں مٹ گئیں کیونکہ گردانوں اور صیغوں کے شمار اس وقت اسی حالت میں تھے جس میں کہ اب ہیں۔ آپ چند منٹ توقف فرمائیں۔ اس کا نمونہ بھی سناتا ہوں۔

پاژند

اس کا نمونہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ ویسٹ صاحب نے مینوئے خرد اور اس کا ترجمہ 1871ء میں چھاپا ہے۔ لکھتے ہیں کہ یہ پاژند کی زبان ہے۔ اور خسرو کے زمانے کی تصنیف ہے (یہ ساسانی عہد کا خاتمہ سمجھو) آزاد اس سے زیادہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ کوئی پرانی اور عہد اسلام کی قریبی فارسی زبان ہے۔ دیکھو! ہر صفحے میں کئی کئی لفظ فارسی متعارف کے اور بہت سے متغیر موجود ہیں۔ ہاں تصنیف عمدہ اور برکت والی ہے۔ معرفت الٰہی ' اصلاح نفس اور حکمت اخلاق کے مضامین ہیں۔ صاف سلیس اور بے تکلف عبارت میں ادا کیے ہیں اور یہ زرتشتیوں کے کسی ایسے فرقے کی کتاب ہے جو دیوتاؤں ' اور موثر و توانا روحوں کو بھی یزدان کہتا تھا۔ چند فقرے اس کے بھی سناتا ہوں :۔

پنام وشنایس و سپاسول داوار ہومزد۔ ہروست مینو و گیتی وہشا یزداں فرہنگا۔ فرہنگ دین مہ است۔ کیش ایدم ئن خان داناے ہمہ دانائی ست فرازہ جیدار۔

بنام و عظمت آگاہ ہندہ مطلق داوار ہومزد۔ ہر ہمہ ایزداں آخرت و دنیا آفریدہ او مستعد۔ ہمہ فرہنگہا فرہنگ ایں دین مہ است ذکر وحت دراں بجاو خانہ۔ ہمہ دانائی ست

خوردہ استا

یہ کتاب عہد مذکور سے بھی کسی پہلے زمانے کی کتاب ہے۔ اس میں نمازیں۔ یا دعائیں ہیں۔ سورج۔ چاند۔ بعض سیارے۔ آگ۔ آب رواں وغیرہ کی حمدیں ہیں اور مثلاً صبح کو اٹھیں تو کیا پڑھیں۔ شام کو چراغ جلے تو کیا پڑھیں۔ کھانا کھانے سے پہلے کیا پڑھیں۔ گناہوں سے ندامت کے لیے کیا پڑھیں۔ یہ کتاب باترجمہ ہے۔ اور دیباچہ میں لکھا ہے کہ ساسان پنجم نے کلام الٰہی سے دری میں ترجمہ کیا ہے۔ اس میں سے بھی چند سطریں سناتا ہوں :۔

خورشید نیائش بن (صفحہ 22)

مس دوہ وفیروز گرباد میتوئی خورشید امرگ رایو مند خردمند

بزرگ وفیروز مندباد میتوئی خورشید بے مرگ خالص نور مند خردمند

اروند اسپ ہمت وبخت وہورشت۔

قوی اسپ بہ نیک نیت۔ نیک گفتار۔ نیک کردار نماز بہان

نمو ہور خشتیامہ اروداسپامہ (سہ بار) بطور نیت

نماز بہ چشمہ خورشید قوی اسپ

خوشنوترہ اہور ہر مزد۔ انماستی اہورہ مزدا (سہ بار) بطور نیت

ستائش بہ تواے داوار ار مزد۔ نماز بہتوائے خدائے مردانا

سریچند فردانیائش دمان (سہ بار۔ بہ سہ آئین۔ نیت۔ گفتار۔ کردار)

نیک وبیش از تمام پیدائش نماز بہ تو

نمودوامشاسپنتاو یسنلی ہورہ ہزوشا

نماز بہ شماے فرشتگان کہ باخورشید ہم کام ہستید

مجھے اس کے الفاظ میں بحث کرنے کی طاقت ولیاقت نہیں لیکن پہلے ہی فقرے میں جو اروند اسپ اور ترجمہ میں قوی اسپ ہے اس کے معنوں پر خیال کرو۔ یہ تو ظاہر ہے کہ استعارہ کے رنگ میں سورج کی تیز رفتاری دکھائی ہے لیکن سنسکرت کی طرف دیکھو! اس کی انشاپردازی نے بھی سورج دیوتا کی رتھ میں گھوڑے ہی لگائے ہیں اور ہر فقرے میں دو تین لفظ بھی ایسے ہیں کہ ہم تم عام فارسی کے جاننے والے سمجھتے ہیں۔

دساتیر

تقریباً 590ء میں خسرو پرویز کا زمانہ تھا۔ صولت عرب دولت فارس کو آنکھیں دکھا رہی تھی کہ ساسان پنجم نے وہ نامے اپنی سلیس اور فصیح زبان میں ترجمہ کر کے ترتیب دیئے جو عہد قدیم میں سلاطین مہ آباد وغیرہ پر نازل ہوئے تھے۔ مجموعہ مذکور کا نام دساتیر ہے۔ یہ خورد استا سے بھی پہلے کی زبان معلوم ہوتی ہے۔ مملکت کے کسی علاقے کی پراکرت ہے۔ اس طرح زور پکڑ گئی ہو گی جس طرح یہاں ایک زمانے میں پالی ہو گزری۔ 1816ء میں ملا فیروز پارسی نے اصل مع ترجمہ مذکور کے چھاپی اور فرہنگ آپ لکھ کر ساتھ لگائی۔ اس کے بھی چند فقرے سنئے :۔

نامہ شت وخشور فریدوں (نمبر 10، صفحہ 156)

ہوزامیم فہ مزدان ہزہزماس دزماس ہر شیور ہر دیور۔

پناہم بہ یزدان از منش و خوے بد در شت گمراہ کنندہ بر اہد برندہ۔

فہ شید شمتا۔ ہر شندہ ہر شفتگر زمریان فروہیدور۔

ہام ایزد خشا سندہ خشا شگر مہربان داد گر۔

ہے پریسہ دم فرپود ابتر یم منہو شام ویزد شام ہر شیدم وار جم کاچہ ہونپر اہیی فہ فر جیشوری چاریدم وجہاخ کاسمرندہ تموردردم۔

اے فریدوں پور آبتین بر مردمان و جانوران بے آزاد بخشیدم۔ واز گناہ ایشاں گزشتم۔ وترا کہ دوست منی بہ پیغمبر گزیدم وجہان را پر ستندہ تو کردم۔

مازاو فروز آباد کا جیور کم۔

آئین ہوزرگ آباد را زندہ کن۔

عزیزان وطن! عبارت مذکور کے باب میں کیا کہوں؟ فریدوں۔ اور اس کے باپ آبتین کو تو سب جانتے ہیں۔ دیکھو! یہاں کیسی صورت بدلے بیٹھے ہیں۔ اور الفاظ اور افعال کو کوئی کیا پہچان سکے۔

اور پہلے ہی دو جملوں کے معنوں پر خیال کیا؟ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ اور ہر نامہ کا عنوان انہی دونوں سے تاجدار ہے۔ اللہ اللہ جہاں دیکھو، اسی کے نام میں پناہ ہے اور اسی کا نام ہر جگہ کام سنوارتا ہے۔

اس کی عبارت اور طرز ادا کی تعریف نہیں ہو سکتی کہ حکمت الٰہی۔ حکمت اخلاق۔ معرفت کے مطالب اور اور مضامین ہیں اور چھوٹے چھوٹے فقرے ہیں۔ باوجود اس کے ہر فقرہ اپنا حق آپ ادا کرتا ہے۔ پہلے کا کام دوسرے پر ملتوی نہیں۔ استعارہ و تشبیہ یا مبالغہ کے رنگ نے اصلیت مضمون پر پردہ نہیں ڈالا اور لفظی صنعتوں نے معنوں پر اندھیرا نہیں کیا۔

پیارے دوستو! مفلس معلومات کے کیسہ میں اور سرمایہ نہیں کہ ان ہزاروں برس کی پرانی زبانوں پر کوئی سندی تحقیق پیش کرے اور یورپ کی ہر سالہ تحقیقیں رہی سہی عقل گم کرتی ہیں۔ سال گزشتہ کی ایک تصنیف سے منکشف ہوا کہ زرتشت ساسانیوں کے عہد میں سنہ عیسوی سے تقریباً 5 سو برس پہلے ہوا ہے۔ اور اس کی تصنیف اوستا تھی۔ ہم استا کہتے تھے اور جو کچھ اسے سمجھتے تھے وہ غلط فہمی تھی۔ کہتے ہیں کہ اس کے بیس باب تھے۔ 19 گم ہو گئے۔ ایک وندیداد باقی ہے۔ جن لوگوں نے اکیسواں باب بھی کہا ہے وہ غلطی ہے۔ پیغمبر اسلام کے فضائل و معجزات سن کر اس قسم کے مضامین پیچھے لکھے گئے اور اوستا کا اکیسواں باب کہلائے۔ (یہ بھی کہتے ہیں کہ)

زرتشت کے شاگردوں اور بعد کے موبدوں نے بہت کتابیں لکھیں۔ وہ اور زبان میں ہیں۔ اس زبان کا نام ژند ہے۔ غلط فہمی تھی جو سمجھتے تھے کہ ژند زرتشت کی پہلی کتاب کا نام ہے اور وہی دین کی بنیاد ہے۔ (کہتے ہیں) کچھ عرصے کے بعد جو کتابیں تصنیف ہوئیں۔ پہلوی زبان میں تھیں۔ پہلوی خط کا پڑھنا بہت مشکل تھا۔ ادنیٰ بات یہ تھی کہ 5 یا 4 حرفوں کے ایک مجموعہ سے کئی لفظ پڑھے جاتے تھے اس لیے قریبی زمانہ آمد اسلام کا تھا کہ زبان اور خط کو بدل دیا۔ اس زبان کا نام پاژند ہے۔ اسی میں مینوی خرد۔ وغیرہ کتابیں ہیں اور وہ فارسی حال سے بہت ملتی جلتی ہیں۔ (کہتے ہیں کہ) اوستا کے معنے معلوم نہیں۔ وہ بھی غلط سمجھے تھے جو لکھ گئے استا بہ معنی حمد ہے وغیرہ وغیرہ۔

ان وہمیات پریشاں سے گھبرا کر کہتا ہوں کہ پرانی ہڈیوں کے اکھیڑنے سے کچھ

حاصل نہیں۔ ہزاروں برس گزر گئے۔ ان کے بولنے والے خاک در خاک ہو گئے۔ رہنما ملتا نہیں۔ اٹکل پچو باتوں سے کیا فائدہ۔ البتہ فائدہ ہے تو زندہ زبان کی جستجو میں ہے کہ کیسی ہڈیاں تھیں جن پر گوشت پوست چڑھ کر یہ پتلا بن گیا جس کو سب فارسی کہتے ہیں اور وہ کیسی فارسی تھی جس سے عرب کی زبان نے کچھ رنگ اتار دیا۔ کچھ چڑھا دیا اور اس صورت کی یہ مورت بنا دی جو آج زبانوں پر چلتی اور کاغذ پر دوڑتی ہے۔

ہماری درسی کتابیں زبان فارسی کے باب میں کیا کہتی ہیں؟

فارس کی زندہ زبان اپنی تاریخ کے بتانے میں مردہ سے کم نہیں۔ بڑے بڑے محقق گزرے۔ مگر جو ہیں یہی لکھتے ہیں کہ فارسی زبانیں 7 قسم کی ہیں۔ فارسی۔ دری۔ پہلوی۔ ہروی۔ سکزی۔ زاولی۔ سغدی۔ مدت تک اس معمے میں عقل حیران تھی کہ 7 قسم کی فارسی کے کیا معنے؟ اور کیسی زبانیں ہوں گی جن کی نظم نثر۔ کسی تصنیف یا لفظ کا پتا نہیں ملتا۔ جب مختلف زبانیں دیکھیں اور ان کی تاریخی حالات معلوم ہوئے تو آنکھیں کھلیں اور یہ عقدہ حل ہوا کہ اسلام کے قریبی عہد میں یہ پراکرت زبانیں ہوں گی۔ پاس پاس کے وقتوں میں سلطنت اور تصنیف کے زور سے جم گئیں۔ ان کے الفاظ بھی ملتے جلتے ہوں گے۔ متقدمین کے پاس کچھ کچھ نوشتے بھی ہوں گے۔ ان کے متاخرین نے بڈھوں سے سن کر قسمیں باندھ دیں۔ اور بے شک! نہ لکھتے تو اپنے عہد میں بے خبر کہلاتے۔ ہاں یہ کوتاہی ہوئی کہ نمونے نہ دے گئے۔ انہیں ان وقتوں کی کیا خبر تھی۔ خیر یو سمجھو کہ :۔

فارسی۔ زندہ ہے وہ اپنے زور سے اپنا کام کر رہی ہے۔ دری اور پہلوی مر گئیں۔ اس کی بدولت برائے نام زندہ ہیں۔

4۔ ہروی۔ ہرات اور اس کے علاقے کی زبان ہو گی۔ عہد قدیم میں وسیع مملکت تھی۔ اب بھی صدہا کوس تک جنگل ویران پڑا ہے۔

5۔ سکزی۔ سیستان کو عہد قدیم میں سکزی کہتے تھے۔ ع چوں تا ختن رستم سکزی بہ پسر بر۔ (رستم و سہراب کا اشارہ ہے)۔ رستم حامی ایران کا وطن تھا۔ خدا جانے اس

وقت کہاں تک آباد ہوگا۔ اب بھی سینکڑوں کوس ویرانے پڑے ہیں۔

6۔ زاولی۔ قندھار۔ غزنی وغیرہ شہرہائے خراسان کی زبان ہوگی۔ اسی واسطے شعرا نے محمود غزنوی کو محمود زابلی بھی لکھا ہے۔

7۔ سغدی۔ سمرقند کے قرب وجوار میں سرسبز اور شاداب قطعہ پر ایک آباد اور نامور شہر تھا۔ اس علاقہ کو دنیا کی 4 بہشتوں میں سے ایک بہشت جانتے تھے۔ اس کی زبان سغدی کہلاتی ہوگی۔

بہر حال زبان ہائے مذکورہ جب ہوں گی تب ہوں گی۔ ہم پرانی لکیروں کے فقیر اب تک وہی صدا کیے جاتے ہیں کہ فارسی کی 7 قسمیں ہیں۔ اچھا اب جہاں تک کہ معلوم ہوئے۔ پہلی 3 زبانوں کے حالات بیان کرتا ہوں اور ان میں فارسی کو اخیر پر ملتوی رکھتا ہوں کہ اس کا دامن بہت پھیلا ہوا ہے۔

دری

ہماری لغت کی کتابوں میں لکھا ہے کہ کسی زمانے میں یہ دربار کی زبان تھی اس لئے اسے دری کہتے تھے۔ اور وہی فارسی تھی۔ مگر فارسی میں بعض حرف کم زیادہ کئے ہوئے ہیں۔ دری میں الفاظ اپنی اصلیت پر ہوتے تھے۔

بعضے کہتے ہیں کہ درہ کوہ کے لوگوں کی زبان تھی۔ اور اس کی اصلیت میں فصاحت شہر کی ترمیم نے عمل نہیں کیا تھا۔ جس طرح کبک دری کہتے ہو اسی طرح زبان دری سمجھو۔ بندہ آزاد کہتا ہے۔ شیخ بو علی سینا نے حکمت فارسیہ کے دیباچہ میں لکھا

دری		عام زبان
ابریشم		بریشم
دری		عام زبان
اسپند		سپند
اشکم		شکم
اشتر		شتر
برو		رو۔ یعنی جا
بدو	بدو	دو۔ یعنی دوڑ
بشنو	بشنو	شنو۔ یعنی سن

ہے کہ میں اس کتاب کو بر ابر بر۔ یعنی اوپر
دری فارسی میں لکھتا ہوں۔ ایلے یے۔ یعنی لیے
پس اس بات سے یہی ثابت
ہوتا ہے کہ جس فارسی کو
دربار نے شستہ و رفتہ کر
کے محاورے کا سکہ لگایا ہو
وہی دری زبان ہے۔ اور
نظامی کے اشعار جابجا اس
کی تائید کرتے ہیں ~

نظامی کہ نظم دری کار اوست دری نظم کردن سزاوار اوست

پہلوی

ہمارے لغت کے مفلس خزانچی ہر کتاب میں یہی لکھتے ہیں۔ بدانکہ زبان پہلو منسوبست بہ پہلو۔ ابن سام۔ ابن نوح۔ بعض کہتے ہیں کہ پہلو شہر کو کہتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ چھاؤنی لشکر کو کہتے ہیں اور سند میں فردوسی کا شعر پڑھتے ہیں ~

پہلو بروں رفت کاؤس شاہ زہر سو ہمے گشت گرد سپاہ

بعضے کہتے ہیں کہ پہلوانان فارس یہ بولی بولتے تھے۔ اس لئے پہلوی اور پہلوانی بھی کہتے تھے۔ فردوسی کا ایک اور شعر ہے ~

اگر پہلوانی ندانی زباں بہ تازی تو اروند را دجلہ خواں

پہلو۔ ایک راگ کا نام بھی ہے۔ یارمیگوید بہ بانگ پہلوی۔ نظامی ~

بمراے گنجش چو پدرام کرد بہ پہلو زبانش ہرے نام کرد

ملا خیر اللہ مہندس اس کی شرح میں لکھتے ہیں۔ ایں زبان اہل شہر نیست بلکہ زبان اطراف دیار است و اختیار کردن زبان اطراف باوجود زبان شہر بنابر آنست کہ چوں تخت گاہ سلاطین مجمع اصناف خلائق میباشد۔ زبان مردم آنجا بر صرافت خود نمیماند۔ لہذا فارسی

راتعریف می کنند۔ فارسی قہ کہ معرب کہ و مخفف کوہ است۔ وفارسی دری ہم ازیں قبیل۔ وفضلائے متقدم در حل معانی لغات سند ہا ازبدویان واعراب گرفتہ اند۔

میرے نزدیک یہ رائے اصلیت کے مخالف ہے۔ بات یہ ہے کہ فصحائے فارس نے کسی موقع پر اہل کوہ کی زبان کو کہ خالص اصلیت پر ہوتی تھی۔ دری کے لفظ سے سراہا ہے۔ کسی موقع پر اہل شہر کی زبان کو کہ تراش پاکر شستہ ورفتہ اور بامحاورہ ہو جاتی ہے۔ پہلوی کہہ کر تعریف کی ہے۔ عالم سیاحت میں محققان ایران کے بیان سے اس کی تائید ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ بزرگان سلف۔ اصفہان۔ رے (اب یہیں طہران آباد ہے) اور ان کی زبان کو پہلوی یعنی شہری کہتے تھے۔ باقی کو دری اور تبری۔ کہ تبرہ۔ پشتہ اور پہاڑی کو کہتے ہیں۔ اس سے تبرستان بہ معنی کوہستان ہے۔

نیا نکتہ یہ ہے کہ پہلوی کا مٹا ہوا سراغ ہندوستان میں آنکلا۔ کھتری فرقوں کی تفریق میں منوجی اپنے باب 10۔ اشلوک 43 میں کہتے ہیں۔ ان کھتری ذاتوں کے اعمال رفتہ رفتہ شاستر سے نامطابق ہوتے گئے۔ اور برہمنوں سے روگرداں ہو گئے۔ اس لئے حیوانیت کو پہنچ گئے۔ 1 پونڈر۔ 2 اوڈر۔ 3 دراوڑ۔ 4 کامبوج۔ 5 یون۔ 6 شک۔ 7 پادر۔ 8 پلہو۔ 9 چینن۔ 10 کرات۔ 11 درد۔ 12 کہش۔ (شارح ہر فرقہ کی توضیح کرتا ہے اور ان میں سے نمبر 8 پلہو کے باب میں کہتا ہے۔ یہ ایران میں آباد تھے۔ جن کی پہلوی زبان میں ان کا نام باقی ہے)۔

کولڈ اسٹر صاحب نے اپنی گریمر میں لکھا ہے کہ۔ پلہو ایک کم رتبہ فرقہ کھتریوں کا ہے۔ یہ راجہ سگر کی رعایا تھے۔ اپنے ولی نعمت کو بہت ستایا۔ اس کی بددعا سے یہ پھل پایا۔ اس فرقہ کے اکثر لوگ ہندوستان کے جنوب میں آباد ہیں۔ کسی زمانے میں فارس کے کسی علاقہ سے آئے تھے۔ اور جنوب مغرب کے رستے گزرے تھے ان کے ملک کا نام پہلو تھا اور زبان پہلوی تھی۔ نہیں معلوم کہ وہ علاقہ کہاں تھا۔ ہماری کتابوں میں کوئی تصنیف نظم، نثر یا فرہنگ ایسی نہیں ملتی جس سے ان تینوں کی طرز عبارت اور ترکیب الفاظ کی کیفیت معلوم ہو۔ فردوسی نے شاہنامہ میں ایک جگہ لکھا ہے۔

بداں آبداری و آں نیکوی زباں تیز بکشاد بر پہلوی

کہ شاہا ہژبر اسپہد تنا نجستہ گو گر د شیر اوژنا

آگے پھر متعارف فارسی کے شعر ہیں۔ ہمارے قیاس آج تک شکوک و اوہام کے اندھیرے میں ٹٹولتے پھرتے تھے۔ اور حیران تھے کہ پہلوی کیا ہو گی۔ چند سال ہوئے اردائے ویراف کی اصل کتاب نے آکر روشنی کر دی۔ اس کی کیفیت سنئے :۔

اردائے ویراف۔ اردشیر بابکان خاندان ساسانیہ کا بانی تھا۔ سکندر نے جس سلطنت کو جیاد سے اکھیڑ کر پھینک دیا تھا۔ اس ہمت والے بادشاہ نے پھر اس کا قلعہ باندھ کر بلند کیا۔ اور دین زرتشت کو بھی دوبارہ روشن کیا۔ تمام علمائے مذہب اور شرفائے قوم کو شہر شہر سے بلایا۔ اور چاہا کہ مذہب کی پریشانی کو جمعیت کے سلسلے میں لائے۔ 40 ہزار دانائے دیندار جمع ہوئے۔ بادشاہ کی فرمائش سن کر سب سے کہا کہ اردئے ویراف کے سوا کوئی اس مہم کو سر انجام نہ کر سکے گا۔ اسے بلایا۔ اور آتشکدہ خاص میں تخت زریں پر بٹھایا۔ اس پیر مرد کہن سال نے بموجب آئین زرتشت کے 3 جام شراب ہیربد کے ہاتھ سے پئے۔ اور وہیں چادر تان کر لیٹ رہا۔ 6 دن تک دنیا سے بے خبر سوتا رہا۔ سب اس کے گرد بیٹھے تھے۔ اور معرفت الٰہی کے زمزمے گا رہے تھے۔ ساتویں دن ہوش میں آکر اٹھا اور دو کاتبوں کو پاس بٹھا کر لکھوانا شروع کیا۔ جو کچھ اس خواب کا بیان لکھا گیا وہی کتاب اردائے ویراف ہے۔ بندہ آزاد نے اس تمام کتاب کو دیکھا۔ لکھا ہے کہ مجھے فرشتے لے گئے۔ پل صراط پر گزر ا۔ دوزخ کو دیکھا۔ اہل دوزخ کو دیکھا۔ قسم قسم کے گناہگاروں کا حال لکھا ہے۔ اور ان کے عذاب بھی ایسے لکھے ہیں کہ حرفوں کو دیکھ کر روح کانپتی ہے۔

زاہدا! خوف خدا چاہئے دوزخ سے نہ ڈر یہ بھی اک تجھ کو ڈر کا سا دیا تا کہ ڈرے

اسی طرح اور بہت سے حالات ہیں۔ اسی میں سے یہ بھی لکھا ہے کہ اس کی زبان پہلوی ہے۔ چند فقرے اس کے سنئے :۔

اردائے ویراف۔ صفحہ 13

(۱) رویانوے دلمن ویراف من تودل چکات دائنگ چنیوت پہل وزلوند

روح ویراف از جانب تن جدائی گزید واز چنیوت پل گزشت

(2) وہفتون یوم شپانو لکہوار (لخوار) یاثوتدومین تنووزلوند

و ہفتم روز و شب باز آمد و درمیان تن رفت

(3) ویراف مدم خاست چیگون امت من زک خلموئے بسیم اخیزید

ویراف ہماں دم بر خاست چنانکہ گویا از یک خواب خوش بر خاستہ

(4) وہومن ے نشن وخورم۔

والہام نیک خیال کردو خورم

اہل تحقیق نے لکھا ہے کہ "پہلوی زبان ایران میں ایسی ہے جیسے ہندستان میں کوئی مہذب پراکرت۔ اور ایک پہلو اس کا عرب سے بھی ملا ہوا ہے۔" اس فقرہ کی یہاں پوری تصدیق ہوتی ہے۔ دیکھئے 4 سطر کی عبارت ہے۔ اور پہلے ہی فقرہ میں دیکھو من عربی ہے۔ تن۔ فارسی کا ایسا لفظ ہے کہ اب بھی عام ہو رہا ہے۔ چنیوت پھل۔ وہی چنیودپل ہے کہ فارسی فرہنگوں میں لکھا ہے۔

دوسرے فقرہ میں۔ ہفت۔ فارسی بھی۔ سنسکرت بھی۔ یوم۔ عربی۔ شپا کو فارسی بھی کہو۔ سنسکرت بھی۔ یاتوند۔ کو دیکھو۔ شائد اتے۔ یاتی عربی کے فعل ہیں۔ زبان مذکور کی طاقت نے۔ یاتی سے فارسی کا فعل مشتق کر لیا ہے۔ ومین (بین) عربی ہے۔ زک (زاک) عربی ہے۔ بسیم۔ عربی ہے۔ خیز فارسی ہے۔ خورم۔ فارسی ہے۔

فارسی

یہی اقبال مند زبان ہے جس کے لئے زمانہ نے سب زبانوں کے چراغ گل کر دیئے۔ اور آج تک کل ملک و مملکت پر اس کا سکہ چل رہا ہے۔ عہد قدیم میں فارس کا علاقہ کنارہ جیحون سے فرات تک۔ اور باب الابواب سے کنارہ عمان تک پھیلا ہوا تھا۔ پھر صوبہ صوبہ کا نام جدا ہو گیا۔ اب فارس بھی ایک صوبہ ہے۔ شیراز۔ بہبہان۔ کازرون۔ تبریز۔ جرم اور لار وغیرہ اس کے مشہور شہر ہیں۔ پہلے اصطخر اس کا دارالسلطنہ تھا۔ کئی سو برس سے شیراز دارالملک ہے اور زبان آج تک فصاحت کے دودھ میں شیرہ گھولتی ہے سعدی شیرازی فرماتے ہیں۔

یارب زباد فتنہ نگہدار خاک پارس چندانکہ خاک را بود و باد را بقا

یہی فارس اور یہی فارسی تھی جس کے حق میں خواجہ حافظ نے فرمایا ہے۔

خوبان پارسی گو بخشندگان عمرند ساقی بدہ بشارت پیران پارسا[19] را

اب مجھے چاہیے اس فارسی کا نمونہ دکھاؤں جو ورود اسلام کے وقت فارس میں بولی جاتی تھی۔ پھر معلوم ہو جائے گا کہ زبان عرب نے وقت بوقت اس پر کیا کیا اثر کیے۔ اور آج کیا حال ہے۔ میں ابھی کہہ چکا ہوں کہ 590ء میں جبکہ اسلام کا طلوع اور خسرو پرویز کا زمانہ تھا۔ ساسان پنجم نے دساتیر کو ترتیب دیا۔ فقرہ بفقرہ فارسی میں ترجمہ کیا۔ اور ضرورت کی جگہ تفسیر بھی لکھی اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس زمانے میں ترجمہ ہوا اور اہل تحقیق نے اسے زبان فارسی تعبیر کیا۔ وہی فارسی اس وقت ملک کی زبان ہو گی۔ دساتیر کے چند فقرے ابھی بیان ہوئے۔ مگر اب ایک مسلسل عبارت ساسان پنجم کی تحریر کی سناتا ہوں۔ جو نامہ کہ زرتشت پر نازل ہوا تھا یہ اس کے ایک فقرہ کی تفسیر ہے (دساتیر کے فقرہ کا ترجمہ) صفحہ 191

اے پیغمبر دوست! زرتشت! پور اسفنتمان چوں چنگر نگاچہ[20] آمد از یک نسک اوستا براہ راست گرائید و بہد باز گشت (تفسیر از ساسان پنجم)

چنگر نگاچہ دانائے بود بہ فرزانگی وزیری کی شناختہ۔ شدہ و موبدان جہان بشاگردی لوے نائید ند۔ چوں سخن از فرہ وخشور یزدان زرتشت اسفنتمان بشنید باہنگ بر انداختن آئین باران آمد۔ جوں بہ بلخ رسید۔ بے آنکہ از زبان تختے بیرون دہد و پرشہا کند۔ پیغمبر یزدان زرتشت باد گفت۔ ہرچہ در دل داری بزبان مسپار! او رازدار!۔ پس بفرزانہ شاگرد خود گفت۔ یک نسک اوستا بر دخواں۔ دریں فجستہ نسک سراسر پژوہشہائے چنگر نگاچہ بود۔ یاپا سخہا کہ باپیغمبر خود میگوید کہ چنیں کسے آید بدیں نام۔ و نخستیں پرسش او ایںست۔ و پاسخ آں چنیں۔ چوں چنگر نگاچہ چنیں فرجودے دید۔ بہ آئین شد۔ و بہدبوم باز گشت۔ دریں فرخندہ کیش استوار ماند۔ تخشندہ یزداں مارلو دوستان مارا دین بہیں می بخشاد۔

میرے دوستو! تم دیکھتے ہو! یہ اچھوتی فارسی ہے۔ اور اس عالم میں ہے کہ عربی نے اسے آواز تک نہیں چھوائی۔ بڑی خوشی ہوئی تھی جس دن یہ صاف سطح میرے

ہاتھ آئی تھی اور معلوم ہوا تھا کہ عربی نے اس پر کس کس عہد میں کیا کیا دستکاری کی۔ تم بھی غور کرو اور اسی سے یہ بھی سمجھ لو کہ کس طرح الفاظ محاورہ سے گر کر مردار ہو جاتے ہیں اور نئے الفاظ ولادت پاتے ہیں۔ یہ بھی دیکھ لو کہ زبان کی طول عمر میں تغیرات مذکورہ فقط الفاظ ہی پر عمل نہیں کرتے لفظوں کے جوڑبند میں بھی بڑے فرق آ جاتے ہیں۔ مختصر یہ سمجھ لو کہ یہاں برج بھاشا کا یہ حال ہوا جو آج تم بول رہے ہو۔ ایران میں اس کا یہ حال ہوا جو آج پڑھ رہے ہو۔

اسی سلسلہ میں ترقی طبع کے لئے ایک اور میدان دکھاتا ہوں۔ خیال کرو! ہماری پراکرت زبانوں میں اکثر سنسکرت کے لفظ رنگ بدلے ہوئے موجود ہیں۔ دیکھ لو اس طرح وہاں کی پہلوی۔ دری اور فارسی میں ژند کے الفاظ ایسے نظر آتے ہیں جیسے راکھ میں چنگاریاں۔ اور ان میں جس زبان کو علم اور دربار سے جتنی زیادہ قربت رہی۔ اتنا ہی اس میں ژند کا اثر زیادہ ہے۔ چند الفاظ تمثیلاً کہتا ہوں۔ انہیں دیکھو۔ بلکہ تمہاری آج کی فارسی میں بھی بہت کچھ الفاظ زبان ہائے مذکورہ کے موجود ہیں اور لطف یہ ہے اب تک سنسکرت میں آواز ملاتے ہیں :۔

فارسی	پہلوی	ژند	پاژند	سنسکرت
اگر	اگر		اگر	
اکنونؔ	اکنی۔اکنیں		اکنیں	
گمان	کمان		گمان	
بے کنارہ	اکنارک		اکنارہ	
پاداش۔باداش	پاداہشتا			
خان۔خانہ۔	خوانو۔اخوان		اخان	
اختر	اختر	اختر	اختر	
ناسپاس	اسفاس		ان سپاس	
آشتی	آست	اشتیا	آشتی	آسکتی
انبار	انبار	ہان۔ہان بار	انبار	

اند۔اندک	اند		اندک	
اندر	اندر	انترہ		انتر
برنا	پرناک	اپرنا	اپرنا	
استخوان۔ہستہ	است استک		است	اتھی
پیانہ	پاتمانہ۔پیمانہ		پیان	پرمان
آگاہی	آگاس			
درون	درون	درونا	درون	
دور	دور	دورا	دور	دور
نیرو	نیرک۔نیرکن			نرو تندرست
نو	نوک	نوا	نوا	نوا
کنارہ	کنار۔کنارک	کرانہ	کنارہ	
کالبد	کارپوت۔کارپو			کلیور
دش	دش	دش	دش	دشٹ
بادافراہ	پاتفراہ	پاے تفرارسا	پادافراہ	
شرم	شرم	فشارما	شرم	

اب پھر اس میدان میں آنا چاہئے جہاں سے فارسی قدیم پر نظر ڈال کر فارسی موجودہ پر نظر کر سکیں۔ اور عہد بعہد دیکھیں کہ کیونکر زمانہ اسے وقت کی زبان بنا کر اہل زبان کے منہ میں دیتا رہا۔

عزیزان وطن! جن لوگوں کو مختلف قوموں اور مختلف زبان کے لوگوں میں گزارے کرنے پڑے ہوں گے وہ خوب جانتے ہیں کہ جب ایک قوم دوسری قوم سے ملتی ہے تو جس طرح ان کے کاروبار غلط ملط ہوتے ہیں اس طرح ان کی زبانیں بھی مل جل جاتی ہیں۔ اس کی کئی صورتیں ہیں:۔

(1) اکثر نئی چیزیں۔ نئے کام کاج ایک کو دوسرے سے حاصل ہوتے ہیں۔ اور وہ اپنے نام اور افعال اور استعمال کے خیالات بھی ساتھ لاتے ہیں۔

(2) جب دونوں کو ایک جگہ گزارہ کرنا پڑتا ہے تو اس غرض سے کہ ایک شخص دوسرے کو اپنا مطلب جلدی سمجھاوے۔ اور کام چلتا کرے۔ 4 لفظ اپنے بولتا ہے۔ 2 اس کے کہہ جاتا ہے۔

(3) اس میں گلہ اور زبان و دہان کی مغائرت لفظوں کے تلفظ کو بدلتی ہے۔ جس سے عرب نے معرب الفاظ بنائے۔ اور فارسی نے مفرس۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور حقیقت میں اس کا کوئی قاعدہ نہیں۔ جو زبانوں پر چڑھ گئے وہ چڑھ گئے اکثر لفظ وقتوں کے انقلابوں سے بدلتے بدلتے ایسے ہو گئے کہ بالکل پہچانے نہیں جاتے۔ عبارت ہائے مذکورہ بالا میں ناموں ہی کو دیکھو۔ بھلا ان تبدیلیوں کا قاعدہ کوئی کیا باندھ سکے۔ اور لفظوں کو کیا پہچان سکے۔

(4) آٹھ پہر ایک جگہ رہنے سہنے سے بے ارادہ بھی ایک کی زبان سے دوسرے کے لفظ نکل جاتے ہیں اور آپس کی محبت سے ایک کو دوسرے کے لفظ بھی پیارے معلوم ہوتے ہیں۔ الفاظ کے علاوہ گیت، کہاوتیں اور شعر زبانوں پر چڑھ جاتے ہیں اور سب سے بڑھ کر وہی بات ہے کہ حضرت اقبال جس طرح فتح یابوں کی تلوار میں چمک دیتے ہیں۔ اسی طرح گفتار، رفتار، وضع، لباس اور کل کاروبار کو ایسا چمکیلا اور خوشنما دکھاتے ہیں کہ وہی خاص وعام کو بھاتے ہیں۔ خود بخود وہی باتیں مطابق عقل، وہی باتیں اصول تہذیب، وہی آرام کا سامان، وہی زیبا اور خوشنما اور وہی شان و شکوہ بن کر مصلحت وقت کو نظر آتی ہیں۔ اور وہ اس وقت غیر الفاظ کو فقط ادائے مطلب کا اوزار ہی نہیں سمجھتے بلکہ انہیں بول کر فخر کے چہرے چمکاتے ہیں۔

عزیزان وطن! تقریر کا سلسلہ طول کھینچ گیا۔ اور بات کہیں سے کہیں جا پڑی۔ نقطہ مطلب پر پھر خیال جمانا چاہیے۔ جس کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ موجودہ فارسی کی اصل کیا تھی۔ دوسرے یہ کہ عرب اور ترک کے اختلاط سے اس میں کیا کیا تغیر ہوئے۔ پہلا پہلو دیکھ لیا۔ دوسرے کے لئے کمر باندھنی چاہیے کہ جلسہ آئندہ میں صدی بہ صدی کے رنگ دکھاؤں۔ اور تغیر کے سبب بتاؤں۔ خدا کرے کہ وقت وفا کرے اور فکر یاری دے۔

عرفی دم پیریست قدم دیدہ بنہ ہر گام کہ نے نہی پسندیدہ بنہ
از عینک شیشہ ہیچ نگشاید ہیچ لختے ز جگر تراش و بر دیدہ بنہ

۱

تیسرا لکچر

(19 فروری 1872ء)

زبان فارسی نے اسلام کے بعد کیا کیا رنگ بدلے۔

عزیزان وطن! گزشتہ لکچر میں آپ نے سن لیا کہ جب اسلام کا قدم زمین فارس پر آیا تو فارس کی زبان کیا تھی۔ اس سے پہلے لکچر میں یہ بھی سن لیا کہ جب اقبال نے ملک تسخیر کیا تو زبان نے تقریر و تحریر دونوں پر قبضہ کر لیا۔ تقریباً 3 سو برس تک زبان مذکور موت کی نیند سوتی رہی۔ لیکن دوسری صدی ہجری سے عباسیہ کا دور تھا کہ عیاشی نے خلافت کو سلطنت بنایا۔ اور غفلت نے سلطنت کو ضعیف کرنا شروع کیا۔ دربار میں رنگ رنگ کے مصاحب اور محلوں میں قوم قوم کی عورتیں بھر گئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہر مملکت میں ایک ایک ہمت والا خودسری کی تلوار باندھ کر بادشاہ بن بیٹھا۔ خلفاء فقط دارالسلام بغداد میں تبرک بن کر رہ گئے۔ لیکن قرابت نبوی کا نام درمیان تھا اس لئے حالت مذکورہ نے طول کھینچا۔

زبان فارس کے لئے قدرتی سامان یہ ہوا کہ سامانیوں نے ماوراءالنہر میں قومی سلطنت کا نشان قائم کیا۔ امیر اسماعیل سامانی نے ترکستان، خراسان اور اصفہان وغیرہ پر حکومت پھیلا دی۔ جب تک خاص عرب حاکم تھے تب تک عربی زبان ملکی زبان کو دبائے رہی۔ اب حاکم وقت خود اسی خاک کا پتلا ہوا۔ وہ بہرام چوبیں کی اولاد تھا۔ جس طرح عرب کو اپنی عربی کی محبت تھی۔ اسے اپنے باپ دادا کی زبان کی محبت ضرور ہو گی۔ غرض خواہ اس محبت سے خواہ ملکی مصلحت سے اس نے عربی زبان کی وہ پابندی نہ رکھی ہو گی جو اب تک تھی۔

342ھ میں تمام دفتر فارسی ہو گئے۔ 350ھ کے قریب یہاں تک نوبت پہنچی کہ

منصور سامانی کے وزیر نے تاریخ طبری کا ترجمہ فارسی میں کیا۔ اور رودکی شاعر جسے نظم فارسی کا آدم اول کہنا چاہیے درباروں اور جلسوں میں غزلیں اور قصیدے گانے لگا۔

تھوڑے عرصے کے بعد محمود کا دور آیا۔ اس کے عہد میں بہت تصنیفیں نظم و نثر میں ہوئیں۔ ایک اور تاریخ فارسی میں لکھی گئی۔ پھر تاریخ بیہقی تصنیف ہوئی۔ اس میں محمود اور آل محمود کا دن دن کا حال ہے۔ محمود کے عہد میں عنصری، عسجدی، فرخی وغیرہ فارسی کے بڑے بڑے نامی شاعر تھے۔ فردوسی کا شاہنامہ درفش کاویانی کی طرح اس کی ناموری کا نشان اڑاتا ہے۔ میں اس موقع پر نظم کو قلم نہ چھواؤں گا۔ نظم کی تاریخ کو ایک الگ لکچر پر منحصر رکھ کر اس وقت نثر کے باب میں گفتگو کرتا ہوں۔

تم نے پڑھے طوطے اور بولتی مینا کو دیکھا ہو گا۔ جب تک پنجرے میں ہوتے ہیں سیکھی ہوئی بولیاں بولتے ہیں۔ جب پنجرے سے چھٹ جاتے ہیں تو درختوں پر جاتے ہی اپنا جنگلا بولنے لگتے۔ اس وقت کے تعلیم یافتہ کچھ ایرانی نسلوں سے تھے کچھ عرب کی نسلوں سے خلط ملط تھے۔ کئی سو برس کے بعد جو سیکھی سکھائی زبان چھوڑ کر اپنے عزیز بزرگوں کی بولی بولنے اور لکھنے کا موقع پایا تو طبعی آوازیں پھر نکلنے لگیں۔ ان کا قدیمی انداز تم ابھی سن چکے ہو۔ اب اگرچہ 3 سو برس کی مدت نے محاورہ کو بہت توڑا ہے پھر بھی تازہ تصنیفوں میں دیکھو وہی چھوٹے چھوٹے فقرے اصلی مطلب کو ادا کرتے ہیں۔ سادی عبارتیں استعارہ، تشبیہ اور مبالغہ کی رنگ آمیزی سے پاک ہیں۔ مراوف فقرہ یا مراوف لفظ کا نام نہیں۔ جو ہیں مطلب کی باتیں ہیں۔

میں اس عہد کی عبارتیں بیان کرتا ہوں۔ اور جہاں جہاں انقلاب زمانہ نے اصلاح کی ہے ان کے امتیاز واضح کرتا ہوں۔

ترجمہ تاریخ طبری

این تاریخ نامہ بزرگست کہ گرد آوردہ۔ ابو جعفر محمد ابن جریر یزید الطبری رحمتہ اللہ کہ شہریار خراسان۔ ابو صالح بن منصور بن

این تا تخیست معتبر کہ ابو جعفر محمد ابن جریر یزید طبری فراہم نمود۔ وابو صالح بن منصور ابن نوح ابو محمد ابن محمد بلعمی وز

نوح۔ فرماں داد دستور خود را ابو علی محمد بن محمد البلعمی را کہ ایں تاریخ پسر جریر است۔ پارسی گرداں ہرچہ نیکوتر۔ چنانکہ اندروے نقصانے نیفتد۔

خود را فرماں داد کہ در زبان پارسی بجمال سلاست ترجمہ سازد۔ بنوعے کہ در اصل مطالب نقصانے راہ نیابد۔

پس گوید۔ چوں اندروے نگاہ کردم و بدیدم علمہا دیدم۔ اندروے فائدہ بسیار دیدم۔ پس رنج بردم۔ وجہد و ستم بر خویش نہادم و پارسی گردانیدم بہ نیروے ایزد عزوجل۔

میگوید کہ چوں دروے نگاہ کردم و غور نمودم۔ علمہا دیدم۔ و فوائد بسیار۔ چنانچہ رنجہا بردم۔ و محنتہا کشیدم۔ وبہ نیروے ایزد عزوجل آں را در پیکر پارسی آوردم۔ وبہ توفیق اللہ تعالیٰ۔

وما خواستیم کہ تاریخ روز عالم اندروے یاد کنیم۔ انچہ ہر کسے گفتہ است۔ از اہل نجوم۔ واز اہل ہر گروہے گفتہ اند۔ از گبر و ترسا وجہود و مسلمان۔ ہر گروہے انچہ گفتہ یاد اندریں کتاب۔ بہ توفیق ایزد عزوجل وباللہ التوفیق کہ از روزگار آدم علیہ السلام تا گاہ رستخیز۔

وخواستم کہ تاریخ آغاز عالم انچہ گروہے از اہل نجوم۔ و گبر۔ و ترسا۔ و یہود۔ و مسلمان گفتہ اند۔ دراں ذکر کنم کہ مدت روزگار از آدم تا انجام عالم چہ قدر بود۔

واندریں کتاب محمد ابن جریر ایں حدیث و ما نیز نمودیم تا ہر کہ اندروے نگرد۔ زود اندر یابد و آسان بود۔

ودریں کتاب مطلب مذکور زا مصنف مورخ و من مولف ذکر کردم۔ تا ہر کہ دراں نظر کند زود دریابد۔ و کار دشوار آسان شود

حال افریدوں

پس جہاں بافریدوں درست شد پس سلطنت بر افریدوں مسلم شد۔

کاوہ بر مال و خزینہ کہ حاصل کردہ بود تمام بردے سپرد۔ و لشکر برداشت و گرد جہاں برآمد۔ و ہمہ جہان از مخالف و از ظالم پاک کرد۔ و ہر کجا حرب کردے آں علم پیش داشتے۔ فیروز یافتے۔ مدت بست سال کاوہ گرد جہاں میگشت۔ پس افریدوں اصفہاں و آں ناحیت تمام بکاوہ داد۔ و او باصفہان شد۔ و دہ سال بر ولایت بماند۔ پس بمرد۔

داورا فرزندان بماندند و افریدون ہمہ خواستہ او بفرزندانش داد۔ مگر آں علم کہ بفال مبارک بود در خزینہ نہاد۔ و بہر حربے کہ رفتے آنرا پیش داشتے۔ ظفر یافتے۔ و بعد ازو پاشاہ بپادشاہ ے آمد۔ و عزیزش ے داشتند و ہر یلے پیرایہ و جواہرے چند برآں ے بستند تا وقت یزد گردشاہ۔

چوں مسلمانان خزینہ او غارت کردند۔ او راپیش امیر المومنین عمر خطاب رضی اللہ عنہ آوردند و امیر المومنین بفرمودند تا آں گوہر ہا داشتند و آں پوست راسوختند

و چنیں گویند کہ افریدون از پس کاوہ دویست سال بزیست و جہان پر عدل و داد

و کاوہ بر مال و خزینہ کہ حاصل کردہ بود ہمہ را بوے سپرد۔ پس لشکر برداشت و عالمے را تسخیر نمود۔ و جہان را از دشمن و ظالم پاک کرد۔ و بہر جا کہ جنگ میکرد ہماں علم خود را پیش خود میداشت۔ و فیروزی مییافت۔ مدت بست سال کاوہ گرد جہاں میگشت۔ پس افریدون اصفہاں و مضافات آنرا بہ کاوہ بخشید۔ و او باصفہان رفت و دہ سال فرماں داد و فوت کرد۔

داورا افرزنداں بماندند۔ افریدون تمام اموال بفرزندانش داد۔ مگر آں علم کہ بفال مبارک بود در خزینہ نگہداشت۔ و بہر حربے کہ میرفت پیش میداشت۔ و ظفرے یافت۔ و بعد ازوے بادشاہ بہ بادشاہ ے آمد۔ و او را محترم میداشتند۔ تا عہد یزدگرد شاہ ہر یکے پیرایہ و جواہرے چند برآں ے افزود۔

چوں مسلمانان خزینہ او را غارت کردند۔ علم راپیش امیر المومنین عمر خطاب رضی اللہ عنہ آوردند۔ و امیر المومنین فرمود تا جواہر آنرا برداشتند و چرم را سوختند۔

گویند فریدون بعد از کاوہ دویست سال بادشاہی کرد۔ و کار جہاں را بعدل و داد

کرد۔ مغان گویند آتش پرست بود۔ و ہندواں گویند بت پرست بود۔ و لیکن ایں دو قول درست نیست۔ درست آنست کہ بر دین نوح بود۔ و داوگر بود۔ و علماء و حکما را دوست داشتے۔ و نخست پادشاہے کہ در نجوم نگریست او بود۔ و در علم طب نیز رنج برد۔ و تریاق او ساخت و اول پادشاہے کہ بر پیل نشست او بود۔ و پیل را حرب فرمود۔

و او را سہ پسر۔ مہترین تور نام۔ و میانین سلم۔ و کہترین ایرج۔ پس افریدون ہم بزندگانی خود جہان بر فرزندان قسمت کردہ ناحیت ترک۔ خزر و چین و ماچین۔ و مشرق تور را داد۔ و اورا تغفور نام گرد۔ و زمین روم و روس و آلان و مغرب سلم را داد و او را قیصر نام کرد۔ و اقلیم میان را کہ آں را ایران زمین خوانند عراقین و آذربایجان و پارس۔ و خراسان و حجاز تا حد یمن بایرج داد۔

افریدون او را دوست داشتے و ولایت شہر ایران بنام او خواند۔

آورد۔ مغان گویند آتش پرست بود۔ و ہندواں گویند بت پرست بود۔ و ہر دو قول درست نیست۔ حق آنست کہ بر دین نوح بود۔ و داوگر بود۔ علماء و حکما را بزرگ داشتے۔ و نخست بادشاہے کہ بر نجوم نظر آورد او بود۔ و در گرد آوردن علم طب زحمت کشید۔ و تریاق او ساخت۔ و اول بادشاہ او بود کہ بر فیل نشست۔ و فیلاں را بہ جنگ انداخت۔

او را سہ پسر بود۔ مہترین تور و میانین سلم۔ و کہترین ایرج۔ پس افریدون ہم بزندگانی خود مملکت را بر فرزندان قسمت کرد۔ ناحیت ترک و خزر و چین و ماچین و مشرق تور را داد۔ و اورا فغفور نام کرد۔ و زمین روم و روس و آلان و مغرب۔ سلم را داد۔ و آں را قیصر نام کرد۔ و میانہ اقلیم را کہ ایران زمین خوانند۔ یعنی عراقین و آذربایجان۔ و پارس و خراسان و حجاز تا حد یمن بہ ایرج داد۔

افریدون او را بغایت دوست میداشت چنانچہ ایران را باسم او کرد۔

بلاغت

اس صدی میں انشا پرداز طبیعتیں ترقی کی سیڑھیاں ڈھونڈنے لگیں۔ اصول فصاحت کہ اپنی بہار میں اس خاک سے آگے تھے۔ سب خاک میں مل گئے تھے۔ اب جو اہل استعداد کہ تصنیف کی لیاقت رکھتے تھے فصاحت عرب کے شاگرد تھے۔ اسی کے اصول و قواعد کے چربے فارسی میں اتارنے لگے چنانچہ استاد فرخی محمود کے شاعر دربار نے ترجمان البلاغت صنائع شعری میں لکھی۔ دیکھو عربیت کا کس قدر فخر تھا۔ نام تک بھی اپنی زبان کے لفظوں میں نہ اختیار کیا۔ مجھے اس کا مطالعہ نصیب نہیں ہوا۔ افسوس ہے۔

فلسفہ و حکمت

400 ہجری کے بعد شیخ ابو علی ابن سینا نے حکمت فارسیہ علاء الدولہ ابو جعفر محمد ابن وشمگیر کی فرمائش سے لکھی۔ چنانچہ فرماتے ہیں :۔

☆

فرمودتا کتابے تصنیف کنم بہ پارسی دری کہ اندروئے اصلہا و نکتہ ہائے پنج علم از علمہائے حکمت پیشینگاں گرد آورم بہ غایت مختصر یکے علم منطق کہ او علم ترازوست دوم علم طبیعیات کہ آں علم چیزہاست بہ حس تعلق دارد۔ واندر جنبش و گردش اند سوم علم ہئیت و نہاد عالم وحال وصورت جنبش آسمانہا و ستارگان۔ چنانکہ باز نمودہ اند کہ چوں شائست حقیقت آں دانستن چہارم علم موسیقی و باز نمودن سبب ساز و ناساز آوازہا و نہاد لحنہا پنجم علم انچہ بیروں از طبیعت

فرمودتا کتابے در پارسی دری تحریر کنم دوراں اصول و نکات پنج علم از حکمت قدیمہ در غایت اختصار فراہم آرم۔ یکے علم منطق کہ علم میزانست۔ دوم علم طبیعیات وآں علم اشیاست کہ بہ حس تعلق دارند۔ ودر تغیر و حرکت اند سوم علم ہئیت و وضع عالم۔ وحال صور و حرکت افلاک و انجم۔ چنانچہ شرح دادہ اند کہ چگونہ بدید دانست آنرا۔ چہارم علم موسیقی وسبب سازو ناساز آوازہا۔ و وضع لحنہا۔ پنجم علم انچہ مابعد الطبیعتہ

است۔ وچناں اختیار افتاد کہ چوں پرداختہ شدہ آید۔ از علم منطق خیلت کردہ

است ومناسب چناں نمود کہ چوں از علم منطق فراغ دست دہد۔ از علویات آغاز

☆

آید کہ آغاز علم بریں کردہ شود۔ وبتدریج بہ علمائے زریں شدہ آید۔ بہ خلاف آنکہ رسم است وعادت است۔

کردہ بہ تدریج بہ بیان سفلیات آئیم۔ کہ خلاف رسم وعادت مصنفین است۔

☆ ☆

مجربات آں مقدمات بوند کہ نہ بہ تنہائے خرد بشاید دانستن۔ ونہ بہ تنہائے حس ولیکن بہر دو شاید دانستن۔

مجربات مقدماتے بود کہ نہ تنہا بہ عقل و، تنہا بہ حس تواں دانست بلکہ بہ ہر دو۔

☆ ☆

چنانکہ چوں حس از چیزے ہر بارے فعلے بیند۔ یا او را حالے بیند۔ وہم بارہا چناں بیند۔ داند خود کہ نہ از سبب اتفاق است۔ واز ہمیشہ نبودے۔ و بیشتر ایں حال نہ بودے۔

وطریق علمش چنانست کہ ہر گاہ حس ہر بار صدور فعلے از چیزے بیند۔ یا او را حالے بیند۔ وہر بار ہمچناں بیند۔ داند کہ از اتفاق نیست۔ چہ اگر از اتفاق میبود چناں نمیبود۔ وبیشتر ہمیں حال نمیبود۔

☆ ☆

مثال وے چنانکہ سوختن آتش۔ واسہال کردن سقمونیا صفرا را۔ وہر چہ بداں ماند۔

مثالش چنانکہ سوختن آتش۔ و اسہال کردن سقمونیا صفرا را و امثال آں

☆

متواترات اما متواترات آں مقدماتے بود کہ بہ گفت بسیار کس درست شدہ بود خرد را۔ چنانکہ دانستہ ایم کہ اندر جہاں مصر است وبغداد او۔ ہر چند ندیدہ ایم۔

☆

متواترات مقدماتے بود کہ بسبب گفتن بسیار کس نزد عقل مسلم شدہ باشد۔ چنانچہ بہ یقین دانیم کہ در جہاں مصر ہست۔ وبغداد ہست۔ ہر چند ندیدہ ایم۔

1

و شرائط تواتر آنست کہ اندروے شک نیوفتد۔ وہر چیز یکہ باوے شک تواند اوفتاد کس را۔ آنکس راہنوز تواتر نبود۔

و شرائط تواتر آست کہ در وشک راہ نیابد و ہرچہ دراں شخصے راشک تواں افتاد۔ برائے او ہنوز تواتر نہ باشد۔

☆

پس کے راز سد کہ گوید کہ باید کہ بدیں چیز بگروی کہ حکم وے چوں حکم دیگر چیز

☆

بس کے راز سد کہ گوید۔ بدیں امر یقین آر۔ بدلیل اینکہ حکم وے چوں حکم امر

☆

است۔ ازاں کہ بوے گرویدہ۔

☆

دیگر است کہ بداں یقین داری۔

☆

کہ اگر آنچناں بودے کہ حکم وے چوں حکم آں بودے۔ نتوانستے شک کردن چناں کہ اندراں نتوانستم۔

☆

زیرا کہ اگر حکم ایں چوں حکم آں میبود۔ خود امکان نداشت کہ دراں شک کنم۔ چناں کہ دریں شک کردن نمیتوانیم۔

☆ ☆

وتواتر بہ حقیقت خود یقین افتد چناں کہ مر شنوندہ را حاجت نیاید کہ اندر گویندگاں تامل کند۔

وتواتر بہ حقیقت خود چناں بہ یقین آرد کہ سامع راحاجت نیاید کہ در گویندگاں تامل کند۔

سبب خواب دیدن۔ اما گوشاشپ دیدن ازاں بود کہ قوت متخیلہ تنہا ماند۔ واز مشغول کردن حس مراو را برہد۔ ونفس روئے از حس برواند۔ واز شغل حس فارغ ببود۔ وطبع متخیلہ حکایت کردن است۔ ودر اسکون کم افتد۔ پس گا ہے مزاج تن راحکایت کند۔ چوں صفرا بود رنگہا زرد نماید۔ وچوں سودا بود رنگہا سیاہ۔ چوں حرارت غالب بود آتش نماید۔ وچوں سردی غالب بود یخ نماید۔ وگا ہے اندیشہ گزشتہ را حکایت کند۔ وچوں شود وتباہ شود بہ تباہی آلت۔

عزیزان وطن! یہ موقع وہ نہیں کہ خشک چند سطریں پڑھ دوں اور چپ چاپ نکل جاؤں۔ واجب ہے کہ جہاں تک ممکن ہو۔ حرف حرف میں۔ اس وقت کا۔ اور آج کا فرق دکھاؤں :۔

(1) خیال کرو! اس وقت فعلوں اور اسموں پر (ب) اس طرح لگاتے تھے کہ اب نہیں لگاتے۔

(2) (در) کی جگہ پہلے اکثر۔ (اندر) بولتے تھے۔

(3) پہلے جہاں مصدر بولتے تھے اب ماضی بولتے ہیں۔ اور جہاں ماضی بولتے تھے اب مصدر بولتے ہیں (تجربات میں دیکھو) شاید دانستن۔ اب کہتے ہیں۔ شاید دانست۔ یا تواں دانست (متواترات میں دیکھو) بہ گفت بسیار کس۔ اب۔ یہ گفتن بسیار کس۔ بولتے ہیں۔

(4) (مر)۔ کا استعمال جتنا پہلے تھا۔ اب نہیں۔ چند سطر کی عبارت میں دیکھو (کے) جگہ آیا ہے۔

(5) جن لفظوں کے آخر میں الف ہو۔ پہلے اس کے بعد ایک (ے) بڑھا دیتے

تھے۔ مثلاً جائے۔ پائے۔ اب فقط صفت اور اضافت کی حالت میں بڑھاتے ہیں۔

(6) ماضی شرطی میں پہلے اکثر (ے) مجہول لگاتے تھے۔ اور اسی طرح ماضی استمراری میں۔ لیکن اب اس کا کم استعمال کرتے ہیں۔ اب اس کی جگہ اول میں (ے) لگاتے ہیں۔

(7) پہلے یائے وحدۃ بہت لگاتے تھے۔ اب اور طرح لفظوں کو ترکیب دیتے ہیں (عبارت شیخ) چوں حس از چیزے ہر بارے فعلے بیند۔ وغیرہ وغیرہ۔

(8) پہلے جہاں ضمیر منفصل بولتے تھے اب متصل لگا کر اختصار پیدا کرتے ہیں۔

(9) اب اکثر لفظوں میں تخفیف کرتے ہیں (متواترات میں دیکھو) اندروے شک نیوفتد (اب کہتے ہیں) دراں شک نیفتد۔ (پہلے کہتے تھے) ہرچہ بادے شک تواند او فتاد (اب کہتے ہیں) ہرچہ دروے شک تواں افتاد۔

(10) اب عربی کے لفظ بہت گھل مل کر زبانوں پر چڑھ گئے ہیں۔ دیکھو عبارت مذکورہ بالا کے مقابلہ میں۔

(11) اکثر محاورہ و الفاظ کے پس و پیش میں بھی فرق آگیا ہے۔

(12) پہلے اکثر فارسی کے لفظ کام میں لاتے تھے۔ اب عربی کے لفظ یا مصادر جعلی استعمال کرتے ہیں۔ دیکھو کتاب مذکور میں۔ باب منطق میں۔ جہاں انہوں نے علم کی تقسیم اور تصور اور تصدیق کی توضیح کی ہے۔ وہاں کہتے ہیں :۔

دانستن بر دو گونہ است۔ یکے اندر رسیدن۔ کہ بہ تازی آنرا تصور خوانند۔ چنانکہ اگر کسے گوید۔ مردم یا پری۔ یا فرشتہ۔ و ہرچہ بدیں ماند۔ تو فہم کنی۔ و تصور کنی۔ واندریابی۔ دوم گرویدن چنانکہ بگروی کہ پری ہست۔ و مردم زیر فرمانے ہست۔ و ہرچہ بدیں ماند۔

اب گرویدن کی جگہ۔ یقین اور اذعان استعمال کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ خواب کا بیان دیکھو۔ اسے گوشاسپ لکھا ہے کہ اصلی لفظ زبان فارسی کا ہے۔ خواب پیچھے محاورہ میں آیا ہوگا۔ اور دیکھو یہ مشتق ہے۔ خوابیدن سے اس کے علاوہ ہمانا۔ ایدوں۔ ہمیدوں ایدر۔ وغیرہ وغیرہ۔ اکثر الفاظ عہد مذکور میں تھے۔ سب

رفتہ رفتہ متروک اور محاورہ سے معزول ہو گئے۔

شاہ ناصر خسرو

450ھ کے پس و پیش میں اپنا سفرنامہ۔ کنز الحقائق نثر میں روشنائی نامہ نظم میں اکسیر اعظم علم منطق میں اور چند رسالے اور لکھے۔ یہ فلسفی تھے اور ساتھ اس کے فصیح شاعر۔ سفرنامہ کی عبارت بہ نسبت حکمت فارسیہ اور اس عہد کی اور کتابوں کے بہت صاف اور رواں ہے۔ پھر بھی بعض خصوصیتیں اس عہد کی موجود ہیں جن کا جتانا واجب ہے۔

سمنان کے مقام میں ایک ملا کے درسگاہ میں گئے ہیں۔ اس کا حال لکھتے لکھتے کہتے ہیں :۔

دراثنائے سخن میگفت کہ من بہ استاد ابو علی سینا رحمتہ اللہ علیہ جنہیں خواندم۔ وازوے چنیں شنیدم۔ ہمانا غرض وے آں بود تا من بدانم کہ او شاگرد ابو علی سیناست۔

دیکھو! ہمانا۔ 700ھ کے بعد کم رواج ہو گیا۔ اور بے تکلفی دیکھو! اس وقت صاف کہہ دیتے تھے۔ بہ استاد شیخ ابو علی خواندم۔ اب اس پر لفافے چڑھاتے ہیں اور کہتے ہیں مثلاً۔ خدمت وے چنیں استفادہ کردم۔ بہ حضرت وے عرض کردم۔ واو چنیں افادہ فرمود۔ یا ارشاد نمود۔ وغیرہ کوہ دماوند کے حال میں لکھتے ہیں :۔

بر سر آں چاہے ست کہ نوشادر ازاں حاصل میشود۔ وگویند کبریت نیز۔ مردم پوست گاؤ ببرند۔ و پر نوشادر کنند واز سر کوہ بغلطانند کہ براہ نتواں فرود آوردن۔

دیکھو اب کہتے ہیں۔ بر سر آں چاہیست کہ نوشادر۔ وگویند کبریت ہم ازآنجا حاصل شود۔ شاہ فرماتے ہیں کہ براہ نتواں فرود آوردن (اب کہتے ہیں) زیرا کہ براہ نتواں فرود آورد (اور اگر مصدر ہی استعمال کرنا ہے تو یوں کہو) زیرا کہ فرود آوردن آں براہ۔ از حیز امکان بیرون است۔ یا۔ براہ فرود آوردن امکان ندارد۔

(24 صفحہ میں فرماتے ہیں) بست و سوم شعبان بہ عزم نیشاپور بیروں آمدم۔ د ازمرو بہ سرخش شدم۔ دیکھو! متاخرین۔ شدم۔ بہ معنی رفتم۔ نثر میں نہیں لکھتے۔ بلکہ

نظم میں بھی کہیں خاص ہی موقع پر کہہ جاتے ہیں۔

(34 صفحہ میں فرماتے ہیں) حاکم زمان طغرل بیگ محمد بود۔ برادر چغری بیگ۔ و مدرسہ فرمودہ بود نزدیک بازار سراجان۔ و آنرا عمارت میکردند۔ و او بولایت گیری باصفہان رفتہ بود۔

(اب کہتے ہیں) حاکم آں طغرل بیگ محمد۔ برادر چغری بیگ بود کہ بہ فرمان او نزدیک بہ بازار سراجان مدرسہ عمارت۔ میکردند۔ و خودش بر اصفہان لشکر کشیدہ بود۔ (آذربایجان میں پہنچ کر فرماتے ہیں) مرا حکایت کردند کہ دریں شہر زلزلہ افتاد (اب کہتے ہیں) گفتند۔ یا۔ مردم ہمن نقل کردند کہ بہمیں نزدیکی دریں شہر زلزلہ اتفاق افتاد (یا زلزلہ رو داد)۔

تاریخ بیہقی

500ھ کے پس و پیش میں بیہقی نے بہت سے جزوی جزوی حالات سبکتگین اور اس کی اولاد کے لکھے ہیں۔ عنوان اور اکثر سرخیاں عربی عبارت میں ہیں۔ اور عربی لفظ بھی بہت ہیں۔ یہ کتاب عہد مذکور کی زبان کا نمونہ ہے۔ سبکتگین کے آغاز امارت کے حالات میں سے ایک ماجرا لکھا ہے۔ دلچسپ حکایت ہے۔ اس سے بیان کو دلچسپ کرتا ہوں۔ اور دیکھو گزشتہ صدی کی عبارت میں اور اس میں کتنا فرق ہو گیا ہے۔ ادھر سے اٹھتی ہے اور ادھر کو ڈھلتی آتی ہے۔

☆

جدم گفت چوں از جنگ ہرات فارغ شدیم۔ و سوے نشاپور کشیدیم۔ ہر روز رسم ہماں بود کہ امیر کزکاں و ہمہ سالاران محتشم۔ از آں سامانی و خراسانی بہ	جدم گفت چوں از جنگ ہرات فارغ شدیم بسوے نشاپور رو آوردیم۔ ہر روز رسم ہمیں بود بود کہ امیر کزکاں و ہمہ سالاران محتشم از قبیل سامانی و خراسانی

در خیمہ امیر عادل سبکتگین آمد ندے۔
وسوار بایستاندے۔ چوں وے بیروں
آمدے۔ تابر نشیند ایں ہمہ بزرگان پیادہ
شدندے۔ چوں شدے۔ ہمگناں سوار
شدندے وسوئے منزل کشیدندے۔
چوں بمنزلے رسید کہ آنرا خاکستر گویند۔
یک روز آنجا بار افگند۔ وبسیار صدقہ فرمود
درویشاں را وپس نماز دیگر بہ نشست۔
ودراں صحرا ہا میگشت۔ وہمہ اعیان
باوے۔ وجائے جائے دراں صحراہا۔ وکوہ
پایہ ہا بود۔ وپارۂ کوہ دیدیم۔ امیر سبکتگین
گفت یافتم۔ واسپ بداشت۔ وغلامے پنج
شش را پیادہ کرد۔ گفت فلاں جائے را
بکاوید۔ کاویدن گرفتند ولختے فرورفتند۔ تختے
آہنیں پیدا آمد سطبر چنانکہ ستورگاہ راباشد
حلقہ ازا وجدا شدہ۔ برکشیدند۔ امیر
سبکتگین آنرا بدید۔ از اسپ فرود آمد بر زمین۔
وخدائے را عزوجل شکر کرد وسجدہ کرد۔ و
بسیار بگریست ومصلائے نماخواست۔ و
دو رکعت نماز گزارد۔ وفرمود تا ایں میخ را
برداشتند۔ وبرنشست وبایستاد وبزرگاں
گفتند ایں حال چہ حال است؟ کہ تازہ
گشت۔

گفت قصہ نادر است بشنوید۔

در خیمہ امیر عادل سبکتگین ے آمد ند۔ و
سوارہ ے ایستادند۔ چوں بیروں ے آمد
تا سوار شود۔ ہمہ بزرگان پیادہ میشدند۔
چوں پشت اسپ ے نشست ہمگناں
سوار میشدند و سر بمنزل میکشیدند۔ چوں
بہ منزلے رسید کہ آرا خاکستر گویند یک
روز آنجا مقام کرد۔ درویشاں را بسیار
صدقہ فرمود۔ وبعد از نماز دیگر اسپ
خواست۔ ودراں صحرا باہمہ اعیان لشکر
در نشیب و فراز صحرا امیگشت۔ زمین ہمہ
کوہ پایہ ہا بود۔ تاپشتہ دیدیم۔ امیر سبکتگین
گفت۔ یافتم! وعنان اسپ رانگہداشت۔
پس پنج شش غلام راپیادہ کرد وگفت۔
فلاں جائے را بکاوید۔ ایشاں فرماں بردند
ولختے خاک برآوردند۔ تختے آہنیں پیدا شد
سطبر۔ بنوعیکہ در اصطبل ہا بکار آید۔
حلقہ اش جدا شدہ بود۔ امیر آرا بدید۔ از
اسپ بزمین فرود آمد۔ وشکر بدرگاہ الٰہی جا
آورد۔ وبسیار گریہ کرد۔ پس مصلا
خواست و دو رکعت نماز گزارد۔ من
بعد سوار شد۔ وباز ایستاد۔ بزرگاں گفتند
ایں چہ حال است کہ گاہے ندیدیم۔
گفت قصہ نادار است گوش نہید۔

قصہ کی صورت حال کو بشرح مذکورہ بالا لکھوں تو داستان بڑھ جاتی ہے۔ اس لیے صرف جملہ نقل کرتا ہوں:

پیش ازانکہ من بسرائے الپتگیں افتادم۔ خواجہ کہ ازاں او بودم مرا و سیزدہ یارم را از جیحون بگذرانید۔ و شبرقان آورد۔ وازانجا بہ کزکاناں۔ و پدر ایں امیر آں وقت بادشاہ کزکاناں بود۔ مارا نزدیک او ببرند۔ ہفت تن را جزاز من بخرید۔ و مرا و پنج تن را اختیار نہ کرد۔ و خواجہ ازاں سو بہ نیشاپور کشید۔ و بہ مرد الرود و سرخس چہار کس دیگر بفروخت۔ من ماندم و یارے دو۔ مرا سبکتگین دراز گفتندے۔ و بہ قضائے سہ اسپ خداوندم در زیر من ریش شدہ بود۔ چوں بہ خاکستر رسیدیم اسپے دیگر در زیر من ریش شدہ بود۔ خداوندم مرا بسیار بزدہ بود۔ و زین بر گردن من نہادہ من سخت غمناک بودم از حال و روزگار خویش و بیدولتی۔ کہ کس مرا نمیخرید۔ و خداوندم سوگند خوردہ بود کہ مرا بہ نشاپور پیادہ برد۔ و ہمچناں برد۔ آں شب باغمے سخت بزرگ خفتم۔ در خواب دیدم خضر را علیہ السلام۔ در نزد آمد۔ مرا پرسید و گفت کہ چندیں غم چرا میخوری۔ گفتم از بخت بد خویش۔ گفت غم مدار۔ و بشارت دہم ترا کہ مردے بزرگ و با نام خواہی شد۔ چنانکہ وقتے صحرا بگذری بابسیار مردم محتشم۔ و تو مہتر ایشاں باشی۔ دل شاد دار۔ و چوں ایں پائگاہ بیافتی با خلق خدائے نیکوئی کن۔ و داد بدہ تا عمرت دراز گردد۔ و دولت بر فرزندان تو بماند۔ گفتم سپاس دارم۔ گفت دست مرا دہ۔ و عہد کن۔ دست بدو دادم۔ پیمان کردم۔ دستم نیک بیفشرد۔ واز خواب بیدار شدم۔ و چناں مینمود کہ اثر آں افشردن بر دست من است۔ برخاستم۔ نیم شب غسل کردم۔ و دو نماز ایستادم۔ تارکعتے پنجاہ کردہ آمد۔ و بسیار دعا کردم و بگریستم۔ و در خود قوتے بیشتر میدیدم۔ پس ایں میخ برداشتم و بہ صحرا بیروں آمدم۔ و نشان فرو بردم۔ چوں روز شد۔ خداوندم بارہا نہاد و میخ طلب کرد۔ و نیافت۔ مرا بسیار بہ تازیانہ بزد۔ و سوگند گراں خورد کہ بہ ہر بہا کہ تراخواہند خرید بفروشم۔ و دو منزل تا نشاپور پیادہ رفتم۔ و الپتگیں بہ نشاپور بود۔ بر سپہ سالاری سامانیاں با حشمتے بزرگ۔ و مرا با دو یارم بدو بفروخت۔ و قصہ پس ازاں دراز است۔ تا بدیں درجہ رسیدم کہ مے بینید۔

چہار مقالہ

560ھ کے پس و پیش میں نظامی عروضی نے مجموع النوادر اور کتاب چار مقالہ حکمت عملی اور آداب خدمت ملوک میں لکھی۔ اس کی زبان کا لطف بھی دیکھ لو:۔

دیباچہ بندۂ مخلص احمد بن علی العروضی چہل و پنج سالہ است کہ در خدمت ایں خاندان بہ بندگی موسوم است۔ و خداوند ملک الجبال علاء الدین ابو علی بن الحسین بن الحسین کہ زندگانیش دراز باد در حق من بندہ اعتقاد تمام داشت۔ مگر از مہتر زادہائے امیر عمید صفی الدین ابوبکر روز عید فطر بداں حضرت پیوست۔ و او جوانے فاضل بود و دبیرے نیک دانشے۔ دراں حال من حاضر نبودم۔ در مجلس بر لفظ پادشاہ رفت کہ نظامی رانجوانید۔ امیر عمید گفت نظامی انجا ست گفتند آرے۔ و او چناں گماں برد کہ نظامی منیری ست۔ چوں فرازش رسیدم مرانجواند رفتم و خدمت کردم۔ چوں دور چند در گزشت امیر عمید گفت کہ نظامی نیامد۔ ملک گفت آمد او در مجلس نشستہ است۔ امیر گفت کہ من نہ ایں نظامی را می گویم و آں نظامی دیگر است من ایں رانشناسم۔ پادشاہ را دیدم کہ متغیر شد۔ ورود بمن کرد و گفت غیر تو نظامی دیگر ہست؟ گفتم بلے۔ دو نظامی دیگر ہستند یکے سمر قندی و او را منیری خوانند۔ و یکے نیشاپوری و او را اثیری گویند۔ و من بندہ را نظامی عروضی گویند۔ گفت تو بہی یا ایشاں۔ امیر عمید گفت کہ من آں ہر دو را دیدہ ام و حق المعرفت می شناسم۔ و ایں را ندیدہ ام و شعر ہم نشنیدہ ام۔ اگر دریں معنی کہ رفت دو بیت میگوید طبع او معلوم شود و بگویم کہ کدام بہتر است ملک سوئے من نگاہ کرد و گفت ہاں نظامی! مارا خجل نہ کنی بگو چنانکہ امیر عمید میخواہد۔ قلم برگرفتم ہنوز دور۔ دور بپایاں نرسیدہ بود کہ ایں پنج بیت بگفتم۔ قطعہ

در جہاں سہ نظامیم اے شاہ کہ جہان و زمانہ افغانند
من یکے بندہ پیش تخت شہم واں دو در مرو پیش سلطانند
بہ حقیقت کہ در سخن امروز ہر یکے مفخر خراسانند
گرچہ ہمچوں رواں سخن گویند من شرابم کہ شاں چو درمانند

ایں یکے چوں زہرہ دور افگند ہر دو از کار خود فرد مانند

چوں من ایں بیتہا عرض کردم امیر عمید حرمت کرد و گفت۔ اے پادشاہ نظامیاں را انکار کہ از شعرائے حال از ماوراالنہر وغیرہ کس۔ راندانم کہ بدیہہ چنیں ابیات تو اند گفت۔ شاد باش اے نظامی کہ ترا در بسیط زمین نظیر نیست۔ و باد شاہ از سخن او عظیم برافروخت۔ و بشاشتے در طبع او پدید آمد۔ و مرا تحسین کرد و گفت۔ کان سرب از یں عید تا عید گو سفند کشاں تبو دادم۔ عاملے نفرست۔ چناں کردم و در مدت ہفتاد روز دوازدہ من سرب بدیں دعا گوئے رسید۔ و اعتقاد آں پادشاہ۔ در حق من از یکے ہزار شد۔

500 ہجری کے بعد حمید الدین نصر اللہ نے بہرام شاہ کے عہد میں کلیلہ دمنہ فارسی میں ترجمہ کی۔

مقامات حمیدی

بعض اشخاص کو شوق ہوا کہ عرب کی انشا پردازیوں کے انداز سے فارسی میں ایجاد دکھائیں۔ چنانچہ 550 ہجری میں قاضی حمید ابوبکر نے مقامات حریری پر مقامات حمیدی لکھی۔ اس میں عربی عبارتیں بھی ویسی ہی مقفٰی ہیں اور فارسی زمزموں کو عرب کے الحان میں ادا کیا ہے۔ عبارت کو دیکھو تو لفظی ترجمہ معلوم ہوتا ہے۔ متواتر مترادف الفاظ۔ مشکل لغات۔ اس پر اضافتوں کے الٹ پھیر۔ محاورہ مفقود ہو گیا۔ زبان کو فارسیت سے واسطہ نہیں رہا۔ عربی لفظوں کی یہ بہتات ہے گویا ریگستان عرب سے آندھی اٹھی۔ چند سطریں اس کی بھی پڑھو کہ ذائقہ تو معلوم ہو۔ تازہ ایجاد ہے۔

المقامتہ الخامستہ عشرۃ فے المعزم الکشمیری۔ حکایت کرد مرا دوستے کہ حق مراضعت مہد صغر داشت۔ و نسبت مصاحبت عہد کبر۔ کہ وقتے از اوقات کہ سیمائے عالم غض و تازہ و طری بود و بساط ہاموں استبرق و عبقری۔ ردائے دمنہا کحلی۔ و عبہری۔ و وطائے چمنہا خیری و معصفری۔ رباعی

از برگ گل بسیط زمیں را بساط بود در صبح باد صبح چو باد نشاط بود

در کوزہ مے جو دلبرے اندر نقاب بود در غنچہ گل چو کودک اندر قماط بود

درو قتیکہ عالم چنیں رنگ وبوئے داشت وقدم ہمت عزم جستجوئے۔ اتفاق راہجتازو طاری گزر کردم نہ بروجہ سکون واقامت ونہ بعزم اطالت وادامت۔ گفتم آب ایں خاکہ راچشیدن وایں طرف بزرگوار رادیدن بہ طرف اعتبار واختیار کارے عظیم ودولتے جسیم باشد۔ چوں روزے چند مقام کردم۔ ناگاہ غلق در حلقہ دام افتاد۔

رشید وطواط، جس نے حدائق السحر وغیرہ کئی رسالے بلاغت اور فن شعر میں لکھے اور مدت تک لاجواب شمار ہوتے رہے، 578 ہجری میں مر گیا۔ وہ اسی صدی کی کارگزاری ہے۔

600ھ سے 700ھ تک

تاریخ جہانگشا

علاء الدین علاء الملک نے 600ھ کے بعد لکھی۔ انداز عبارت سب کے یکساں ہیں۔ زبانیں گفتار میں اور قلم رفتار میں چھوٹے چھوٹے فقروں سے مسافت بیان کو ماپ رہی ہیں۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان تصنیفوں میں عربی نے ملاوٹ بہت کی ہے مگر گھلاوٹ نہیں پائی۔ عبارتوں کو پڑھو۔ الفاظ بہت آگئے ہیں مگر یہ حالت ہے گویا پلاؤ میں نمک کوٹ کر ڈالا ہے۔ کسی نوالہ میں ٹھیک ہے۔ کسی میں کنکر سامنے میں آگیا۔ اور کوئی بالکل پھیکا۔ فقروں کی استخوان بندی دیکھی؟ جیسے کوئی گنڈیریاں کترتا ہے۔ مسلسل نہیں۔

یہ سب باتیں درست مگر انشا پردازی کے حق میں یہ انداز بے تکلفانہ۔ خوش نصیبی کا زمانہ تھا۔ اس میں بہت الفاظ عربی کے بھی نہ آتے تھے جن کے سمجھنے میں دقت ہو۔ ناوٹ اور دکھاوٹ ایسی رنگ آمیزی نہ کرتی تھی کہ تشبیہ اور استعاروں کی شدت مطلب کی اصلیت کو گم کر دے۔ غرض یہی تھی کہ مطلب خاص وعام کی سمجھ میں آجائے۔ وہ پوری ہو جاتی تھی۔

گلستان

عجائب اتفاقات سے یہ ہے کہ اسی صدی کے 656ھ میں شیخ سعدی کی زبان پر جوش طبیعت نے ایک چشمہ کھول دیا۔ اس میں فصاحت نے شربت اور سلاست نے دودھ بہایا اور گلستاں ایک ایسی کتاب سرسبز ہوئی جس کا آج تک جواب نہیں۔ ادنیٰ سے اعلیٰ تک کوئی پڑھا لکھا نہ ہوگا جس نے اس سے سبق نہ پڑھا ہو۔ مگر اس عالم میں پڑھا ہے کہ گویا نہیں پڑھا۔ اچھا۔ اب خیال کر کے دیکھو! وہی چھوٹے چھوٹے فقرے ہیں اور کتری کتری عبارت ہے مگر خدا نے اس کے بیان میں گھلاوٹ اور زبان میں ایسا لوچ دیا ہے کہ ریشم کے لچھے مسلسل معلوم ہوتے ہیں۔ صنائع بدائع کی دستکاری نے اسے قلم نہیں لگایا مگر سادگی کے منہ سے پھول پڑے جھڑتے ہیں۔ اس کے ننھے ننھے فقرے آیت اور حدیث کی طرح اب تک تقریروں اور تحریروں کو قوت دیتے ہیں۔ مزا یہ ہے۔ کہ جو چٹخارا زبان کو نظم کے پڑھنے میں آتا ہے۔ وہ اس کی نثر میں آتا ہے کیونکہ اس کی قدرتی فصاحت نظم و نثر کو ایک قالب میں ڈھالتی ہے۔ اس کے لب و دہان کو خدا نے ایسی برکت دی ہے کہ اگر کسی کی عبارت کو اس کی عبارت میں پیوند کر دیں تو صاف ایسا نظر آتا ہے جیسے مخمل کا پردہ پڑا ہے اور اس میں بانات کا پیوند لگا ہے۔

عجیب تر یہ کہ عالم سے عارف اور پارسا سے رند بے حیا تک سب پڑھتے ہیں اور اپنے اپنے مزے لیتے ہیں۔ پھر کیسی طبیعت اور کیسا مزاج لیکر آیا تھا کہ شاہانہ، فقیرانہ، واعظانہ اور نصیحت بزرگانہ، جس مضمون کی حکایت کو چاہو پڑھ لو۔ اس کی شوخی اپنے انداز سے کہیں بھی نہیں چوکتی۔ یہ بھی قدرتی اتفاق ہے کہ حسن قبول نے اسے محبت کے ہاتھوں پر لیا اور شہرت نے ایسا ہر دل عزیز کیا کہ کمال عزت ہوگئی۔ بچوں نے دست مال بنا دیا ہے۔ پھر بھی اہل نظر اور اہل فضل کے دلوں میں وہی عزت و عظمت ہے جو کہ تھی۔ خوبی یہ ہے کہ طبائع مختلف اور مذاق جدا جدا پھر بھی سب ذوق و شوق سے پڑھتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے علماء اور شعرا فضیلت کے زوروں سے اٹھے۔ اور طبیعت کے شعلوں سے چمکے۔ اس کتاب پر کتابیں لکھیں۔ مگر ایک تصویر بھی پوری نہ اتری۔ ملا سعد الدین تفتازانی کہا کرتے تھے کہ ساری مطول مجھ سے لے لیتے اور یہ فقرہ دیدیتے۔ از بستر زمش بہ خاکستر گرمش نشانند۔

بہت سے فقرے نثر ہیں اور نظم کی طرح زبانوں پر رواں ہیں۔ گفت اے درویش! دامن بدار۔ گفت۔ دامن از کجا آرم کہ جامہ ندارم۔

محمود غزنوی کے باب میں کہتے ہیں۔ ہنوز چشمش نگران است کہ ملکش باد گران است۔

ہونہار شہزادہ میدان جنگ میں بہادروں کے دل بڑھاتا ہے۔ اے مرداں بکوشید۔ تا جامہ زناں نپوشید۔

جاڑے کی اندھیری رات میں چور کہتے ہیں۔ چہ حرامزادہ مرد مانند کہ سنگھار ابستہ اندو سنگھار اکشادہ۔

بعض پرانے محاورے بہ نسبت اور فصحائے وقت کے ان کی زبان پر زیادہ چڑھے تھے۔ مثلاً خواجہ ...... خویش۔ خویشتن (بجائے خود) ہمے (تواتر فعل کے لیے)۔ مر (زائد)۔ در۔ اندر۔ اور ب اور بر کا جمع کرنا۔ ع : بے حکم شرع آب خوردن خطاست۔

علوم و فنون

جملہ فنون و علوم بھی اس صدی میں فارسی بولنے لگے۔ اکثر علما نے مختلف علموں میں رسالے لکھے۔ محقق طوسی نے علاوہ عربی تصانیف کے مجسطی اور کئی کتابیں ہیئت میں لکھیں۔ اساس الاقتباس منطق و فلسفہ میں۔ اوصاف الاشراف اصلاح نفس میں۔ اخلاق ناصری حکمت اخلاق میں۔ معیار الاشعار عروض و قافیہ میں زبان فارسی میں لکھی۔ باوجود اس کے جو علماء اپنے رتبہ کی حفاظت ضروری سمجھتے تھے وہ اپنی کتاب کو عربی زبان میں شان و شکوہ دیتے تھے۔ اخلاق ناصری کے دیباچہ کا ایک فقرہ میرے خیال کی سند ہے۔ محقق موصوف کہتے ہیں کہ ایسے عمدہ مطالب کو ایسے ہلکے اور بودے کپڑے پہنانے مناسب نہ تھے مگر بادشاہ وقت کی فرمائش تھی اس لیے تعمیل کی گئی کہ فائدہ عام ہو۔

اخلاق ناصری کی عبارت کا اندازہ دیکھو۔ وہی چھوٹے چھوٹے فقرے برجستہ متین اور سنگین عبارت ہے۔ عربی الفاظ نے زبان پر قبضہ کر رکھا ہے اور یہ حالت خبر

دیتی ہے کہ جو اس وقت فارسی بولتا یا لکھتا ہوگا عربی الفاظ کو عزت کا سامان سمجھ کر کرسی کلام پر بٹھاتا ہوگا۔ ان کی تصنیف میں یہ خصوصیت تھی کہ اکثر حرف ربط اور بعض فعل آخر جملہ سے محذوف ہوتے تھے۔ ایک خصوصیت اور بھی تھی اور وہ اس چند سطر عبارت میں نہیں ظاہر ہو سکتی۔ یعنی ان کی قدرت کلام اکثر عربی محاوروں کو فارسی میں لفظی ترجمہ کر دیتی تھی۔

عبارت اخلاق ناصری

چوں از تہذیب ایں دو قوت فراغت یابد۔ بہ تکمیل قوت نظری مشغول باید شد۔ وترتیب دراں رعایت باید کرد و اول کہ در تعلم شروع نماید خوض در فنے باید کرد کہ ذہن راازضلالت صیانت کند و بطریق اقتباس معارف ہدایت کند۔ پس در فنے کہ وہم را باعقل در قوانین آں مساعدت باشد۔ و تحیر و خبط را دراں مجال نہ باشد۔ تا ذہن را ذوق یقین حاصل شود۔ و ملازمت حق ملکہ کند۔ وبعد ازاں بحث بر معرفت اعیان موجودات و کشف حقائق واحوال آں مقصور باید گردانید وابتدا از مبادی محسوسات باید کرد۔ و بمعرفت مبادی موجودات ایں بحث بانتہا باید رسانید۔ وچوں بدیں مرتبہ رسد۔ از تہذیب ایں سہ قوت فارغ شدہ باشد۔ بعد ازاں بر حفظ قواعد عدالت توفر باید نمود۔ واعمال و معاملات بر حسب آں طبیعت مقدر باید گردانید۔ وچوں ایں دقیقہ نیز رعایت کند۔ انسانی بالفعل شدہ باشد۔ واسم حکمت وسمت فضیلت اورا حاصل آمدہ باشد۔ پس اگر خواہد در سعادات خارجی وسعادات بدنی اہتمام نماید۔ نور علی نور بود والا باری مہمات را معطل نہ گزاشتہ باشد و بفضول مشغول نبودہ باشد۔

جب کسی مسئلہ کے یاد رکھنے کو تاکید کرتے ہیں تو کہتے ہیں۔ بر تو باد۔ یہ بعینہ ترجمہ ہے عربی محاورہ کا مثلاً علیکم حسن الخط۔ و علیکم حفظ القرآن۔

کبھی ایک حکیم کا قول لکھ کر توضیح کرتے ہیں۔ یا کسی اور عالم کا اختلاف رائے لکھتے ہیں اور آخر میں کہتے ہیں۔ و معنی ہمین است کہ یاد کردیم۔ یہ عربی کا محاورہ ہے والمعنی ما ذکرنا۔ و معنی ہمین است کہ بیان کردیم یا گفتیم۔

کبھی کہتے ہیں۔ چنانچہ یاد کردیم قبل ازیں۔ عربی کا محاورہ ہے۔ کماذکرنا قبل ذلک۔ (اب کہتے ہیں) چنانچہ پیش ازیں گفتیم یا بیان کردیم۔

عزیزانِ وطن! اقلیم سخن کا سیاح صدی بصدی تغیرات زبان کے عالم دیکھتا چلا آتا تھا۔ جب 700ھ کی حد پر پہنچا تو ملک سخن کی ہو بدلی اور انشاپردازی کے فلک پر انقلاب عظیم کے آثار نظر آنے لگے۔ سلسلہ کلام بھی طول پکڑ گیا ہے۔ اگر آئندہ کی تبدیلیاں آج ہی دکھائی جائیں تو کلاموں کے خلط ملط میں طبیعتیں الجھیں گی۔ مسافر آج یہیں مقام کرتا ہے اور مطالب آئندہ کو جلسہ آئندہ پر ملتوی رکھتا ہے۔ یار باقی و صحبت باقی۔

چوتھا لکچر

(یکم مارچ 1877ء)

فارس کی زبان مروجہ میں دوسرا انقلاب

700ھ۔ فارس کی زبان اپنے فرزندوں کے لیے سلیس اور فصیح قالب ڈھال رہی تھی۔ ایجادی قوتیں خیالات کی ہوا میں پاک روحوں کی طرح اڑتی پھرتی تھیں اور ظہور کے مواقع ڈھونڈتی تھیں۔ اس عالم میں ترکان چنگیزی کا قبضہ ملک پر ہو گیا تھا۔ زبان کے لیے بڑا خطر تھا۔ خوش نصیبی تھی کہ سر لاکھوں کٹ گئے۔ مگر زبان بچ گئی۔ وہ خونریز جاہل تھے۔ زبان تاتاری تھی۔ اور چینیوں سے ملتی جلتی لکیریں حرفوں کی بھی کھینچتے تھے۔ آج ان کی تحریروں کے نمونے چاہو تو معدوم ہیں۔ چنگیز کی طبیعت میں قواعد و قانون کے ایجاد کی قوی طاقت تھی۔ طورۂ چنگیز خانی کے کچھ کچھ ترجمے ہیں۔ فتحیاب لڑکے صاحب ملک اور صاحب زبان تھے۔ ان کی حب الوطنی اور بلند نظری فارس کی زبان کو مخالفت کے کانوں سے سنتی تو عجب نہ تھا۔ لیکن ان کی زبان کے لیے نہ مذہبی رعایت تھی نہ علمی طاقت تھی۔ اس لیے ملک کی زبان کو روک نہ سکی۔

چنگیز خود ایک ملک گیر بادشاہ تھا۔ اولاد کو ملک داری بھی کرنی پڑی۔ بلند ہمتیں ایران میں اپنی ناموری کے ایوان سجا رہی تھیں۔ نہیں بلکہ سلطنت کی بنیاد کو مضبوط کرتی تھیں۔ وہ اس وقت ایران کے علوم و فنون کو سلطنت کا موید سمجھ کر ایرانی عالموں اور کاردانوں کی پرورش کرنے لگے۔ چنگیز کا پوتا ہلاکو خاں تھا۔ اس کی علمیت نصیر الدین محقق طوسی کے دامن میں پلی تھی اس لیے علوم و فنون کا تربیت اور پرورش کرنے والا تھا۔ اس کے عہد میں ہر فن کے فاضل اور ماہر مصنف جمع ہوئے۔ مراغہ میں رصد خانہ تعمیر ہوا۔ زیچ لکھی گئی۔ منطق۔ فلسفہ اور اس کی تمام شاخیں عرب سے آکر

فارس کی خاک میں سر سبز ہوئیں اور اکثر چنگیزی نسل کے دماغ انہی خیالات سے روشن رہے۔

اقبال مندوں کے دربار میں علوم وفنون کے ساتھ ساتھ انشاپردازی بھی امیدوار آئی۔ انہوں نے فقط امید کا پیٹ نہ بھرا بلکہ ذوق شوق کو چمکا کر تصنیفات کے میدان کھلوادیئے۔ اس سے اقلیم سخن میں انقلاب عظیم نمودار ہوا۔ زمین آسمان اور آسمان زمین ہو گیا۔ عالم صورت کے تماشبین اسے زبان فارسی کا نوروز کہیں گے۔ کیونکہ استعارہ اور تشبیہ کی گلکاری اور خیالات بہاری گل بلبل نغمہ، چمن گلشن سبزہ شبنم مے جام صراحی وغیرہ وغیرہ سے کاغذی تختے گلزار نظر آتے ہیں۔ مگر آزاد تم سے کہتا ہے کہ اندر کچھ نہیں۔ وہ حقیقت میں لفظوں کی بہار تھی اور معنوں کی خزاں۔

700ھ۔800ھ

699ھ میں عبداللہ وصاف ابن فضل اللہ نے غازان خاں شاہزادہ چنگیزی کے لیے تاریخ وصاف لکھنی شروع کی۔ حقیقت میں بڑا زور مارا ہے اور فارسی اور عربی زباندانی کا حق ادا کر دیا ہے۔ مگر فقط لفاظی اور لغت بازی ہے۔ عربی فارسی ترکی لفظوں کا حشر برپا ہے۔ استعارہ اور تشبیہ نظم میں سو برس پہلے رنگ دینے لگے تھے۔ نثر میں بہت کم تھے۔ انہوں نے اس قدر بہتات کی کہ مطلب گم ہو گیا۔ عبارت کو مقفیٰ کیا۔ اور ہر فقرے پر اس کا ہم معنی فقرہ اور سوار کیا۔ ہر صفحہ میں دو دو تین تین عربی شعر اور عربی عبارتیں۔ کہیں کہیں کئی سطریں، آدھا صفحہ، اور زیادہ بھی لکھ جاتے ہیں۔ اس کا سبب یہ تھا کہ غازان خاں کی حکومت کنارہ ایران سے سرحد مصر تک پھیلی ہوئی تھی۔ خاک عرب کا اثر ضرور ظاہر ہوتا تھا۔ ترکی الفاظ کیوں نہ آتے۔ ترک جوں میں بیٹھ کر لکھتے تھے اور ترک بادشاہ کے دربار میں کھڑے ہو کر سناتے تھے اور چونکہ فاضل تھے۔ صاحب زبان تھے۔ آمد طبع کا دروازہ کھلا ہوا تھا اس لیے کہیں چھوٹے کہیں بڑے بڑے فقرے لکھ کر لمبے لمبے ہاتھ مارتے تھے۔

یہ افسوس بھی یہیں سے شروع ہوتا ہے کہ فقرے طولانی ہو گئے۔ مطالب

صنائع و بدائع۔ تشبیہ و استعارہ میں الجھ کر پیچ در پیچ ہو گئے۔ لغات کی بہتات لفظوں کے مبالغے اصلیت حال پر پردہ ہو گئے۔ زبان بیان واقعیت میں اپاہج ہو گئی۔ وہ چھوٹے چھوٹے فقرے، کلام کا اختصار، بے تکلفی سادگی اور حقیقت نگاری کا وصف ایسا گیا کہ آج تک ملک کی زبان میں اس قصور سے ملکوں میں بدنام ہے۔

تغیر مذکور کا چھ سو برس تک دور رہا۔ تیرہویں صدی کے ہجری کے اخیر میں ناصر الدین شاہ بادشاہ ایران نے ملک کی تعلیم و تہذیب کو بدلا اور تصنیفات کو نئے قالب میں ڈھالا۔ اب زبان فارس کے دامن سے یہ دھبا دھویا جائے گا کہ اس میں اصلیت کے ظاہر کرنے کی طاقت و لیاقت نہیں۔

تاریخ وصاف (از صفحہ ،281)

ذکر جلوس بایدو خان۔ چوں امر کیختاتو خاں را ہلاک کروند۔ ودامن امانی اور لبد ست فنا چاک۔ طغاچار توئین و دیگر امرا بحضرت بایدو پیوستند۔ و نجابت او نچاکاہ دادہ سلسلہ مطاوعت در ہم بستند۔ واز اطراف پادشاہ زادہ گان و خواتین و لشکریان بصوب حضرۃ از مقام خود توجہ نمودند۔ پس آقبو قاو تماچی وسر تاق را باجمعے کہ ایناقان کیختاتو خان بودند۔ از حکم یرلیغ بیاسا[21] رسانیدند۔ و طایجو را در بندگی حضرۃ احضار کردند۔ و سخن پر سیدہ۔ پادشاہ فرمود کہ کیختاتو ترا چنداں قربت و مکنت بخشید۔ و نہال تربیت تو بآب اصطناع بالاکشید۔ و ثمرۂ عنایت او جہانیاں را ظاہر گشت۔ تا او را روزے بکار آئی۔ در زمان شدت از روئے مردی و مروت یک لحظہ با او ثبات نہ نمودی۔ از تو دیگرے چہ توقع دارد۔ و او را نیز از عقب دیگراں بموضعے کہ مراجعت ممکن نیست روانہ کرد۔ و حسن را ہمیں گناہ مواخذت فرمود۔ بلے جان او را بہ بخشید۔ آیت طغلی در الاطاق ہنگام عربدہ کیختاتو خان حکم فرمان بے ادبی نمودہ بود در یارغو[22] حاضر گشت۔ جوابے درست درشت بے دہشت وکان منه العقول بالجد دہشت عرضہ داشت کہ آنروز کیختاتو خان بر تخت خانیت متمکن بود اگر بر قتل اقدام فرمودے امتثال واجب بودے۔ اجمام[23] نا ممکن۔ امروز نیز بندۂ بادشاہم۔ اگر سیور غامیشی[24] فرماید۔ و بر بندہ خود بہ نیم جانی منت نہد۔ با

ہر کہ اشارہ رود جہاں انقیاد واجب دانم۔ پادشاہ جواب معقول او را پسندیدہ فرمود۔ وآنچا قضیہ ان کان الکذب ینجی فالصدق انجی صادق آمد و معنی فکاك المرفی الصدق متحقق وقال الواثقی۔ العفوالی المقرا سرع منه الی المصر سیور غامیشی فرمودہ خدمتے کہ تا غایت مباشرآں بود مشغول گشت۔ دو حشتے کہ صادر شدہ بود۔ دوجہ خلاص ازاں متعذر مینمود وسیلت قربت و موجب مزید اعتماد شد۔ پادشاہ درماہ جمادی الاولی من السنہ در حدود ہمدان فراز سرپر خانیت را جلوس مبارک بیاراست در وقتے کہ از تاثیر اعتدال زمان ایں بیت چوں ورد مضاعف ور دزبان پیر وجواں بود۔

رایت ازهارها بالطل ممتزجا　کانها خنخود حف بالعرق
نسیم روضتها مسک و تربتها　کانها مزحت بالعنبرالعتق

وباے جواں گلرنگ ہمولفہ:

پیراں چنگ پشت و جواناں چنگ زلف　درچنگ جام بادہ و درگوش بانگ چنگ

زہاب چشمساران۔ چوں اشک دیدہ عشاق بروے خاک بکشاد۔ شگوفہ در شگفت از سر سبزی بہار۔ دندان تبسم سفید کرد۔ وقمریان آہنگ شاخسار چنار دوید۔

وحماء العلاط یضیق فوها　بما فی الصدرمن صفته العزام
هم به صبح و هم بشام ع بشمن غضا فملن الی بشام زمین

مینا رنگ وزمان مینوش گشتہ۔

پھر ایک پورے ورق میں بہار کا سماں اسی قسم کے فقروں سے دکھا کر کہتا ہے۔ بدیں منوال چوں روزہا از مجلس بزم انس۔ تمتع یافتند۔ شاہزادہ لیغہا را در صحبت ایلچیاں بتمامت بلاد و ممالک فرستادند کہ چوں کٹاتو از ترتیب اسباب ملک داری اعراض نمود۔ ویاساء چنگیز خانی دگر کرد۔ باتفاق آقا25 و اینی26 و خواتین و امرا او را برداشتم۔ وغیرہ وغیرہ۔

تاریخ بناکتی

اس صدی میں بھی جو مصنف اپنی معلومات سے خاص و عام کو فائدہ پہنچانا مد نظر

رکھتے تھے وہ سلیس عبارت سے کام لیتے تھے چنانچہ فخر الدین بناکتی نے 730ھ کے قریب ایک تاریخ لکھی۔ وہ آج تک اپنے تمکین و اعتبار سے قابل تعریف ہے۔ اس میں سلاطین خطا، اقصائے ہند، یہود اور قیاصرہ روم کے حالات ایسی تفصیل سے بیان کیے ہیں کہ کسی نے نہیں لکھے۔

ہندوستان میں بھی تصنیفات کا سلسلہ جاری تھا۔ ضیاء برنی اور سراج عفیف نے تاریخ فیروز شاہی منہاج السراج نے طبقات ناصری لکھی۔ یہاں کے مصنف یا خراسانی تھے یا ترک۔ ان سے ہندوستانی نسلیں بھی نکلی تھیں۔ وہ اب بھی باپ دادا کی مقلد تھیں اور یہی ان کے لیے بڑا کمال تھا۔ چنانچہ ساتویں صدی تک جو تصنیفات ہیں ان کا قدیمی انداز ہے۔ پھر ہندوستان کی خاک نے اپنے جوش نئے انداز سے نکالے۔ امیر خسرو کے والد ترکستان سے آئے تھے۔ انہوں نے ہندوستان میں ولادت اور تربیت پائی تھی مگر دماغ وہ لائے تھے کہ ایجاد مضامین کا طلسم خانہ تھا۔ انہوں نے صنائع لفظی و معنوی کا عجائب خانہ کھول دیا۔ فارس کے اجناس میں ہندوستان کی میناکاری خرچ کی۔ نظم سے درگزر اور نثر پر نظر کر کے کہتا ہوں کہ صفحے کے صفحے دیکھو۔ فقط لفظوں کی چنان و چنیں ہے۔ اسے سرکا دو تو کچھ بھی نہیں ہے۔

اعجاز خسروی

688 صفحہ کی موٹی کتاب ہے مگر اول سے آخر تک ایہام۔ مراعات النظیر۔ طبقات۔ تضاد۔ وغیرہ وغیرہ صنائع و بدائع میں لغت بازی اور جگت بازی کا مینہ برس رہا ہے۔ اس دھواں دھار میں تاریخی آگاہی۔ اخلاقی تاثیر۔ علمی مسائل۔ مذہبی ہدایت کچھ نظر نہیں آتی۔ لفظوں ہی لفظوں میں ساری دنیا تمام ہے۔ مثلاً اول ایک سرخی لکھیں گے:۔

نسبتش ہم زدبیری

بنگر۔ بدانکہ الفاظ بسیار است؛ اما لفظے چند کہ بدیوان انشا و اصحاب شغل اختصاص

بیشتر دار و بازی نمایم کہ از یں بیش نگنجد۔ انجا طغرائے پادشاہ قطار علمہائے سیاہ را ماند کہ برائے فتح نصب شوند۔ الفہائے طغرائے سلطان را در عمارت عالم ایستادیست کہ اگر سقف آسمان خلل آرد ستونہا آں توانند شد۔ بادشاہ عہد ہنگام جلوس برائے نشاندن سکہ توقیع از خدا یاری میخواست از فتح باب آسمانی آواز آمد کہ نصر من اللہ۔ بادشاہ متوکل باقوت۔ توکلت علی اللہ را در قالب ملک افگندہ است۔ و توقیع نام نہادہ۔ و توقیع سلطان جان بادشاست ہی کہ در کالبدش توقیع کردہ اند۔ توقیع شاہنشاہی بے علت توقیع بقائے لبدی میشد۔ ملک باربک کہ لسان السلاطین است کامرانی او بفرمان کامگاری آنست۔ فلاں خانزادہ در سن سی و دو۔ لسان السلاطین شد۔ مومناں را از آتش خلاص نیست مگر بہ پروانہ رسالہ محمد وکیل در خدائے بادشاہ مالک وکیلد ر رابر سالت کافراں رواں میشد تا ایشیاں را برسالت رسول دعوت کند۔ امید است کہ ہمہ مسلمان شوند۔ زیراکہ در ادا گوئی وحی می گزارد۔

غرض یہ کتاب اپنے لغات و الفاظ اور غیر مشہور اصطلاحوں سے عام لوگوں کے بس کی نہیں اور خاص اشخاص کو ان کے کاروبار اجازت نہیں دیتے کہ گراں بہا وقت کو کوہ کنی اور کاہ برآری میں صرف کریں۔

خزائن الفتوح تاریخ ہے مگر اس میں بھی وہی ہت کھنڈے چلے جاتے ہیں۔ صفحہ صفحہ دو دو صفحے جگت بازی کر کے آدھی سطر کام کی آتی ہے۔ مجھے چند پھولوں کے لالچ نے اس ریگستان میں۔ اس سرے سے اس سرے تک گھسیٹا اور اس لیے کہ پھر کسی تاریخی نکتہ کے لیے خاک نہ چھاننی پڑے دوبارہ اس کا خلاصہ لیا۔ پھر بھی حق سے نہ گزروں گا۔ ان مبالغوں اور فضولیوں میں بھی بعض بعض فقرے ایسے ٹپک گئے ہیں کہ ہزار خون جگران پر قربان ہیں۔ اس قسم کی تصنیفیں وہ انشا پرداز لکھتے تھے جنہیں شہرت کی خوشی آگے ہرے باغ دکھاتی تھی۔ یا قدر دانی درباروں کی طرف بلاتی تھی۔ ادائے مطلب۔ اور عام ضرورت کے پورا کرنے والے اب بھی اپنی کتابیں بے تکلف اور عام زبان میں لکھ رہے تھے۔ چنانچہ نظام الدین بیضاوی نے نظام التواریخ۔ حمد اللہ مستوفی نے تاریخ گزیدہ۔ خواجہ رشید الدین نے جامع التواریخ رشیدی۔ اسی طرح

لکھی جس طرح باتیں کرتے تھے۔

771ھ کے پس و پیش میں امیر تیمور اٹھے۔ علماء و فضلاء کی خوب قدردانیاں کیں۔ اگرچہ دربار سے لیکر لشکر تک ترکی ہی ترکی تھی لیکن ایک توزک اپنی فارسی زبان میں مفصل لکھوائی اور خود اپنے ملفوظات ترکی زبان میں لکھے۔ اکثر فرمان اور مراسلے ترکی میں جاری ہونے لگے۔ ان کی زبان بھی فقط قومی زبان تھی۔ وہ مذہبی برکت یا علمی دولت سے مفلس تھی۔ زبان فارسی ایسے قلاش سے کچھ لینا نہ چاہتی تھی۔ ترکی بھی فارسی پر اتنا ہی زور کر سکی کہ اس میں اکثر لفظ ترکی ملا دے اور اس کی ملنسار طبیعت نے بے تکلف انہیں جگہ دی۔ تیمور کی دوسری توزک بڑی مبسوط کتاب ہے۔ دونوں میں لفظوں سے بڑھ کر جا بجا چھوٹے چھوٹے فقرے ترکی آتے ہیں اور چونکہ بے تکلف عبارت میں ہیں اس لیے وہ مزا دیتے ہیں۔ چنانچہ اس کے ایک جلسہ مشورت کی گفتگو نقل کرتا ہوں۔

کنگج در تسخیر دار الملک ہندوستان

دراول حال بر سبیل مزاجدانی از فرزندان عظام و امرائے ذوی الاحترام کنگج در ملک ہندوستان خواستم۔ امیر زادہ سلطان محمود گفت کہ ہندرا میگیریم لیکن چہار حصار است۔ اول دریا و شہرہا۔ ودوم جنگلہا و بیشہ ہا۔ سوم سپاہ سلاح دار۔ چہارم فیلان آدمی شکار۔ امیر زادہ رستم گفت کہ در قوانین ترک خواندہ ام کہ چہار بادشاہ عظیم الشانند کہ از بزرگی ایشیاں را بنام نمیخوانند۔ بادشاہ ہندرا رلو میخوانند۔ وبادشاہ روم را قیصر۔ وبادشاہ چین وما چین و ختا را فغفوری نامند۔ وبادشاہ ترک را خاقان میگویند۔ وبادشاہ ایران و توران را شہنشاہ می نامند۔ و شہنشاہ را ہمیشہ حکم بر ہندوستان جاری بود۔ وچوں ایران و توران در تصرف ماست لازم در کیم ہندوستان بذہ مسخر اولسون۔ وامیر قراچار وامیر جہان شاہ۔ و امیر خداداد گفتند کہ ہندرا میگریم لیکن اگر اقامت نمائیم نسل ماگم شود و اولاد و احفاد ما از ترکیت برآیند۔ و ہندی زبان شوند۔ ورفتہ رفتہ باہل ہند مخلوط شوند۔ ونام مغلی از ما منقطع شود۔ واسلام و شریعت را فراموش کنند۔ چوں ایں سخن را شنیدم بسیار ایں سخن در من اثر

کردو او را تحسین کردم۔ درویش بجو سیدم اماچوں در تسخیر و گرفتن ہند عزیمت نمی بودم نخواستم کہ ترک عزیمت خود کنم۔ درجواب ایشاں گفتم کہ بہ تنگری تعالیٰ متوجہ میشوم۔ واز قرآن فال میکشایم تابہ ہرچہ حکم تنگری تعالیٰ باشد بداں عمل نمایم۔ ایشاں ہمہ قبول کردند۔

سلاطین چنگیزی و تیموری کی بدولت ترکی کا اتنا اثر ہوا کہ بادشاہی عہدے، مہینوں اور برسوں کے نام۔ مشہور معرکوں کے اشارے۔ ان کے رسوم ورواج کے حوالے فن انشا میں آئے۔ یغما۔ تمغا۔ سنگ یدہ۔ ترکوں کی ترکتاز۔ ان کی زدوبرد اور تیر اندازی آئی۔ مغان و مغبچگان کی جگہ ترکوں اور ترک بچوں کا حسن آیا۔ ترکان یغمائی۔ ترکان ختائی۔ بتان فرخاری وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح استعاروں میں ترک چشم اور ترک نگاہ وغیرہ وغیرہ استعارے اور تشبیہیں فن انشا کے لیے باعث زیبائی ہوئے۔ ایران میں اگرچہ گاؤں کے گاؤں اور شہر میں محلے کے محلے ترکوں سے آباد ہو گئے مگر آپس میں ترکیاں اڑاتے رہے۔ ملک کی زبان فارسی رہی۔ البتہ ماوراالنہر میں سمرقند وبخارا۔ خیوہ کوکان وغیرہ کل ملکوں کی زبانیں ترکی ہو گئیں۔

آل تیمور کی سلطنت میں تصنیفات کو بہت ترقی ہوئی۔ کیونکہ انھیں عربی زبان کا سمجھنا بہت دشوار تھا۔ اس لیے فارسی کی تصنیفوں اور ترجموں پر زیادہ متوجہ ہوئے جس طرح ان کے انعام واکرام نے امیدوں کے دامن بھرے۔ اسی طرح مصنفوں نے کتب خانے بھرے۔

800اور900ھ

اس صدی کے شروع میں میر شرف الدین علی یزدی ایک فاضل تبحر تھے۔ باوجود اس کے موزوں طبع۔ رنگین خیال تھے۔ زمانہ کی ہوا سے ان کی طبیعت مطابق اور قسمت موافق تھی۔ شاہزادہ ابراہیم ابن شاہرخ مرزا نے بڑی فرمائش اور نہایت التجا سے دادا کے کارنامے ان سے قلمبند کروائے بادشاہی دفتروں سے روزنامچے نکالے گئے۔ تیموری کہن سال ڈھونڈ ڈھونڈ کر بلائے گئے۔ چنانچہ میر موصوف نے 4 برس کاغذ پر

خون جگر ٹپکایا۔ اس نے ظفر نامہ تیموری نام پایا۔ انشا پردازی کے دیندار آج تک ان کا نام ادب سے لیتے ہیں اور ان کی کتاب پر تعظیم و تعریف کے چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔

انھوں نے وصاف کی لغت بازی کو ہلکا کیا۔ عربی شعر موقوف کیے۔ عربی عبارتیں کم کیں۔ پھر بھی ہر مقدمہ کی ابتدا میں ایک تمہید ہے۔ مترادف الفاظ فقروں کا پھیلاؤ' استعارات اور عربی لغات سے مطلب میں مبالغہ اور عبارت میں شور و غل پیدا کرتے ہیں۔ جملے مقفیٰ اور ایک پر دوسرا اہم معنی فقرہ سوار ہے۔ مگر اس خوبی کو بھولنا بھی نہ چاہیے کہ زبان محاورہ سے دست و گریبان ہے۔ گویا وصاف نے جس طرز کی بنیاد ڈالی تھی انھوں نے اسے ایسا خوشنما دکھایا کہ رواج عام ہو گیا۔ لفظوں کی بہتات اور طولانی فقروں کو طبیعت کی آمد کہنے لگے اور استعارہ و تشبیہ کے ساتھ بہاریہ اور عاشقانہ خیالات کا رنگین کلامی اور معنی آفرینی نام ہوا۔

عبارت کا نمونہ:

گفتار در رزم حضرت صاحبقران با سلطان محمود نبیرہ فیروز شاہ والی ہندوستان و ظفر یافتن بر ایشاں۔

چوں صاحبقران دیں پرور بر وفق مضمون
بگیر قبضہ شمشیر عدل و جنبش کن
بر آب گرد ہمہ ہند پادشا آسا

روئے ہمت بلند بہ نیت جہاد بصوب ممالک ہندوستان نہاد و بہر دیار کہ رسید جنود فتح و ظفر باستقبال موکب ہمایونش استعجال نمودوے قلاع مسخر فرمود۔ در ہفتم ربیع الثانی روز سہ شنبہ کہ بہ ترک فلک فیروزہ فام بہرام خوں آشام منسوب ست علی الصباح کہ خاقان مشرقی انتساب آفتاب در معرکہ سپہر رایت طلوع بر افراخت و سپاہ شاہ سیاہ چہر شب را ہزیمت دادہ جہاں پناہ گردوں و کہنہ دہلی دہر بو قلموں را از وحشت ہندو نژاد ان ظلمات بپرداخت۔ خورشید رائے کشور کشائے حضرت صاحبقرانی از مطلع تائیدات آسمانی بر آمدہ پرتو التفات بر قہر دشمن و ترتیب سپاہ انداخت۔ بسعادت و اقبال سو

ارشد و صفوف عساکر ظفر قرین بعون خیر الناصرین بر حسب اشارت اصابت شعار از برنغار و جرنغار و قول والتمش و ہر اول بفر شکوہ شاہزادہ کامگار پیر محمد جہانگیر و سائر امرائے نامدار انتظام گرفت و ماچہ رایت نصرت آیت حضرت صاحبقران از اوج قلب بطالع فرخندہ بر آمدہ انوار فتح و فیروزی بر مفارق ہمگناں گسترد۔ لشکرے آراستہ گشت کہ تا جمشید خورشید شہسوار مضمار چہارم است و میدان آسمان جولانگاہ شاہ ماہ و سپاہ انجم۔ چشم زمانہ بر چناں انبوہے نیفتادہ و سپاہے باں کثرت روئے جلادت بر زمگاہے ننہادہ:

فراواں سپہ جمع شد پیش ازیں ندیدہ کسے لشکرے بیش ازیں

وبدیں نسق و ترتیب پیش راند تو از جانب سپاہ مخالف سلطان محمود نبیرہ سلطان فیروز شاہ با جماعتے از سروران ہندو سارے سپہ سالاران آں سرزمین صف ہا آراستہ یادہ ہزار سوار و چہل ہزار پیادۂ جنگی با اسباب و آلات حرب و پیکار روئے مقابلہ بہ مقاتلہ بہ کارزار آوردند و عمدۂ استظہار شان پیلان کوہ پیکر بود کہ بر دنداں ہائے ستوں کردار شاں دشنہ ہائے زہر دار استوار کردہ بر پشت پشتہ مثال از چوب تخت ہائے محوط محکم ساختہ و بر ہر تختے چند ناوک افگن قادر انداز برائے جدال و قتال آمادہ و بالجملہ در نظر جلادت فوج از عساکر گردوں مآثر وقعے چنداں نداشت اما پیلان را دیگر ندیدہ بودند و از افواہ والسنہ شنیدہ کہ ہیکل شاں از صلابت بہ حیثیتے ست کہ تیر و شمشیر بر اں کارگر نیست و قوت شاں ہمرتبہ کہ مزیدے بر آں متصور نے۔ درختان قوی را باد حملہ از بیخ بر آرند و بناہائے عالی را باشارت پہلوئے ویراں سازند و ہنگام کارزار خرطوم ثعبان کردار اسپ را با سوار از زمین در ربایند و بہوا بر اندازند و از کثرت استماع ایں مبالغہ ہا کہ در بیشتر طبائع مرکوز است دغدغہ خاطر لشکریان راہ یافتہ۔ چنانچہ در وقت تعین مواضع سروران و اعیان۔ مرحمت صاحبقران کہ در ہمہ حال شامل احوال اہل علم و کمال بودے از جمع علمائے رفیع مقدار کہ ظفر کردار ملازم رکاب ہمایوں آثار بودند مثل خواجہ افضل پسر مولانا شیخ الاسلام جلال الحق والدین و مولانا عبدالجبار پسر قاضی القضاۃ مولانا نعمان الدین خوارزمی بزبان اشفاق سوال فرمود کہ جائے شما کجا خواہد بود۔ ایشاں از غایت دہشت و اندیشہ آں سختان کہ شنیدہ بودند جواب مبادرت نمودند کہ جائے بندگان دراں محل باید

کہ خواتین و عورات باشند۔ و نہ عجب۔ شعر:

دراں زماں کہ بود بیم جاں شگفت مدار   بزیر چادر ناہید اگر خزد بہرام

900ھ سے 1000ھ تک

اس صدی میں طرز مذکور کا رواج عام ہو گیا۔ ملا حسین واعظ نے اسی انداز میں انوار سہیلی لکھی اور بعض اور تصنیفات پر بھی یہی رنگ چڑھایا۔

روضۃ الشہداء مذہبی کتاب ہے اس میں شہدائے کربلا کے مصائب کا بیان ہے جن پر آج تک زمانہ روتا ہے۔ اور کچھ شک نہیں کہ ملائے موصوف نے بھی اس غمنامہ کو بڑے صدق اعتقاد سے لکھا ہے۔ باوجود اس کے خون شہداء سے گلزار کھلاتے ہیں۔ نالہ و زاری کے نغمے بناتے ہیں۔ سیہ قلم مشکیں رقم اور حروف و عبارت سب سیہ پوش ہوتے ہیں۔ غرض کہاں تک بیان کروں کہ کسی حال میں اس انداز کو بھولتے نہیں۔

زمانے کی ہوا دیکھ کر ہر مصنف نے اپنی تحریر کو اسی قالب میں ڈھالنا شروع کیا اور، رنگینی کا رنگ عام ہو گیا۔

روضۃ الصفا میر آخوند شاہ نے 930ھ کے اندر لکھی۔ ابتدائے عالم سے عہد مصنف تک ایک جمہوری تاریخ ہے۔ چونکہ مختلف تاریخوں سے کہیں خلاصہ اور کہیں نقل لی ہے۔ اس لیے کسی سلطنت کا کچھ رنگ ہے اور کسی حکومت کی عبارت کا کچھ۔ لیکن زمانے کی ہوا بدل گئی تھی۔ جہاں اپنی عبارت لکھتے ہیں وہاں ہر بیان کے سر پر ایک تمہید کا تاج رکھتے ہیں اور رنگینی اور سنگینی سے اپنا کمال ثابت کرتے ہیں۔ جسے سب ادب سے تسلیم کرتے ہیں۔

حبیب السیر میر غیاث الدین نے لکھی۔ اس میں 930ھ تک کا حال ہے۔ اس صاحب کمال نے نظم و نثر دونوں میں طبیعت کا جوش دکھایا۔ گویا روضۃ الصفا کو اکثر عبارتیں بدل کر تقریبا ہمرنگ کیا۔ بہت سے حالات اپنی اپنی جگہ زیادہ کیے۔ خصوصا علماء و اہل کمال کے حالات کو عہد بعہد خوب توضیح سے لکھا۔ مگر طول کلام اس قدر ہے کہ اکثر جگہ صفحے کی خاک چھان کر مطلب کی دو باتیں نکلتی ہیں۔

اس صدی میں ترکوں کی ترکی تمام ہو کر ایران میں سلاطین صفویہ کا دور شروع ہوا۔ خاندان مذکورہ کی سیادت اور پارسا بزرگوں کی برکت نے خلائق کے دلوں میں عظمت کے نقش جمائے تھے۔ لاکھوں آدمی معتقد تھے۔ انہیں کے جوش اعتقاد نے مخدوم زادوں کو سند فقر سے اٹھا کر سریر سلطنت پر بٹھا دیا۔ وہ آبائی علوم کے سنبھالنے والے اور فرزندان فنون کے پالنے والے تھے۔ صدہا کتابیں ہر علم و فن کی فارسی میں تالیف و تصنیف ہوئیں۔ انشا پردازی روشن استعاروں، چمکتی تشبیہوں، رنگین خیالوں سے مرصع ہوئی۔ مضامین نے ترقی کر کے قطرے کو دریا اور ذرے کو آفتاب کر دیا۔

1000ھ سے 1100ھ تک

یہ قاعدہ ہے کہ استعارے اور تشبیہیں جتنے نئے ہوں اتنے ہی خوش آئندہ ہوتے ہیں اور جتنے پاس پاس اور سامنے کی چیزوں میں ہوں اتنے ہی مزا دیتے ہیں کیونکہ جلد سمجھ میں آتے ہیں اور مطلب کے رنگ کو چمکاتے ہیں۔ دو تین سو برس میں پاس پاس کے استعارے خرچ ہو گئے اس لیے واجب ہوا کہ یا آگے سرکیں یا اضافت کو دہرا کر کے استعارہ در استعارہ کریں۔ اسی طرح حقیقت در حقیقت اور تشبیہ وغیرہ میں۔ چنانچہ پہلے گل عارض کہتے تھے۔ اب رنگ عارض گل کہنے لگے۔ پہلے، گل خوبی کہتے تھے۔ اب گل گلزار خوبی کہنے لگے۔ اس سے ایک نزاکت پیدا ہو گئی مگر معنے مشکل در مشکل ہو گئے۔ ان لوگوں نے قدر دانوں سے نازک خیال اور خیال بند کا خطاب حاصل کیا۔

عالم آرائے عباسی

سلاطین صفویہ کی تاریخ ہے۔ فارسی کے زباندان سمجھتے ہیں کہ سکندر منشی نے ملک سخن میں انشا پردازی کا نشان بلند کیا ہے۔ اس نے ظفر نامہ کا انداز لیا ہے۔ طولانی اور الجھے ہوئے فقروں کو کچھ سلجھایا ہے کچھ الجھایا ہے اور استعاروں اور تشبیہوں کا رنگ بھی کچھ گہرا کیا ہے کچھ ہلکا کیا ہے۔ زبان کی خوبی کو جلوہ دیا ہے۔ پھر بھی جہاں جوش آجاتا ہے وہاں دھوم دھام کی تمہید اور لفظوں کی بہتات اور بلند پروازی کا زور لگاتا ہے۔ اس پہ

ترکی کا طرہ۔ یہ گفتار اس کے قلم کی خاص رفتار ہے۔ عالم اور شاعر سب اسے صاحب کمال اور اپنی طرز کا استاد مانتے ہیں۔ یہ بات دوسری ہے کہ طرز مذکور میں بذات خود کیا خوبی۔ کیا نقصان ہے۔ نمونہ عبارۃ۔

ذکر آغاز سال ایت ایل ترکی مطابق احدی و ثلثین والف
کہ سال ششم قرن ثانی جلوس مبارک شاہی ظلم الٰہی ست :

باز طنطنہ رایات بہار طلیعہ افروز عرصہ روزگار گشتہ جہانیاں را تازگی نوید فتح۔ و مژدہ فیروزی دادہ۔ آفتاب عالم تاب کہ نیر اعظم۔ و منور ساز عرصہ عالم است۔ باکوکبہ نور واشعہ جہاں آرائے بہجت و سرور۔ قدم بر بساط شرف نہادہ۔ ساحت گیتی را از فروغ عالمگیری روشنی تازہ و طراوت بے اندازہ بخشید۔ دریں سال خجستہ آغاز سعادت فرجام نو روز فیروز در روز دو شنبہ ہشتم جمید الاول مطابق احدی و ثلثین والف ہجری اتفاق افتادہ نو عروسان حجلہ خاک باہ آراستگی و پیراستگی سر از جیب خاک مغاک بر آوردہ در بساط جہاں آرائے چمن روزگار جلوہ گری در آمد ند۔ گیاہ و لالہ و ازہار بصد زیب و بہار در عرصہ روزگار صف آراء گشتہ عندلیب آسا بہ ز ارزبان ثنائے شہریار کامگار کامران رسانید ند۔ نظم

بہار آمد دگر عالم نوی یافت — فروغ از بزمگاہ خروی یافت
جہاں را فرہ فرخندگی داد — خلائف را زنو آسودگی داد

موکب نصرت قرین ہمایوں شاہی ظل الٰہی را بنا بر مقدماتے کہ در سال گزشتہ اشعار شد۔ توجہ خراسان در خاطر انور تقسیم یافتہ بود لہذا عنان نصرت نشان فیروزی و اقبال بجانب خراسان در حرکت آوردہ در قصبہ طبس و گیلکی نزول اجلال داشتند۔ بعد از مراسم جشن نوروزی وانجاح مطالب و مقاصد بجزہ و زیر دستان۔ عنان اشہب صبا پیوند بعزم سیر و شکار سواحل رود ہیر مند۔ و انتظام مہمات ضروری خراسان۔ بدانصوب انعطاف دادہ۔ از راہ تومان دشت بیاض قائن در حرکت آمدہ۔ فرمان قضا جریان بنفاذ پیوست کہ امرائے عظام و عساکر ظفر فرجام کہ در ولایت نیشاپور قشلاق فرمودہ بودند بولایت فراہ آمدہ در انجام بموکب معلے ملحق گردند۔ و سپاہ ظفر پناہ فوج فوج و قشون قشون روئے توجہ بدانصوب آوردہ چوں موکب ہمایوں بفراہ رسید طبقات حشم و افواج خدم

بنظر ہمایوں فرمانفرمائے عرب و عجم در آمدہ بقاعدہ و قانون مقرر بعرصہ گاہ شگفتہ زبان بدعاو ثنا شہریار کامگار کامراں کشودند۔ سوانح ایں سفر خیریت اثر و فتوحاتے کہ روئے دادہ در ذیل دفتر مرقوم قلم عنبریں رقم مے گردد انشاء اللہ تعالیٰ۔

ابواب الجنان

اسی صدی میں ملا رفیع واعظ قزوینی نے یہ کتاب تہذیب اخلاق میں لکھی۔ مذہبی پیرایہ میں وعظ و نصیحت کرتے ہیں۔ عبارت کے باب میں اتنا کہنا کافی ہے کہ جیسو زمانے کی ہوا دیکھی اسی انداز میں گھوڑا اڑایا ہے۔ پھر بھی یہ بات قابل تعریف ہے کہ وعظ کی کتاب ہے اور ہر مطلب کی بنیاد آیت اور حدیث پر ہے بلکہ جس صفحے میں دیکھو گے آیتوں کے ٹکڑے اور حدیث کے فقرے نظر آتے ہیں۔ جہاں حکایت ہے وہ بھی مذہبی روایت ہے۔ باوجود اس کے اپنی انشا پردازی کے رنگ کو پھیکا نہیں ہونے دیتا۔ وہی لفظوں کی رنگینی معانی کی بلند پروازی۔ استعاروں میں الجھے ہوئے فقرے اور ہر فقرے کے ساتھ ہم معنی فقرے کا جوڑا موجود ہے۔

عبارت ابواب الجنان

ولیکن در زیارت قبور میباید کہ صاحب فرہنگان کامل۔ مانند شوخ و شنگان جاہل نباشند کہ حسرت گاہ مقابر را۔ عشرت گاہ نفس کافر قرار دادہ۔ چنانکہ در اکثر بلاد متعارف ست۔ کہ ہر ہفتہ روزے معین بسیر آنجا میروند۔ و تماشائے بازیگران۔ و حقہ بازان کہ دراں معرکہ ہنگامہا ساختہ اند محو گشتہ۔ سراپا چشم و گوش میگردند۔ و صاحب مذاقان بے آبرو بصد گونہ طلب و جست و جو۔ فرزندان مسلمانان را از ہر سو بنظر در آوردہ۔ سر در دنبال ایشاں میگذارند۔ و شاہد بازان شوخ و شنگ۔ با جامہائے سرخ و زرد و نیم رنگ در ہر گوشہ باشاہدان بہ بہانۂ حیلہ باز۔ ہنگامہ راز و نیاز۔ درمیاں میدارند۔ جمعے بیباک بر قبور آں غریبان خاک نشستہ۔ بجائے تلاوت قرآن بہ لغو و ہذیان مے پردازند۔ و گروہ گروہ دراں مقام پراندوہ۔ حلقہ بستہ۔ در عوض ہائے ہائے گریہ کہ باید بروز خود کنند

بہ قہقہ و خندہ آواز بلند مے سازند۔ واصلاً ازاں عزیزان خاک شرم و حیانہ۔ واز آخر کار خو اندیشہ و پروا نمیدارند۔ ونمیگویند کہ در زیرپائے ما یک دو ذرع فاصلہ چہ خبر و چہ صحبت۔ و دریں شگافہائے زہرہ شگاف۔ چہ ولولہ وچہ وحشت است۔ لہذائے جنس ماہند کہ باخاک تیرہ یکساں گشتہ اند۔ اقران و امثال مایند۔ کہ نالہ پر حسرت شاں بزبان حال از فلک گزشتہ۔ گردن کشانند۔ سر بگریبان مذلت کشیدہ۔ سخت مردانند۔ بسنگ صعوبت اجل۔ نرم گردیدہ۔ سرو قدانند۔ ہیزم صفت در آتش نیستی قدم قدم بر سر ہم افتادہ۔ نازک تنانند۔ مانند اوراق گل در خاک فنا تہ بزیر زمین بر روئے ہم نہادہ۔ آزادانند۔ ہیچ و پوچ گشتہ۔ دلشادانند۔ در آتش حسرت برشتہ۔ جہاں کشایانند۔ دربر روئے خود بستہ۔ فرماں روایانند۔ بتاسف نافرمانی نشستہ۔ شیر شکارانند۔ سر در زنجیر امواج بلاکشیدہ۔ میداں دارانند۔ بسوراخ تنگ فنا در خزیدہ۔ صاحب نظرانند۔ سرمہ صفت در چشم خاک خفتہ۔ سخنورانند۔ مانند زبان درکام زمین نہفتہ۔ عالمانند۔ اجزائے کتاب و جود شاں از ہم پاشیدہ۔ کاتبانند۔ کزلک مرگ رقم ذکر شاں را از صفحہ روزگار تراشیدہ۔ چرب زبانانند۔ شمع صفت مغز جان شاں بشعلہ مرگ گداختہ۔ شیریں کلامانند۔ موران گور۔ جسم زار شاں را خانہ زنبور ساختہ۔ گلہ پربادانند۔ دست اجل خاک درکاسہ سر شاں کردہ۔ خشک مغزان اند۔ آتش فنا دود از نہاد شاں برآوردہ۔ خود فروشانند۔ شکست متاع خودی را جاں خریدہ۔ الواں پوشانند۔ جامہ کفن نجون شاں گلبدے گردیدہ۔ ازہادی طریق زندگی و محی مراسم بندگی حضرت امیر المومنین منقول است کہ مامن احدیمر بمقبرۃ الاواہل القبور یقبور یقولون۔ یاغافل۔ لو علمت مانعلم الذاب لحمک علی جسدک حاصل معنی اینکہ ہیچکس بر قبرستانے گزر میکند۔ مگر اینکہ مردگان آں قبور۔ و خفتگان آں رخنہائے پر مار و مور۔ گویند اے بے خبر اگر بدانی۔ آنچہ ما میدانیم۔ ہر آئنہ بگدازد گوشت بر اندامت۔

اسی صدی میں انشا پردازی کے عالم میں بہت سے مخلوق پیدا ہوئے جو عجیب الخلقت ہیں۔ یعنی چند کتابیں لکھی گئیں کہ علمی تاریخی اخلاقی کوئی مطلب کتابی ان میں نہیں۔ پھر بھی کتابیں ہیں۔ ایک ان میں سے سہ نثر ظہوری ہے۔ ابراہیم عادل شاہ نے

علم موسیقی میں ایک کتاب لکھی تھی۔ یہ اس کے 3 دیباچے ہیں۔ ان میں سرمایہ مضمون کیا ہے؟ فقط تعریف یعنی خوشامد۔ پہلی نثر تمام گانے بجانے کی ضلع بازی ہے اور ناچ رنگ کے جگت اور پھبتیاں۔ جنہیں متین لوگ تشبیہیں اور استعارے کہتے ہیں۔ باوجود لطافت اور نزاکت کے ان کے مضامین کو دیکھ کر ہنسی آتی ہے۔ حمد الٰہی کو نغمہ اور زمزمہ بنادیا۔ قانون شریعت کو ساز و آواز میں بجادیا۔ بہرام کی کیا حقیقت ہے۔ گور میں نچا دیا۔

فقرہ نعت۔ وردرود باساز و برگ بر نواز ندہ امتان کہ قانون دین ہمضراب ہدایتش پر صدا است۔

بادشاہ کی تعریف کرتے کرتے کہتے ہیں:

زبس در نغمہ انگیزیست ایام سزد رقصد اگر در گور بہرام

باقی نثروں کے حال کہاں تک لکھوں افسوس آتا ہے کہ کیسے عالی دماغوں سے بلند مضامین اترے اور کہاں برباد ہوئے۔

پنجبر قعہ

یہ کتاب بھی انہی کی سنگت میں آئی۔ ہر رقعہ ایک لمبا چوڑا خط عاشق کی طرف سے معشوق کے نام ہے مضمون اور مطلب کچھ نہیں۔ طول کلام اور فقط استعاروں کے پیچ در پیچ ہیں، باقی خیر و عافیت۔ بے سہارے جسم کے، ہوا پر رنگ چڑھاتے ہیں۔

مینا بازار

اس میں بزاز، کنجڑا، تنبولی اور دیگر بہت سے بازاریوں کی تعریف جدا جدا فصلوں میں کی ہے۔ آپ عاشق اور اتنے سارے معشوق۔ مضامین کی باریکی اور تاریکی سے تمام بازار میں اندھیر مچ رہا ہے۔ کوئی کہتا ہے ظہوری کی تصنیف ہے کوئی کہتا ہے ارادت خاں واضح کی۔

شبنم شاداب

فقط ایک باغ کی تعریف ہے۔ وہی استعارا اور تشبیہ کی بہار ہے۔ خیال کے پھول مہک رہے ہیں۔ رنگ اڑتا ہے، ثمر کچھ نہیں۔ وہم کی نہر بھی جاتی ہے۔ مطلب ندارد۔

اسی صدی میں مرزا طاہر وحید شاہ عباس کے منشی باشی تھے۔ فرامین اور مراسلات شاہی لکھتے تھے۔ زور قلم سے کاغذ کے نقارے بجاتے تھے اور ہوائی توپیں چلاتے تھے۔ یہ سب ہم آواز مرغ ہیں۔ ایک ایک کی بولیاں کہاں تک سناؤں۔

میرے دوستو! یہ انشا پرداز، منہ زور گھوڑوں کے شہسوار تھے کہ بے مطلبی کے میدانوں میں، بے ارادہ کسی منزل کے، خواہ مخواہ گھوڑے مارے چلے جاتے تھے اور حق پوچھو تو یہ بھی بڑا کمال ہے۔ ذرا سی بات کو بلکہ بے بنیاد معاملہ کو، مثلاً بادشاہ کی مدح کہ وہ بہت اچھا ہے، یا باغ کا حال کہ خوب شاداب ہے، یا بازاری دکانداروں کی تعریف کو اس قدر لمبانا اور جوڑنا، بغیر دود کے لبال اٹھانا ہے اور یہ انہی کا کام تھا مگر بے حاصل۔

ایک تیز قلم مصور نے نظر کے زور اور ہاتھ کی مشق سے ایک گلاب کی پتی پر قلعہ فورٹ ولیم کی تصویر کھینچی اور اس میں کوئی جز اس کی عمارت کا باقی نہ چھوڑا۔ یا کسی نازک دستکار نے چنے کی دال کا جنگی جہاز تراشا۔ اس طرح کہ چھوٹے سے چھوٹا پرزہ بھی اصل جہاز کا دیکھو تو موجود پاؤ۔ بے شک! دونوں نے بڑا کمال کیا۔ مگر اس قلعہ کے ایوان میں کونسا بادشاہ ملک رانی کرے اور جہاز میں کونسا لشکر سمندر پار اترے۔

انداز مذکور نے ایسا ذوق و شوق پھیلایا کہ تمام تحریریں تشبیہ اور استعارہ میں مسلسل ہو گئیں۔ کوئی ماجرا، کوئی معاملہ اور کوئی مراسلت نہ رہی کہ اس سے خالی ہو۔ اسے رنگین بیانی، نازک خیالی اور معنی آفرینی کہنے لگے اور فقرے وہی ہم معنی۔ جوڑہ جوڑہ۔ جو بہت بے تکلف سادہ نویس ہوتے ان کا کلام رنگین نہ ہوتا تھا مگر نیرنگ ضرور ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ سادہ نویسی اور سلاست عبارت زبان سے گم ہو گئی۔ بلکہ اصلیت نگاری اور مطلب نویسی کی طاقت اس میں نہ رہی اور زبان پر یہ داغ لگ گیا کہ مبالغہ اور بناوٹ فارسی زبان کا جوہر ہے۔ اہل ایران مالک زبان تھے۔ افغانستان ترکستان اور

ہندوستان سب اس کے شاگرد تھے جو بات وہاں خوبی سمجھی گئی۔ اس کی نقل کو سب نے فخر سمجھا۔ ان کے قلم بھی انھی کی چال چلنے لگے۔ یہ صاحب زبان نہ تھے۔ ان بچاروں کی زبانیں تھوڑے ہی عرصے میں ضعیف بلکہ اپاہج ہو گئیں۔

میرے دوستو! اس سے یہ نہ سمجھنا کہ کتب مذکورہ بالکل نکمی ہیں۔ ایسا کبھی خیال نہ کرو۔ ان کے نازک خیال، خوبصورت استعارے، نئی نئی تشبیہیں، خوشنما ترکیبیں، لفظوں کی عمدہ تراشیں، خیالوں کی نزاکتیں، طبیعتوں کی بلند پروازیاں اور صنعتوں کے ہجوم جواب نہیں رکھتے۔ ظہوری نے جس فقرہ کے ساتھ فقرہ جوڑا ہے۔ وہی اس کا جوڑا ہے۔ مجال نہیں کہ ایک کو اٹھا کر کوئی دوسرا فقرہ اس کی جگہ رکھ سکے۔ ذرا دیکھنا! بادشاہ کی فصاحت کی تعریف میں کہتا ہے۔ نکتہ ہائے برجستہ؛ غنچہ ہائے سربستہ (پھر کہتا ہے) ہر صفحش چمنے؛ ہر سطرش انجمنے؛ ہر حرفش فصلے؛ وہر فرعش اصلے (حسن کی تعریف کرتے کرتے کہتا ہے) ابروان فجستہ۔ کلید دلہائے بستہ۔

بات یہ ہے کہ ان کتابوں کو بڑی غور اور احتیاط سے پڑھنا چاہیے۔ انہوں نے خوبی الفاظ اور نزاکت خیال اور زور طبع کو بے مطلب وبے مدعا خرچ کیا ہے۔ تم انھیں لو اور بیان مطلب کے کام میں لاؤ۔ پھر دیکھو گے تمہاری عبارت کیا کیفیت اور کیا تاثیر پیدا کرتی ہے۔

ہندوستان پر ان صدیوں میں اکبری اور جہانگیری دور تھا۔ اس کے مصنفوں نے عہد صفوی کی تصنیفوں پر تصنیفیں لکھیں۔ ابوالفضل کو انشا کے عالم میں فرمانروا کہنا چاہیے۔ وہ باوجود فضیلت علمی کے قادر الکلام انشا پرداز تھا۔ اس نے ایرانی انشا پردازوں کے ساتھ میدان بمیدان برابر گھوڑے دوڑائے اور کہیں آگے بھی نکل گیا۔ اس کا اکبر نامہ عرصہ سخن کا کارنامہ ہے۔ تین موٹی موٹی جلدوں میں انواع مضامین کے طلسمات باندھے ہیں۔ خوشنما انداز تراشتا ہے اور نئے نئے فقرے ڈھالتا ہے۔ مراسلات شاہی کو پڑھو۔ سبحان اللہ۔ عبارت کی شان: شگفتگی بیان۔ ادائے مطلب کے انداز عین برجستہ ومناسب۔ لمبے لمبے فقرے۔ ان کا جز جز ایک دوسرے کی پشت پناہ۔ لفظوں کی بہتات۔ کلام کا زور شور ہے کہ برابر توپخانہ داغتا چلا آتا ہے۔ اس پر طبیعت کا

یہ عالم ہے کہ کہیں تھکتی ہی نہیں۔ زبردست تیر انداز کی کمان ہے۔ فقرہ پر فقرہ کستا ہی چلا آتا ہے۔ ڈھیلا نہیں ہوتا۔ پھر جس انداز میں چاہو دیکھ لو۔ یہی عالم ہے حکیمانہ، عالمانہ، صوفیانہ، دوستانہ، اقسام سخن میں جس عبارت کو دیکھو۔ سنجیدہ اور برگزیدہ خیالات ہیں۔ انھیں ایسے مناسب، برجستہ، برمحل الفاظ و عبارت میں ادا کیا ہے کہ اس سے بہتر ممکن نہیں۔

اکبر کو علوم فنون، مذاہب اور اقوام وغیرہ۔ ہر امر کی تحقیقات کا شوق تھا۔ اس کے عہد میں سنسکرت، عربی، ترکی، لاطینی اور یونانی سے اکثر کتابیں ترجمہ ہوئیں۔ ابوالفضل نے کلیلہ دمنہ کو سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کیا۔ کئی عالموں نے گنوان پنڈتوں کی مدد سے مہابھارت کے ترجمے کیے۔ ایک عالم نے انہی داناؤں کے ساتھ بیٹھ کر رامائن کو فارسی لباس پہنایا۔ سنگھاسن بتیسی کی پتلیوں کو فارسی بلوایا۔ ان کتابوں کی عبارت نہایت سلیس ہے کیونکہ ادائے مطلب کے ساتھ اصل کی مطابقت مد نظر تھی۔

آئین اکبری حقیقت میں اکبر نامہ کی چوتھی جلد ہے معلوم ہوتا ہے کہ ابوالفضل کو رائج الوقت تحریر کی لغویت سمجھ میں آگئی تھی اس لیے پرانے انداز کو نیا کیا۔ اس نے فارسی کی پرانی تصنیفیں ان پارسیوں سے پائی ہوں گی جو خاندیس سے اکبر کے دربار میں آئے تھے۔ اس نے پرتگال اور اٹلی کے پادریوں اور عالموں سے لاطینی اور یونانی کتابوں کے ترجمے بھی لکھے یا اپنے ماتحت لکھوائے تھے۔ ان سے بھی سادہ نویسی کا مزہ پایا ہو گا۔

یہاں آئین اکبری کے مفید مطالب اور عمدہ تحقیقاتوں کے باب میں گفتگو کا موقع نہیں۔ طرز عبارت کے باب میں کہنا ضرور ہے کہ ہندوستان میں یہ طرز اسی صاحب کمال کا ایجاد ہے۔ آج تک دوسرا شخص اس پر قلم نہیں اٹھا سکا۔ تشبیہ اور استعارہ اگر اسے اپنی رنگینی کا قلم لگائیں تو ہاتھ کاٹے جائیں۔ ننھے ننھے فقرے برابر جڑے ہوئے۔ جیسے ولایتی انار میں دانے۔ مگر ایک ایک دانے میں کئی کئی اناروں کا رس بھرا ہے۔ تاریخ فلسفہ، فروغ ریاضی علم الارض، علم الحیوانات، اخلاق، تدبیر المنزل، وغیرہ وغیرہ۔ کوئی علم نہیں جو اس میں نہ ہو۔ اس پر قدرت کلام دیکھو کہ جس زور سے اٹھا ہے

چڑھتا ہی چلا گیا ہے اور اتنی موٹی کتاب کو اول سے آخر تک ایک انداز میں تمام کر دیا ہے۔ نئی نئی تراشیں۔ انوکھی ترکیبیں۔ بیان کا بانکپن۔ ادائے مطلب کے نرالے انداز چشمہ خیز طبیعت سے ابلتے آتے ہیں۔ وہی جوش تھا کہ خاتمہ کتاب میں شعر ہو کر پھوٹ بہا:

بس کارنامہ ایست کہ آمد بروئے کار　　حیراں شوند اگر دوستہ حرفے رقم زنند

بے درد اسے فخریہ کہتے ہیں۔ آزاد کہتا ہے کہ واقعیت کے دل کا ارمان نہیں نکلا۔ اس سے بڑھ کر کہنا چاہیے تھا۔ اب اس کی چند سطریں سنائے بغیر مجھ سے نہیں رہا جاتا۔

آئین پیل خانہ

ایں شگرف جانور در تنومندی و استواری کوہ آسا۔ ودر دلیری و جاں شکری شیر کردار۔ در شکوہ افزائی۔ وکشور کشائی۔ سترگ تبرد۔ و در آبادے سپاہ و ملک۔ والادست آویز۔ شناسندگان ہندی بوم۔ گزیدہ را برابر پانصد سوار بر شمارند۔ وہمعنائی دلیران تیر انداز۔ یک تنہ کار ہزار کند۔ در تند خوئی و سبک عنانی چوں تازی بارگی۔ ودر فرماں پذیری و رموز دانی بسان زیرک مردم۔ در شورش مستی و آشوب کینہ وری از مردمی بیشتر بمادہ گزندے نرساند۔ باآنکہ دستمایہ [27] گرفتاری میگردو۔ و بجز دفیلاں در نیاویزد۔ و در خورمالش نداند۔ واز حق شناسی تیمار دار خود را نیازارد۔ ہموار خاکبازی کند۔ و در سواری ازاں باز ماند۔

فیلے در شورش مستی بہمسر خود آویز داشت۔ خورد سالے پیش پائے او در رسید۔ از مہربانی بخرطوم برگرفتہ یکسو برنہاد و جنگ از سر گرفت۔ ودر وقت مستی چوں از بند رہائی یابد۔ و ہنگامہ خودسری آراید۔ ہیچ یک را زہرہ آں نبود کہ پیرامون گردد۔ کاروان پردل بر مادہ فیل سوار شد نزدیک رود و آرپائے بند کند۔ بسا مادہ در سرگوساری از خور و آشام باز ماند۔ ودر غم فرو شود۔ گوناگوں آموزش پذیرد۔ واصول راکہ جز موسیقی شناس بدال رلو نیابد فرایاد گیرد۔ و اعضاء را بداں نمط جنبش دہد۔ و برو شمار آید۔ و کمان کشیدن۔ و تیر انداختن۔ و افتادہ را بر گرفتہ بہ فیلبان دادن خو کند۔ رسم آنست کہ دانہ بگاہ پیچیدہ خورش دہند۔ باشارت پاسبان بگوشہ دہن نگاہ دارد۔ و در تنہائی بر آوردہ سپارد۔ پستان و

زاو نگاہ او بسان آدمی۔ وطوطی آسا گرد زبان۔ وخایہ پیدائے ندارد۔ آب از درون شکم بجز طوم کشید۔ و بر خود افشاند۔ ولوائے تا خوش ندہد۔ کاہ خوردہ را روز دیگر بیرون آوردہ و دگر گوں نبود۔ ارز او یک لک روپیہ تا صد باشد۔ و پنج ہزاری بسیار پیدائے گیرد۔ ودہ ہزاری نیز یافتہ شود۔ چہار گونہ بود۔ یکے بھدر بفتح باو ہائے خفی۔ وفتح دال ہندی مشدد۔ درا۔ متناسب اعضاء افراختہ سر۔ کشادہ سینہ۔ بزرگ گوش۔ درازدم۔ دلیر و رنج کش باشد۔ واز پیشانی او مہرہ چوں بزرگ مروارید بر آورند۔ وبہ ہندی زبان گج موتی گویند۔

اس وقت ہندوستان میں فارسی زبان کی تصنیفات عام ہو گئی تھیں۔ ہر قسم کی تحریریں رنگین یا نیم رنگ عبارتوں میں لکھتے تھے اور افسوس یہ ہے کہ تاریخ اور بیان واقعات میں بھی اس چال کو نہ چھوڑتے تھے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ استعارہ اور تشبیہ جو کلام کا زیور تھے ان کی بہتات سے کلام میں مبالغہ اور اصلیت میں فرق آ گیا جس بیان کو دیکھو۔ آدھا خواب سچا ہے، آدھا جھوٹا۔ آدھا تیتر، آدھی بٹیر۔

فاضل بدایونی کی منتخب التواریخ، آصف خاں کا اکبر نامہ اور نظام الدین بخشی کی طبقات اکبری، وغیرہ وغیرہ کوئی کم کوئی زیادہ اسی انداز میں لکھی گئی ہیں۔ یہ کتابیں عمدہ اور معتبر تاریخیں ہیں۔ مگر انداز تحریر نے چاندی کو کھوٹا کر دیا ہے۔ تاریخ کے علاوہ اکثر علمی اور مذہبی کتابیں بھی فاسی میں تحریر ہوتی تھیں۔

تاریخ فرشتہ

دکن میں مرزا محمد قاسم فرشتہ نے لکھی۔ اس کا درخت خاک ایران سے اگا تھا۔ عبارت بموجب رواج وقت کے اعلیٰ درجہ فصاحت پر ہے۔ پہلے دفتر کی عبارت نیم رنگ ہے اور دوسرے دفتر میں اس قدر زور مارا ہے کہ اگر بس ہوتا تو سہ نثر ظہوری سے جا ملاتا۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ کل اوصاف رواج وقت کے موجود ہیں مگر یہ تاریخ کی شان نہیں۔

توزوک جہانگیری

جس طرح تیمور نے ملفوظات اور توزوک تیموری اور بابر نے توزوک بابری لکھی تھی۔ یہ کتاب جہانگیر نے خود لکھی اور اپنے ہی نام سے لکھی۔ اس کی سلیس عبارت اپنی سادگی میں آب رواں بہاتی ہے۔ صاف صاف باتیں ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جو بولتا تھا وہی لکھوا دیتا تھا۔ عمدہ تحقیقاتوں کے علاوہ بری بھلی میٹھی پھیکی کوئی بات اپنی نہیں چھوڑی۔ اسی سادگی کی برکت ہے کہ جہاں سے پڑھو۔ بات پوری کیے بغیر چھوڑی نہیں جاتی۔

بہار دانش

شاہجہاں کے عہد میں لکھی گئی۔ مطالب خلاف تہذیب عبارت کہیں شوخ رنگ اور اکثر نیم رنگ ہے مگر خوش رنگ ہے اور محاورہ سے شیر و شکر۔ بادشاہ کی طبع باانصاف پر ہزار رحمت! دیکھ کر فرمایا۔ عنصر کثیف را کسوۂ لطیف دربر کردہ۔ جب وزیر نے سفارش کے کلمے کہے تو کہا۔ خط زشت است وباب زر نوشت است حق مخلش بدہند۔

شاہجہاں نامے

شاہ جہاں نامے تو کئی لکھے گئے جنہوں نے زیادہ طبیعت پر زور دیا ہے انہی نے مطالب پر زیادہ پردہ ڈالا ہے اور حال کو بد حال کیا ہے۔

نازک خیالی کا سکہ کل ایشیا میں چلتا تھا پھر بھی جو کام کے مواقع ہوتے تھے وہاں سادگی کی طرف التجا کرنی پڑتی تھی۔ مہموں کے ذموں والے اور تدبیروں کے دردمند۔ رنگینی کی چھینٹ بھی اپنے کاغذ پر نہ پڑنے دیتے تھے۔ یہاں اس دور میں طرز زندگور کی کتاب رقعات عالمگیری ہے۔ عالمگیر نے دل معتدل اور زبان قادر البیان پائی تھی۔ اس لیے اپنے فرمان اور خطوط آپ لکھتا تھا یا سامنے لکھواتا تھا۔ کاغذات پر خود حکم چڑھاتا تھا۔ وہ 50 برس سلطنت کر کے 1118ھ میں فوت ہوا۔ اس کی تحریریں دیکھ کر تعجب آتا ہے کہ جس طرح اورنگ سلطنت زیر قدم رکھتا تھا۔ اسی طرح کشور سخن بھی زیر قلم۔ دیکھو اس کے چھوٹے چھوٹے فقرے۔ ملک رانی کے پیچوں میں الجھے ہوئے ہیں مگر

عبارت صاف ہے اور لفظ لفظ میں محاورہ کا نمک دیا ہوا ہے۔ تمام انتظامی ہدایتیں اور اکثر اخلاقی نصیحتیں ہیں کہ تاثیر میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اس کی تحریر کو گلستان سے تشبیہ دوں تو مضائقہ نہیں۔ اتنا فرق ہو گا کہ گلستان کے خیالی مضامین ہیں اور اس کے حالی۔ عبارت اس کی جتنی پڑھنے میں سہل ہے اتنی ہی لکھنے میں دشوار ہے۔

1100ھ سے 1200ھ تک

فارسی کی تحریر پر یہ صدی ایران اور توران میں برابر منحوس رہی۔ اصلیت مطالب عبارتوں سے جلاوطن ہو گئی تھی۔ جو عیب تھا وہی عین کمال سمجھا جاتا تھا۔ انشا پردازی کا نمونہ مرزا مہدی خاں کی تصنیفات ہے کہ نادر شاہ کا منشی باشی تھا۔ اس کی جہانگشا نادر شاہ کے عہد کی تاریخ ہے اور ایک انشا ہے جس میں بادشاہی فرمان اور مراسلے اور خطوط درج ہیں۔ انشائے مذکور کی ایسی ہوا باندھی تھی کہ اب تک ایران سے قندھار اور کابل تک مکتبوں میں پڑھاتے ہیں اور بچوں کو حفظ کرواتے ہیں۔

جہاں کشا کا انداز وہی ہے جو عالم آرائے عباسی کا ہے۔ جہاں کوئی بڑی مہم یا مقدمہ سلطنت ہوتا ہے وہاں تمہید کی دھوم دھام ہے۔ ایسے مقاموں میں فقرے پر ہم معنی فقرہ بھی سوار ہے۔ البتہ بیان مطالب میں ذرا اس سے صاف رہتے ہیں۔ ادائے مطلب میں خیالات نئے اور عبارت بھی کچھ سلیس۔ لمبے لمبے فقرے کم الجھے ہوئے ہیں۔ پھر بھی بات کو بلند لفظوں سے بڑھاتے اور چڑھاتے ہیں اور الفاظ ترکی اس پر طرہ۔ حرف ربط اور اس کے فعل جملوں کے اخیر سے جابجا گراتے جاتے ہیں۔

جہاں کشا کی عبارت:

(جب نادر شاہ ہندوستان پر گیا اور کابل کے افغانوں نے قلعہ نشین ہو کر مقابلہ کیا۔ نادر نے 4-3 کوس ہٹ کر لشکر ڈالا۔ تیسرے دن سوار ہو کر شہر کی طرف گیا۔ افغان باہر نکل کر توپیں اور بندوقیں مارنے لگے۔ اس موقع پر لکھا ہے:)

ایں معنی مہیج غضب خاقانی گشتہ جمعے را کہ دراں وقت در رکاب اقدس حاضر

بودند بہ تنبیہ آں جماعت اشارۃ فرمودند۔ مامورین جانب آں جماعت اسپ برانگیختہ وبا شمشیر ہائے آختہ باشیاں درآویختہ تاپائے قلعہ سر افشانی کردند۔ وغیرہ وغیرہ۔

(خیوہ کی مہم میں ایک شہر پر دھاوا کر کے قلعہ کا محاصرہ کرلیا۔ اس مقام پر کہا ہے ض:)

پس جوالہائے آسماں رفعت ترتیب دادہ توپہائے رعد ادائے اژدر دہان و خمپارہ ہائے ستارہ ریز آتش فشاں راسہ شبانہ روز برق خرمن صبر و تواں۔ وخانمانسوز قلعگیاں ساختند۔ ونقابان چابکدست از چند جابہ شگافتن زمین وکافتن نقب پرداختند۔ ودیوار قلعہ بضرب توپ قلعہ کوب ویراں۔ ونقبہا برج وحصار دست وگریباں گردیدند۔

(مہم خوارزم سے فارغ ہو کر ملکی انتظام کیے۔ ان کے سلسلہ میں لکھا ہے:)

وتمامی اسرا کہ در عہد سلف ازولایات خوراسان بردہ بودند۔ ذکور و اناث جمع کردہ بہر یک از خویشان واقربائے ایشاں۔ کہ حاضر بودند سپردند۔ وہمچنیں سابقاً جمعے از طائفہ روسیہ گرفتار قید ازبکیہ بودند۔ ایشانرا مستخلص۔ وبازاد و راحلہ خص کردہ روانہ مقصد ساختند۔ وعدد اسرائے خراسان ہمہ جہت دوازدہ ہزار نفر متجاوز میشد۔ بارگیر و دواب جہت ایشاں سرانجام نمودہ۔ وذخیرہ وماکول دروجہ ایشاں معین فرمودہ روانہ خراسان ساختہ در قلعہ کہ چہار فرسنگے ابیورد۔ بمعماری ہمت بلند و سرکاری نیت ارجمند آنحضرت احداث شدہ بود۔ سکنی دادہ قلعہ مذبور را بہ خیوہ آباد موسوم کردند۔

ہندوستان میں آکر اس خیال بندی کی اور بھی مٹی خراب ہوئی۔ جو اہل ایران مالک زبان تھے۔ وہ ضرورت کے وقت مطلب بھی ادا کر جاتے تھے۔ یہاں کے لوگ بالکل اپاہج ہو گئے۔ فارسی کے اچھے اچھے دعویداروں اور انشا پردازوں کو دیکھا۔ جب کچھ لکھنے بیٹھے ہیں تو اول یار کی تمہید اٹھاتے ہیں۔ پھر مطلب کی طرف مڑتے ہیں۔ ایک آدھ فقرہ کسی معمولی استعارہ پر بنیاد رکھ کر اٹھایا۔ اس کے لفظوں کے خیال سے ایک اور فقرہ اور اس کے لگاؤ سے کوئی اور۔ پھر بہتے بہتے کہیں کے کہیں جا پڑتے ہیں۔ جب ہر پھر کر مطلب پر آئے۔ تو پھسک گئے۔ مطلب کی عبارت کو دیکھو تو پھسر پھسر۔ جب وہ نہ رہے تو کچھ بھی نہ رہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ زبان میں طاقت اور کلام میں بیان

مطلب کی قوت نہیں۔ حق یہ ہے کہ رنگینی اور عبارت آرائی جس طرح مطالب پر پردہ ڈالتی ہے۔ اسی طرح ان کی لیاقت کا بھی پردہ ڈھانکتی ہے۔ جب وہ اٹھ جاتی ہے۔ پردہ اٹھ جاتا ہے۔ جن تشبیہوں اور استعاروں پر انہیں ناز ہوتا ہے۔ وہ بھی پہلے بزرگوں کے چبائے ہوئے نوالے ہوتے ہیں۔ انہیں کو چباتے ہیں اور موچھوں پر ہاتھ پھیرتے ہیں۔

جو اعلیٰ درجے کے خیال بند کہلاتے ہیں۔ ان کی تصنیفات میں مرزا بیدل کا چار عنصر اور رقعات وغیرہ ایک نامی نمونہ ہے۔ انہیں پڑھ کر عقل حیران ہوتی ہے۔ اضافت پر اضافت۔ استعارہ در استعارہ۔ فقروں پر فقرے۔ خیال در خیال برابر چلے جاتے ہیں۔ اس پر مقفیٰ اور مسجع اتنے باریک ہوئے ہیں کہ نظر نہیں آتے اور جو کچھ ان سے سمجھ میں آتا ہے وہ اصل میں کچھ بھی نہیں ہوتا۔ الفاظ بہت خوشنما مگر سراسر مضمون 'مدعا غائب۔ نہیں معلوم ہوتا کہ کیا کہتے ہیں اور کیوں کہتے ہیں۔ آپ خیال فرمایئے کہ اس طرز میں اگر کوئی تاریخ یا اخلاق یا کسی علم کی کتاب لکھی جائے، یا کوئی سلطنت کا فرمان جاری ہو تو پڑھنے والوں پر کیا گزرے۔

کسی دوست کو ایک عرصے کے بعد خط لکھا ہے۔ مطلب کچھ نہیں فقط اتنی بات ہے کہ میں مدت سے سوچ رہا تھا کہ کس عذر کے ساتھ آپ کو خط لکھوں۔ اس سوچنے کو دیکھو:۔

رقعہ مدتیست بے دل متحیر غبار دامن تامل بود تا بو سیلہ کدام طاعت سر از جیب تسلیم بدر آردیا بواسطہ چہ خدمت قدم بہ عرصہ نیاز گزارد۔ انفعال نارسائی ہا بسامان عرقے نہ پرداختہ کہ تری از جبہ تحریر تواند شست۔ وشرم ناتوانی بساط سرنگوں طرح نہ نمودہ کہ از خامہ جرات گردن افرازی تواں جست۔

طرز کے طرفدار ان فقروں کو پڑھتے اور لوٹ لوٹ جاتے ہیں کہ دیکھیے گا! کیا سوچ ہے! اور کیا عذر ہے! اور سلام بھی اسی میں آگیا۔ اور نیاز بھی اور ندامت تو دیکھئے! اسی ڈھنگ کی 15 سطریں اور ہیں۔ مطلب مدعا ہیچ۔

1200ھ سے 1300ھ تک

تیرھویں صدی میں زبان فارس کی لغویت حد کو پہنچ گئی۔ حالت یہ تھی کہ ملک کی طبعی زبان کئی سو برس سے معزول بیٹھی تھی اس لیے اپنے کام میں ناطاقت بلکہ اپاہج ہوگئی تھی۔ خیال بند جو اس کے دعویدار بنے تھے، افلاس میں گرفتار تھے۔ خیالی رنگ ان کا سرمایہ تھا وہ بھی اڑ گیا تھا۔ پرانے بزرگوں کے چیتھڑے لیتے تھے۔ انہی سے پیوند پارہ۔ اور وقت کا گزارہ کرتے تھے۔ یعنی جب کچھ لکھنا ہوتا تو معمولی استعارے۔ وہی تشبیہیں۔ اکثر استادوں کے فقرے لے لیتے تھے۔ جوڑ توڑ کر مطلب ادا کر دیتے تھے۔ 70برس اسی عالم میں گزر گئے۔

یکایک زبان کی طبیعت نے زور کیا۔ اور اس طرح کیا کہ جن سببوں سے اب تک طرز تحریر میں تغیر ہوئے تھے۔ یہ ان سب سے علیحدہ تھا۔ شاہ نے ممالک یورپ کی طاقتوں کو دیکھ کر ملک کو خطرناک حالتوں میں دیکھا۔ غور کے بعد معلوم کیا کہ ان ملکوں کو علوم، فنون اور ایجاد صنائع نے زور دیا ہے۔ اس لیے مستعد طالب علموں کو پیرس میں بھیجا۔ بعد اس کے اکثر دانایان یورپ کو بلا کر مدرسہ اور صنعتگری کا تعلیم خانہ کھولا۔ خود یورپ کا سفر کیا وہاں کے تعلیم خانوں اور کارخانوں کو مشاہدہ کیا۔ اس سلسلہ میں ترجمہ اور تالیف کا رستہ کھلا۔ بہت کتابیں فرنچ، جرمن اور انگریزی سے ترجمہ ہوئیں۔ تاریخیں جغرافئے علماء، حکماء، شعراء کے تذکرے لکھے گئے۔ نئی تعلیم نے سبق پڑھا دیا تھا کہ ان مطالب کا ادا کرنا ملک کی طبعی زبان کے سوا دوسرے کا کام نہیں ہے۔ اس لیے اسی کو حالی کا خلعت ملا اور خیال بندی کو ملک ایران بلکہ ملک خیال سے بھی نکالا ملا۔ اب تعلیم خانہ شاہی کے علاوہ اکثر شاہزادے، امراء اور شوقین علماء تصنیفیں کر رہے ہیں۔ کاغذ دولت (گورنمنٹ گزٹ)، ایک اخبار با تصویر اور عام خبروں کے 3 اخبار جاری ہیں۔

اسی جوش و خروش میں صدہا برس کا دبا ہوا بیج پھوٹ نکلا۔ اس نے ایران کی تاریخ لکھ کر نامہ خسروان نام رکھا۔ عہد قدیم سے آج تک کا حال اس میں درج کیا ہے

اور یہ التزام رکھا ہے کہ ایک لفظ بھی عربی کا نہ آنے پائے۔ وہ اپنے ارادے میں کامیاب ہوا اور باوجود ایسی سخت قید کے لطف عبارت اپنے اعتدال پر تلا ہوا ہے۔

ہندوستان میں اس صدی کے شروع میں زبان مذکور کا سکہ چلتا تھا مگر کچھ کھوٹا کچھ ملت۔ اس کی حالت ایسی ہو گئی تھی کہ نہ فارسی نہ ہندی۔ نہ پلاؤ نہ کھچڑی۔ قاعدہ ہے کہ بجاو قوم کی قوت پر قائم ہوتی ہے یا حکومت پر۔ قوم کے جو لوگ یہاں آئے تھے ان کی اولاد ہندی ہو گئی تھی۔ بادشاہ اور اس کا دربار سو سو برس سے شطرنج کی بساط ہو گیا تھا۔ ان کی زبان اردو ہو گئی تھی۔ اس صدی میں وہ دربار بھی نہ رہا تھا کیونکہ عملداری انگریزی ہو گئی۔ 30-40 برس بعد کچہری کی تحریر اردو ہو گئی۔ پھر بھی 9 سو برس سے کہ فارسی کی جڑ دلوں میں دوڑی ہوئی تھی۔ اس کی محبت اہل ہند سے آپس کی تحریریں فارسی ہی میں لکھواتی تھی۔ سن رسیدہ بڈھے کیا ہندو کیا مسلمان۔ اردو کو بے علمی کی علامت جانتے تھے۔ لیکن اب وہ بھی نہ رہے۔ اس لیے ہر جگہ اردو ہی اردو ہے۔ باوجود اس کے اکثر ریاستوں اور پرانے قصبوں میں جو خاندانی اشخاص باقی ہیں وہ اب تک فارسی میں خط لکھتے ہیں مگر یہ پچھلی رات کی چاندنی ہے۔ آگے اللہ ہی اللہ ہے۔

اب میں ان چند فقروں پر لیکچر کا خاتمہ کرتا ہوں کہ جس طرح ایران کی تصانیف پہلے ہم لوگوں کے لیے نمونہ تحریر تھیں۔ ویسا ہی اب بھی عمدہ نمونہ ہیں۔ اور تہذیب کے حکم کے بموجب نمونہ ہیں۔ ان کی صاف اور سلیس کتابوں میں ناسخ التواریخ کا انداز ہماری اصلاح کا دستور العمل ہے۔ اس میں تکلف، رنگینی اور عبارت آرائی کا اثر مل کر فضول لفظ کا گزر بھی نہیں ہوا۔ فقط ادائے مطلب ہے اور ایسے سنجیدہ اور برگزیدہ لفظوں میں ہے جو بیان کا حق جوں کا توں ادا کر دیتے ہیں۔

شاہ نے اپنے 4 سفرنامے لکھے۔ یہ مبارک نامے واجب تھا کہ اور کتابوں کے بادشاہ ہوتے۔ چنانچہ ہیں۔ وہ ہمیں قانون دیتے ہیں کہ اس طرح بولو۔ اس طرح لکھو۔ ان کی عبارت کی روانی پانی کی روانی ہے۔ دار التصنیف کے عالموں کو ان مراتب کی پابندی کی تاکید ہے۔ ان کی تصنیفیں خبر دیتی ہیں کہ تہذیب کے تار آ رہے ہیں۔ علوم وفنون کی ریل آیا چاہتی ہے۔ ملک کو مالا مال کر دیگی۔

منتظم ناصری

آغاز سال ہجرت سے ایک تاریخ عالم ہے اور سال بسال کا حال جس قدر تحقیق کو پہنچا ہے، تفصیل سے لکھا ہے۔ اس میں یورپ کی تاریخوں کے مطالب بھی شامل ہیں۔

مرات البلدان

اس میں ممالک دنیا کے ہر شہر کا حال ردیف وار ہے اور اس کے بیان میں ایشیا اور یورپ کی معلومات کا سرمایہ شامل ہے۔

تذکرۃ العلما

علمائے اسلام کے سوانح عمری عمدہ تحقیق اور مناسب تفصیل کے ساتھ لکھے ہیں۔

شاہی جنتری

سال بسال چھپتی ہے۔ اس میں مملکت کے عزل و نصب عہدہ داروں کے نام اور ترقی و تنزل کے احکام مشتہر ہوتے ہیں۔ ان سب کی عبارت ایک انداز میں ہوتی ہے۔
دار الترجمہ اور دار التصنیف کے دفتر کھلے ہیں اور تصنیفات کے سلسلے جاری ہیں۔ شاہ اپنے قلم خاص سے بھی بعض مسودے لکھ کر بھیجتے ہیں اور علماء کے مسودے طلب کر کے سنتے ہیں اور ہدایتیں کرتے ہیں۔ نئی تصنیفوں کی تفصیل کہاں تک لکھوں۔ اگر ہوس است۔ ہمیں قدر بس است۔
عزیزان وطن! زبان نے جو صدی بہ صدی انقلاب کے رنگ بدلے۔ آپ نے دیکھے۔ اگرچہ ان کے پھیلانے کو سامنے میدان فراخ ہے۔ مگر فرصت کا میدان تنگ ہے۔ شائقان سخن اجازت دیں کہ اب طول کلام کو مختصر کروں اور آریا کے رشتہ سے جو سنسکرت اور فارسی کا تعلق ہے اس کے بیان کا سامان کروں۔

پانچواں لکچر

قدمائے فارس کے اصول شرعی اور رسوم عرفی

میں نے جلسہ گزشتہ میں فارس اور فارس کے آئین شرعی ' رسوم قومی اور آداب سلطنت کے باب میں کچھ کچھ اشارے کیے تھے۔ اب خیال کیا تو ان کی آگاہی بھی انشا پردازی کا ایک جزو مستقل ہے اور تہذیب و شائستگی کیسی قدم بقدم ساتھ چلتی ہے۔ یہ بھی دیکھو کہ ہر ملک کی تاریخ وہاں کے آئین قدیم اور قواعد رسوم کو ظاہر کرتی ہے۔ لیکن بالفرض اگر تاریخ بالکل نہ رہے تو انشا پردازی وہاں کی کس خوبصورتی سے مٹے ہوئے نشانوں پر اشارے کرتی ہے۔ ان سب باتوں میں ہندوؤں کے ریت رسوم پر بھی خیال کرنا ہوگا۔

عزیزان وطن! اس ملک میں بہت سے خاندان بادشاہوں کے گزرے۔ ان میں مہ آبادیوں کا خاندان شہرت ' عظمت اور تقدس میں سب پر فائق تھا اور یہی خاندان تاریخ ایران کے سر کا تاج ہے۔ یہ پاک سلسلہ بادشاہی سکہ سے حکمرانی کرتا رہا اور پیغمبری برکت سے خلائق کے دلوں میں اطاعت کی تاثیر دیتا رہا۔ پھر اخیر میں آکر پیشدادی ' کیانی ' اشکانی ' ساسانی ' چار خاندان نامور ہیں۔ جن پر تاریخ فارس کی بنیاد قائم ہے۔ مہ آبادیوں کے فرمانوں کی تعمیل سب کے نزدیک دین کی سعادت اور دنیا کی برکت سمجھی گئی۔ ان کے احکام آئین فرہنگ کہلاتے تھے۔

جتانے کے قابل یہ بات ہے کہ اکثر باتیں شاستر سے مطابق تھیں۔ گویا دونوں شاخیں ایک درخت سے نکلتی ہیں۔

(1) جو چار برن ہندوؤں میں اب تک موجود ہیں وہی وہاں تھے۔ عہد قدیم کی تقسیم میں۔ 1- کاتوزی ترک دنیا کر کے پہاڑوں میں رہتے تھے۔ 2- نیساری لشکروں کو قوت۔ سلطنت کو قیام۔ مردانگی کو عزت دیتے تھے۔ 3- نسودی سختی اور سخت بات کی برداشت

نہ کرتے تھے۔ 4۔انو حشی محنت کشی اور پیشہ وری کرتے تھے۔

ان چار حلقوں کو زمانہ کی گردش نے توڑ ڈالا۔ اس لیے جمشید کو پھر بندوبست کرنا پڑا۔ اس کی تفصیل وندیداد میں اس طرح ہے۔ 1۔آسورنی۔ علمائے ملت۔ 2۔ارتشار۔ سلاطین وسپاہ۔ 3۔اشر ہوش۔ کشتکار۔ 4۔ ہو تخش۔ کارندے اور مزدور۔

کہتے ہیں کہ اس میں اخیر کے دو لفظ ژندو پاژند کے ہیں۔ مالکم صاحب کہتے ہیں کہ مجھے یہ امر تحقیق نہیں ہوا۔ البتہ واستر۔ پہلوی میں۔ دانہ اور سبزہ کو کہتے ہیں۔ ہو۔ خوب۔ آزاد کہتا ہے کہ برہان میں۔ واس۔ غلہ اور تخشا محنت و کوشش کو کہتے ہیں۔

لطیفہ۔ فارس کے محاورہ میں جواب تک 4مذہب دیکھتے ہیں: مثلاً

مے کو چو آب زلال آمدہ بہر چار مذہب حلال آمدہ

ملک کی قدیم زبان میں 4ملت ہوگا اور اس سے یہی چار فرقے مراد ہوں گے کہ جو کل قوم کو شامل تھے۔ اسلام کے بعد بھی محاورہ کا اثر قائم رہا۔ پھر 4اماموں کے 4فتوے مراد رکھے گئے۔

(2)ان کے مذہب میں بھی حیوانات بے آزار کا مارنا گناہ عظیم تھا:

چہ خوش گفت فردوسی پاک زاد کہ رحمت براں تربت پاک باد
میازار مورے کہ دانہ کش است کہ جاں دارد و جان شیریں خوش است

موذی حیوانوں کا مارنا جائز تھا شودر لوگوں کو شکار کا گوشت اور ان کا مردار کھانا بھی جائز تھا۔

(3) تناسخ کا مسئلہ ان میں بھی تھا چنانچہ جو شخص بے گناہ کو مارے اسے دوسری ولادت میں اس کا عذاب اٹھانا پڑتا تھا۔ ہمارے تصوف نے اس خیال کو زندہ کیا:

ہفصد و ہفتاد قالب دیدہ ام ہمچو سبزہ بارہا روئیدہ ام
ہزار بار خم و کوزہ کردہ اند مرا ہنوز تلخ مزاجم زمرگ شیریں کار

(4) صبح، دوپہر، آدھی رات، شام عبادت کے وقت تھے۔ اس میں یاد الٰہی کے زمزمے اور گیت ہوتے تھے۔ انھیں "گاتھا" کہتے تھے۔ یہ وہی لفظ ہوگا جس کے نام پر یہاں گیتا کتاب ہے۔ وید میں منتر ہیں۔ گاتھا کے اجزاء منترا کہلاتے ہیں۔ ہر گرہن کے

وقت خاص خاص طور پر عبادتیں بجالاتے تھے۔ لطیفہ یہ ہے کہ گرہن سنسکرت میں اس مصدر سے مشتق ہے جس کے معنے ہیں گرفتن۔ فارسی میں آج تک گرفتن آفتاب اور گرفتن ماہ محاورہ ہے۔

(5) خدائی کے کارکن بہت سے دیوتا یا فرشتے تھے۔ اور انھیں کاروبار دنیا میں صاحب اختیار سمجھتے تھے۔ یہ مسئلہ ہند، یونان اور روما وغیرہ کے اکثر قدیمی مذہبوں میں ہے۔ فلاسفہ عرب نے اس کا ترجمہ رب النوع کیا۔ آگ، پانی، ابر، بجلی، بہار، حسن، عشق، راگ رنگ اور وقت وغیرہ وغیرہ سب کے لیے ایک ایک دیوتا تھا۔ زرتشت نے آکر ان خیالات کو مٹایا۔ وہی پرانے خیال تھے جنھیں سعدیؒ نے رنگ توحید میں کہا ہے:

ابروباد و مہ خورشید و فلک درکاراند   تاتونانے بکف آری و بہ غفلت نخوری
ہمہ از بہر تو سرگشتہ و فرماں بردار   شرط انصاف نباشد کہ فرماں نہ بری

غور کرو تو دیوتاؤں کا معاملہ ایک طبعی خیال ہے کہ انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے چنانچہ متاخرین فارس کے دماغ سے بھی اپنے استعارات کی لہر میں کہیں کہیں ٹپک گیا ہے اور ظہوری سے اس کا ظہور اکثر ہوا۔ وہ سہ نثر کی حمد و نعت کے بعد بادشاہ کی تعریف میں کہتا ہے۔ "مژدہ شنیدن رالبہ گفتن سخن شہنشاہ چنیں و چناں۔" مطلب اس کا یہ ہے کہ وہ قوۃ کلیۃ شنیدن کی (یارب النوع سماعت) جس سے ہر کان کو فیضان سماعت پہنچتا ہے اسے خوشخبری ہو کہ میں فلاں ممدوح کی تعریف شروع کرتا ہوں۔ اس میں دو لطف ہیں۔ اول۔ یہ کہ ہر خاص و عام ایسے امر عالی شان کے سننے کے قابل نہیں۔ رب النوع سماعت سنے۔ دوسرے۔ جس وقت، وہ سنے گا تو فیض لطف اس کا خود بخود تمام جہان کو پہنچ جائے گا۔ ایک اور جگہ کہتا ہے۔ فضائے دیدن بہ صفحاتش گلشن۔ وسواد خواندن بہ بیاضش روشن۔ یہ بھی اسی جوہر کی چمک ہے کہ اندر سے لفظ میں چمکی ہے۔

قربانی بھی کرتے تھے اور اسے استی کہتے تھے۔ دیکھو۔ اسے سنسکرت میں اشٹی کہتے ہیں۔

جنیو اگرچہ بعینہ ایسا نہیں۔ مگر ایک رسی کمر سے لپیٹتے ہیں اور اسے گستی کہتے

ہیں۔

ہون بھی ہوتا تھا اس کا نام مجھے یاد نہیں رہا۔ مگر عبادت مذکورہ کے وقت جو آگ پر چمچہ سے گھی ڈالتے ہیں اسے آجوتی کہتے تھے۔ سنسکرت میں آہوتی کہتے ہیں۔

(6) پہلے یہاں اور وہاں۔ آسر۔ بہ معنی غالب تھا۔ رگھوید کے ابتدا میں اس سے آفتاب مراد ہے۔ زرتشت کے عقائد سے دونوں میں مخالفت پڑی۔ ہندو اہر کو شیطان قرار دیکر آسر کہنے لگے۔ ایرانی بدستور۔ اہر بہ معنی غالب سمجھ کر اہورا مزدا (ہرمزد) خدا کو کہتے ہیں (سنسکرت کا "س" فارسی میں "ھ" ہو جاتا ہے)

دیو کے معنے پہلے دونوں جگہ متبرک تھے۔ پارسیوں نے ہندوؤں کی ضد سے دیو بہ معنی شیطان بنا دیا۔ خیالات کا اتفاق پھر بھی قابل غور ہے کہ یہاں نیک اشخاص کو راکھسوں سے لڑایا ہے۔ وہاں دیوؤں سے لڑایا ہے۔ تم نے رامائن میں سنا ہوگا کہ جنگل کے جانوروں نے راون کے مقابلے میں رامچندر جی کی مدد کی۔ شاہنامہ میں کیومرث کا حال پڑھو۔ اس کے بیٹے کو دیو نے مار ڈالا۔ باپ نے دیوؤں پر فوج کشی کی۔ شیر' چیتے' بھیڑیے' جنگل کے درندے اس کی فوج میں داخل ہوئے۔ آخر دیوؤں پر شکست پڑی۔ درندوں نے انھیں چیر پھاڑ کر فنا کر دیا۔

تاتار کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ دیو سے اکثر اہل چین مراد لیتے ہیں کہ انھیں آکر ستاتے تھے۔ اسی واسطے دیو اکثر ایسے دشمن کو کہتے تھے جو قوت اور حیلہ و تدبیر میں ان سے چست اور غالب ہو۔

(7) اجرام آسمانی کی عظمت واجب اور تغیرات عالم میں انھیں موثر سمجھتے تھے۔ دبستان مذاہب میں سات سیاروں کی صورتیں لکھی ہیں۔ ہندی جوتش سے مطابق نہیں مگر مشابہ کہہ سکتے ہیں۔ ان کی مورتیں بنا کر پرستش کرتے تھے۔ ان کے گنبد اور اس میں پرستش کے طریقے اور دھونیاں جدا جدا تھیں۔

زحل کی مورت سنگ سیاہ کی بنائی تھی۔ بندر کا سر' آدمی کا بدن' سور کی دم۔

مشتری۔ خاکی رنگ' گدھے کا سر' اس پر تاج' تاج پر مرغ کا سر اور اژدھا۔

مریخ۔ مورت سنگ سرخ کی۔ داہنے ہاتھ میں تلوار۔ اس ہاتھ کو لٹکائے تھا۔

بائیں ہاتھ میں لوہے کا کوڑا علم کیے تھا۔

سورج کی مورت سونے کی ڈھلی ہوئی تھی۔ ایک آدمی گھوڑے پر سوار۔ دور خا چہرہ۔ دونوں سروں پر تاج۔ سات سات کنگرے۔ لعل و یاقوت سے مرصع۔ اژدھے کی دم۔ داہنے ہاتھ میں سونے کا عصا۔ جواہرات کا مرصع ہار گلے میں۔

زہرہ۔ آدمی کی مورت۔ سر پر سات گوشہ کا تاج۔ دست راست میں ایک تیل کا شیشہ۔ بائیں ہاتھ میں کنگھی۔

عطارد۔ سور کا سر، مچھلی کا دھڑ، سر پر تاج، داہنے ہاتھ میں قلم، بائیں میں دوات۔

چاند۔ ایک آدمی سفید گائے پر سوار، داہنے ہاتھ میں یاقوت کا عطا، بائیں میں تلسی کی ٹہنی۔

اسی واسطے ہر کام، لگن پوچھ کر اور ساعت دکھا کر کرتے تھے۔ جس دن جواہرات کانوں سے، پھول پھل باغوں سے، اناج کھیتوں سے، پشم بھیڑ بکری لوتوں سے لینی شروع کرتے تھے تو مبارک دن مبارک لگن دیکھ لیتے تھے۔ مہینے کا ایک دن، ایک ایک دیوتا یا فرشتہ کا تھا۔ ہفتہ کا ایک ایک دن، ایک ستارہ کا۔

افسانہ گو کا قاعدہ ہے کہ جن کا افسانہ کہتا ہے۔ ان کا ان کے ملک کا ان کے رسم و رواج کا جامہ پہن لیتا ہے۔ فردوسی اپنے شاہنامہ میں جہاں ان لوگوں کی زبانی باتیں کرتا ہے۔ ستاروں کا پر تو ضرور دیتا ہے مثلاً:

بدو گفت سہراب کائے خوب چہر به تاج و به تخت و به ماه به مہر
که ایں باره باخاک پست آورم ترا اے ستمگر بدست آورم

پھر کہتا ہے:

مگر چوں تو باشی بمردی و زور سپہرش دہد بہره کیوان و ہور

پھر کہتا ہے:

چنینم نوشتہ بداختر بہ سر کہ من کشتہ گردم بدست پدر

اگرچہ اسلام نے ان اعتقادوں کو بالکل مٹا دیا مگر ان کا خیال نہ مٹ سکا۔ شیخ سعدی

ایک پردہ کے ساتھ کہتے ہیں :

ابروباد و مہ و خورشید و فلک درکار اند تا تو نانے بہ کف آری وبہ غفلت نہ خوری

موکلے کہ تعین است بر خزائن باد چہ غم خورد کہ بمیرد چراغ بیوہ زنے

خواجہ حافظ کہتے ہیں :

مزرع سبز فلک دیدم و داس مہ نو یادم از کشتہ خویش آمد و ہنگام درو

تکیہ بر اختر شب گرد مکن کیں عیار تاج کاؤس ربود و کمر کیخسرو

ان کی خصوصیت نہیں۔ ہر شاعر نے اپنے اپنے طور پر یہ مضمون باندھے ہیں۔

(8) گائے کی محبت ان کے سینوں میں دلنشین تھی اور اس کا سبب عام شفقت یا حق شناسی معلوم ہوتی ہے جو ہمیشہ نیک دلوں میں رہتی ہے۔ گرشاسپ نامہ میں لکھا ہے کہ سیستان میں ایک بادشاہ تھا اس کی بیٹی جمشید کے محل میں تھی۔ اور نور یعنی گرشاسپ کا پرداد اختر مذکور کے بطن سے تھا۔ وہ گائے کی عظمت کرتا تھا۔ گاورنگ اس کا نام تھا۔ اسدی طوسی نے گرشاسپ نامہ میں لکھا ہے :

مرآں شاہ را نام گورنگ بود کزو تیغ و فرہنگ بے رنگ بود

نوشیرواں کا چچیرا بھائی حاکم مازندران اسی محبت سے گاویار کہلاتا تھا۔ نژاد نامہ میں اس کا حال توضیح سے لکھا ہے۔

ابوریحان البیرونی نے آثار الباقیہ میں لکھا ہے کہ مملکت مذکور میں 7 بادشاہ ایسے ہوئے ہیں جنھوں نے گائے کی محبت اور عظمت سے اسے اپنے نام کا جز قرار دیا تھا۔

پارسی لوگ مہرگان کے دن عید کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ آج کی رات ایک گائے ظاہر ہوتی ہے۔ سونے کے سینگ ' چاندی کے کھر ' ایک جلوہ دکھا کر غائب ہو جاتی ہے۔ جسے نظر آتی ہے اس کا تمام سال عیش اور خوشحالی میں گزرتا ہے۔

گائے کی عظمت کا سبب ایک اور تاریخی افسانہ ہے اور چونکہ اس میں چند اور الفاظ کی دلچسپ توضیح ہوتی ہے۔ اس لیے بیان کرتا ہوں کہ فارسی کے مبتدی شوقینوں کے لیے سرمایہ آگاہی ہوگا اور یہ بھی دیکھیں گے کہ ملک کی انشاپردازی اپنے ملک کی تاریخ کن اشاروں سے بتاتی ہے۔

ماران ضحاک۔ جب ضحاک نے بلاد عرب سے اٹھ کر جمشید کی سلطنت کو خود پرستی کے گناہ اور غفلت کی سزا دی تو شہنشاہی کا تاج سر پر رکھا اور ایسا ظلم و ستم کرنے لگا کہ تمام ایران گھبرا اٹھا۔ اس کے دونوں شانوں پر دو پھوڑے نکل آئے۔ لوگ کہتے ہیں کہ گناہوں کی سزا میں خدا نے دو سانپ بھیجے تھے۔ بہر حال طبیبوں نے آدمی کا بھیجا درد کی دوا یا سانپوں کی غذا نکالی۔ گھر گھر سے باری باری دو نوجوان بے گناہ لیکر مارے جاتے تھے۔

مایہ مایون ضحاک۔ کو ہر وقت خاندان شاہی کی طرف سے کھٹکا لگا رہتا تھا۔ جسے کیانی سنتا تھا مروا ڈالتا تھا۔ ایک حاملہ بی بی جان بچا کر بھاگی اور پہاڑوں میں گھس کر کسی گاؤں میں رہنے لگی۔ بچہ پیدا ہوا۔ اس کا نام فریدوں رکھا۔ نحوست کی گرمی نے دودھ سکھا دیا۔ خدائی رحمت نے ایک گائے بھجوا دی۔ اس کا نام مایہ یا مایون رکھا' کیونکہ مایہ پرورش تھی۔ ادب سے برمایہ اور برمایون بھی کہتے تھے۔ اسی حالت کے بیان میں فردوسی تقدیر کی زبانی کہتا ہے:۔

یکے گاؤ برمایہ خواہد بدن جہاں دار را دایہ خواہد بدن

قدرت الٰہی اقبال کے فرزند کو پہاڑوں میں پال رہی تھی۔ نجومی اور فال بین ہر وقت دربار میں لگے رہتے تھے۔ ظالم کو خبر دی کہ ماں بچے سمیت فلاں مقام میں ہے۔ سنتے ہی خود روانہ ہوا۔ جب اس کی آمد آمد کی خبر اڑی۔ عاجز بی بی نے بچے کو تعویذ کی طرح گلے سے لگایا اور اس گاؤں سے سرک گئی۔ مایہ رہ گئی۔ خونخوار نے جل کر اسے مروا ڈالا۔

درفش کاویانی۔ کاوہ ایک لہار تھا مگر صاحب خاندان 70 بیٹے پوتے اپنے تن کے رکھتا تھا۔ ایک دن اس کے بیٹے بھی سانپوں کے حصے میں گئے۔ لہار لوہے کی طرح لال ہو گیا۔ مگر بڈھا کہن سال تھا۔ حب قومی کے خون کو گرما کر اٹھا۔ اس نے اپنے پیش بند چمڑے کو ایک بانس پر باندھ کر حب قوم کا نشان قرار دیا۔ قوم کے نام پر ہزاروں آدمی امنڈ پڑے اور ان ستم رسیدوں کا شمار نہ تھا جو سمجھتے تھے کہ مدتوں کے بعد خدا نے دعا قبول کی ہے۔

گرز گاؤ سر۔ جب حب قوم کی آگ سلگی تو اقبال کا فرزند پہاڑوں میں پل کر جوان ہو گیا تھا۔ قوم کے حامیوں نے اسے پتھروں سے اٹھا کر جواہر نگار تخت پر بٹھا دیا اور ضحاک پر لشکر لیکر آئے کہ حق دار کو حق دلائیں۔ کاوہ کا لوہا تیز نکلا۔ حمایت قومی فتح یاب ہوئی اور ایسا جبار قہار بادشاہ باوجود خزائن شاہی اور سامان و لشکر کے گرفتار ہوا۔ فتح یاب فریدوں نے حب قوم کے چمڑے کو مبارک سمجھ کر لعل جواہر اور موتیوں سے مرصع کیا اور درفش کاویانی نام رکھا۔ محبت کا دودھ جوش میں آیا۔ پیاری برمایہ کی یاد میں اپنے گرز فولادی کو کلہ گاہ کی مورت میں ڈھالا (فردوسی نے کہا):

بیامد فریدوں بجائے نشست ہماں گرزہ گاؤ پیکر بدست

تمام ایرانی پہلوانوں نے پیروی کی۔ آج تک گرز گاؤ سر۔ گاؤ سار۔ گاؤ پیکر۔ گاؤ چہر سے فصحا اپنے کلام پر شوکت کے سینگ نکالتے ہیں اور فریدون کے ساتھ برمایہ کے نام کو بھی زندہ کرتے ہیں۔ دقیقی نے ایک بہاریہ قصیدہ کا کیا خوب مطلب کہا ہے۔ ذرا وقت کی زبان پر بھی خیال کرنا:

نو بہار آمد، جشن ملک افرودنا واں کجا گاؤ نکو بودش برمایونا

غور کرو۔ کل ملک میں تاریخ کی واقفیت عام تھی جبھی انشا پردازی میں ایسے اشارے مزہ دیتے تھے۔ اگر ان فصیحوں کے کلاموں کو کوئی نہ سمجھتا تو وہ کب کہتے۔

چاہ بیژن: "کے خسرو" کے عہد میں بیژن ایک نامی پہلوان نوجوان۔ عالی خاندان تھا۔ وہ گودرز یعنی کاوہ کے پوتے کا پوتا 'گیو کا بیٹا اور رستم کا بھانجا تھا۔ بادشاہ کے دربار میں سرحد ایران کے لوگ فریادی آئے کہ ہمارے علاقہ میں جنگلی سور کوہ دشت سے آگئے۔ کھیتوں کو برباد اور لوگوں کو مار مار کر فنا کیے دیتے ہیں۔ کیخسرو نے حکم دیا کہ ایک پہلوان کچھ فوج لے جائے اور انہیں فنا کر دے۔ بیژن نے بڑھ کر اجازت چاہی کہ فدوی اکیلا کافی ہے۔ حکم ہوا کہ من چلا بہادر ابھی نوجوان ہے۔ گرگین پہلوان پرانا سپاہی اس کے ساتھ جائے۔ دونوں گئے۔ صحرائی لوگ بھی ساتھ ہوئے اور سوروں کو مارنا شروع کر دیا۔ نوجوان بہادر مارتا مارتا افراسیاب کے ملک میں جا پہنچا۔ وہاں ایک شاداب گلزار تھا کہ افراسیاب کی بیٹی منیزہ اپنی سہیلیوں کو لیکر آیا کرتی تھی اور بہار کی

خوبی اور صحرا کی سرسبزی سے دل خوش کرتی تھی۔ ان دنوں میں وہ آئی ہوئی تھی۔ نوجوان نے اس عالم پرستان کو دیکھا۔ اس نے اسے دیکھا۔ دونوں کے دل پھنس گئے۔ کئی دن وہاں رہے۔ جب منیزہ گھر جانے لگی تو بیژن کو چھپا کر ساتھ لے گئی اور محلوں میں چھپا رکھا۔ افراسیاب کو خبر ہو گئی۔ آگ ببولا ہو گیا۔ بیژن کو پکڑ کر سیہ چاہ میں قید کر دیا۔

بیژن کا اس طرح پھنسنا سہل بات نہ تھی۔ ایران میں خبر پہنچی۔ رستم دربار میں طلب ہوا۔ مصلحت کے بعد ایک سوداگری کا کاروان باندھا۔ رستم کارواں سالار بنے۔ بہت سے پہلوانوں کو سامان جنگ سمیت صندوقوں میں چھپایا۔ بہتوں کو ساربان بنایا اور دارالخلافہ توران میں پہنچے۔ دن کو مقام کیا۔ سارے حالات معلوم کیے۔ رات کو۔ اپنے پہلوانوں سمیت پہلے سیہ چاہ پر پہنچے۔ بیژن کو نکالا۔ پھر افراسیاب کے محلوں پر پہنچے۔ غافل بے خبر پڑے سوتے تھے۔ پہلوان کمندیں ڈال قلعہ میں کود پڑے۔ جن کی قضا تھی، مارے گئے۔ باقی اٹھ اٹھ کر بھاگ گئے۔ یہ اپنے صندوق لوٹ کے مالوں اور خزانوں سے بھر۔ منیزہ کو لے ایران میں داخل ہوئے۔ اسی قصہ کا اشارہ کیا ہے خاقانی نے:

چو بیژن داری اندر چہ مجسپ افراسیاب آسا
کہ رستم در کمین است و نہنگے زیر خفتانش

چاہ رستم: شغاد رستم کے بھائی نے بھائی کی ناموری کے رشک سے ایک شب اس کی دعوت کی اور رستے میں کنوئیں کھود کر اوپر گھاس بچھا دی۔ اندر برچھیاں تلواریں خنجر وغیرہ کھڑے کر دیئے۔ رستم رات کو بے خبر گیا۔ رخش سمیت کنوئیں میں گر پڑا۔ بے نظیر گھوڑے نے ہمت کر کے جست کی تو دوسرے کنوئیں میں جا پڑا۔ پھر جست کی تو اور کنوئیں میں تھا۔ آخر کہاں تک۔ رہ گیا۔ اور بھائی کی بے مہری سے بھائی کی جان گئی۔

سیمرغ۔ سام رستم کا دادا تھا۔ اور زال رستم کا باپ تھا۔ جب سام کے گھر میں زال پیدا ہوا تو اس کے تمام بدن پر سفید بال تھے۔ دائی نے پہلوان جہاں کو خبر کی۔ وہ

پہلوان نامی پشت در پشت مملکت ایران کا حامی اسے بدنامی کا سبب سمجھا۔ کچھ غمگین ہوا کچھ شرمندہ ہوا اور بچہ کو چپ چپاتے دامن کوہ میں رکھوا دیا۔ وہاں سے کوئی کہتا ہے کہ ایک سیمرغ نے بچے دیئے تھے وہ اٹھا لے گیا کہ انہیں چونگا دے۔ اس کے دل میں خدا نے رحم ڈالا اور بچوں کے ساتھ پرورش کیا۔ جب وہ بڑا ہوا تو سام نے خواب میں دیکھا کہ بیٹا جوان ہوا اور یکہ پہلوان ہوا۔ فلاں مقام پر موجود ہے۔ چنانچہ گیا اور لے آیا۔ چلتے ہوئے سیمرغ نے اسے اپنے کئی پر دیئے کہ جب کوئی مشکل پیش آئے تو ایک پر کو آگ دکھائیو میں فوراً آکر مدد کروں گا۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوتا رہا۔

بعض کا قول ہے کہ سیمرغ ایک زاہد پرہیز گار دنیا کو چھوڑ کر اس پہاڑ میں رہتا تھا اس نے زال کو پالا تھا۔ وہی ہر ایک موقع پر اس کی مدد کیا کرتا تھا۔

سیاوش۔ کاؤس بادشاہ ایران کے محل میں ایک بچہ پیدا ہوا۔ نجومیوں نے زائچہ دیکھ کر کہا کہ یہ لڑکا منحوس ہے۔ رستم دربار میں حاضر تھا۔ وہ اقبال کا پہلوان نحوست کو کب مانتا تھا۔ اس نے بادشاہ سے مانگ لیا اور سیستان میں جاکر پرورش اور تربیت کیا۔ جب بڑا ہوا تو ایک دن دربار میں آیا اسے بھی ساتھ لایا۔ بادشاہ دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ خون نے جوش مارا اور کہا کہ ہمارے پاس رہا کرے۔ کاؤس کی ایک چاہیتی بی بی اس پر عاشق ہو گئی اور در پردہ پیغام کیا۔ سیاوش نے انکار کیا۔ وہ دشمن ہو گئی اور کاؤس سے الٹی چغلی کھائی۔ وہ بھی رستم کا پالا ہوا تھا۔ گفتگو نے طول کھینچا۔ آخر آگ بھڑکائی گئی۔ سیاوش اپنے سچ کے دعوے پر اس میں گیا اور بال بال سلامت نکل آیا۔

خون سیاوش۔ سیاوش باپ کی طرف سے دل شکستہ رہتا تھا۔ افراسیاب نے پیغام سلام بھیج کر اسے اپنی دامادی اور ملک کی بادشاہی پر للچا کر بلایا۔ وہ توران میں چلا گیا۔ بد عہد افراسیاب نے چند روز کے بعد بیٹے کے اغوا سے داماد کو مروا ڈالا۔ رستم انتقام کا لشکر تیار کر کے پہنچا۔ افراسیاب کو شکست دی۔ ملک کو لوٹا مارا اور کیخسرو سیاوش کے بیٹے کو لے آیا۔ خون سیاوش یعنی خون بے گناہ اسی قصے کا اشارہ ہوتا ہے۔ جہاں اس کا خون گرا تھا وہاں ایک قسم کی گھاس اگی کہ قدرت خدا سے اکثر امراض کی دوا ہے۔ اس کا نام پرسیاوشاں ہے۔ اور شبرنگ۔ سیاوش کا گھوڑا۔

شیریں و فرہاد کی سرگزشت کے مختلف اشارے، کوہ بے ستون کا تراشنا، قصر شیریں کا بنانا، جوئے شیر کا لانا، کوہکن کا لقب پانا، بڑھیا کے فریب سے سر پھوڑ کر مر جانا۔

اسی میں خسرو پرویز، اس کا باربد ماہر موسیقی، زردست افشار، سات خزانے، ان کے بہم پہنچنے کا جدا جدا افسانا اور شیریں کا گھوڑا گلگوں۔

نوشیروان کا عدل۔ مداین میں اس کا ایوان عدالت، اس میں بڑھیا کے جھونپڑے کی رعایت رکھنی اور ایوان شاہی کی ناموزونی گوارا کرنی۔ وغیرہ وغیرہ ہیں کہ انشا پردازی کے قلم سے جا جا تاریخ کے پھول جھڑتے ہیں۔ ہر ایک کے لیے نثر کے فقرے یا نظم کے شعر لکھوں تو کلام بے لطف ہو جاتا ہے۔

(9) برہمنوں کی جگہ ان کے ہاں موبد اور دستور ہوتے تھے۔ علم و فضل کی آگاہی اور نیکی اور پرہیزگاری کے سبب سے بادشاہ، امیر، غریب سب ان کی عظمت کرتے تھے۔ شادی غمی اور گھروں کے بڑے بڑے معاملات بغیر ان کے سرانجام نہ ہوتے تھے۔ ان کا چرن امرت آنکھوں سے لگاتے تھے کہ نجات ہو۔ پیتے تھے کہ برکت اور شفا ہو۔ انشائے فارس اس رسم کا پتا بتاتی ہے۔ فردوسی ایسے موقع پر ضرور موبد کو لاتا ہے۔ موبد پاک، نیکو نہاد، نیکو سرشت ان کی صفت واقع ہوتی ہے۔

(10) وہ لوگ جنتر یا منتر یا طلسموں کی برکت سے مقدسان آسمانی کا فیض حاصل کر لیتے تھے اور نحوستوں اور بلاؤں سے محفوظ رہتے تھے:

بہ بازوئے رستم یکے مہرہ بود که آں مہرہ اندر جہاں شہرہ بود
بدو داد و گفتش کہ ایں را بدار اگر دختر آرد ترا روزگار
بگیرد بگیسوئے او بر بدوز بہ نیک اختری فال نیکو فروز
در ایدوں کہ آید زاختر پسر بہ بندش بہ بازو نشان پدر
بہ بالائے سام نریماں بود بہ مردی و خوئے کریماں بود

اور شاعر کہتا ہے۔

نقشے کہ بر زر است ندانی کہ سر سری ست

ایں گردنامہ ایست کہ پیدا کند پری

اسی علاقہ کی سرزمین سے مجھے چند دانے نگینوں کے ملے جن پر کچھ کچھ گھسے پسے نقش موجود ہیں۔ وہ طلسم معلوم ہوتے ہیں اور ان کی وضع اور تراش سے اور ان میں جو سوراخ ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈورا ڈال کر گلے میں پہنتے تھے یا بازوؤں پر باندھتے تھے۔

(11) شگون کو مانتے تھے اور غور کرو تو اتنی ہی بات کافی ہے کہ سعادت و نحوست کے خیالات پہلے تھے جب شگون کا لفظ زبان میں پیدا ہوا ورنہ لفظ کہاں سے ہوتا اور دیکھو! اس میں بھی دونوں قومیں متفق ہیں۔ شگن سنسکرت ہے۔

مبارک آدمی کا منہ صبح کو دیکھتے تھے تو سمجھتے تھے کہ آج تمام دن خوشی سے گزرے گا۔ منحوس نظر آئے تو دن بھر نحوست۔ سعدی اپنی شاعری میں خبر دیتے ہیں:

خورم آں فرخندہ طالع را کہ چشم افتدش بر روئے تو ہر بامداد
ہر کس بہ تمنائے فال از رخ او گیرد بر تختہ فیروزی تا قرعہ کرا باشد

یہی شگون نیا چاند دیکھ کر اور نئے سال پر بھی سمجھتے تھے۔ نظامی:

بہ فرخندگی فال زن سال و ماہ کہ فرخ بود سال فرخندہ ماہ

ہمیشہ نیک کلام زبان سے نکالتے تھے اور اس کا نیک اثر سمجھتے تھے۔ خلاف اس کے برخلاف۔ نظامی:

مبارک بود فال فرخ زدن نہ بر رخ زدن بلکہ شہ رخ زدن
مزن فال بد کا درد حال بد مبادا کسے، کو زند فال بد

انسان کے یا گھوڑے وغیرہ کے آنے یا خریدنے سے بھی نیک و بد شگون نکالتے تھے۔ جب کسی زبان کی انشا پردازی نے فرخ پے، فرخندہ پے، وغیرہ وغیرہ محاورے لکھے۔ سمجھنے والا فوراً سمجھ گیا کہ قوم کا یہ خیال تھا۔

چہ میدانی اے خضر فرخندہ پے کہ ازمے مراہست مقصود مے

ان کی انشا پردازی خبر دیتی ہے کہ عام باتوں کو بھی نیک اور مبارک لفظوں میں ادا کرتے تھے چنانچہ نحس قدم کو سبز قدم کہتے تھے۔ چراغ اور شمع کے بجھنے اور بجھانے کے

لیے مردن اور کشتن کا لفظ ہے۔ فصیح فارس اپنے محاورہ میں کہتا ہے۔ قدرے روغن در چراغ کن کہ گل میشود۔ شمع را زیر دامن بگیر کہ خاموش نشود۔

چراغ گل کنید۔ شمع گل کنید۔ دروازہ بند کرنا ہو تو کہتے ہیں۔ مغمور کنید۔ کوئی چیز ہو چکے تو کہیں گے برکت شد۔ جلسہ میں کسی کا ذکر آئے اور وہ موجود نہ ہو تو کہیں گے۔ احمد کہ جائش سبز است ہمن گفتہ بود۔ یا۔ احمد کہ یادش بخیر باد ہمن خبر دادہ بود وغیرہ۔ کسی کے جواب میں انکار کرنا ہو تو۔ نہیں۔ نہ کہیں گے مثلاً ایک شخص صبح کو تمہارے گھر آیا۔ تم نے پوچھا۔ ناشتا کردید ؟ وہ کہتا ہے۔ قبلہ خیر (ناشتا نہیں کیا)۔

ہما۔ دونوں قومیں اس خیال میں متفق تھیں کہ جس کے سر پر ہما کا سایہ پڑے وہ بادشاہ ہوتا ہے۔ اسی واسطے اس کے پر تاج شاہی میں لگاتے تھے۔

ہمائے اوج سعادت بدام ما افتد اگر ترا گزرے بر مقام ما افتد

ہمایوں کو جب بہ معنی مبارک دیکھے گا تو صاحب نظر سمجھے گا کہ ہما میں کوئی برکت ضرور ہے۔

ہمایوں منزلے کاں خانہ را ماہے چنین باشد
مبارک کشورے کاں عرصہ را شاہے چنیں باشد

الو، کوے اور چیل کو وہ بھی منحوس سمجھتے تھے۔ اسی سے ہے۔ زاغ دل ' سیاہ دل ' سعدی :

ماری توکہ ہر کجا بہ بینی بزنی یا بوم کہ ہر کجا نشینی بکنی
خسرو زاغ دلاں را قفس شوم دہ مغز غلیواز و سر بوم دہ

آب بر آئینہ ریختین۔ عہد قدیم میں دستور تھا کہ جب کوئی سفر کو جاتا تھا تو رشتہ دار یا دوست آشنا اس کے پیچھے آئینے پر ایک سبز پتا رکھ کر پانی ڈالتے تھے اور پانی کے بہنے اور پتے کو بہانے سے یہ مراد تھی کہ وہ بھی اسی طرح جلد منہ دکھائے۔ ہندوستان میں پان۔ رکھتے ہیں۔

سبز اور سرخ رنگ کو اچھا اور مبارک سمجھتے تھے۔ سیاہ کو منحوس اور ماتمی۔ چنانچہ سیہ گلیم سے بدبخت و بے دولت مراد ہے۔ سیہ سال = قحط سال۔ سیہ کاسہ = مفلس منحوس۔

سہ پستان = جس عورت کا بچہ نہ جئے۔ سیہ پوش = ماتمی۔

فال شانہ۔ ولائتیوں کے دسترخوانوں پر اکثر دیکھا گیا کہ پلاؤ کی قابوں میں جب شانہ کی ہڈی ثابت نکل آتی ہے تو بعض اشخاص اب تک استخوان مذکور کو ورق کتاب کی طرح دیکھتے ہیں اور آئندہ یا غائب کی خبر دیتے ہیں۔ اسی کو فال شانہ یا شانہ بینی کہتے ہیں۔

جب اکبر نے گجرات پر یلغار کی تو رستہ میں ایک مقام پر کھانا کھانے کو اتر پڑے۔ ہمراہی ادھر ادھر پھرنے لگے۔ ایک ہرن نظر آیا۔ اکبر نے ایک چیتا اس پر چھوڑا اور کہا کہ شگون لیتے ہیں اگر چیتے نے مار لیا تو جانو کہ ہم نے غنیم کو مارا۔ ہرن نکل گیا تو سمجھو کہ وہ بھی نکل جائے گا۔ چیتے نے دو ہی جستوں میں شکار مار لیا۔ دسترخوان پر بیٹھے تو ایک ہزارہ حاضر تھا (اس قوم میں اکثر اشخاص کو شانہ بینی میں خوب نظر ہوتی ہے) کسی قاب میں شانہ کی ہڈی نکلی۔ ایک امیر بولا کہ ملا! دیکھو اس یلغار کا انجام کس کی فتح پر ہے۔ اس نے بغور دیکھا اور کہا کہ فتح ہماری ہے مگر ایک سردار ہمارا کام آئے گا۔ چنانچہ فتح ہوئی اور یوسف خاں اکبر کا کوکلتاش مارا گیا۔ صائب نے اس مضمون کو عجب لطف سے باندھا ہے لوزجیا اس کی فقط لفظ شانہ پر رکھی ہے کہ فارسی میں کنگھی کو بھی کہتے ہیں اور ایران میں اکثر چوب شمشاد کی کنگھیاں بنایا کرتے ہیں:

خواہد فتاد دامن زلفش بدست ما ایں فال راز شانہ شمشاد دیدہ ایم

خواب کے نتیجوں پر اعتبار کرتے تھے۔ دیکھ لو انشا پردازی میں بھی ہزاروں مضامین نظم و نثر میں ہیں جو کہ اس خواب پریشاں کی تعبیر دیتے ہیں۔

پری۔ جن۔ بھوت وغیرہ کو مانتے تھے۔ ان کی انشا پردازی کو تم بھی دیکھتے ہو۔ تمام پرستان سے آباد ہے اور بیابان غولوں سے۔

چوٹی سر پر ضرور رکھتے ہوں گے کیونکہ کتابوں میں اس کے لئے لفظ چتر موجود ہے اور اکثر اہل ایران اب تک رکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ نزلہ کو مفید ہے۔ اب کاکل کہتے ہیں۔

مملکت مذکور میں بادشاہ کی تعظیم، خدائی تعظیم تھی جس طرح وہ مرتبہ اور حکومت میں سب پر فوقیت رکھتا تھا۔ اسی طرح نیک نیتی اور نیکوکاری میں بھی سب سے افضل ہوتا تھا۔ وہ گالی سے زبان آشنا نہ کرتا تھا۔ فاحشہ، مسخرے، دیوانے صحبت میں نہ جاسکتے تھے۔ جو ایسے اوصاف نہ رکھتا ہو وہ بادشاہ نہ ہوتا تھا۔ اگر اتفاقاً ہو جائے تو معزول ہو جاتا تھا۔ بادشاہ اپنا ولی عہد جس بیٹے کو چاہتا تھا آپ کر دیتا تھا اور چونکہ آئین فرہنگ کے بموجب ہوتا تھا اس لیے اگر دوسرے بیٹے کو اس کا حکم ناگوار ہو تو اپنی بد نفسی سمجھ کر خود دل میں شرمندہ ہوتا تھا چنانچہ ایک شاہزادے نے خواب میں دیکھا کہ باپ نے میرے بھائی کو بادشاہ کر دیا ہے اور اس عالم میں مجھے یہ امر ناگوار ہوا ہے۔ اٹھ کر آپ اپنے تئیں مار ڈالا۔

یہی عظمتیں خاص و عام کی آنکھوں میں سمائی تھیں اور محبتیں دلوں پر چھائی تھیں کہ ملک کی زبان نے اکثر بڑائی اور تعریف کے خیالات کو لفظ شاہ سے ترکیب دیکر مضمونوں کی شان بڑھائی ہے۔ جو اور زبانوں میں نہیں ہے مثلاً شہ رگ، شاہ راہ، شہسوار، شاہ مرکب، شہباز، شاہین، شاہ بیت، شاہ کاسہ، شہتیر، شاہ بز، شاہ دارو، خسروانی وغیرہ بیسیوں لفظ ہیں کہ اب عام محاورے ہو گئے ہیں۔

اہل دربار یا رعایا اپنے بادشاہ کا نام بڑی تعظیم سے لیتے تھے۔ سلطنت کی یہ عظمت تھی کہ اس کی قسم کھاتے تھے۔ تم نے ابھی سنا سہراب نے تاج و تخت کی قسم کھائی۔ بادشاہ کے نام پر کوئی جھوٹی قسم کھاتا تو اس سے ملنا چھوڑ دیتے تھے (یہ بھی وہی اشارہ ہے کہ برادری کا باہر 'حقہ' پانی بند) کوئی شخص بادشاہ کی طرف سے آتا یا سفر میں جاتا ہوا کسی کے گھر میں اترتا تو اس کے پاؤں کا دھوون لیکر تبرک کی طرح رکھتے اور خدمتگاروں کی طرح کام کو حاضر رہتے۔

ننگ و ناموس رعایا کی بڑی رعایت تھی کیونکہ شاہ ان کا حقیقی باپ اور سلطنت

ماں۔ آئین مہ آباد میں بڑی تاکید تھی کہ رعایا آرام سے رہے۔ اسے کسی طرح کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ انشا پردازوں کی تحریریں اس پر محضر شہادت ہیں۔ خصوصاً شیخ سعدی کی تصنیفات:

میازار عامی بہ یک خردلہ کہ سلطاں شبانست و عامی گلہ
چو پرخاش بیند و بیداد ازو شباں نیست گرگ است فریاد ازو

ایک اور جگہ کہا ہے:

نہ آں شوکت و پاد شاہی بماند نہ آں ظلم بر روستائی بماند

جب نوشیرواں مالگزاری کے آئین باندھ چکا تو بابک کو بلایا کہ لشکر کی موجودات اس کا ذمہ تھا۔ اس سے کہا۔ چاہتا ہوں کہ ملک سے جو خراج وصول ہوتا ہے بیکار نہ جائے۔ فوج میں ایک آدمی ہزار درم۔ ایک سو درم کے لائق ہے۔ ایک ہوتا ہے کہ تیر جوڑنا بھی نہیں جانتا۔ اور تیر اندازوں کی تنخواہ لے جاتا ہے۔ ایک تلوار کا ہاتھ نہیں مار سکتا اور تلواریوں کی تنخواہ لیتا ہے۔ ایک کے پاس ہتھیار ہی نہیں اور پورے سپاہیوں کی تنخواہ پاتا ہے۔ یہ مجھ پر ظلم ہے۔ میں سپاہی اور رعیت پر ظلم نہیں کرتا۔ چاہئے کہ وہ بھی مجھ پر ظلم نہ کریں۔ یہ کام تیرے حوالے کرتا ہوں اور مملکت کا خزانہ سپرد کر کے پورا اختیار دیتا ہوں۔ اپنے قلعہ کے آگے میدان میں تیرے لئے نشیمن بنواتا ہوں۔ وہاں بیٹھ اور فوج کی موجودات لے۔ ہر شخص کا حلیہ اور نام اور پتا قلم بند کر۔ چنانچہ ہر سپاہی کے لیے زرہ، جوشن، کمند، خود اور دستانے۔ چاہئیں۔ زین، رکاب اور برگستوان سب درست ہوں۔ زین کے آگے ترکش تیروں سے بھرا ہوا۔ بائیں ہاتھ پر قربان جس میں دو کمانیں زہ کی ہوئی۔ اور دو زہ زیادہ لپیٹی ہوئی۔ کندھے پر آویزاں رہیں کہ کمان کی ایک زہ بگڑ جائے تو اپاہج نہ رہ جائے۔ جس سپاہی کے پاس سب سامان درست ہو لکھ لے۔ جس دن ان میں سے کوئی چیز کم ہو۔ درم کاٹ لے اور جس کے پاس سب چیزیں موجود ہوں۔ اس کی سوار کاری دیکھے۔ پھر ایک ایک ہتھیار میں اس کی کاروائی دیکھے۔ جو سب طرح پورا ہو چار ہزار درم سے زیادہ تنخواہ نہ دے۔ پیادوں میں جو سب میں گھٹ کا ہو۔ اسے سو درم سے کم نہ چاہیے۔

غرض بابک کو سب باتیں سمجھا کر خلعت دیا اور پریٹ پر جگہ مقرر کر کے مسند ستی 28 مسند کے ساتھ پیش گاہ مقرر کی۔ عملہ انتظام کے لیے دیا اور فوج میں حکم بھیج دیا کہ سب آکر موجودات دیں کہ دفتر میں نام لکھا جائے۔ تیاری کے لیے تین دن کی مہلت دی گئی۔

چوتھے دن بابک پریٹ پر آکر بیٹھا۔ تمام فوج حاضر ہوئی۔ اس نے سب کو دیکھا اور کہا "جاؤ جسے حاضر ہونا چاہیے تھا وہ نہیں نظر آتا۔" سب چلے گئے۔ نوشیرواں نے سن کر جانا کہ سپہ سالار نہ گیا ہوگا۔ دوسرے دن پھر سب فوج حاضر ہوئی۔ بابک نے دیکھ کر پھر وہی کہہ دیا "جاؤ جسے آنا چاہیے تھا وہ نہیں آیا۔" پھر چلے گئے۔ نوشیرواں نے سنا۔ مگر نہ سمجھا کہ کے چاہتا ہے۔ تیسرے دن بابک نے چاؤش سے کہا۔ بآواز بلند کہہ دو! "صاحب تاج و تخت کو چاہئے کہ حاضر ہو (سب میں بڑا سپاہی وہ ہے اسے سب سے پہلے نمونہ دکھانا چاہیے) اور موجودات میں نام لکھوائے" دوسرے دن نوشیرواں نے خود سر پر رکھا۔ سب ہتھیار سجے اور اسی طرح سوار ہو کر میدان میں آیا۔ بابک نے جب اسے دیکھا تو کہا۔ "اے بادشاہ مجھ سے تو تیرے کام میں بھی کمی نہیں دیکھی جاتی۔" نوشیرواں نے اپنے اوپر خیال کیا دیکھا دو زہیں کمان کی بھول گیا۔ اسی وقت منگا کر پیچھے لٹکائیں اور موجودات دی۔

غرض ایک ایک سپاہی بابک کے سامنے سے گزر گیا۔ جب موجودات ہو چکی تو بولا کہ اے بادشاہ! تو صاحب تخت و تاج ہے تیری تنخواہ اوروں سے کچھ زیادہ ہونی چاہیے۔ نوشیرواں نے کہا تجھے اختیار ہے۔ بابک نے اس کے لیے چار ہزار ایک درم لکھے۔ دوسرے دن دربار میں آکر کہا کہ حضور کے لیے میں نے ایک ہی درم زیادہ لکھا ہے کہ اوروں کو ترقی مانگنے کا موقع نہ ہو۔ نوشیرواں نے کہا کہ میں تیری نصیحت سمجھا۔ اور حق تیرا مانا۔ جو مصلحت کے لیے مجھ پر سختی کرے۔ میں اس کی برداشت کروں گا۔ چنانچہ خلعت دیا اور عزت سے رکھا (یہی باربک ہے جس کا مخفف بابک کتابوں میں لکھا ہے)

وزیر وہ شخص ہوتا تھا جو سب سے بڑا مہندس ہو۔ اس سے کم اس کے ماتحت ہوتے

تھے۔ ہر شہر میں ایک اندازہ گیر (مہندس) اور ایک ارشیا[29] (محاسب) وزیر ہوتا تھا۔ اسے رعایا زرمالیہ دیتی تھی۔ اس کے نیچے اور اہلکار ہوتے تھے۔ ہر قصبہ اور قریہ میں ایک ایک دستور رہتا تھا۔ وہاں کے مالیات کے کام اسی کے متعلق تھے۔

وزیر کے ماتحت دو استوار (امین) ہوتے تھے۔ دو شدہ بند (وقائع نویس) ہوتے تھے اور بہت سے توند روند[30] (خبر رساں) اس کے ماتحت ہوتے تھے۔ سامان سالار (میر سامان) خبر کار (داروغہ)۔ اپنے اپنے کام سرانجام کرتے تھے۔ فوج میں لاکھ پر ایک سپہبد۔ ان سے نیچے کئی کئی سر ہزار کے بردار۔ پھر سینکڑوں پر سردار۔ پھر دہاکوں پر سردار۔ پھر 55-44 کے افسر۔ ۱۰ کا افسر سالار 100 کا سپہدار کہ ہندوستان میں بخشی اور ایران میں (کئی سو برس گزرے) لشکر نویس کہلاتا تھا۔ بادشاہ کے پاس بارنگار (چوکی نویس) دن رات حاضر رہتا تھا کہ دم دم کا حال لکھتا رہتا تھا۔ 4-4 آدمی کی چوکی ہوتی تھی۔ دو دو آدمی ایک ایک پہر جاگتے تھے۔ دو دو سوتے تھے۔ شدہ بند (واقعہ نویس) دارالخلافہ کے گھر گھر کا حال بادشاہ کو برابر پہنچاتے تھے اور ہر شہر کا شدہ بند اپنا اپنا فرض برابر ادا کرتا رہتا تھا۔

ہر شہر میں فرہنگ روز (کوتوال) ہوتا تھا۔ اس کے ساتھ تین واقعہ نویس اور امین رہتے تھے۔ ہر لشکر میں ہر شہر کے حاکم کے پاس بھی واقعہ نویس اور امین رہتے تھے۔ جو صاحب خدمت اپنی خدمت میں کوتاہی کرتا فوراً بادشاہ کو خبر پہنچتی تھی اور کوتاہی کی سزا ملتی تھی۔ جاسوس اگر اپنی یہ خدمت لوگوں کو جتا دے تو موقوف ہو جاتا تھا۔ بادشاہی خیر خواہی کر کے جو کسی کا حق رکھ لے تو سزا پاتا تھا جب پیادہ یا سوار نوکر ہو تو اس کا اور گھوڑے کا چہرہ لکھا جاتا تھا۔ گھوڑا اکثر بادشاہی ہوتا تھا۔ گھوڑا مر جاتا تو عاملوں سواروں اور لوگوں کی گواہیوں سے اور ملتا تھا۔ رعیت سے مالیہ لیتے تھے۔ جب ساسانیوں کی سلطنت نئی قائم ہوئی تو رعیت نے امداد کے لیے خود دہ یکی قبول کی۔ اسی لیے اسے باج ہمداستانی کہتے تھے۔

آئین مہ آباد کے فتوے بغیر بادشاہ کو بھی قتل کا اختیار نہ تھا۔ فرہنگ دار (قاضی) اور دادستاں (مفتی) سے فتوئی لیا جاتا تھا۔ امرا اور شہزادے پاس ہوں یا دور۔ بے حکم بادشاہ

قتل نہ کر سکتے تھے۔ ہاں کوئی ایسا سرکش ہو کہ اگر فوراً نہ مار ڈالیں تو فساد اٹھ کھڑا ہو۔ اس کے قتل میں دربار کے حکم کا انتظار نہ کرتے تھے۔ بادشاہ کی نیک نیتی کی حکومت اور لوگوں کی صدق دلی کی اطاعت اس درجہ کو پہنچی تھی کہ اگر حکم ہوتا تو ایک آدمی جاتا اور سپہبد کا سر اتار لاتا۔ چنانچہ اکثر ایسا ہوا اور سرداروں نے آپ سر جھکا جھکا کر گردنیں کٹوا دیں۔ چونکہ یہ بھی دستور تھا کہ باپ کے بعد بیٹا اس کی جگہ پاتا تھا اس لیے بادشاہ ان کی اس اطاعت سے خوش ہوا۔ سب نے سر اپا اور بیٹے نے باپ کا عہدہ پایا۔ رعایا بھی ایسی جاں نثار تھی کہ بادشاہ کے حکم کو حکم الٰہی سمجھتی تھی۔ اس کی خوشی میں مر جانا بہشت میں جانا تھا اور اسی کو زندگی سمجھتی تھی۔ یہ اعتقاد و اطاعت بادشاہ کی یا تو چنگیز خاں کو اپنی قوم مغول پر نصیب ہوئی یا شاہ اسمٰعیل کو قزلباش پر ہوئی۔ ہر قسم کی سزا قاضی کے فتوے سے ملتی تھی۔ بید اور کوڑے بھی لگتے تھے مگر اشراف کو پاجی سے نہ پٹواتے تھے جب تک کئی جاسوسوں کی خبر مطابق نہ ہوتی تھی تب تک اس پر عمل نہ کرتے تھے۔ شہزادوں کی بھی ہش (حاضری) اور باش (غیر حاضری) ہوتی تھی تاکہ غریب نوکروں کی ضرورتوں کی قدر معلوم ہوتی رہے۔ حضور میں بلائے جاتے تو سپاہی جاتا اور پیادہ لیکر آتا کہ پیدل چلنے کی قدر معلوم رہے۔

ایک ایک علاقہ ایک ایک تعلقہ دار کو سپرد تھا۔ اس کے نیچے کئی کئی گاؤں کے علاقہ دار۔ ان کے نیچے ذیلدار۔ ان کے نیچے لمبردار وغیرہ وغیرہ۔ حکم تھا کہ زمیندار سے اتنا ہی روپیہ وصول کرو جتنی اسے گنجائش ہو۔ رعایا پر زیادہ بوجھ نہ ڈالو۔ اتنا لو کہ وہ آرام سے رہیں۔ تمہاری عدالتوں کے خرچ نکل آئیں اور فوج آسودہ رہے۔ زمیندار اپنے کام سے گرتا تو دستگیری کرتے تھے۔ مر جائے تو اس کی اولاد کو سنبھالتے تھے۔

لڑائی پیش آتی تو تعلقہ داروں کو حکم پہنچتا۔ ہر شخص اپنی حیثیت اور قاعدہ کے موجب فوج لیکر حاضر ہوتا۔ چونکہ ہر شخص ملک کا حمایت دار تھا اور سب اپنے اپنے علاقوں پر جنگلوں اور پہاڑوں میں رہتے تھے۔ اس لیے سب شکار کے شوقین اور مشاق ہوتے تھے۔ یہ ضرورتیں ہر شخص کو سپاہی بناتی تھیں اور سامان سپاہ گری تیار رکھتی تھیں۔

سفر میں ہر شخص کے پاس کل ہتھیار۔ کل ضروری چیزیں۔ گھوڑے کے نعل بلکہ درفش اور سوئی تک بھی ہوتی تھی۔ باوجود اس کے تکلیفوں کے مشاق۔ تھوڑے سامان کے ساتھ دور دور کے رستے کاٹتے تھے۔ خیمے ڈیرے کی پروانہ کرتے تھے۔ سخت گرمی، سخت جاڑا، برف باران سب سر پر لیتے تھے۔ فارس کی انشا پردازی اس امر سے آگاہ کرتی ہے۔

سالار اور سردار سپاہ بڑے زرق و برق سے رہتے تھے۔ تاج خسروی تو خاص بادشاہ کے لیے تھا۔ امرا کے سر پر بھی خاص خاص وضع کے تاج ہوتے تھے اور ہزاروں لاکھوں روپے کے جواہرات سے مرصع ہوتے تھے۔ زریں کلاہ۔ زریں پٹکا۔ زرین کفش۔ زریں زین امیر الامرا کی وردی تھی۔ ان میں بھی درجوں کا لحاظ تھا۔ بعض طلائی۔ بعض ملمع۔ بعض چاندی کے۔ انشا پردازی ان سب باتوں کی خبر دیتی ہے۔

فردوسی کہتا ہے:

تہمتن بہ توسن چو آزاد سرو ۔۔۔ بہ سر بر کلہ ہمچو بال تذرو

چو شاہ سمنگاں دید باز ۔۔۔ تہمتن اورا زہر گونہ ساز

زتاج و زتخت و کلاہ و کمر ۔۔۔ زاسپ و زاشتر ز زرع و گہر

تہمتن بیامد بہ نزدیک شاہ ۔۔۔ میاں بستہ زرم و دل کینہ خواہ

بیاور سپاہ و درفش مرا ۔۔۔ ہماں تخت و زرینہ کفش مرا

خواجہ حافظ نے بھی اشارہ کیا ہے:

تکیہ بر اختر شب گرد مکن کیں عیار ۔۔۔ تاج کاؤس ربود و کمر کیخسرو

بسر چاو شاں دید و تیغ و کمر ۔۔۔ قباہائے اطلس کمر ہائے زر

(سعدی شیرازی)

یکے برسرش خسروانی کلاہ ۔۔۔ یکے در برش پرنیانی قباہ

میدان جنگ میں جب تک بادشاہ یا اس کا قائم مقام کھڑا رہتا۔ سپاہ اپنی جگہ سے جنبش نہ کرتی۔ اگر کوئی بھاگتا تو اس کا کھانا پانی رشتہ داری بند کر دیتے جو اس سے علاوہ بھی ویسا ہی خوار و ذلیل ہو جاتا۔

کوئی عہدہ دار مر جاتا تو اس کے بعد بیٹے کو ورنہ اس کے قریبی رشتہ دار کو اس کی جگہ دیتے۔ بے گناہ کسی کو موقوف نہ کرتے تھے۔ اسی سے شریف عہدہ داروں کی نسلیں صدہا سال تک برابر درباروں میں قائم چلی جاتی تھیں جن پر جاں نثاری کے واقعی بھروسے کیے جاتے تھے۔ امیر زادہ نا قابل ہوتا تو عہدہ سے موقوف کر دیتے تھے۔

جس گھوڑے، گدھے گائے بیل سے خدمت لیتے بڑھاپے میں اسے آرام سے بٹھاتے اور کھلاتے تھے۔ جانوروں پر لادنے کے وزن مقرر تھے۔ اس سے زیادہ لادے تو سزا پائے۔ اسی قانون کی بنیاد باقی ہے کہ اس سے اور بیگار وغیرہ سے فارس کے ناصح انشا پرداز عمدہ مضامین پیدا کرتے ہیں۔ خصوصاً شیخ سعدی کہ اس قانون کی پابندی میں کہیں بادشاہ کو شوق دلاتے ہیں۔ کہیں دھمکاتے ہیں:

دل باد شاہاں شود بار کش چو بینند در گل خر خار کش

سپاہی زخمی ہوتا تو بڑی کوشش سے اس کی تیمار داری کرتے۔ کمزور یا بڈھا ہو جاتا تو بیٹے کو اس کی جگہ دیتے تھے۔ بچہ ابھی نوکری کے قابل نہ ہوتا تو خزانہ سے وظیفہ پاتا۔ کچھ نہ ہوتا بڈھا پنشن پاتا۔ مر جاتا تو جورو بیٹا بیٹی جو بچتا بادشاہ اس کے ساتھ وہ سلوک کرتا جو باپ بچوں کے ساتھ کرتا ہے۔

سپاہی مارا جاتا تو بیٹا عزت کا عہدہ پاتا۔ اس کے پس ماندوں کے ساتھ رعایت کرتے تھے۔ لڑائی میں گھوڑا گرتا تو اس سے اچھا سرکار سے ملتا۔

سوداگر اپنے کام سے گرتا تو اس کی مدد کرتے تھے۔ مر جاتا تو اس کی اولاد کو سنبھالتے تھے۔ ہر فرقے کو اس کا کام سکھاتے تھے۔ عملداری میں کوئی مفلس نظر نہ آتا تھا جو پردیسی شہر میں داخل ہوتا حاکم کو خبر کرتے۔ وہ اس کی حیثیت کو دیکھتا اور گزارہ کی فکر کرتا تھا۔

بیمار اور اپاہج۔ بیمار خانوں میں داخل ہو جاتے تھے۔ حکیم علاج کرتے۔ خدمتگار تیمار داری کرتے تھے۔ مردوں کے بیمار خانے جدا تھے۔ عورتوں کے جدا۔ یہی مطالب ہیں جو ظہوری کے ایک مصرع میں بند ہیں: شہنشہ تر ہر آں کو مہرباں تر۔ یعنی بادشاہ کی بڑائی اس کے ملک کی وسعت اور خزانہ کی بہتات سے نہیں ہوتی۔ جو رعیت کے حال پر

زیادہ شفقت کرے وہی بڑا شہنشاہ ہے۔

سراؤں کی تعمیر اور رستوں کی آبادی کی بڑی تاکید تھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگ بہت سفر کرتے تھے اور اس کے فوائد سے کافی حصے لیتے تھے۔ اگر یہ تاریخی آگاہی نہ ہوتی تو بھی رباط 'سرائے ' مہمانسرائے 'کاروانسرائے، سبک باری، گراں باری وغیرہ کے مضامین والفاظ اور ان کے استعاروں سے زبان مذکور تمہیں خبر دیتی ہے جو اور زبانیں کم دیتی ہیں۔

سبک سار مردم سبک تر روند حق ایحست صاحبدلاں بشنوند
ہر کہ سبک بار سبک خیز تر مرغ سبک پر پرد تیز تر

عرب کی زبان یہ سامان نہیں رکھتی اس لیے کہ ملک ریگستان اور جنگل ویران ہے۔ وہاں اس طرح کی تعمیریں اور ان کی آبادی ممکن نہیں۔ ہاں ریتلی زمینیں پتھریلی زمینیں ٹیلے، پہاڑیاں، حنظل کے درخت، طلح کی چھاؤں اور اثل کے جھنڈ ہیں۔ وہی اس کے الفاظ واستعارات میں نظر آتے ہیں۔ ہند میں آبادی خوب۔ مگر سراؤں کی رسم کم تھی۔ یہاں کے مندر۔ ٹھاکر دوآرے۔ وغیرہ ان کا کام دیتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ زبان مذکور میں ان کے خیالات اور ادائے مطلب کے لیے الفاظ بھی کم ہیں۔

فقیر کو سخت سخت ریاضتیں کرنی پڑتی تھیں۔ اگر حقیقت میں خدا پرست ہوتا تو فقرا کے ساتھ خانقاہوں میں رہتا ورنہ اپنے پیشہ سے لگتا۔ کاہل مفت خوران میں نبھ نہ سکتا تھا۔

بادشاہ کے مصاحب لیاقت والے نیک نیت لوگ ہوتے تھے۔ اچھی اچھی تاریخیں سچی داستانیں مفید افسانے سناتے تھے۔ نجومی ' حکیم ' طبیب ' صاحب انشا، صاحب تحریر ہوتے تھے اور یہ لوگ حاکم کے ساتھ ہر شہر میں رہتے تھے کہ رعایا ہمیشہ ان کے محتاج ہیں۔ یہ باکمال اپنے اپنے فن میں کامل ہوتے تھے۔ سپاہی ' رعایا، پیشہ ور سب کو پڑھنا لکھنا واجب تھا۔ ایک پیشہ کا آدمی دوسرے پیشہ میں ہاتھ نہ ڈالتا تھا۔ یہ نہ ہو سکتا تھا کہ لشکر کا سپاہی یا سردار ہو اور سوداگری بھی کرے۔ ہر شہر میں اہل علم ' پیشہ ور ' اہل طرب ' تاجر ' سپاہی، جس قدر کھپ سکتے تھے اتنے رکھتے تھے۔ باقی کھیتی پر لگا دیتے

تھے۔ تاکہ ہر شخص تھوڑا تھوڑا سب کچھ جانتا ہو۔ مگر بہت آدمی ایک ہی کام نہ کریں۔ جس کام میں بادشاہی محصول سخت ہوتا اگر کوئی خیر خواہی دکھانے کو اس کی ترقی دکھاتا تو اسے سزا دیتے تھے۔

ہفتہ میں ایک دفعہ دربار عام ہوتا تھا۔ ہر مظلوم بادشاہ تک پہنچ سکتا تھا۔ سال بھر میں ایک دفعہ بادشاہ سب کے ساتھ مل کر بیٹھتا اور کھانا کھاتا تھا۔ دو جگہ دربار کرتا تھا۔ ایک روزستان یا تابسار تھا۔ اونچی جگہ پر بیٹھتا تھا۔ پہلوان بہادر صف بستہ حاضر ہوتے۔ دوسرا شبستان، رات کو دن سے بھی زیادہ جگہ بلند ہوتی تھی۔ نامی نامدار اور بڑے بڑے سردار باہر کھڑے ہوتے۔ دروازہ پر شاہی خواص جو لوگ پاس حاضر ہوتے۔ جنگی ہتھیاروں میں اونچے نیچے ہوتے تھے۔ بادشاہ کے پاؤں تک بھی کسی کا ہاتھ نہ پہنچ سکتا تھا۔ کوئی جوتیوں کو بوسہ دے لیتا۔ کوئی گرد پھر لیتا تو بڑی بات تھی۔ آستینیں لمبی لمبی ہوتی تھیں اور الگ ایک تخت پر دھری رہتی تھیں۔ بڑے ہی صاحب رتبہ ہوتے تھے کہ تخت کے پایہ کو بوسہ دے سکتے تھے۔ بزرگان عصر آستین کوتاہ رکھتے تھے۔ چنانچہ خواجہ حافظ کہتے ہیں:

بہ زیرِ دلق ملمع کمند ہا دارند　　دراز دستیِ ایں کوتہ آستیناں بیں

آہ ازیں طائفہ زرق ساز　　آستنی کوتہ و دست دراز

دیکھو انشا پردازی نے لباس ملک پر کیونکر اشارہ کیا ہے۔

برونستان (روزستان) کا حال تو سن لیا۔ درونستان (یا شبستان پنہانی) کا حال بھی سننا چاہیے۔ حرم سرا کو مشکوئے زریں کہتے تھے۔ نامہ آذر ہوشنگ (آئین مہ آباد) میں ہے کہ بادشاہ کی کتنی ہی بیگمات ہوں۔ مگر بانوان بانو (بادشاہ بیگم) ایک ہی ہوتی تھی۔ جو خدمتیں باہر مردوں کی تھیں محل میں بانوان بانو کے حضور میں لیاقت مند عورتیں بجا لاتی تھیں۔ مگر اسے شاہانہ حکم احکام جاری کر دینے کا اختیار نہ تھا۔ بادشاہ کی ماں زندہ ہوتی تو اس کی عظمت بانوان بانو سے زیادہ ہوتی تھی۔ انہیں باہر کے کاروبار میں کچھ دخل نہ تھا۔ بلکہ باہر ان کا نام بھی نہ لے سکتے تھے۔ وہ بے ضرورت سوار نہ ہوتی تھیں۔ بادشاہ اندر جاتا تو دیر تک نہ بیٹھتا تھا۔ وہ دربار کے کاروبار میں۔ مثلاً کسی عہدہ دار کے تقرر،

ترقی، تنزل، تبدل میں کچھ نہ کہہ سکتی تھیں۔ امیروں کے ہاں ایک ایک بڑھیا بادشاہ کی طرف سے رہتی تھی کہ بانوان بانو کو کل حالات لکھ کر بھیج دیتی تھی۔ یا زبانی آکر عرض کرتی تھی۔ وہ بادشاہ سے کہہ دیتی تھی۔

مشکوے زریں میں یا امراء کے محلوں میں خواجہ سرا لیاچہ تک نہ جاسکتا تھا۔ بے گناہ کسی کو خوجہ نہ کرتے تھے۔ جس طرح اب درباروں سرکاروں میں خوجے محرم راز ہوتے ہیں اس وقت ایسا نہ تھا۔ بیچنے کے لیے کسی کو خوجہ کرنا بڑا جرم تھا۔ برس میں کئی دفعہ عیدوں کی تقریب سے شرفا کی عورتیں بانوان بانو کے سلام کو حاضر ہوتی تھیں۔ سال میں ایک دفعہ دربار عام ہوتا تھا۔ اس میں تمام شہر کی عورتیں آتی تھیں۔ بادشاہ ان عورتوں پر نگاہ نہ کرتا تھا جس دن وہ محل میں آتیں تو کہیں اور چلا جاتا۔ ان زنانے درباروں سے مطلب یہ تھا کہ کسی کو اپنے شوہر یا رشتہ دار سے کچھ شکایت ہو تو خود اس ذریعے سے بادشاہ تک پہنچائے۔ بادشاہ آئین سلطنت کے بموجب دادرسی کرے۔

بے آزار جانور کے قتل پر عہد قدیم میں جان کے بدلے جان کا قصاص لیتے تھے۔ شراب پینی بھی ایسا ہی جرم تھا۔ کیومرث کے زمانہ سے خفیہ پینے لگے۔ رفتہ رفتہ کھلم کھلا ہوگئی۔ مگر کوچہ وبازار میں مست نہ پھر سکتے تھے۔ دیکھ پاتے تو سزا دیتے۔ بادشاہ اتنی شراب نہ پیتا تھا کہ بے ہوش ہو جائے۔ کیونکہ وہ پاسبان ہے۔ پاسبان کو ہشیار رہنا چاہیے۔ (بادک) بادہ دہ۔ (شراب دہ) یعنی ساقی عورتیں ہوتی تھیں۔ بے ریش لڑکا جلسہ میں نہیں آسکتا تھا۔ اور ابتدائے عہد میں پیتے بھی اس وقت تھے کہ حکیم کسی مرض کے لیے بتاتا تھا۔ آخر رواج ہوگیا تو یہ بھی دربار اور آرائش محفل کے سامانوں میں داخل ہوگئی۔ وہ بھی آپس میں ایک دوسرے کی محبت کا پیالہ اٹھاتے تھے۔ کبھی غائب کی یاد پر جام پیتے تھے۔ شاہنامہ اور سکندر نامہ کے جام ایسے شعروں سے چھلک رہے ہیں۔

بیاد تو نوشم ہمہ روز جام ہمہ تو کوشم ہمہ صبح و شام
(فردوسی)

بہ شادی زمانے برآریم کام زجمشید گوئیم و نوشیم جام
(فردوسی)

بدہ ساقی نوش لب جام مے بنوشم بیاد شہ نیک پے

(نظامی)

خواجہ حافظ اسی خیال میں فرماتے ہیں:

چوبا حبیب نشینی و بادہ پیمائی بیاد آر محبان بادہ پیمارا

وہاں کے ارمنی اور آتش پرستوں میں قدیمی رسمیں موجود ہیں۔ جب دوست آشنا مل کر سرور کرنے بیٹھتے ہیں۔ جام بلوریں 'شیشہ و مینا' نقل و گزک وغیرہ وغیرہ سامان حاضر ہوتے ہیں۔ ساقی جام بھر کر دیتا ہے۔ طرف ثانی آنکھوں ہی آنکھوں میں شکریہ ادا کرتا ہے اور ایک انداز کے ساتھ گردن مینایا دوسرے گلاس سے ٹکرا کر کہتا ہے۔ بیاد دوست! کبھی ذرا سی چھلکاتا ہے اور کہتا ہے۔ قربون سر دوست۔ اور پی جاتا ہے۔ ساقی دوسرے کو بھر کر دیتا ہے وہ آنکھوں کو لگاتا ہے اور چڑھا جاتا ہے۔ اسی پر خواجہ حافظ کہتے ہیں:

اگر شراب خوری جرعہ فشاں بر خاک ازاں گناہ کہ نفعے رسد بہ غیر، چہ باک

رستوں پر منزل بہ منزل سرائیں تھیں[31]۔ وہاں بھی شدہ بند (خبر نویس) موجود۔ طبیب سامان ضروری کے ساتھ چوں۔ بیماروں۔ اپاہجوں کی خبر گیری کو حاضر۔ مستورات مسافر ہوں تو بڑھیا عورتیں موجود ہوتی تھیں جو درکار ہو حاضر۔

سپاہیوں کی عورتیں بڑی کارگزار ہوتی تھیں۔ کاتنا 'بینا' پرونا اور ہر قسم کی دستکاریاں جانتی تھیں۔ گھوڑے کستی تھیں۔ سوار ہوتی تھیں۔ کمانداری و تیر اندازی میں مشاق ہوتی تھیں۔ سفر کی محنتیں مردوں کے برابر اٹھاتی تھیں۔ (یہ اوصاف وہاں کی صحرا نشین عورتوں میں اب بھی موجود ہیں)۔

خبر رسانی کا انتظام بھی خوب تھا۔ سلطنت بہت وسیع تھی۔ اس لیے تمام رستوں پر (روند) ڈاک کے رونے بیٹھے ہوئے تھے۔ شدہ بند اپنے روند کو دیتا تھا۔ روند بہ روند بادشاہ تک پہنچا دیتے تھے۔ اسی واسطے تھوڑی تھوڑی دور پر (آبادچہ) گاؤں بسائے تھے۔ جا بجا ڈاک چوکی کے لیے گھوڑے تیار رہتے تھے۔ اسی طرح بادشاہ کی طرف سے احکام روانہ ہوتے تھے۔ بعض کام ایسا خفیہ اور ضروری ہوتا تھا کہ بادشاہ کسی خاص امیر کو کاغذ

دیتا تھا۔ جائے روند کے وہ آپ لے کر چوکی بہ چوکی پہنچاتا تھا کہ دوسرے کو بو تک نہ پہنچتی تھی۔ انہیں نوند کہتے تھے۔ مگر نوندوں کی مجال نہ تھی کہ رستہ میں کسی کا گھوڑا جبراً چھین لے۔ لیتے تو سزا پاتے تھے۔

منشی ہمیشہ سپاہیوں سے پوچھ لیتا تھا کہ افسر سے راضی ہو؟ پہرہ میں چار چار مل کر پہرہ دیتے تھے۔ پہر پہر بھر۔ دو ہتھیار بند کھڑے پہرہ دیتے تھے۔ دو تیار سوتے رہتے تھے۔ وہ دو سو کر اٹھتے تو یہ دونوں سو رہتے۔ صبح ہوتے یہ رخصت چار اور حاضر۔ اس پر بھی لشکر دار کے حکم سے افسر تین دفعہ آکر دیکھ جاتا تھا کہ پہرہ پر ہشیار ہیں یا نہیں۔ جب پہرہ دیکر جاتے تو ان سے پوچھ لیتے کہ افسر سے کسی بات کی شکایت تو نہیں کرنی؟ ہر جگہ منشی ماہ بماہ فوج کی موجودات لیتے تھے۔ سامان اور لوازمات سپہ گری میں کسی چیز کی کمی ہوتی تو باز پرس کرتے تھے۔ عذر معقول مقبول ہوتا تھا۔ ضرورت ہوتی تو اس کا سرانجام کرتے۔ کسی کی جاگیر پر تنخواہ ہوتی تھی۔ کسی کی نقدی پر۔ روزانہ ماہانہ جو ہوتا برابر ملتا تھا۔ دن رات میں کوئی غائب ہوتا تو اتنا ہی وضع ہو جاتا نہ کہ تمام۔ ضرورت پر رخصت مانگتا تو ملتی تھی۔ افسر بھی اپنے ماتحتوں سے خوشنودی نامہ لیتے تھے کہ ہم سے کوئی بدسلوکی نہیں کی۔ وہ دست بدست بالا دستوں کے ہاتھ بادشاہ تک پہنچتا تھا۔ جاسوس ہفتہ بہ ہفتہ خبریں دیتے رہتے تھے۔ پھر بھی بادشاہ سپاہ اور نوکروں سے پوچھتا رہتا تھا کہ حق سے محروم تو نہیں رہے۔

مصاحبوں کو مجرم کا جرم بخشوانے کی مجال نہ تھی۔ احکام کی پابندی اس قدر تھی کہ بیٹا باپ کو۔ اور باپ بیٹے کو بے دریغ سزا دیتا تھا۔ اگرچہ قتل کیوں نہ ہو۔

ہاتھی شیر اور بڑے بڑے درندوں کی لڑائی کے لیے مقام مقرر رکھتے تھے۔ ان کے کناروں پر دیواریں اونچی اونچی بناتے تھے۔ گرد لوگ بیٹھے تماشا دیکھتے تھے۔ انہیں کچھ خطر نہ تھا۔ مست ہاتھیوں کو اور پلے ہوئے درندوں کو بازاروں میں نہ لاتے تھے۔ آبادی سے دور رکھتے تھے۔ مست ہاتھی نے ایک آدمی کو مار ڈالا۔ بادشاہ نے اسے مار ڈالا اور محافظوں کو بھی قتل کیا۔

لڑائی کے وقت ترتیب سے قلعہ باندھ کر لڑتے تھے۔ اس ترتیب کو نہ لڑائی کے

وقت ٹوٹنے دیتے تھے نہ بعد فتح کے توڑتے تھے۔ دشمن بھاگ جائے تو اس کی لوٹ پر نہ جا گرتے تھے۔ میدان جنگ میں ایک ایک جاں باز نکلتا تھا۔ اور دلاوری اور حب قومی کی داد دیتا تھا۔ شاہنامہ میں بہت سے معرکے ایسی لڑائیوں کے تماشے دکھاتے ہیں۔ مگر انشا پردازی میں یکہ تاز، یکہ سوار، یک سوار اور یک سوارہ وغیرہ الفاظ بھی اس رسم پر دلالت کرتے ہیں۔

فتح کے بعد بادشاہ سوچ سمجھ کر ایک حصہ فوج کا بھیجتا تھا۔ جو خیمے ڈیرے مال اسباب رہ جاتے تھے اس کی قرقی ہوتی تھی۔ فتحیاب فوراً اپنے خیموں میں داخل نہ ہوتے تھے کہ ایسا نہ ہو دشمن پلٹ پڑے۔ لوٹ میں سے بادشاہ پہلے غریبوں کا حق اور عمارت اور کارہائے مفید کے لیے ایک حصہ نکال لیتا۔ پھر اہل فوج جنھوں نے جنگ میں جانفشانیاں کی ہوں ان کے حق، پھر جو معرکہ میں موجود تھے انھیں پھر سپہبدوں اور سرداروں کو دیتا تھا۔ پھر اپنا حق لیتا تھا اور نہایت قدیم زمانہ کے بادشاہ اپنا حق بالکل نہ لیتے تھے۔ جو جو لوگوں کے نقصان ہوئے انھیں کا تدارک کرتے تھے۔ اپنے ملک میں کسی پر سازش کا شمول پاتے تو تحقیقات کے بعد سزا دیتے۔ حریف کے لشکر میں جو ہتھیار ڈالتا اور امان مانگتا اسے نہ مارتے زخمیوں کی تیمارداری میں بڑی توجہ کرتے تھے۔

50-40 منزل کا احاطہ گھیرتے۔ اس میں کوسوں کے جنگل اور پہاڑوں سے جانوروں کو گھیر لاتے تھے۔ نکاس کے موقع بند کرتے۔ بہت سے لکڑہاتھ آجاتے تو کٹہرے کھڑے کرتے۔ ایک دن بادشاہ تمام امیروں کے ساتھ آتا۔ اچھے اچھے سپاہیوں اور پہلوانوں کو لاتا۔ بادشاہ کا تخت بہت اونچا سجایا جاتا کہ کسی جانور کا حملہ وہاں تک نہ پہنچ سکے۔ شاہ شاہزادوں سمیت بیٹھتا۔ درندے جانوروں کو سامنے گھیر کر لاتے اور ایسی ہشیاری سے روکتے کہ ایک جانور بھی نکلنے نہ پاتا۔ پہلے شاہ تیر پھینکتا۔ پھر شاہی خاندان کے لوگ۔ پھر اور امیر۔ پہلوان۔ سپاہی۔ جب سب درندوں کو مار لیتے تو جمع کر کے ڈھیر لگاتے اور دیکھتے۔ اگر کسی کے ہاتھ سے بے آزار جانور مارا جاتا تو اسے بہت سی لعنت ملامت کرتے اور قصاص میں اسے مار کر ساتھ رکھ دیتے تھے۔ پھر موبد ایک بلندی پر چڑھ جاتا اور کہتا کہ اے بے آزار جانورو۔ تمہارے دشمنوں سے انتقام لینے کو بادشاہ دادگر

نے بذات خاص توجہ کی۔ خون کا عوض لیا گیا۔ وہ اپنی سزا کو پہنچے۔ اب آرام سے جنگلوں اور پہاڑوں میں پھرو چلو رہو سہو۔ دیکھو۔ اپنے رب النوع کے سامنے شکوہ نہ کرنا۔ پھر احاطہ توڑ دیتے تھے۔ بے آزار جانور جنگلوں اور پہاڑوں میں نکل جاتے تھے۔ اس شکار کو داد شکار کہتے تھے۔ اب کتب تاریخ میں اسے شکار قمرغہ اور شکار جرگہ کہتے ہیں (ترکی لفظ ہیں۔)

گھر گھر قومی رسم ورواج کا پابند تھا۔ ننگ وناموس کی بڑی حفاظت تھی۔ بچوں کی تربیت پر توجہ تھی۔ جب لڑکا سمجھ والا ہوتا تو 3 باتوں کی تعلیم دیتے تھے۔ راستبازی ' شہسواری ' تیر اندازی۔ ساتھ اس کے بڈھے کی بڑی تعظیم کرتے تھے۔ مجلس میں اس سے اوپر نہ بیٹھتے تھے۔ رستہ میں آگے نہ بڑھتے تھے۔ یہ تاریخی آگاہی ہے اور ماہر لغت لفظ سالاری ہی کو دیکھ کر سمجھ جائے گا۔ کہ مرکب ہے سال اریا سال ور سے۔ دانائے سخن ان کی انشا پردازی دیکھ کر سمجھ جائے گا کہ جب کوئی بات نصیحت کی کہتے ہیں۔ پیر مغاں ' پیر کہن ' پیر دہ کی زبانی کہتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ قوم میں ان کی فہمائش بہ نسبت اوروں کے زیادہ موثر تھی۔ مقابل اس کے مخاطب کو۔ "اے پسر خطاب" کرتے ہیں۔ انشا پردازی یہ بھی خبر دیتی ہے کہ شرفا کے لڑکے آوارہ گرد نہ ہوتے تھے:

منہ اے طفل اشک از خانہ چشم قدم بیروں
کہ می آیند مردم زادہ ہا از خانہ کم بیروں

کہن سال شخص اپنے علاقہ بلکہ علاقوں کی تاریخ۔ گھر گھر کے حالات کا ذخیرہ اور ان کے رسوم و قواعد کا قانون ہوتا تھا۔ اس کی نیک نیت اور نیکاری اسے یہ منصب دلواتی تھی۔ دیکھو بوستان میں ایک بڈھا اپنے بڑھاپے کی واقفیت سے ایک ناواقف کو دباتا ہے:

کس از من نداند دریں شیوہ بہ ندانی کہ فرتوت شد پیر دہ؟

یہی بنیاد ہے جس سے رفتہ رفتہ ریش سفید چودھری یا لمبر دار یا سردار قبیلہ کو کہنے لگے۔ اب بھی کوہ دشت کے قبائل میں اس شخص کا زور۔ قومی زور کے شمول سے بعض موقع پر بادشاہ کے قابو کا نہیں ہوتا۔ شیخ سعدی بہت جگہ اس بنیاد پر اپنی نصیحت میں زور

پیدا کرتے ہیں:

شنید ایں سخن دہ خدائے قدیم بشوریدہ گفت اے خبیث رجیم

فردوسی کا شاہنامہ کہتا ہے کہ اس نے اپنے افسانہ کا سرمایہ کہن سال لوگوں سے پایا ہے۔ وہ ہر داستان کے آغاز یا انجام میں کہتے ہیں:

چنیں گفت دہقان دانش پژوہ مرایں داستاں راز پیشیں گروہ

زگفتار فرزانہ مرد پیر سخن بشنو ویک بیک یاد گیر

زگفتار دہقاں کنوں داستاں بہ پیوندم از گفتہ باستاں

نظامی اکثر ساقی کی طرف خطاب کرتے ہیں۔ دہقان پیر کی طرف کم۔

جوئے میستاندز دہقان پیر بہ زرمیفرستد بدیوان میر

گزارندۂ درج دہقاں نورد گزارندگاں راچنیں یاد کرد

فردوسی کے حق میں کہتے ہیں:

سخن گوئے دیرینہ دانائے طوس کہ آراست روئے سخن چوں عروس

ستم رسیدہ جب کسی کے ظلم سے سخت نالاں ہوتا تو کاغذی پیرہن پہن کر دربار میں فریادی آتا۔ دیکھو انشا پردازی نے کس رنگ سے خبر دی ہے۔ کمال اسماعیل:

کاغذی جامہ بپوشید و بدرگاہ آمد زادہ خاطر من، تابدہی داد مرا

رسم قدیم ہے کہ جب کسی کا دوالا نکل جاتا ہے تو دکان کے آگے کھڑا ہو جاتا ہے اور بوق بجاتا۔ انشا پردازی نے اسے آگاہ کیا اور ساتھ اس کے یہ بھی جتایا کہ خر آس یا پن چکی والے بھی بوق بجایا کرتے ہیں تاکہ اناج لانے والوں کو خبر ہو جائے:۔

آسیائے دہر خالی دیدم از جنس وفا درجہاں بوقے بہ طرز آسیاباں مے زنم

اب اسی طرح حمامی حمام کے آنے والوں کو خبر دیتا ہے کہ آج حمام میں عورتیں ہیں۔ مرد نہ آئیں۔

میں نے جب دھرم شاستر کے باب شہادت میں دیکھا کہ آگ شہادۃ غیبی ہے تو سیاوش کی داستان یاد آئی اور ساتھ ہی رنج ہوا کیونکہ یہاں اس کا عمل درآمد بڑی تفصیل

کے ساتھ لکھا ہے۔ وہاں ایک اشارہ کے سوا کچھ بھی نہیں (ہائے تاریخ باستانی) اور اس میں ذرا شبہ نہیں کہ بہت کچھ ہوگا اور خدا جانے کیا کچھ ہوگا۔

ہند کے راج میں جب کسی مہتم پر یہ عمل ہوتا تھا۔ تو نگری کا راجہ دو دن پہلے تعلقات دنیا سے محترز ہو کر طہارت حاصل کرتا تھا۔ ایک دن پہلے بموجب طریقہ شاستر کے ایک خاص وضع اور لباس کے ساتھ آتا اور جگہ مقرر کرتا۔ اس کی شان دیکھنے کے قابل ہوتی تھی۔ زمین پر نو دائرے کی قطار مغرب سے مشرق کو کھینچتا۔ ہر دائرے کا قطر 16 انگل۔ ہر دائرہ ایک ایک دیوتا کے ساتھ منسوب ہوتا تھا۔ ہر دائرہ میں 32 انگل کا فاصلہ۔ ایک ایک پر گھاس بچھی ہوئی۔ راجہ ہر دیوتا کی پوجا کرتا تھا۔ دائروں کے گوشہ مغرب کی طرف آگ دہکتی تھی اور شانتی ہوم ہوتا تھا کہ رحمت کی برکت حاصل ہو۔ ایک لوہے کا گولا جس کا 8 انگل کا دور۔ اس دہکتی آگ میں تپتا تھا۔ برہمن دھرم کی استت یعنی ستائش و نیائش کے منتر پڑھتا تھا۔ سب دیوتاؤں کی پوجا کر کے ہوم شروع کرتا وہ ایک عرصہ معین تک جاری رہتا اور استت کے منتر پڑھے جاتا۔

ملزم کمال اعتقاد اور عجز و نیاز کے ساتھ حاضر ہوتا۔ اس کے ہاتھ چاولوں کے آٹے سے مل مل کر دھلواتے تھے۔ برت رکھے ہوتا تھا۔ اسی وقت اشنان کرتا اور بھیگے کپڑے پہنے سامنے آتا۔ ایک کاغذ میں جرم کی تفصیل لکھی ہوتی تھی۔ وہ ایک منتر پڑھ کر اس کے سر پر باندھتے تھے۔ اس کی ہتھیلی پر اشوتا یا پیپل کے پتے۔ وہ بھی نہ ہو تو آکھ کے یا کسی اور درخت کے 7 پتے اوپر تلے رکھ کر 7 دھاگوں سے باندھتے تھے۔ اس پر 7 پت کتے کے۔ 7 پتیاں ہری دوب اور کچے چاول دہی ملے ہوئے اور کچھ پھول رکھتے تھے۔ ملزم پہلے مغربی دائرے میں ٹھیک مشرق کی طرف منہ کر کے کھڑا ہوتا تھا۔

راجہ ہوم کی آگ میں گولے کو تپاتا تھا۔ اور منتر پڑھتا جاتا تھا جس کا خلاصہ یہ ہے:۔ اے آگ تو ہی چار بید ہے۔ تجھی پر کل پرعشوں کا مدار ہے۔ تو دیوتاؤں اور دیوتا مقام بزرگوں کی صورت ہے۔ تو کل مخلوقات میں رمی ہوئی ہے۔ اسی واسطے ہر نیک و بد کی تجھے خبر ہے۔ تو گناہ سے پاک کرتی ہے اسی واسطے سب تجھے پاک کرنے والا مانتے ہیں۔ اے پاک کرنے والی۔ اپنا ظہور دکھادے۔ گناہ ہے تو جل اٹھ اور نہیں ہے تو ٹھنڈی ہو

جا۔ اے آگ تو کل مخلوقات کی گواہ ہے۔ اے روحانی پاک۔ جو حال، فانی انسان نہیں جانتا۔ تو جانتی ہے۔ یہ آدمی ایک الزام میں آگیا ہے اور اپنی برات چاہتا ہے۔ اس کی جیسی برات کہ دینی چاہیے۔ تیرا ہی کام ہے۔ یہ کہہ کر وہ گولا جو تین دفعہ آگ میں دہکا کر سرخ کر چکا ہے۔ دیچنے سے پکڑ کر نکالتا تھا۔ اور مجرم کے سامنے لاتا تھا۔ وہ نہایت صدق و یقین کے ساتھ حق کی طرف ملتجی ہوتا تھا اور ہاتھ بڑھا کر آگ کی استت کا منتر پڑھتا تھا جس کا خلاصہ یہ ہے۔ اے پاک کرنے والی آگ! تو ہر مخلوق میں رمی ہوئی ہے۔ تیرے ہونے سے ہر چیز ہوتی ہے تو مصیبت زدہ کی بے گناہی ثابت کر سکتی ہے۔ جو کچھ حق ہے۔ گواہ کی طرح بول اٹھیو۔

ملزم پہلے دائرے میں تو کھڑا ہی تھا۔ آہستہ آہستہ 7 قدم اور آگے بڑھتا تھا۔ نویں پر جا کر گولا ہاتھ سے پھینک دیتا تھا اور ہتھیلی پر بالکل آنچ نہ آتی تھی تو جرم سے بری سمجھا جاتا تھا۔

مجھے اس بات سے بحث نہیں کہ یہ شہادت غیبی سچی ہوئی یا نہیں اور وہ شخص بری ہوا یا نہیں۔ مگر تصور کر کے دیکھو کہ یہ پر اثر سامان اور اس وقت اہل عمل کی عظمت و شان اور ان منتروں کے موثر الفاظ ان لوگوں کے دلوں پر کیسی تاثیر پیدا کرتے ہوں گے جس کا ذکر بھی ہمارے کانوں میں سے بغیر اثر کیے نہیں گزر جاتا۔ ایران جیسی عالیشان مملکت میں اور ژندو استا جیسی باعظمت کتابوں سے جب ایسے معرکہ کی شہادت ہوتی ہو گی تو اسی بات میں طے نہ ہو جاتی ہو گی کہ آگ میں گئے اور چلے آئے۔ وہاں بھی اس کے بڑے بڑے سامان ہوئے ہوں گے اور عجیب و غریب عبارتوں میں ستائشیں اور نیائشیں ہوتی ہوں گی۔ افسوس کوئی قدیمی کتاب نہ رہی۔ مگر افسوس کہ باقی ہے۔

قواعد تدبیر المنزل میں لکھا ہے کہ دولت مند مال کے تین حصے کرتے تھے۔ 1/3 میں گھر کے کاروبار اور تجارت 1/3 کی اشرفیاں وغیرہ امانت کہ سفر آپڑے تو جوکھوں کی چیز جہاں چاہے رکھ لے۔ 1/3 کا روپیہ اشرفی وغیرہ قیمتی چیزیں لے کر ایسی جگہ گاڑ دیتے تھے جہاں کسی کا خیال بھی نہ جا سکے اور ان پر طلسم بھی لگاتے تھے کہ کوئی لے نہ سکے۔ ایسے دفینے کبھی تو زمینداروں کو ہل جوتتے جوتتے ہاتھ آتے تھے۔ کبھی خدا کے بندے

قسمت کے زور سے نکال لاتے تھے یا وہیں کے وہیں رہ جاتے تھے کسی کو خبر بھی نہ ہوتی تھی۔ یہ دور اندیشیاں زمانہ کے انقلابوں سے یا بادشاہِ وقت کے خطرے سے ہوتی ہوں گی! مطلب یہ ہے کہ اہل انشا نے جو گنج در ویرانہ اور مار بر سرِ گنج اور طلسم کشایانِ خزائنِ اسرار ہو غیرہ کے خیالات باندھے اسی بنیاد پر ہیں۔ نظامی:

مگر مار بر گنج زنجا نشست کہ تا رائگاں گنج نایدبدست

سب سے اول عید نوروز ہے۔ وہاں بھی شروع سال یہی ہے۔ یہاں بھی اسی دن سے سال سمت شروع ہوتا ہے۔ 12 سو برس ہوئے کہ اسلام اپنی تاثیر اس ملک و مملکت پر پھیلا رہا ہے مگر جب سے آج تک برابر چلا آتا ہے۔ بادشاہ سے امیر اور امیر سے غریب تک گھر گھر جشن مناتے تھے۔ وہی دھوم دھام اور جوش و خروش دلوں پر چھائے ہوئے تھے کہ شاہنامہ اور سکندر نامہ کے ہر داستان پر اور قصاید کے سروں پر گلہائے بہاری کے تاج دھرتے ہیں۔ 6 دن بادشاہ جشن کرتا تھا۔ امرا اپنی حیثیت بموجب اس کی پیروی کرتے تھے۔ غریبوں کو خیرات۔ نوکروں کو انعام دیتے تھے۔ گھر سجاتے تھے۔ زرق برق کے کپڑے پہنتے تھے۔ پھلے پھولے باغوں میں۔ ہرے میدانوں میں میلے کرتے تھے۔ ناچ ہوتے تھے۔ باجے بجتے تھے۔ سانگ بنتے تھے۔ انڈے لڑاتے تھے۔ دل لگی کے کھیل ہوتے تھے۔ مردوں کی یادیں کرتے تھے۔ کھانوں کے طبق بھر بھر کر بزرگوں اور خاندان کے بڑے بڑے بہادروں کی ارواحوں کے لیے کوٹھوں اور برجوں پر رکھتے تھے۔ ان میں سے جو اچھے ہوتے تھے وہ پریاں بن کر جو خبیث ارواحیں ہو جاتیں وہ بھوت بن کر آتے اور کھا جاتے۔ ان کا خیال تھا کہ پہلے تین دن تک روحیں زمین سے 3-3 کمان اوپر اوپر پھرتی ہیں۔ پھر اپنے اپنے پیاروں اور دوستوں کو دیکھ کر خوش ہوتی ہیں۔ اگر وہ راضی ہو کر جائیں تو گھر اور گھر والوں کی نحوستیں دفع ہوتی ہیں۔ چنانچہ تین دن تک کوئی گھر سے باہر نہ نکلتا تھا۔ اب تک بھی گجرات دکن کے علاقے میں جو پارسیوں کی نسلیں ہیں وہ اپنی قدیمی رسموں کو معمولی دنوں میں زندہ کرتی ہیں۔

ایسا ہی ایک میلہ ستمبر کے مہینے میں یعنی اعتدال خریفی پر گرمی میں کرتے تھے۔ جون کے مہینے میں آب ریزاں ایک تہوار ہوتا تھا۔ آپس میں ایک دوسرے پر پانی ڈالتے

تھے۔ جن لطیف مزاجوں کو خدا سامان دیتا تھا۔ وہ گلاب عرق بہار اور انواع و اقسام کی خوشبوئیاں چھڑکتے تھے۔

دسمبر کے مہینے میں آتش سوز کا تہوار ہوتا تھا۔ تمام آتش خانوں میں روشنیاں ہوتی تھیں ڈھیر کے ڈھیر آگ جلتی تھی۔ لوگ جمع ہوتے تھے۔ اس کے گرد گاتے تھے ناچتے تھے بلکہ اس میں بعض بعض رسمیں بے رحمی کی بھی ہوتی تھیں۔

ان تہواروں میں بعض دنوں کو فصلوں کے اعتدالوں سے بھی تعلق تھا۔ بعض کو سلطنت کے خاص خاص فتح ناموں سے علاقہ تھا۔ بعض بالکل واہیات اور تمسخر تھے۔ چنانچہ ایک جشن ہوتا تھا کہ اسے جشن کوسہ برنشین کہتے تھے۔ ایک آدمی ایسا ڈھونڈ کر لاتے تھے کہ ڈاڑھی کا کوسہ ہو اور آنکھ سے کانڑا۔ ایک ہاتھ میں پنکھا دیتے تھے ایک میں کوڑا۔ گدھے پر سوار کرتے تھے۔ اکثر خاندان شاہی کے لوگ اور امراء' غربا گرد ہوتے تھے۔ اس سے مسخراپن کرتے جاتے تھے۔ اس کے بدن پر گرم دوائیں مل دیتے تھے کہ برابر چلاتا تھا۔ ہائے گرمی ہائے گرمی اور جلدی جلدی پنکھا جھلنے لگتا تھا۔ تب کوئی اس پر ٹھنڈا پانی ڈال دیتا تھا کوئی برف ڈال دیتا تھا۔ یہاں تک کہ مارے سردی کے کانپنے لگتا۔ پھر بہت غصے ہوتا اور کوڑا سنبھال کر پھرانا شروع کر دیتا۔ لوگ اس کی چوٹیں کھاتے تھے اور ہنستے تھے۔ وہ جس دکان میں چاہتا گھس جاتا جس سے جو چاہتا مانگتا۔ مالک نہ دیتا تو چھین لیتا۔ کچھ سیاہی' کچھ گیرو' کچھ کیچڑ گھلا ہوا اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ جو نہ دے اس پر ڈال کر خراب بھی کرتا تھا۔ لوگ خود اپنے اپنے دروازوں پر اور جابجا اس کے واسطے نذرانے لیے حاضر رہتے تھے۔ صبح سے دوپہر ڈھلے تک جو جمع ہو۔ بادشاہ کے خزانہ میں جاتا۔ پھر چار گھڑی دن رہے تک کوسے مسخرہ کا اور اس کے ساتھیوں کا حق تھا۔ شام سے پہلے پہلے یہ سوانگ ختم ہو جاتا تھا اور وہ گدھے سے اترتے ہی ایسا غائب ہو جاتا تھا کہ پھر نہ دکھائی دیتا تھا۔ پھر دکھائی دیتا تو اتنا جتیاتے تھے کہ ہوش ٹھکانے نہ رہتے تھے۔

اپریل میں جشن خورم روز ہوتا تھا۔ اس کی بنیاد عین مصلحت ملکی پر تھی۔ بڑی دھوم دھام سے جشن مناتے تھے۔ امرائے دربار، روسائے ملک' شرفائے قوم' تعلقہ داران اضلاع، بڑے بڑے زمیندار بلائے جاتے تھے۔ زمینداروں کی دعوتیں ہوتی۔

تھیں۔ بادشاہ ان کے ساتھ بیٹھ کر ایک دستر خوان پر کھانا کھاتا۔ پھر ایک ایسی الفت بھری تقریر کرتا تھا کہ جس سے سب کے دل اس کی محبت اور قوم کی ہمدردی سے لبریز ہو جاتے تھے۔ وہ کہتا تھا کہ اے میری قوم! میں تم ہی میں سے ایک ہوں۔ سلطنت کے بلکہ دنیا کے کام زراعت اور عمارت پر منحصر ہیں۔ یہ بے تمہارے نہیں چل سکتے۔ میرا تم بغیر گزارہ نہیں جس طرح کہ مجھ بغیر تمہارا گزارہ نہیں۔ ہم تم سب ہمدرد بھائی ہیں۔ چاہیے کہ ہمیشہ باہم مل چل کر رہیں اور اپنے آرام کو دوسرے کے آرام پر قربان کرتے رہیں تاکہ امن امان اور آسائش و آرام ہم تم میں عام رہے۔

دسمبر میں ان عزیزوں کی یادگار کی رسمیں ادا کرتے تھے۔ جو مر گئے تھے ان کی آٹے کی مورتیں بناتے تھے اور چوراہے میں رکھ آتے تھے۔ ان کے ساتھ اور بھی چڑھاوے چڑھاتے تھے۔ ان روحوں کی بڑی تعظیم کرتے تھے۔ جون کے مہینے میں کچھ اور ٹوٹکے کرتے تھے اور کہتے تھے کہ دیو بھوت پریت گھروں میں گھسے ہیں اب وہ نکل گئے اور اگر ہیں تو تکلیف نہ دے سکیں گے۔

فروری کے مہینے میں نوشت گزدم کا ٹوٹکا کرتے تھے کہ بچھو گھروں سے نکل جائیں۔ گھر کی تین طرف کی دیواروں پر کاغذ پر کچھ کچھ لکھ کر لگاتے تھے۔ دروازہ کی طرف کھلی رکھتے تھے۔ اس وقت رنگین کپڑے پہنتے تھے اور کچھ عمل اور بھی کرتے تھے۔ پھر دروازہ کھول دیتے تھے۔ گویا بچھو ادھر سے نکل گئے۔

اسی مہینے میں 5 دن تک مردگیران کا جلسہ رہتا تھا اور اسے حافظ عورات سمجھتے تھے۔ ان دنوں میں عورتوں کو بڑے اختیار ہو جاتے تھے۔ جو فرمائش کریں خاوند بجا لائیں۔ لیکن باشوہر اور بے شوہر سب پاک دامن ہوتی تھیں۔ کوئی خبث درمیان نہ ہوتا تھا۔ اس میں ہندوستان کے سوئمبر کا ڈھنگ ہوتا تھا۔ چنانچہ آپس کی پسند اور رضامندی سے بعض جگہ منگنیاں، بعض جگہ شادیاں ہو جاتی تھیں۔ یہ قوم کا عام رواج تھا۔ امیر غریب جاہل عالم کوئی اس سے باہر نہ تھا۔ چنانچہ جو شادیاں اس طرح ہوتی تھی وہ بڑی مبارک اور پسندیدہ گنی جاتی تھیں۔ گویا نسل اور ولادت کا فرشتہ ان سے خوش ہوتا تھا۔

ایامِ بہار میں ہولی کی طرح چراغاں کر کے جشن مناتے تھے۔ ان میں سے چراغاں روز اسفند تھا۔ اور یہ مارچ کے دوسرے دہاکہ میں ہوتا تھا۔ ان کی شاعری خبر دیتی ہے:

سیاہ روز شدم بہر عشرت دگراں درین زمانہ چراغاں روز اسفندم

مینہ برسنے کے لیے بھی ٹوٹکا تھا۔ ایک سانڈھ کی دم میں روئی، کپڑا وغیرہ آتش گیر چیزیں باندھ کر آگ دیتے تھے اور چھوڑ دیتے تھے۔ وہ بھاگتا تھا اور کسی بلندی پر جا کر ٹھہرتا تو جانتے کہ مینہ برسے گا۔

بسنت کے میلے کا وہاں بھی اثر ہے۔ ایک قسم کے زرد پھول ہوتے تھے کہ آمد بہار میں سب سے پہلے کھلتے تھے۔ اہل عشرت ایک دن قرار دیکر باغوں میں جاتے تھے۔ گلگشت کرتے تھے۔ وہی پھول بہت سے توڑ کر لاتے تھے۔ گھروں کے حوضوں اور نہروں میں ڈالتے تھے اور خوشیاں مناتے تھے اسے جشن گل کوبی کہتے تھے۔ مولوی معنوی فرماتے ہیں:

خدایگان جمال و خلاصہ خوبی بہ باغ حسن درآمد برسم گل کوبی

افسوس کہ تقریر کہیں سے کہیں جا پڑی۔ کہنا کچھ تھا اور میں کچھ اور کہہ گیا۔ حقیقت میں ان حالتوں کا بیان کرنا منظور تھا جس طرح آج کل اہل فارس رہتے سہتے ہیں اور جن رسم و رواج کے ساتھ زندگی بسر کرتے ہیں اور اس کا اثر نظم و نثر میں ظاہر ہوتا ہے۔ خیر، اب کی دفعہ اس تقریر کو یہیں ختم کرنا چاہیے اور مقصد اصلی کو ہفتہ آئندہ پر ملتوی رکھنا چاہیے۔

چھٹا لکچر

اسلام کے بعد اہل ایران کے آداب و رسوم اور رہنے سہنے کے طریق

لکچر گزشتہ میں تم نے سن لیا کہ عہد قدیم میں اہل ایران کے دین و آئین اور رسم و رواج کا کیا طور تھا۔ یہ بھی سن لیا کہ شاہان قدیم کی عظمت اور اختیار کس درجہ پر تھے۔ تمھیں معلوم ہے کہ اس کی بنیاد خود بادشاہ کی نیک نہادی اور دین الٰہی کی برکت سے تھی۔ شاہان قدیم موبدوں کی آواز پر کان لگائے رہتے تھے۔ اسلام کے عہد میں فتوائے شریعت پر سب کی نگاہ ہو گئی۔ گیارہویں صدی کے بعد صفوی سلطنت کا خاتمہ ہوا۔ ان کے ساتھ ہی اہل شریعت کے روز روشن کا خاتمہ ہوا۔ شاہان صفوی کے عہد میں یہ حال تھا کہ اگر مجتہد وقت بادشاہ یا کسی حاکم پر مخالفت شرع کا فتویٰ لگا دیتے تو اسی وقت خاص و عام اٹھ کھڑے ہوتے اور اسے منہ چھپا کر بھاگنا پڑتا۔

شاہ عباس نے ایک عورت سے جبراً نکاح کرنا چاہا۔ ایک بھائی کے سوا کوئی اس کا وارث نہ تھا۔ مولانا احمد اردبیلی اس وقت مجتہد تھے۔ عورت کا بھائی ان کی خدمت میں پہنچا اور حال بیان کیا۔ انھوں نے ایک کاغذ کے پرزہ پر لکھ کر دیدیا "صورہ رقعہ برادرم عباس! خواہر حامل رقعہ را بہ وے بازدہ فقط" شاہ نے اسی وقت تعمیل کی اور وہ خط فخر سے سب کو دکھایا کہ سرکار مولانا نے مجھے برادر لکھا ہے۔ پھر خزینہ دار کو دیا کہ اسے احتیاط سے رکھو دفن کے وقت میرے کفن میں رکھنا۔

اختیارات علماء کے قائم رہتے۔ مگر زمانے کی ہوا بدل گئی۔ دول خارجہ زور پکڑ گئیں۔ سلطنت کا مزاج ضعف کے سبب سے پہلی باتوں کی برداشت نہ کر سکتا تھا اس لیے واجب ہوا کہ ان میں تبدیلی کی جائے۔ یہ تبدیلیاں نادر کے عہد سے شروع ہوئیں اور وہ بے سبب نہ تھیں کیونکہ ملک کو افغانوں اور رومیوں کے قبضے سے نکالنا ممکن نہ تھا بجز اس کے کہ ملک میں قومی جوش پیدا کیا جائے۔ اور مصالح ملکی کو شرع پر مقدم رکھا

جائے۔ آغا محمد خاں دولت قاچاریہ کا بانی اور اس کے جانشین یعنی شاہ حال کے بزرگوں کو روسیوں اور افغانوں سے ملک چھڑانا تھا انہیں مصالح ملکی کو زیادہ تر مقدم رکھنا پڑا۔

ناصر الدین شاہ بادشاہ حال کے عہد میں ایک موقع پر مازندران کے علاقہ میں کوئی سردار باغی ہو گیا۔ اس کی گوشمالی کو فوج بھیجی گئی۔ اس وقت تک اتنی بات باقی تھی کہ ہر فوج کے ساتھ ایک ملائے عسکر ہوتا تھا کہ نماز' روزہ اور جماعت ہر روزہ' موت زیست کے امورات کا سرانجام کرے۔ اس فوج کے ساتھ بھی ایک ملا صاحب تھے۔ خدا جانے انہیں باغیوں نے کچھ لالچ دیا۔ یا آپ ہی دین داری کے دودھ میں ابال آیا۔ فوج کو کہا کہ "تم بھی مومنین۔ وہ بھی مومنین۔ لڑائی میں طرفین سے مومنین مارے جائیں گے۔ یہ جنگ جائز نہیں۔" چونکہ مرنا خود بھی کسی کو پسند نہیں۔ فوج نے لڑنے سے انکار کیا۔ سپہ سالار شاہی کو حال معلوم ہوا۔ وہ گھبرا لیا اور بادشاہ کو عریضہ لکھا۔ ایسے نازک وقت میں بادشاہ کو بجز اس حکم کے چارہ نہ تھا کہ "ملا صاحب کو پہرہ میں کرکے بھیج دو اور غنیم پر فوراً حملہ کرو۔" جناب ملا کو بھی خبر لگ گئی۔ وہاں سے ایسے بھاگے کہ ایک دم ہندوستان پہنچے۔ ساتھ ہی بادشاہ نے حکم دیا کہ ملایان عسکر یک قلم موقوف۔ ایسے ایسے اکثر مقدمے واقع ہوئے۔ اسے 23-24 برس ہوئے۔ ملا صاحب موصوف کی اسی شہر لاہور میں مجھ سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔

مجتہد اب بھی وہاں بہت ہیں مگر جو کہ اوصاف اجتہاد سے موصوف ہیں انہیں بادشاہ اور حکام دل سے معزز و محترم سمجھتے ہیں۔ زکوٰۃ اور خمس کے روپے انہیں بانٹنے کو بھیجتے ہیں۔ وہ نہیں لیتے اور کہہ دیتے ہیں کہ اکثر علماء ہیں جو یہ کام کر سکتے ہیں۔ انہیں دو۔ ہمارا وقت عزیز ضائع ہوتا ہے۔ وہ تصنیف' درس' وعظ اور عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ بادشاہ خود ان کے سلام کو جاتے ہیں اور وہ پہلو بچاتے ہیں۔ وہاں کے علما امرائے دربار کو ظلمہ کہتے ہیں۔ مجتہد اور با احتیاط اشخاص' سوداگر بلکہ ادنیٰ دکاندار یا پیشہ ور کی ضیافت کھا لیتے ہیں۔ نوکری پیشہ لوگوں کی ضیافت نہیں کھاتے۔ صاف کہہ دیتے ہیں کہ ظلمہ ہستی آغا۔

اب علماء کا کام یہ ہے کہ نماز' روزہ' کفن و دفن' نکاح، طلاق' قرض، فرض'

بیع رہن وغیرہ آپس کے جھگڑے۔ لوگ ان کے پاس لے جاتے ہیں۔ جو مقدمے ملکی معاملات سے تعلق رکھیں انھیں بادشاہ خود فیصل کرتا ہے۔ علماء بھی اب اودھر دخل نہیں دیتے۔ سمجھ گئے ہیں کہ زمانہ کے انقلاب نے کاروبار عالم کے اصول بدل دیئے ہیں اگر سلطنت کے کاموں میں ہاتھ ڈالیں گے تو جو کچھ ہے یہ بھی جاتا رہے گا۔

خلاصہ یہ کہ ایران میں کسی عالم کو مجتہد ہونے کے لیے دو امر درکار ہیں اول مجتہد کامل کا اجازہ کہ یہ شخص علوم دینی سے ماہر ہے اور صاحب تقویٰ و طہارت ہے۔ دوسرے اپنے تئیں ان صفتوں سے موصوف رکھنا جن سے پبلک کے اعتقاد بذات خود اس کی عظمت کو تسلیم کریں۔ جب تک ایسے ہیں تب تک قبلہ وکعبہ ہیں۔ ایک نکتہ میں فرق آیا اور پبلک کے دل ہٹے۔ پھر جیسے سب ویسے وہ۔ کوئی نہیں پوچھتا۔

اب حال یہ ہے کہ مجتہدان حقیقی یعنی علمائے دیندار کو تو بادشاہی معاملات کی کچھ پرواہی نہیں۔ علمائے دنیادار عالم بے اختیاری میں تڑپتے ہیں کچھ کر نہیں سکتے۔ میں نے خود دیکھا چپکے چپکے کہا کرتے ہیں۔ سلطنت اور حکم سلطنت حق امام کا اور خزانہ دولت مال امام کا ہے۔ جب امام حاضر نہیں تو ہم وارث امام ہیں۔ بادشاہ نے ہمیں بے دخل کر رکھا ہے۔ حق امام کا غاصب ہے۔

کئی برس ہوئے ناصر الدین شاہ بادشاہ ایران یورپ کی سیر کو گئے۔ وہاں صدر اعظم یعنی وزیر کی صلاح سے ریوٹر کمپنی کو سڑک وغیرہ کا ٹھیکہ 70 برس کے لیے دے دیا۔ ایران میں بھی خبر پہنچی۔ یہاں علماء نے صدر اعظم یعنی وزیر کی تکفیر کا فتویٰ لگا دیا۔ شاہ کو بھی خبر پہنچ گئی۔ اودھر سے پھرا تو صدر اعظم کو بندرگاہ میں چھوڑ آیا اور کہا کہ معزول کر دیا۔ ساتھ اس کے علماء کو سمجھایا کہ ریل بن جائے تو بہت فائدے کی بات ہے۔ آپ صاحبوں کو بھی حج و زیارت میں سواری و بار برداری کا آرام ہو گا۔ انہوں نے کہا کہ بہت سے غیر مذہب مرد اور عورتیں یہاں آکر مل جل جائیں گی۔ جن کے عادات و اطوار اس ملک کے بالکل برخلاف ہیں۔ گدھے 'خچر' اونٹ ہمارے بزرگوں کے بوجھ ڈھوتے رہے۔ وہی ہمارے لیے کافی ہیں۔ بادشاہ نے کمپنی سے اقرارنامہ توڑنے کی ندامت گوارا کی مگر ان سے کچھ نہ کہہ سکا۔ یہ بات بھی جتانے کے قابل ہے کہ ایسے

جلیل القدر اور واجب التعظیم فقط گنتی کے لوگ ہیں۔ باقی جو ملا اور عالم حاجی کہلاتے ہیں وہ لوگوں کے دلوں میں نہایت پست درجے رکھتے ہیں۔ ایسے لوگ وہ ہیں جن کے ذکر شعرا کے فقروں میں شوخیاں پیدا کرتے ہیں۔

لطیفہ: چند سال ہوئے ایک شخص کے گھر سے آلات شراب نوشی وغیرہ پکڑے گئے۔ فاضل نجفی وہاں کے مجتہد تھے۔ انہوں نے اسے سزا دی اور گھر لٹوا دیا۔ مرزا یغما نے اس پر رباعی کہی۔ :

شیخ نجفی شکست پیمانہ ے گرویدہ بساط بادہ خواراں ہمہ طے
گر بہر خدا شکست بس وائے بہ ما ور بہر ریا شکست پس وائے بہ وے

اس کا چرچا ہوا۔ شیخ نے بھی سنا بلایا، اور کہا کہ "یغما! اہانت شرع کردی بد کردی۔" یہ استاد تھے! دست بستہ سر جھکا کر، گربہ مسکین کی طرح کھڑے ہو گئے اور کہا "جناب آغا ہر گے کہ خوردم پشیمانم بر آں۔ استغفر اللہ ربی واتوب الیہ۔ شیخ بچارے چپ ہو گئے۔ دعائے توبہ پڑھوائی اور رخصت کر دیا۔ انہوں نے آتے ہی ایک غزل کہی کہ جس کی طرح تھی۔ ساغر نمی کردم چہ میکردم۔ گوہر نمیکردم چہ میکردم۔ وغیرہ وغیرہ۔ اخیر میں کہا کہ :

ز شیخ شہر جاں بردم بہ تزویر مسلمانی مدارا گربایں کافر نمی کردم چہ میکردم

یہ غزل یاروں کو دے گئے اور آپ دوسرے شہر میں چلے گئے۔ اسی دن گلی گلی اور کوچہ کوچہ یہ شعر زبانوں پر تھا۔

عہد قدیم میں شاہان مہ آباد کی تعظیم، تعظیم الہٰی تھی۔ صفویہ کا خاندان بھی رکن ایمان تھا کیونکہ ہزار در ہزار قزلباش حسن اعتقاد سے ان کے نام پر جان قربان کرتے تھے۔ خاک کی تاثیر اور قومی سرشت دیکھو آج قجر کی بادشاہت ہے مگر داب وآداب اور عظمت واحترام وہی چلے جاتے ہیں۔ دربار جس طرح باہر ہوتا ہے اسی طرح حرم سرا میں ہوتا ہے۔ وہی قواعد ہیں وہی آئین مجرا ہیں۔ وہاں بھی کسی کو بیٹھنے کی اجازت نہیں ہوتی۔

بادشاہ حال کے دادا فتح علی شاہ قجر نے اپنی تصویر حاکم سندھ کو بھیجی۔ اس کا

صندوق ایک نہایت مکلف سواری میں رکھا ہوا۔ فوج کے ساتھ اس توزک و احتشام سے گیا جیسے کوئی درگاہ جاتی ہے۔ جس آبادی کے قریب پہنچتا تھا۔ لوگ پیشوائی کو نکلتے تھے۔ بڑی عظمت کے ساتھ لاتے تھے اور عید کی طرح خوشیاں منا کر روانہ کر دیتے تھے۔ بوشہر میں پہنچا تو دریابیگی کئی منزل استقبال کو گیا۔ جب شہر میں داخل ہوا تو شلک سلامی سر ہوئی۔

بادشاہی خلعت کسی حاکم کے پاس پہنچتا ہے تو وہ خواہ شہزادہ ہو خواہ کوئی امیر ہو۔ کئی میل تک استقبال کو آتا ہے۔ ہر شہر کے پاس ایک مقام مقرر ہے۔ اسے خلعت پوشاں کہتے ہیں وہاں ٹھہرتا ہے۔ شہر کے لوگ جمع ہوتے ہیں۔ دھوم دھام کا دربار ہوتا ہے۔ وہاں خلعت پہنتا ہے۔

دربار شاہی کے آئین و آداب دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے۔ تمام شہزادے اور امرائے دربار 'اپنی اپنی جگہ باادب کھڑے، سب کی نگاہیں بادشاہ کی طرف' خاموش' بے حرکت، گویا بدن میں جان نہیں۔ کسی سے کچھ کہتا ہے تو اس طرح کہ فقط ہونٹ ہی ہلتے معلوم ہوتے ہیں۔ جس کو بلاتا ہے وہ کئی کئی قدم پر آگے بڑھتا ہے اور تھم جاتا ہے گویا بار بار اجازت چاہتا ہے کہ بڑھوں یا نہ بڑھوں؟ بادشاہ گفتگو کرتا ہے تو اپنے تئیں غائب تعبیر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ شاہ فرمان میدہد۔ شاہ میفرماید۔ شاہ خواہش دارد۔ وزراء و امراء قبلہ عالم کہتے ہیں اور غائب ہی تعبیر کرتے ہیں۔ قبلہ عالم کا حکم ہو تو اس طرح کیا جائے اور قبلہ عالم کی اجازت ہو تو اس طرح عمل میں آئے۔

جب کوئی جشن ہوتا ہے تو طلسمات کا عالم ہوتا ہے۔ انگریزی سیاح اپنے سیاحت ناموں میں لکھتے ہیں کہ آسمان اس شکوہ و شان کے ساتھ دربار ایرانی کے مقابل میں ہیچ معلوم ہوتا ہے۔ تخت مرصع پر جواہرات جگمگ جگمگ کرتے ہیں کہ آنکھ نہیں ٹھہرتی۔ شاہ اس پر بیٹھتا ہے۔ اراکین دربار دو طرفہ عالم تصویر! میر غضب دیو پیکر گرز کندھوں پر دھرے حکم کے منتظر سامنے کھڑے رہتے ہیں کہ ادھر اشارہ ہوا ادھر ہاتھوں ہاتھ اڑا کر لے گئے۔ فرشتہ ہائے عذاب معلوم ہوتے ہیں۔ ان کی ڈراؤنی صورتیں دیکھ کر زہرہ پانی ہوتا ہے۔ کئی میل تک دو طرفہ فوج کھڑی ہوتی ہے۔ مگر

چپ چاپ۔ دم بخود۔ جاہ و جلال، رعب داب اور عظمت و وقار کا یہ عالم کہ گھوڑے کا کان تک ہلتا نہیں نظر آتا۔ ایسے دھوم دھام کے دربار جشن پر ہوتے ہیں یا جب دول خارجہ میں سے کسی کا ایلیوس[32] آتا ہے تو اس کی ملازمت پر۔

سفر میں بادشاہ ہمیشہ گھوڑے پر سوار ہوتا ہے کیونکہ وہ شہسوار ہوتا ہے۔ بیماری کی ناچاری ہو تو تخت رواں پر جاتا ہے۔ اسے خچر کھینچتے ہیں۔ سفر کا خیمہ و خرگاہ بھی بڑی نمود و نمائش رکھتا ہے۔ سلاطین صفویہ سادات تھے۔ وہ عبا و عمامہ رکھتے تھے۔ قجر سپاہگری کا فخر رکھتے ہیں اس لیے ان کا لباس چست ہے اور عمامہ کی جگہ پوست برہ کی کلاہ۔ سواری کے گھوڑے برق و باد سے باتیں کرتے ہیں۔ سونے چاندی کا ساز و یراق جواہرات سے مرصع ہوتا ہے۔ اس طرح کے بہت سے گھوڑے سجے سجائے کوتل بھی چلتے ہیں[33]۔ ہر شہر کے حاکم اپنے اپنے طویلوں میں اچھے اچھے گھوڑے تیار کرتے ہیں اور وقت بوقت حضور میں بھیجتے رہتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ان کے محاورہ میں شاہ کا لفظ مختلف لفظوں کے ساتھ مل کر معنوں کو بھی شان و شکوہ دیتا ہے۔

حکایت: ایک دفعہ جہانگیر کابل میں تھا۔ میوہ کی ڈالی میں اعلیٰ قسم کے آلوچے سامنے آئے۔ بہت خوش ہوا اور شاہ آلو نام رکھا۔ وہ اپنی توزک میں شاہ دانہ کا ذکر بھی بہت کرتا ہے۔ اسے بھی اور اکبر کو بھی بہت بھاتا تھا۔ اسی طرح شاہ لیمو۔ شاہ انجیر۔ شاہ زیرہ ہے۔ مگر لفظ شہتوت ہندوستان میں ہے۔ وہاں فقط توت کہتے ہیں۔ بادشاہ حسن۔ تاجدار حسن وغیرہ معشوق کو کہتے ہیں۔ چمن کے تخت پر پھول کو کبھی خسرو بہار، کبھی خسرو گل کہہ کر بٹھاتے ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

رہنے سہنے اور زندگی بسر کرنے کے طریقوں میں بہ نسبت عہد سلف کے بہت کم تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ اس ملک میں زیادہ تر دو قسم کے لوگ ہیں۔ (1) اہل شہر کہ خانہ گیر ہیں۔ (2) ایلیات۔ جنہیں بیاباں گرد، صحرا نشین اور خانہ بدوش غرض جو کہو درست ہے۔ ہزاروں کی جمعیت۔ عیال و اطفال، بال بچے، سب خانہ داری کے سامان۔ ایک شہر رواں یا ملک خانہ بدوشاں ہوتا ہے۔ ہزاروں بکریاں اور دنبے گھوڑوں کے گلّے۔ اونٹوں کی قطاریں ان کی املاک اور جاگیریں ہیں کہ ساتھ ساتھ پھرتی ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں

جن کے اصلی وطن برفانی پہاڑ ہیں۔ ستمبر میں برف سے پہلے پہلے زمینیں تیار کر کے تخم ریزی کی۔ جہاں یخ بندی معلوم ہوئی۔ سب گھر بار باندھا اور دامن کوہ میں اتر آئے۔ زیادہ سردی ہوئی تو دروان اور سر سبز میدانوں میں نکل آئے۔ مئی میں برف پگھل گئی۔ پھر گئے تو دیکھا کہ کھیتی بالشت بالشت بھر کھڑی ہے۔ آنکھوں کے دیکھتے دیکھتے 15-20 دن میں کاٹنے قابل ہو گئی۔ 3-4 مہینے وہاں رہے۔ جو غلہ ہوا وہ لیا۔ پھر گھر بار لاد پھاند کر اتر آئے۔ تمام عمر اسی طرح گزر جاتی ہے۔

ان کے سفر کی حالت بھی ایک بہار کا تماشا ہے۔ چولہا' چکی' پکانے کھانے کے اسباب سب گھوڑوں خچروں اور گدھوں پر لدے ہیں۔ رنگ برنگ کے نمد اور قالین کہ اپنے ہاتھوں کی دستکاری ہے۔ وہی جھولیں پڑی ہیں۔ ننھے ننھے بچے جیسے چاند کے ٹکڑے۔ چھوٹے چھوٹے پنگوڑوں اور کجاووں میں سوتے ہیں یا بیٹھے ہیں۔ ہنگھوڑے اونٹوں اور خچروں پر جھولتے چلے جاتے ہیں۔ جو بہت غریب ہیں وہ کندھوں پر لیے ہیں یا کمر سے باندھے ہیں۔ یہ غریب مال دولت کے غریب ہیں۔ مگر حسن و جمال کے امیر ہیں۔ حوریں اور پریاں معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے شیر شکار کتے مویشیوں کو گھیرے لیے جاتے ہیں۔ مجال نہیں کہ ایک جانور رستہ سے پھٹ جائے۔ جس وقت دامن کوہ یا کمر کوہ میں گزرتے ہیں (اور رستہ بھی ایک ایک ہی آدمی یا گھوڑے کا ہوتا ہے) اس وقت وہ رنگارنگ کے گلزار چیونٹوں کی قطار عجب بہار دیتی ہیں۔

یہ قدرتی مخلوق جنگلوں اور دروں میں بھی پھرتے چلتے رہتے ہیں۔ جہاں جاڑہ کے لیے سر سبز جنگل اور اپنے لیے میوہ دار درخت اور شکار دیکھے وہیں یہ چادر یعنے کالی تنبوتیاں ڈالیں اور اتر پڑے۔ یہ ڈیرے انھیں کے اونٹوں اور بکریوں کی اون کے ہوتے ہیں۔ ان کا کمسریٹ ان کے ساتھ لدا آتا ہے۔ وہ غلہ سوکھے توت۔ سوکھے زرد آلو۔ اخروٹ۔ گوشت قاق (سوکھا گوشت)۔ سوکھا ہی ہوتا ہے۔ کچھ اس سے، کچھ جنگل کے ہرے میووں سے کچھ تازے شکاروں سے اپنے تنوں کو تیار اور جانوں کو تازہ کرتے ہیں۔ ان کے قبیلوں کے سردار جنھیں جوانی کی طاقت اور توانائی حوصلے دیتی ہے شہروں میں جاتے ہیں۔ درباروں سرکاروں میں خدمتوں سے عظمتیں پاتے ہیں۔ بڈھے سردار

ریش سفید کہلاتے ہیں اور اس شہر رواں کے حاکم یا بادشاہ جو سمجھو وہی ہوتے ہیں۔ ریش سفید کا سب ادب کرتے ہیں۔ وہ بھی سیدھی سادی وضع کے ساتھ ان میں انہی کی طرح ملا جلا رہتا ہے۔ سب کی چادریں ہمرنگ اور یکساں ہوتی ہیں۔ البتہ ریش سفید کی چادر ذرا بڑی ہوتی ہے۔

یہ جہاں اترتے ہیں چوکور قلعہ باندھ کر اترتے ہیں۔ اونٹ گھوڑے خچریں دنبے ادھر ادھر چرنے کو چھوڑ دیتے ہیں۔ جوان کچھ کام نہیں کرتے۔ اگر شکار نہ ہو تو 20-20 اور 10-10 مل بیٹھتے ہیں ہنستے کھیلتے ہیں۔ گاتے بجاتے ہیں اور حقہ اڑاتے ہیں۔ عورتیں گھروں پر رہتی ہیں۔ روٹیاں پکاتی ہیں۔ چرخے کاتتی ہیں۔ قالین ایسے ایسے بنتی ہیں کہ مخمل کو گرد کر دیتی ہیں۔ بعض عورتیں بڈھوں اور اپنے بچوں کے ساتھ گلے چراتی ہیں۔ جب بہار کے موسم میں شہروں کے مسافر گھروں سے نکلتے ہیں تو دیکھتے ہیں۔ آذربائیجان اور کردستان کے دورن اور پہاڑوں کا یہ عالم ہوتا ہے کہ رنگارنگ مخلوق خدا سے موج مارتے ہیں۔ یہ صحرائی مخلوق اکثر دامن کوہ میں یا پہاڑ کے آس پاس ہی رہتے ہیں۔ جہاں بادشاہ یا دشمن کی طرف سے کچھ خطرہ معلوم ہوا۔ جھٹ اسباب باندھا اور پہاڑوں میں گھس گئے۔

شکار ان کی موروثی خوراک ہے۔ اسے شہری اور ایلیات دونوں آج تک برابر نباہتے ہیں۔ اتنا فرق ہے کہ پہلے تیر و شمشیر سے شکار کرتے تھے۔ اب بندوق سے کرتے ہیں۔ شیر، چیتا، بھیڑیا، گیدڑ، لومڑی، خرگوش، جنگلی بکرے، پہاڑی بکرے اور قسم قسم کے ہرن ان کا نشانہ ہیں۔ جرہ۔ باز۔ شاہین سے۔ تیتر خرگوش کبوتر مرغابی وغیرہ مارتے ہیں۔

کتے کو نجس جانتے ہیں مگر شکار کا شوق وہ بھی پلواتا ہے۔ خصوصاً ایلیات کہ ہر سیہ چادر کے ساتھ ایک ایک شیر شکار کتا چوکیدار ہوتا ہے جس سے بھیڑیے کی جان کسی طرح نہیں بچ سکتی۔ بعض کتے بہت بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ بعض چھوٹے ہوتے ہیں اور نہایت خوشرنگ خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے رنگ بہ رنگ کے نام رکھتے ہیں۔ سیہ مار۔ شہباز۔ قرلباز۔ زرگوش۔ چنگ۔ پلنگ وغیرہ۔ اگر سیاحت ملک یا قوم کی تاریخ

ان حالات سے خبر نہ دے تو انشا پردازی آگاہ کرتی ہے۔ خاقانی سفر مکہ کے قصیدہ میں کہتا ہے۔

چوں زراہ مکہ خاقانی بہ یثرب کرد رو پیش قبر مصطفیٰ ثانی حساں دیدہ ام
بندہ خاقانی سگ تازی ست پیش مصطفیٰ
خ خ آں تازی سگے کش فارسی خواں دیدہ ام

خواجہ حافظ:

شنیدہ ام کہ سگاں را قلادہ می بندی چرا بگردن حافظ نمی کنی رسنے

شاہ طہماسپ کے ایک مسخرے کا نام سگ لوند تھا۔ شاہ ایک دن صبح اٹھتے ہی شکار کو چلا گیا۔ رات کے جلسہ میں کچھ ذکر نہ تھا۔ سگ لوند کو خبر نہ تھی رہ گئے۔ دوپہر کے قریب شاہ آیا۔ سگ لوند حاضر تھے۔ گھوڑے کے پاس جا کھڑے ہوئے اور کہا کہ:

سحر آمدم بکویت بشکار رفتہ بودی توکہ سگ نبردہ بودی بہ چہ کار رفتہ بودی

چنانچہ یہی سبب ہے کہ بیسیوں اصطلاحیں اس سے ترکیب پا کر نکلی ہیں۔ مثلاً سگ سیرت، سگ دل، سگ جگر، سگ جان وغیرہ۔

ایسے جنگی ملک میں قوم کی بہادری قائم رہنے کے لیے شہسواری اور صید افگنی ضرور تھی۔ چنانچہ بزرگ ان کے عربستان کے ریگستان سے اچھی اچھی نسلیں لائے۔ ایرانی اور تورانی گھوڑوں سے انہیں پیوند دیا۔ یہاں کے سرسبز جنگلوں نے پال کر انہیں فربہ، توانا اور خوبصورت بنایا۔ تواریخ قدیمہ کے افسانہ خواں جانتے ہیں کہ گھوڑوں نے بڑے بڑے وقتوں پر کام دیے ہیں اور آدمیوں کی طرح رفاقت و جاں نثاری کی ہے۔ اس لیے انہیں جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں اور ملک ایسا ہے کہ ہر شخص گھوڑا رکھ سکتا ہے۔ اسپ توسن، سمند یکران سیون تکاو، بارہ بارگی خنگی وغیرہ اس کے بہت نام ہیں۔ صبا رفتار، بادپا، دشت پیما، صحرا نورد، ہاموں نوردو وغیرہ وغیرہ بیسیوں صفتیں خوشنما اور خوش آئند نکالی ہیں۔ پیار کے مارے ہر شخص اپنے اپنے گھوڑے کے پیارے پیارے نام رکھتا تھا۔ رستم کا رخش، خسرو اور شیریں کا شبدیز و گلگوں تھا اور ان کے علاوہ اکثر شیریں، ہمدم، پرند، عقاب، ترنج وغیرہ وغیرہ نام رکھتے ہیں۔ اب تک ناصر الدین شاہ بادشاہ

کے ایک ایک گھوڑے کا نام الگ الگ ہے۔ از انجملہ صباح الخیر ہے کہ سفر یورپ میں ساتھ تھا۔

گھوڑے ہمیشہ ان کے پیش نظر ہیں۔ یہی سبب ہے کہ بہت سی اصطلاحیں انشا پردازی میں ان کے متعلق پیدا ہو گئی ہیں۔ کوئی شخص بہت بک رہا ہو تو مرد ظریف کہے گا۔ "ساعتے لگامش بدہید۔ اندکے لگامش بکشید" (تا ازیں ہرزہ دوی باز ایستد)۔ کسی کی یاوہ گوئی کا اشارہ کرنا ہو تو کہتے ہیں۔ آب بے افسار میخورد (رکتا نہیں برابر بکے چلا جاتا ہے) اکنوں توسن فکر را عناں می کشم (بہت لکھا۔ اب لکھنا موقوف کرتا ہوں) ناچار دریں وادی عنان افگندم اور فرس افگندم (یہ کام شروع کیا۔ یا اس مطلب پر لکھنا شروع کیا) اور ازیں وادی عنان را بری تافتم۔ (یعنی دوسرا مطلب شروع کرتا ہوں)۔

اس کے علاوہ گھوڑے کے دوڑانے اور تیز کرنے اور روکنے اور آہستہ اور تیز چلانے کے لیے۔ بہت سی اصطلاحیں نکالی ہیں۔ مثلاً عنان فگندن۔ عنان سبک کردن۔ عنان کشیدن۔ عنان گرم کردن۔ اور عنان در عنان تافتن (برابر برابر) اور عنان گرفتن۔ کسی کو جانے سے روکنا۔ عنان گستہ میرود (بگٹٹ جاتا ہے) اور برخلاف اس کے لنگ لنگاں دنبالش میروم اور خوش لگام۔ بدلگام وغیرہ بہت سے اوصاف ہیں کہاں تک لکھوں۔

گھوڑے کے اوصاف اور لوازم ہمیشہ پھرتی، جوش اور ہمت کے موقع پر استعارہ کیے جاتے ہیں۔ توسن فکر، کمیت خامہ، توسن اندیشہ، عنان عقل، توسن قلم، یکران قلم، یکران اقبال، توسن روزگار، توسن گردوں، ابلق ایام اور سرخنگ افلاک اور کہتے ہیں، عنان صبر از دست برفت وغیرہ وغیرہ۔

اہل ایران اب تک ان کی نسلوں میں احتیاط کرتے ہیں۔ گھوڑوں کے نسب نامے لکھے ہوئے ساتھ رہتے ہیں۔ شہسواری کا یہ رنگ ہے کہ ہرن کے پیچھے گھوڑا ڈالتے ہیں اور بگٹٹ دوڑاتے ہیں۔ سو دو سو قدم رہتا ہے تو گھوڑے کو اس طرح دبا کر ڈپٹتے ہیں کہ زمین سے وصل ہو کر ہرن کے برابر جا نکلتا ہے۔ اس وقت آپ جھک کر ہرن کی ٹانگ، سینگ جو ہاتھ آئے پکڑ لیتے ہیں اور الگ اٹھا لے جاتے ہیں۔

مالکم صاحب سفارت ایران پر گئے تھے۔ لکھتے ہیں کہ میں سیر و سفر کے عالم میں ایک مرغزار پر گزرا۔ سیہ چادریں ڈالے لوگ پڑے تھے۔ ایک عورت ہمیں دیکھ کر رستہ پر آکھڑی ہوئی۔ میرے ساتھ چند شرفا تھے۔ ایک نے اس سے پوچھا۔ باجی! شویت کجاست؟ اس نے کہا۔ بہ شکار رفتہ۔ ایک 9-10 برس کی لڑکی بھی اس کے برابر کھڑی تھی۔ ہم نے پوچھا کہ ایں کیست؟ عورت نے پیار سے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور کہا "دختر من است" ہم نے کہا "خدا پسرے ولادت بدہد کہ برادر ایں دختر باشد۔" عورت مسکرائی۔ پاس ہی اس کی سیہ چادر تھی۔ وہاں اس کا گھوڑا بندھا تھا۔ اسے جا کر لگام دی اور ننگی پیٹھ لے آئی۔ بیٹی کو اشارہ کیا۔ لڑکی جھٹ لپک کر سوار ہوئی۔ اودھر دو تین کاوے دیئے ہوئے۔ سامنے ایک اونچا سا ٹیلا تھا کہ پتھروں سے سنگلاخ ہو رہا تھا۔ سرپٹ دوڑا کر اس پر چڑھ گئی۔ چوٹی پر پہنچی تو چلا کر للکاری۔ ایک ہاتھ اونچا کیا اور بالکل نڈر اور بے خطر پھر اسی طرح دوڑائے چلی آئی۔

یہ سب لوگ حقیقت میں لٹیرے راہزن ہیں اور اسی کو فخر سمجھتے ہیں۔ آج کل کہ انتظام درست ہے۔ بڈھے بڈھے مغل مل کر بیٹھتے ہیں۔ چائے پیتے جاتے ہیں۔ حقے اڑاتے ہیں۔ اگلے زمانوں کو یاد کرتے ہیں اور کہتے ہیں۔ اے آغا! وقتے وقتے بود کہ ہر کس شمشیرے۔ در کمر۔ خونے در جگر۔ اپے بزیر ران داشت۔ البتہ میتوانست پارۂ از عمر بہ آرام بسر برد۔ ایں زندگی نیست۔ رسوائیست۔ موت بہزار درجہ بہتر است ازیں زندگی۔

ان کی گزران سفری اور کاموں کی رواروی سے اکثر الفاظ خبر دیتے ہیں مثلاً اجاغ ترکی میں چولہے کو کہتے ہیں۔ اچ = 3 + اایاغ = پایئے سہ پایہ۔ تم بھی سمجھتے ہو۔ ایسا چولہا اکثر ضرورت وقتی کے لیے بناتے ہیں کہ پکایا، کھایا اور روانہ۔ ہمارے تمہارے چولہے ایسے نہیں ہوتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کی گزران ہمیشہ ان سے اجاغ بنواتی تھی۔ اب گھروں کے چولہوں کو بھی اجاغ کہتے ہیں۔ لطف یہ ہے کہ محاورہ میں "اجاغ زادہ" خاندانی اشراف کو کہتے ہیں۔

عالم آرائے عباسی میں اکثر نمکخوران دولت کے لیے لکھا ہے۔ فلانی کہ از زلہ

خواران اجاغ ایں دولت است بداں خدمت اعزاز یافت۔

ان لوگوں کو بہت سے لوٹ مار کے کارنامے اپنے بزرگوں کے یاد ہیں۔ وہ فخریہ بیان کرتے ہیں اور کوئی کہتا ہو تو نہایت اشتیاق سے سنتے ہیں۔

فتح علی شاہ (بادشاہ حال کے دادا) کا زمانہ تھا کہ وزیر مختار دولت فرنگ کا سیاحت کو اٹھا۔ منزل بمنزل سیر کرتا ہوا جاتا تھا۔ وزیر مختار کی اردلی میں ایک دستہ اپنے سواروں کا رہتا ہے وہ بھی ساتھ تھا۔ اس دستہ کے سوار لرستان کے رہنے والے فیلی اور لک۔ بیاباں گرد قبیلوں کے لوگ تھے۔ صاحب نے انہیں قواعد سکھائی تھی۔ ان کی وردی یکساں، گھوڑوں کے زین، سازو یراق سب یکساں، سوار قواعد کے پابند، چپ چاپ بت بنے چلے جاتے تھے۔ گھوڑے بھی برابر قدم ملائے تھے۔ ساتھ ایک شاہی سردار تھا۔ اس کے رفیق اور نوکر چاکر بھی ہمراہ تھے۔ یہ بھی اور رستہ کے لوگ بھی دستہ مذکور کی حالت کو چشم تعجب سے دیکھتے تھے۔ سردار شاہی کے مصاحبوں میں بموجب رسم کے ایک مسخرہ بھی تھا۔ رستہ میں صاحب اس سے باتیں کر کے دل خوش کرتے جاتے تھے۔ ایک گاؤں کے پاس کو گزرے۔ لوگ آبادی سے نکلے اور تماشا دیکھنے کو آن کھڑے ہوئے۔ مسخرے نے صاحب سے سواروں کی تعلیم کی بہت تعریف کی پھر پوچھا کہ انہیں کتنی مدت میں قواعد سکھائی ہو گی؟ صاحب نے کہا کہ فقط 6 مہینے میں۔ اس نے کہا کہ یہ چھ مہینے کی محنت کہو تو ایک دم میں برباد کر دوں! صاحب نے کہا کیونکر؟ وہ جھٹ گھوڑا اڑا کر چلا۔ برابر میں ایک چھوٹا سا ٹیلا تھا۔ زمزمہ کی آواز لگاتا ہوا اس پر چڑھ گیا۔ اکثروں کے خیال ادھر متوجہ ہوئے۔ جب دستہ مذکور ٹیلے کے برابر میں آیا۔ مسخرہ نے ایک ہاتھ اٹھایا اور اپنی آہنگ ایرانی میں لہکار کر کہا:

اے جوانان لرستاں! بشنوید از من کہ من
یاد دارم داستانہا از نیاگان شما

بزرگوں کی مردانگی کا نام سن کر سب کے کان کھڑے ہوئے۔ اس نے دوبارہ پڑھا۔ یا تو سب برابر با قواعد چلے جاتے تھے۔ یا قواعد کو چھوڑ۔ صفوں کو توڑ پھوڑ۔ سب کے سب گھوڑے مار کر ادھر بھاگے کہ دیکھیں ہمارے بزرگوں کی کیا داستانیں سناتا

ہے۔ دوسری طرف سے گاؤں والے دوڑے۔ مسخرے کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔ ہر شخص پاس کھڑا ہونا چاہتا تھا کہ اچھی طرح سن سکے اور اسی واسطے ایک دوسرے سے آگے بڑھا جاتا تھا۔ ولایتی گھوڑے سر شور، سینکڑوں پاچھیاں چلنے لگیں۔ سوار گر گر پڑے۔ گھوڑے چھٹ چھٹ گئے۔ تماشائیوں نے مفت چوٹیں کھائیں۔ عجب ہنگامہ ہوا۔ صاحب بچارے حیران کھڑے دیکھتے تھے کہ یہ کیا ہو گیا۔ مسخرا پھر ہنستا ہوا آیا اور کہا کہ صاحب! دیکھا۔ یہ شعر وہ افسوں ہے کہ نادر کے بعد جب ملک میں بدعملی ہوئی تو ایک شخص چند رفیق اور کئی گویے ساتھ لیکر ایلیات میں گیا۔ اس کی برکت سے 15 ہزار آدمی جمع کر لیے اور کئی ہفتہ تک بادشاہ بنا رہا۔

قجر کے خاندان میں اب تک آباؤ اجداد کی بہت باتیں سخت استقلال سے برقرار ہیں۔ آزاد کو ان میں سے ایک بات پسند آئی۔ محمد حسن خاں نے (کہ فتح علی شاہ یعنی بادشاہ حال کے دادا کا دادا تھا) ایک موقع پر قبائل صحرانشین میں پناہ لی تھی۔ ایک قبیلہ کے سردار نے اسے اپنی بیٹی دینی چاہی۔ خان مرحوم نے انکار کیا اور کہا۔ اس لڑکی کی طبیعت ایسی نہ ہو گی جس کے بیٹے تخت و تاج کے دعوے پر جان قربان کر دیں۔

ایران کا ایلچی ایک دفعہ ہندوستان کی طرف آیا۔ اس کے پیش خدمتوں میں ایسے ایسے کئی شخص تھے۔ ایک ان میں بہت خوش مزاج تھا۔ ایک صاحب نے اس سے پوچھا کہ "چہ طور یافتی شہر کلکتہ را۔" ہنس کر کہا کہ "عجب جائیست برائے چپاو" مگر خوبی یہ ہے کہ چوری کو سخت عیب سمجھتے ہیں۔ کوئی خون کر کے آیا ہو اور ان کی سیہ چادر پر آکھڑا ہو۔ اس کی حفاظت اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ حاکم خود چڑھ آئے تو اسے دھکے دیکر نکال دیتے ہیں۔ وہ حاکم کی سزا کی ذرا پروا نہیں کرتے۔ مائیں بچپن میں بچوں کو خواہ مخواہ سونٹے مارتی ہیں کہ بڑے ہو کر پٹنے کی عادت رہے۔

باہمی مقدمات کا فیصلہ تانجوت (پنچایت) سے کرتے ہیں۔ ریش سفید صدر انجمن یعنی سرپنچ ہوتا ہے۔ جو فیصلہ اس کے سامنے ہو جائے رد نہیں ہو سکتا۔ قبیلہ کی امارت خاندان سے باہر نہیں نکلنے پاتی۔ امیر مر جائے اور چھوٹے سے بچے کا بھی کہیں پتہ لگ جائے تو وہیں سے ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔ اپنے جنگل پہاڑوں میں لے جاتے ہیں اور

ہاتھ چوم کر امیر بناتے ہیں۔ اپنے امیر کے نام پر مال تو کیا جان تک دریغ نہیں کرتے۔ بادشاہ کے لیے جمعیت کی ضرورت ہو تو اس طرح جان توڑ کر جمع نہیں ہوتے۔ امیر پر وقت آئے تو پل کے پل میں چادر چادر، پہاڑ بہ پہاڑ اور جنگل بہ جنگل حکم پہنچ جاتا ہے اور سب اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ طرفدار بہ معنی سپہ سالار یا بادشاہ ہو گیا ہے (دارندۂ طرف)۔ اپنے امیر کے مرنے کا بڑا ماتم کرتے ہیں۔ اس کے گھوڑے کو سجاتے ہیں۔ اس کی ٹوپی زین کے ہرنے پر رکھتے ہیں۔ دونوں طرف دونوں موزے۔ ایک طرف سپر ایک طرف تلوار لٹکاتے ہیں۔ کمر پٹکا اس کے گلے میں لپیٹتے ہیں۔ اس کی دم کتر دیتے ہیں اور جنازہ کے ساتھ ساتھ گرد چکر دیتے ہوئے لیے چلتے ہیں۔ آپ گریباں چاک، ننگے سر، راکھ منہ پر ملے، روتے پیٹتے جاتے ہیں۔ اس کے دوست بھی اپنے اپنے گھوڑے (کہ ان پر بھی ہتھیار دھرے ہوتے ہیں) اعزاز و احترام کے لیے بھیج دیتے ہیں۔ یہ ایک عجیب وقت اور پر تاثیر حالت ہوتی ہے۔ راہ چلتے بھی کھڑے ہو جاتے ہیں اور دیکھ کر رونے لگتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قدیم رسم ہے ماوراء النہر کے ترکمان صحرا نشین میں بھی یہی دستور ہے۔ فردوسی نے جہاں سہراب کا جنازہ اٹھایا ہے وہاں بھی یہی سامان درست کیا ہے:

بریدہ دم بادپایاں ہزار پہلوی خاک بر سر مہتراں نامدار
بریدہ سمند سرافراز دم دریدہ ہمہ کوس رویئنہ خم
بہ پیش تابوت میر اندند بزرگاں بسر خاک بفشاندند
تہمتن پیادہ ہمیں رفت پیش دریدہ ہمہ جامہ، دل کردہ ریش
کشادند گرداں سراسر کمر ہمہ پیش تابوت پرخاک سر
ہمہ زخ کبود و ہمہ جامہ چاک بسر برفشاندہ بریں سوک خاک

عزیزانِ وطن! فارس کی انشاپردازی تمہیں خبر دیتی ہے کہ میرے ملک میں تجارت کو عمدہ ذریعہ زندگی کا سمجھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ نظم و نثر میں سفر، کاروان، گرد کاروان، رباط، سرائے، مہماں سرائے، خر، پالان، خرلنگ، پشت، ریش، شتر، کجاوہ، محمل، دشت، کوہ گردار اور منزل وغیرہ کے صدہا استعارے نظر آتے ہیں اور ان

الفاظ سے عمدہ مضامین پیدا کرتے ہیں:

دلم زسینہ بروں رفت و داغ او باقیست چنانکہ ماند بر جائے کارواں آتش

زبان مذکور آگاہ کرتی ہے کہ زراعت بھی وہاں عمدہ ذریعہ گزارہ کا ہے اور نمونہ اس کا الفاظ باغ، کشت، دہقان، روستائی، خرمن، تخم، جو، گندم، آب آبیاری، شبان، گلہ، گرگ اور گوسپند وغیرہ کے استعارے ان کی انشا پردازی میں دکھاتے ہیں۔

پیشہ کشاورزی و سوداگری باز فقیری پس ازاں چاکری

اس سلسلہ میں خواجہ حافظ کا مطلع لکھے بغیر مجھ سے نہیں رہا جاتا:

مزرع سبز فلک دیدم و داس مہ نو یادم از کشتہ خویش آمد و ہنگام درو

اس زمین میں فیضی سے بہتر میں نے نہیں سنا کہ کسی نے مطلع لکھا ہو:

مشتے از جو بکف آریم و بکاریم زنو انچہ کشتیم ز خجلت نتواں کرد درو

جب ان جنگلوں سے کہ خدائی گلزار ہیں آبادیوں کی طرف آؤ تو رستہ میں 4، 4، 5، 5 کوس پر پاؤ گے کہ صفوی سلاطین کی تعمیری سرائیں اور رباطیں ان کی نیتوں پر آب حیات چھڑک رہی ہیں اور بڑے بڑے شہروں میں دور سے اونچی اونچی عمارتیں بزرگان عجم کے ناموں کو بلند کرتی ہیں۔

بازار یہاں وہاں یکساں ہیں مگر اکثر جگہ زانو زانو برف پڑ جاتی ہے اس لیے شہروں میں بازاروں کو لداؤ کی چھتوں سے پاٹتے ہیں۔ شاہ جہاں کے زمانے میں جب علی مردان خاں حاکم قندھار، ایران سے منحرف ہو کر ادھر آگیا تو سرد ملک کا رہنے والا سمجھ کر اول اول اسے شاہجہاں نے کبھی کشمیر کبھی کابل میں رکھا۔ کابل اور پشاور میں پٹے ہوئے بازار اس نے بنوائے۔ اور یہ بازار بغدادی کہلائے کہ بغداد کے نمونہ پر بنوائے تھے۔ کابل میں اب تک بازار چار چھتہ اس کی یادگار باقی ہے۔ پشاور میں گردش فلک سے مٹ گئے۔

بازاروں کے ذکر میں یہ بات اہل وطن کو جتانے کے قابل ہے کہ خراسان اور ترکستان کے گاؤں گاؤں میں ہفتہ ہفتہ یا ہفتہ میں دو دفعہ بازار لگتا ہے۔ چو کوسی پچ کوسی گاؤں کے لوگ کوئی گھوڑے پر کوئی گدھے پر اور کوئی پیادہ اندھیرے منہ گھروں سے چل کھڑے ہوتے ہیں۔ ان میں ہر قسم اور ہر پیشہ کے لوگ ہوتے ہیں۔ 8-9 بجے تک

وہاں آن پہنچتے ہیں۔ ادھر سے گاؤں کا چپہ چپہ بلکہ عورتیں بھی برقع اوڑھ اوڑھ کر نکلتی ہیں۔ اپنا اپنا مال دیتے ہیں۔ مبادلہ میں اپنی ضرورت کی چیزیں خرید لے جاتے ہیں۔ گھوڑا۔ گدھا۔ گائے۔ بھینس۔ بکری۔ دنبہ۔ مرغی۔ انڈے تک موجود ہوتے ہیں۔ بڑھئی' جلاہا' درزی' تیلی وغیرہ وغیرہ ہر قسم کا پیشہ ور اپنی چیزیں لاتا ہے۔ باغ اور سرد رختی والے اپنے میوے۔ زمیندار اپنے غلے بلکہ ان کا بھس تک لے آتے ہیں۔ گاؤں کی عورتیں اپنا کاتا ہوا سوت۔ سی ہوئی ٹوپیاں لے نکلتی ہیں۔ اور خدا کی شان ہے کہ کوئی کمبخت ہی ہو گا جو ناکام پھر کر جاتا ہو گا۔ یہی سبب ہے کہ تجارت کو بہت رواج ہے۔ مگر ثابت ہوتا ہے کہ روپیہ کی کمی ہے۔ انشا پردازی کے خزانچی کو یہاں سے یہ بات گرہ میں باندھنی چاہیے کہ یہ مقام آبادی قصبہ کے باہر لیکن آبادی سے ملا ہوا ہوتا ہے۔ رات کو دیکھو تو کتا بھی نہیں۔ دن کو دیکھو تو جنگل میں منگل ہو گیا۔ پھر شام کو دیکھو آدم زاد کا پتا نہیں۔ جا بجا راکھ کے ڈھیر ہیں۔ اور میووں کے چھلکے۔ مصطلحات میں لکھا ہے۔ "بازار گاہ قطعہ زمینے کہ درآں بازار واقع شود۔ از عالم بزمگاہ و مجلس گاہ۔" میں کہتا ہوں کہ بازار گاہ سے حقیقت میں وہی بازار مراد ہے۔ جنہوں نے ان بازاروں میں لین دین کیا ہے وہ نہ لفظ گاہ کی زیادتی کی فکر کریں گے نہ تاویل کے محتاج ہوں گے۔ صاحب مصطلحات اصلیت حال سے واقف نہیں ورنہ واقع کا لفظ نہ لکھتا۔ فقط اتنا ہی کافی تھا کہ "قطعہ زمینے کہ درآں بازار شود۔"

بازار کے دن ایک شخص اپنے گھر سے نکلتا ہے۔ سامنے سے کوئی آتا ہوا ملتا ہے اس سے پوچھتا ہے۔ چہ خبر است از بازار؟ کبھی وہ کہتا ہے بروید کہ گرم است۔ کبھی دیر ہو جاتی ہے تو کہتا ہے کہ نزدیک است بہ شکستن۔ کبھی کہتا ہے نروید کہ بازار شکست۔ یہیں سے نکلی ہے۔ گرم بازاری (کسی شے کا رواج کار)۔ اسی طرح بازار فلاں چیز تیز است اور اس کے برخلاف یہ کہ بازار فلاں چیز سرد است۔ اسی سے ہے۔ بازار نہادن۔ بازار زدن۔ بازار کشیدن۔ بازار آراستن۔ کہ سب ہم معنی ہیں۔ بازار زدہ جس چیز کو دوبارہ بازار میں لے گئے ہوں اور کوئی خریدار نہ ہوا ہو۔ بازار برچیدن: اپنا کاروبار اٹھا لینا۔ بازار کردن: کسی قسم کا معاملہ یا گفتگو درمیان لانی۔ اہل زبان کہتا ہے۔ امروز بہ فلانی بر خوردیم۔ طرفہ

بازارے کرد ہما۔

قومی عادت اور ملک کی حالت نے اب تک سب کو سپاہیانہ سامان میں رکھا ہے۔ اس لیے ہر شخص ہتھیار بند رہتا ہے۔ ایک درزی اپنے گھر میں یا دکان پر بیٹھا کپڑے سیتا ہوگا مگر سپر تلوار، پیش قبض، طپنچہ وغیرہ سامنے کھونٹی پر لٹکتا ہوگا۔ یہ خیالات ان کے دماغوں میں ایسے سمائے ہیں کہ جنگی داستانوں کو بڑے شوق سے سنتے ہیں۔ کوئی تھوڑا سا پڑھا لکھا بھی ہوگا تو شاہنامہ کے شعر اسے جا بجا سے حفظ ہوں گے سبب یہ ہے کہ جب چار آدمی مل کر بیٹھتے ہیں تو ایک شخص شاہنامہ ضرور پڑھتا ہے۔ سب سنتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ ہتھیاروں اور جنگی استعاروں میں اکثر خیالات ادا کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ چوں کے ہاتھوں میں مہندی لگاتے ہیں تو اس میں تیر کمان کے نقش بناتے ہیں اور تیروں سے فالیں دیکھتے ہیں۔ تیر امان: بھاگے ہوئے مجرم کے لیے جب قتل کا حکم دیا ہوا ہو اور وہ خود حاضر ہو کر امان حاصل کرلے تو اسے بادشاہ اپنے ترکش سے ایک تیر دیتا تھا۔ اس پر بادشاہ کا نام لکھا ہوتا تھا۔ مجرم اسے ہاتھ میں رکھتا تھا۔ وہ تیر امان کہلاتا تھا کہ کوئی دیکھتے ہی نہ مار ڈالے۔ بہت قسم کے تیر ہیں اور ان کے بہت نام ہیں۔ اس سے بہت سی اصطلاحیں نکالی ہیں۔ تیر آہ اور تیر تظلم۔ اور تیر سحر (آہ پر اثر)۔ تیر باران سے کثرت مراد رکھی ہے اور اس طرح کی اصطلاحیں بہت ہیں۔

اسی طرح پانی میں شمشیر موج اور پہاڑ پر تیغ کوہ اور تیزی کوہ اور تیغ خورشید یعنے طلوع صبح۔ تیغ افراسیاب۔ تیغ بہرام اور تیغ فلک (شعاع آفتاب) تیغ شدن (مقابل ہونا)۔ تیغش می برد (اس کا کام بنا ہوا ہے)۔ دیدم تیغم نمی برد (میری کوشش میں اثر نہیں) بینم شمشیرت تا کجای برد (دیکھیں تمہاری کوشش کہاں تک کام کرتی ہے) تیغ بہ خاک کردن (خونریزی کو موقوف کرنا)۔ کیونکہ شائقان شکار کا دستور تھا کہ جب ہزار شکار مار لیتے تھے تو تلوار کو خاک پر رکھ دیتے تھے (کہ اب شکار موقوف)۔ آنکھ کو ترک سے چشم اور نظر کو ترک نگاہ وغیرہ وغیرہ۔

ایران کے بازاروں میں اور اکثر قہوہ خانوں میں ایک شخص نظر آئے گا کہ سرو قد کھڑا داستان کہہ رہا ہے اور لوگوں کا انبوہ اپنے ذوق و شوق میں مست اسے گھیرے

ہوئے ہے۔ وہ ہر مطلب کو نہایت فصاحت کے ساتھ نظم و نثر سے مرصع کرتا ہے اور صورت ماجرائے کو اس تاثیر سے ادا کرتا ہے کہ سماباندھ دیتا ہے۔ کبھی ہتھیار بھی سجے ہوتا ہے۔ جنگ کے معرکہ یا غصہ کے موقع پر شیر کی طرح بپھر کھڑا ہوتا ہے۔ خوشی کی جگہ اس طرح گاتا ہے کہ سننے والے وجد کرتے ہیں۔ غرض کہ غیظ و غضب، عیش و طرب یا غم و الم کی تصویر فقط اپنے کلام سے نہیں کھینچتا بلکہ خود اس کی تصویر بن جاتا ہے۔ اسے حقیقت میں بڑا صاحب کمال سمجھنا چاہیے کیونکہ اکیلا آدمی ان مختلف کاموں کو پورا پورا ادا کرتا ہے جو کہ تھیٹر میں ایک سنگت کر سکتی ہے۔

امرا اور اہل دول کے مکانات کیا تعمیر اور کیا سامان میں رنگ رنگ کے تکلفوں سے سجے ہوتے ہیں۔ آب جاری تو گھر گھر میں خدائی رحمت ہے۔ خانہ باغ اس میں نہر جاری۔ نہر میں فوارے جاری۔ مکان کی طرح ایسے انداز سے رکھتے ہیں کہ جاڑے میں ٹھنڈی ہوا سے محفوظ رہیں۔ بہار یا گرمی میں ہر طرف سے ہوا کا لطف لے سکیں۔ بادگیر اکثر مکانوں میں ہیں اور روشن دان بغیر کوئی گھر نہیں۔ امرا کے مکانوں میں اور حماموں میں عہد قدیم کے بادشاہوں کی اور ان کے درباروں کی اور ان کے مشہور معرکوں کی تصویریں ہوتی ہیں۔ جن کا دیکھنا ہر وقت انقلاب زمانہ کی تصویر پیش نظر رکھتا ہے۔ بابر جب بدیع الزمان میرزا سے ملنے ہرات میں گیا تو اپنی توزک میں اس کے مکان کی موزونیت اور ایجاد اور آرائشوں کی تعریف کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہر مکان میں زمان قدیم کی سرگزشتوں اور معرکوں کی تصویریں ان کے عہدوں کی یاد کو تازہ کرتی تھیں اور یہ رسم نئی نہیں۔ عہد قدیم کا قانون ہے۔ چنانچہ قصر شیریں اور کوہ بے ستون اور سلاطین سلف کی ٹوٹی پھوٹی عمارتیں اس کی گواہی دیتی ہیں۔ فردوسی نے ایک قطعہ لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ مگر جزو اعظم اس کی خوبی کا، اشارہ اس نکتے کا ہے:

فلک گر بزیر سحاب اندر است		وگر زیر پر عقاب اندر است
پندار کو از پئے کار تو		بہ بند خطا و ثواب اندر است
اگر بدکنی کیفر خود بری		نہ چشم زمانہ بخواب اندر است
در ایوان ہا نام بیژن ہنوز		بزندان افراسیاب اندر است

چو بیژن داری اندر چہ محسپ افراسیاب آسا
کہ رستم در کمین است او میخے زیر خفتانش
(خاقانی)

ان کی مہمان نوازی جس پر غیر ملکوں کی تاریخوں اور جغرافیوں نے محضر شہادت لکھے۔ انشاپردازی کی گواہی اس میں سب سے روشن ہے۔ فردوسی نے اکثر ایرانیوں کو مسافرت کی داستانوں میں جہاں اتارا ہے۔ پہلے دستر خوان پر بٹھایا ہے۔ اسی طرح نظامی و جامی وغیرہ شعرائے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ شیخ سعدی نے گلستاں میں ایک بادشاہ کو عالت شکار سرگرداں کیا۔ رات کو کسی زمیندار کے گھر پہنچایا ہے۔ وہاں پہلی بات یہی ہے۔ ماحضرے کہ واشت حاضر آورد۔ ملا حسین واعظ کو دیکھو کہ انوار سہیلی میں جانوروں کی کہانیاں ہیں۔ ان میں اگر ایک چوہے کو کوے کے گھر مہمان لے جاتے ہیں۔ وہاں بھی پہلے ضیافت کھلاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ضیافت۔ ملک کی عام رسم اور ایک معمولی بات ہے۔ اس لیے بات کہنے والا جب اس موقع پر آتا ہے خواہ مخواہ دستر خوان کا ذکر زبان پر آجاتا ہے۔ دیکھو امیر خسرو کیا مزہ سے کہتے ہیں :

اشکم بروں می افگند راز درون پردہ را   آرے شکم‌تہا بود مہمان بیروں کردہ را

یہی سبب ہے کہ جو شخص ان کے گھر آئے اسے تعظیمی لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ (یعنی مہمان) اور صاحب خانہ کا نام رکھا ہے، میزبان[34]۔ گویا فرض اصلی کا دستر خوان سجانا ہے۔

اہل ایران اب بھی مہمان کا آنا برکت الٰہی سمجھتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ مسافرت اس ملک میں خوب نبھتی ہے۔ ان کے گھروں کی تعمیر کہتی ہے کہ بننے سے پہلے مجھ میں مہمانداری کی غرض مد نظر رکھی ہے۔ ذرا آسودہ حال ہو گا تو باہر دیوانخانہ مع خانہ باغ کے ہو گا۔ جس کے حوض میں فوارہ بھی چھٹتا ہو گا۔ اس سے اتر تا غریب ہو گا تو ڈیوڑھی سے ملے ایک دو حجرے اور اس کے آگے کچھ صحن ہو گا کہ مہمان کا اچھی طرح گزارہ ہو۔ دو تین کیاریاں پھولوں کی۔ جن میں دوست آشناؤں کی ملاقات کا لطف حاصل ہو۔ اسے مہمان خانہ کہتے ہیں۔ کچھ نہیں تو گھر اس طرح کا ہو گا کہ جب کوئی آیا۔ مستورات

کو ایک طرف کر دیا۔ وہ وہاں اپنے سینے پرونے کا کام کرتی رہیں۔ یہ دوسرے کمرے میں بیٹھ، ے چائے پی، کھانا کھایا اور باتیں کرتے رہے۔ جب وہ گیا تو پھر نکل بیٹھیں۔

اس مقام پر وہ الفاظ لکھتا ہوں جو مہمان اور صاحب خانہ کو ہمیشہ باہم کہنے پڑتے ہیں اور یہ گویا رسم ملک میں داخل ہیں۔

صاحب خانہ کہتا ہے۔

(i)

خوش آمدید۔ صفا آوردید۔ قدیم بر چشم

یا۔ خوش آمدید خوش آمدید قدم شما نجیر

یا خوش آمدید۔ وصفا آوردید۔ قدم رنجہ فرمودید۔

بسیار خوب کردید کہ تشریف آوردید۔

شادماں کردید۔ مسرور کردید۔ سرافراز کردہ اید۔ خیلے مشتاق دیدار شما بودم۔

مہمان کہتا ہے۔

(ii)

عنایت شماست۔ مرحمت شماست۔

مدتے ست میخواستم مشرف خدمت شوم

ولے بخت نامساعد است کہ مانع شد۔

(ii)

احوال شما خوب است ؟

مزاج مقدس ؟ مزاج شریف ؟

احوال شریف ؟ وغیرہ وغیرہ

(ii)

از لطف شما۔ از مرحمت شما۔ از دولت شما

از محبت شما۔ از شفقت شما۔ سایہ شما از سر ما کم نہ شود۔ محبت شما زیاد۔ وغیرہ وغیرہ

چلتے وقت مہمان کہتا ہے :۔

اجازت است ؟ مرخص میشوم ۔یا۔

دردسر کمتر میکنم۔ یا بسیار دردسر دادم

زحمت دادم۔

صاحب خانہ کہتا ہے :۔

بایں زودی تشریف می برید ؟ پس خدا حافظ۔

مزین فرمودید۔ مشرف فرمودید۔ یا فقط۔ مزین

مشرف! صفا آوردید۔ زحمت کشیدید۔

حقیقت کہ مجلس ما بے حضور شما صفائے
نداشت

اتنی بات تو ان فقروں سے ہر شخص نے سمجھ لی ہو گی کہ صاحب خانہ کا دل مہمان کے آنے سے خوش ہوا جو یہ خوشی کے لفظ زبان سے نکلے لیکن دیکھنے کے قابل یہ بات ہے کہ عرب کے گھر عرب آتا ہے تو صاحب خانہ کہتا ہے اہلاً و سہلاً۔ کبھی کہتا ہے کہ خیر مقدم خیر مقدم۔ پہلا فقرہ ظاہر کرتا ہے کہ سرزمین اس ملک کی دشوار گزار ہے۔ دوسرا فقرہ کہتا ہے کہ وہاں بھی مہمان کے آنے کو اچھا سمجھتے تھے۔

فارس میں مہمان آئے تو کہتے ہیں خوش آمدید صفا آوردید۔ معلوم ہوا کہ خوشی و خوش حالی اور شگفتگی اور جگہ کی صفائی و زیبائی انہیں ہر وقت مد نظر ہے۔ سنسکرت میں کہتے ہیں۔ سوا گتو بھوان یعنے خوش آمدی۔ اس فقرہ نے پھر گواہی دی کہ دونوں کے خیال ایک اصل پر ہیں۔ فقط زمانوں اور مکانوں کے انقلابوں نے لفظ بدل دیئے ہیں۔

یہ گفتگو جو اوپر ہوئی فقط اوپر ہی نہیں ہے۔ جب کسی کے گھر جاؤ کھانے کا وقت ہو گا تو بغیر کھانا کھائے ہرگز چھٹکارا نہیں۔ نہ کھاؤ تو سمجھا جاتا ہے کہ یہ شخص کسی معاملہ میں خفا ہے۔ اگر کھانے کا وقت نہیں تو غریب سے غریب آدمی بھی اول حقہ سامنے رکھے گا۔ ایک روسی چائے دان میں چائے (اسے غوری کہتے ہیں دو تین پیالیاں تشتریوں میں رکھی ہوں گی۔ کئی قسم کے میوؤں کے دو دو تین تین پھل ہوں گے۔ یہ سب سامان ایک کشتی میں لگائے گا۔ ایک پاکیزہ دستر خوان بچھائے گا۔ اپنی باسی روٹی کے کچھ ٹکڑے ایک دو کلچے رکھے گا۔ پہلے تمہیں کھلائے گا۔ پھر جو باتیں کرنی ہوں گی وہ ہوں گی۔

یہ دستر خوان بھی قابل دیکھنے کے ہوتے ہیں۔ اگرچہ وہیں کی چھینٹ کے چھپے ہوتے ہیں مگر حاشیوں پر ایک دو حدیثیں تعظیم مہمان یا تعریف سخاوت کی۔ ایک دو فارسی کے فقرے۔ ایک دو شعر اسی مضمون کے مثلاً:

شکر جا آر کہ مہمان تو روزی خودمی خورد از خوان تو

کسی اور کا شعر ہے۔

بر سر ہر دانہ بنوشتہ عیاں کز فلاں ابن فلاں ابن فلاں

جب دوست سے دوست سر راہ مل جائے تو باہم بڑے تپاک سے ملتے ہیں۔ ایک دوسرے کی پیشانی پر بوسہ دیتا ہے اور اسی طرح رخصت کے وقت تم نے دیکھا ہوگا شیخ سعدی نے بھی گلستاں میں جابجا لکھا ہے۔ بر سر و چشمش بوسہ داد۔ بر روئے ہم بوسہ دادیم و گفتیم۔ وغیرہ وغیرہ۔ فردوسی نے بھی کہا ہے:

بہ چشم و بہ سر بوسہ دادش بہ بر گرفتش بہ گردن پدرود

ان کے گھر پنجاب کے گھروں سے بالکل بر خلاف ہیں۔ دہلی، آگرہ اور لکھنو کے گھروں سے کچھ ملتے ہیں۔ سواتنی بات میں کہ ہندوستان میں ذرا صحن کی رسم ہے۔ اس ولایت کے اشراف اگرچہ غریبی کی حالت میں ہوں مگر اتنا صحن ضرور رکھتے ہیں کہ دو دو تین تین درخت سیب، بہی، ناشپاتی، انار اور انگور وغیرہ کے اور دو تین کیاریاں گلکاری کی ہوں۔ اس میں خانہ بخانہ نہر کا گزر ہوتا چلا آتا ہے کہ ہر چیز کی صفائی کا مطلب اچھی طرح حاصل ہوتا ہے۔ ہندوستان کے گھروں میں دالانوں کے در کشادہ ہوتے ہیں۔ وہ لوگ انہیں کمروں کی طرح دروازوں سے قبضہ میں رکھتے ہیں کہ برف اور ہوا سے بچاؤ رہے۔ ان بند حجروں میں تبدان، باد گیر اور کھڑکیاں رکھتے ہیں۔ دیواروں میں بخاریاں آتشدان بناتے ہیں اور گرمجوشی میں کبھی جی چاہتا ہے تو چائے سے بڑھ کر پلاؤ بھی وہیں دم دے لیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے اس قوم کے بزرگ اچھی طرح جانتے تھے کہ صحت، آرام اور سلیقہ کیا چیز ہے اور کیونکر اس سے لطف اٹھا سکتے ہیں۔

آداب محفل کے بہت سے قواعد اور اصول رکھتے ہیں۔ مثلاً جب کوئی پانی پیے گا دوسرا آدمی کہے گا۔

پینے والا	کہنے والا
خدا شمارا بیامرزد۔ یا۔ خدا والدین شمارا بیامرزد۔ اگر کہنے والا بزرگ ہو اور پینے والا خورد تو جواب میں کہے گا۔ سلمکم اللہ	سقاکم اللہ شراباً طہوراً۔ یا۔ سقاکم اللہ یا۔ ہنا کم اللہ۔ یا۔ انشاء اللہ عافیت باشد۔ یا۔ عافیت باشد

محفل میں باادب بیٹھتے ہیں اور دو زانو بیٹھتے ہیں۔ کسی کو بٹھانا منظور ہو تو کہیں گے۔

بفرمائید۔ بسم اللہ بفرمائید۔ چائے یا شربت یا حقہ وغیرہ کچھ کھانے پینے کو کہتے ہیں کہ میل بفرمائید۔ بفرمائید بسم اللہ۔ طرف ثانی کہتا ہے۔ بعد از شما۔ پھر کہتے ہیں۔ نمیشود۔ یا کہتے ہیں۔ امکاں ندارد شما میل بفرمائید۔ طرف ثانی شکریہ میں کہتے ہیں۔ لطف شما زیاد۔ اگر کسی کو ایک لفافہ یا قلم بھی اس پہلو سے اس تک اٹھا کر دو تو وہ لیتے وقت کہے گا۔ الطاف شما کم نشود۔ یا مرحمت شما کم نشود۔ ان ادب آداب کے اصول و قواعد میں 70 برس کا بڈھا اور 7 برس کا بچہ برابر ہوتا ہے۔

طبیعتیں عموماً لطافت اور ظرافت کے عنصروں سے بنی ہیں۔ اس لیے خوش پوشاکی اور نفاست کو تہذیب کا جزِ اعظم سمجھتے ہیں۔ اگرچہ کام کے وقت ادنیٰ مزدوروں سے زیادہ عرق ریزی کرتے ہیں اور جی توڑ کر کام کو لپٹ جاتے ہیں مگر جہاں فارغ ہوئے اور نہا دھو کپڑے پہن عمامہ سر پر رکھا چغا یا عبا کندھے پر لی اور آغا صاحب بن کر بیٹھ گئے۔ حقہ سامنے دھرا ہے۔ چائے دم ہو رہی ہے۔ گرمجوشیوں سے جلسہ گرم ہے۔ غریب سے غریب آدمی ہوگا مگر گھر جھاڑا بہارا فرش کیا ہوا۔ ایک طرف قالین یا نمالچہ یا توشک سے نشست کی جگہ نمودار معلوم ہوتی ہے۔ طاقوں میں ایک ایک دو دو سیب ناشپاتی بہی کے دانے۔ ایک طاق میں چھوٹا سا گلدستہ۔ ایک کھونٹی پر انگور کا خوشہ بھی لٹکتا ہوگا۔ طاقوں میں فرش۔ آگے ننھے ننھے ریشمی جھالر ٹانکتے ہیں۔ بعض پر ننھے ننھے پودے لٹکتے ہیں اور ان میں ریشمی ڈورے بندھے ہیں۔ ان سب باتوں کے نباہ کی صورت یہ ہے کہ صاحب خانہ اگر 4 روز کا مزدور ہو۔ پھر بھی جب باہر سے آتا ہے۔ روٹی بازار سے لیتا آتا ہے۔ وہ ایسی ہوتی ہے کہ یہاں فرمائش سے نصیب نہیں ہوتی۔ دوسرے تیسرے دن کچھ میوہ بھی لاتا ہے۔ تازہ طاقوں میں رکھ دیتا ہے۔ باسی آپ کھاتا ہے۔ بی بی بچوں کو کھلا دیتا ہے۔ بیبیوں کا پکانے میں کم وقت خرچ ہوتا ہے۔ سینے پرونے میں مردوں سے زیادہ کمائی کر لیتی ہیں۔ اسی واسطے جب دیکھو اس سجے ہوئے گھر میں بیگم بنی بیٹھی ہیں۔ آغا باہر سے آئے۔ بیوی اٹھ کھڑی ہوئیں۔ کپڑے اتروا کر کھونٹیوں پر ڈالے۔ حقہ تازہ کیا ہوا تھا وہ بھر لا۔ آفتابہ میں گرم پانی بھر دیا۔ انگیٹھی سامنے روشن تھی۔ چاء جوش دھر دیا۔ آغا ہاتھ منہ دھو۔ ترو تازہ ہو۔ ڈاڑھی میں کنگھی کر۔ تکیہ سے لگ بیٹھے۔ وہ

بیٹھے حقہ پیتے ہیں۔ بیوی سامنے بیٹھی سی رہی ہیں۔ چائے تیار ہوئی۔ جناب آغا نے پیالی بھری ایک بیوی کے سامنے رکھ دی۔ ایک آپ پی۔ کوئی بچہ ہوا تو وہ پاس آبیٹھا۔ آپ کھایا۔ اسے کھلایا۔ اودھر اودھر کی باتیں کیں۔ دن بھر کی کلفت بھول گئے۔

وہ لوگ گھروں میں کھانا بہت کم پکاتے ہیں۔ بازار سے بھی لاتے ہیں اور اپنے تنوروں میں خمیری روٹیاں پکار کھتے ہیں۔ غلے اور آب وہوا کی خوبی ہے کہ جوں جوں باسی ہوتی ہے اور مزے کی ہوتی ہے اور کلہ پائے کی تو جان ہے۔ بازاروں میں بھی رنگ برنگ کی روٹیاں قسم قسم کے کباب۔ کلے پائے وغیرہ بکتے ہیں۔ اس میں خرچ کی بھی تخفیف رہتی ہے اور عورتوں کو اپنے دستکار ہاتھ اور قیمتی وقت چولھا پھونکنے میں نہیں لگانا پڑتا۔ رموز سخن کے پہچاننے والوں نے جان لیا کہ قوم کی زبان اس کی رسم رواج سے کس طرح آگاہ کرتی ہے۔ اب یہ دیکھیں کہ وہ ان کے لباس کا انداز کیونکر دکھاتی ہے کہ بیستون اور طاق بستان کی عمارتوں پر بادشاہی درباروں اور سواریوں کے مرقع دیئے ہیں۔ ان میں نئی تراش کی ٹوپیاں اور خوشنما قبائیں نظر آتی ہیں۔ اور تم خیال کرو تو ملک کی انشاپردازی ہمیں اس سے پہلے خبر دے چکی ہے۔ پھر دیکھو۔ کلہ دار ایران، خورشید کلاہ ایران۔ کلہ دار توران۔ شاہ کجلاہ۔ کجلاہ حسن۔ کلاہ خسروی اور کلاہ تتری گواہ ہیں۔ ایسے مقاموں میں عمامہ یا دستار کہیں نہیں آیا۔

دیکھو! کلاہ کج نہادن۔ کلاہ برابرو شکستن۔ باد در کلاہ داشتن۔ کلاہ بہوا انداختن اور کلاہ رعونت از سر نہاد۔ اور۔ کلاہ ارادت بپایش نہاد۔ اور: بازی چرخ بشکندش بیضہ در کلاہ۔ بہتیری اصطلاحیں آئی ہیں۔ مگر عمامہ بہوا انداختن۔ دستار برابرو شکستن نہیں آیا۔

کلہ گوشہ بر آسمان بریں ہنوز از ارادت سرش برزمیں

دیکھنا عرفی نے تہنیت عید کے قصیدہ کو کیا شاندار مطلع سے تاج دیا ہے:

صباح عید کہ در تکیہ گاہ ناز و نعیم گدا کلاہ نمد کج نہادو شہ دیہیم

تصاویر مذکورہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان کی قباؤں کے دامن بڑے ہوتے تھے۔ انشاپردازی نے بھی بجائے خود اس کا ذکر کیا ہے۔ عرفی کہتے ہیں :

کردہ از عرفاں لباسِ عجز را دامن دراز کوتہی در جیبِ عقلِ نکتہ داں انداختہ

دامن کشاں رفتن۔ فخر و ناز سے چلنا۔ شیخ علی حزیں فرماتے ہیں :

شادم کہ از رقیباں، دامن کشاں گزشتی گو مشتِ خاکِ ماہم، برباد رفتہ باشد

ظاہر ہے کہ جس کے دامن ہی نہ ہوں وہ دامن کشاں کیونکر چلے گا۔ شیخ سعدی نے غضب کیا ہے "گفت: اے درویش دامن بدار۔ گفت: دامن از کجا آرم کہ جامہ ندارم۔ جس نے ٹھنڈے ملکوں میں جاڑا گزارا ہو گا وہ جانے گا کہ پا بدامن پیچیدن میں کیا مزا ہے اور اسی سے استعارہ نکلا۔ پا بدامن صبر پیچیدہ۔ بھلا کوٹ کے دامن میں پاؤں لپیٹ کر کیونکر بیٹھ سکتے ہیں۔ جس نے اس ملک میں گزران کی ہو گی وہی جانے گا کہ دامن بر آتش زدن سے آگ سلگانے کی اصطلاح کیونکر نکلی ہے۔ اور اس کے لیے بڑا دامن کام دیتا ہے یا چھوٹا۔ اگر بڑے دامن نہ ہوتے تو "چراغ زیرِ دامن" کی اصطلاح کیونکر پیدا ہوتی۔

ملک کی زبان تمہیں یہ بھی آگاہ کرتی ہے کہ ان کی آستینیں کیسی ہوتی تھیں۔ ظاہر ہے کہ بڑی اور فراخ ہوتی تھیں۔ جبھی آستیں افشاندن۔ بہ معنی رد کردن و انکار کردن کیا۔ آستین بہ چشم کشیدن۔ اشک باستین پاک کردن اور آستین بر چراغ افشاندن۔ اس کا ٹھکانا۔ اور ایک آستین گل۔ جتنے پھول آستین میں سمائیں۔ آستین بر زدن۔ آستین چڑھانی۔ اگر آستینیں تنگ ہوتیں تو یہ محاورے اور اصطلاحیں کیونکر پیدا ہوتیں کہ بیسیوں ہیں اور کوتہ آستین برخلاف اس کے ہے۔ خواجہ حافظ :

بریز دلق ملمع کنند ہا دارند درازدستی ایں کوتہ آستیناں بیں

آہ ازیں طائفہ زرق ساز ستی کوتہ دست دراز

(خسرو)

دیکھو انشا پردازی نے لباس ملک پر کیونکر اشارہ کیا۔ اکثر امرا و شرفا کو دیکھا ہے کہ جب کسی عالم، حاجی، زائر، یا اہلِ ضرورت کو کچھ دیتے ہیں تو مصافحہ کے لیے اس سے ہاتھ ملاتے ہیں اور آستین کے پردہ میں جو دینا ہو دے دیتے ہیں تاکہ طرفِ ثانی شرمسار نہ ہو۔ سعدی :

برد خواجہ کوتاہ کن دست آز چہ میبایدت آستین دراز

عورتوں کی پردہ داری کا وہاں یہ حال ہے کہ ہندوستان کے لوگ برسوں اس م میں رہ کر آئے ہیں۔ شاید کبھی گلی کوچہ میں کوئی عورت منہ کھلی نظر آئی ہو گی۔ نقاب، برقع موزے وغیرہ پہن کر اس طرح پھرتی ہیں کہ پاؤں کا ناخن اور پوست کا رنگ تک نہیں معلوم ہوتا۔ اس پاکیزہ رسم نے ان کے دلوں پر مستقل اثر کیا ہے اگر اتفاقاً کسی کوچہ میں عورت سامنے آجائے اور کوئی شخص اس کی طرف دیکھنے لگے تو فوراً کہتی ہے "چشمت کور شود، مادرت مے بینی بہ خواہرت؟ از خدا شرم نہ داری؟" برقع وہاں اسلام کے ساتھ آیا ہے اسی واسطے فارسی کا لفظ بھی اس کے لیے نہیں ہے۔ لفظ مذکور کی بدولت بہت سے لطیف استعارے کلام میں پیدا ہو گئے ہیں۔ مثلاً برقع حیا از رخ برانداختہ پیش آمد و گفت اور بہ بیان حال برقع از روئے معنی کشود۔ برخلاف اس کے رخ در پردہ اختفا کشید۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور گل برقع از رخ برگرفت۔ اور سبزہ سر از برقع خاک برآورد یعنی بہار آئی سبزہ نکلا اور پھول کھلے۔ اور پنجہ خورشید برقع شب بردرید۔ یعنی سورج نکلا۔ وغیرہ وغیرہ۔

خصوصیات ملک کے ذکر میں اگر وہاں کے حماموں کا ذکر نہ کیا تو کچھ کہا ہی نہیں۔ بڑے بڑے کمرہ در کمرہ اور حجرہ در حجرہ لداؤ کی عمارتیں۔ چونہ گچ کی دیواریں۔ زمین بھی اسی سے پختہ یا سلوں کا فرش۔ نامی بادشاہوں کے دربار اور ملاقاتوں کے جلسے۔ ان کے جنگی معرکے سب عالم تصویر میں عیاں ہوتے ہیں۔ بوستاں میں شیطان کی تصویر اور شیطان کی گفتگو کی حکایت پڑھ کر میں حیران تھا۔ جب وہاں جا بجا ایسی تصویریں دیکھیں۔ اس حکایت کا مزا آگیا۔ حمام میں اکثر دوست آشنا ل کر جاتے ہیں۔ پہلے کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ ساوارچی چائے تیار لیے بیٹھا ہوتا ہے۔ وہاں بیٹھ کر ایک حقہ پیا۔ ایک ایک پیالی چائے کی پی۔ مزاج میں گرمی آئی۔ دوسرا کمرہ جامہ کن کہلاتا ہے۔ وہاں جا کر کپڑے اتارے۔ ایک حقہ اور پیا اور طبیعت گرمائی۔ پھر حمام کے کمرہ میں داخل ہوئے۔ طبیعت میں عجیب فرحت اور مستی پیدا ہوتی ہے کہ بغیر شعر خوانی اور ترنم کے رہا نہیں جاتا۔ تماشا یہ ہے کہ ان کمروں میں معمولی آواز سے بھی باتیں کرو تو ایسی گونج

نہیں جاتی۔ تب معلوم ہوتا ہے کہ سکندر نامہ میں "سرو دے بگرمابہ در گفتہ گیر" کا یہ مطلب ہے۔ ایک ایک آدمی کو کئی کئی حمامی لپٹ جاتے ہیں۔ کوئی پانی ڈالتا ہے۔ کوئی کیسہ کر کے ملتا ہے۔ کوئی مشتمال کرتا ہے۔ کبھی بٹھا کر اور کبھی لٹا کر۔ کبھی دائیں کروٹ اور کبھی بائیں کروٹ۔ اس اس طرح کل کل دباتے ہیں کہ عمر بھر کی کلفتیں اتر جاتی ہیں۔ نہانے کے بھی کئی کمرے ہوتے ہیں۔ سب میں ٹھنڈے اور گرم پانی کے حوض بھرے ہوئے۔ ہر کمرہ میں پانچ پانچ، آدمی بیٹھے نہا رہے ہیں اور سب کے سر منڈے، گول گول، یکساں ہانڈیاں عجب بہار دیتی ہیں۔ پہر بھر سے کم نہانے کا لطف نہیں۔ نکلتے ہیں تو پھر اسی طرح کمرہ بہ کمرہ ٹھہرتے ہوئے اور دم لیتے ہوئے نکلتے ہیں۔ دفعتاً نکلیں تو خدا جانے لقوہ، فالج، ذات الجنب کیا بیماری ہو جائے۔ نکلتے ہوئے بھوک کا یہ زور ہوتا ہے کہ پیٹ میں آگ لگ اٹھتی ہے۔ وہیں کسی دکان میں چلے گئے۔ روٹی کلے پائے، کباب، شب دیگ لیکر کھائی اور لمبی لمبی ڈاڑھیوں پر ہاتھ پھیرتے گھر چلے آئے۔

جو سخن شناس دور دراز کے ملکوں میں قرائن کی دوربین لگائے بیٹھے ہیں انہیں یہ الفاظ اور ان کی ہزاروں ترکیبیں دکھا رہی ہیں کہ وہ ملک کیسا اور وہاں کی سرزمین کیسی ہے۔ کس قسم کی چیزوں کی وہاں بہتات ہے۔ کیسے اہل ملک ہیں جو کہ ان چیزوں سے ایسے ایسے خیالات پیدا کرتے ہیں۔ چونکہ عاقلوں کو نکتہ کافی ہوتا ہے اس لیے جو کچھ لکھا گیا، کم نہ ہوگا۔

ساتواں لکچر

ہر ایک سرزمین اور اس کے موسموں کی بہار انشا پردازی پر کیا اثر کرتی ہے۔

عزیزان وطن! میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ہر ایک انشا پردازی اپنے ملک کی سرزمین، آب و ہوا اور پیداواری بلکہ اس کے جغرافیہ کو آئینہ کی طرح دکھاتی ہے۔ کیونکہ جو چیزیں انشا پرداز کو آس پاس نظر آتی ہیں۔ انہی کو وہ ادائے مطلب کے سامان میں خرچ کرتا ہے۔

ایک خوشرنگ خیال ہے۔ ذرا غور کر کے دیکھو۔ ہر ملک میں جو رنگ رنگ کی اشیاء، مختلف اجناس اور مخلوقات ہیں وہ حقیقت میں مختلف کیفیتیں ہیں کہ اس سرزمین کی طبیعت یا مزاج نے باہر نکالی ہیں۔ اسی طرح ہر ملک کی زبان ایک سرزمین ہے کہ بیان کو وہیں کے اجناس و اشیاء کے استعاروں میں جلوہ دیتی ہیں۔ دیکھو۔ جس طرح کسی سرزمین کی طبیعت مجبور ہے کہ قدرتی پیداواروں کو باہر نکالے بغیر نہیں رہ سکتی اسی طرح اس کی زبان کی طبیعت مجبور ہے کہ وہیں کے تشبیہ و استعاروں میں مطلب کو رنگ دیتی ہے۔ ہر سرزمین اپنی تاثیر میں مجبور ہے اس کی زبان اپنی خاصیت میں مجبور ہے۔

اس خیال کو میری تقریر نے پیچیدہ کر دیا۔ اچھا اب یوں سمجھو کہ کسی ملک کا انشا پرداز جب کوئی مطلب بیان کرنے لگتا ہے تو وہاں کے اشیاء و اجناس وغیرہ جو آس پاس، ادھر ادھر سامنے ہیں وہ ہجوم کر کے اس کے دل و زبان پر امنڈ کر آتے ہیں اور مجبور کرتے ہیں کہ جو کہنا ہے ہمارے استعاروں اور ہماری ہی تشبیہوں میں ادا کرو۔ چنانچہ اسے مجال نہیں ہوتی۔ بجز اس کے کہ انہی کو اپنے ادائے مطلب کا سامان بنائے۔ جب بیان میں صفائی کے ساتھ لطف آئے۔

لطیفہ: تین شخص ہم سفر تھے۔ سنار، پنیر والا اور نان بائی۔ شام کو ایک جگہ جنگل میں اترے۔ بستر ایسے مقام پر ہوئے کہ سامنے کوسوں تک کھلا میدان تھا۔ منہ ہاتھ دھوئے۔ کھانے کھائے۔ جب کچھ رات گئی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چلنے لگی۔ دل شگفتہ ہوئے۔13-14 تاریخ تھی۔ چاند نے سامنے سے سر نکالا:: سنار نے کہا۔ آہا کندن ڈلک ڈلک کرتا ہے۔ ابھی کٹھالی سے نکالا ہے۔ پنیر والا بولا: ثابت چکتی ہے، ابھی چاقو تک نہیں چھولیا۔ نان بائی نے کہا۔ یہ تو میرے تنور سے پھڑ پھڑاتی روٹی نکلی ہے۔

دیکھو جو شخص جس جس حال میں تھا ویسے ہی خیال اس کے دل میں پیدا ہوئے۔

گر خیالت گلشن است تو گلشنی در خیالت گلخن است تو گلخنی

ہر ایک ملک کی سرزمین میں اکثر پیداواریں ایسی بھی ہوتی ہیں جن سے دوسرا ملک محروم ہے۔ اسی واسطے ہر ایک زبان میں ادائے خیالات کے انداز جدا جدا ہوتے ہیں۔ بلکہ اشیاء مذکورہ صاحب زبان کو مجبور کرتی ہیں اور اپنے ہی خیالات زبان پر لاتی ہیں۔ اکثر چیزیں دو ملکوں میں مشترک ہیں۔ اس لیے اکثر خیالات بھی مشترک ہیں۔ بعض ایسے خیالات ہیں کہ غیر ملکوں سے آئے ہیں مگر اپنی خوبی یا دوسری قوم کے شدت ارتباط سے زبان میں داخل ہو گئے ہیں۔

بہر حال مناسب ہے کہ آج فارس کی ملکی حالت بیان کروں اور دکھادوں کہ یہ خیالات، یہ ترکیبیں یا اصطلاحیں یا محاورے جو اس کی انشاپردازی میں ہیں کیونکر اپنے قدرتی زور سے انشاپرداز کی زبان پر آئے ہیں اور ان کی نزاکت، لطافت اور رنگینی جو اور زبانوں سے سفید و سیاہ کا امتیاز رکھتی ہے۔ یہ حقیقت میں اصل سرزمین کی حالت اور اس کی لطافت اور نفاست کا نقشہ کھینچتی ہے۔

عرب کا ملک ریگستان اور کوہستان ہے۔ پتھریلی، خاکی، مخلوط، ہموار، ناہموار، سہل، دشوار گزار، بادرخت اور بے درخت وغیرہ وغیرہ اقسام کی زمینیں تھیں۔ جن میں رات 'دن' رہنا سہنا' خانہ بدوش پھرنا ان کا کام تھا۔ اس واسطے ہر ایک کے لیے جدا جدا لفظ تھے۔ درخت تھے تو اسل، طلح اور کھجور کے اور اکثر سوکھی روکھی قسم کے درخت نظر آتے تھے۔ اونٹ' شتر مرغ' جنگلی گائیں' پہاڑی بکرے' ہرنیاں' بکریاں'

بھیڑیں، وغیرہ جانور آنکھوں کے سامنے پھرتے تھے۔ چنانچہ اونٹوں اور کھجوروں کے متعلق بہتیرے لفظ ہیں۔ بادشاہت اور امارت کی شان و شکوہ سے وہ ملک محروم تھا۔ پس عیش و عشرت اور تکلف کے سامان بھی اسی حیثیت بموجب سمجھ لو۔ لوگ بیاباں گرد اور صحرا نشین تھے۔ لطافت اور نزاکت کے تکلفات کا وہاں کچھ کام نہ تھا۔ پھر بھی طبیعت میں قدرتی فصاحت کا جوش تھا۔ جن چیزوں کی وہاں بہتات تھی اور ہر وقت آنکھوں کے سامنے نظر آتی تھیں انہی کی تشبیہوں اور استعاروں میں بے تکلف طور سے اپنے مطالب ادا کرتے تھے اور فصاحت کے زور اور کلام کے سحر کا پورا اثر دلوں پر پہنچاتے تھے۔

فصیح عرب معشوق کی تعریف کرتا ہے تو آنکھ کو ہرن یا گاؤ دشتی کی آنکھ کہتا ہے۔

زلف کو کوا لیلنے زغال کہتا ہے اور جب بالوں کی رنگ و بو کو زیادہ چمکاتا ہے تو لونگیں بھی پیس کر ڈالتا ہے۔ مگر مشک و عنبر کی خوشبو سے بھی غافل نہیں ہے۔

ہونٹوں کا سیاہی مائل ہونا قابل تعریف سمجھتا ہے۔ ملک گرم ہے۔ رنگ کالے ہیں۔ دانتوں کو کبھی اولا کبھی گل بابونہ کہتا ہے۔ انہیں چمکاتا ہے مگر مسوڑھوں پر سرمہ چھڑک کر سیاہ کرتا ہے۔

گردن کو بت کی گردن سے تشبیہ دیتے تھے۔

ہند کا انشا پرداز زلف کی تشبیہ میں بھونرے اڑاتا ہے اور سانپ کے پھن بھی لہراتا ہے مگر پہلی تشبیہ خاص ہندوستان کی ہے اور ملک کے لوگوں کو خبر ہی نہیں۔ وہ کیونکر کہتے اور کہتے تو سننے والے کیا مزا لیتے۔

آنکھ کے لیے کنول کے پھول دکھاتا ہے۔ مملولے کی اچپلاہٹ دکھاتا ہے۔ کہ ہندوستان کے لیے خاص ہیں۔ جی چاہتا ہے تو ہرن سے بھی آنکھ لڑا لیتا ہے۔

دانت۔ موتی کی لڑیاں ہیں، یہ تشبیہ مشترک ہے۔

ناک کو طوطے کی چونچ سے تشبیہ دیتا ہے کہ خاص ہند کا جانور ہے۔

رفتار میں کبھی ہنس، کبھی ہتنی کی چال دکھاتا ہے یہ بھی خاص ہند کا حسن ہے۔

بدن کی نرمی اور صفائی کو کیلے کے گابھے اور نیلوفر کے پھول سے تشبیہ دیتا ہے۔ یہ

بھی یہیں کی لطافت ہے۔

رنگ سانولا ہو تو میگھ برن، کھلا ہو تو چنپئی۔ یا کندن کا سا رنگ۔ پہلے دونوں رنگ خاص ہندوستان کا حق ہیں۔ ملک کی گرمی پر خیال کرو۔

خوش آوازی کے لیے کوئل، کوکلے، پپیہے کی کوک سنا تا ہے۔ یہ جانور ہندوستان کے سوا کہیں نہیں۔

رنگ کی صفائی کے لیے ابٹنا ملتے ہیں کہ سانولے رنگ کا یہی بناؤ ہے۔ فارس والے گلگونہ ملتے ہیں کہ گوری رنگت کا سنگار ہے۔ یہاں کاجل لگاتے ہیں۔ وہاں سرمہ۔ غرض ہر ملک کا انشا پرداز اپنی اپنی چیزوں سے اپنے کلام کو سنوارتا ہے اور چونکہ مطلب ان استعاروں میں ادا ہوتا ہے جو ہر وقت آنکھوں کے سامنے ہیں اور ہر جگہ عام ہیں۔ اس لیے ان کے استعارے کلام میں مزہ اور سمجھنے میں آسانی اور صفائی پیدا کرتے ہیں نہ کہ کلفت یا دشواری۔

قدر کی خوبی کو بان اور اسل اور ارنڈ کی لچکتی ٹہنی سے تشبیہ دیتا ہے۔ معشوق کا گندمی یا چنپئی رنگ عام تعریفی رنگ ہے۔ وجہ اس کی یہ کہ گرمی کے سبب سے ملک کالا ہے۔ وہاں ذرا سا اجالا بھی غنیمت ہے اور گوری رنگت۔ کا تو کیا کہنا۔ اس کی سبحان اللہ کیوں نہ ہو تم نے دیکھا ہوگا بعض ہونٹوں پر ایک قدرتی تحریر سیاہی کی ہوتی ہے اور خوشنما ہوتی ہے۔ وہ عرب کے جمال کا جزاعظم ہے۔ یہ بھی ملک کی گرمی کا سبب ہے۔ حقائق زبان کا ماہر صفحہ کو الٹ کر دیکھے گا تو اور مضمون نظر آئے گا وہ ان خیالات کو دیکھ کر صاف کہہ دے گا کہ یہ ملک گرم ہوگا جو وہاں کے لوگ ان وصفوں کو غنیمت سمجھتے ہیں اور ان ہی کی تعریفیں کر کے خوش ہوتے ہیں۔

عرب کا شاعرہ گھٹا گھنگور کو بہت پسند کرتا ہے۔ مینہ کی پھوار سے خوش ہوتا ہے او رنجلی کے کوندنے کو کہتا ہے۔ گویا سخی کے ہاتھ سیاہ چادر سے نکل کر بخشش کر رہے ہیں۔ ہائے، تہی دست ہی جانتا ہے کہ سخاوت کی کیا قدر کرنی چاہیے۔

اونٹ، کھجوریں، میدان، میدانی پہاڑیاں، ہرنیاں، شتر مرغ اور قطار وغیرہ وغیرہ ان کے معمولی مضمون ہیں۔ مثالی اشعار کہاں تک لکھوں۔ مخل شاعر کے قصیدہ

میں سے چند اشعار کا ترجمہ:

(1) جب میں مست ہوتا ہوں تو خورنق اور سدیر کا مالک ہوتا ہوں،
ہوش میں آؤں تو بکریوں والا ہوں اور اونٹ والا۔

(2) میں اس اہل کے کجاوے میں گھس گیا،
اور اس دن بدلی چھائی ہوئی تھی۔

(3) وہ جوبن والی اس کی چھاتیاں ابھری ہوئی،
اطلس کے کپڑوں اور ریشم کے لچھوں میں لہراتی ہوئی۔

(4) میں نے اسے دھکیلا اس نے مجھے،
جیسے قطار تلاؤ کی طرف جائے۔

(5) میں نے اسے لپٹا لیا تو ہانپنے لگی،
جیسے کوئی پیاری ہرنی ہانپتی ہے۔

(6) میں اسے چاہتا ہوں وہ مجھے چاہتی ہے،
اور میرا اونٹ اس کی اونٹنی کو چاہتا ہے۔

مسافرت میں استعارہ کرتا ہے تو کہتا ہے "سوار ہوا میں کوہانِ غربت پر"۔

اللہ کی شان دیکھو۔ اس کا عظمت و جلال دیکھو اور ان صنائع قدرت کو دیکھو جن میں عقل عاجز ہے۔

فارس میں گدھوں کی سواری اور بارداری بہت ہے اس لیے انشا پردازوں کے بوجھ بھی وہی اٹھاتے ہیں۔

ایک قصیدہ کی تمہید میں متنبی کہتا ہے کہ یاران قدیم کے گھر ویران پڑے ہیں۔ وہ چلے گئے اور غیر آن بسے:

وہ گھر یاروں سے خالی ہیں حالانکہ رہنے والے موجود ہیں کیونکہ اونٹوں کے گلے شام کو چرا کر آتے ہیں مگر ہمارے دل کو اچاٹ کرتے ہیں (کہ ہمارے یار نہیں) اب طبیعت کی لطافت دیکھو اسی مضمون کو شاعر فارس کہتا ہے:

سراغ یک نگاہ آشنا در کس نے یابم　　جہاں چوں نرگستاں بے تو شہر کور میباشد

فصیح فرنگ ایک پہاڑی جزیرہ کا رہنے والا ہے۔ وہ جب بہار کا سما اور صبح کی بہار دیکھتا ہے تو اور رنگ سے لطف اٹھاتا ہے۔ سمندر کا کنارہ پانی پر ہوا کا لوٹنا۔ موجوں کا لہرانا۔ جہاز دور سے نمودار ہوتا ہے۔ بادبان ہوا میں فراٹے لیتے ہیں۔ پاس پاس کشتیاں دوڑتی پھرتی ہیں۔ دام دار جال پھینک رہے ہیں۔ مچھلیوں کے شکار ہوتے ہیں۔

پھر شفق میں سورج کا کنارہ افق سے نمودار ہوتا ہے۔ اس کی کرنوں سے پانی جگمگاتا ہے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر دھوپ سنہری رنگ دکھاتی ہے۔ کہیں دھوپ ہے کہیں چھاؤں ہے۔ سبزے لہلہاتے ہیں۔ چشمے بہتے ہیں۔ پانی لہراتے چلے جاتے ہیں۔ دیکھو! سمجھنے والے انہی اشاروں کو دیکھتے ہیں اور انشا پردازی سے ملک کی جغرافیائی کیفیت دریافت کر لیتے ہیں۔ یہ اختلاف ضرور ہے کہ حسن میں ہمارے ہاں سیہ چشم کی تعریف ہے۔ ان کے ہاں کبود چشم۔ یا سبز چشم تعریف ہے۔ ہمارے ہاں بالوں کی سیاہی پسند ہے۔ وہاں سرخی یا بھوراپن۔

حاصل کلام یہ ہے کہ ملک کا شاعر جو اپنی تشبیہیں اور استعارے کام میں لاتا ہے اسے اس کا قصد اارادہ نہ سمجھو۔ بلکہ اشیاء وہاں کی جو ہر دم سامنے ہیں۔ مجبور کرتی ہیں کہ ہم ہی کو کام میں لا اور ہم ہی میں مطالب ادا کر اور وہ بھی جانتا ہے کہ اسی طرح اپنے مطلب پر جلد کامیاب ہوگا۔ کیونکہ اشیاء موجودہ کے پیرایہ میں جو باتیں ادا کی جاتی ہیں۔ سننے والوں کے دلوں پر فوراً اثر کرتی ہیں۔ طبیعتیں لطف اٹھاتی ہیں۔ اسی کے چٹخارے زبانوں سے واہ وا کے غل مچواتے ہیں۔ جو بات سمجھ میں نہ آئے اس کا دل کیا مزا اٹھائے اور زبان کیا واہ وا کرے۔

فارس میں گوری رنگت عام ہے۔ سستی چیز کی کوئی قدر نہیں کرتا۔ اسی واسطے اس کی انشا پردازی میں تعریف نہیں۔ ہاں اس کی سرخی و صفائی پر مرتے ہیں کہ آئینہ رخسار کے صدقے اور گل رخسار کے قربان۔ ان میں جو کہیں سانولا رنگ ہوتا ہے تو غضب ہی ہوتا ہے۔ اس کے لیے نظربازوں نے حسن سبز اور حسن سبزینہ کے الفاظ رکھے ہیں۔ ہندوستان کی سانولی رنگت کا خیال کرتے ہیں اور مزے لیتے ہیں: "کشتۂ ہندم و سبزان گلابی پوشش کشمیر کا نازک خیال کہتا ہے:

حسن سبزے بہ خط سبز مرا کرد اسیر　　دام ہمرنگ زمیں بود گرفتار شدم

آنکھوں کی خوبیاں جو ہند میں ہیں وہی وہاں ہیں کیونکہ ایک دادا کی اولاد ہیں۔ البتہ ترکوں کے حسن نے جب انداز دکھایا تو چشم تنگ کی بھی تعریف ہونے لگی:

مے و مرغ و ریحان و آواز چنگ　　بت تنگ چشم اندر آغوش تنگ

اس کا کیا سبب؟ وہی اصول عام یاد کرو۔ انشا پرداز جو سامنے دیکھتا ہے اسی کو سامان انشا پردازی میں داخل کرتا ہے۔

عزیزان وطن! حقیقت یہ ہے کہ زمین مذکور۔ قدرت کا گلزار ہے اور عجیب بات یہ ہے کہ روئے زمین پر جو ہوا کا اختلاف اور موسموں کا فرق ملکوں میں ہوتا ہے وہ فرق اس کے قطعہ قطعہ میں آشکار ہے۔ چنانچہ بعض جگہ سخت گرم ہے۔ بعض جگہ معتدل ہے یا سرد ہے۔ اضلاع جنوبی میں کرمان۔ یزد۔ لارستان وغیرہ اضلاع گرم ہیں اور بعضے عرب کی طرح ریگستاں ہیں۔ گرمی میں سخت گرمی ہوتی ہے اور اول کے دو مہینوں میں آندھیاں چلتی رہتی ہیں۔ جنگل کے جنگل ریت کے اڑتے ہیں مگر جاڑہ اور بہار ایسے شگفتہ ہیں کہ دل شگفتہ ہوتے ہیں۔

فارس یعنی شیراز اور اس کے تمام متعلقات میں نہایت لطیف اور شگفتہ آب و ہوا ہے۔ نہ سخت گرمی ہے نہ سخت سردی۔ چھوٹی چھوٹی نہریں جاری ہیں۔ یاد کرو خواجہ حافظ کے کلام میں چشمہ اللہ اکبر اور آب رکناباد کا کنارہ۔ پہاڑوں کے دامن ہرے ہیں اور پھولوں سے بھرے۔ سعدی اور حافظ جیسی بلبلیں جہاں زمزمے کریں۔ وہ خدائی باغ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ سرسبز پہاڑ۔ اور لہلہاتے مرغزار۔ صحرا نشین مخلوقات کو پالتے ہیں اور ان کے مویشی کو فربہ کرتے ہیں۔ ان علاقوں میں غلے اور میوے دانے کی بہتات ہے۔ جوں جوں شمال کو چڑھتے جاؤ آب و ہوا اچھی ہی ہوتی جاتی ہے۔

اصفہان ایک زمانہ میں پایہ تخت سلاطین صفویہ کا تھا۔ اب ویران کہلاتا ہے مگر سب آبادیوں سے زیادہ رونق دکھاتا ہے۔ گرمی شیراز سے نرم ہے۔ اور جاڑا زیادہ ہے۔ سال بھر میں فقط کئی ہفتہ برف ہے باقی آسمان صاف۔ برف بھی ایسی نرم کہ پڑی اور پانی ہوئی۔ مینہ بھی کچھ سخت نہیں۔ ہوا دیکھنے میں صاف اور اثر میں خشک، صیقل دار چیز کو

جہاں چاہو رکھ دو۔ زنگ نہیں لگتا۔ چاروں فصلیں شگفتہ بہار۔

آذربائی جان اور اس کے متعلقات مثلاً تبریز وغیرہ میں ایسا جاڑا پڑتا ہے کہ تھرمومیٹر 14 درجہ پر آجاتا ہے۔ اکتوبر میں شدت سے برف پڑنے لگتی ہے۔ جنوری میں یہ عالم ہوتا ہے کہ ابھی کٹورے میں پانی ڈالا۔ ابھی جم گیا۔ بخاری کے پاس لکھنے پڑھنے کا سامان رکھتے ہیں۔ اس پر بھی دمبدم دوات جم جاتی ہے۔ شیشوں کے منہ بند ہوتے ہیں اس پر شربت اور عرق جم جاتے ہیں۔ انڈے ہانڈیوں اور قطیوں میں رکھتے ہیں مگر مارے سردی کے پھٹ پھٹ جاتے ہیں۔ تانبے کا آفتابہ رات کو باہر رہ جائے تو صبح کو ترق جاتا ہے۔ کھیتی کا یہ حال ہے کہ ہندوستان میں فروری میں کٹ جاتی ہے۔ پنجاب میں آخر مارچ اور اپریل میں۔ وہاں 15 جولائی کو کٹتی ہے۔ ہمدان میں بھی برف بہت ہے۔ کردستان، اگرچہ جنوبی ملک ہے مگر زمین بلند ہے اس لیے سرد ہے۔

شمالی ایران میں مازندان اور گیلان وغیرہ گرم بھی ہیں اور سیراب بھی ہیں (جیسا ہند میں بنگالہ) خراسان نہایت سرد ہے مگر جو علاقہ سیستان میں ملا ہوا ہے وہ نہایت گرم ہے۔ گرمی میں کئی کئی دن باد سموم کے ڈر سے باہر نہیں نکلتے۔

ممالک مذکور کا ہر شخص بلکہ حیوان بھی بالطبع سردی کو پسند کرتے ہیں اور سردی ہی ان کی طبیعت کے موافق ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ زمانہ قدیم میں کبھی بلخ کبھی اصفہان دارالسلطنت تھا۔ وہ برفانی ملک ہے اور رؤسا اور اہل دول اور ان کے سبب سے فرقہ فرقہ کے لوگ دارالسلطنت سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ اہل ملک سیاحت پسند اور اکثر تجارت پیشہ ہیں اس لیے گرم ملکوں کے رہنے والے بھی اگر کچھ قدرت رکھتے ہیں تو اپنے کاروبار کی تقسیم اس طرح کر لیتے ہیں کہ گرمی ان کی سرد ملکوں میں کٹتی ہے۔ اب کہ 40-50 برس سے طہران دارالسلطنت ہے۔ 1885ء کا جاڑا میں نے وہیں بسر کیا۔ سردی موذی نہیں۔ تمام فصل میں 3-4 مہینے بادشاہ طہران کو چھوڑ دیتا ہے۔ دامن کوہ الوند میں کئی کوس تک برابر باغستان اور قدرتی سبزہ زار چلے جاتے ہیں۔ وہ ان کا شملہ اور کوہ مری ہے۔ جب تک گرمی رہتی ہے۔ شاہ، ارکان دولت اور خاندان شاہی سمیت وہیں رہتا ہے۔

جیسی ہمارے ملک کے لوگوں کو سردی کی برداشت نہیں ویسی ہی انہیں گرمی کی برداشت نہیں۔ سردی میں خوش رہتے ہیں اور جو ایرانی کہلاتے ہیں ٹھنڈے ہی ملک کے لوگ سمجھے جاتے ہیں۔ گویا ٹھنڈا ہی ملک ان کا وطن ہے۔ یہی سبب ہو گا کہ مزاج پرسی کے فقروں میں کہتے ہیں۔ مزاج مقدس؟ احوال خیر؟ دماغ چاق؟ کیونکہ سردی میں رہنے سے زکام وغیرہ عوارض کی شکایتیں رہتی ہیں۔

ہندوستان میں حکمائے ہند نے دو دو مہینے کا ایک ایک موسم کر کے سال کے چھ موسم کیے ہیں[35]۔ بسنت 'گریکھم' برکھا' سرت' ہمنت 'سسر۔ ایران میں چار موسم ہیں :۔

1-بہار	21 مارچ سے	اپریل۔ مئی۔ 21 جون تک	حمل ثور جوزا
2-تابستان۔	21 جون سے	جولائی۔ اگست 21 ستمبر تک	سرطان اسد سنبلہ
3-پائیز	21 ستمبر سے	اکتوبر۔ نومبر 21 دسمبر تک	میزان عقرب قوس
4-زمستان	21 دسمبر سے	جنوری۔ فروری 21 مارچ تک	جدی دلو حوت 18

بہار نوروز

آفتاب آخر حوت پر پہنچا اور موسم میں تبدیلی نظر آئی۔ دل گھبرانے لگتے ہیں۔ آمد بہار کی تاثیر سے زمین سانس لیتی ہے۔ درودیوار کے مسامات سے گرمی نکلتی معلوم ہوتی ہے۔ اسے کہتے ہیں کہ "زمین نفس دزدہ میگرد۔" پھر چند روز کے بعد کچھ اس سے زیادہ ہوتا ہے کہ درودیوار میں پسینا سا بہتا ہے۔ تب کہتے ہیں کہ "زمین نفس آشکار میگیرد۔" ساتھ ہی بہار کا موسم شروع ہو جاتا ہے۔ 21 تا 22 مارچ کو نوروز ہوتا ہے یا تو درختوں پر پتوں کا نام نہ تھا۔ سب شاخ بلوریے کھڑے تھے اور زمین آسمان برف ہی برف نظر آتے تھے۔ یا برف باری موقوف ہو جاتی ہے۔ آٹھ دس دن کے بعد کبھی ایک آدھ دفعہ کوئی ہلکا سا جھالا پڑ گیا۔ ورنہ برف بر طرف۔ زمستان موقوف۔ جہاں ہوتی ہے

پانی ہوتی جاتی ہے۔ نہریں۔ حوض۔ تالاؤ وغیرہ بلکہ اکثر دریا کہ جم کر آئینہ ہو گئے تھے وہ پگھلنے لگتے ہیں۔ نہروں کی نالیوں میں چپکے چپکے پانی سرسرانے لگتا ہے۔ پھر حوضوں کے اوپر کا تختہ کنارے کنارے سے پگل جاتا ہے۔ گویا حوض نے دہن کھول دیا۔ کناروں پر سبزہ اور سبزہ میں کلیاں آجاتی ہیں۔ نظامی:

دہن ناکشادہ لب آبگیر کہ آید لب غنچہ را بوئے شیر

میرے دوستو! جب تک ایسے ملکوں میں جا کر حالت مذکورہ کو آنکھوں سے نہ دیکھے تب تک شعر مذکور اور اس قسم کے اشعار کوئی کیا سمجھ سکتا ہے۔ اکثر شارح اور محشیوں نے صفحے سیاہ کیے ہیں اور اصل مطلب کے سایہ تک نہیں پہنچے۔ پھر دیکھ لو! انشا پردازی نے اپنے ملک کی حالت اور موسم کی کیفیت کو کیونکر ظاہر کیا ہے۔

زمیندار اپنے کھیتوں پر آتے ہیں۔ باغ والے باغوں میں پہنچتے ہیں۔ باغچے سب کے پاس ہیں۔ بعض کے گھروں میں چھوٹے چھوٹے خانہ باغ ہیں۔ غریب اپنے دوست آشناؤں کو لے کر انگوروں کی دار بستیں باندھتے ہیں۔ درختوں کو چھانٹتے ہیں۔ کیاریاں صاف کرتے ہیں۔ درخت جو سوکھی جھاڑیاں نظر آتے تھے ان میں پھر جان آتی ہے۔ اس طرح کہ آج صبح کو دیکھا ٹہنیوں پر برف نہیں رہی۔ کل صبح کو دیکھا تو سبزی کی تحریر معلوم ہوئی۔ دوسرے دن دیکھا تو ہری ہری کونپلیں۔ مگر سبزی بھی ایسی صاف شفاف کہ آنکھوں میں طراوت آئے۔ جس درخت کی طرف دیکھو زمرد کی ٹہنیاں بن گئیں۔ 8-10 دن میں ہرا بھرا درخت لہلہا رہا ہے۔ باغ و گلزار میں بلکہ گھر گھر کی کیاریوں میں گلاب کھل گیا ہے۔ در و دیوار پر سبزۂ خود رو بھی اگا تو ایک گل خود رو لئے اگا۔ لوگ گھروں میں سکڑے بیٹھے تھے نکل کھڑے ہوئے۔ بند کام جاری ہو گئے۔ آسودہ حال لوگ گھوڑوں پر چڑھے۔ دوست آشناؤں کو لے کر باغوں میں گئے۔ بہاریں منائیں۔ عورتیں بھی باغوں اور کھیتوں میں گئیں اور دل خوش کرنے لگیں۔ جس شخص کے دل پر یہ خیالات چھائے ہیں۔ خاقانی کے بہاریہ قصیدہ کا اسی کو مزہ آئے گا:

نو روز برقع از رخ زیبا برافگند برگستواں بہ دلدل شہبا برافگند

نوروز اپنے رخ رنگیں سے برف کا برقع الٹ دیتا ہے۔ یا پری رویوں کے رخ زیبا

ہے کہ جو برف کے سبب سے لحافوں میں دبکے بیٹھے تھے۔ ہر طرح لطف زیادہ بر زیادہ ہے۔

ادھر گلاب کھلا۔ ادھر بلبل ہزار داستاں اس کی شاخ پر بیٹھی نظر آئی۔ بلبل نہ فقط پھول کی ٹہنی پر بلکہ گھر گھر درختوں پر بولتی ہے اور چہ چہے کرتی ہے اور گلاب کی ٹہنی پر تو یہ عالم ہوتا ہے کہ بولتی ہے۔ بولتی ہے۔ حد سے زیادہ مست ہوتی ہے تو پھول پر منہ رکھ دیتی ہے اور آنکھیں بند کر کے زمزمہ کرتے رہ جاتی ہے۔ تب معلوم ہوتا ہے کے شاعروں نے جو اس کے اور بہار کے اور گل و لالہ کے مضمون باندھے ہیں وہ کیا ہیں اور کچھ اصلیت رکھتے ہیں یا نہیں۔ وہاں گھروں میں نیم کیکر کے درخت تو ہیں نہیں۔ سیب 'ناشپاتی' بہی 'انگور کے درخت ہیں۔ چاندنی رات میں کسی ٹہنی پر آن بیٹھتی ہے اور اس جوش و خروش سے بولنا شروع کرتی ہے کہ رات کا کالا گنبد پڑا گونجتا ہے۔ وہ بولتی ہے اور اپنے زمزمے میں تانیں لیتی ہے اور اس زور شور سے بولتی ہے کہ بعض موقع پر جب چہ چہ چہ کر کے جوش و خروش کرتی ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کا سینہ پھٹ جائے گا۔ اہل درد کے دلوں میں سن کر درد پیدا ہوتا اور جی بے چین ہو جاتے ہیں۔ میں ایک فصل بہار میں اسی ملک میں تھا۔ چاندنی رات میں صحن کے درخت پر آن بیٹھتی تھی اور چکارتی تھی تو دل پر ایک عالم گزر جاتا تھا۔ کیفیت بیان میں نہیں آسکتی۔ کئی دفعہ یہ نوبت ہوئی کہ میں نے دستک دے دے کر اڑا دیا۔ یہ موسم دلوں میں جوش پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ جب چاندنی رات ہوتی ہے تو چند آشنا ہم طبع، ہم نفس زندہ دلی کی امنگ میں آکر کہتے ہیں:

"بیائید امشب شب گل کنیم۔" باغ جاتے ہیں۔ رات کو وہیں رہتے ہیں۔ بہار مناتے ہیں اور زندگی کی بہاریں لوٹتے ہیں۔

نگاہ خانہ قدرت کے دیکھنے والے دیکھیں گے کہ ہمارے ہندوستان کی بہار کا موسم برسات ہے۔ جو لطف وہاں بہار میں ہوتے ہیں یہاں برسات میں ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں بلبل کا زمزمہ نہیں۔ کوئل کی کوک اور پپیہے کی ہوک دلوں پر آفت لاتی ہے۔ تلاؤ پڑے چھلکتے ہیں۔ جھیلیں موجیں مارتی ہیں۔ دریاؤں کے چڑھاؤ مستیاں دکھاتے چلے جاتے ہیں۔ گل اور لالہ ان دنوں میں نہیں پھولتا۔ مگر چنپا، موتیا اور رائے

بیلی وغیرہ وغیرہ پھولوں کی خوشبو سے عالم مہک جاتا ہے۔ دلوں پر بھی جو اثر شگفتگی کے برسات میں ہوتے ہیں بہار میں نہیں ہوتے۔ گھٹا گھنگور چھائی ہے۔ کبھی مینہ برس رہا ہے کبھی پھوار پڑتی ہے۔ بادل گرجتے ہیں۔ بجلیاں چمکتی ہیں۔ مور بولتے ہیں۔ باغوں میں جاتے ہیں پنکھے چڑھتے ہیں۔ آموں کی سیریں ہو رہی ہیں۔ ٹپکا لگا ہوا ہے۔ درختوں میں جھولے پڑے ہیں۔ شاعروں نے بھی جو برسات کے گیتوں میں مزے لیے ہیں وہ بسنت میں نہیں لیے۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ قدرتی بہار بسنت کی ہندوستان میں سوائے سرسوں کے اور کچھ نہیں۔ اس کے علاوہ عمر بھی تھوڑی ہے۔ دو تین ہفتہ میں گرمی آتی ہے اور سارا لطف خاک میں ملا دیتی ہے۔ ہند کے انشا پردازوں نے جب کسی باغ کا لطف یا عیش کا سماں باندھا ہے تو اکثر برسات ہی کا موسم لیا ہے۔

ایران ایک قدرتی بہشت ہے۔ وہاں جن چیزوں کی بہتات ہے وہی اس کی انشا پردازی کا سامان ہے۔ گل۔ بلبل۔ سبزہ۔ شبنم۔ برف۔ اولے۔ مرغزار۔ آبِ رواں۔ گلشن۔ چمن۔ درخت۔ جوانانِ چمن۔ مرغانِ چمن۔ نغمہ سنجانِ چمن ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ ان ترکیبوں میں ہزاروں نازک اور لطیف خیالات ادا کرتے ہیں۔ گلاب کے پھول میں جو زردی ہے اسے زرِ گل کہتے ہیں۔ گل اپنا خزانہ لٹاتا ہے اور ہنستا ہے۔ مگر غنچہ مٹھی بند کر کے اپنی زرداری پر خوش ہوتا ہے اور مسکراتا ہے۔ شبنم بے ثباتی پر روتی ہے۔ جس طرح بلبل گل کی عاشق ہے قمری سرو کی شیدا ہے۔ اس کا گیروا لباس ہے۔ نغمے لالہ زار میں، مگر سبزہ بیگانہ ہے۔

زمزموں کی کثرت سے اس کا نام ہزار۔ ہزار داستان۔ ہزار آواز رکھا ہے۔ بیسیوں صفتیں خوشنما و خوش آئندہ نکالی ہیں۔ مرغِ شب خواں۔ خوش آہنگ۔ آتش نوا وغیرہ وغیرہ ایک ایک ترکیب سے کئی کئی مضمون شاعرانہ جداگانہ پیدا کیے ہیں۔ کوہ۔ صحرا۔ مرغزار۔ چشمے۔ آبِ رواں کہ قدرت کے عجائب خانے ہیں ان سے ہزار در ہزار خیالات زبان میں پرواز کرتے پھرتے ہیں۔

اہلِ عرب نے کھجور سے۔ انہوں نے شرابِ انگور سے بلکہ اس کی تازگی۔ کہنگی۔ مستی۔ سیہ مستی۔ بدمستی۔ سرخوشی۔ خمار۔ سرگرانی میں۔ خندہ جام۔ گریہ شیشہ۔

قلقل مینا۔ قہقہہ مینا وغیرہ وغیرہ سے سرور کیے ہیں۔ انہی کی بہتات ہے کہ انشا پرداز کو اپنے رنگین مضمونوں اور استعاروں سے نکلنے نہیں دیتی۔ ایک گل کو دیکھو کہ کتنی عمدہ عمدہ اصطلاحیں رنگی ہیں۔ گل کردن (ظاہر ہونا) گلگشت (گلزار میں پھرنا) گل زمین (قطعہ زمین) گلک (طنز کی بات) وغیرہ سینکڑوں اصطلاحیں ہیں کہاں تک سنو گے۔ آب رواں کی کثرت اور زمین کی شادابی اور سرسبزی نے صدہا نہیں۔ ہزاروں اصطلاحیں اور کنائے سرسبز کیے ہیں۔ فقط آب کی ترکیب سے جو سیر اب اور خوشنما معنی پیدا ہوئے ہیں اگر لکھوں تو ایک رسالہ بنتا ہے۔ سبزہ کی خوشنمائی نے اپنی فراوانی کے سبب سے مختلف ترکیبوں میں لہلہاتے معنی پیدا کیے۔ مثلاً گنبد سبز۔ پل سبز۔ دریائے سبز (آسمان) سبز آخور (خوشحالی میں رہنے والا گھوڑا) سبز بخت (خوش نصیب) سبز کار' سبز گر (جو اچھے کام کرے) آغا سبز کردۂ شما ہستیم (تمہارے پرورش کئے ہوئے ہیں ہم) سبزہ رنگ (سانولا معشوق) سبزۂ گلگوں۔ ان کا تعریفی رنگ اور ایک راگ کا بھی نام ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ کیا کیا کہوں۔ شیخ نے کہا:

برومند بادش درخت امید سرش سبز وروئش برحمت سفید

اب تم عرب۔ فارس۔ اور ہند کی انشا پردازی کو پہلو بہ پہلو ترتیب دیکر دیکھو۔ ہر ملک کے محاورے اور اصطلاحیں تمہیں بتا رہی ہیں کہ اس ملک کی کیا حالت ہے۔ سرزمین کی کیا کیفیت ہے۔ آب و ہوا کا کیا عالم ہے۔ پیداواروں کی کیا صورت ہے اور لوگوں کی طبیعتوں پر اس کا اثر کیا ہے جو زبانوں سے ظاہر ہوا ہے۔

تابستان

گرمی کا موسم آیا۔ رستے برف سے بند پڑے تھے۔ سب کھل گئے۔ کاروان تیار ہوئے۔ سوداگروں نے دساور باندھے۔ کاریگروں کے کارخانے جاری ہوئے۔ درختوں پر میوے دانے ہرے دکھائی دینے لگے۔ پہاڑوں پر برفیں پگھلتی ہیں۔ جہاں باقی ہیں۔ سبز مخمل پر سفید چادریں بچھی ہیں۔ چشمے بہہ نکلتے ہیں۔ دریا چڑھاؤ پر آکر زور شور دکھاتے ہیں اور موجیں مارتے چلے جاتے ہیں۔ نہریں بہتی ہیں۔ پانی کی چادریں

اس زور سے گرتی ہیں کہ کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی۔ جگہ جگہ پن چکیاں چلنے لگتی ہیں۔پانی آگے بڑھ کر آبادیوں میں آتے ہیں۔ گھر گھر گنگا بہتی ہے۔ کھیتیاں دھوپ کی گرمی سے روز بروز زرد ہوتی ہیں۔ ہوا کی قدرتی خشکی دنوں کی جگہ گھڑیوں میں سکھاتی ہے اور جھٹ پٹ کاٹنے کے قابل کر دیتی ہے۔ باہر کسان کھیت کاٹ اناج نکال کر ٹھکانے لگاتے ہیں۔آپ چند روز دم لیتے ہیں اور زمین کو بھی دم لینے دیتے ہیں کہ آیندہ فصل کے مسافروں کے لیے تازہ دم ہو جائے۔

باغوں میں میوے پک کر تیار ہو جاتے ہیں۔ بازاروں میں باسلیقہ دکاندار ایسی خوبصورتی سے دکانیں سجاتے ہیں کہ گویا نعمت الٰہی کا نگار خانہ کھلا۔ سیب۔ ناشپاتی۔ بہی۔ انگور۔ رنگا رنگ بو قلموں۔ گھروں میں کوئی گھر خالی نہیں دو دو چار چار قسم کے درخت موجود ہیں۔آپ میوے توڑتے ہیں کھاتے ہیں کھلاتے ہیں۔باغ والوں کے گھروں میں باغوں سے کٹ کر میوے آتے ہیں۔ میوہ خانہ کے حجروں میں انگور خربوزے تربوز لٹکاتے ہیں کہ قندیلیں قمقمے نظر آتے ہیں۔ سیب۔ بہی۔ ناشپاتیاں اتنی ہوتی ہیں کہ دنبے اور بکریاں بھی نہیں کھا سکتیں۔ زمین کھود کھود کر ایک ایک تہ بھس کی دیتے جاتے ہیں اور تہ بہ تہ جماتے جاتے ہیں۔ ہوا کی لطافت اور پاکیزگی یہ ہے کہ سڑنے نہیں دیتی بلکہ پرورش کرتی ہے۔ گرم ملکوں کے لوگ اپنے اپنے اجناس لیکر ٹھنڈے ملکوں کی طرف بیچنے کو نکل جاتے ہیں۔ کیونکہ سیاحت وہاں کی فقط رسم ملکی ہی نہیں۔ باعث زندگی ہو گئی ہے۔ شہروں میں بازار گرم ہوتے ہیں۔ بھیڑ بھاڑ سے رونق ہو جاتی ہے۔ جابجا مرزا منش خوش پوشاک۔ خوش وضع خوبصورت لوگ پھرتے ہیں۔

گرمی کا موسم ولایت میں ہد کاموں کو کھولتا ہے۔ منافع کو پھیلاتا ہے۔ اور عموماً گرمی آسائش اور آرام کا سامان ہے۔ دیکھو! اسی واسطے لفظ گرم نے مختلف لفظوں کے ساتھ ترکیب پاکر خوبی و خوشنمائی یا تیزی اور شوخی پیدا کی ہے مثلاً حسن گرم، شعر گرم، گرم نفس (صاحب تاثیر آدمی)۔ گرم صحبت (جوش محبت والا)۔ گرمی ہنگامہ۔ گرمی بازار۔ گرمی صحبت۔ گرمی اختلاط۔ گرم کردن نظر (حسن یا خوشنما چیز سے نظر کا لطف اٹھانا) گرم کردن دماغ۔ گرمی گفتار۔ گرمی رفتار وغیرہ بیسیوں محاورے پیدا ہو گئے

ہیں کہ معنوں میں لطف، شوخی یا زور بڑھاتے ہیں۔

اگرچہ وہاں کی گرمی ایسی ہے جیسے یہاں کا گلابی جاڑا۔ لیکن اکثر گرم میوے اور دنبوں کے گوشت کھاتے ہیں۔ یخنیاں اور چائے پیتے ہیں اس لیے مزاجوں کو گرمی کی برداشت نہیں۔ تھوڑی دیر چلتے پھرتے ہیں۔ پسینے پسینے ہو جاتے ہیں۔ دکاندار پہاڑوں سے برف ڈھیمے کے ڈھیمے کاٹ کر لاتے ہیں۔ فالودہ کی دکانیں سجاتے ہیں۔ تم نے پیسا دو پیسے دیئے۔ اس نے کٹورے میں تھوڑا شربت انگور تھوڑا برف کا پھاڑا لا اور حوالہ کیا۔ جام از دستش گرفتیم وبسر کشیدیم۔ شکر خدا کردیم وراہ خود گرفتیم۔

بہر حال الفاظ مذکورہ کی ترکیبوں کو دیکھو اور سمجھو کہ وہ کیونکر ملک کی حالت بتاتے ہیں یا یہ کہو کہ ملک کی حالت نے محاورات مذکورہ پیدا کر دیئے۔

پائیز

آفتاب میزان میں آیا جاڑے کا پیام لایا۔ یخ بندیاں شروع ہو گئیں۔ پہاڑوں پر چشمے بند ہو گئے۔ دریا اترنے لگے۔ نہریں سوکھنے لگیں۔ کہیں پانی ہے تو اتنا کہ اوپر انگل دو دو انگل برف کی پپڑی۔ نیچے پانی بہتا چلا جاتا ہے۔ اول اول پپڑی کو مکا مار کر توڑا۔ پانی بھر کر لے گئے۔ پھر محلوں میں حوض بھر لیتے ہیں۔ وہ سب یخ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان سے اور آب انباروں کے پانی سے کام چلتے ہیں۔

یخ بندیاں دیکھتے ہی کسان زمینیں جوت کر بیج بو دیتے ہیں۔ اسی عرصہ میں برف کے آثار نظر آنے لگتے ہیں۔ سب کھیتوں اور باغوں کو چھوڑ گھروں کا رخ کرتے ہیں۔ جو بیج بوئے تھے۔ خدا کے سپرد یا برف کے حوالے۔ وہ قدرتی دائی آپ ہی بچے نکالے گی۔ آپ ہی پالے گی۔ فردوسی نے اسی خیال میں بڑھاپے کی آمد کھائی ہے۔

بگسترد کافور برجائے مشک   گل ارغواں شد بہ پائیز خشک

عزیزان وطن! جب تک ممالک سرد سیر میں رہ کر موسموں کی حالتیں آنکھوں سے نہ دیکھی ہوں اکثر کتابوں کے خاص خاص مقاموں کا مزا نہیں آتا بلکہ سمجھ میں نہیں آتے۔ کوئی کیا جانے: "کدیور شد از باغ برخاستہ"۔ کا کیا مطلب ہے۔ اور موسم

خزاں میں کھیتوں اور باغوں میں اداسی کا کیا عالم ہوتا ہے۔ غرض باہر کے کام والے شہروں میں آئے۔ پوستین۔ لحاف۔ توشک۔ انگیٹھیاں۔ آتشدان گھر گھر میں موجود ہیں۔ ضروری سامانوں کے ذخیرے بھرے ہیں۔ میوہ خانوں میں تر و خشک میوے دھرے ہیں۔ دنبے کے دنبے بلہ کیے ہیں اور نمک سود کر کے لٹکا دیے ہیں۔ گوشت قاق تیار ہیں۔ یخنیاں اور شب دیگیں پکائیں گے۔ پلاؤ دم دیں گے اور گھروں میں بیٹھے کھائیں گے۔

اتنے میں ہوا جاڑے کی سواری لائی۔ سناٹے چلنے لگے۔ دیکھتے دیکھتے کیا باغ کیا جنگل تمام درخت زرد ہو گئے اور زردی بھی وہ کہ گویا عالم زعفرانی ہو گیا اور بعض درختوں کے پتے تو سرتاپا ایسے سرخ ہو جاتے ہیں جیسے تپایا ہوا تانبا۔ میں ایک دن دیوان انوری پڑھ رہا تھا۔ ایک قصیدہ کے دعائیہ میں دو شعر آئے:

تاہوائے خزاں بہ بہمن ودے زرگر باغ و بوستاں باشد
باغ ملک ترا بہارے باد نہ چناں کز پیش خزاں باشد

ایک طالب علم نے پوچھا کہ خزاں کو زرگر کیونکر کہہ سکتے ہیں۔ جب میں نے اس کے سامنے کیفیت مذکورہ کا رنگ دکھایا تو اس کے چہرے پر سمجھ کا رنگ چمکا۔ خاقانی نے بھی اسی مضمون کا رنگ دیا ہے:

سخا ہنگام درویشی فزوں ترکن کہ شاخ رز
چو درویش از خزاں گردو فزوں گردو زر افشانش

پہلے مصرع میں شاخ رز۔ شاخ انگور ہے اور زر افشانی۔ اس کی برگ ریزی ہے فصل خزاں میں۔

بہر حال ایسے مضامین بار بار میرے اس خیال کی تصدیق کرتے ہیں کہ کسی زبان کا شائق جب تک برس دو برس تک خود اس ملک میں جا کر نہ رہے گا تب تک نہ رمز سخن کو پاسکے گا نہ زبان کا لطف حاصل کر سکے گا۔

زمستان

دفعتہً ہوا بند ہوئی۔ ابر سا گھر آیا۔ دنیا دھواں دھار ہو گئی۔ پھر سفید غبار سا برستا معلوم ہوا۔ تھوڑی دیر بعد دیکھا تو زمین پر کوٹھوں پر دیواروں اور منڈیروں پر کوئی سفید سفید آٹا سا چھڑک گیا۔ غرض کہ ایک جھکولا برف کا اور پڑا۔ رات گزری صبح کو دیکھا تو تمام درختوں پر برگ ریز کا حکم پہنچ گیا۔ دوسرے دن ایک جھکولا اور۔ اور ساتھ ہی ایک سناٹا ہوا کا آیا۔ پھر جو دیکھا تو درخت پر پتے کا نام نہیں۔ جو درخت ہفتہ بھر پہلے پتوں سے بھرے تھے اب خالی جھاڑیاں کھڑے ہیں جیسے کسی نے کپڑے اتار لیے۔ وہ بھی سیاہ رنگ جیسے تجلی مار الوہا۔ ایک دو دن بعد برف برسنی شروع ہو گئی مگر کس طرح؟ جیسے کوئی آسمان پر بیٹھا روئی دھنک رہا ہے۔ ایک دن رات جو برف کا تار لگا تو در و دیوار۔ زمین آسمان تمام سفید۔ وہ سیاہ جھاڑیاں برف جم کر بلور کے درخت اور شیشہ کی شاخیں ہو گئیں۔ دیکھنا انشا پردازی نے کیونکر جغرافیہ ملک کا نقشہ کھینچا ہے۔

برآمد زکوہ ابر کافور بار مزاج زمیں گشت کافور خوار

اور شیخ سعدی نے ہنسی ہنسی میں سب کچھ کہہ دیا: "چہ حرامزادہ مرد مانند کہ سنگہا را بستہ اند و سگہا را کشادہ۔

پہاڑوں پر برف کے پہاڑ چڑھ گئے۔ جنگلوں میں برف سے رستے رک گئے۔ سوداگر جہاں کے تہاں بیٹھ رہے۔ میدان۔ کھیت۔ گلی۔ کوچہ میں گھر گھر قد آدم برفیں چڑھ گئیں۔ بازاروں میں سناٹا۔ کارخانے بند۔ غریب کاریگروں کے کاروبار ان کے ہاتھوں سے بھی سوا ٹھنڈے۔ کوٹھوں پر برف کے انبار ہیں۔ جلدی گراؤ! نہیں تو گھر بیٹھا۔ امرا کے غلام، نوکر اور مزدور لکڑی کے پنج شاخے اور پھاوڑیاں لیے ہیں برف گرا رہے ہیں۔ آگ بغیر گزارہ نہیں۔ انگیٹھی بیچ میں لے بیٹھتے ہیں۔ جن کو خدا نے دیا ہے ان کے ہاں آتشدان اور بخاریاں روشن ہوتی ہیں [36]۔ کمروں کے دروازے بند ہوتے ہیں۔ وہ گھروں میں دنبے کاٹتے ہیں مرغ ذبح کرتے ہیں۔ نہیں تو گوشت قاق کے پلاؤ دم دیتے ہیں۔ اس کی یخنیاں پیتے ہیں۔ کلے پائے اور شب دیگیں پکا پکا کر کھاتے ہیں اور چائے اڑاتے ہیں۔ لیکن باہر تمام عالم ویرانہ ہے کھیت اور باغ سب سنسان۔ گیدڑ لومڑی خرگوش بلکہ چوہا تک جنگل میں نظر نہیں آتا۔ اپنے اپنے بھٹوں اور بلوں میں گھس

رہتے ہیں۔ اس وقت نظامی کا دیباچہ اور اس کے خزاں کے مضمون مزا دیتے ہیں۔

گرگ آشتی: بھیڑیوں کو اس موسم میں سخت مشکل ہوتی ہے۔ وہ گوشت کے سوا اور کچھ کھاتے نہیں اور کسی قسم کا ذخیرہ رکھتے نہیں۔ باہر برف کی کثرت سے کتا تک نہیں نظر آتا۔ گلے سب بند ہو جاتے ہیں۔ یہ دس دس بیس بیس جمع ہو کر بیٹھ جاتے ہیں۔ مگر ہر بھیڑیا اس طرح بیٹھتا ہے کہ اس کی آنکھ سب پر پڑے۔ ہر چند بھوک، پیاس اور تھکن سے تنگ ہوتے ہیں مگر ایک کو دوسرے پر اعتبار نہیں اس لیے آنکھوں میں آنکھیں ڈالے بیٹھے رہتے ہیں۔ آخر نیند تو ظالم ہے کسی کی ذرا آنکھ جھپکی اور جتنے بیٹھے تھے جھٹ اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ فوراً پھاڑ چیر تکا بوٹی کر کے کھا ہی جاتے ہیں۔ اسی سے اہل ملک نے اصطلاح نکالی ہے گرگ آشتی یعنی اس بدذات جانور کے ملاپ کا بھی اعتبار نہیں۔

ملک کے لوگ اسی برف کے کیڑے ہیں۔ انھیں یہ سردی کچھ بہت دکھ نہیں دیتی۔ اس لیے بازار چلتے رہتے ہیں۔ حاجتمند بچارے یا اکثر مصیبت کے مارے سفر بھی کرتے ہیں۔ ان کے نمدی چغوں پر برف پڑی ہوئی۔ پلکوں پر برف جمی ہوئی۔ موچھیں اور ڈاڑھی میں گویا شیشہ کی سلائیاں لٹکتی ہیں۔ اس عالم میں پرند جانور بھی کم نکلتے ہیں۔ البتہ خاص قسم کے کوے اور بعض بعض اور جانور اڑتے پھرتے ہیں۔ ان کے پیٹھ اور بازوؤں پر برف جمی ہوتی ہے۔ اس وقت نظامی کی تشبیہ کا مزا آتا ہے کہ: "مر ابر ف بارید بر پر زاغ"۔ اور انہی لوگوں کو مزا بھی آتا ہے۔ جن کی آنکھوں کے سامنے یہ سب چیزیں ہیں کیونکہ تشبیہ اور استعارہ جتنا قریب کا ہو اتنا ہی قریب الفہم ہوتا ہے۔ اسی واسطے زیادہ مزا دیتا ہے۔ اس حالت میں کبھی جھکڑ چلنے لگتا ہے اور جو برف پڑی ہوئی تھی وہ خاک کی طرح اڑتی ہے۔ بدن اور چہرے پر چھرے کا کام کرتی ہے اور کوئی ذرہ آنکھ میں پڑ جاتا ہے تو بڑی تکلیف دیتا ہے۔ اسے بادروبہ کہتے ہیں۔

ایک سال یہی جاڑے کا موسم تھا اور میں اسی ملک میں تھا۔ برفیں پڑ رہی تھیں۔ دو مہینے برابر سفر کرنا پڑا۔ دریائے جیحون رستہ میں ملا۔ اس پار سے اس پار تک ایک تختہ آئینہ کا تھا۔ شتری اور ایسی قافلے پیادہ اور سوار برابر چلے جاتے تھے۔ میں ایک بلند کنارہ پر کھڑا

دیکھتا تھا۔ چونٹیوں کی سی قطار عجب بہار دیتی تھی۔ رستہ میں کئی منزلیں ایسی ملیں کہ جہاں سر لیا مکان کچھ نہ تھا کہ جس میں ذرا سر تو چھپا بیٹھیں۔ زمین پر کمر کمر برف چڑھی تھی اور ادھر ادھر پہاڑ برف سے سفید دکھائی دیتے تھے۔ ہم نے ایک پتھر کی آڑ میں برف ہٹا کر زمین نکالی۔ ادھر ادھر سے دو چار لکڑ گھسیٹ لائے ان میں آگ سلگالی۔ بستر کر کے پڑے اور گٹھری ہو کر سکڑ رہے۔ غنیمت یہ ہے کہ رات کو ہوا بند ہوتی ہے۔ ہم گھنٹے دو گھنٹے بعد اٹھ کر چائے بناتے۔ ایک ایک پیالی پی کر سینے گرم کرتے اور پھر پڑ رہتے تھے۔ خدا خدا کر کے صبح ہوئی۔ اس وقت شاہ ناصر خسرو کی رباعی سمجھ میں آئی کہ ایسے ہی موقع پر کہنی پڑی ہوگی۔ رباعی:

دوشینہ شبے کہ برف تا دوشم بود زانو چو عروس نو در آغوشم بود
پوشیدنی نہ بود غیر از چشم چیزے کہ بزیر سر نہم گوشم بود

لطیفہ: جاڑے کا موسم زور پر تھا۔ ایک قلندر مشرب کے پاس جاڑے کا کپڑا کچھ نہ تھا۔ سردی کے مارے مرنے لگا۔ کسی سے پوچھا کہ غضب سردی ہے آفتاب کس برج میں ہے؟ اس نے کہا "عقرب میں۔" قلندر نے کہا کہ "خدا کی لعنت عقرب پر۔ زمین پر بھی دکھ۔ آسمان پر بھی دکھ۔" تم نے دیکھ لیا۔ جب آفتاب عقرب میں ہوتا ہے تو وہیں جاڑے کی جوانی ہوتی ہے۔ وہاں ہاتھ پاؤں باہر نہیں نکال سکتے۔ یہاں ان دنوں میں ایک چادرے کا جاڑا ہوتا ہے۔ اس خیال کا لطیفہ پیدا ہوگا تو اسی ملک میں پیدا ہوگا۔ اس ملک کے لوگ سنتے ہیں، چپکے ہو رہتے ہیں۔

زبان اپنی اصطلاحوں یا استعاروں کے علاوہ ادائے مطالب میں بھی ملک کے موسم سے آگاہ کرتی ہے۔ دیکھو فصیح فارس اپنی مضمون آفرینی میں ملک کی سردی کو کس طرح دکھاتا ہے:

عجب جائیست ایں کاخ دل آویز کہ چوں جا گرم کردی گفت برخیز

جب تم تھوڑی دیر کہیں بیٹھتے ہو تو جگہ گرم ہو جاتی ہے۔ گرم ملک میں ٹھنڈی جگہ پر بیٹھنا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ ٹھنڈے ملک میں گرم جگہ پر بیٹھنے سے آرام ہوتا ہے۔ پس شاعر کہتا ہے کہ دنیا عجب مقام ہے جہاں ذرا آرام سے بیٹھنے کا موقع آیا اور حکم ہوا کہ

اٹھ کھڑے ہو۔

آگ ایسے موقع پر فقط باعث آرام نہیں بلکہ چشمہ بہت سے منافع کا ہوتی ہے۔ نہیں۔ نہیں۔ اکثر موقع پر باعث زندگی ہو جاتی ہے۔ یہی سبب ہے کہ انشائے فارسی نے اس سے بیسیوں لفظ ترکیب دیے ہیں جن سے تیزی، چستی، رونق، قدرو مرتبہ وغیرہ کے خیالات روشن ہوتے ہیں مثلاً آتش زبان۔ آتش بیان۔ آتش سخن (تیز کلام آدمی)۔ آتش مزاج (تیز مزاج) آتش کار (چالاک) آتش لباس سرخ لباس: آتش و آب۔ آتش آب پرور۔ آتش مجسم (تلوار) آتش پر آب۔ آتش بے باد۔ آتش توبہ سوز۔ آتش سرد (شراب) آتش بے دود (سورج، شراب یا غصہ) آتش پیکر۔ آتش نیم‌رزم۔ آتش بید (سورج) آتش ہندی (تیغ ہندی) وغیرہ وغیرہ بیسیوں لفظ ہیں کہ خوبی معنی سے مختلف کاموں اور مختلف چیزوں میں رونق اور خوبی پیدا کرتے ہیں۔

میں کہتا ہوں کہ گائے وغیرہ بہت سی مفید چیزیں جو انسان کی آسائش اور زندگی میں مدد دیتی ہیں ہندوؤں میں واجب التعظیم ہوئیں۔ یہاں تک لوگ رفتہ رفتہ انہیں دیوتا ماننے لگے۔ کیا عجب ہے کہ آگ سے ان ملکوں میں بہت سی تکلیفیں رفع ہوتی تھیں اور اکثر قسم کے فائدے حاصل ہوتے تھے۔ شاید اول تعظیم کے لیے حکم ہوا ہو پھر رفتہ رفتہ عبادت ہونے لگی۔

برخلاف اس کے سردی سے لوگوں کے کاروبار رک جاتے ہیں اور فوائد میں نقصان آتے ہیں۔ پھرتے چلتے بیٹھتے اٹھتے تکلیف اٹھاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ جن الفاظ سے سردی ترکیب پاتی ہے معنوں میں بھی کمی۔ بے لطفی اور خرابی پیدا کرتی ہے۔ مثلاً وعدہ سر، گریہ سرد، آہ سرد، ناز خنک، نوائے خنک، گفتار خنک، سرد شدن اختلاط (کمی محبت)، سرد حرف، سرد بیان، سرد گوئے، سرد مہر، سرد نفس، سرد رو، خنک طبع، خنک ادا، خنک گفتار، خنک روئے وغیرہ وغیرہ بہت سے الفاظ ہیں۔

برخلاف اس کے عرب کا ملک گرم ہے۔ اسی واسطے سردی سب کو عزیز ہے۔ جب کہتے ہیں وکان الھواء بارد تو ہوا کی خوش آیندگی مراد ہوتی ہے اور پانی کی برودت سے اس کی لطافت و گوارائی مراد لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ خوش بیان فصیحوں نے

عیش بارد۔ آرام کی زندگی۔ اور غنم بارد یعنی عمدہ نعمت بھی کہہ دیا اور برد امر تا یعنی ہمارا کام بن گیا۔

تم ضرور کہو گے کہ فارس میں بھی خنکی چشم بہ معنی راحت و آرام بولتے ہیں نہ کہ بے آرامی۔ آزاد کہتا ہے کہ یہ درست ہے لیکن اگر میرا قیاس غلط نہیں تو یہ محاورہ عرب سے آیا ہے اور ترجمہ ہے قرۃ العیون کا۔ ایران میں بہت محاورے عرب سے آئے ہیں۔ انہی میں یہ بھی آیا ہوگا۔

تم کہو گے کہ اس محاورہ کی خصوصیت نہیں خنکی زبان فارسی میں اور جگہ بھی لطف و خوبی پیدا کرتی ہے۔ شیخ سعدی نے کہا ہے:

خنک روز محشر تن داد گر کہ در سایہ عرش دارد مقر

میرے دوستو! غور کرو یہ محاورہ نہیں بلکہ ایک مذہبی روئیداد کا بیان ہے۔ تم جانتے ہو کہ قیامت کے دن گرمی کی شدت کس درجہ پر ہوگی۔ تابش آفتاب سے سر کا بھیجا پگھل کر ناک سے ٹپک جائے گا اور زمین تانبے کی طرح تپے گی۔ شاعر کہتا ہے کہ جس دن گرمی کا یہ عالم ہوگا۔ اس دن داد گر کا تن بدن خنک ہوگا اور وہ عرش کے سایہ میں ہوگا۔

زبان ایران یہ بھی کہتی ہے کہ میری سرزمین تمام کوہستان ہے جو بیشمار خلقت سے آباد ہے۔ یہی سبب ہے کہ پہاڑ کے متعلق بہت سے محاورے، استعارہ اور خیالات ان کی انشاپردازی میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً کوہ پشت (کوز پشت) کو کہتے ہیں (اس کے کب کی شباہت کے سبب سے)۔ کوہ جگر (شجاع)۔ کوہۂ آب: موج آب (اسے اپنے دریا یا نہروں کی لہر نہ سمجھو۔ سمندر اور اس کے طوفانوں کی طرف خیال کرو۔) اور عموماً بلندی کا اشارہ بھی اسی لفظ سے کرتے ہیں۔ مثلاً کوہۂ زمین یا پیش کوہہ اور پس کوہہ یعنی اس کے آگے کی بلندی اور پیچھے کی بلندی۔ فصیح فارس اپنے سرور میں آتا ہے تو کہتا ہے۔ "در عالیکہ کوہ ہنگ از سر پریدہ بود"۔ کبھی کہتا ہے۔ "کوہ تا کوہ ہنگ از سر پریدہ بود اور کوہ کوہ کیف از سر میگذشت"۔ یہ استعارے بھی ملک کی سرسبزیوں نے زبان کو دیئے ہیں۔ کمر اور چوتڑوں کی تعریف میں شاعر نے کہا۔ کوئی معشوق سے پوچھو!

"کوہ را با تار موئے بستی آخر چہ ساں؟" اور جلد پھر آنے کے موقع پر کہا۔
"چوں صدا از کوہ برگشت۔ اور چوں سیل از کوہ بہ زیر آمد"۔
پہاڑ کے مختلف حصوں کے نام اس کی صورت حال کے بموجب تراشے ہیں اور ضرور ایسا ہونا چاہیے تھا۔ کیونکہ وہیں کا رہنا سہنا ہے۔ کام کاج۔ آنے جانے میں اور ہر موقع کا اتا پتا بتانے میں جدا جدا جگہ کے واسطے جدا جدا نام چاہیے ہیں۔ اس سے زبان کی وسعت معلوم ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو کاروبار میں ہرج ہوتے۔ مثلاً کمر کوہ۔ دامن کوہ۔ تیزئے کوہ۔ تیغ کوہ۔ بینی کوہ۔ قلہ کوہ۔ درہ کوہ اور کوہ پایہ۔

اسی صورت حال کو اور موسم کی کیفیت کو دیکھ کر ملک کے شاعر نے کہا:

برآمد زکوہ ابر کافور بار مزاج زمیں گشت کافور خوار
آفتاب از کوہ سر بر میزند ماہ من انگشت بردر میزند
(سعدی)

ملا محتشم کاشی نے مرثیہ میں کہا:

چوں شد بہ نوک نیزہ سر آں بزرگوار خورشید سر برہنہ برآمد ز کوہسار

دیکھو وہ ایک صاحب زبان کا خیال تھا جو کہ خالص خیال ہند تھا۔ میر انیس مرحوم ہند کے شاعر تھے انہوں نے اسی خیال کو رنگین کیا:

تھا بسکہ روز قتل شہ آسماں جناب نکلا تھا خود ملے ہوئے چہرہ پہ آفتاب

اور کسی اہل زبان نے بڑھاپے کے سر کو دیکھ کر کہا "آفتاب بر سر کوہ است"۔ یاد کرو شعر مذکورہ بالا: "مرا برف بارید، بر پر زاغ"۔ تم نے دیکھا اس طرح ایک زبان بتاتی ہے کہ میرے بولنے والے کن خیالات کے لوگ ہیں؟ اور میں کس ملک کا سبزہ خودرو ہوں؟۔

اگرچہ چار موسم اپنا اپنا لطف جدا جدا رنگوں میں دکھاتے ہیں مگر عموماً ہر موسم میں زمین سرسبز اور شاداب ہی دکھائی دیتی ہے۔ خشک یا شورزار قطعہ بہت کم نظر آتا ہے۔ جدھر دیکھو ہریاول لہلہاتی ہے اور سبزہ ہوا سے پانی کی طرح لہریں مارتا ہے۔ سبزی جتنی تیز ہے اس سے سوا گلریز ہے۔ درخت جتنے ہرے ہیں اس سے زیادہ پھولے پھلے ہیں۔

جو ہوا آتی ہے صبا ہے یا نسیم ہے۔ بو آتی ہے تو نگہت ہے یا شمیم ہے۔ آسمان بھی یہ آسمان نہیں۔ جب دیکھو رنگ نکھرا ہوا ہے۔ اسی کو دیکھ کر کہتے ہیں۔ چرخِ فیروزی، چرخِ مینائی، فلکِ مینا رنگ، چرخِ آئینہ فام، آبگون، آبگینہ رنگ، چرخِ نیلی، چرخِ نیلگوں، گوئے لاجور، اور گنبدِ لاجوردی، وغیرہ حق پوچھو تو یہ الفاظ اسی آسمان کے لیے زیبا ہیں نہ کہ فلکِ ہند کے لیے جس کے نیچے سدا خاک اڑے۔

بلبلِ ہزار داستان کا زمزمہ اور تدرو کا قہقہہ ناحق مشہور ہو گیا ہے۔ وہاں ہزاروں جانور ہیں۔ جو ہے اپنی ٹہنی پر بلبل اور آشیانہ پر ہزار داستان ہی ہے۔ خوش رنگ ایسے ہیں کہ شوخی آنکھوں کو قوت دیتی ہے۔ وہاں کی چڑیا کا رنگ بھی ڈہڈہاتا ہے۔ نہ کہ ہندوستان کی چڑیا جس کے بھوسلے رنگ سے خاک جھڑتی ہے۔ چرندوں کو دیکھو تو غزال و آہو۔ ہرنیاں۔ گوزن۔ گورخر، نیلہ گاؤ وغیرہ خوشنما جانور دامنِ دشت اور دامنِ کوہ میں قلاچیں مارتے پھرتے ہیں۔ اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ خواجہ حافظ نے کیا کہا ہے۔ اور کس عالم میں کہا ہے:

صبا بہ لطف بگو آں غزالِ رعنا را کہ سر بکوہ و بیاباں تو دادہ مارا

پہاڑوں کے چشمے میدانوں میں نہریں بہاتے ہیں اور شہروں میں پانی پہنچاتے ہیں۔ گھر گھر گنگا بہہ رہی ہے۔ کوئی مکان ایسا نہیں جہاں پانی جاری نہ ہو۔ ان کی انشاپردازی سے ٹپکتا ہے کہ قدرتی خوشنمائیاں ہر وقت سامنے ہیں۔ اور وہی لوگ ہیں کہ مزے لے لیکر ان پہاڑوں کے لطف اٹھاتے ہیں۔ شستہ الفاظ۔ عمدہ ترکیبیں۔ لطیف اشتقاق۔ نازک خیالات۔ پاک تشبیہیں اور استعارے تراشتے ہیں۔ مثلاً آب رو (عزت)۔ اکنوں معاملہ اش آبے بر روئے کار آوردہ" (اب اس کے کام نے ذرا رونق بہم پہنچائی ہے) اور کہتے ہیں۔ "پیش فلانی رفتیم۔ دیدیم در عالم آبست۔ پشیماں شدیم و برگشتیم" (یعنی شغل شرابخوری میں تھا یا مست تھا) آبش از سر گزشتہ است (خرابی حد تدارک سے گزر گئی ہے) آب در دیدہ ندارد (بے حیا ہے)۔ آب در جوال میکوبد۔ آب بہ غربال می پیماید۔ آب در سبد میکند۔ میخواہد آب بر ریسماں بندد (بے فائدہ کام کرتا ہے) تم جانتے ہو۔ پانی پر تیل ڈالتے ہیں تو اوپر جاتا ہے۔ اسی بنا پر۔ جب کوئی ظاہر میں دوستی

دکھاتا ہے اور چکنی چپڑی باتیں بنا کر مطلب نکالنا چاہتا ہے تو کہتے ہیں۔ "بازی نخوری آغا۔ ایں روغنے ست کہ بر روئے آب پاشیدہ۔ معاملہ اش آب در میان دارد (اس میں کچھ دغا ہے)" "پرحذر باشی از فلانی کہ آبے ست در زیر کاہ"۔ تم نے بھی اکثر برسات میں دیکھا ہوگا۔ میدان میں پانی پھیلا ہوتا ہے۔ تم ایک ہری گھاس پر قدم رکھتے ہو کہ نیچے زمین ہے۔ پاؤں رکھا تو غڑپ پانی میں جا پڑا۔ اسی واسطے جس شخص کا ظاہر خوشنما اور باطن خراب ہوتا ہے۔ کہتے ہیں۔ "آب زیر کاہ ست"۔ تنک آب (کم ظرف)۔ دریا سے جلد عبور کر جانے کے موقع پر کہتے ہیں۔ "ہمچو باد از روئے آب گزشت"۔ پانی کی بہتات نے بہت سے عمدہ وصف اپنے موصوفوں کے لیے پیدا کیے اور انشا پرداز نے کہا۔ شعر تر۔ نغمہ تر (مزہ دار شعر یا نغمہ) گوہر تر (آبدار موتی) تردست (صنعتگر کامل یا سخی) تر زبان (فصیح) وغیرہ وغیرہ۔

پانی کی مختلف حالتوں اور کاموں کے سبب سے بہت کہاوتیں نکل آئیں۔ مثلاً آب آمد تیمم برخاست۔ آب ندیدہ موزہ کشیدہ۔ وغیرہ وغیرہ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پانی کی کثرت نے انہیں قدرتی چشموں کی طرح زبان سے جاری کیا ہے، جس سے ہماری طبیعتیں بالکل محروم ہیں۔ بابر نے اپنی توزک میں یہ نکتہ خوب کھولا۔ لکھتا ہے "اہل ہند کے دل ان کیفیتوں سے ایسے بے مذاق ہیں کہ اگر سیر و سفر میں ہوں اور اتفاقاً آب رواں کے کنارے آن اتریں تو ادھر خیمہ کی پشت کرتے ہیں۔"

وہ شگفتہ مزاج لوگ اپنے دلوں کو ہمیشہ انہی گلزاروں میں شگفتہ رکھتے ہیں اسی واسطے طبیعت بات بات میں شگفتگی دکھاتی رہتی ہے۔

یہی سبب ہے کہ خوشی نے اپنے اصلی معنوں سے بڑھ کر بہت سے معنوں پر قبضہ کر لیا۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ کباب خوش نمک اور طعام خوش نمک (جس میں اعتدال سے نمک ہو) اور خوب اور اچھا۔ خوش انگشت۔ خوش نواز (اچھا ستار بجانے والا) خوش خواہش۔ خوش کام۔ معشوق خوش کنار۔ گوہر خوش آب۔ خوشنما۔ خوش جلا۔ خوش نظر۔ خوش طینت۔ خوش نہاد۔ خوشرو۔ اسی طرح شاداب۔ شاد بہر۔ شاد کام۔ وغیرہ وغیرہ اس طرح کی بیسیوں ترکیبیں ہیں۔

لطیفہ۔ شاہ طہماسپ کے حضور میں حکیم حسن گیلانی اول روز باریاب ہوا تو نوجوان اور نہایت حسین تھا۔ بادشاہ نے حال پوچھا اور مسکرا کر: "ہم ما خوش طبیبے ست بیا تا ہمہ بیمار شویم" اور کثرت کے معنی بھی پیدا کرتا ہے۔

چنانچہ مرد خوش برگ (بسیار سامان) درخت خوش ثمر۔ باغ خوش حاصل۔ زمین خوش حاصل اور سر خوش اور دل خوش میں اور ہی لطف پیدا ہوتا ہے۔ خوش سودا۔ خوش حساب۔ خوش معاملہ اور ہی معنے دیتا ہے۔ خوش غلاف وہ تلوار کہ ذرا سے اشارہ میں میان سے نکل آئے۔

خورم۔ مرکب ہے۔ خور۔ رم۔ سے۔ اس کے معنی سر سبز و شاداب کے ہو گئے۔ اسی سے عہد قدیم میں۔ خورم روز ایک عید کا نام تھا۔ پھر خورم گاہ اور مکان خورم اور فضائے خورم اور گلستان خورم و دلکش۔ اور خورم روئے۔ خوبصورت وغیرہ وغیرہ بہت سی ترکیبیں پیدا کیں اور اسی طرح شگفتہ رو، شگفتہ مزاج۔ شگفتہ طبع۔ شگفتہ کلام اور زمین شگفتہ اور جبین شگفتہ وغیرہ وغیرہ۔ انہوں نے شہر شہر میں لطف و خوبی کی حالت اور وقت

کی لطافت کو انتخاب کر کے کیا ہے اور شعرا نے ضرب المثل کر کے نظم کیا ہے کہ زباں زد خاص و عام ہے:

علی الصباح نشاپورو خفتن بغداد نماز دیگر مرو نماز شام ہرات

اور ہندوستان میں اس کے مقابل صبح بنارس اور شام اودھ ہے۔ غریب سے غریب ہو گا۔ مگر گھر میں ہو گا تو گھر کو قدرتی سنگاروں سے سجائے گا۔ باہر جائے گا تو آب رواں کی سیر اور گلگشت سے جی بہلائے گا۔ لفظ گلگشت کی ترکیب دلالت کرتی ہے کہ ان کی چہل قدمی گلزاروں میں واقع ہوتی ہے۔ یہی شگفتگی ان کے مزاجوں کو شگفتہ رکھتی ہے کہ ہفتہ دو ہفتہ بعد ملا شاعر سوداگر پیشہ ور غرض اپنے اپنے ڈھنگ کے ہم طبع اور ہم نفس باغوں میں جاتے ہیں گھروں سے سامان لے جاتے ہیں۔ درختوں کے نیچے آب رواں کے کنارہ چبوترے بنے ہوتے ہیں ان پر یا جہاں موقع کی جگہ پاتے ہیں فرش بچھاتے ہیں۔ سامنے مرغزار ہرے ہیں۔ دامن کوہ لالہ و گل سے بھرے ہیں۔ پہلو میں

پلاؤ دم ہو رہا ہے۔ ایک طرف کباب لگے ہوئے۔ چائے کی پیالی چل رہی ہے۔ شعر خوانیاں ہو رہی ہیں۔ زمزمے اڑ رہے ہیں۔ دو تین دن زندگی کا لطف اٹھاتے ہیں اور چلے آتے ہیں۔ عرفی کہتا ہے:

فصل گل رفت عبث حیف شرابے نہ زدیم
بہ کباب جگر خود نمک آبے نہ زدیم
اشک خوں گشت سرچشمہ چشم بہ امید
خیمہ بر آب رواں ہمچو حبابے نہ زدیم

جن لوگوں نے دامن کوہ نہ دیکھا۔ اس میں چشمہ کا رساؤ نہ دیکھا۔ دامن صحرا میں بہاؤ نہ دیکھا۔ انہیں کیا مزا آئے گا کہ اشک کا آنکھ سے بہنا اور چشمہ سے پانی کا رسنا کیسی تشبیہ ہوئی۔

میووں کی آبداری اور شادابی کا یہ عالم ہے کہ منہ میں ڈالو تو شربت ہوئے جاتے ہیں۔ پھوگ کا نام نہیں۔ خربوزہ کاٹو تو شیرہ اور شربت پڑا بہتا ہے۔ نزاکت کا یہ حال ہے کہ پکی ہوئی فالیز کے برابر سے سوار گھوڑا مارے نکلتا ہے تو دہقان بچارا ہاتھ باندھے دوڑا آتا ہے کہ برائے خدا گھوڑا نہ دوڑاؤ دھمک سے میرے خربوزہ پھٹ جائیں گے۔ انگوروں کے خوشے جب درخت سے کاٹتے ہیں تو دانے پھوٹ پھوٹ کر رس کے سرائے بہتے ہیں۔ وہاں کے چقندر یہاں کے شلغموں سے بڑے ہوتے ہیں۔ جوش کر لیتے ہیں یا بھوبل میں دبا دیتے ہیں۔ صبح کو چنگیریوں میں رکھ کر گلی کوچوں میں پھانکیں کاٹ کاٹ کر بیچتے ہیں۔ مٹھاس کا یہ عالم ہوتا ہے کہ ان کے عرق کا قند بناتے ہیں۔ سفیدی میں برف اور لطافت میں ہمارے قند سے بہتر ہوتا ہے۔ چھوٹی چھوٹی سی کلھاڑیاں ہوتی ہیں ان سے توڑتے ہیں۔ رات کے وقت اس پر چوٹ لگاتے ہیں تو آگ کے پتنگے اڑتے ہیں۔ اسی بنیاد پر صدہا محاورے اور اصطلاحیں شیرینی کی پیدا ہو گئی ہیں۔ ہر ایک نایاب اور خوشنما اور خوش آئند چیز کو شیریں کہتے ہیں۔ خوش حرکات اور خوش مزاج بچہ کو کہتے ہیں۔ عجب بچہ شیرینے ست۔ اور خواب شیریں: میٹھی نیند۔ معشوقہ کا نام شیریں۔ معشوق کی صفت میں شیریں حرکات۔ شیریں شمایل۔ شیریں کار۔ شیریں

خرام۔ شیریں بہانہ۔ شیریں ادا۔ شیریں کلام۔ شیریں مقال۔ وغیرہ وغیرہ بہت سی ترکیبیں پیدا کی ہیں اور دجش شیریں کن (یعنی کچھ رشوت دو)۔ شیریں کار (جو شخص اچھے اچھے کام کرے)۔ شیریں باف (ایک بہت اچھا کپڑا ہوتا ہے) شکر و قندی شکند (عجب میٹھی میٹھی باتیں کرتا ہے) صحبت ہمہ گر شیر و شکر است (ان کی خوب مزے میں گزرتی ہے) شکر خواب (خواب خوش)۔ شکر ریز (دلہن کا نچھاور۔ اور وہ اکثر شگون کے طور پر مٹھاس کی قسم سے ہوتی ہے) غرض کہ قند اور شکر کی ترکیب سے سینکڑوں میٹھی میٹھی اصطلاحیں اور محاورے نکالے ہیں زبان میں مہارت پیدا کرو اور اہل زبان کے کلام پر عبور کرو۔ پھر ان بیانوں کو ان سے مطابقت دو تو لطف حاصل ہو۔

اس ملک کو نگار خانہ قدرت کہیں یا صنعت خانہ الٰہی سمجھیں۔ قلمدان میں جس قدر آب و رنگ الفاظ و عبارت کے تھے اس کے نقشہ میں لگا دئے مگر دل کا ارمان نہیں نکلا۔ خیر۔ مجھے ملک کا زبان ملک سے تعلق دکھانا ہے اس کے لیے اتنا کافی ہے۔ اب اس نقشہ کو لپیٹنا چاہیے اور اس مضمون پر خیال لگانا چاہیے کہ اس رنگین زبان کی طرز کو اور زبانوں کی طرز سے کیا نسبت ہے۔

آٹھواں لکچر

زبان فارسی کا انداز اور زبانوں کے انداز سے کیا نسبت رکھتا ہے۔

آج کا لکچر اس مضمون پر ہے جو فارسی کے عالم کا نفس ناطقہ ہے۔ جو لکچر اب تک دیے گئے وہ گویا فرش۔ میزیں، کرسیاں اور لیمپ تھے کہ ان پر آج کا مضمون جلوۂ زیبائی دکھائے۔ اس زبان کی تعریف میں ایشیائی زبانوں کے اہل ذوق کبھی کہتے ہیں کہ "فارسی شکراست ترکی ہنر است۔ ہندی نمک است۔" لطف یہ ہے کہ یورپ کے زبان دانوں نے بھی اس کی طرز ادا کو مانا ہے اور لکھا ہے کہ چند اوصاف خاص نے اسے دنیا کی زبانوں پر فوقیت دی ہے۔

(1) ایک ان میں سے کہتا ہے کہ ایشیائی زبانوں میں اسے وہی رتبہ حاصل ہے جو یورپین زبانوں میں فرنچ زبان کو حاصل ہے۔ اسے خدا نے الفاظ دیے اور الفاظ کی ترکیب میں ایسا اثر دیا ہے کہ جس مطلب کو ادا کرتی ہے دل کا ارمان پورا کر دیتی ہے۔

(2) ایک فرنچ صاحب زبان کہتا ہے [37]۔ اس میں نہ شبہ ہے نہ مبالغہ۔ کہ فارسی عمدہ زبانوں میں دلپذیر زبان ہے۔ اس کے خزانے مجاز اور استعارات و کنایات اور عمدہ محاوروں سے مالا مال ہیں۔ وہ اپنے سرمایہ سے ہر قسم کے مضمون کو ایسے قالب میں ڈھال لیتی ہے جو اس کے لیے ٹھیک مناسب اور زیبا ہے۔ اس کی لیاقت السنہ مشرقیہ میں شاعری اور انشا پردازی کے لیے بالطبع مناسب ہے اور ان چٹکلوں کے ڈھالنے کے لیے نہایت قابل ہے۔ اس کی باتیں میٹھی ہیں اور صرف و نحو کے قاعدے سیدھے سادھے ہیں۔

(3) ایک دانائے فرنگ کہتا ہے: قدرت نے اسے گلزار زمین، پر بہار ہوا سے شگفتگی طبع کے لیے ایسے سامان دیے ہیں کہ انشا پردازی کے لیے قلم اور رنگ کا کام دیتے ہیں۔ فصیح فارس وہاں بیٹھتا ہے اور الفاظ و عبارت کی رنگ آمیزی سے بہار کی

کیفیت، حسن کا جوبن، عشق کا غم، دل کی وحشت، فراق کی حسرت اور طبیعت کی اداسی وغیرہ وغیرہ مضامین کو حد سے گزار دیتا ہے اور وہ خیالات مذکورہ میں مقید نہیں۔ شاہنامہ کو دیکھو۔ میدان جنگ میں قیامت آ رہی ہے۔

(4) قدرت نے اس کے لفظوں کے جوڑ وبند اور ترکیب کے سلسلے ایسی لطافت سے مسلسل کیے ہیں کہ پڑھنے والا اگر ذرا بھی سلیقہ رکھتا ہو تو نا سمجھ کے کان بھی اس کی آواز سے مزا لے سکتے ہیں۔

(5) اصول زبان کے ماہر کہتے ہیں کہ ہر زبان اپنے الفاظ کے معنوں سے ادائے مطلب کرتی ہے۔ اس کے الفاظ فقط باہمی ترکیب سے عجیب اور لطیف معنے پیدا کرتے ہیں۔ یہ وصف اور زبانوں میں بھی ہے مگر بہت کم اور اس میں بہت زیادہ۔

(6) اس کے بیان میں استعارہ اور تشبیہ کے قبول کرنے کا قدرتی مادہ ہے۔ فصیح فارس ان سے ایسے لطائف، ظرائف، نکیلے کنائے۔ اور چبھتے ہوئے اشارے پیدا کرتا ہے کہ نثر میں نظم کا مزا آتا ہے۔

(7) اس کی پرانی تصنیفات کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی قدرتی طاقت سے ہر مطلب کی اصلیت کو کم لفظوں میں، صاف عبارت میں اور چھوٹے چھوٹے فقروں میں ادا کر دیتی ہے جسے سن کر ہر دل سے آواز آتی ہے کہ بے شک حسن خداداد کو بناؤ سنگار کی کچھ احتیاج نہیں ہے۔

آزاد کو فارسی زبان کا اور زبانوں سے امتیاز دکھانا ہے اس لیے اس میں گفتگو کرتا ہے اور فخر کے ساتھ کہتا ہے۔

(1) ہر زبان ضرورت کے وقت دوسری زبان کے لفظوں کو لیتی ہے اور کبھی بے تصرف، کبھی بے تصرف کام لیتی ہے۔ لیکن فارسی میں جس قدر وسعت اس استعمال کی ہے اور زبانوں میں نہیں۔ اس سے میری مراد تعریب و تفریس نہیں۔ وہ اور اس قسم کی تبدیلیاں الگ لیکچر میں بیان کروں گا۔ یہاں مجھے دکھانا اس امر کا ہے کہ فارسی غیر زبان کے لفظ لیکر کیسے نئے معنی اور معنوں میں لطافت اور نزاکت پیدا کرتی ہے۔ دیکھو!

ذوق عربی لفظ ہے جس کا ترجمہ ہے: چشیدن۔ فارسی میں "ذوق کردن" سے جو

کیفیت دل میں پیدا ہوتی ہے۔ کسی طرح لفظوں میں ادا نہیں ہو سکتی۔ مثلاً آزاد اپنے سیاحت نامہ میں کہتا ہے: "در شیراز روزے بر قبر خواجہ حافظ رفتم فاتحہ میخواندم کہ مطلع خواجہ بخاطرم گزشت:

در نمازم خم ابروئے تو تا یادآمد حالتے رفت کہ محراب بہ فریاد آمد

کیفیتے طاری شد کہ شرح آنرا حوصلہ بیان بر نمی تابد اینقدر می دیدم کہ لب خندان است ودیدہ گریاں ودل از ہر دو بر کراں۔ تا کہ بمنزل رسیدم میخوندم۔ وذوقہا میکردم"۔

اب خیال کرو اس محاورہ نے تمہارے دل پر کیا اثر کیا ہے اور اس کا ترجمہ کیا ہو سکتا ہے۔

کبھی اسی موقع پر کہتے ہیں۔ "میخوندم ووجد میکردم"۔ وجد کے معنے عربی میں ہیں۔ یافتن۔ محاورہ میں آکر وہ بھی ایسے ہی گومگو معنے پیدا کرتا ہے۔

تماشا عربی میں کئی آدمیوں کا مل کر چلنا ہے۔ اب دیکھو اہل زبان کیا کیا تماشا دکھاتے ہیں:۔

آنکہ دائم ہوس سوختن ما می کرد کاش می آمد و امروز تماشا می کرد

خوش گلشنے ست دہر کہ گلچین روزگار فرصت نمی دہد کہ تماشا کند کسے

تو نیز بر سربام آکہ خوش تماشائیست

جلوہ عربی لفظ ہے۔ جس کا ترجمہ ہے: نمودن وعرض کردن خویشتن را۔ فارسی میں آکر اپنی ترکیب سے بڑائی اور خود نمائی اور خوشنمائی کے معنے پیدا ہوتے ہیں۔ کبھی کہنے والا کسی کے کبر وغرور پر طنز کرتا ہے۔ چنانچہ ایک جلا بھنا سائل کسی امیر سے انعام میں ایک جبغہ لیکر کہتا ہے: "مرد کہ بہ جامہ کہنہ سخاوت خودرا جلوہ داد"۔

کبھی ایک خوش مزاج تمسخر سے دل خوش کرتا ہے اور کہتا ہے۔ "در جلسہ مشاعرہ رفتہ بودم۔ مردم غزلہا خوندند۔ ماہم بہ پنج شعر فصاحت خودرا جلوہ دادیم"۔

پریزادوں کے جلوہ میں جو خوش ادائی کے انداز ہیں۔ جاننے والوں کے دل جانتے ہیں۔

حاشا عربی میں کبھی بمعنے: دور شد۔ کبھی "مگر" کبھی "خالی" وغیرہ آتا ہے۔ مگر فصیح فارس۔ اپنے جوش میں ایک بد معاملہ نادہند کی شکایت کرتا ہے۔ "از من پول نقد گرفت۔ وبہ ہزار منت گرفت۔ قسمہا یاد کرد۔ وخدا اور میان داد۔ امروز کہ گفتم۔ مرد کہ حاشا زد"۔ یعنی مکر گیا۔

ان ترکیبوں کی گنجائش۔ جیسی زبان فارسی میں ہے۔ دوسری زبان میں نہیں ہے۔

(2) زبان فارسی کے اسم بھی مختلف فعلوں کے ساتھ مل کر ایسے اوصاف عجیب رنگ سے ظاہر کرتے ہیں۔ مثلاً:

خوش کردن	پسند کرنا۔ انتخاب کرنا
تر آمدن	شرمانا
گل کردن	ظاہر ہونا
سر کردن یا شدن	شروع کرنا۔ اور ہونا
تن زدن	چپکا ہونا۔ در گزر کرنا
سر آمدن	تمام ہونا
دراز کشیدن	لیٹنا

(3) اس کے فعل بھی ہر ایک اسم کے ساتھ مل کر نئے معنی پیدا کرتے ہیں۔ تیس، چالیس، اور پچاس بلکہ اس سے بھی زیادہ نوبت پہنچ جاتی ہے۔ دیکھو:

کشیدن۔ اصلی معنوں پر مختلف طور سے مستعمل ہوتا ہے: "کہ زر زر کشید درجہاں گنج گنج"۔ کماں کشیدن اور دانہ کشیدن اسی سے ہے اور پھر مور دانہ کش۔ ارہ کشیدن۔ کشتی کشیدن وغیرہ۔

کبھی لکھنا مراد ہوتا ہے۔ مثلاً خط کشیدن۔ صورت کشیدن۔ طغرئی کشیدن۔ کبھی اٹھانے کے معنی پیدا کرتا ہے۔ (1) حقیقی: مثلاً بار کشیدن اور بردوش کشیدن (2) مجازی: مثلاً ناز کشیدن، جفا کشیدن اور شرم کشیدن۔

کبھی کھانے کے اور کبھی پینے کے معنی پیدا کرتا ہے۔ مثلاً شراب کشیدن، کباب کشیدن، زہر کشیدن۔

بہ معنی کردن: جیسے نظر کشیدن، مشق کشیدن، قیمہ کشیدن اور اتو کشیدن۔ بچھانا اور تاننا: مثلاً خوان کشیدن، سفرہ کشیدن، دام کشیدن اور فرش کشیدن۔

بہ معنی بر آوردن۔ مثلاً طعام از دیگ کشیدن۔ چہ کشیدن۔ خار از پا کشیدن۔

بستن: مثلاً کمر کشیدن، زین کشیدن، پردہ کشیدن اور نقاب کشیدن۔

پرونا: مثلاً گوہر در گوش کشیدن۔

بنا کردن: مثلاً حصار کشیدن اور دیوار کشیدن۔

باندھ لینا: بہ زنجیر کشیدن۔

ترتیب دادن و آراستن: انجمن کشیدن، بزم کشیدن اور بازار کشیدن۔

بلند کردن: مثلاً خیمہ کشیدن۔ بارگاہ کشیدن اور گردن کشیدن۔

زدن: مثلاً جاروب کشیدن اور حرف کشیدن۔

غوطہ دینا: مثلاً جامہ در نیل کشیدن اور آب کشیدن جسے ہندی میں کھنگالنا کہتے ہیں۔

دراز کردن: یا شدن: مد کشیدن، خط کشیدن اور حرف کشیدن۔

تولنا: بہ ترازو کشیدن۔

پہننا: رخت در بر کشیدن، لیکن از تن کشیدن۔ اتارنا ہے۔

باز کشیدن: عناں باز کشیدن، روک لینا۔

کبھی۔ انقضائے مدت مراد ہوتی ہے۔ مثلاً چلہ کشیدن اور یک ماہ کشید و یک سال کشید۔ رنگ کشیدن: رنگ پھیرنا۔

بعض مصدر مثلاً زدن وغیرہ ہیں کہ صدہا معنی دیتے ہیں اور دس پندرہ یا بیس تو بہت پیدا کر دیتے ہیں۔

(4) اس کے حرف بھی ایسی ہی خاصیت ظاہر کرتے ہیں۔ دیکھو:

بر خوردن	سر رلو ملاقات ہو جانی	رو ساختن	شرمانا
در افتادن	لڑ مرنا	رو کشیدن	سامنا کرنا
بر افتادن	گر پڑنا	نفس سوختن	دم چڑھنا
بر کردن	چراغ روشن کرنا		

در فتن: گھسڑ جانا اور تفنگ در رفت: خود بخود چھٹ گئی۔ پاش در رفت: پھسل گیا۔ بر آمدن: گھر سے نکلنا۔ سر بام بر آمدن: چڑھنا۔

در گرفتن صحبت: اس کا دلچسپ اور موافق ہونا۔ در گرفتن آشنائی: تپاک اور گرمجوشی محبت۔

در گرفتن سودا: یعنی سودا بن گیا اور خوب نفع ہوا وغیرہ وغیرہ۔ شیخ سعدی ایک جلسہ میں وعظ کہتے کہتے فرماتے ہیں۔ "دیدم کہ نفسم در نمی گیرد"۔ یعنی میری بات ان کے دل میں اثر نہیں کرتی۔

در گرفتن آتش: آگ کا جل اٹھنا۔ در گرفتن چراغ: اس کا بھڑک اٹھنا۔ اور مجازاً: در آتش شوق در گرفتن۔ بہ آتش قہر در گرفتن۔

دوسرا وصف: زبان فارسی میں اکثر الفاظ ہیں جو ناواقف آدمی کو مفرد یا جامد معلوم ہوتے ہیں۔ در حقیقت مرکب ہوتے ہیں اور باعتبار مناسبت معنی کے انھیں اصل شے کے ساتھ عمدہ تعلق ہوتا ہے مثلاً مردمک۔ تصغیر ہے مردم کی۔ اصل میں آدمی کو کہتے ہیں اور آنکھ کی پتلی کو بھی کہتے ہیں۔ وجہ یہ کہ جب تم اسے دیکھو تمھاری تصویر تمھیں دکھائی دیتی ہے اور وہ بھی تمھاری طرح ہر ایک چیز کو جو سامنے آئے دیکھتی ہے۔ اس لفظ میں عجیب لطف یہ ہے کہ عرب نے اسے انسان کہا۔ ہند نے پتلی کہا۔ فرنگ نے اسے Pupil کہا۔

زمین: اہل لغت کہتے ہیں کہ زم بہ معنی خنک ہے۔ چونکہ جوہر زمین خنک ہے اس لیے "ی ان" نسبت کا لگا کر کرہ خاک کا نام زمین رکھا اور سنسکرت میں "جیا" زمین کو کہتے ہیں کہ جیتی جانوں کا مقام ہے۔ کیا عجب ہے کہ فارسی میں بھی۔ زی۔ زیستن سے ہو۔ "ی ان" نسبت کا لگایا۔ زیوین ہو کر زیمین اور پھر زمین ہو گیا۔

بیزار۔ بیز آر۔ بیز: فارسی قدیم۔ سیری یعنی دل بھر جانا ہے اس پر "آر" لگا کر بیزار بنا لیا۔

پشیمان: پشم۔ لغت قدیم میں بہ معنی برکندگی وجدائی تھا۔ ان لگا کر پشیمان کر لیا اور یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی کام کر کے انسان پچھتاتا ہے تو اس سے دل اکھڑ جاتا ہے۔

آباد۔ لغت قدیم میں بہ معنی ستائش، آفرین اور بارک اللہ ہے اور مقابل ہے ویران۔ اور خوش اور خوب اور نیک اور پیغمبران عجم میں سے پہلے پیغمبر کا نام بھی آباد تھا۔ مرکب ہے۔ آب + آدہ سے۔ آدہ حرف نسبت ہے جیسے پیادہ (پے آدہ) وغیرہ میں۔ چونکہ آب خمیر مایہ رحمت الٰہی کا ہے اور اس کے معنے رونق اور قدر و منزلت کے بھی ہیں۔ اس لیے شہروں اور بسے ہوئے مقاموں کا نام آباد ہوا کہ بارونق ہیں اور اسی واسطے اہل معنی کے لیے، کہ مظہر ہیں رحمت و برکات کے بلکہ محرک ہیں ستائش اور نیائش الٰہی کے اور مورد ہیں تحسین و آفرین کے، یہ لفظ مستعمل ہوا اور طریق تمدن گواہی دیتا ہے کہ ابتدائے آفرینش میں جبکہ اولاد آدم بڑھی ہوگی اور بہ سبب کثرت کے اطراف عالم میں پھیلی ہوگی تو سرسبز اور شاداب زمینوں میں سکونت اختیار کی ہوگی۔ اسی بنیاد پر مکانات معمور نے "آباد"۔ نام پایا ہوگا اور اسی نسبت سے بیابان (بے آبان) یعنی بے آب و گیاہ اور غیر آباد جنگل۔ اسی طرح بیاد، پیادہ وغیرہ اور مرغزار اور بازار۔

(2) اکثر الفاظ مشتق ہیں مثلاً:

کمان: مبدل ہے خمان کا۔ اور یہ نام اس لیے ہوا کہ خمدار ہے۔

کمند: مبدل ہے۔ "خمد"۔ کا کہ اصل میں۔ "خم وند"۔ یا "خمندہ" تھا۔ سبب یہ ہے کہ اسے اسی طرح لپیٹ کر زین کے پیچھے لٹکاتے ہیں جس طرح بہتے ڈول کی رسی کو۔

کودک: نجاست کے ڈھیر کو۔ "کود"۔ کہتے ہیں۔ اسی سے ہے کودک کہ بچہ بھی نجاست کے نکالنے میں بے اختیار ہوتا ہے۔

ریدک: مشتق ہے۔ "ریدن"۔ سے وہی سبب اس نام کا ہے جو اوپر ظاہر ہوا۔

نوش: حاصل بالمصدر ہے۔ "نوشیدن"۔ سے۔ چونکہ شہد و شربت اور آب حیات اور ہر قسم کی شیرینی طبیعت کو کھانے پر راغب کرتی ہیں۔ اس لیے شیرین کو۔ "نوش"۔ کہا گیا۔

تیغ: مبدل ہے۔ "تیز"۔ کا۔ تلوار کو اس لیے کہتے ہیں کہ تیز ہے۔

(3) کبھی یہ زبان دو اسموں کی ترکیب سے معنوں میں لطافت مذکورہ پیدا کرتی ہے مثلاً سبک روحی: لطافت طبع اور ترقیات معنوی کی لیاقت۔ گراں جانی اس کے برخلاف۔

دل تنگی: غمگینی۔ پامردی: استقلال ہمت و مروت۔ پاداری: استقلال۔ خاکساری: فروتنی: عجزوانکسار۔ رگ گردن کے بارے میں اہل زبان کہتا ہے: "فلانی رگ گردنے دارد کہ ہیچ خنجرش نتواں برید"۔ سبک سری: بے وقوفی۔ سرگرانی: دردسری۔ غصہ: ناراضی۔

(4) اکثر افعال کے لیے مصدر موجود ہیں۔ مگر وسعت زبان نے کئی لفظ ملا کر وہی معنے پیدا کیے اور یہ لطافت طبع اور نزاکت خیالات کا نتیجہ ہے کہ اور زبانوں میں کم ہے۔ مثلاً:

پریدن: پرواز کرد۔ رو بہوا نہاد۔ سر در ہوا شد۔ بال در ہوا کشاد۔ بہ ہوائے شوق۔ بال کشاد۔ رو بہو آورد۔ سر در ہوا کشید۔ پر پرواز کشاد۔ سر بہوائے شوق نہاد۔ بال طیراں کشاد۔

اطاعت کردن: سر تسلیم نہادن، گردن نہادن، سر بر خط فرماں نہادن، فرمان بردن، حکم برداشتن اور بجا آوردن۔

برہم شدن: بر خود پیچدن، بر خویش پیچیدن، خشم گرفتن اور دماغ سوختن۔

رفتن: راہ طے کردن، گام زدن، قدم زدن، چالش کردن، مسافت پیمودن، رہ پیمودن، پابرداشتن۔ حرکت کردن اور "راہ نوردیدن" کو دیکھنا گویا قدم بر قدم کپڑے کا تھان تہ کرتا چلا جاتا ہے۔

سفر کردن: رخت کشیدن، راہ غربت گرفتن، قدم بہ وادی غربت نہادن، سر بصحرا کشیدن، سمند سفر را زین نہادن، راہ نوردیدن، راہ سفر پیمودن، سفر گزیدن، غربت گزیدن، دل از وطن برداشتن، دل از خانہ بر کندن اور راہ غربت پیمودن۔

(5) زبان فارسی بے مدد استعارہ و تشبیہ کے بھی اکثر مطالب کو ایسے خوشنما رنگوں میں دکھاتی ہے کہ ہر مطلب ایک خوشنما نکتہ نظر آتا ہے۔ حقیقت میں دیکھو تو کچھ بات ہی نہیں:

"روغن از کدوے خشک برمے آرد۔ روغن از سنگ میکشد"۔ یعنی اپنی محنت اور ہمت سے ایسی جگہ سے مطلب حاصل کرتا ہے جہاں سے ممکن نہ ہو۔

ریگِ بیاباں "پیمودن"۔ امرِ بے حاصل مراد ہوتا ہے مگر دیکھو اسے کس کس طرح کام میں لاتے ہیں:

مجنوں بہ ریگ بادیہ غمہای دل شمرد   یادآں زمانہ کہ غمِ دل حساب داشت

باد پیمودن: آہن سرد کوفتن اور دام بر ہوا انداختن وغیرہ اصطلاحوں کو عجیب عجیب لطف سے استعمال کرتے ہیں۔

امریست پیش پا افتادہ۔ امر سہل اور کار آسان۔ آب در جگر داشتن۔ آبے در جگر داشتن۔ کم وبیش طاقت یا ہمت۔ مثلاً تاکہ آبے در جگر داشتم رفاقت کردم۔ یا تاکہ آبے در جگر داشتم دست وپائے زدم۔ یعنی جب تک طاقت رہی اس کا ساتھ دیا۔

چوں کار دبا ستخواں رسید خودرا بر کنار کشیدم۔ جب جان پر آبنی تو مجبور الگ ہو گیا۔ سر بر سنگ زدن۔ سعی بے ہودہ کرنا۔ بر یخ زدن اور بروئے آب نوشتن وغیرہ۔ ایسی ہی تقریروں میں بولتے ہیں مگر استعمال میں زبان پر قدرت ہونی ضرور ہے۔ ہر چند انگشت بر لبش زدم۔ حرفے از بانش بر نیامد۔ ہر چند میں نے تحریک کی مگر کچھ نہ بولا۔ خیہ از روئے کارش افتاد۔ اس کا بھرم کھل گیا۔ جو اس کا اصلی حال تھا ظاہر ہو گیا۔ پردہ از روئے کارش افتاد۔ اس کا پردہ کھل گیا۔

پاک فروخت۔ پاک سوخت۔ کوئی بد نصیب سارا گھر برباد کردے یا برباد ہو جائے اس موقع پر کہتے ہیں۔

"کیسہ بہ صابون زدہ" یعنی بالکل مفلس ہو گیا کوڑی پاس نہیں رہی۔

غرض اس قسم کے ہزاروں محاورے ہیں کہ باتیں کرتے ہیں اور شکر پارے توڑتے چلے جاتے ہیں۔ کوئی کہاں تک لکھے۔

تیسرا وصف وہ ہے جس کے کہنے میں لب مسکراتے ہیں اور عقل شرماتی ہے۔ شرمانا اس افسوس پر ہے کہ استعارہ اور تشبیہ وغیرہ صنائع مختلفہ وصف ہو کر آئے اور ایسے چھائے کہ عیب ہو گئے۔ حقیقت میں استعارہ اور تشبیہ رنگ تھے۔ رنگ جو ہر شے کو خوشنما دکھاتا ہے۔ صنائع مذکورہ عبارت میں مطلب کو روشن کرتے تھے کہ خوبی و لطافت سے سمجھ میں آتا تھا۔ کئی سو برس سے رنگوں کی شدت نے اصلیت کو پیچ در پیچ

پردوں میں دبایا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ مطالب عبارت سے جلاوطن ہو گئے۔ قباحت مذکور کے سمجھانے کو اتنا کہنا کافی نہ ہوگا اس لیے زیادہ توضیح سے کہنا چاہیے۔

خیال کرو! فصیح فارس اگر کسی چیز کا ذکر خوبی یا زشتی کے ساتھ کرنا چاہتا ہے تو اسے ایک اور شے قرار دیتا ہے۔ جو حسن و قبح میں اس سے کچھ تعلق رکھتی ہے۔ پھر اپنے حسب ضرورت اس کے اچھے اچھے لوازمات کے بیان سے اصل مطلوب کی بھلائی برائی ظاہر کرتا ہے۔

مثلاً حمد کے موقع پر اس کے الفاظ کو موتی اور جواہر قرار دیتا ہے جن کے لیے چمک اور آبداری ضرور ہے اور اس لیے چمکیلے الفاظ کا لانا بھی ضرور ہوتا ہے۔ ان کی کمی زیادتی کی مقدار کے لیے ترازو بھی درکار ہے۔ پھر ترازو کے لیے پلے اور تولنے کے لیے دست و بازو بھی چاہئیں۔ اس لیے یہ سامان بھی سمیٹنا پڑتا ہے۔ اب عبارت ذیل کو دیکھو کہ حمد کے الفاظ کو جواہر کہہ کر اس کے لیے اور لوازمات کس کس طرح تیار کیے ہیں:

جواہر زواہر نیائش بیش از قیاس۔ ولآلی متلالی ستائش لاتناہی اساس۔ کہ کفہ زبان و میزان بیان از کشیدن آں قاصر۔ و بازوئے تواں از تعقل آں فاتر باشد۔ نثار سرائے کبریائے مالک الملکے کہ مقرنس چرخ کبود از شہرستان عظمت و جلال او کاخے۔ و شجرہ بدیع الازہار جود از گلشن وسیع الفضائے قدرت او شاخیست۔ دیدۂ دقیقہ شناس رموز آفرینش۔ روزنیست بصحرائے بے منتہائے قدرتش کشادہ۔ درد شنی اذہان دانشمنداں چراغیست در راہ معرفتش نہادہ

یہ موقع ہے کہ ہندی کی عبارت سے اس عبارت کا مقابلہ کروں اور دونوں کے فرق دکھاؤں۔ دیکھو ہند کا انشا پرداز جب کسی چیز کا بیان کرتا ہے تو جو کچھ کہتا ہے اس کے اور اسی کے لوازمات کے بیان سے کہتا ہے۔ مثلاً مطلب مذکورہ بالا کو وہ کہے گا تو اس طرح کہے گا:

اعلیٰ سے اعلیٰ الفاظ اور روشن سے روشن عبارتیں، اس پروردگار کی حمد پر قربان ہیں کہ آسمان کی بلندی اس کے آگے خاک سے کم ہے اور سارے جہان کے دریا شبنم، داناؤں کی آنکھیں اس کی قدرت کو دیکھ کر کھلی کی کھلی رہ گئی ہیں۔ گویائی دم بخود ہے

اور عقلیں سوچ میں گم۔

انصاف یہ ہے کہ فصاحت فارس نے استعارہ اور تشبیہ کے خیالات میں لطافت اور نزاکت سے پھولوں کے عطر نکالے ہیں اور بلند پروازی میں آسمان سے تارے اتارے ہیں۔ مگر اس قدر افراط کی ہے کہ بدنام ہو گئے۔ ورنہ استعارہ ہر زبان میں ہے تقدیری اتفاق ہے کہ جو وصف اولیت کا درجہ لینے کو اختیار کیا تھا اسی نے سب سے پیچھے پھینک دیا۔

ظہوری اپنی سہ نثر میں بادشاہ کے عرفان کی کس زور سے تعریف کرتا ہے۔:"از صدمہ توحیدش دوئی در یکی گریختہ وبہ علاقہ تجریدش خود در توئی آویختہ"۔

(اس کی قدردانی کی تعریف کرتا ہے) از علم نکتہ بہ کتابے و گلے بہ گلزارے قبول۔

(اس کی انشاپردازی کے باب میں کہتا ہے) جو شاذوق چمن طبعے کہ بہ ورک نکات رنگینش رنگ فہمیدن بر چہرہ تواند بست۔

(اسی تعریف میں اپنی راست بیانی پر قسم کھاتا ہے) بہ نگارندۂ کہ بہ ریحان خط، خوباں مشک را بر نسریں برات دادہ۔

چوتھا جوہر زبان فارس کے مضامین بہاریہ ہیں۔ تم جانتے ہو جو کچھ سامنے ہوتا ہے اس کی تصویر آئینہ میں پڑتی ہے اور اسے خوش رنگ، بد رنگ، رنگین یا بے رنگ کرتی ہے۔ زمین مذکور سبزہ و گل کا وطن ہے۔ خصوصاً فصل بہار میں کہ جب سبزہ فرش خاک پر تخت زمرد سجاتا ہے۔ پھول سبزہ کے سر پر تاج رکھتا ہے۔ در و دیوار سے بہار برستی ہے۔ شادابی ہوا میں موجیں مارتی ہے۔ شیراز کے گلزار، خاک مصلیٰ، چشمہ رکناباد' اصفہان کے مرغزار، کوہ الوند کی چوٹیاں اور دامن پھولوں سے بھرے۔ ان کے اتار چڑھاؤ، ہیر پھیر، پانی کی چادریں گرتی ہیں اور گھاٹیوں میں گرجتے بادلوں کی طرح گڑگڑاتی چلی جاتی ہیں۔ انہی میں سے لہراتی نہریں نکلتی ہیں۔ لہکتی مہکتی ہوا میں کبھی ابر کبھی بادلوں کی بہار اور کبھی مینہ کی پھوار:

بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نہ خواہی یافت ‏ کنار آب رکنا باد و گلگشت مصلیٰ را

جب فصیح فارس اس خاک پر اپنے شگفتہ و خورم دل اور رنگین و شاداب طبیعت کو

لیکر بیٹھتا ہے تو سماباندھ دیتا ہے۔ وہ قصیدہ کے سر پر بہاریہ خیالات کا تاج رکھتا ہے۔ رنگین طرے گوندھ کر مطالب کی کلاہ میں ٹانکتا ہے۔ اور یہی ہونا چاہیے کیونکہ جو سامنے ہو، وہی دل میں اور جو دل میں ہو وہی زبان سے نکلتا ہے۔ جو شیشہ میں ہو وہی جام میں آتا ہے۔ رنگینی ان کے قلم میں کونپلوں کی طرح پھوٹتی ہے اور طبیعت سے شبنم کی طرح برستی ہے۔

البتہ یہ افسوس ہے کہ ان خیالوں میں اصلی مطالب کا رستہ بھول گئے۔ فقط وہی باتیں رہ گئیں۔ بہار کے الفاظ، استعاروں اور تشبیہوں کے ایچ پیچ میں آکر رنگیں خیالی کے خطاب سے نامور ہوئے اور کل تحریریں اسی رنگ میں ڈوب گئیں۔ تم غور کرکے دیکھو۔ جتنی بہاروں کی کمائی اس زبان کے سنگار میں صرف ہو رہی ہے جہاں کی زبانوں کے لیے کافی ہے۔ ذرا قلم پر زور ڈالا اور اک باغ بھر رنگ ٹپک پڑا۔

حق یہ ہے کہ جو ہر مذکور وہاں کے متقدمین میں وصف تھا جو سادہ نویس کہلانے لگے۔ پھر جو رنگین نگار ہوئے وہ بد نقش و بد نگار ہو گئے۔ جو مطلب لکھتے ہیں۔ ایک ہی ضلع کی جگت بازی کرتے چلے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ غمگین بھی ہوتے ہیں تو غنچہ کی صورت میں دل تنگی دکھاتے ہیں:

گرفتہ بود دل من برنگ غنچۂ گل شگفتہ روئی صبا شگفتہ کرد مرا
پیش ما اے باغباں گلدستہ گلہا مبند صحبت یاران رنگیں یاد مے آید مرا

دوست ایک امر ضروری کے لیے دوست کو دو سطر کی بات لکھتا ہے۔ پہلے رنگین الفاظ میں ایک عریض آداب و طویل القاب لکھتا ہے۔ پھر انہی خیالات میں اک پیچ در پیچ تمہید اٹھاتا ہے۔ پھر دو سطریں مطلب کی لکھتا ہے اور خاتمہ کی ٹھوکر کھا کر گر پڑتا ہے۔

لطف یہ ہے کہ حمد الٰہی میں بھی رنگ ہی اڑاتے ہیں۔ ملا ظہیر نے باغ کی تعریف میں ایک رسالہ لکھا۔ حمد کا فقرہ سر دیباچہ ہے:

شبنم شاداب ہر گونہ ستائش و ثنا کہ از ہوائے روح پرور بستان بہیاں۔ بر گلبرگ زبان سخنوراں نشیند۔ مجذب استحقاق ذاتی۔ راجع بہ جناب آفتاب نقاب بیہا۔ پیرائیست کہ در بیت المقدس گلشن غنچۂ مریم مسیح دم را۔ دہان روزہ دار صمت۔ بہ کلمہ طیبہ ہو کہ اسم

اعظم لوست۔ کشودہ۔

شاعروں نے فقط بہار کے مضمون پر کتابیں مجلد کیں۔ جو نظم میں لکھیں ان کا نام ساقی نامہ رکھا۔ اسی عالم میں کبھی باغ و بہار کی کیاریوں کو دیکھو گے کہ میدان کارزار ہو رہی ہیں اور یہ انداز ثابت کرتا ہے کہ قوم مذکور بغیر دلاوری اور سپاہ گری کے انسانیت کو ناتمام سمجھتے تھے۔ دیکھو تمام کہانیوں کی بنیاد صید افگنی اور شہسواری پر ہے۔ اسی بنا پر تیغ اور خنجر کے لیے سبزہ رنگ، گندنا گون وغیرہ عمدہ صفتیں پیدا کیں۔ موج رواں کو، تیغ تیز اور گرداب کو سپر تعبیر کیا۔ معشوق اور اس کی آنکھ کو ترک اور صید افگن۔ نگاہ کو خدنگ و شمشیر۔ مژگان کو تیر۔ سرمہ کو سنگ فساں۔ کبھی زبان طرار کو خنجر یا تلوار۔ زبان آوریا جس شخص کی دعا اکثر قبول ہوتی ہو اس کو سیف زبان کہتے ہیں۔ حسن کے عالم میں فردوسی نے رستم کی بی بی کی تعریف میں کیا خوب کہا ہے:

دو ابرو کمان و دو گیسو کمند زبانش چو خنجر دہانش چو قند
سر زلف وجعدش چو مشکیں زرہ فگنداست گوئی گرہ برگرہ
بہار بے سپر جام بارے گزرد نسیم ہچو خدنگ از کنارے گزرد

اگر آں ترک شیرازی بدست آرد دل مارا
بہ خال ہندوش بخشم سمرقند و بخارا را
فغاں کیں لولیان شوخ و شیریں کار و شہر آشوب
چناں بردند صبر از دل کہ ترکاں خوان یغمارا[38]

ان مضامین سے نظم و نثر کے شہر آباد ہیں اور خوش آئندہ اور دلپذیر محاوروں کے ساتھ کمر رہے ہیں کہ ملک کی زبان کس خوبی سے بیان کرتی ہے کہ جو قومیں وہاں رہتی ہیں ان کے عادات و اطوار کیا ہیں۔

دیکھو! دو ملا بھی اپنے شاگردوں اور طرفداروں کے جتھے کو لے کر مباحثہ کا جلسہ گرم کریں تو کہنے والا کہے گا۔ "ملا جعفر کہ در میدان مباحثہ شمشیر خوش غلاف بود لول سر سخن آمد مگر بہ دو حرف سپر[39] انداخت"۔

بیرم خاں خانخاناں اپنی فوج کو لے کر میدان میں صف آرا ہوا ہے۔ مورخ کہتا

ہے۔ "سبحان قلی ترک کہ تیر روئے 40 ترکش بود۔ در اول حملہ بر قلب دشمن زدو چپقلشہانے مردانہ کردہ از دست راست سر برآورد"۔

پانچواں وصف زبان فارس کا ادا کرنا ہے کیفیت حسن و عشق کا۔ ان خیالات کو اس لطافت اور نزاکت اور ظرافت کے ساتھ ادا کرتی ہے گویا اسی کے واسطے پیدا ہوئے ہیں۔ سبب یہ ہے کہ سامان خداساز ہاتھ آئے ہیں۔ عالم سبزہ زار، ہرے بھرے پہاڑ، بہتے پانی، گرتے ہوئے آبشار، موسم نو بہار، بلبل کے چہچہے، چکور کے قہقہے اور سامنے پریزاد صورتیں۔ فصیح فارس جب اس طلسم قدرت میں بیٹھ کر اپنے پر اثر الفاظ و عبارت سے حسن کا جلوہ دکھاتا ہے تو پرستان کی تصویر کھینچ دیتا ہے:

ابر است و نو بہار روز مے شگفتہ ساقی تو ہم بیا بہ جبینے شگفتہ

اور بات فقط وہی ہے کہ جو لطف آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ الفاظ ہو کر زبان سے ٹپکتے ہیں۔ پھر جب عشق منزل میں آتے ہیں تو درد کے پتلے اور غم واندوہ کی مورت نظر آتے ہیں۔ انصاف یہ ہے کہ ایسے حسن کا عشق بھی ایسا ہی ہونا چاہیے۔

نشتر عشق فرد رفتہ مرا در رگ و پے عشق میگویم و جاں مید ہم از لذت وے

لیکن مشکل یہ ہوئی کہ آب و ہوا کا نشوونما، دلوں کی آسودگی تھی۔ اس پر قومی سلطنت، گھر کی دولت، دل بڑھے ہوئے اور دماغ بلند۔ گویا باروت میں چنگاری پڑ گئی۔ یا شراب میں آگ لگ اٹھی جو مطالب و مقاصد تھے سب بھول گئے۔ ہر چیز میں حسن اور ہر شے میں عشق نظر آنے لگا۔ الٰہی تری اماں ہر ذرہ آفرینش کے دل میں عشق ہے کہ شوق میں اڑ رہا ہے۔ بلبل گل پر۔ قمری سرو پر۔ پروانہ شمع پر عاشق، لوہا مقناطیس پر عاشق، کاہ کہربا پر عاشق، شبنم آفتاب پر عاشق، چکور چاند پر عاشق۔ لیلائے شب، زلف مشکفام کھولتی ہے۔ صبح گریبان چاک کرتی ہے۔ آسمان کے دل پر بھی داغ عشق ہے۔ وہ کیا؟ آفتاب! آفتاب خود وحشت میں سرگرداں ہے۔ مجنون اندیشہ، شاہد مضمون کی تلاش میں حیران ہے۔ پتھر کے دل میں اس آگ کا چنگا ہے۔ ہرنے میں آتش عشق ہے کہ نیستان کو پھونک دیتی ہے اور نے معشوق حقیقی کی یاد میں نالہ وزاری کرتی ہے۔ ایسے ایسے مضامین زبان مذکور میں ایسے عام ہو رہے ہیں کہ جہاں چاہتے ہیں ایک اشارہ کر جاتے ہیں۔

سمجھنے والے بے قصد سمجھ جاتے ہیں۔ مزے لیتے ہیں اور وجد کرتے ہیں۔ خیر زبان والے غیر ان منہ تکتے ہیں کہ یہ کیا باتیں ہیں اور معاملہ کیا ہے۔

یہ فساد نظم سے شروع ہوا۔ نظم فارسی کی تاریخ میں دیکھو گے کہ 6 سو برس سے یہ مضامین آئے اور ایسے آئے کہ زبان مذکور پر جاگیر کی طرح قبضہ کر لیا۔ عاشقانہ اشعار پہلے بھی ہوتے تھے مگر نہ اس فضیحت و رسوائی کے ساتھ جو کہ اب ہیں۔ حسن و عشق کی غزلخوانی کا مزا کانوں اور زبانوں میں شیخ سعدی اور خواجہ حافظ کی خوش آوازی سے پہنچا۔ پھر: "ہر کہ آمد بر اں مزید کرد"۔

عاشقانہ خیالات ایسے دور پہنچے کہ حمد الٰہی بھی انھیں میں ادا ہونے لگی۔ خدا کو معشوق بنایا اور آپ عاشق بنے۔ اس کا حسن حقیقی۔ ان کا عشق حقیقی، نعت پیغمبر بھی انہی مطالب میں ادا ہونے لگی۔ خیال در خیال پھیلنے لگے۔ کبھی خدا کو عاشق اور آنحضرت کو معشوق ٹھہرایا۔ کبھی بالعکس۔ پھر آپ حضرت کے عاشق بنے اور خدا سے رقابت نکالی:

دل از عشق محمد ریش دارم رقابت باخدائے خویش دارم

یہ درست ہے کہ جب ہم تسبیح و تقدیس الٰہی بجا لائیں تو چاہئے ایسا مزا آئے جیسے پیارے معشوق سے باتیں کرتے ہیں۔ جب پیشانی سجدہ میں رکھیں تو وہ ذوق شوق دل میں پیدا ہو جو معشوق سے لپٹنے میں ہوتا ہے اور اسی طرح حضرات عالی درجات کی یاد میں یہ ایک مثال کم فہموں کے سمجھانے کو دی تھی۔ افسوس کہ نافہموں سے پالا پڑا اور وہ کہیں کے کہیں جا پڑے۔

چھٹا وصف زبان فارس کا مبالغہ کلام ہے۔ جس نے صرافان زبان میں اسے بے اعتبار اور کھوٹا کر دیا ہے۔ اکثر سامان طبعی بیان ہوئے جو طبیعتوں میں جوش پیدا کرتے ہیں اور قومی اور ملکی خروش ہیں جو بات کو دل سے اچھال کر زبان پر پھینک دیتے ہیں۔ جس قوم کے نشان نے ہزاروں برس کسی میدان میں سر نہ جھکایا ہو۔ اور علوم، فنون، صنائع۔ بدائع ان کے ہر ولایت میں نمونہ رہے ہوں۔ اگر ان کا جوش و خروش کلام میں مبالغہ پیدا کرے تو عجب کیا ہے اور یہاں سے سیکھو کہ کسی زبان کے انداز سے قوم کی گرم خونی یا سرد مزاجی۔ ہمت یا بے ہمتی وغیرہ وغیرہ کیونکر معلوم کر سکتے ہیں۔ خیال

کرو۔

(1) گھوڑے کے لیے بادپا، تگاور اور یکران وغیرہ صدہا اصطلاحیں ہیں۔ تلوار کے لیے برق دم اور نہنگ وغیرہ صدہا نام اور صفتیں ہیں۔ اور اسی طرح اور چیزوں کے لیے۔

(2) ہندی کہے گا۔ "آرزو ہے کہ ایک دفعہ ایران دیکھوں"۔ ایرانی کہے گا۔ "داغ ہمیں حسرت ام۔ نجون خودم مے غلطم۔ چہ کنم کہ دستم نمے رسد۔ زمیں سخت است و آسماں دور"۔

ہندی عالم مجبوری میں دق ہو کر کہے گا۔ "کیا کروں تن بہ تقدیر بیٹھا ہوں" ایرانی کہے گا! "دست از جان شستہ ایم و نشستہ ایم۔ از جان گزشتہ ایم۔ تن بہ کشتن دادہ ایم"۔

(3) سخت بات پر تحمل نہ کر سکے گا اور کہے گا۔ چہ گفتی مرد کہ اگر مرد ہستی یکے باز گو۔ کو زبانت کہ از قفا بر کشم (ایک دفعہ پھر تو کہو۔ تیری زبان کہاں ہے کہ گدی میں سے نکال لوں) پیش قبض پر ہاتھ رکھے گا اور کہے گا حالا زبانت مے برم۔ طپنچہ پر ہاتھ رکھے گا اور کہے گا۔ اگر بار دگر گفتی واللہ کہ شکمت پر آتش میکنم۔ قزلباشان کابل نوکر یا غلام پر خفگی میں کہتے ہیں۔ اے ابز نم گردنت رلبہ درہ خیبر۔

(4) امر دشوار کو آسان ظاہر کریں گے تو کہیں گے۔ آسان کاریست۔ بے ہیچ است۔ ہیچ حقیقت ندارد۔ ایک ایرانی سے سفر حج کے باب میں گفتگو ہو رہی تھی۔ ہندی نے کہا۔ بڑی دشواری اس سفر میں جہاز کی سواری ہے۔ ایرانی نے کہا۔ من جہاز رلبہ پر کاہے نمیگیرم۔ جان شما کہ بہ جوئے نمیگیرم۔

(5) کسی چیز کو بے قدر و قیمت کہنا ہو تو کہیں گے۔ بہ جوئے نمے ارزد۔ بہ ہیچ۔ نمے ارزد۔ بہ کنجد شکستہ نمے ارزد۔ بہ لعنتے نمے ارزد۔

(6) دو چیزوں میں ایک کو ترجیح دیں گے تو کہیں گے۔ استغفر اللہ ایں چہ نسبت دارد باو۔ ایں بہ خاکش نمیرسد۔ بہ خاکش نمے ارزد۔ دریں ہر دو از زمین تا آسمان فرق است۔ تمام زبان میں یہی پھول برس رہے ہیں۔ کہاں تک کہوں گا اور کہاں تک سنو گے۔

ساتواں وصف: ہر بات کو ظرافت و نزاکت کے رنگ میں ادا کرنا اس زبان کا جوہر طبعی

ہے۔ خاص و عام زن و مرد بچے سے لیکر بوڑھے تک فصاحت کی مچھلیاں ہیں کہ بیان کے دریا میں تیرتی پھرتی ہیں۔ گلے میں تکلف کی ذرا کھر کھراہٹ نہیں معلوم ہوتی۔

(1) مثلاً ایک دکان دار سے خریدار نے روئی مول لی اور کہا۔ کم است آغا۔ دکاندار کے آگے ترازو ہے۔ چوٹی ایک رسی میں بندھی جس کا سرا چھت کے قلابہ میں بندھا ہے۔ وہ کہتا ہے۔ ایک (لو دیکھو) اگر جنس کا پلہ جھکتا ہے تو دکاندار کہتا ہے۔ ترازو سلام میکند آغا (دیکھئے ہم سچے یا آپ ؟) اگر برابر ہے تو کہتا ہے نگاہ کنید۔ عدل است (برابر ہے! اور اشارہ میزان عدل کا ہے کہ میدان قیامت میں کھڑی ہوگی)

(2) کئی دن سے گرمی بشدت تھی۔ مینہ برسا اور کھل گیا۔ میں نے ایک ایرانی سے کہا۔ امروز آبے بر آتش زدند۔ اس وقت ہوا بند تھی اور گرمی زیادہ ہو گئی تھی اس نے کہا۔ بلے۔ مگر آتش بلند تر شد (اور بھڑک اٹھی)۔

(3) ایک ولائتی سے اس کے لڑکے کے باب میں گفتگو تھی کہ کیا پڑھتا ہے ؟ اس نے کہا: "سوادے روشن کردہ است"۔ گویا پہلے آنکھوں کے آگے اندھیرا تھا اب ذرا آنکھیں روشن ہوئی ہیں کہ عبارت پڑھنے اور مطلب سمجھنے لگا ہے۔

آٹھواں وصف زبان مذکور کا یہ ہے کہ عیب بھی ہو تو خوبی کے پردہ میں ادا کرتی ہے چنانچہ بہرے کو "کر" نہیں کہتے۔ کہتے ہیں: گوشش سنگین یا گوشش گران است۔

کانے کو یک چشم نہیں کہتے۔ کہتے ہیں: یک چشمش معذور است۔ کبھی کہتے ہیں: یک چشمش گل دارد۔

بڈھے کو نہیں کہتے کہ مرنے والا ہے۔ کہتے ہیں: آفتابش بر سر کوہ است۔ چراغ سحر یست۔

نواں وصف ایہام کے طور پر عام محاورہ میں سے ایک مضمون شاعرانہ پیدا کرنا اس زبان کا جوہر ہے اور یہ یورپ کی اور زبانوں میں کم ہے۔ تم جانتے ہو سواد شہر۔

(1) سواد لشکر: سیاہی لشکر۔ کثرت اور جمعیت کے معنے پیدا کرتی ہے۔ دیکھو شاعر نے اس میں سے کیا نازک مضمون نکالا ہے:

درنامہ زمانہ بجز حرف جنگ نیست گویا کہ از سیاہی لشکر نوشتہ اند

(2) یار فروشی: دوست کی خوبیاں اور کمالات مشہور کرنے کو کہتے ہیں۔ اسی بنیاد پر فصیح فارس کہتا ہے:

بہر کجا کہ روم وصف دوستاں گویم   برائے یار فروشی دکاں بمیائد

اسی لحاظ سے خان آرزو کے مقطع کو دیکھو کہ آرزو نے کیا لطف پیدا کیا ہے:

بہ یمن عشق تو مقبول عالمے شدہ ام   کدام دل کہ درو جائے آرزوے تو نیست

بیدل کے تخلص کو دیکھو اس رباعی میں کیا کیفیت دکھاتا ہے:

از جرات اگرچہ منفعل گردیدم   وز شوخی اظہار خجل گردیدم
صد شکر گرفت نامہ ام رنگ قبول   بیدل بودم ہزار دل گردیدم

خاتمہ۔ تقریر کا میدان وسیع سامنے ہے اور مطالب کے کاروان قطار قطار چلے آتے ہیں۔ نہ زبان کا چشمہ خشک ہوا ہے۔ نہ دل کا جوش فرو ہوا۔ جو تھوڑا بہت لکھا گیا۔ آئندہ خیالات کے پھیلانے کو کافی ہے۔ لطف زبان کے طلب گاروں کے لیے رستہ نکل گیا۔ دیکھنے والے دیکھیں گے اور سننے والے سنیں گے۔ اسے پھیلائیں گے اور آپ پھیلیں گے۔ اب کلام کے پھیلاؤ کو سمیٹنا چاہیے کیونکہ وقت مہلت دینے میں تحمل ہے اور سخت زبردست ہے۔ اس کا پھیلا لینا کسی کے اختیار میں نہیں۔

نواں لکچر

زبان عربی سے مل کر زبان فارسی نے کیا کیا رنگ بدلے۔

ہر زبان میں بعض حروف ایسے ہوتے ہیں ہیں کہ اختلاف مخارج کے سبب سے ان کا صاف بولنا دوسرے ملک کے لوگوں کو کبھی دشوار اور کبھی ناممکن ہوتا ہے اس کے علاوہ ہر زبان کی ساخت اور اس کے لفظوں کی حرکات وسکنات اور باہمی ترکیب قدرت نے ایسی رکھی ہے کہ ایک زبان کا لفظ دوسری زبان میں مسلسل کریں تو منہ میں کنکر سا کھٹکتا معلوم ہوتا ہے۔ البتہ جب دوسری زبان کے قادرالکلام اس کے بعض حروف و حرکات کو اپنے طور پر الٹ پلٹ کرلیں تو وہ بھی ان میں کھپ جاتا ہے۔ اس کو اہل عرب تعریب کہتے ہیں۔ عرب میں جب غیر زبان کا لفظ جاتا ہے تو اول وہ دیکھتے ہیں کہ اس میں کوئی حرف ان کے حروف تہجی سے باہر تو نہیں۔ اگر ہوتا ہے تو فوراً بدل لیتے ہیں۔ بعد ازاں دیکھتے ہیں کہ ثلاثی ورباعی وغیرہ میں ان کے اوزان مختصہ کے موافق ہے یا نہیں۔ جو فرق ہوتا ہے اسے گھٹا بڑھا کر تراش ڈالتے ہیں۔ فارس کی ملنساری اور مہمان نوازی کو دیکھنا چاہئے کہ عرب کے مہمانوں کے ساتھ ان کے لفظوں کو کیسی جگہ دی اور کس بے تکلفی سے شیر وشکر ہوگئی۔ اسے ایرانی اردو کہنا چاہیے۔

ظرافت فارس نے یہ لطیفہ بہت خوب کہا۔ مگر فلسفہ زبان اس موقع پر چپ رہنا جائز نہیں سمجھتا اور اس کی گفتگو بھی قابل سننے کے ہے۔ وہ کہتا ہے "تم جان چکے ہو کہ فارس میں جب عرب کی زبان آئی تو دین آئین اور دربار سلاطین۔ بلکہ گھر گھر میں عربی زبان کی عملداری تھی۔ ملک کے اصلی علوم وفنون فنا ہوگئے تھے اور جو علمی خزانے لوگوں کی قسمتوں میں تھے۔ اس کی کنجی عربی ہی زبان تھی۔ اس لیے ہر شخص کو اس کا سیکھنا واجب تھا۔ اور صحت کے ساتھ اس کا تلفظ نہ ہو تو کلام بے معنی تھا۔ یہی سبب ہوا کہ قرات تعلیم عربی کا ایک فن خاص ٹھہر گیا اور اس میں کتابیں تصنیف ہوئیں۔ نتیجہ

اس کا یہ ہوا کہ عرب کے الفاظ پر عجم کی زبان بے تکلف پھرنے لگی اور اس کے لفظ باوجود بعض حرفوں کے تنافر کے فارسیوں کی زبانوں پر پانی کی طرح رواں ہو گئے"۔ نہیں یوں کہو کہ اسباب مذکورہ بالا نے ملک کی زبان کو ایسا مجبور کیا کہ وہ اور زبانوں کی طرح عربی الفاظ پر اپنی تراش و تبدیل کی قینچی نہ چلا سکے اور جو کچھ کیا بہت کم ہے۔ بعض بعض مقاموں میں اہل زبان نے شوخی طبع کی جولانیاں بھی دکھائی ہیں۔ چنانچہ میں آج کے لیکچر میں وہ باتیں بھی بیان کروں گا۔

سب جانتے ہیں کہ فارسی میں عربی کے لفظ بہت ملے ہوئے ہیں۔ مگر قاعدہ ہے کہ جو چیز ہر وقت کام میں آتی رہتی ہے اس کے ذرہ ذرہ سے فرق پر خیال اٹکتا نہیں۔ اور اگر اس کے نکتہ نکتہ پر خیال کریں تو عجب لطف حاصل ہوتا ہے۔

(1) سب سے پہلے یہ کہ اس نے اپنے حروف تہجی کو اور اپنی تحریر کو یک قلم دل سے بھلا دیا جس میں اعراب بھی حرفوں سے ظاہر ہوتے تھے۔

"اع" اور "ت ط"۔ اور "ث س ص" اور "ذ ز ض ظ" کے فرق اگرچہ تلفظ میں نہ دکھا سکے مگر ان کی املا میں ایک جگہ بھی چوکنا گناہ خدا اور جرم حاکم سے سخت تر سمجھا۔

تم جانتے ہو کہ عربی زبان کے تلفظ میں فارسی کے تلفظ سے مشرق و مغرب کا فرق ہے۔ اول تو عربی میں آٹھ حرف ایسے موجود ہیں جو فارسی میں آتے ہی نہیں۔ اسی طرح مشدد لفظ فارسی میں نہیں آتا۔ وغیرہ وغیرہ۔ باوجود اس کے دیکھو کہ اس نے عربی کے لفظوں کو جوں کا توں لیا اور صحیح سلامت امانت رکھا۔

(2) عربی لفظ کو مجلسہ اور اس طرح اپنا مضاف کر لیا گویا اپنے ملک کا مال ہے مثلاً حکم شاہ۔ مراد دل۔ واقف راز۔ اہل نیاز وغیرہ۔

(3) مضاف الیہ بنالیا مثلاً دانائے اسرار۔ کار خیر۔ روشنی طبع وغیرہ۔

(4) دو عربی لفظوں میں اپنی اضافت پیدا کی مثلاً بشارۂ فتح۔ تائید غیب وغیرہ۔

(5) عربی لفظ کو فارسی لفظ کی صفت ڈالا مثلاً کار خیر۔ شاہ عادل۔ بندۂ مطیع۔ بلکہ مرکبات کو بھی مثلاً فرمان واجب الاذعان۔

(6) عربی لفظ کو موصوف اور فارسی کو صفت ڈالا مثلاً ثمر شیریں۔ بنائے بلند۔ سفر خجستہ۔ سفر سعادت اثر۔ سفر محمود العاقبۃ۔

(7) دو عربی لفظوں کو فارسی طور پر صفت ڈالا مثلاً تاکید تمام۔ دولت وافر۔ منشور لامع النور۔ وغیرہ۔

(8) کتابت میں بھی عربی الفاظ پر فارسیانہ تصرف کیے مثلاً:

(اضافت میں) روضہ جنت۔ سلسلہ خاندان (صفت میں) نکتہ برجستہ۔ لطیفہ نمکیں۔

(نوٹ: جس طرح فارسی لفظوں میں ہائے مختفی پر (ء) لکھتے ہیں اسی طرح یہاں لکھ دیا۔)

(9) عربی الفاظ کو فارسی میں ترکیب دیکر تشبیہیں اور استعارے پیدا کیے۔ مثلاً شاہد گل۔ رامشگر بلبل۔ شاہد شمع۔ توسن دولت۔ یکران اقبال۔

(10) جن عربی الفاظ کے اخیر میں الف تھا ان پر اضافت میں الفاظ فارسی کی طرح "ے" زیادہ کردی مثلاً: بلائے آسمان وغیرہ غذائے روح وغیرہ۔

(11) فارسی کے دو لفظوں کو باہم ترکیب دے کر صفت تالیفی بنایا کرتے تھے۔ اسی طرح عربی و فارسی لفظوں کے ارتباط سے بنانے لگے۔ مثلاً اقبال نشان، فصیح زبان۔ بے نظیر اور باتدبیر وغیرہ۔

دو عربی لفظوں کو اسی طرح ترکیب دیتے ہیں مثلاً صاحب کمال، یوسف جمال اور حمیدہ خصال۔

(12) عربی لفظوں میں حروف فاعلی، صفتی، ظرفی اور تصغیری اس طرح لگاتے ہیں کہ گویا فارسی لفظ ہیں مثلاً دولتمند، غمگین، طربناک۔ جفاکار، عدل پرور، کافرکیش، صنم کدہ اور طفلک وغیرہ۔ ابوالفضل نے کہا ہے: "بطبعک تاقصک خود چناں سنجیدہ ام"۔

(13) عربی لفظوں میں اس طرح یائے مصدری لگاتے ہیں گویا فارسی ہیں۔ مثلاً زیادتی، سلامتی، صفائی اور انتظاری (مرکبات میں بھی) خوش اخلاقی، دولت مندی اور

اقبال بلندی۔

(14) اکثر الفاظ عربی کے معنوں میں تصرف کر کے استعمال کیا۔ مثلاً:

سیر: عربی میں بہ معنی رفتار ہے۔ اب فقط دیکھنے کے معنوں میں بولتے ہیں۔ شیراز میں اس کا بہت استعمال ہے۔ کہتے ہیں سیر کنید (یعنی نگاہ کنید۔ ادھر دیکھو) ایں خانہ را سیر کردید؟ قابل سکونت نیست۔ امروز اسپ شما را سیر کردم خیلے چاق شدہ۔

شمہ: شم۔ عربی میں بہ معنی شمیدن ہے۔ یعنی سونگھنا۔ یہ ایسی ذری سی چیز کو کہتے ہیں جو سونگھنے کے لیے کافی ہو۔ شیخ سعدی نے کہا: "وزیر اندریں شمہ راہ برد۔ (فقرہ) شمہ از احوال خود باز نمود۔

ارتفاع: عربی میں بلندی۔ فارسی میں آمدنی سالانہ کو کہتے ہیں۔ گلستاں میں ہے۔ ارتفاع ولایت نقصان پذیرفت"۔

فلک: عربی میں آسمان ہے۔ اہل فارس ایک لکڑی میں چھید کر کے اونچا باندھتے ہیں۔ اس میں گنہگار کے پاؤں ڈال کر الٹا لٹکا دیتے ہیں اور کوڑے مارتے ہیں۔ اسے فلک کہتے ہیں۔

سبق: عربی میں سبقت اور گھڑ دوڑ کو کہتے ہیں۔ فارسی میں وہی سبق ہے جو استاد سے پڑھتے ہیں۔

محو: عربی میں مٹانے کو کہتے ہیں۔ فارسی والے محو بہ معنی عاشق استعمال کرتے ہیں۔

(15) عربی میں بعض الفاظ جمع ہیں۔ یہ انھیں واحد تعبیر کرتے ہیں مثلاً:

عسس عربی میں جمع عاس کی ہے۔ یہ عسس کو توال کو کہتے ہیں۔

وقائع جمع واقعہ ہے۔ یہ واحد تعبیر کرتے ہیں۔

حقائق جمع حقیقتہ ہے۔ ابوالفضل نے کہا:

ترا از کاف کفرت ہم خبر نیست حقائق ہائے ایماں راچہ دانی

آمال جمع امل ہے۔ صائب نے کہا:

ہرچند صائب میروم سامان نومیدی کنم زلفش بہ دستم میدہد سر رشتہ آمال ہا

(16) عربی لفظوں سے فارسی طور پر اشتقاق کرتے ہیں۔ مثلاً:
فہم سے فہمیدن۔ غارت سے غارتیدن۔ شم سے شمیدن سیر بہ معنی رفتار ہے۔
عرفی نے کہا

کرم گفتا پرستار است بے غیر بیادوست تحمل گیردے سیر

تمیز عربی لفظ ہے۔ سالک یزدی نے فارسی طور پر اشتقاق کیا:

سالک نفروشند بما بادۂ صافی کوذائقہ محتسبے تا بتمیزد

اسمائے جامد سے بھی اشتقاق کرتے ہیں۔ مگر یہ ظرافت میں داخل ہے۔ مثلاً:

اگر بے تو یک دم شرابیدہ باشم بہ کانون ہجرت کبابیدہ باشم
مدنیدیم پس ازمعیدن نہ بکس حیلہ دنے مکریدن
مرقد پاک نبی طوفیدیم عمریدیم و لبابکریدیم

(17) فارسی لفظوں کو عربی لفظوں کے قالب میں ڈھال دیتے ہیں۔ مثلاً زلف مترش۔ لباس مزیب۔ معجون مبہی۔ جام بلب۔ لوح مطلا۔ موئے مزلف، جامہ مزرکش۔ مرد مفلوک (فلک زدہ) فلاکت۔ نزاکت۔ بادشاہت۔ متکشمر (کشمیری بنا)۔

(18) فارسی لفظوں کی عربی جمع بنا لیتے ہیں مثلاً تراکمہ ارگنج۔ افاغنہ کابل۔ تکاکرۂ ہند۔ فرامین شاہی۔ اہل دفتر کی اصطلاح میں۔ مدنزدات۔ پرگنات۔ باغات۔

(19) فارسی لفظوں کو عربی طور پر ترکیب دیتے ہیں۔ نعمت خان عالی نے کہا:

گل تگر بانگ انا الیار بگلشن زدہ است بر سر دار خیال سر منصور کنم
تا مہر تو گشت نور افشاں ذوالخورشید من شد شتاباں
(خاقانی)

تاریخ ہفت اقلیم میں خواجہ حسن دہلوی کے حال میں لکھا ہے۔ وے در آخر عمر حسب الفرمود بادشاہ وقت سلطان تغلق بہ دیوگر رفت۔
ابوالفضل نے اپنی انشا کے دفتر سوم میں عبدالخواہش لکھا ہے۔
بیدل نے کہا: "النوید آفتاب عالمتاب"۔
نور چشمی اور قبیلہ گاہی میں دیکھو یائے متکلم لگائی ہے۔

(20) عربی کے مشدد لفظ کو مخفف کر لیتے ہیں۔ نظامی نے نیت کو بتخفیف باندھا۔

پناہندہ رلیاد کرواز نخست نیت کرد برکامگاری درست

اسی طرح محویت (غیر مشدد) کو محویت ایک شاعر نے باندھا:

کیست آئینہ کہ باحیرت من چرہ شود ہمہ تن محویت عربدہ سازم کردند

خاص اور خاصیت مشدد ہیں۔ اب خاص و عام مخفف بولتے ہیں:

ایں ہدیہ خاص اوست کہ آثار بذل شاہ چوں آفتاب خاصیت خود گرفتہ است

اسی طرح غم، ہم، حق وغیرہ بہت الفاظ ہیں۔

(21) کبھی لفظ و معنی دونوں میں تصرف کرتے ہیں۔ مثلاً:

کیفیت بالتشدید بہ معنی چگونگی ہے۔ انہوں نے بالتخفیف کیفیت سے نشے کا سرور مراد لیا۔ شمشیر گرتی:

مے کوز دست ساقی مشکیں کلالہ نیست درصد سبوش کیفیت یک پیالہ نیست

طامات عربی میں بالتشدید بہ معنی مصیبت و حادثہ عظیم ہے۔ یہ طامات صوفیہ کے مقالات نامشروع کو کہتے ہیں۔

نظارہ عربی میں جمع ہے دیکھنے والوں کو کہتے ہیں۔ یہ نظارہ اور نظارہ نظر بھر دیکھنے کو کہتے ہیں۔

غشی عربی میں بے ہوش کو کہتے ہیں۔ یہ غش کردن بہ معنی فریفتہ شدن بھی بولتے ہیں۔

(22) الفاظ عربی سے اہل عرب کے طور پر لفظ مشتق کیے ہیں۔ حالانکہ وہ اشتقاق، عرب کے محاورہ میں نہیں آئے۔ مثلاً:

عربی میں یاس سے یوس آیا ہے۔ انہوں نے مایوس نکالا اور اس لفظ نے ایسا رواج پایا کہ محتاج بیان نہیں۔

اسی طرح مرسول بہ معنی مرسل۔ عرفی نے کہا ہے:

قضا بہ حاکم دانش نوشتہ مصلحتے فلک نہ دیدہ کہ مرسول او چہ است

ماثور بہ معنی متاثر۔ عرفی نے کہا:

اگرچہ ہست مبرہن کہ در مسیر وجود موثر اند صفات الہ نے ماثور

عربی میں اصم بہرے کو کہتے ہیں۔ انہوں نے صمیم نکالا۔ عرفی نے کہا ہے:

نوائے مرثیہ صوم و شادیانہ عید کشادہ از اثر انبساط گوش صمیم

اسی طرح مروج کی جگہ۔ بدر چاچ نے رائج کہا: "مشتری نہاد نقدے رائجے دربار من"

(23) شعرائے اہل زبان نے کہ قادر الکلامی ان کی مسلم الثبوت ہے۔ بعض الفاظ عربی میں حروف ساکن کو متحرک باندھا۔ سعدی:

عفو کردم ازوئے عملہائے زشت بفضل خودش آورم در بہشت

اگر سہوے بود دروئے عفو کن دریدہ پردۂ کارم رفو کن

(ناصر خسرو)

دو قرن از کرمت درد و جہاں بردہ نواست

تو چہ دانی کہ جہاں بے توچہ بے برگ و نواست

(24) اسی طرح متحرک کو ساکن کر دیتے ہیں۔ مثلاً متواری کو متواری۔ کمال اسماعیل

دے کہ عقرب کلکش بہ جنبش آردنیش شود حسود بہ سوراخ مار متواری

بود آں تیغ وے ہنگام ہیجا

چناں دیبائے بوقلموں ملون

(منوچہری)

لیکن الفاظ مذکور جہاں آگئے وہیں درست ہیں اور جگہ استعمال نہیں کر سکتے نہ اس قیاس پر ہم متحرک کو ساکن یا ساکن کو متحرک کر سکتے ہیں۔

(25) عربی لفظ میں سے بعض حروف کو حذف کر دیتے ہیں۔ مثلاً مواسات سے مواسا۔ محاکات سے محاکا۔ وغیرہ۔ اس میں بھی جہاں تک اہل زبان نے تصرف کیا وہیں

تک جائز ہے۔ ان پر قیاس کر کے ملاقات کی جگہ ملاقا نہیں کر سکتے۔

اسی طرح تمیز سے تمیزاور تغییر سے تغیر کر کے ی گرا دیتے ہیں:

مسکین خر اگرچہ بے تمیزاست چوں بار ہمے برد عزیز است

اسی طرح مصئون کو مصون بوزن زبون کر دیا۔ ظہوری نے کہا ہے:

خدا پیرایہ بخشد از قبولش مصوں دارد ز رو ہر فضولش

بعض نے عیال مند کو۔ یال مند کہا۔ مگر وہ اسی موقع کے لیے رہا جہاں کہنے والا کہہ گیا۔

ابونصر ابوجہل ابولہب ام غیلاں ابواسحٰق الطعمہ ارسطاطالیس

بونصر بوجہل بولہب مغیلاں بسحق اطعمہ سطالیس

اصطرلاب سے صطرلاب۔ صلاب۔ نظامی نے کہا ہے:۔

ہمہ زیچ و صلاب برداشتند براں کاریک ہفتہ بگذاشتند

(26) عربی کے مرکب لفظوں کو فارسی میں اس طرح ترکیب دیتے ہیں گویا فارسی کے مفرد لفظ ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں۔ "ایں مطلب تفصیل علیحدہ میخواہد" اور "اوہمکانے علیحدہ نشستہ بود"۔ تم جانتے ہو کہ علیٰ حرف جر ہے اور وحد میں سے "و" گرا کر اس کے عوض "ہ" بڑھادی ہے۔ پس علیحدہ۔ علیٰ حدۃ سے مرکب ہے۔

ماجریٰ کو موصوف کر کے کہتے ہیں۔ "ماجرائے عجیبے ست" اور اکثر کہتے ہیں: "عجیب واقعہ وطرفہ ماجرائے ہست"۔

اسی طرح کہتے ہیں۔ اتلاف حقوق خلاف شیوہ انسانیت است فلیف کہ در حق برادران وخویشان! اور آجکل کے محاورہ میں لکھتے ہیں۔ مدتیست کہ از کیف شما آگہی نداریم (از حال شما)

اور کہتے ہیں اگرچہ از دیانت وخیانتش خبر ندارم مع ذلک از احوالش غافل نباید بود۔ ایں برادر نسخہ ست علیحدہ۔

مرزا بیدل اپنے رقعات میں ایک پرانی کتاب کی کہنگی اور کرم خوردگی کے باب میں کہتے ہیں۔ نخستیں جریدہ کہ منقول عنہ لوح محفوظش تواں گفت امروز بنظر آمد۔ دیکھو منقول عنہ کو مضاف کیا ہے اور اضافت کی زیر کو کس طرح عنہ کی "ہ" پر ڈالا ہے۔

لفافوں پر لکھتے ہیں۔ لفافہ ہذا بموجب قاعدہ کے ہذہ چاہیے کیونکہ لفافہ میں تائے تانیث موجود ہے۔

اسی قبیل سے ہے۔ عقدۂ مالا ینحل۔ جملہ موصولہ صفت واقع ہوا ہے۔

اسی قبیل سے ہے۔ بدل ما تخلل۔ جملہ موصولہ مضاف الیہ پڑا ہے۔ یعنی واحد مذکر غائب کا صیغہ ہے۔ یہ انسے اس طرح بولتے ہیں جیسے فارسی کا حرف تفسیر اور "یعنی چہ" جو محاورہ عام ہو رہا ہے وہ اس سے بھی بڑھ کر ہے۔ صائب نے کہا:

دلبرا طرح نوانداختہ تعنی چہ جامہ را فاختہ ساختہ یعنی چہ

اگر صحت پر خیال کریں تو تعنی چہ کہنا چاہیے لیکن اب محاورہ اور استعمال کی سند سے یہ غلطی ایسی زبانوں پر چڑھ گئی ہے کہ صحیح بولیں تو مسخراپن معلوم ہوتا ہے۔

(27) کبھی ایک حرف کے ساتھ دوسرا حرف ہوتا ہے اور مجموعہ کو ایک حرف سمجھ کر فقط ایک معنی اعتبار کرتے ہیں۔ دوسرے کا بالکل لحاظ نہیں کرتے چنانچہ ولیکن۔ عربی میں "و" عاطفہ حرف استشنا پر ہے۔ یہ کل کو ایک حرف استثنا شمار کرتے ہیں:

ولیکن خداوند بالا وپست بہ عصیاں در رزق بر کس نہ بست

بل عربی میں ترقی یا اضراب یا اعراض کے لیے آتا ہے۔ انہوں نے بلکہ بعض موقع پر بہ معنی شاید استعمال کیا:

در سرود گل ویاسمن این نور نہ دیدم ہنگامہ مرغان چمن بلکہ توباشی

(28) بعض تعلیلی تغیر کیے۔ مثلاً حاج بالتحدید تھا۔ انہوں نے تخفیف کر کے ایک "ی" زیادہ کر دی۔ اب سب حاجی کہتے ہیں۔

محفہ پردہ دار کجاوہ جو اونٹ پر کسا جاتا ہے۔ انہوں نے محافہ بنالیا۔

غدہ عربی لفظ ہے انہوں نے غدود بنالیا:

خدنگ عقدہ کشائے تو بایدم کہ غمت درون سینہ گرہ گشتہ چوں غدود مرا

ولے مخفف ولیکن کا ہے۔ سعدی: "ولے زبا طلش ایمن مباش و غرہ مشو"۔

(29) اس ہجوم الفاظ اور شورش تصرفات میں ہزاروں عربی الفاظ نظر آتے ہیں۔ ان کے فارسی الفاظ ایسے گم ہوئے کہ گویا ملک کی زبان میں ان کے لیے لفظ ہی نہ تھا۔

یہاں چند عربی لفظ لکھتا ہوں جو خاص و عام کے روزمرہ میں رائج ہیں۔ اول وہ چیزیں لکھتا ہوں جو عام لوگوں کی نظر میں عرب سے آئیں اور اپنے نام ساتھ لائیں مثلاً لباس میں عمامہ' جبہ' برقع' عبا' وغیرہ۔ کیا عجب ہے کہ فارس میں بھی یہ یا اس قسم کی اشیاء ہوں اور ان کا نام بھی ہو۔

اکثر چیزیں ہیں کہ فارس میں تھیں مگر اب عربی لفظ ان کی جگہ اس طرح کام دے رہے ہیں کہ اگر کتابوں میں ڈھونڈ کر ان کے لیے فارسی الفاظ نکالیں اور بولیں تو کوئی سمجھے بھی نہیں۔ یا مطلب اصلی فوت ہو جائے مثلاً کتاب۔ صفحہ۔ سطر، فصل، باب، اسم، فعل، حرف، غزل، قصیدہ، وکیل، قاضی، مفتی، فتویٰ، صندوق، حمام، پانچوں انگلیوں کے نام، دانتوں کے نام، ساقی، تنور، شمع، عید، قلیان (غلیان)، دلال، فراش، جلاد، صراف، بیطار، مسخرہ، صورت، شکل۔، شبیہ، کرسی، رکاب، نعل، عقیدہ، تہمت، وفا، الزام، سیر تماشا، غلط، صحیح، قبالہ، ضمانت، ضامن، وکیل اور قمری وغیرہ۔

(30) بعض باتیں اپنے ملک کے ساتھ خصوصیت رکھتی تھیں انہیں چھوڑ دیا۔ ان کی جگہ وہ باتیں اختیار کیں جو عرب کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہیں۔

فردوسی وغیرہ قدیمی شاعر تاریخی بات کو دہقان پیر کی طرف نسبت کرتے تھے۔ انہوں نے داستان کی ابتدا میں تمہید اختیار کی۔ حاکیان اسمار دراویان اثار عروس ایں حکایت در حجلہ بیان چنیں جلوہ دادہ اند۔

سمر۔ عرب کے بیاباں گرد قبیلے اپنے ریگستانوں میں جابجا سفر کرتے اور اترتے پھرتے تھے اور اسی عالم میں زندگی بسر کرتے تھے۔ جب چاندنی رات ہوتی تو اپنی اپنی تمبوئیوں اور تانے ہوئے کمبلوں سے نکل بیٹھتے اور کہانیاں کہہ کر جی خوش کرتے۔ عربی میں چاندنی کو سمر کہتے ہیں۔ چونکہ یہ کہانیاں چاندنی رات میں ہوتی تھیں اس لیے کہانی کو بھی سمر کہنے لگے۔

نعمان ابن منذر نے عرب میں لالہ کا تخم پہنچایا۔ ایک دن باغ میں چلتے پھرتے لالہ کے تختہ پر گزر ہوا۔ رنگا رنگ کے پھول دیکھ کر دل شگفتہ ہوا۔ چونکہ عربی میں شقائق

بہ معنی رنگارنگ ہے۔ اس کی زبان سے نکلاما احسن الشقایق (کیا بو قلمونی ہے) عرب کے لوگ اسے شقائق النعمان کہنے لگے۔ اب یہ بھی اپنی زبان میں شقائق النعمان استعمال کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ شقائق النعمان تھا تو ان کے لیے تھا۔ نہ کہ ان کے لیے۔

عرب کے لوگ اقصائے مغرب کے سونے کو کھرا سمجھتے تھے اور اسی واسطے زر خالص کو زر مغربی کہتے تھے۔ انہوں نے بھی زر دہ گانی اور زر دہ دہی کی جگہ زر مغربی اختیار کیا۔ کھوٹے سونے کو وہ پنجی کہتے ہیں۔

جعفر برمکی نے خلفائے عباسیہ کی وزارت میں اپنے عمدہ انتظاموں میں ایک یادگار یہ بھی چھوڑی کہ سکہ ہائے سابق کو تڑوا کر سونے کو خالص کیا اور خلفائے وقت کی ضرب اس پر لگائی چنانچہ وہاں زر جعفری اپنے کھرے پن میں مشہور تھا۔ انہوں نے وہی اختیار کیا۔

اس سے بڑھ کر یہ کہ اپنے تاریخی اشارے چھوڑ کر عرب اور اسلام کے نئے اور پرانے حوالے اختیار کیے۔ مثلاً نوح کا طوفان۔ خضر کی رہنمائی۔ عیسیٰ کی جان بخشی۔ موسیٰ کا عصا۔ مریم کی پاک دامنی۔ عرش۔ کرسی اور کعبہ کی بزرگی ذوالفقار کی برش وغیرہ وغیرہ۔

اکثر جگہ مذہبی محبت کو چھوڑ کر عرب کی عام مشہور باتوں کو بھی لیا چنانچہ لیلیٰ، عذرا، سلمیٰ، سعاد کا حسن، مجنوں، وامق کا عشق ایسا بھایا کہ ویس ورامین کے قصہ کو بھول گئے۔ خورنق، سدیر کی عمارتوں کی خوبی اور سنمار کی دستکاری نے قصر شیریں اور طاق بستان سے پہلو مارا۔ کوہ بوقبیس کی بلندی نے کوہ الوند اور بے ستون کا مقابلہ کیا۔

(31) اصول انشا کے شیرازہ بند جانتے ہیں کہ ایک زبان کے محاورہ کو دوسری زبان میں ترجمہ کرنا جائز نہیں مگر یہاں ہوا اور وہی محاورہ ہو گیا۔ چنانچہ اہل عرب علماء کو ارباب العمائم کہتے تھے۔ شیخ شیراز نے اس کا ترجمہ کیا:

چو قاضی بہ حکمت نویسد سجل نگردد ز دستار بنداں خجل

عرب میں ضرب المثل ہے "النوم اخ الموت"۔ بدر چاچ نے اس سے

مضمون نکالا:

چو دید دولت بیدارت از جہان نگرسخت گرفتہ دست برادر اجل خلیل و حشم

محاورہ ہے وبقطع النظر عن ذلک اہل فارس لکھتے ہیں۔ و چشم بریدہ ازاں میگویم کہ چنیں است و چنان است۔ غور کرو تو چنین و چناں بھی کذا و کذا کا ترجمہ ہے۔

عرب میں کہتے تھے: "علیلک ان تفعل کذا وکذا" اہل فارس کہتے ہیں۔ بر تو باد (یعنی از قبیل واجبات است بر تو کہ چنیں و چناں بعمل آری)

عربی محاورہ ہے۔ "الیک عنی"۔ نجود باش۔

یاللعجب۔ انہوں نے اس کا ترجمہ کیا۔ اے عجب اور اے شگفت شیخ شیرازہ جا جا کہتے ہیں:

شنید ای سخن مرد صاحب ادب بہ تندی برآشفت و گفت اے عجب

ومن ھھنا۔ انہوں نے کہا: وازینجاست (یعنی ہمیں سبب)

ومن ثم۔ وازینجاست (یعنی ہمیں سبب است)

بناء علی ذلک۔ بریں بنا۔ بنا بریں۔ بریں بنیاد کردہ میگویم۔

وله یدفی ذلک۔ او دریں کار دستے دارد۔

براسه۔ سر خود، اس کا ترجمہ ہے۔ نعمت خان عالی وقائع میں کہتے ہیں:

حضرت میر بذات خود پیرے مستند و سر خود میرے۔

سوادالعسکر۔ سیاہی لشکر اس کا ترجمہ ہے۔ اس سے خوشنما افعال مشتق کیے۔ لشکر سیاہی کرد (یعنی سامنے سے نمودار ہوا) کیا خوب کہا ہے فصیح فارس نے:

درنامہ زمانہ بجز حرف جنگ نیست گویا کہ از سیاہی لشکر نوشتہ اند

قام الخرب علی ساق۔ شاید اسی کا ترجمہ ہے۔ جنگ برپا شد اور قیامت برپا شد۔

قرآن میں آیا ہے والصبح اذا تنفس۔ انہوں نے اس سے مضمون پیدا کیا۔

قدسی:

ساقی بہ صبوحی نفسے پیشتر از صبح برخیز کہ تا صبح شدن تاب ندارم

اور نفس زدن صبح کا استعارہ اکثر اہل انشا میں عام ہے۔ بدرچاچ:

چوں صبح کہ زدیک نفس از سینہ پرسوز کے میل نجواب آیدو مہرش بہ خوراشد

صبح صادق گر نمیز ددم بہ مہر بوتراب تکمہ چاک گریبانش نبیند آفتاب

اہل عرب موصول کو منادیٰ کرتے ہیں۔ مثلاً: "یا من غدالی ساعدا و ساعدا دون" "البشر (اے کیسہ گشتی برائے من معاون پیش مردم) شیخ شیراز فرماتے ہیں:

"بیالاے کہ عمرت بہفتا ورفت" اور "اے آنکہ باقبال تو در عالم نیست"

"اور "اے کہ پنجاہ رفت و در خوابی"۔

قبل الارض بین یدیہ۔ زمین خدمت ببوسید۔ لیکن قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ادب کی رسم دونوں ملکوں میں یکساں ہو گی۔

احیاء اللیل۔ عرب میں شب بیداری کو کہتے ہیں۔ یہاں شیخ شیراز نے کہا ع

خردمند عثمان شب زندہ دار۔

(32) بعض محاورات ایسے ترجمہ ہو گئے ہیں جن کا اتحاد اتفاق معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اقتضائے عقلی واقعہ مذکورہ کے لیے یہی لفظ تجویز کرتا ہے خواہ عرب میں ہو خواہ فارس میں۔ مثلاً:

طویل الباع عرب کا محاورہ ہے۔ فارس میں اس کے لیے فراخ دست اور دست رسا ہے۔

قصیر الباع عرب کا کوتاہ دست۔ ظہوری بادشاہ کی تعریف میں کہتا ہے:

کوتاہ دستان بلند حوصلہ ہرچہ شب خواب بیند۔ صبح از باغ شخالیش گل مراد چنیند۔ شیخ سعدی نے کہا ہے:

قوی بازوانند کوتاہ دست

خردمند وشیدا وہشیار ومست

قوی بازوانند کوتاہ دست خردمند و شیدا و ہشیار ومست

جر الذیول خرام متکبرانہ مراد ہے۔ دامن کشاں رفتن سے انہوں نے بھی

نازوانداز دکھائے ہیں۔

دمع الشمع — شمع سے جو چربی بہتی ہے۔ فارس میں بھی اسے اشک شمع کہتے ہیں۔

بالراس والعین — بسر و چشم۔ چشم اور چشم بھی کہتے ہیں۔

قرۃ للعیون — خنکی چشم ہر ملک میں باعث صحت چشم ہے۔ عجب نہیں کہ ہر ایک اپنے محاورہ کا مالک ہو۔

رطب اللسان — تر زبان۔ ہر ملک میں خشکی زبان حارج تکلم ہے۔

بنت العنب — دختر رز کہتے ہیں۔ شاعر نے اس سے عجب رنگین مضمون پیدا کیا ہے:

بنت الکرم — ساقیاں دختر پیرے کہ فرومانده ز تاک
خوب کردند کہ درگردن مینا بستند

غزالہ — عربی میں آفتاب کو کہتے ہیں۔ بدر چاچ نے اس کا ٹھیک ترجمہ کیا:۔

سبزہ زار آسماں را در پناہ عدل او — مرتع آہوئے مادہ سینہ شیر ز است

بنات النعش — دختران نعش۔ "چوں دختران نعش بہ پیرامن جدی"۔

ذنب السرحان — دم گرگ اس کا ترجمہ کیا کہ صبح کاذب سے مراد ہے۔

ماء الحیوۃ — آب حیوۃ۔ آب زندگی۔

فرزین ہذہ الرقعہ — عرب کا محاورہ ہے مگر نہیں کہہ سکتا کہ کس نے کس سے لیا ہے۔ سعدی:

تو دانی کہ فرزین ایں رقعہ ام
نصیحت گر شاہ ایں بقعہ ام

کبھی برعکس اس کے محاورہ فارس کے لیے عربی لفظ استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً راہ دادن کی جگہ طریق دادن:

دو خواہند بودن بہ محشر رفیق — ندانم گدایاں دہندم طریق

خاتمہ

عزیزان وطن۔ میٹھی زبان نے شیر کو شکر میں ملا کر دکھا دیا کہ میں جس قوم کی زبان ہوں ملنساری اس کی کس حد کو پہنچی ہے۔ آزاد اپنی کم زبانی سے شرمندہ ہے کہ بیان کا حق ادا نہ کر سکا۔ پھر بھی جو کچھ کہا گیا سمجھنے سمجھانے کو کافی ہے۔ اب ایک اور مطلب کی سماعت پر مستعد ہونا چاہیے جو کہ خاص اپنے ملک سے متعلق ہے۔ یعنی فارسی زبان جب ہندوستان میں آئی تو اس سے اور ہندی سے کیا معاملے گزرے۔ اس مضمون کو جلسہ آئندہ پر ملتوی رکھ کر حاضرین اور شائقین سے رخصت چاہتا ہوں:

اب تو جاتے ہیں میکدہ سے میر
پھر ملیں گے اگر خدا لایا

دسواں لکچر

فارسی پر ہندوستان میں آکر کیا کیا رنگ چڑھے۔

عربی نے جو جو اثر فارسی پر کیے۔ اکثر تم نے سن لیے۔ اب ذرا دیکھو کہ خود فارسی جب عربی سے رنگین ہو کر ہندوستان میں آئی تو وہ ہندی کے ساتھ کس طرح پیش آئی اور ہندی نے اس پر کیا کیا رنگ چڑھائے۔ اول تو یہی دیکھو کہ یہاں اردو ایک نئی زبان پیدا کر دی۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ خود اپنے سلسلہ میں بھی بہت سے ہندی لفظوں کو جگہ دی۔ ہندوستان میں جو مسلمان آئے تو زیادہ تر ترک قوم کے بادشاہ آئے۔ مگر تعجب ہے کہ تصنیفات ان کی یا عربی میں رہیں یا فارسی میں۔

سلاطین چغتائیہ کے عہد میں بھی دربار کی زبان فارسی رہی مگر ملک کی خاک اور قوم کی تاثیر بھی موجود تھی۔ سینکڑوں ہندی لفظ اس میں بولتے تھے اور لکھتے تھے۔ جہانگیر کے ہاں جب خورم (شاہجہاں) پیدا ہوا تو اکبر بادشاہ نے اسے بیٹا کر لیا۔ وہ اکبر کو شاہ بابا اور جہانگیر کو شاہ بھائی کہا کرتا تھا۔ اکبر بادشاہ جہانگیر کو شیخوجی کہتا تھا۔ اور مراد کو پہاڑی راجہ۔

ایک دن فیضی حسب الحکم حضور میں کچھ لکھ رہا تھا۔ بیربل بات کرنے لگا اکبر نے آہستہ سے کہا۔ "حرف نزنید شیخ جی می نویسد۔" تم عہد چغتائیہ کی تصانیف دیکھو گے تو معلوم ہو گا کہ کتابوں میں "جروکہ درشن" برابر لکھتے تھے اور کبھی کہتے تھے۔ "بپائے درشن حاضر شدہ باریاب مجرا گشت۔"

سرچوکی۔ ان نوکروں کے افسر کو کہتے ہیں جو اپنی باری پر حاضر ہو کر کام دیں۔ ظہوری نے سہ نثر میں بادشاہ کی تعریف میں کہا۔ "بارجگت گردئی عالم بردوش گرفتہ" اور ساقی نامہ میں کہا:

شود چہرۂ زرد خورشید آل دہندش اگر نازنیناں اگال

اب چند ایسے الفاظ دکھاتا ہوں جن میں فارسی تلوار نے اپنی تراش کا جوہر دکھایا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب فارسی ہندوستان پر قابض ہوئی تو کوئی مانع نہ تھا جو اسے ہندی لفظوں میں تصرف کرنے سے روکے۔ دین، دربار اور علوم فنون انہی کے تھے۔ سنسکرت میں پرانے خزانے تھے جن کا حاصل کرن طالب کمال کو واجب تھا مگر فتحیاب کی خود پسندی اجازت نہ دیتی تھی کہ پسند کی آنکھ سے دیکھ سکیں اور اس سے کچھ حاصل کریں یا استعمال میں اس کے لفظوں کی صحت و غلطی بلکہ معنی و بے معنی یا درستی و نادرستی کی خبر لیں۔ البتہ ابوالفضل وغیرہ دو تین مصنف اہل تحقیق ہوئے۔ انہوں نے تصحیح الفاظ کا حق ایسا ادا کیا کہ حروف و اعراب تک کو عبارت میں تحریر کر کے کھولا۔ ورنہ کسی نے لفظوں کی تحقیق اور ان کے صحیح بولنے کی پروانہ کی۔ اپنی زبان میں جس لفظ کو جس طرح ٹوٹا پھوٹا ادا کر سکے اسی طرح بول دیا اور تعریب کے مقابل میں اس کا نام تفریس رکھا۔

تفریس کی ضرورت مختلف سببوں سے ہوتی تھی۔ تم جانتے ہو کہ ٹ ڈ ڑ مثقلہ زبان فارسی میں نہیں۔ جن ہندی لفظوں میں کوئی حرف ان میں سے ہوتا ہے تو "ت۔ د۔ ر" ہو جاتا ہے۔ (2) ہائے مخلوط التلفظ ان کی زبان میں نہیں۔ جس ہندی لفظ میں آجاتی ہے اسے گرا دیتے ہیں۔ (3) کسی فارسی لفظ میں تشدید تم نے نہ دیکھی ہوگی۔ زبان فارسی گویا بالطبع اس سے انکار رکھتی ہے۔ دیکھو عربی نے اس میں بے شمار مشدد الفاظ پھیلائے مگر ان کی زبانوں کو تشدید کی مشق بہت کم ہوئی۔ اسے طبعی اثر کا زور سمجھنا چاہیے کہ جس ہندی لفظ میں تشدید ہوتی ہے۔ تخفیف ہو جاتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

بعض موقع پر اسباب مذکورہ بالا میں سے کوئی نہ کوئی سبب ہوتا ہے جو تفریس کے لیے مجبور کرتا ہے۔ مثلاً:

کٹارہ کو کتارہ کہتے ہیں۔ صاحب رشیدی نے سفرنامہ سے نقل کیا اور بعض اشخاص نے اسے تسلیم بھی کیا کہ اصل اس کی قتالہ ہے۔ اہل یمن کے محاورہ میں ہے۔ مگر یہ ان صاحبوں کا خیال ہے۔ کیونکہ کٹار خاص ہند کا حربہ ہے۔ سلف سے اپنا نام ساتھ لیے چلا آتا ہے۔ یہ لفظ کہیں سے لیا ہوا نہیں ہے۔

سر آں دو چشم گردم کہ چو ہندوان رہزن   ہمہ را بہ نوک مژگاں زدہ بر جگر کتارہ

جمدھر کو اہل فارس اپنے تلفظ میں جمدر کہتے ہیں۔ طغرا:

شوخ سوسن راجگودل ے ربابد قشقہ لت
ذات رجپوت است ترسم دست بر جمدر کند

متھرا شہر کو متورہ کہتے ہیں:

چوں زند سبز متورہ حرفے از پاژند حسن   بہر زیب نطق مصحف خوان گل از بر کند

سکھر کو سکر اور سکھری کو سکری کہتے ہیں:

اے خدا عالی بیچارہ بہ ہوند آمدہ است   نازنیں شوخ ظریف سکری میخواہد

جھگڑ کو جکر کہتے ہیں۔ اس میں تشدید کو تخفیف اور ڑائے مثقلہ کو رائے مہملہ سے بدل لیا ہے۔ اسی قیاس پر جھروکہ درشن کو جروکہ درشن کہتے اور لکھتے تھے۔

عرفی:۔

در چاشتگہ از شبنم گل گرد فشانست   آں باد کہ در ہند اگر آید جکر آید

کھچڑی کو کچری کہتے ہیں۔ سالک یزدی:

سیر گشتم ز کچریے لیام ہوس سیم و زر نمیدارم

برامختر۔ ہائے مخلوط اور ایسے "ن" کے ساتھ ہے جو ہماری زبان سے نہیں نکلتا۔ اہل فارس نے برہمن اور برہمن کر لیا۔ چندر بھان، دارا شکوہ کے منشی نے کہ برہمن تخلص کرتا تھا کہا:

مرا دلیست بکفر آشنا کہ چندیں بار   بکعبہ رفتم وبازش برہمن آوردم

چوکھنڈی بالاخانہ جسے ہوا کے لیے چاروں طرف سے کھلا رکھتے ہیں:

چوکندی شکوہش اگر سایہ افگند   پیل سپہر شانہ بدزدد بزیر آں

(2) بعض موقع پر کوئی سبب تفریس کے لیے نہیں ہوتا۔ مگر وہ پھر بھی اپنا دخل کر ہی لیتے ہیں۔ چنانچہ اکثر اہل زبان کو گفتگو میں دیکھا جاتا ہے کہ بھاری لعل کو بہاری لعل کہتے ہیں۔ میں نے خود ایک شخص سے کہا کہ جناب آغا! ایں بھاریست۔ بالکسر بفرمائید۔ متعجب ہو کر بولے کہ بہاری؟ پس ایں چہ معنی دارد؟ میں نے کہا نام یکے از

پیشوایان ہنوز است۔ آغا صاحب جھنجھلا کر بولے کہ "خیر۔ او معنے ندارد۔ بہاری منسوب بہ بہار بامعنی لفظیست۔ ایں خیلے خوب است۔ باید بہار خوانیم۔"

اسی طرح جنگل کشور اور تولکشور میں کشور کو بہ سکون "شین" اور "فتح" واو بولتے ہیں۔ میں نے کہا کہ آغا! کشور بہ سکون واو مجہول است۔ کہنے لگے کہ "خیر۔ کشور معنے ندارد۔ کشور بمعنے ولایت لفظ خوبیست باید کشور بگوئیم۔

یہی اثر تھا جس کے زور نے کلیم کی زبان سے شاہجہاں نامہ میں سنگھ کو سنگ کہوا دیا:

سر راجپوتاں جگت سنگ بود که بر شیشه نه فلک سنگ بود

یہ تصرف بعض جگہ کسی قاعدے کے پابند نہیں ہوتے اور اکثر لفظوں کے حرفوں یا حرکتوں کو ادل بدل کر اپنی زبان کے قالب پر ڈھال لیتے ہیں۔ کیونکہ ہر ایک ملک کے لوگوں کی زبان و دہان کو قدرت نے اس طرح بنایا ہے کہ وہ غیر ملک کے لفظوں کو جوں کا توں ادا نہیں کر سکتے۔

مارواڑ اور سندھ کے درمیان میں ایک علاقہ کا نام جیسلمیر ہے۔

اہل ایران اسے جسر میر کہہ گئے ہیں۔ چنانچہ طغرا کا شعر غزل مذکورہ بالا میں ہے:

نوحه کز جسر میر آید به گلزار بهشت از نزاکت جائے خود بردید عبهر کند

جمنا کو جمنہ اور جمن باندھتے ہیں۔ ملا طغرا:

چوں تخت شه زگل نزندم که بهر او اورده آب جمنه ز ملک بهار تخت

کہار۔ کو کہا (مشدد) باندھا ہے۔ طغرا:

چوں کرده رو بر پالکی گردیده خاور پالکی بنشست تا در پالکی نه چرخ کهار آمده

گربھ سوت: ہندی ہے۔ سوت اور ریشم کے ملے ہوئے کپڑے کو کہتے ہیں۔ اہل ایران اسے گرم سوت کہتے ہیں۔ محسن تاثیر:

سخن ہند از قماش لفظ بے مضموں نمیگردد که گرمی از لباس گرم سوت افزوں نمیگردد

میرے دوستو۔ تمہیں تعجب آئے گا جب میں اکثر الفاظ ایسے سناؤں گا کہ فارسی ہیں مگر زبان فارسی نے ہند میں آکر پیدا کیے ہیں۔ تم انہیں فارسی سمجھ کر بولتے ہو اور

فارس والے ان سے وہ مطلب نہیں سمجھتے جو تم مراد لیتے ہو۔ مثلاً:

شبنم، تن زیب، جامدانی، کامدانی۔ وغیرہ کپڑوں کے نام ہندوستان میں فارسی لفظوں میں ہیں مگر وہ لوگ نہیں سمجھتے۔

رہباری۔ مزدور جو راہ سفر میں تمہارا بوجھ اٹھا کر لے چلے۔

فارغ خطی: بروقت فیصلہ باہمی۔ مدعی اپنے مدعا علیہ کو لکھ کر دیتا ہے۔

دست پناہ۔ جو دسپنا مشہور ہے۔ ایران میں اسے آتشگیر کہتے ہیں۔

خوشدامن۔ یہاں ساس کو کہتے ہیں۔ وہاں مادر زن یا خشو کہتے ہیں۔

خویش۔ یہاں داماد کو کہتے ہیں۔

تاہم۔ اہل ہند کا ایجاد ہے۔ "بااین ہمہ" یا "بازہم" "باوجود ایں" جو مناسب مقام ہو اہل ایران کا محاورہ ہے۔

فوج کے عہدہ داروں کے نام رسالہ دار۔ جمع دار۔ برقنداز۔ تھانہ دار۔ سب یہیں کے لفظ ہیں۔ بلکہ رسالہ بھی یہیں کا ایجاد ہے۔

متصدی اور منشی۔ نویسندوں کے نام یہاں قرار پائے ہیں۔ وہاں میرزا کہتے ہیں۔ ان کے دفتر کی اصطلاحیں بھی یہیں تصنیف ہوئی ہیں مثلاً:

روشنائی۔ یہاں سیاہی کو کہتے ہیں۔ وہاں مرکب کہتے ہیں۔

رسید۔ یعنی سند قبض الوصول۔

رسد۔ کاروان غلہ و سامان لشکر۔ ایران میں اسے سورسات کہتے ہیں۔

دفتر۔ آجکل وہاں فرد کاغذ کو کہتے ہیں۔

چلم۔ یہاں مشہور ہے۔ اسے وہاں سر قلیان کہتے ہیں اور کابل، قندھار اور ہرات میں حقہ کو چلم کہتے ہیں۔

دستانہ۔ اسلحہ جنگ میں ایک لوہے کی چیز تھی کہ ہندوستانی بہادر لڑائی میں ہاتھوں پر پہنتے تھے۔ کہنیوں تک زخم سے حفاظت کرتے تھے۔ ایران میں اسے قلچاق کہتے ہیں۔

اس طرح کے بہت سے لفظ ہیں کہ سلاطین ہند کے درباروں اور دفتروں میں

نکلے اور تمام ہندوستان میں رواج پا کر یہاں کی تصنیفات میں داخل ہو گئے۔ انھیں ہندوستانی فارسی کہنا چاہیے۔ اہل ایران کو خبر بھی نہیں ہے۔ انشا پرداز کو چاہیے کہ جس طرح ان لفظوں سے باخبر ہے اسی طرح ان لفظوں سے بھی آگاہ رہے جو کہ ایران میں ان کی جگہ بولتے ہیں تاکہ جب اہل زبان کے جلسہ میں بیٹھے تو شرمندہ نہ ہونا پڑے۔ وہی بولے جو وہ آپس میں بولتے ہیں۔ کیونکہ فارسی وہی ہے جو فارس میں بولیں نہ کہ ہند میں۔

جب سلسلہ کلام کا یہاں تک پہنچا تو واجب ہے کہ ان غلطیوں کو کھول کر بیان کروں جن میں خود آلودہ رہا اور اکثر بے استعداد ہم وطن میرے مبتلا ہیں۔ اس مطلب کو جس قدر پھیلایا جائے اسی قدر مناسب ہے تاکہ کانوں سے زبانوں پر اثر پہنچے۔ زبان کے معاملہ میں فقط سمجھ لینا کافی نہیں۔ مشق اور کثرت استعمال ایک ضروری شرط ہے۔ اکثر غلطیاں جو ہم لوگوں سے گفتگو اور تحریر فارسی میں ہوتی ہیں۔ ان کا سبب یہ ہے کہ ہم کو ان کے ہر قسم کے الفاظ پر اور مناسب مقام محاوروں پر عبور نہیں۔ یہ بات دو طرح سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اول تو یہ کہ ہمیشہ اہل زبان کے ساتھ نشست و برخاست رہے اور ہر وقت ان سے ہمکلام رہیں۔ یہ نہ ہو سکے تو ان کے کلام کو ہر وقت پڑھتے رہیں اور زبان پر جاری کرتے رہیں۔ ہم ان دونوں دولتوں سے محروم ہیں۔ اس لیے جا بجا ٹھوکریں کھاتے ہیں اور دیکھنے والوں کو اپنے اوپر آپ ہنساتے ہیں۔

حالت یہ ہے کہ جب کوئی مطلب فارسی میں ادا کرنا ہوتا ہے تو پہلے اس کی اردو سوچتے ہیں۔ پھر فارسی میں اس کا ترجمہ کرتے ہیں۔ ہر مقام کے مناسب حال فارسی کے محاورے زبان پر نہیں۔ لفظی ترجمہ کر دیتے ہیں۔ وہی تمسخر اور ریشخند کا سامان ہوتا ہے۔ ایک ولایتی جب اردو بولنے لگتا ہے تو اس کی بے محاورہ باتوں پر تم کیوں ہنستے ہو؟

اسی لیے ہنستے ہو کہ اس کا بے محاورہ پن کانوں میں گدگدیاں کرتا ہے۔ وہ تمہارے محاوروں پر اچھی طرح حاوی نہیں اس لیے ادھر ادھر سے توڑ جوڑ کر جگہ بے جگہ الفاظ بولتا ہے۔ تمھیں اس پر ہنسی آتی ہے۔ بس اسی طرح ہم لوگوں کی فارسی کا حال ہے کہ ذرہ ذرہ سے لفظ جو بات بات کے بولنے چالنے میں کام آتے ہیں ان کے فرق ہمیں معلوم نہیں۔ یا معلوم ہیں زبان پر رواں نہیں۔ ہم کبھی تو اپنے محاورہ کا ترجمہ کر جاتے ہیں۔

کبھی بے خبری کے سبب سے جو منہ میں آتا ہے وہ کہہ جاتے ہیں۔ اہل زبان سن کر ہنس دیتے ہیں۔ مثلاً اگر کہنا چاہیں۔ میں نے سیب کے مربے سے روٹی کھائی تو:

ہم کہتے ہیں	نان از مربائے سیب خوردم	
اہل زبان کہے گا	نان بمربائے سیب خوردم	
ہم کہتے ہیں	ایں عبارت را از روشنائی بنویسید	وایں را از شنگرف
اہل زبان کہے گا	ایں عبارت را بمرکب بنویسید	وایں را بہ شنگرف
ہم کہتے ہیں	ایں صفحہ را از قلم نیزہ نوشتہ	وایں را از قلم آہن
اہل زبان کہے گا	ایں صفحہ را بقلم نیزہ نوشتہ	وایں را بقلم فولاد

ضمیریں منفصل ہماری زبانوں پر ایسی چڑھی ہیں کہ متصل کے لطف اختصار سے بالکل محروم ہو گئے۔ مثلاً بلی کچھ پکڑ لائی ہے۔ پوچھتے ہو کہ اس کے منہ میں کیا ہے۔ ہندی کہے گا کہ در دہن ایں چہ چیز است۔ اہل زبان کہے گا بدہنش چیست۔ بدہن چہ دارد۔

اسے اندر نہ آنے دینا۔ ہندی کہے گا۔ ایں را درون آمدن ندہید۔

اہل زبان کہے گا۔ مگزار کہ سر فرش بیاید۔

اگر کہنا منظور ہو کہ۔ اسے باہر نکال دو۔ تو ہم کہتے ہیں ایں را بیرون کن۔ اہل زبان کہتے ہیں۔ بدرش کن۔

ہم ایک بچہ سے پوچھتے ہیں تو کہتے ہیں۔ بدست شما چہ چیز است۔ ایرانی کہتا ہے۔ بدستت چہ داری۔ در دست چہ داری۔ بدستت چیست۔

(حکیم ایرانی ہمارے کہتا ہے)۔ وستت من بدہ۔ نبضت من بنما۔

ہم کہتے ہیں تیرا قلم کیا ہوا۔ قلم تو چہ شد۔ قلم تو کجا رفت۔ اہل زبان کہتا ہے۔ قلمت راچہ کردی؟ قلمت چہ شد؟ میں نے آپ دیکھا ہے یہیں تھا۔ ہم کہتے ہیں۔ من خود دیدم ہمیں جابود۔ اہل زبان کہتا ہے۔ بندہ خودم دیدم ہمیں جابود۔

ہندوستانی پوچھتا ہے۔ ایں کارد کیست؟ ایرانی پوچھتا ہے۔ ایں کارد از کیست؟ ہم کہیں گے۔ ایں کارد من است۔ ایرانی کہے گا۔ از من۔ از ماست۔ از خودبندہ۔

اگر جواب میں کہتا ہو کہ۔ یہ تمہارا ہی چاقو ہے؟ تو ہم کہیں گے۔ ایں کاردلِ شماست؟ (دیکھو ہی کا اشارہ رہ گیا)۔ اہلِ زبان کہے گا۔ از خودِ تانست۔ از خود شماست؟

ایک خط کا لفافہ چاہئے ہو تو ہم پوچھیں گے نزد جناب لفافہ ہست۔ پیش شما لفافہ ہست؟ اہل زبان کہے گا۔ لفافہ ہست؟ لفافہ[41] دارید؟

جواب میں ہم کہیں گے۔ نزد من نیست۔ نزد بندہ نیست۔ پیش بندہ نیست۔ ایرانی کہے گا۔ ندارم۔ ندارم آغا۔ پیش من نیست آغا۔

یہ تصویریں تمہارے پاس کہاں سے آئیں؟ ہم ترجمہ کر دیں گے۔ ایں تصویرہا پیش شما از کجا آمدند۔ ایرانی کہے گا: این تصویرہا را از کجا یافتید۔

تمہیں ان میں سے کون سی چاہیے؟ ہندی کہتا ہے۔ شما را ازیں تصویرہا کدام تصویر درکار است۔ اہل زبان کہے گا۔ شما کدامش میخواہید؟

مثلاً دکاندار سے تم نے ایک چاقو مانگا اور پسند نہ آیا۔ تم کہتے ہو۔ یہ میرے کام کا نہیں۔ ہم خدا جانے کیا کیا کہتے ہیں۔ پھر بھی مطلب نہیں ادا ہوتا۔ صاحب زبان کہہ دیتا ہے۔ بکارم نمیخورد۔

دکاندار کہتا ہے۔ یہ اور ہے۔ وہ کہتا ہے۔ نمیخواہم۔ بکار ندارم آغا۔

ایک شخص کے سامنے دوا کا پیالہ دھرا ہے۔ کہتا ہے۔ کیا کروں۔ نہیں پیا جاتا۔ ہم کہتے ہیں۔ چہ کنم کہ نوشیدہ نمیشود۔ آشامیدہ نمیشود۔ اہل زبان دو لفظوں میں فیصلہ کر دیتا ہے۔ چہ کنم کہ نمیتوانم۔

ایک لڑکا فارسی زبان کا شوقین کوٹھے پر جانے لگا۔ کسی نے پوچھا۔ کجا میروید آغا؟ اس نے کہا۔ برائے گذاشتن کتاب بالا میروم (لفظی ترجمہ اردو کا ہے۔ اوپر کتاب رکھنے جاتا ہوں) محاورہ سے واقف ہوتا تو کہتا۔ میروم کتاب بالا بگذارم۔

ایک غریب نواب صاحب کے ہاں گیا۔ دربان نے جانے نہ دیا۔ فارسی میں کہتا ہے۔ خانہ نواب صاحب رفتہ بودم۔ دربان رفتن نہ داد۔ اہل زبان کہتا ہے۔ خانہ نواب رفتہ بودم دربان نگزاشت کہ دروں روم۔

جانے دو۔ ہندی کہتا ہے۔ رفتن بدہ! اہل زبان کہتا ہے: بگزار کہ برود! نہ جانے

دیتا! نگزارکہ بر ود۔

کوئی۔ اردو میں انسان اور غیر انسان دونوں کے لیے آتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ میں گیا تھا وہاں کوئی نہ تھا اور یہ ساری لگتا ہے۔ کوئی چیز بھلی نہیں لگتی۔ فارسی میں انسان کے لیے کس یا کسے کہتے ہیں۔ چیز کے لیے ہیچ یا "ی" کافی ہوتی ہے۔ جنہیں یہ نکتہ زبان پر چڑھا ہوا نہیں۔ وہ دونوں موقع پر کس یا کسے بول جاتے ہیں چنانچہ کہیں گے۔ "بندہ رفتہ بودم آنجا کس نبود" یا "ہیچ کس نبود یا کسے نبود" اور دوسرے فقرے کا بھی وہی ترجمہ کر دیں گے کہ "کسے چیز خوشم مے آید"۔ اگر بجائے اس کے کہتے۔ ہیچ چیز خوشم مے آید۔ چیزے خوشم مے آید۔ چیزے بمذاقم خوش نمے آید۔ تو محاورہ درست ہوتا۔

ناواقف زبان کہتا ہے۔ اگر کسے حویلی در خیال شما باشد نشان دہید کہ من بکرایہ بگیرم۔ یہ ترجمہ بھی اس فقرے کا ہے کہ کوئی حویلی تمہارے خیال میں ہو تو بتاؤ کہ میں کرایہ کو لوں گا۔ اگر کسے خط از وطن بیاید ضرور مرا خبر کنید۔ کوئی خط وطن سے آئے تو ضرور مجھے خبر کرنا اور۔

اہل زبان کہے گا۔ اگر مکانے در نظر شما باشد بہ بندہ نشان دہید کہ کرایہ بگیرم۔ اگر خطے از وطن برسد بہ بندہ خبر دہید۔

اردو میں اکثر کوئی بھی اور شخص بھی دونوں کو جمع کر کے کہتے ہیں۔ کوئی شخص وطن سے آئے تو مجھے ضرور خبر کرنا۔ یہ فارسی میں بھی کہہ دیتے ہیں۔ اگر کسے شخص از وطن آید ضرور مرا خبر کنید۔ یہاں اتنا ہی کافی ہے کہ اگر شخصے از وطن برسد یا کسے از وطن بیاید۔

یہ بات بھی جتانے کے قابل ہے کہ ہمارے ہم وطنوں نے ایشاں یا شاں کو نزدیک کے لیے رکھا ہے۔ یعنے ان کا ترجمہ سمجھا ہوا ہے اور اوشاں کو ان کا ترجمہ قرار دیا ہے اور یہ بے فائدہ محض ہے۔

حاضر و غائب کی ضمیروں میں بھی ہم لوگ اسی طرح سے شتر گربہ کرتے ہیں اور غائب کی ضمیر اور غائب فعل سے خطاب کرنا ادب میں داخل سمجھتے ہیں مثلاً جناب آغا شما کجا رفتہ بودند۔ جناب کجا تشریف بردہ بودند۔ بندہ صبح حاضر شدہ بود۔ کبھی فعل حاضر لگا دیتے ہیں اور کہتے ہیں۔ آں کرمفرما کجا رفتہ بودید؟ کجا خواہید رفت؟ آں غائب پر اشارہ

کرتا ہے اور بودید اور خواہید رفت صیغہ ہائے حاضر ہیں۔ اہل زبان ہو گا تو صاف کہہ دے گا۔ کجا رفتہ بودید؟ بندہ صبح آمدہ بودم۔ اور۔ کجا خواہید رفت کی جگہ کہے گا کجا میروید؟ وغیرہ استقبال کی جگہ صیغہ حال سے کام لیتے ہیں۔

ہمارے اہل وطن میں تعظیم کے موقع پر آنجناب کا بہت خرچ ہے اور فعل بھی غائب۔ مثلاً بندہ خدمت آنجناب عرض کردہ بود اور آنجناب کجا تشریف مے برند۔

اینجانب اپنے لیے بولتے اور لکھتے ہیں۔ مثلاً۔ اینجانب رفتہ بود۔ اہل زبان اینجانب بولتے ہیں مگر اینطرف کے معنوں میں لکھتے ہیں۔ مثلاً از اینجانب قصورے نخواہد رفت یا فلاں کس از متوسلان اینجانب بودہ۔

اکثر خطوں میں دیکھا جاتا ہے کہ لڑکے کے لیے نور چشم اور اس کی بہن ہو تو نور چشمی لکھتے ہیں اور اعتراض کرو تو صاحب زادہ اور صاحب زادی سند پیش کرتے ہیں۔ایسے لوگ لفظ قبلہ گاہی کو ضرور ماں سمجھتے ہوں گے۔ یہ غلطیاں انہی دو کوتاہیوں سے پیدا ہوئی ہیں کہ اہل زبان کی صحبت نہیں اور کتاب پر نظر نہیں۔

اہل ہند نے کتاب میں پڑھا ہوا ہے کہ نہادن بہ معنی رکھنا۔ چنانچہ جب کہنا چاہتے ہیں کہ گلاب کا شیشہ طاق میں رکھ دو۔ یا میری کتاب طاق پر رکھ دو۔ تو فارسی میں کہتے ہیں کہ شیشہ گلاب در طاق بنہید اور عمامہ بسر بنہید۔ کوئی زیادہ فصاحت خرچ کرتا ہے تو کہتا ہے کتاب من بر طاق بگزارید۔ یا کتاب بندہ بطاق بگزارید۔

واقف زبان کہے گا۔ شیشہ گلاب سر طاق بگزارید۔ اور کتابم سر طاق بگزارید اور عمامہ بر سر بگزارید۔ کتاب روئے میز بگزارید۔ یا سر میز بگزارید۔ مشکل یہ ہے کہ اسے سن کر جب کہنا چاہتے ہیں کہ میرا چوغا رکھو کل لے لوں گا تو کہتے ہیں۔ چوغائے من بنہید یا بگزارید فردا خواہم گرفت۔ اہل زبان کا صحبت یافتہ چغا دیتا ہے اور کہتا ہے۔ ایں را پیش خود نگہدارید۔ فردا میگرم۔

خواہم گرفت اور مے گیرم کے اختلاف کا سبب بھی جتانے کے قابل ہے۔ ہم لوگوں نے قواعد کی کتابوں میں پڑھا ہوا ہے کہ استقبال کا صیغہ یہ ہے اور حال کا یہ ہے اس کے بموجب ہر وقت کے لیے اسی کا صیغہ بولتے ہیں اور لکھتے ہیں۔ اہل زبان کے کلام

میں استقبال کی جگہ ہمیشہ حال کا صیغہ آتا ہے۔ اس لیے ہمیں بھی وہی بولنا چاہیے۔

لطف یہ ہے کہ بہت آدمیوں کو گفتگو میں دیکھا کہ فردا اور دیروز میں فرق نہیں سمجھتے۔ اردو میں گزشتہ اور آئندہ دونوں کو کل ہی کہتے ہیں۔ ایسے لوگ بے تکلف کہتے ہیں کہ دیروز ضرور بہ بندہ منزل تشریف آرید۔ ودیروز حاضر خدمت خواہم شد۔ اور فردا آمدہ بودم شما خانہ بنودید۔

کسی بہادر کی تعریف کے موقع پر ہندی کہتے ہیں۔ وہ بڑا بہادر ہے جب شیر مارا ہے تلوار ہی سے مارا ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں۔ او بسیار بہادر است۔ وقتیکہ شیر را زدہ است بہ شمشیر زدہ است۔ او بسیار شیر ہا ازدہ است اور من ہم امروز موشے زدہ ام۔ اور۔ فلاکس در جنگ زدہ شد۔

اہل زبان ہرگز اس طرح نہ کہے گا۔ وہ کہے گا۔ خیلے دلاور است۔ شیر را گاہے نہ کشتہ مگر بہ شمشیر۔ اور۔ بسیار شیر ہا کشتہ است۔ اور۔ شیر راہچو موش میکشد۔ اہل زبان جب کہتے ہیں کہ احمد را سگ زدہ است۔ محمود را مار زدہاست۔ اس سے کتے اور سانپ کا کاٹنا مراد ہوتا ہے۔

یہی لوگ ہیں جو گزیدن اور بریدن کا فرق بھی نہیں رکھتے کیونکہ اردو میں کتے کے کاٹنے کو بھی کاٹنا کہتے ہیں اور چھری تلوار کے کاٹنے کو بھی کاٹنا کہتے ہیں۔ بچہ پر خفا ہوتے ہیں تو کہتے ہیں۔ صبح زد استاد تو خواہم رفت و خواہم گفت گوش تو میگزد۔ اہل زبان کہتا ہے۔ صبح پیش استادت میروم و میگویم۔ گوشہایت ے برد۔ اسی طرح جو لوگ محاورہ سے بے خبر ہیں کتے اور بھڑ کے لیے کہتے ہیں۔ ملا فرقان بہ بازار میرفت سگ بپایش گزید اور زنبور بدستش گزید (برید بھی کہہ دیتے ہیں)۔

اکثر اشخاص ہیں کہ شکستن اور گسستن میں بھی فرق نہیں کرتے۔ نہیں جانتے کہ گسستن رسی اور ڈورے کے لیے خاص ہے۔ اس لیے پاؤں ٹوٹے۔ ہڈی ٹوٹے۔ پیالہ۔ سر۔ ڈورا۔ جو ٹوٹے ایک ہی لفظ کہہ دیتے ہیں کہ احمد از درخت افتاد پایش گست اور استخوانش بگست۔ اور پیالہ از دست افتاد و بگست اور سرش بگست اور رشتہ نازک بود بگست۔

گذاشتن کے معنے آمد نامہ میں چھوڑنا پڑھے ہیں۔ جانتے ہیں کہ چھوڑنا ایک ہی

ہوتا ہے۔ خواہ گھر چھوڑنا۔ خواہ بندوق چھوڑنی۔ خواہ کتے کو شکار پر چھوڑنا۔ اسی واسطے کہتے ہیں کہ احمد مدرسہ راگزاشت وخانہ راگزاشت اور تفنگ گزاشت اور سگ را بر صید گزاشت۔ اہل زبان سن کر ہنستے ہیں۔ کیونکہ ان کے محاورہ میں مدرسہ راگزاشت اور خانہ راگزاشت صحیح ہے۔ باقی سب واہیات ہیں۔ وہ کہیں گے۔ تفنگ سر کرد اور سگ راسر نخچیر سرداد۔ باز راسر کبوتر سرداد۔

بندوق خود بخود چھٹ جائے یا کتا یا بکری چھٹ جائے تو اس کے لیے فرق ہے۔ تفنگ سر شد اور سگ رہا شد۔ گوسپند یلہ میگرددیار ہاشد۔ یہاں کے لوگ بندوق کے لیے بھی کہہ دیتے ہیں کہ تفنگ یلہ شد اور کسی نے چھوڑدی ہو تو کہیں گے یلہ کرد۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ ایرانی کہے گا۔ اتفاقاً تفنگ دررفت (چھٹ گئی)۔

اس کا تیر نشانہ پر نہ لگا۔ کسی کی دعا لگ گئی۔ میرے کئی برس اس کام میں لگے اور اس کے پاؤں میں چوٹ لگ گئی۔ جو لوگ محاورہ سے ناواقف ہیں۔ کہہ دیتے ہیں۔ تیر بر نشانہ چسپید۔ دعائے کسے چسپیدہ است۔ چندیں سال بریں کار چسپید۔ ضرب بپایش چسپید۔

زباں دان کہے گا کہ تیرش برہدف رسید۔ یا تیرش برہدف نشست۔ اور دعائے کسے اثر کرد۔ دعائے کسے اثر کردہ باشد۔ دعائے فلانی زدہ است او را۔ چندیں سالم دریں کار گزشت یا سالہا دریں کار صرف کردم۔ سالہا صرف کارش کردم۔ ضرب سخت بپایش رسیدہ۔

بعض اشخاص جھوٹے نگینہ یا عقیق کو کہتے ہیں۔ ایں نگین دروغی است۔ واقف زبان کہے گا۔ اصلی نیست۔ یا۔ مصنوعی ست۔ یا جعلی ست۔

حقہ۔ عربی لفظ ہے۔ فارسی میں اسے قلیان کہتے ہیں (اس کی اصل بھی غلیان عربی ہے) ناواقفوں نے پینے کے لیے نوشیدن سنا ہوا ہے اس لیے کہتے ہیں بسم اللہ حقہ بنوشید۔ اہل زبان کہتا ہے۔ قلیان بکشید۔ یا میل بفرمائید اور یہ خبر نہیں کہ اہل زبان پانی کے لیے بھی یہی کہتے ہیں کہ آب بخورید خیلے خنک است اور چائے میخورم کہ خنکی مے آرد۔ اور۔ شیر میخورم کہ چاہیدہ ہستم۔ ماست میخورم کہ بمزاجم میسازد۔

ایک جلسہ میں یہ مَثل ترجمہ کرنے کے لیے پیش ہوئی۔ (شیر بکری ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں) یاروں نے انواع و اقسام سے آپس میں طبع آزمائیاں کیں۔ شیر و گو سفند در کنارے آب می نوشند۔ شیر و گو سفند بر یک چشمہ از آب سیر مے شوند۔ شیر و بز بر ساحلے آب مے نوشند۔ اور۔ بیک جا آب مے آشامند۔ و۔ بیک مشرب آب مے آشامند۔ و نوش میکنند۔ اصل وہی ہے کہ شیر و بز یکجا آب میخورد۔

جب کسی کو دھمکاتے ہیں تو اردو میں کہتے ہیں کہ آج میں نے اسے خوب جھاڑا۔ مترجم کہتے ہیں۔ امروز اورا خوب فشاندم۔ اہل زبان کہے گا۔ ترساندم۔ تنبیہش کردم۔ برق چشمش گرفتم۔

بھائی کو برادر صاحب اور سب میں بڑے بھائی کو اخوان صاحب کہتے اور لکھتے ہیں۔ یہ بھی فضول ہے۔ برف اور یخ کو ایک سمجھتے ہیں۔ موٹے قلم سے لکھا ہو تو کہتے ہیں قلم فربہ نوشتہ است اور ایں غیشکر ہم بسیار فربہ است۔

ماضی تمنائی کی "ی" جس کے لطف ادا کا خاتمہ بلبل شیراز کی زبان پر ہو گیا۔ لوگوں کو بہت خراب کرتی ہے۔

ایک دفعہ یہ فقرہ امتحان میں پیش ہوا۔ اگر میرے پاس روٹی ہوتی تو بھی میں نہ کھاتا۔ اس پر جس جس طرح لوگوں کے ذہن دوڑے ان کا تماشا دیکھنے کے قابل ہے:۔

اگر نزد من نان بودے۔ تاہم نوش نکردے۔ اگر پیشم نان بودے تاہم از من خوردہ نشد۔ اگر نزد من نان شدے ہم نخوردے۔ بات فقط اتنی ہے کہ اگر نان پیش من میبود۔ ہم نمیخوردم۔

یہ عام اہل ہند کی ٹھوکریں ہیں جو لکھی گئیں۔ تخمیناً پندرہ یا سولہ برس پنجاب میں ہوئے۔ بعض لغزشیں ایسی معلوم ہوئیں کہ پنجاب کے لوگوں کے لیے خاص ہیں۔ چنانچہ ایک دفعہ مہاراجہ رنجیت سنگھ بہادر کی ڈاڑھ میں درد ہوا۔ لاہور میں ایک شاہ جی صاحب عامل تھے۔ ان کے جھاڑنے سے درد جاتا رہتا تھا۔ انھیں بلایا اور رخصت کے وقت حکم دیا کہ انھیں روپیہ دے دو۔ دیوان حاضر باش موجود تھا۔ حسب ضابطہ خزانچی کے نام حکمنامہ لکھا۔ فلاں شاہ جی بر روئے سرکار جھاڑہ کردہ است بست و پنج روپیہ

بایشاں بدہند۔ تاکید دانند۔

اس ملک میں خوش کی جگہ راضی بولتے ہیں۔ اسی بنا پر ایک شخص نے لکھا۔ چوں ایں سخن بشنید بسیار راضی شد۔

تم جانتے ہو کہ ہندوستان میں ٹانگ وہی ہے جسے فارسی میں "پا" کہتے ہیں اور لات خاص مارنے کے لیے ہے۔ مثلاً گھوڑے نے لات ماری۔ گدہے نے لات ماری۔ اسی کی فارسی لکد ہے۔ کہتے ہیں کہ اسپ لکد زد اور خر لکد زد۔ پنجابی میں عموماً ٹانگ کو لت کہتے ہیں کہ "اس دی لت وچ پیڑ ہوندی ہے"۔ اور یہی لت مارنے میں بھی لگا دیتے ہیں کہ گھوڑے نے لت ماری۔ چنانچہ ایک لڑائی میں کسی شخص کے گھوڑے کی ٹانگ گولے سے اڑ گئی تھی۔ اسی بنیاد پر ایک منشی نے معرکہ جنگ سے روئیداد لکھ کر مہاراج کی خدمت میں بھیجی۔ اس کا فقرہ تھا کہ لکد اسپش از گلہ توپ پرید۔ اس نے جانا کہ جس طرح پنجابی میں دونوں کے لیے ایک لفظ ہے یعنی لت۔ اسی طرح فارسی میں بھی ہوگا۔ اگر اہل فارس کے کلام پر عبور ہوتا تو لکھ دیتا کہ پائے اسپش از گلہ توپ پرید۔

ان باتوں کی تفصیل لکھ کر اگر میں چاہوں کہ کل اس قسم کی غلطیوں کی فہرست مکمل کر دوں اور اسے پھر کر کوئی محاورہ کے رستہ میں ٹھوکر نہ کھائے۔ تو خیال محال ہے کیونکہ جس شخص کو دیکھتا ہوں ایسی نئی غلطی ایجاد کرتا ہے کہ اس سے پہلے کسی کو نہیں سوجھی۔ اس لیے مناسب ہے کہ اس تقریر کو یہیں ختم کر دوں اور آئندہ کے لیے نظم فارسی کی تاریخ کا سامان کروں۔ اگرچہ سالانہ چھٹیاں ہیں مگر میں نے نیت کر لی ہے کہ جب تک وہ لکچر لکھ نہ چکوں گا۔ آرام کا لطف نہ اٹھاؤں گا۔

گیارہواں لکچر

نظم فارسی کی تاریخ

عزیزان وطن! جلسہ کی جمعیت میں بہ نسبت سابق کے زیادتی معلوم ہوتی ہے۔ جس میں بہت سی معنی فہم صورتیں نظر آتی ہیں۔ اسے مبارک شگون اور نیک فال سمجھتا ہوں۔ غالباً اب وہ وقت قریب آگیا ہے کہ قوم تحقیقات کی طلبگار ہو اور مطالب علمی کے شکار تک ان کا نشانہ پہنچنے لگے۔ چونکہ آج شعرا ابھی کچھ کچھ طبیعتوں کے جوہر دکھائیں گے۔ اس لیے واجب ہے کہ بیان مطلب شروع کروں تاکہ اور پڑھنے والوں کے لیے وقت میں گنجائش ہو۔

فارسی کے مورخ اور تذکرہ نویس لکھتے ہیں کہ اسلام سے پہلے ملک فارس میں شاعری نہ تھی۔ بہرام گور ایک دن شکار کو نکلا۔ ایک بن میں گھس کر شیر کو جیتا پکڑ لایا۔ اور اس طرح زیر کیا کہ دونوں کان کھینچ کر گرہ لگا دی۔ جوش تفاخر میں اس کی زبان سے نکلا: "منم آں پیل دماں و منم آں شیر یلہ اس کی ایک معشوقہ تھی کہ حسن و ادا کے ساتھ حاضر جوابی اور لطیفہ گوئی میں بولتی گھڑی کی طرح جواب دیتی تھی۔ بہرام مارے محبت کے اسے ہمیشہ ساتھ رکھتا تھا اور باتیں سن کر خوش ہوتا تھا جس وقت یہ مصرع کہا تو بامید جواب اس کی طرف دیکھا۔ اس نے کہا: "نام بہرام ترا و پدرت بوجبلہ"۔ بادشاہ کو یہ انداز پسند آیا۔ اہل طبع کو جمع کر کے تقطیع کروائی اور شوق ظاہر کیا۔ اس کے شوق سے ترقی نے قدم آگے بڑھائے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اس نے عرب میں پرورش پائی تھی۔ اصل میں وہاں کی موزونیت تھی جس نے اس کی زبان پر یہ رنگ دکھایا۔

یہ بھی لکھا ہے کہ بہرام کے بعد عہد اسلام میں سب سے پہلے ابو حفص حکیم سعدی نے فارسی میں شعر کہا اور وہ پہلی صدی ہجری میں تھا:

آہوے کو ہی در دشت چگونہ رودا او ندارد یار چگونہ رودا

بعض کا قول ہے کہ یعقوب ابن لیث صفار جو ایران میں پہلے خود سر بادشاہ ہوا۔ اس کا ایک چھوٹا سا بیٹا تھا۔ وہ اسے بہت چاہتا تھا۔ ایک دفعہ عید کا دن تھا بچہ لڑکوں میں جو بازی کر رہا تھا۔ بادشاہ ادھر کو آیا۔ بچہ کو دیکھ کر محبت کے مارے ٹھہر گیا اور دیکھنے لگا۔ بچہ نے (جوز) اخروٹ پھینکے۔ ان میں سے سات تو گچی (چھوٹا سا گڑھا) میں پڑے ایک باہر رہ گیا۔ یہ سمجھا کہ یہ دانہ رہ گیا۔ زمین ڈھلوان تھی۔ ذرہ ٹھہر کر وہ بھی لڑھکا اور آہستہ آہستہ گچی کی طرف چلا۔ بچہ دیکھ کر خوش ہوا اور اچھل اچھل کر کہنے لگا: "غلطاں غلطاں ہمیدود تا لب گو"۔ (گو: گچی یا چھوٹا سا گڑھا)۔ بادشاہ کو یہ موزوں کلام پسند آیا اور اس لیے کہ فارس میں یہ فخر میرے بچے کے لیے قائم رہے۔ علماء کو حکم دیا کہ اس کا قاعدہ باندھو۔ چنانچہ ابو دلف عجلی اور ثبت الکعب نے تقطیع کر کے معلوم کیا کہ بحر ہزج کی ایک شاخ ہے۔ بعد اس کے بڑھتے بڑھتے یہاں تک نوبت پہنچی۔

ابتدائی تحصیل میں جب تک میں نے فقط عروض کی کتابیں پڑھی تھیں اور کتابوں میں حالات مذکورہ بالا نہ دیکھے تھے۔ تو مدت تک یہی خیال رہا کہ زبان فارسی نے نظم اور اس کی بحریں اور زحاف وغیرہ عرب کی برکت سے پائی۔ لیکن جب ملک فارس کی تواریخ قدیمہ کو دیکھا تو خیال پیدا ہوا کہ فارس جیسا ملک۔ جس میں چار سلسلے سلاطین با آئین کے گزر گئے اور ایسی شان و شکوہ کے ساتھ سلطنت کر گئے۔ جس کی باتیں آج افسانے ہیں۔ علوم و فنون اس کے یونان اور روما کا پہلو مارتے ہیں۔ گلزار زمین! خداداد حسن! تفریح کے سامان! اور عیش و طرب میں پرستان! کیا یہ زندہ طبعتیں نظم کے پھولوں کے لیے مردار زمین تھیں؟ وہ لوگ غزلخوانی نہ کرتے ہوں گے۔ اپنے بادشاہوں کو قصیدے نہ سناتے ہوں گے۔ ان کی عورتیں گیت نہ گاتی ہوں گی۔ اپنے بچوں کو لوریاں دیکر نہ سلاتی ہوں گی۔

سنسکرت کی نظم نے یہ بڑا کام کیا کہ مذہب، تاریخ، علوم، فنون جس مطلب پر کتاب لکھی گئی سب کو اپنے سلسلے میں کھینچ لیا۔ یہ قوت بیان اور قدرۃ بیان کی برکت ہے۔ اس کی نظم میں ایک وصف اور بھی ہے یعنی اس کے حروف اور الفاظ کی ترکیب اس ڈھب کی واقع ہوئی ہے کہ لفظ لفظ اپنی موزونیت کا کھٹکا کان میں پہنچاتا ہے۔ اس کا سبب

یہ ہے کہ اس کے مرصع کار کے پاس بہت سے چھوٹے اور بڑے بڑے موتی اور جواہر موجود ہیں۔ جو نگینہ جہاں سجتا دیکھتا ہے وہی جڑ دیتا ہے۔ بات یہ ہے کہ زبان مذکور میں لفظوں کی بہتات ہے۔ اکثر لفظ ہیں کہ فقط سبب ہائے خفیف ہیں یا انہیں سے مرکب ہیں۔ اکثر سبب ہائے ثقیل ہیں۔ اکثر وتد اور اس کی مختلف قسمیں ہیں۔ یا ان سے مرکب ہیں۔ پس زبان مذکور اپنی ہر بحر کے لیے جیسے الفاظ خوش آئندہ موزوں دیکھتی ہے لگا دیتی ہے۔ کیونکہ اس کا سامان وافر اس کے پاس موجود ہے۔ اس کی نظم میں ان بحروں کو زیادہ لیا ہے جن میں ہر مطلب کے ادا کرنے کی وسعت ہے۔

میں نے اکثر پارسیوں کو عبادت معمولی کے وقت پڑھتے ہوئے سنا۔ اگرچہ وہ بالکل بے علم اور ہر بات سے بے خبر ہیں۔ نظم یا نثر کچھ نہیں جانتے۔ اور جو کچھ پڑھتے ہیں بے سمجھے پڑھتے ہیں۔ باوجود اس کے ان کی آواز سے نظم کے تسلسل کا مزا آتا ہے۔ کیا عجب ہے کہ عہد قدیم میں ان کی تصانیف بھی سنسکرت کی طرح اگر کل نہ ہو تو اکثر منظوم ہو۔ پھر یورپ کے داناؤں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہی صورت ہے۔ یہی موزونیت ہے جس نے سروں میں آکر راگ کو طرب ریز اور دل انگیز کر دیا۔ ان کے مدو شد اجزا پر پردہ ڈالے ہیں۔ ورنہ خاص خاص کتبوں میں موزونیت کے رنگ کھل جاتے ہیں۔ رقص کی تال اور ترانوں کے سم دلوں پر موزوں کھٹکے دیتے ہیں اور یہی اثر ہیں کہ ہر راگ میں تان پر آکر محفل بھر کے سر ہلا دیتے ہیں۔ اللہ اللہ ان دلوں پر لذتیں قربان ہوتی ہیں جو موسیقی کیفیتوں سے پل میں آبدیدہ اور دم میں متبسم نظر آتے ہیں۔

اس موزونیت کے اوج پر ذہن نہیں پہنچ سکتا جو عالم کے اجزا میں طاری و ساری ہے کہ اسی پر قیام دنیا کا مدار ہے اور اسی پر کل نظام فلکی دن رات گردش کر رہا ہے۔ ہر ستارہ اپنے اپنے دورے میں طلوع و غروب پر پل بھر اور بال برابر فرق نہیں کرتا۔ اگر اس نظم میں کہیں سکتہ ہو اور کوئی لفظ گر جائے، عجب نہیں کہ قیامت آجائے۔

بہت خوب، مان لیا کہ فارس نے نظم کی کھجوریں عرب ہی کے ہاتھ سے لیں۔ تب ضرور تھا کہ ابتدائی حال میں جو کچھ کہا تھا وہ عرب کی اصل بحروں میں ہوتا بلکہ مدت

دراز تک اسی انداز میں کہتے رہتے۔ ایک عرصہ کے بعد تراش و ترمیم اس منزل تک پہنچاتی۔ ساتھ اس کے جس طرح دوسری تیسری صدی کی اور تصنیفیں ہیں اسی طرح نظم کے نمونہ بھی جدا جدا امتیاز کے ساتھ موجود ہوتے لیکن ہم دیکھتے ہیں اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر دیکھتے ہیں کہ کوئی مثنوی، قصیدہ، غزل اس عہد کی یادگار ہو۔ مگر نمونہ کو بھی ہاتھ نہیں آتی۔ حیرت آتی ہے کہ غیر قوم اور غیر زبان کے شاگرد اتنے جلد بڑھ گئے۔ کیونکر بڑھ گئے؟ بیشک تیز و طرار طبیعتیں ایجاد کے رستوں میں بڑھتی ہیں۔ مگر بچوں کی طرح گھٹنیوں گھٹنیوں۔ نہ کہ اس پھرتی سے۔

فارسی میں سب سے پہلے جامع کتاب معیار الاشعار محقق طوسی نے لکھی۔ دیکھ لو بحروں کی تمثیل کے لیے اس میں بھی اکثر اشعار عرب کے ہیں۔ جو زمانہ جاہلیت کی یادگار ہیں۔ بعض شعر فارسی کے ہیں لیکن وہ فقط مثالیں ہیں۔ کہ خود انہوں نے یا اور شاعروں نے سمجھنے سمجھانے کے لیے کہہ دیں۔ ان کے سوا کسی دیوان یا تذکرہ میں فارسی کا کوئی قصیدہ یا غزل بحر ہائے عرب میں نہیں نظر آتی۔

پھر جب ہم فارسی کی نظم موجودہ کی حالت کو دیکھتے ہیں اور عربی کی نظموں کو دیکھتے ہیں تو ایک کا سایہ بھی دوسرے سے نہیں ملتا۔ تم کہو گے کہ فارس نے زحاف دے دے کر اسے تراش لیا۔ یہ جواب سب سے زیادہ حیرت انگیز ہے۔ کیونکر ہو سکتا ہے کہ شاگرد جس فن سے بالکل ناواقف تھا اس کی بحروں میں ایسی لطافت و موزونی پیدا کرلے کہ استاد کے دیئے ہوئے نمونے کو بالکل مٹا دے؟ اور اس قدر جلد!

میر اقیاس یہ کہتا تھا کہ جس طرح ہر ولایت میں اپنی اپنی طبیعت کے بموجب نظم اور نظم کی خوبی ہے اسی طرح فارس بھی اس فن سے بے بہرہ نہ ہوگا۔ انقلاب زمانہ نے جس طرح اس کے علوم و فنون کو فنا اور کتابوں کو برباد کیا۔ نظم کی لڑیاں بھی توڑ ڈالیں اور دیوان درہم برہم کر دیئے۔ پھر بھی خوشحالی یا بد حالی میں قوم قائم تھی۔ ٹوٹے پھوٹے شعر گیتوں کی آواز، شادی کے سہاگ یا بچوں کی لوریوں میں مدت تک زبان بزبان چلے آئے ہوں گے۔

دیکھو! جب ایک کھیت یا باغ خشک ہو کر ویران ہو جاتا ہے تو کیاریاں سوکھ جاتی

ہیں اور پودے فنا ہو جاتے ہیں۔ چند سال کے بعد ان کے نشان بھی مٹ جاتے ہیں۔ پھر جب مینہ برستے ہیں یا کوئی نہر نالا آجاتا ہے اور زمین سیراب ہوتی ہے تو جو سوکھے ساکھے بیج خاک ہو گئے تھے یا وہ سبزہ و گل جو خاک کی طبیعت میں چھپے ہوئے تھے۔ پھر نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ اسی طرح جب طبیعتیں شگفتہ ہوئیں اور لوگ نظم کہنے لگے تو شعر انہی بحروں میں موزوں ہو کر نکلے جو خاک ایران کی اصلی طبعزاد اور خودرو سبزہ تھیں۔

سوال ہوا کہ عروض کی کتابیں عربی سانچوں میں کیونکر ڈھل گئیں؟ جواب ظاہر ہے کہ عروض فارسی کی کتابیں 600ھ کے پس و پیش میں لکھی گئیں۔ اس وقت جو لوگ ملک مذکور میں تھے یا تو عربوں کی اولاد تھے کہ فارس میں پیدا ہو کر اسی کو اپنا ملک سمجھتے تھے۔ یا ملک کی نسل تھے کہ مسلمان ہو گئے تھے۔ جب شاعری کا چرچہ زیادہ ہوا تو اس کے قواعد کی بھی ضرورت ہوئی۔ فارس کے علوم پہلے ہی فنا ہو چکے تھے اور ان کے عالم ان سے پہلے معدوم ہو گئے تھے۔ اب تصنیفات اور ضبط قواعد انہی علماء کا کام تھا جو عربی زبان اور عربی علوم وفنون میں مہارت رکھتے تھے۔ انہیں ملکی میراث کا خیال ہی نہ آتا تھا کہ تھی بھی یا نہ تھی۔ عربی عروض کے اصول سامنے تھے اور تم جانتے ہو کہ افاعیل۔ تفاعیل اپنے زحافوں کے ساتھ گز یا پیمانہ ہیں۔ ہر کلام موزوں کو ماپ سکتے ہیں۔ فارسی ہو۔ سنسکرت ہو۔ خواہ انگریزی۔ انہوں نے فارسی کے اشعار مروجہ کو بھی اپنے گز کے نیچے دھر لیا اور اسی کے بموجب کاٹ چھانٹ کر کے کسی نہ کسی بحر کے کنارے لگا دیا۔

میرے دوست اسے تسلیم کرتے تھے۔ لیکن جب وہ عہد قدیم کی نظموں کے نمونے اور عروض قدیم کے قواعد اور اصطلاحیں مانگتے تو اس کے جواب میں آزاد کی زبان لاجواب تھی۔ چند روز کے بعد نظر نے اور وسعت پیدا کی اور کتب لغت سے معلوم ہوا کہ فارسی قدیم میں مفصلہ ذیل الفاظ تھے۔

نظم۔ پیوستہ	نثر۔ پرگندہ	شعر۔ سردارہ	دم۔ وزن شعر
چامہ۔ غزل	چکامہ۔ قصیدہ	سردارہ۔ قافیہ	پساوند۔ ردیف

داغ۔ تخلص۔ اور یہ ظاہر ہے کہ ہر قوم کی زبان میں پہلے اشیا اور کام ہوتے ہیں۔ پھر ان کے لیے لفظ یعنی اسما اور افعال ہوتے ہیں۔ اگر عہد باستانی میں اہل فارس کو شعر

کہتا نہ آتا تھا تو الفاظ مذکور کیوں تھے۔

غور کر کے دیکھو ملک عرب میں مثنوی اور مثنوی میں کسی ماجرے کے نظم کرنے کا رواج کسی عہد میں بھی نہیں ہوا۔ یہ قدیم طریقہ خاص اہل فارس کا ہے۔ یاد کرو حال وامق وعذرا کی داستان کا۔ قدمائے عرب کے کلام میں ردیف بھی نہیں پائی گئی۔ یہ لفظ پیچھے پیدا ہوا۔

عزیزان وطن! اس دن کی خوشی کا لطف بیان نہیں کر سکتا۔ جب کہ تذکرۂ دولت شاہی میرے ہاتھ آیا۔ اس میں عہد قدیم کے سیاحوں سے یہ نکتہ منقول پایا کہ عضد الدولہ دیلمی کے عہد تک کوہ بے ستون پر قصر شیریں کی عمارتیں اکثر باقی تھیں۔ ایک دروازہ کی پیشانی پر یہ شعر لکھا تھا:۔

ہژبرا بہ گیہاں انوشہ بدے جہاں رلبدیدار نوشہ بدے

خان آرزو نے لکھا ہے کہ سلاطین قدیمہ میں سے فرہوش نام ایک عالیشان بادشاہ تھا۔ اس کے دربار میں گروہ کثیر اہل سخن کا حاضر رہتا تھا۔ ان میں سے شیدوش شاعر نے ایک موقع پر بادشاہ بیگم کے حق میں کہا:

زن شاہ است درداور گردا گوز گردد ندارد ہم از کس

اسی کتاب میں لکھا ہے کہ زبان قدیم میں درداور شجاعت اور گرداب معنی سمندر تھا۔

اس تقریر سے میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو بحریں آج ہم فارسی میں دیکھتے ہیں وہ بعینہٖ اس کے پرانے سانچوں میں ڈھلی ہوئی ہیں اور بے کم وبیش ان کے بزرگوں کی میراث ہیں۔ نہیں! وہ بھی ہیں۔ عرب سے بھی لی ہیں۔ کچھ ان میں اصلاح ہو گئی ہے۔ کچھ نئی ایجاد ہو گئی ہیں اور اس سے سکا کی 42 کے قول کی تائید ہوتی ہے۔ اس نے بحروں کی فہرست لکھ کر کہا ہے۔ "ترقی بآواز بلند پکار رہی ہے۔ کہہ دو طبع سلیم کو کہ جو چاہے ان پر بڑھائے۔ یہاں سلامتی طبع کے سوا کسی کی حکومت نہیں"۔

مرزا بیدل نے نکات بیدل میں اکثر غزلیں نئی بحروں میں لکھی ہیں۔ حقیقت میں نہایت پسندیدہ ہیں اور دل کو خوش آواز معلوم ہوتی ہیں:

سر طرہ بہوافشاں فتنے زمشک تر آفریں
ہمہ بآئنہ بازکن گل عالمے دگر آفریں
بہ تماشائے ایں چمن، در مژگاں فرازکن
زخمستان عافیت قدحے گیر دناز کن
چہ بود سروکار غلط سبقاں در علم و عمل بفسانہ زدن
بہ قبول دلائل بے خبری، ہمہ تیر خطابہ نشانہ زدن
شور جنوں در قفسی باہمہ بیگانہ برآ
ایک دو نفس نالہ شود ازدل دیوانہ برآ
گر بہ گلشن زناز گردد قد بلند تو جلوہ فرما
زپیکر سر و موج خجلت بروں تراود چوے زیبا

جبکہ فارس کی قدیمی شاعری کے باب میں اس سے زیادہ ہم کچھ نہیں کہہ سکتے تو بہتر ہے کہ اسلام کے بعد اس نے جس طرح نئی ولادت پائی اور قدم قدم چلتی رہی اس کا حال بیان کریں۔

عزیزان وطن! اگرچہ نظم مذکور اپنی نثر کے ساتھ بزرگوں کا کل سرمایہ خاک میں ملا بیٹھی تھی اور تصنیف کا دروازہ بند تھا لیکن آپ جانتے ہیں کہ نثر کی تصنیف کے لیے ہمیشہ مضمون اور سبب درکار ہے۔ نظم ایک طبعی اثر ہے کہ خود بخود طبیعت سے نکلتا ہے۔ جس طرح کوئی زمین بے روئیدگی نہیں رہتی اسی طرح کوئی زبان بے شعر نہیں رہ سکتی۔ بے شک اسلام کی زبان کو لوگ ایمان سمجھتے تھے۔ مگر اپنی زبان اپنی ہی زبان ہے۔ بات چیت ہنستا بولنا، شادی مہمانی افسانہ کہانی جو دل کی امنگ تھی فارسی میں نکلتی ہوگی اور جب ہوتا ہوگا۔ طبیعت کا جوش بھی اپنی موزونیت اسی میں دکھاتا ہوگا۔ افسوس یہ ہے کہ اسلام کے بعد دو سو برس تک اس کا نمونہ بھی ہمارے پاس نہیں۔

چند سال ہوئے کہ ایران میں مرزا رضا قلی خاں للہ باشی (اتالیق خاندان شاہی) نے (مجمع الفصحا) ایک تذکرہ کمال جامعیت کے ساتھ لکھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ

بہرام اور ابو حفص سعدی سے پہلے فارسی زبان میں کسی کا شعر نہیں ملتا۔ عہد مامون الرشید میں ابو العباس مروزی ایک شاعر ملک فارس میں ہوا۔ طبیعت کے جوش اور قدردانی کی کشش نے اسے بغداد میں پہنچایا۔ اس نے ایک قصیدہ زبان فارسی میں کہا اور خلیفہ کے خوش کرنے کو فارسی کے ساتھ عربی الفاظ ترکیب دیئے۔ چونکہ خلیفہ کی حکومت ایران کو لیکر توران میں پہنچ چکی تھی اور خود زبان فارسی کا شوق رکھتا تھا اس لیے بہت قدردانی کی اور ہزار دینار انعام دیئے۔ افسوس کہ قصیدہ مذکور کے زیادہ اشعار نہیں پائے جاتے۔ پھر بھی اتنا معلوم ہوتا ہے کہ خلیفہ اس ایجاد تازہ سے بہت خوش ہوا۔ شاعر مذکور 200ھ میں فوت ہوا۔ ممکن نہیں کہ ایسی لطیف شے عرب سے آئے اور یہاں ایک غیر ملک کا رہنے والا اس میں اس قدر جلد ایسی تراش اور اصلاح کرے کہ اصلی قالب کی صورت بالکل بدل جائے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ اس کے پاس اپنا قالب پہلے سے موجود ہو۔ جس میں شعر ڈھالے اور عرب کے لفظ داخل کرلے۔ قصیدہ مذکور کے یہ اشعار باقی ہیں:

اے رسانیدہ بدولت فرق خود بر فرق دیں
گسترانیدہ بہ فضل وجود در عالم یدیں
مر خلافت راتو شائستہ چو مردم دیدہ را
دین یزداں راتو بائستہ چو رخ راہر دو عیں
وغیرہ وغیرہ وغیرہ
وغیرہ وغیرہ وغیرہ
کس بدیں منوال پیش از من چنیں شعرے نگفت
مر زبان پارسی راہست باایں نوع بیں
لیک زاں گفتم من ایں مدحت ترا تا ایں لغت
گیرداز مدح و ثنائے حضرت توزیب وزیں
معذور کن اے شیخ کہ گستاخی کردم
زیرا کہ غریبم من و مجروحم و خستہ

محمود وراق 221ھ میں فوت ہوا اس کے دو شعر تذکروں میں لکھے ہیں :

نگارینا بہ نقد جانت ندہم گرانی در بہا، صارزانت ندہم
گرفتم جاں داماں وصلت دہم جاں از کف ودامانت ندہم

حنظلہ خراسانی بھی اسی عہد کا شاعر تھا 219ھ میں فوت ہوا۔ وہ کہتا ہے :۔

یارم سپند اگرچہ برآتش ہے فگند از بہر چشم، تا نرسد مرورا گزند
اورا سپند و مجمر ناید ہے بکار بلروئے ہیچو آتش و باخال چوں سپند
مہتری گربکام شیر دراست تو خطر کن زکام شیر وجوئے
یابزرگی و نازونعمت و جاہ یا چو مردانت مرگ روباروے

فیروز مشرقی 283ھ میں مرگیا :

مرغیست خدنگ اوعجب دیدی مرغیکہ شکار اوہمہ جانا
داوہ پرخولیش کرگش ہدیہ تاچہ اش را برو بہ مہمانا
سرو سیمین ترا ور مشک تر زلف مشکین تو سرتاپا گرفت

ان چند شعرا کے اشعار جو مع سال عہد کے میں نے پڑھے ان سے تم نے نتیجہ نکال لیا ہوگا۔ یعنی اگر فارس کے شاعر عرب کے شاگرد ہوتے تو پہلے عرب کی بحروں میں شعر کہتے۔ پھر رفتہ رفتہ ان میں اصلاح کر کے اس درجہ تک پہنچتے۔ اتنی جلدی یعنی 20یا25برس میں استاد کی بحروں کو ایسے موزوں اور خوش انداز قالب میں نہ ڈھال سکتے اور عرب کی بحروں کو تم خود جانتے ہو کہ غیر ملک کے لوگوں کو موزوں بھی نہیں معلوم ہوتیں وہ آپ ہی پڑھتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔

جتنا کلام اس ابتدائی شاعری کا ملا ہے۔ اس قدر کم ہے کہ نکتہ مذکور سے زیادہ کوئی بات نہیں نکال سکتے۔ البتہ دو شعر ردیف کی مثال کے بھی مل گئے جسے عہد قدیم میں پیاوند کہتے تھے۔ یہ بھی تذکروں میں لکھا ہے کہ ابتدائی شاعر مدت تک دو بیتی کہا کرتے تھے۔ خوشی کے متوالے انہیں گاتے تھے اور دل بہلاتے تھے حقیقت میں گیت ہوتے تھے لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ یہ نظم شاعری کے سلسلے میں کوئی رتبہ نہیں پاسکتی۔ رفتہ رفتہ 300ھ کے اندر رودکی پیدا ہوا۔ اس کی طبیعلت میں آمد بہت

تھی۔اس نے دوبیتی کو قطعہ اور قطعہ کو بڑھاتے بڑھاتے زیادہ اشعار کر دیئے۔اسے صاحب دیوان بھی لکھا ہے۔ شاید اسی واسطے وہ فارس کا پہلا شاعر کتابوں میں لکھا گیا۔ ہمارے محققوں نے اول سے آج تک نظم فارسی کو اور اس کے تغیرات کو دیکھ کر شعرا کے طبقے باندھے ہیں۔صاحب نظر کو ان کے کلام پر غور کرنے سے عہد بہ عہد کی نظم کا رنگ صاف الگ الگ نظر آتا ہے۔

طبقات شعرائے فارسی

(1)رودکی	اسدی طوسی	فردوسی۔وغیرہ
(2)خاقانی	انوری	نظامی
(3)سعدی	حافظ	
(4)جلال اسیر	قاسم مشہدی	قاسم دیوانہ وغیرہ

پہلے طبقہ کے اشعار کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ جب کوئی واقعہ حالیہ موزوں طبیعت کو حرکت دیتا تھا یا ضرورت اس کے خیال کو اکساتی تھی تو زبان سے نظم نکلتی تھی۔اس میں کبھی مذہبی، کبھی بزرگانہ طور پر نصیحت کرتے تھے۔ کبھی شراب، کبھی بہار کا عالم، کبھی فلک، کبھی نصیبہ کی شکایت کرتے تھے۔ کبھی دنیا سے دل بیزار کرتے تھے۔ اور ہر بات میں نصیحت کے اشارے کرتے جاتے تھے۔ تم جانتے ہو محبت سے کوئی جگہ۔ اور کوئی دل خالی نہیں۔اس لیے عاشقانہ کلام بھی کہتے تھے۔روٹی کی ہوس سے بھی کوئی پیٹ خالی نہیں۔اس لیے بادشاہوں کی تعریفیں بھی خوب کرتے تھے۔اس میں جنگ' شجاعت' سخاوت' عدالت وغیرہ اوصاف اور نصائح پر بنیاد قائم کرتے تھے۔ غرض کوئی نہ کوئی اصل ضرور ہوتی تھی۔

اب میں آدم الشعرا استاد رودکی کے کلام پر کچھ گفتگو کرتا ہوں۔ سب نے اسے استاد خطاب دیا ہے اور لکھتے ہیں کہ وہ صاحب دیوان تھا۔ غالباً اسی واسطے ان سے سلسلہ نظم شروع کیا ہے مگر یہ کوئی نہیں کہتا کہ میں نے اس کا دیوان دیکھا۔ایران کے جس شہر میں میرا گزر ہوا وہاں کے اہل کمال سے پوچھا۔جہاں دیکھا چند معمولی قصیدوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ان میں بھی بعض قصیدے ایسے ہیں کہ جو لوگ ایران میں جوہر سخن کو

پہچانتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ حکیم قطران کے ہیں۔ انجان فخر کرتے ہیں کہ ہمارے پاس رودکی کے ایسے قصیدے ہیں کہ اوروں کے پاس نہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ اس کی طبیعت میں پہلے شعرا اور اپنے ہمعصروں سے زیادہ آمد تھی۔ کہتے ہیں کہ اس نے 13 لاکھ شعر یادگار چھوڑے اور کلیلہ دمنہ کو نظم کر دیا۔ مجھ سے پوچھو تو جیسے اس کے شعر ہیں ایسے 13 کروڑ ہوں تو بھی بہت نہیں۔

کوئی کہتا ہے موضع رودک علاقہ بخارا کا رہنے والا تھا۔ کوئی کہتا ہے کہ وہ رود 43۔ بربط۔ خوب بجاتا تھا اس لیے رودکی تخلص کیا تھا۔ خوش آواز تھا اور گانے میں کمال تھا۔ اندھا مادر زاد تھا۔ آنکھوں کے رس نے ادھر رستہ نہ پایا۔ وہ بھی نظم میں بہہ نکلا۔ آٹھ برس کی عمر میں شعر کہنے لگا۔ اس کے شعر کی گرمی کو موسیقی تیز کرتی تھی اور موسیقی کو اس کی خوش آوازی آسمان پر اڑاتی تھی۔ آنکھیں نہ تھیں مگر سب آنکھوں پر بٹھاتے تھے۔ اسی کی بدولت اسماعیل سامانی کا مصاحب بنا رہا۔ 304ھ میں مر گیا۔

ایک دفعہ بادشاہ دارالخلافہ بخارا سے علاقہ خراسان میں آیا۔ یہاں ایسے معاملات پیش آئے کہ ہرات میں ٹھہر گیا۔ اہل دربار، فوجوں کے سردار طول مسافرت سے تنگ آگئے۔ سب نے استاد سے کہا کہ تم خلوت و جلوت کے مصاحب ہو کسی تدبیر سے بادشاہ کو بخارا لے چلو۔ ایک دفعہ رات کا وقت تھا۔ بادشاہ نے بخارا کی آب و ہوا اور گل و گلزار کا ذکر کیا۔ استاد نے موقع پا کر سارنگی سنبھالی اور گانا شروع کر دیا۔

بوئے جوئے مولیاں آید ہمے یاد یار مہرباں آید ہمے
ریگ آموی 44 دور شتیہائے او پائے مارا پرنیاں آید ہمے
آب جیحوں باشگر فیہائے او خنگ شہ را تا عناں آید ہمے
اے بخارا شادباش و شاد زی شاہ نزدت شادماں آید ہمے
شاہ ماہ است و بخارا ۴۹ آسماں ماہ سوئے آسماں آید ہمے
شاہ سرو است و بخارا بوستاں سرو سوئے بوستاں آید ہمے

مورخ لکھتے ہیں کہ اس غزل کے کئی سو شعر ہیں مگر سب نے اتنے ہی لکھے ہیں اور اس ثبوت کے لیے یہی کافی ہیں کہ نظم فارسی کی ابھی زبان نہیں کھلی۔

(1) دیکھو "ہمے" رودکی اور اس کے ہم عصروں کی زبان پر تکیہ کلام ہے۔ شیخ سعدی کے عہد میں کچھ تخفیف اور اب ضرورت کے سوا نہیں بولتے۔

(2) اضافہ تشبیہی۔ استعارہ وغیرہ تکلفات کا رنگ کچھ نہیں۔ محسوسات اور ان کے اصلی حالات ہیں۔ سادے الفاظ۔ سیدھی باتیں۔ جو آپس میں کہتے ہیں۔ وہی صاف صاف نظم کر دیتے ہیں۔ اس بے تکلفی کو دیکھو کہ کہتا ہے۔ بوئے جوئے مولیاں۔ بوئے گل۔ نکہت۔ شمیم۔ وغیرہ خوشبوؤں سے کام نہیں لیتا۔ نسیم۔ صبا۔ باد سحر کے احسان نہیں اٹھاتا۔ کنار آب کے سبزہ زار۔ وہاں کے گلزار اور ان کی گلگشت کو بھی یاد نہیں کرتا۔ جتنی بات تھی اتنی ہی کہہ دی یعنی دریا اور اس کی ریت۔

(3) کبھی قادر الکلام اور مشاق شاعر مناسب اور پر معنی الفاظ کے کھپانے کے لیے، کبھی ترکیب میں چستی پیدا کرنے کے لیے لفظوں کو پس و پیش کر کے اس طرح ٹھاتا ہے کہ اگر اسے کھولیں تو ایک شعر کی ڈیڑھ دو سطریں ہو جائیں۔ یہاں جس شعر میں جتنا مطلب سما سکا وہی ہے اور لفظوں کی بندش دیکھو! کیسی ڈھیلی ڈھالی ہے۔

(4) یاد کرو وہ عام قاعدہ جو کئی دفعہ جتا چکا ہوں کہ جب کسی زبان کی انشا پردازی عالم طفولیت میں ہوتی ہے تو وہ اصلیت کے علاوہ کچھ پیدا نہیں کر سکتی نہ خیالات کو پھیلا سکتی ہے۔ وہ دور کے مضامین تک ہاتھ نہیں بڑھاتی۔ پاس پاس کی چیزیں اور وہی کھلی کھلی باتیں لیتی ہے جو آنکھوں کے سامنے نظر آتی ہیں۔ چنانچہ اشعار مذکور میں خیال کرو۔

مولیان جار یعنی شاعر کے وطن میں ایک نہر ہے۔ پہلے شعر میں اس کا لطف یاد دلایا ہے۔

لطیفہ: بچارا اندھا تھا، آنکھیں نہ تھیں کہ نظر کے لطف پاتا۔ چنانچہ بو کی کیفیت پائی تھی وہی کہہ سنائی۔

رستہ میں ریگستان ہے۔ اس کی ریت کا ذکر کیا اور شوق وطن نے اس کی دقتوں کو آسان کر کے دکھایا۔ آج کل کے شاعر ہوتے تو ذرہ کو آفتاب کر کے آسمان پر چڑھاتے۔ اس بچارے کو ذرہ کی چمک کی خبر نہ تھی۔ ریتا پاؤں کو معلوم ہوا تھا۔ پرنیاں کو اور ملائمت کے آرام کو جانتا تھا۔ اسی کو کہہ دیا کہ موٹا موٹا ریتا پاؤں کو پرنیاں معلوم ہوتا ہے۔

دریائے جیحوں اور آب جیحوں کے ذکر میں ہمارے شاعر اس کے پانی اور موجوں کے خیالات سے خدا جانے کیا کیا طوفان اٹھاتے۔ اس نے جو بات تھی وہی کہہ دی کہ گھوڑے کی ایک باگ پانی ہے۔ اور یہ ایک خوشنما اور فرحت انگیز حالت ہے۔ نہ کچھ تکلیف ہے نہ خطر ہے۔ شہر بخارا کے پہنچنے میں دل کی محبت اور وفا نے بادشاہ کی قدر و منزلت اور آمد آمد کی دھوم دھام بھی دکھادی ہے۔

اس کے کنارے پر دوستوں کے جلسے یاد دلائے ہیں۔ بے شک! حب الوطن کے جوش میں شاعروں نے بہت دلچسپ، پر زور اور رنگین خیال باندھے ہیں۔ مگر وہ شاعرانہ خیال بندیاں اور بلند پروازیاں ہیں۔ یہاں سیدھی سادی باتیں ہیں جو اپنے آس پاس ہیں۔

(5) تم نے اشعار مذکورہ میں یہ بھی دیکھ لیا کہ انشا پردازی اپنے ملک کا جغرافیہ کیونکر دکھاتی ہے۔

(6) بندش کی چستی، الفاظ کی درستی، مضمون کی بلند پروازی اور مبالغہ وغیرہ وغیرہ جس سے آج فارس کی شاعری بدنام ہے۔ وہ اس میں بالکل نہیں جو کچھ ہے۔ اتنا ہے کہ اگر آپس میں بیٹھ کر باتیں کریں تو اس میں بھی اصلیت سے اتنی زیادتی ہو جاتی ہے۔

ایک قصیدہ کے چند شعر اور لکھتا ہوں۔ یہ اس نے اپنے بڑھاپے اور اس کی صورت حال پر کہا ہے:

مرا بسود و فرو ریخت ہرچہ دنداں بود	نہ بود دنداں ہلا چراغ تاباں بود
سپید سیم زدہ بود و در و مرجاں بود	ستارۂ سحری بود و قطرہ باراں بود
یکے نماند کنوں زاں، ہمہ بسود و بریخت	چہ نحس بود ہمانا کہ نحس کیواں بود
نہ نحس کیواں بود و نہ روزگار دراز	چہ بود منت بگویم قضائے یزداں بود
جہاں ہمیشہ چنین است و گرد گردانست	ہمیشہ تا بود آئینش گرد گرداں بود
ہماں کہ درمان باشد بجائے درد شود	و باز درد ہماں کز نخست درماں بود
کہن کند بزمانے ہمانکہ تازہ بود	و نو کند بزمانے ہماں کہ خلقاں بود
بسا شکستہ بیاباں کہ باغ خرم گشت	و باغ خرم گشت او کجا بیاباں بود

ہمے چہ دانی اے ماہروے غالیہ موئے — کہ حال بندہ ازیں پیش باچہ ساماں بود
شدآں زمانہ کہ رویش بسان دیبا بود — شدآں زمانہ کہ مویش بساں قطراں بود
دوزلف چوگاں بازش ہمی نمود بروئے — ندیدی اورا آنگہ کہ زلف چوگاں بود
بلند وروشن ودیدار خوب وروے لطیف — کجا گراں بد زی من ہمارہ ارزاں بود
دلم خزانہ پر گنج بود و گنج سخن — نشان نامہ ما مہر و شہرہ عنواں بود
بسا دلاکہ بسان حریر کردہ بہ شعر — ازاں سپس کہ بہ کردار سنگ وسنداں بود
ہمیشہ دستش زی زلفکان خوشبو بود — ہمیشہ گوشش زی مردم سخنداں بود
عیال نے، زن و فرزند نے موونث نے — ازیں ہمہ ہم آسودہ بود وآساں بود
ہمے خریدے و بے شمار دادہ درم — بشہر ہرچہ ہمے ترک نارپستاں بود
تو رودکی را اے منع کنوں ہمے بینی — بداں زمانہ ندیدی کہ زی حسیناں بود
بداں زمانہ ندیدی کہ درجہاں رفتے — سرودگویاں گفتی ہزاردستاں بود
شدآں زمانہ کہ شعر دراجہاں بنوشت — شدآں زمانہ کہ اور شاعر خوراساں بود
کرا بزرگی و نعمت ازاین واں بودے — مرا بزرگی و نعمت ز آل ساماں بود
بداو میر خوراساں چہل ہزار درم — وزو فزونی یک پنج میر ماکاں بود
کنوں زمانہ دگرگشت و من دگر گشتم — عصا بیار کہ وقت عصا وانباں بود

بڑھاپے کی سیدھی سیدھی باتیں، سادے سادے خیال، ڈھیلی ڈھالی ترکیبیں اور پھس پھسے الفاظ ہیں۔ اس کی شاعری ایسی ہے جیسے ہمارے ہندوستان میں بعض گویے کلاونت موزوں طبع ہوتے ہیں اور سروں کے پورا کرنے کو لفظ جوڑ لیتے ہیں۔

زندگانی چہ کوتہ و چہ دراز — نہ باخر بمرد باید باز؟
ہم بہ چنبر گذاز خواہد بود — ایں رسن را اگرچہ ہست دراز
خواہی اندر عناؤ محنت زی — خواہی اندر نشاط و نعمت و ناز
خواہی اندک تر از جہاں بپذیر — خواہی ازرے بگیر تا بہ حجاز
ایں ہمہ بود و باد تو خواست — خواب را حکم نہ مگر بہ مجاز
ایں ہمہ روز مرگ اگر بینی — نشناسی زیک دگرشاں باز

رودکی چنگ برگرفت و نواخت باده انداز گو سرود انداخت
آن عقیقین مے کہ ہر کہ بدید از عقیق گداختہ نشناخت
ہر دو یک جوہر اندلیک بہ طبع ایں بیفزود و آں دگر بگداخت
ناصبودہ دو دست رنگیں کرد ناچشیدہ بتارک اندر تاخت

دقیقی ابو منصور محمد ابن احمد بلخی (یا سمرقندی) اسی طبقہ کا شاعر تھا۔ سامانی خاندان کے اخیر دور میں تھا۔ اور اپنی اخیر زندگی میں امیر نصر ابن ناصر الدین سبکتگین کے دربار میں پہنچا۔ بہاریہ، عشقیہ اور مدحیہ ہر قسم کے مضمون کہتا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ سبکتگین کے گھرانے میں شاہان عجم کی تاریخ کی مدت سے فرمائش تھی کیونکہ دقیقی نے امیر نصر کی فرمائش سے اس نظم پر کمر باندھی تھی۔ مگر مسلسل نہیں۔ مختلف بادشاہوں کے حالات نظم کیے تھے کہ بد عملی نے دفعتاً نیک عمل سے محروم کر دیا۔ کمبخت غلام پر عاشق تھا۔ وہ غیرت والا تھا۔ خنجر مردانگی سے مالک کو مار ڈالا۔ 341ھ

فردوسی نے اس کی نظم میں سے گشتاسپ کی داستان مجلسہ اپنے شاہنامہ میں داخل کی ہے اور سچ پوچھو تو اپنے کلام کا جلوہ چمکایا ہے۔ کیونکہ ایک قسم کی دو چیزیں برابر رکھی جاتی ہیں تو عیب و ہنر کا رنگ خوب کھلتا ہے۔ صاف نظر آرہا ہے کہ روانی بیان، شگفتگی زبان، نشست الفاظ، چستی بندش اور ادائے مطلب کا اسلوب جو فردوسی کے کلام میں ہے وہ قدرتی جوہر ہے۔ جس طرح ایک آدمی کالا ہوتا ہے۔ ایک گورا ہوتا ہے۔ ایک خوش آواز ہوتا ہے۔ ایک بدآواز ہوتا ہے۔ اسی طرح کلام میں اپنا اپنا حلق تالو الگ الگ ہے۔ ایک کی معمولی باتوں میں بھی مزہ ہوتا ہے۔ ایک میں کچھ بھی نہیں۔

(2) دقیقی کے کلام میں بیان ماجرا کا سلسلہ کہیں درہم برہم اور کہیں بیچ میں سے کترا ہوا ہے جس بات کی تفصیل کو جی ڈھونڈتا ہے۔ اسے گول مول کر جاتا ہے۔ جو معمولی بات ہے اسے تفصیل دیتا ہے۔

(3) اکثر جگہ پہلے مصرع میں داستان کا مطلب کہتا ہے۔ دوسرے مصرع میں آگے کا مطلب نہیں ہوتا۔ فضول الفاظ سے بھرتی کر کے قافیہ کا فرض ادا کر دیتا ہے۔ فردوسی کے کلام میں بھی ایسا ہے مگر نہایت کم۔ یہ قوت زبان اور قدرت بیان پر منحصر

ہے۔ دقیقی کے اشعار کم ملتے ہیں۔ مجھے تلاش میں محنت اٹھانی پڑی۔ حاضرین جلسہ سنیں اور اس عہد کی نظم کا انداز دیکھیں۔ وقت کی زبان پر غور کریں اور یہ بھی دیکھیں کہ دوبیتی سہ بیتی ہو کر کس طرح بڑھ گئی۔

لشکر کشیدن گشتاسپ بر ارجاسپ و شکست خوردن ارجاسپ

بفرمود برون زپیش سپاہ — درفش ہمایونش فرخندہ شاہ
سوئے رزم ارجاسپ لشکر کشید — سپاہے کہ آنرا کرانہ ندید
زبس بانگ اسپان و جوش و خروش — ہمے نالہ کوس نشنید گوش
درفشان بسیار افراشتہ — سرنیزہ ہا زیر بگذاشتہ
چورستہ درخت از بر کوہسار — چو بیشہ نیستاں بوقت بہار
زتاریکی گرد وبانگ سپاہ — کسے روز روشن نمیدید راہ
بجروند یک تیرباراں نخست — بسان تگرگ بہاراں درست
بپوشیدہ شد چشمہ آفتاب — زپیکاں نمائے درخشاں چوآب
تو گفتی ہوا ابر دارد ہمے — وزاں ابر الماس بارد ہمے
ہوازیں جہاں بود شبگوں شدہ — زمیں سربسر پاک درخوں شدہ
یکے بارۂ[45] برنشستہ چو پیل — بہ تن ہمچو آہن بہ تگ ہمچو نیل
نمادے بہ تگ آں گرہ بستہ دم — دوسہ بار بریک درم چارسم
چوبینائی دیدہ بے رنج راہ — رسیدے بہر جا کہ کردے نگاہ
درو دشتہا شد ہمہ لالہ گوں — بدشت و بیاباں ہمے ریخت خوں
چناں شد زبس کشتہ آں زرمگاہ — کہ بروئے نتانست رفتن سپاہ
زتوراں بجستند چنداں سپاہ — کجا رحمت آورد گشتاسپ شاہ
چوآگاہ شد قیصر آں شاہ روم — کہ فرخ شد آں شاہ وارجاسپ شوم
فرستہ فرستاد باخواستہ — غلامان و اسپان آراستہ

بہاریہ

مے صافی بیار اے بت کہ صافیست جہاں از ماہ تاماہی کہ ماہیست
چواز کاخ آمدی بیروں بہ صحرا کجا چشم افگنی دیبائے رومیست
بیاتاے خوریم و شاد باشیم کہ ہنگام مے ولیام شادیست

شکایت روزگار

گویند صبر کن کہ ترا صبر بردہد آرے دہد و لیک بعمر و گر دہد
من عمر خویشتن بصبوری گذاشتم عمر دگر بباید تا صبر بردہد

نصیحت

من اینجا دیر ماندم خوار گشتم عزیز ازماندن دائم شود خوار
چوآب اندر شمر بسیارماند شود طعمش بد ازآرام بسیار

شراب کی تعریف میں

آں مرکب کہ کالبد از نور لیکن او را رواں وجاں ازنار
زاں ستارہ کہ مغربش دہنست مشرق او را ہمیشہ بررخسار

ممدوح کی سخاوت

تواں ابری کہ ناسایدشب و روز زباریدن چناں چوں از کماں تیر
نباری درکف دلخواہ جز زر چناں چوں بر سربد خواہ جز تیر

شراب کی کیفیت

زاں تلخ مے گزیں کہ گردان نیروش روان تلخ راشیریں
از ظلعت او ہوا چناں گردو کز خون تدرو سینہ شاہیں
استاد شہید زندہ بایستے واں شاعر تیرہ چشم روشن بیں

تا شاہ مرا مدیح گفتندے ز الفاظ خوش و معانی رنگیں

فردوسی

ابوالقاسم ابن اسحاق۔ طبقہ اول میں کئی ناموروں سے پیچھے آیا ہے مگر ناموری کا نشان سب سے اونچا لہرا لیا ہے۔ اسحاق زمیندار، حاکم طوس کے چارباغ میں باغبان تھا کہ باغ مراد میں یہ پودا پیدا ہوا اور اسی آبادی میں بڑا ہوا۔ صحرائی آبادی میں اس کی شاعری کے لیے کوئی ترغیب یا جبر نہ تھا۔ باوجود اس کے بچپن سے شعر کہتا تھا کہ وہ اس کا مادر زاد جوہر تھا۔ اپنے کھیتوں میں پھرتا تھا نہروں کے کناروں پر بیٹھتا تھا اور جو دل سے اگتا تھا اسے کاغذ پر ہرا کرتا تھا۔

چرند پرند کے گوشت، قدرت کی غذائیں اور برفانی چشموں کے بہتے پانی جس طرح بدن کو فربہ اور زورمند کرتے تھے۔ اسی طرح خیالات کو نیچر کی ہوا میں بلند کرتے تھے اور اسے ملک سخن کا پہلوان بناتے تھے۔ کبھی فراخ جنگلوں، ہرے ٹیلوں، صبح کی بہار اور شام و شفق کے نقش و نگار میں قدرت کے جلوے دیکھتا اور طبیعت پر خوشی کے رنگ لیتا۔ کبھی جنگلوں کے خوشنما اور خوش آواز جانوروں میں پھر کر ذوق و شوق کو پھیلاتا۔

اگرچہ اس کی طبیعت کو خالص انسانیت نے شائستگی دی تھی اور امیروں کی صحبت اور درباری تکلفات سے محروم رکھا تھا لیکن خوبی اس میں یہ ہوئی کہ ان کی خودآرائی اور ظاہر نمائی کے دھبوں سے بچ گیا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ زور طبع اس کا صحرا کے خلوت خانہ میں اپنے تئیں آپ ورزش دیتا رہا۔ غیروں کے کام اس کے کلام کے لیے نمونہ نہ ہوئے۔ بلکہ علم کی اصلاح اور مصنوعی تکلف اس کے لکھے کو قلم نہ چھوا سکے۔

اسی عالم میں اسے خبر پہنچی کہ محمود کو ایک افسانہ شاہانہ کے نظم میں سننے کا شوق ہے اور دقیقی شاعر اس میں ناکام مر چکا ہے۔ دل کے خیال اور کمال کے زور جوش کھا کر چھلک پڑے۔ پہلے زوال جمشید اور ترقی ضحاک کی داستان نظم کر کے یاروں کو سنائی۔ سب کو پسند آئی۔ چنانچہ یہ اور ساتھ اس کے اپنی عمر بھر کی کمائی لیکر غزنیں کو روانہ ہوا۔

وہاں عنصری شاعر سے ملاقات ہوئی۔ محمود مدت سے نظم شاہنامہ کی فرمائش کر رہا تھا اور وہ ٹالتا تھا۔ فردوسی اور اس کے کلام کی شان و شوکت کو مناسب حال دیکھا۔ کہا کہ چند شعر بادشاہ کی تعریف میں کہہ لو اور چل کر دربار میں سناؤ۔ فردوسی نے اسی بحر میں کچھ اشعار لکھے۔ میں چند شعر ان میں سے سناتا ہوں:

زیزدان ابر شاہ باد آفریں [46] کہ تا او بہ او تخت و تاج و نگیں
جہاندار محمود شاہ بزرگ بآبشخور آرد ہمے شیر و گرگ
جہاں آفریں تا جہاں آفرید چو او مرزبانے [47] نیامد پدید
ز کشمیر تا پیش دریائے چیں برو شہریاراں کنند آفریں
چو کودک [48] لب از شیر مادر بشست بگہوارہ محمود گوید نخست
بہ بزم اندر او آسمان وفاست برزم اندر او شیر جنگ آزماست
بہ تن زندہ پیل و بجاں جبرئیل بہ کف ابر بہمن بہ دل رود نیل

دیکھو! نظم کی صفائی، بندش کی چستی، الفاظ کی درستی، معنوں کی شکوہ اور کلام کی شوکت۔ اس پر قریب الفہم پاس پاس کی تشبیہیں ہیں۔ استعاروں اور اضافتوں کے ایچ پیچ اصلا بالکل نہیں۔ سیدھی سادی باتیں ہیں اور ہر بات کو کس خوبصورتی سے ادا کرتا ہے۔ الفاظ محاورہ سے معزول ہو گئے ہیں پھر بھی کانوں کو بھلے معلوم ہوتے ہیں۔

ساتھ ہی رستم و اسفندیار کی داستان لکھی تھی وہ سنائی۔ آغاز داستان میں کہتا ہے:

کنوں خورد باید مئے خوشگوار کہ مے بوئے مے آید از جوئے بار
ہوا پر خروش و زمیں پر ز جوش خنک آں کہ دل شاد دارد و ز نوش
درم دارد و نقل و نان و نبید سر گوسفندے تواند برید

اس کی نظم کے دبدبہ سے دربار گونج اٹھا۔ محمود بہت خوش ہوا۔ نظم شاہنامہ کے لیے حکم دیا۔ اشرفی شعر انعام مقرر کیا۔ ایک خانہ باغ اپنے حرم سرا کے زیر سایہ، وہیں انواع و اقسام کے ہتھیار، شاہان سلف کے دربار اور مشہور معرکوں کے مرقع، عجیب جانوروں کی تصویریں سجا کر ایک عجائب خانہ مرتب کر دیا اور وہ نظم شاہنامہ میں مصروف ہوا۔ وہ اس کی محنتوں کا کارنامہ اور عمر بھر کی کمائی 60 ہزار شعر کا مجلد ہے کہ

30 برس کی جگر خراشی میں تیار ہوا ہے۔ چنانچہ خود کہتا ہے:

بسے رنج بردم دریں سال سی — عجم زندہ کردم بدیں پارسی

اب مجھے اس کی زبان اور انداز بیان میں کچھ کہنا چاہیے۔ دیکھئے! جب رودکی کی آواز سنتے سنتے اس کا طنطنہ کلام کان میں پہنچتا ہے تو مذاق سخن چونک اٹھتا ہے کہ نظم فارسی ابھی بچہ تھی۔ یکایک جوان کیونکر ہو گئی اور جوانی بھی وہ کہ رستم کی پہلوانی اور اقبال کیانی۔

بہار، سبزہ زار کے سامان اور حسن کے جلوے شعرائے ایران کے معمولی تکیہ کلام میں ہر مطلب کو انہی میں پھیلاتے ہیں۔ فردوسی کی نظم میں یہ رنگ بہت کم ہے۔ کوئی سرگزشت سبزہ زار میں واقع ہوئی تو اس کی خوشنمائی دکھا دی۔ کسی حسین کا ذکر آگیا۔ اچھی صورت تھی دیکھ لی۔ شراب کا ذکر آگیا۔ لازمہ مجلس تھا وہ بھی پی لی۔

اور شاعر، خیالی مطالب کو اچھا پھیلاتے ہیں۔ بیان واقعہ میں کمزور ہو جاتے ہیں۔ مگر اس کی زبان کا زور ہر مطلب پر پوری قدرت رکھتا ہے۔ اور مقصد معین کو عمدہ طور پر ادا کرتا ہے۔ اور شاعر بیت کا دوسرا پلہ بھرتی سے بھرتے ہیں۔ وہ اس میں بھی اصلی مطلب کو کھپاتا ہے۔ یا ایسا مضمون پیدا کرتا ہے کہ اصل ماجرے کا جز معلوم ہوتا ہے۔

اس کی انشاپردازی استعاروں سے رنگینی اور صنعتوں سے میناکاری نہیں مانگتی۔ صاف صاف شعر، سادہ سادہ لفظ، محاورہ کی باتیں اور سلیس زبان۔ جیسے قدرتی نہر میں چشمہ خداداد کا پانی بہتا چلا جاتا ہے۔ رستم اور اسفندیار کے معرکہ میں ہر نیک اندیش یہی چاہتا تھا کہ لڑائی نہ ہو۔ بہت سلام و پیام ہوئے۔ جب لڑائی کے سوا چارہ نہ رہا اور موتیں نظر آنے لگیں تو فصیح فارس۔ ال پدر رستم کی زبانی افسوس کرتا ہے:

ندانم کہ شب اسپ اسفندیار — سوئے آخور آید ہمے بے سوار
و یا بارۂ رستم جنگ جوئے — بہ خانہ کند بے خداوند روئے

افراسیاب بادشاہ توران نے حالت شکار میں ایک نوجوان زمیندار کو کھیت پر دیکھا اور خیال کیا کہ اس ہونہار کو پہلوانی کے کرتب سکھائیں تو رستم کو ضرور مار لے گا۔ یہ رستم کا پوتا سہراب کا بیٹا تھا کہ بے خبری کے جنگل میں پل رہا تھا۔ دیکھو! سادی تصویر کھینچی ہے مگر کتنی خوشنما ہے:

شہ ترک ناگہ یکے بنگرید کشاورز مردے تناور بدید
ستادہ بداں دشت ہچوں ہیوں تن ہچو کوہ و بہ چہرہ چو خوں
کشیدہ بروساعدو یال و برز درختیست دروست مانند گرز
قوی گردن و سینہ دید فراخ تن چوں درخت وبہ بازو چو شاخ
بداں پہلوی بازوان دراز ہمے[49] شاخ بشکست آں سرفراز

غور کرو۔ انہی چیزوں کے ذریعے سے مطلب ادا کیا ہے جو وہاں سامنے موجود ہیں۔ استعارہ کے ذریعے سے خیالی جسامت اور فرضی زور نہیں پیدا کیا۔ ایک اور جگہ کہتا ہے:

یلے بود مانند آزادہ سرو بہ سر برکلہ ہچو بال تذرو
بفرمود تاکوس کیں کوفتند یلاں ہچو شیراں برآشوفتند
بزد نائے زرین و بربست کوس برآراست لشکر چو چشم خروس
تبرزیں بہ خون یلاں گشتہ غرق چو تاج[50] خروستان جنگی بہ فرق
سوارے چو من پائے برزیں[51] نہ کاشت کہ تیغ و گرز مرا برنداشت

دیکھو اس کی بے تکلفی اور سادہ بیانی جب کسی شے کی کمی یا بے حقیقی دکھاتا ہے۔

سرآوردم ایں رزم کاموس تیز دراز است و نفتاد ازویک پشیز
گراز داستان یک سخن کم بدے روان مرا جائے ماتم بدے

الٹر زمیندار ہے۔ جو لفظ اس کے روزمرہ کاروبار نے زبان پر دیئے ہیں وہی نظم میں بھی بولتا ہے۔ بے شک مبالغہ فارسی کا جوہر ہے مگر یہ دیکھو کہ اس کا مبالغہ بھی کیسا بے تکلف اور سیدھا سادہ ہے وہ کوہ و صحرا کا فرزند۔ قدرت کے مرغزاروں کا بلبل ہزار داستان ہے اور نغمہ اس کا طبع زاد ہے۔ بلبل تان۔ سر، پلٹی اور گٹکری نہیں جانتی کیونکہ اس نے تکلف کے گویوں اور بناوٹ کے کلاونتوں سے شاگردی کا داغ نہیں کھایا اسی طرح استعاروں اور صنعتوں سے مانگے کا رنگ نہیں لیا۔

نہ سمجھنا کہ وہ حسن کا جوبن نہیں دکھا سکتا۔ اتنا ہے کہ اور شاعر جا و بے جا حسن اور لوازمات حسن کے استعاروں سے کلام کو آلودہ کرتے ہیں۔ وہ اگر موقع پر کسی حسین کا

ذکر آتا ہے تو اس کی کیفیت بھی دکھا دیتا ہے۔ عروس رستم کے حال میں کہتا ہے:

لباں از طبرزد، زباں از شکر دہانش مرصع بہ لعل و گہر
دو ابرو کمان و دو گیسو کمند زبانش چو خنجر، دہانش چو قند

خسرو کی شیریں سے ملاقات ہوئی ہے اور شیریں کے آنسو ٹپک پڑے ہیں:

بہ نرگس گل ارغواں رالشت کہ بیمار بد نرگس و گل درست
نگارے بد اندر شبستان اوئے زگلبرگ رخ داشت و زمشک بوئے
یکے دخترے داشت خاقان چو ماہ کجا ماہ دارد دو چشم سیاہ
بہ دنبال چشمش یکے خال بود کہ چشم خودش ہم بہ دنبال بود
بہم بستہ مورا بہ صد پیچ و تاب گرہ دادہ شب را پس آفتاب

غور سے دیکھو استعارہ اور تشبیہ کی گرہ کو کس حکمت سے کھولا ہے اور اضافتوں سے کیا بچ کر نکل گیا ہے۔

اس کے زور زبان کے آگے ہر مطلب یکساں ہے۔ باتوں ہی باتوں میں ادا کر دیتا ہے۔ خصوصاً میدان جنگ کی تصویر تو ایسی کھینچتا ہے کہ سامنے تھیٹر باندھ دیتا ہے۔ رستم اور اشکبوس کشانی تورانی کی لڑائی دیکھو:

تہمتن بہ بند کمر برد چنگ گزیں کردیک چوبہ تیر خدنگ
خدنگے بر آورد پیکاں چو آب نہادہ برو چار پر عقاب
بمالید چاچی کماں را بدست بہ چرم گوزن اندر آورد شست
ستوں کرد چپ را و خم کرد راست غریو از خم چرخ چاچی نخواست
چو سو فارش آمد بہ پہنائے گوش زچرم گوزناں برآمد خروش
چو بوسید پیکاں زانگشت او گزر کرد از مہرہ پشت او
قضا گفت گیرو قدر گفت دہ ملک گفت احسن فلک گفت زہ
بزد تیر بر سینہ اشکبوس سپہر بریں بر کفش داد بوس
کشانی ہم اندر زماں جاں بداد تو گفتی کہ از بطن مادر نہ زاد

اور چاہتا ہے تو صفحوں کے مضمون کو دو شعروں میں سما دیتا ہے:

بروز نبرد آں یل ارجمند بہ تیغ و خنجر بہ گرز و کمند
دریدو برید و شکست و بہ بست یلاں راسرو سینہ و پاو دست

ایک جلسہ کی روئیداد میں بھی یہی کمال کیا ہے:

چویک ہمہ از تیرہ شب در گزشت شب آہنگ بر چرخ گردان بجشت
پے مشورۃ مجلس آر ستند نشستند و گفتند و برخاستند

بیانِ مطلب میں اس کی زبان گھر کے ذخیرہ سے کام لیتی تھی۔ غیر زبان کی التجا کم کرتی تھی۔ اسی سے مشہور ہے کہ فردوسی نے عربی کا ایک لفظ نہیں لیا۔ اس کے کلام میں عربی لفظ ہیں مگر اوروں کی نسبت بہت کم ہیں۔ اگر شہر میں تربیت پاتا۔ اگر مدارس علمی سے فصاحت لیتا تو کلام پر عربی کا پرتو پڑتا۔ ملک کے نیچر کا درخت تھا۔ باغبان کا ہاتھ اس تک نہیں پہنچا کہ غیر پیوند کا بار اس پر ڈالتا۔

لطیفہ: شاہنامہ کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسے رستم کے ساتھ دلی محبت تھی۔ جیسے ایک بچہ کو پال پوس کر کوئی پروان چڑھاتا ہے اور اس کی بہار زندگانی دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ یہی حال اس کا ہے۔ اس نے رستم کے کارناموں کو اس جوش و خروش سے لکھا ہے کہ کسی کا حال ایسا نہیں لکھا۔ گویا اس تصنیف سے مقصود اسی کا حال سنانا تھا۔ اوروں کا بہانا تھا۔

جہاں آفریں تا جہاں آفرید سوارے چو رستم نیامد پدید

سکندر نامہ میں نظامی کا یہی حال سکندر کے ساتھ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مصنف کو اپنے مضامین و مصنفات سے اولاد کی محبت ہوتی ہے۔ اسی واسطے کہنے والوں نے انہیں زادہ ہائے معنوی کہا ہے۔

ظاہر میں سکندر نامہ، شاہنامہ کا فوٹو نظر آتا ہے مگر دونوں کے انداز کلام میں بہت فرق ہے۔ سبب اس کا یہ ہوا کہ فردوسی کی بے تکلفی اور سادہ گوئی نے تشبیہوں اور استعاروں میں جو چیزیں اس پاس نظر آتی تھیں سب خرچ کر دیں۔ نظامی نے جب انہیں مستعمل دیکھا تو ان پر نقاشی کر کے کام میں لایا۔ فردوسی کے کلام میں استعارہ اس قدر کم تھا کہ گویا نہ تھا۔ نظامی نے تشبیہ کو استعارہ اور استعارہ در استعارہ کر دیا۔ اس سے

مضمون رنگین ہوا مگر بجائے صفائی کے باریکی اور پیچیدگی پیدا ہو گئی اور ساتھ اس کے اصلیت گم ہو گئی۔

فردوسی اور اس کے ہم عصروں کے کلام میں اختلاف کا سبب یہ ہے کہ وہ کہساروں اور مرغزاروں کا پرورش یافتہ تھا۔ کہتا وہ تھا جو طبیعت سے اگتا تھا۔ اسی واسطے خالص ملک کی زبان میں ہوتا تھا۔ الفاظ کھرے، پارسی کھری، بات میں بناوٹ نہیں، بلاغت کے پیچ نہیں اور استعاروں کے الجھاؤ نہیں۔ رنگینی سے پاک۔ تکلف سے صاف۔ کلام کو دیکھو! کیسا سنگین اور استوار واقع ہوا ہے۔ 4 شعر سینکڑوں میں ملا دو۔ میل نہیں کھاتے۔

شعرائے مذکور دربار شاہی کے حاضر باش تھے۔ علماء و فضلا کے ساتھ ہم صحبت تھے۔ اس میں اکثر عربی اور علمی الفاظ کام میں آتے تھے۔ وضع و لباس میں قواعد کے پابند تھے۔ وہی انداز اور میرزائی تراش کلام میں جلوہ دکھاتی تھی۔ پھر بھی زمانہ ایک تھا۔ سرزمین ایک تھی۔ اصلیت سے باہر نہ ہو سکتے تھے۔ چنانچہ ہر ایک کا کلام تھوڑا تھوڑا سنا کر اپنے بیان کی تصدیق کرتا ہوں۔

اسدی طوسی ابو نصر علی ابن احمد۔ اس جگت استاد کو کل تذکروں اور تاریخوں میں استاد اسدی طوسی لکھا ہے۔ سچ ہے جس کے دامن سے فردوسی جیسا شاگرد پل کر اٹھے۔ وہ نہیں تو استاد کون ہے۔ زبان فارسی کی فرہنگ اور اصول لغت سب سے پہلے اس نے لکھے۔ پھر جس نے لکھا۔ اسے دیکھ کر لکھا (1) وہ نظم فارسی کا ابتدائی دستکار ہے۔ اس کی زبان میں سنگینی کے ساتھ رنگینی اور نزاکت موجود ہے۔ (2) بات کہتا ہے اور اس کے لفظوں میں سے شاعرانہ مضمون پیدا کرتا ہے۔ (3) بڈھا استاد ہے مگر دل نوجوان ہے۔ جہاں باغ، بہار، حسن۔ اور شراب کا ذکر آجاتا ہے۔ اسے پھیلاتا ہے اور مزے لیتا ہے۔ اس کی قدرۃ کلام نے نظم کی آزادی کو مطالب سے وابستہ کیا اور دوبیتی اور سہ بیتی کو زیادہ پھیلایا۔ اکثر قطعے، عاشقانہ، واعظانہ، شاعرانہ وغیرہ نظم کیے۔

دولت شاہ نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ اس عہد میں اشیائے بے جان کو ذی عقل اور جاندار فرض کر کے مناظرہ کرواتے تھے اور ان کے سوال و جواب کو نظم کرتے تھے۔ استاد موصوف نے مباحثہ زمین و آسمان، روز و شب، نیزہ و کمان اور گبرو مسلم

وغیرہ خوب لکھے ہیں۔ ہر نظم کے تیس، چالیس یا پچاس شعر ہیں۔ خاتمہ پر دو یا تین شعر بادشاہ یا وزیر کی تعریف میں۔ تقریباً سو برس بعد اس انداز سے دل بھر گئے۔ پھر بھی شیخ سعدی نے گلستان میں نشان بادشاہی اور سراپردہ کو لڑا کر پرانے کپڑے کو نیا رنگ دیا ہے۔ 465ھ میں یعنی شاگرد کے 4 برس بعد فوت ہوا۔ اب اس کا کلام سناتا ہوں۔ عہد کی زبان۔ بحروں کے وزن۔ اور جو جو انداز شاعری اس کے میں نے بیان کیے۔ ہر نکتہ پر غور فرمائیے:

مناظرہ نیزہ و کمان

هر سلاحی روز گرز ئے ست اندر کارزار | زخم سخت آں دل کزد گرد و عدو کارزار
لیک آں کو ہم بجائے خویش و زخم آورد دور | رمح و قوس است آلت جنگ آوران کیں گذار
ہر دو را روزے جدل افتد باہم در سخن | ایں بر آں آورد حجت آں بدیں کرد افتخار
رمح گفت و تو کہ قوسی۔ فضل من بہتر ازانکہ | تو چو پشت عاشقی، من چوں قد دلبر نگار
قوس گفت ار چوں قدیدی تو چوبو۔ کہ مثال | من چناں کابروے یدم۔ گر توئی چوں قدید
رمح گفتا بدعائے موسیٰ مرسل چو من | آنکہ شدمار بر آورد ز سر دشمن دمار
قوس گفتا بد عصائے موسیٰ آرے چوں تو لیک | آں عصا ہم شبہ من شد۔ چوں بر آمد انگشت مار
رمح دیگر رہ بہ تندی گفت تو کوتہ قدی | مردم کوتہ معجب باشدو تا بردبار
قوس گفتا بسکہ گفتی یا ذا کنوں یک بہ یک | پاسخ از من بشنو و غلت بالقلم برگمار
ہم بہ قوت ژندہ پیلم۔ ہم بہ ہیبت شرزہ شیر | ہم بہ پیچش تندمارم۔ ہم بہ سوزش تفتہ نار
بر جہاں ژالہ چو نوک تیر من بارد غمام | از ہوا قوس قزح چوں من پدید آرد بہار
جز بہ صحرا بر۔ نیائی تو بکار آنجا کہ جنگ | ہم بہ صحرا بر بکار آیم من و ہم در حصار
شاخ میوہ دار خرم چوں من آرد خم گاہ بر | ماہ گردوں ہر مہے چوں من شود وقتے نزار
صاحب راہ سفر توشہ نیائی داد تو | از ہوا من آورم مرغان و صید مرغزار
رمح کایں بشنید۔ عاجز گشت۔ عذر آورد گفت | راست گفتی۔ ایں نیا مختی مگر از شہریار
نامور میر اجل والا منوچہر اصل ملک | تاج شاہان و شجاع دولت و فخر تبار

چھ شعر اور مدحیہ لکھے ہیں۔

گرشاسپ نامہ کے اشعار سنئے اور دیکھئے کہ شاگرد کی تصویر سے استاد کیونکر تصویر اتارتا ہے۔

ز کردار گرشاسپ اندر جہاں　　یکے نامہ بدیادگار از مہاں
ز فرہنگ و نیرنگ و داد و ستم　　ز خوبی و زشتی و شادی و غم
ز نخچیر و گرد نفرازی و بزم　　ز مہر و دل و کینہ سازی و رزم
کہ چوں خوانی از ہر درے اند کے　　بے دانش افزا بداز ہر۔ یکے
ز رستم ہمے چونکہ خواہی شنود　　گمانی کہ چوں او ہمردی نبود
گر از رزم گرشاسپ یاد آیدت　　ہمہ کار رستم بباد آیدت
ہمے رستم آں بد کہ دیو نژند　　ببردش بہ ابرو بدر یا فگند
ستہ شد ز ہوماں بگرز گراں　　زدش و شبانے بہ مازندراں
زبوں کردش اسفندیار دلیر　　بہ کشتیش آورد سہراب زیر
بہمدار گرشاسپ تا زندہ بود　　نہ کردش زبوں کس نہ افگندہ بود
بردم و چین و بہند از نبرد　　بگرد انچہ دستان رستم نہ کرد
نہ گرگ و نہ ببر آمد ازوے رہا　　نہ شیر و نہ دیو و نہ ز اژدہا
بہ شہنامہ فردوسی نغز گوئے　　چو از پیش گویندگاں برد گوئے
بسے یاد رزم یلاں کردہ بود　　وزیں در۔ سخن یاد ناوردہ بود
نہالے بداں۔ رستہ ہم زاں درخت　　شدہ خشک و بے بارو پژمردہ سخت
من ایدوں ز طبعم بہار آورم　　مرایں شاخ را نو ببار آورم
بباد ہنر گل کفانم بر اوئے　　ز ابر سخن در فشانم براوئے
برو میوہ دارش آرم بروں　　کنم آفریں شہنشہ فزوں
بسازم یکے بوستاں چوں بہشت　　کہ خندد ز خوشی برادری بہشت
گلش سربسر در گویا بود　　درخت و گیا مشک بویا بود
جستانے آریم از خوش سخن　　کہ ہرگز نگارش نہ گردد کہن
بنانش از خرد زادہ وز جان پاک　　ز دانش سرشتہ نہ از آب و خاک

بہافم یکے دیبہ شاہوار — زمعنیش رنگ وز گوہر نگار
زجاں آورم تاروپودش فراز — کنم خوریرا برو برطراز
مرا جز سخن ساختن کار نیست — سخن ہست لیکن خریدار نیست
زراواں ہمیں شاہ ماناست و بس — خریدار ازو بہترم نیست کس
زینکو سخن نیست پائندہ تر — نہ زاں خوشترو دل کشائندہ تر
سخن ہمچو جاں زاں نگردد کہن — کہ فرزند جانست زیبا سخن
سرائندہ دہقان موبد نژاد — زگفت دگر موبداں کرد یاد
کہ برشاہ جم چوں برآشفت بخت — ہنا کام ضحاک رو داد تخت
جہاں زیر فرمان ضحاک شد — زہر نامہ نام جم پاک شد
چو برگفت گیتی بشاہنشہی — فرستاد نزد شہاں آگہی
کہ بارائے ماہر کہ دل کرد راست — بجویند جمشید را تا کجاست
گرش جائے در کہ بود چوں پلنگ — دگر زیر آب اندروں چوں نہنگ
بہ خشکی چویوزش ببندید دست — برآرید از آبش چوماہی بہ شست
گریزاں ہمے شد جم اندر جہاں — پریوار از چشم مردم نہاں
بشہرے کہ رفتے نماندے بسے — بداں تا نشانش نداند کسے
بدیں گونہ بدتا کہ گردندہ مہر — بہ پیمود دو راہ راہ سپہر
پس از درد بسیار و رنج دراز — بیامد ابر زاولستاں فراز
یکے شہر دید از خوشی چون بہشت — درودشت و کوہش ہمہ باغ کشت
نہادش نکو، تازہ بر، نونوا — زمیں خورم، آبش خنک، خوش ہوا
براز حشرانبوہ و، مردان مرد — سپاہی و شہری یلان نبرد
درو خسرو نامور شہریار — شہے کش نباشد بصد شہریار
مراں شاہ را نام گورنگ بود — کزو تیغ فرہنگ بے زنگ بود
یکے دخترش بود کز دلبری — پری رالبہ رخ کردے ازدل بری
بکاخ اندروں بت، بمجلس بہار — در ایواں نگار و بمیداں سوار

مہش مشک سائی و شکر میفروش دو نرگس کماں کش، دوگل درع پوش
شبستان گلستاں بدیدار او دوزلف و دو رخ زلف گلنار او

شاہ ناصر خسرو: ان کا کلام چوتھی صدی کی شاعری کا عمدہ نمونہ ہے۔ فضیلت اور حکمت و فلسفہ میں بو علی سینا اور ابو نصر فارابی کے پہلو نشین تھے۔ آخر عمر میں 20 برس عزلت گزین ہو کر سب تصنیفات کو فنا کر دیا۔ 12 ہزار شعر کا دیوان ایران میں مشہور ہے۔ جو کچھ کہا۔ کمال شاعری کے اظہار کے لیے نہیں کہا۔ نہ شعرائے عصر سے مقابلہ مد نظر تھا۔ دل کا جوش تھا۔ زبان سے چھلکا اور اپنی ذاتی زبان میں چھلکا۔ علم کتابی نے عربی الفاظ زبان پر ڈالے تھے۔ دیکھو! وہ بھی آ گئے۔ مگر کلام خاک خوراسان کا طبع زاد جوہر تھا۔ علم عارضی تھا۔ جوہر کو نہ دبا سکا۔ اسی واسطے زبان ملک کی اصلیت و اصالت دیکھنی چاہو تو فردوسی کا کلام دیکھو یا ان کا:

چوں گشت جہاں رو گراحوال عیانیش زیرا کہ بگسترد خزاں راز نہانیش
برحسرت شاخ گل در باغ گواشد بیچارگی و زردی و کوژی و نوانیش
تازاغ بباغ آمد بلبل زفصاحت بربست زباں وز طرب و لحن واغانیش
شرمندہ شد از باد سحر گلبن عریاں وزآب رواں شرمش بربود روانیش
کہسار کہ چوں رزمہ بزاز بد۔ اکنوں گر بنگری از کلبہ نداف ندانیش
چوں زر مزور نگر آں لعل بدخشیش چوں چادر گاذر نگر آں بردیمانیش
بس باد جہد سرو زکہ لاجرم اکنوں چوں پیر کہ یاد آید از روز جوانیش
خورشید بیوشد زغمش پیرہن خز ایمنت ہمیشہ سلب خوب خزانیش
برمفرش پیروزہ بہ شب شاہ حبش را از سودہ پاکیزہ بلوراست اوانیش
ہنگر بہ ستارہ کہ بتازد سپس دیو چوں زر گدازیدہ کہ برقیر چکانیش
مانند یکے جام تخنین است سباہنگ بزدودہ بہ قطرہ سحری چرخ کیانیش
گرنیست یخیں چوں؟ کہ چو خورشید برآید ہر چند کہ جوئید نیابید نشانیش
پرویں بہ چہ ماند یکے دستہ نرگس یانسترن تازہ کہ بر سبزہ فشانیش
ایں دہر دوندہ بہ یکے مرکب ماند کز کار نیاساید ہر چند دوانیش

گیتی ست یکے بندۂ بدخوست مخوانش | زیر از تو بدخو بگریزد چو مخوانیش
از بہر جفا سوئے تو آیدز در خویش | مگزار وز در دور بداں گربتوانیش
دشمن چونکو حال شدی گرد تو گردد | زنہار مشوغرہ بداں چرب زبانیش
چونانکہ چو بز بہتر و فربہ تر گردد | از بہر طمع بیش کند مرد شبانیش
فرزند ہے دارد ایں دہر جفا جو | ہریک بدہ بے حاصل چوں مادر زانیش
تا کس بہ توجز محنت و خواری نہ رساند | ہرچند کہ تو برفلک ماہ رسانیش
ہرگاہ نہ بینی مگر آنرا کہ سزا ہست | گزگاہ برانگیزی و درچاہ نشانیش

عالم پیری و غربت وطن

کہ پرسد زیں غریب وزارد محزوں | خراساں را کہ بے من حال توچوں؟
ہمیدونی کہ من دیدہ بہ نوروز؟ | خبر ہفرست اگر ہستی ہمیدوں
درختانت ہمے پوشند پیرم؟ | ہمے بسدد ستار طبرخوں؟
نقاب رومی و چینی بہ نیاں | ہمے بندد صبا برروئے ہاموں؟
نثار آرد عروساں رابہ بستاں؟ | زگوہر ہائے آلواں ماہ کانوں
ہمے سازند تاج فرق نرگس؟ | بہ زر خنچہ لولوئے مکنوں
مرا بارے دگرگونست احوال | اگر تونیتی بے من دگرگوں
مرا برسر عمامہ خزا او کن | بزدوست زماں خوش خوش بہ صابوں
مرا رنگ طبرخوں دہرقانی | بشست ازروئے سیرم تاب زریوں
زجور دہر الف چوں نوں شد ستم | زجوردہر الف چوناں شودنوں
گرندہ مار را افسوں بدیدست | گزندہ دہر را کشناسد افسوں

اس طبقہ کے شعرا ہر نظم میں تخلص کا ظاہر کرنا واجب نہ سمجھتے تھے۔ شاہ مرحوم کہیں کہیں ناصر نام ظاہر کرتے ہیں۔

عنصری عہد محمود میں ملک الشعرا' امیر الامرا اور مصاحب خاص تھا۔ کلام کے زور اور اقبال کے شور سے 400 شاعر استاد مانتے تھے۔ استاد منوچہری نے بھی اپنے

قصائد میں اس کی شاگردی کا اقرار کیا ہے۔ تذکروں میں 30 ہزار بیت اس کے دیوان کے لکھے ہیں مگر اب جو دیوان ایران کے کتب خانوں میں ہیں 3 ہزار بیت سے زیادہ نہیں۔ اس نے زبان میں ایسی اصلاح کی ہے کہ اپنی نظم کو دو سو برس آگے بڑھا کر طبقہ دوم کے شاعروں سے ملا دیا ہے۔ تمام دیوان اس کا معمولی قصیدے ہیں۔ ملک کی جغرافی حالت نے بہاریہ اور عاشقانہ تمہیدیں لکھی ہیں۔ اکثر تمیں، چالیس یا پچاس شعر کی تمہید۔ اخیر میں محمود کی مدح یا مسعود کی تعریف یا بعض فتوحات کی تہنیت۔ بلکہ اخیر میں ایک دو شعر ممدوح کے نام کے۔ عنصری 431ھ میں مر گیا:

سده جشن ملوک نامدار است ۔۔۔ زافریدون وازجم یادگار است
زمیں امشت تو گوئی کوه طوراست ۔۔۔ کزو نور تجلی آشکار است
گراز فصل زمستانست بهمن ۔۔۔ چرا امشب جہاں چوں لالہ زار است
ہمے مرموج دریا را بسوزد ۔۔۔ بداں ماند کہ خشم شہریار است

معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت تک جشن سدہ کی رسم باقی تھی۔ پھر مذہب اور سلطنت قومی کے تغیر نے مٹا دیا۔

مدح محمود سبکتگین میں کہتا ہے:

عنود استعد ہر ماه منور ۔۔۔ خط و زلفین اں بہ روئے دلبر
یکے راسنبل نورستہ بالیں ۔۔۔ یکے را لالہ خود روئے بستر
بروئے وموئے اونگر کہ بینی ۔۔۔ بے آذر ہر دو از افعل آذر
یکے بعد دود سال و ماه تیرہ ۔۔۔ یکے بعد نور روز و شب منور
مرا بہره دو چیز آمد ز گیتی ۔۔۔ دل پاک و زبان مدح گستر
یکے بر مہر جاناں وقف کردم ۔۔۔ یکے بر مدح شاہنشاہ کشور
مبارک دست او دو گونہ ابرست ۔۔۔ کشند دشمنان و دوست پرور
یکے باتیغ و بارانش ہمہ خوں ۔۔۔ یکے بابذل و بارانش ہمہ زر
بروز رزم او بسیار بینی ۔۔۔ گو لشکر شکار و گرد صف در
یکے را زخم تیرش کرده بے جاں ۔۔۔ یکے را زخم تیغش کرده بے سر

اگر مرجاہ و جودش را خداوند بداوے صورتے مخصوص منظر
یکے اندر فلک خورشید بودے یکے اندر زمیں دریاے اخضر
بہ ہیجا پیشہ آموزد زدستش سنان نیزہ خطی و خنجر
یکے دل دوز و اندر درع و خفتاں یکے سر برد اندر ترک و مغفر
بروز جنگ تیغ او و گزرش بزور بازوئے شاہ دلاور
یکے جیحون خوں راند بہ صحرا یکے ہاموں کند سد سکندر

ایک دفعہ محمود نے فصد کھلوائی۔ اس نے فی البدیہہ یہ قطعہ کہہ کر سنایا:

آمد آں رگ زن مسیح پرست نیش الماس گوں گرفتہ بدست
طشت زرین و آبدستاں خواست بازوئے شہر یار را پربست
نیش بگرفت و گفت عز علیک آنچناں دست را کہ یارو خست
سر فرو برد و بوسہ بر داو در سمن شاخ ارغواں برجست

اس کے اشعار کو دیکھو اور فردوسی کی نظم کو یاد کرو۔ حاضر باشی دربار نے اس کی زبان میں ملائمت اور نرمی پیدا کی ہے۔ اور علماء کی صحبت نے قومیت اور ملکیت کو مٹایا ہے۔

پہلے قطعہ میں باوجودیکہ جشن سدہ کی مبارکباد ہے۔ مگر اس کے چراغاں کو طور کی تجلی میں دکھایا ہے۔ دوسرے قطعہ کو دیکھو۔ ماہ کی صفت منور۔ بہادر کی صفت صف در۔ ترک کی مغفر۔ فردوسی نے شاید کہیں لکھا ہو۔ 60 ہزار شعر کی کتاب موجود ہے۔ دیکھ لو۔

تیسرے قطعہ میں جراح کو مسیح پرست۔ برکت شفا کے لیے کہا ہو۔ یا کوئی روم کا ڈاکٹر عرب کے رستے آکر ملازم دربار ہوا ہو گا۔ یہ آمیزش دربار کی برکت سے ہوئی۔ فردوسی کی چاندی کھری ہے۔

منوچہری دامغانی۔ دربار محمود میں مصاحبت اور امارت کا رتبہ رکھتا تھا اور عنصری سے دوسرے مرتبے پر نشست پاتا تھا۔ اس نے بھی اسی شان اور سامان کے قصیدے کہہ کر زمانہ سے اپنی استادی کا اقرار لیا ہے۔ مگر بعض قصائد میں زبان قومی کے لحاظ سے پرانے الفاظ اور محاورے خوب چھوڑ گیا۔ ترقی زبان کے عاشق عیب سمجھیں تو سمجھا

کریں۔ 432ھ میں مر گیا۔ ابو سہل دبیر کی مدح میں یہ قطعہ کہا تھا۔ زبان کو دیکھو۔ طرز کلام کو دیکھو:۔

نو روز روزگار نشاط است و ایمنی — پوشیدہ ابر دشت بہ دیبائے ارمنی
بریاسمن عصابہ در مرصع است — بر ارغواں طویلہ یاقوت معدنی
خیل بہار خیمہ بہ صحرا بروں زدند — واجب کند کہ خیمہ بہ صحرا بروں زنی
از بامداد تابہ شبانگاہ مے خوری — دز شام گاہ تابہ سحر گاہ گل کنی
بر ارغواں قلادۂ یاقوت نگی — بر مشک بید تازہ عود بشکنی
بر گل ہمے نشینی و بر گل ہمے خوری — بر خم ہمے خرامی بردن ہمے دنی
درست ناخریدہ و مشک است رائگاں — ہر چند برفشانی دہر چند برچنی
نرگس ہمے رکوع کند درمیان باغ — زیرا کہ کرد فاختہ برسرد موزنی
وارد نجستہ غالیہ دانے۔ زسند روس — چوں ثمہ بہ عنبر سارا بیاگنی
نرگس بسان کھہ زریں ترا زویست — چوں زر جعفری بمیانش درافگنی
ماندبہ سینہ و دم طاؤس شاخ گل — چوں مشک و در ودانہ بدوبر پراگنی
دو رویہ گل چو دائرہ بر سرخ دیبہ است — چوں پشت او بہ رشتہ زریں بپاژنی
باطنش ہست دیگر و ظاہرش دیگر است — گوہر شدست ای گل دو روی باطنی
نرگس بسان چرخ کیے برہ آسیاست — آں چرخ آسیا کہ ستوں زمردیں کنی
چرخش ز زر زردگنی و نگبے درو — دندانہ بلوریں گردش تو برکنی
شاخ بنفشہ بر سر زانو نہادہ سر — مانندہ مخالف بوسہل زوزنی
ہرگز منی نکرد و رعونت رہبر زانک — رسوا کند رعونت و رسوا کند منی
از ہمت بلند بدیں مرتبت رسید — ہرگز بمرتبت نرسد مردم دنی
او را زریمنی گہر پاک بازداشت — ممکن نباشد از گہر پاک ریمنی
آمد بسوئے او زہمہ خلق محمدت — چوں بانشیمن آید مرغ نشیمنی
از شان انگبیں نہ بزاید جزانگبیں — ازنفس او نیاید الالطف کنی
رائے موافق و نیت و اعتقاد او — از روزگار تو سن برداشت تو سنی

بسعد شاہ را خلفائے اگر جز لو | لیکن بکام اوست دل شاہ مقتنی
احسان شہریار بہ تعلیم نیک اوست | چوں قوت بہار یہ باران بہمنی
باعز مشک دیژہ باقدر گوہری | باجاہ زر ساوی و بانفع آہنی
خرمن ز مرغ گرسنہ خالی کجا بود | مامر غکان گرسنہ ما را تو خرمنی
تاحرف بانقط بود و حرف بے نقط | تا خط مستوی بود و خط منحنی
عمر تن تو باد فزائندہ و دراز | عیش خوش تو باد گوارندہ دہنی

فی المضحکہ

مرا تو گوئی ے خوردنست اصل فساد | جان تو کہ ہے آیدم ز تو ضحکہ
اگر فساد کندہر کہ اونبید خورد | بسا فساد کہ در یثرب است و در مکہ
چرا نبید حرام ست و ہست سرکہ حلال | نہ ہم نبید بود ابتدا ازاں سرکہ
نبید خام چہ انگوری وچہ موویزی | سفید سیم چہ بے سکہ و چہ باسکہ
کجا نبید است[52] آنجا بود جوانمردی | کجا نبید است آجانکہ رود برکہ

فرخی۔ اس نے اور اس کی شاعری نے سیستان کے جنگلوں میں پرورش پائی۔ طبیعت میں خدائی جوہر تھا۔ خود بخود چمکتا گیا اور زبان سے بڑھ کر گلے پر اثر دکھایا۔ موسیقی کے پروں سے اڑنے لگا۔ سیستان کا علاقہ شہریت کے لوازمات سے ہمیشہ خالی رہا ہے۔ وہاں تنگدستی تنگ رکھتی تھی۔ اس پر شادی کی اور شادی بھی اپنی پسند کی شادی۔ پہلے تنگ تھا۔ اب تنگ تر ہو کر گھر سے نکلا۔ امیر بلخ کو سنا کہ اہل کمال کا قدردان ہے۔ وہاں پہنچا۔ وہ مرغزاروں میں اپنے گھوڑوں کے گلوں میں سے بچھیرے چن رہا تھا۔ اس نے وہیں جا کر سلام کیا۔ امیر نے ایک صحرائی آدمی کو جنگلی لباس میں ایسا فصیح اور روشن دماغ دیکھا بہت خوش ہوا۔ خوش آوازی نے خوش کلامی کی سفارش میں زور لگائے۔ حاکم نے حکم دیا کہ ہزار بچھیرے ہم نے آج جمع کیے ہیں۔ جاؤ۔ ان میں سے جتنے بچھیرے گھیر سکو گھیر لیو۔ یہ ان کاموں کے مشاق تھے۔ کمر باندھ، پگڑ سنبھال کر دوڑے اور جنگلی حکمت عملی سے چند بچھیرے گھیر لیے مگر تھک گئے تھے۔ وہیں پڑ رہے۔ یہ

حالت امیر کو اور بھی پسند آئی۔ آرام اور عزت کے سامان میں ترقی دی۔ امیر دربار محمود میں گیا۔ انہیں بھی لے گیا۔ وہاں جا کر نصیبہ کھل گیا اور رفتہ رفتہ ایسے ہو گئے کہ عنصری کے برابر نام آنے لگا۔

نظم کا انداز، شعرائے دربار کا انداز ہے۔ دیوان عنصری کے برابر دیوان ہے۔ اس میں عربی الفاظ اور عربیت کے اشارے بھی ہیں۔ پھر بھی خاک خوراسان سے اٹھا اور صحرائے سیستان میں پرورش پائی تھی۔ جو اصالت زبان اور قدرت کلام کے انداز ہیں وہ نہیں گئے بلکہ اور شعرائے دربار سے زیادہ ہیں۔ 429ھ میں مر گیا۔

محمود نے غزنی کے دامن کوہ میں ایک محل بنایا۔ سامنے باغ لگایا اور اونچے سرچشمہ سے کاٹ کر بیچ میں نہر لایا۔ اس کی تعریف میں کہتا ہے۔ نظم کا نمونہ سنئے:

به فرخنده فال و به فرخنده اختر　　بنو باغ میخواست شاه مظفر
به باغے درختاں او عود و صندل　　بباغے ریاحین او بسدتر
به باغے چو پیوستن مهر خورم　　بباغے چو رخسارهٔ دوست دلبر
به باغے درو سایه شاخ طوبی　　بباغے درو چشمه آب کوثر
بهشت اندر و بازیانی به نیساں　　بهار اندر و بازیانی باذر
ز سرو بریده چو زلف بریده　　ز شکل مدور چو چرخ مدور
درو مسکن ماه رویان مجلس　　درو خانه شیرگیران لشکر
کجا جائے بزم است گلهائے بے حد　　کجا جائے صید است مرغان بے مر
رواں کرد برگرد رعنا درختاں　　تذروان آموخته ماده و نر
یکے کاخ شاهانه اندر میانش　　سر کنگره بر کنار دو پیکر
بکاخ اندروں صفه هائے مصطفی　　در صفها ساخته سوئے منظر
یکے همچو دیبائے چینی منقش　　یکے همچو ارژنگ مانی مصور
نگاریده در چند جامر مصور　　شه شرق را اندراں کاخ پیکر
بیک جائے در صید و در دست ژوپیں　　بیک جائے در بزم و در دست ساغر
ازاں کاخ فرخ چو اندر گزشتی　　یکے رود و آب اندر و همچو شکر

برفتن ز تیزی چو فرمان سلطاں | بخوردن ز خوبی چو عیش توانگر
نہ چرخ ست و اجزائے اوچوں ستارہ | نہ ابراست و آوائے او ہچو تندر
اگر بگذرد بر سرش مرغ۔ موجش | بیالاید اندر ہوا مرغ را پر
بدیساں بہاغ اندروں تندرودے | یکے ژرف دریا مرآں را برابر
رواں اندرو کشتی و خیرہ ماندہ | ز پہنائے او دیدہ آشناور
بدواندروں ماہیاں چوں عروساں | بجوش اندروں پرگہر حلقہ زر
مکانے برآوردہ پہلوئے دریا | بداں تاہداں ے خورد شاہ صفدر
یمین دول شاہ محمود غازی | امین ملل خسرو ہندہ پرور
ہمردی فزائندہ عزمومن | بشمشیر کاہندہ کفر کافر
زہے بزم را ابر دینار قطرہ | زہے رزم را خرو رزم گستر
بساجنگ جویا کہ پیش تو آمد | سیہ کرد بر سوگ او جامہ مادر
بسا بیشہائیکہ اندر گزشتن | تہی کردی ازگرگ و ببر وغضنفر
بہندوستاں آنچہ نوپار کردی | براہل سلاسل نہ کرد است حیدر

عزیزان وطن! طبقہ اول کے فصحا کا کلام آپ نے سن لیا۔ اب مناسب ہے کہ اس کی خصوصیتوں کو کھولوں تا کہ ان میں اور طبقہ آئندہ کے کلام میں امتیاز نظر آئے۔

(1) آپ دیکھیں گے کہ اس طبقہ کے فصحا کا انداز بیان اور ادائے مطلب کا طریقہ آنے والوں کے انداز بیان سے فرق رکھتا ہے۔ چنانچہ فردوسی کے کلام میں کہیں کہیں اشارہ کیا گیا۔ مگر حقیقت میں وہ نکتے حد بیان سے باہر ہیں ذوق سلیم اس کا مزا لیتا ہے اور رہ جاتا ہے۔

(2) یہ زبان کے مالک جس طرح ضمیروں کو ترکیب دیتے تھے۔ طبقہ دوم وسوم کے فصیح کچھ کچھ اس طرح بولتے رہے۔ پھر رفتہ رفتہ محاورہ بدل گیا۔ ایک جلسہ میں رستم کا حال کہتا ہے۔

یکایک سرا رانگہ کردو دید | ز شادی رخاں شاں چو گل بردمید

اسی طرح "اریم شاں" اور۔ "سپاریم شاں" (یعنی شاں زا)۔

ش۔ ضمیر غائب کو دیکھو اسدی طوسی کس طرح ترکیب دیتا ہے (حمد الٰہی میں)

یکے کش نہ یارد نہ انباز بود — نش انجام باشد نہ آغاز بود

ضمیر کے پہلے حرف کو کہ متحرک ہوتا ہے۔ جہاں چاہتے بے تکلف ساکن کر دیتے تھے (سہراب اپنی ماں سے کہتا ہے):

برسم وہم تخت و گنج و کلاہ — نشانمش برجائے کاؤس شاہ

چو دردشت مرخش رایافتند — سوئے بند کردنش بشتافتند

چو رستم بدیدش کیانی کمند — بیفگند و سرش اندر آمد بہ بند

اسدی طوسی نے جان کے باب میں کہا:

ہمیدت و دیدن ورا روئے نیست — کشد کوہ و ہمسنگ یک موئے نیست

یعنی وہ تجھے دیکھتی ہے مگر اس کے دیکھنے کی کوئی صورت نہیں۔ پہاڑ کو کھینچ لیتی ہے اور بال کے برابر بھی نہیں۔ فردوسی کا عام محاورہ ہے:

برآراستند رخش رستم تمام — بہ زریں رکیب و بہ سیمیں ستام

ساکن کو متحرک کر دیتے تھے:

بشادی ہمہ جاں برافشاند ند — براں پہلواں آفریں خواند ند

(3) الف زائد اسم اور فعل کے آخر میں لگاتے تھے (دیکھو فردوسی سیامک کو دیو سے لڑاتا ہے):

سیامک برآمد برہنا تنا — بیاوسخت باپور آہر منا

چاند سے خطاب کر کے بہت سے شعر لکھے ہیں۔ ان میں کہتا ہے:

بہ سی روز گیتی بہ پیمایدا — دو روز و دو شب روئے ننمایدا

(4) جمع کا الف جہاں چاہتے تھے لگا دیتے تھے۔ فردوسی سہراب کے مرنے پر رستم کو تسلی دیتا ہے:

کہ درمان ایں کار یزداں کند — مگر کیں غماں بر تو آساں کند

اگر عمر باشد مرا سالیاں — بہ خدمت بہ بندم کمر برمیاں

(5) الف یا وجو آخر لفظ میں واقع ہوں ان کے "بعدے" ظاہر کرتے تھے۔

کز اویست 53 پیروزی و دستگاہ ہم او آفرینندۂ مہر و ماہ

(6) زر اور پر کی "ر" کو اکثر مشدد لاتے تھے اور اسی طرح بعض اور الفاظ میں بھی

چنانچہ اسدی طوسی نے حمد میں کہا ہے:

یکے زر بنقش دہد خروی یکے شارہا بانقش ہندوی

چو خورشید آں چادر قیرگوں بدرید واز پردہ آمد بروں

ہوا ابر گشت از بخور عبیر خندید ہم و بنالید زیر

دم اسپ کو دنب اسپ۔ اور سم اسپ کو سنب اسپ باندھا ہے:

بسازم یکے بوستاں چوں بہشت کہ خندد ز خوشی برا روی بہشت

(7) کج کو کژ اور ژ پر تشدید اور اس طرح مژہ کو مژہ باندھتے تھے وغیرہ۔

کہ اے برتر از کژی و کاستی بہی زاں فزاید کہ تو خواستی

(8) در کی جگہ اندر اندرون اور کہیں دونوں بولتے تھے۔ فردوسی رستم کے باب

میں :۔

درآمد خروشاں دراں دشت جنگ بہ چنگ اندروں گرزۂ گاو رنگ

یل نامور پور دستان سام بہ بازی سر اندر نیارد بدام

فلک گر بزیر سحاب اندر است وگر زیر پر عقاب اندر است

پندار کو از پے کار تو بہ بند خطا و ثواب اندر است

اگر بدکنی کیفر خودبری نہ چشم زمانہ بخواب اندر است

درایوان ہا نام بیژن ہنوز بزندان افراسیاب اندراست

بہ رہ بر گو پیلتن را بدید بزد دست و تیغ ازمیاں برکشید

بہ شائستہ کاری بروں رفت رند گوے دید برسان سروبلند

(9) با اور بے کے اول میں اکثر الف زائد لگا دیتے تھے۔ جہاں رستم کو کاؤس نے خفا

کر دیا اور وہ بگڑ کر سیستان کو چلا ہے۔ سپاہ کی زبانی فردوسی کہتا ہے:

ابے او نہ باشیم در جنگ شاد ہمہ رزم ماگشت اکنوں چوباد

ابر بارۂ جنگ جوئے سوار ہمے رفت و میگفت با دیو سار

(10) چناں اور چنیں کو چوناں اور چونیں باندھتے تھے۔ اور چوں او کو چنوے ہشیار کو ہشیوار لکھتے تھے اور دانشمند کو دانشومند بھی کہہ جاتے تھے۔ سہراب دور سے لشکر کاؤس کو دیکھتا ہے اور ایک ایک سردار کا حال پوچھتا ہے کہ رستم کا نشان معلوم ہو:

نبردہ نژادے کہ چونیں بود نہاں کردن از من چہ آئیں بود
کہ گورے مغولی ندیدم چنوئے بداں یال وآں گفت وآں رنگ و بوئے

(11) بر جائے نزد اور نزدیک لاتے تھے۔ رستم سہراب کے خیال میں کہتا ہے:

فرستادمش زر و گوہر بسے برمادر او بدست کسے

بہت لفظ ہیں کہ اس طبقہ کی ہر بات میں زیرِ محاورہ تھے۔ طبقہ دوم میں بعض متروک ہو گئے بعض کبھی کبھی بولتے رہے۔ مثلاً:

ویژہ۔ مر۔ اب ویزہ کی جگہ خصوصاً بولتے ہیں۔ مر کہیں کہیں استعمال ہوتا ہے اور ویژہ بہ معنی مردپاک طینت متروک ہو گیا ہے۔

ہمے۔ شعرائے قدیم فعل کے اول میں لگاتے تھے اس سے فعل مذکور کا جاری رہنا سمجھا جاتا تھا۔

ایدون۔ ہم ایدون۔ اب اس کی جگہ حالا کہتے ہیں۔ رستم اپنے رخش کا سراغ لیتا شہر سمنگان میں پہنچا۔ وہاں کے کارداروں سے کہتا ہے:

در ایدوں کہ رخشم نیامد پدید سراں را بسے سر بخواہم برید

ایدر۔ اودر۔ اب ان کی جگہ اینجا اور انجا لکھتے ہیں۔

کردن۔ بہ معنی ساختن بہت لکھتے تھے۔ فردوسی ہوشنگ کے حال میں لکھتا ہے:

بہ فرکئی نرم کرد آہنا چو خود و زرہ کرد و چوں جوشنا
چہاں رانہ بر بیہدہ کردہ اند ترا نز پے بازی آوردہ اند

بدن۔ بجائے بودن۔ بد۔ بجائے بود۔ بدے۔ بجائے بودے۔ نظم میں اور بعضے نثر میں بھی لکھتے تھے:

یکے امروز بابا ببایدبدن وزاں پس ہمیں رائے رفتن زدن
اگر مادر شاہ بانو بدے مرا سیم و زر تا بزانو بدے

مراخت روشن بدیدار تست بوی خورم و جاوداں تندرست

ترکیب ہائے مذکورہ کے علاوہ صدہا لفظ ہیں کہ اس طبقہ کے عام محاورہ میں مستعمل تھے اور فصحائے وقت اپنے مطالب ان کے ذریعہ سے ادا کرتے تھے۔ پھر وقت بوقت معزول ہو کر مرتے گئے۔

بوشاسپ۔ اس کی جگہ خواب اور رویا کہنے لگے۔ طبقہ دوم میں یہ لفظ مر گیا۔

آذر گشسپ فردوسی اور اسدی کے کلام میں بہت آتا تھا۔ پھر صاعقہ یا برق کہنے لگے۔

ویژہ فردوسی اور اسدی تک رہا پھر نیک۔ باصفا۔ پاک طینت کہنے لگے۔

ساد فردوسی اور اسدی تک رہا پھر خراج کہنے لگے۔

نیو فردوسی اور اسدی تک رہا پھر دلاور۔ دلیر۔ بہادر۔ شجاع وغیرہ کہنے لگے۔

ازیر فردوسی اور اسدی تک رہا پھر زیرک کہنے لگے۔

ازور فردوسی اور اسدی تک رہا پھر شائستہ۔ سزاوار ہو گیا۔

تراش فردوسی اور اسدی تک رہا پھر طمع۔ توقع ہو گیا۔

چرہ فردوسی اور اسدی تک رہا اسپ مطلقاً و اسپ سفید کو کہتے تھے۔

وژآگاہ اب سہمگین و خشمناک کہتے ہیں۔

خیر خیر فردوسی اور اسدی تک رہا پھر حالت خشمناک ہو گئی۔

زکان فردوسی اور اسدی تک رہا پھر اب از خود رمیدہ کہتے ہیں۔

ستیغ فردوسی اور اسدی تک رہا پھر چیز راست و بلند مثل ستون وغیرہ کو کہتے تھے۔

سفت فردوسی اور اسدی تک رہا پھر اب دوش کہتے ہیں۔

گاز فردوسی اور اسدی تک رہا پھر اب گیاہ یا علف کہتے ہیں۔

نوان فردوسی اور اسدی تک رہا پھر اب اس کی جگہ خمیدہ کہتے ہیں۔

ویر فردوسی اور اسدی تک رہا پھر اب اس کی جگہ حفظ کردن از بر داشتن کہتے

ہیں۔

توش فردوسی اور اسدی تک رہا پھر اب اس کی جگہ توانائی یا طاقت کہتے ہیں۔

رست فردوسی اور اسدی تک رہا پھر اب اس کی جگہ خاک یا گرد کہتے ہیں۔

شیر اوژن فردوسی اور اسدی تک رہا پھر اب شیر افگن کہتے ہیں۔

عناں گاشتن فردوسی اور اسدی تک رہا اب عنان اسپ گردانیدن کہتے ہیں۔

آفریں کرد فردوسی اور اسدی تک رہا۔ دعا کرد اور ثنا و ستائش کرد۔ کی جگہ کہتے تھے۔

نمازش برد فردوسی اور اسدی تک رہا۔ مراتب بعجز و نیاز بجا آورد۔ کی جگہ کہتے تھے۔

ان کے علاوہ شاہنامہ میں صدہا لفظ عموماً مستعمل ہیں مگر اب متروک ہیں۔ اگر ان کی فہرست اور توضیح بیان کروں تو سننے والوں کے شوق تنگ اور یہ لکچر ایک فرہنگ ہو جائے۔

ترکیب الفاظ میں بھی اکثر باتیں اس وقت عام تھیں۔ اب بعض ان میں سے متروک ہو گئیں اور بعض کم ہیں۔ چنانچہ،

مضاف مضاف الیہ کی ترکیب مقلوبی سے اکثر اسم صفت بناتے تھے۔ خصوصاً فردوسی کا انداز ہے۔ جہاں پہلواں اور ایراں سپاہ وغیرہ۔

اور فک اضافت بھی:

یکایک سراں رانگہ کرد و دید زشادی رخاں شاد چو گل بشگفید

غور کر کے دیکھئے لفظ لفظ میں فرق ہے یعنی یک یک سر کردہ رانگہ کرد۔ از شادی روہائے شاں ہمچو گل بشگفت۔

اسی طرح صفت موصوف سے مثلاً آزادہ سرو اور نرہ شیر وغیرہ اس سے بڑھ کر یہ کہ کمند کیانی کی جگہ۔ کیانی کمند کہتے تھے۔

است کو فعل جمع کے علامت جمع سے پہلے داخل کر دیتے تھے۔ اسدی طوسی نے کہا ہے:

بزرگان و پیغمبران خدائے بزیر زمیں داشتند جائے

اضافت ابنی سے بہت کام لیتے تھے مثلاً سام نریماں (سام ابن نریماں)

زال سام (زال پور زیماں)۔ بو علی سینا (بو علی ابن سینا)
ناموں کی ترخیم کرتے تھے اور نیرم یعنی نریماں نظم کرتے تھے۔
حرفوں کو گرانے اور بڑھانے کے لیے کوئی قاعدہ نہ تھا۔ دیکھو رستم، سہراب کو مار کر نالہ وزاری کرتا ہے:

کرا آمد ایں پیش کامد مرا کہ فرزند کشتم بہ پیراں سرا
یعنی در پیرانہ سری فرزند را کشتم۔

دوسرا طبقہ

اس گروہ نے 500ھ کے میدان میں ملک سخن کو آباد کیا۔ پہلے زبان کی قدرتی طبیعت زمین شعر میں گل پھول کھلاتی تھی۔ اب زبانوں نے قدرت، فکروں نے پرواز اور نگاہوں نے غور زیادہ پیدا کی۔ مشہور سخن آفرین خاقانی، انوری اور نظامی ہوئے کلام نے لباس بدلا۔ خیالات کا عالم بدلا۔ عرب کے علوم ملک میں عام ہو گئے تھے۔ بلاغت کی کتابیں فارسی میں لکھی گئی تھیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اول عرب کے الفاظ کا قبضہ زیادہ ہوا۔ پھر الفاظ و معانی کو صنائع و بدائع نے علمی رنگ دیا۔ پہلے طبقہ میں تقریر اور تحریر ایک تھی اور نظم کی خوبی یہ تھی کہ وزن کو توڑ دیں تو بے تکلف با محاورہ نثر ہو جائے۔ اب ایجاد نے استعارہ کے گل کھلانے شروع کیے۔ نثر کی تاریخ میں اس کی توضیح کر چکا ہوں۔ پھر مکرر کہتا ہوں کہ پہلے رنگ گل اور نغمہ بلبل کے بیان سے کلام میں بہار دکھاتے تھے۔ اب شاہد گل کے رخسار اور رامشگر بلبل کی آواز مضمون نکالنے لگے۔ اساتذہ مذکور نے اس ایجاد کو خوب برتا اور ہم عصروں نے بقدر مراتب۔ باوجود اس کے اخلاقی خوبی ان باکمالوں کی ادائے مافی الضمیر کی قدرت اور بیان کی صفائی تھی۔ خاقانی ابتدائے روئیداد اور خاتمہ مطالب کو نہایت خوبی اور تاثیر کے ساتھ نظم کرتے تھے۔ خاقانی:

خاقانی آں کساں کہ براہ تو میروند زاغندو زاغ را روش کبک آرزوست
طفلے کہ آرزوے ترازوے زر کند تاریخ راہرو کہ ترازو کند ز پوست
گیرم کہ مارچوبہ کند تن بشکل مار کو زہر بہر دشمن و کو

نیست اقلیم سخن را بہتر از من بادشا | درجہاں ملک سخن رانی مسلم شد مرا

تمہید قصیدہ

مریم بکر معانی رامنم روح القدس | نوعروس فضل را صاحب منم نعم الفتی
درع حکمت پوشم و بے ترش گویم کالقتال | خوان فکرت سازم و بے نخل گویم کالصلا
رشک نظم من خورد حسان ثابت راجگر | دست نثر من شد سحبان وائل راقفا
تلخ وشیرین است قدح ومدح من تااہل عصر | از عنب ے پختہ سازند و زخصرم توتیا

نظامی گنجوی نے پانچ لاجواب مثنویاں اور بہت سے قصیدے لکھ کر انشاپردازی میں نئے رنگ پیدا کیے اور تشبیہ اور استعارہ کو رنگینی کے ساتھ برتا اور اس خوبصورتی کے ساتھ برتا کہ اس کے بیچ باتکمن نظر آئے جو چند شعر لکھے ہیں فقط نمونہ ہیں کہ ایجاد نے کیونکر وقت کی زبان پر دستکاری کی۔ ایجاد مذکورہ بہت خوب اور نہایت خوب مگر بعض جگہ خصوصاً جشن نوشابہ میں ایسے پیچ پر پیچ پڑے ہیں کہ کام مشکل در مشکل ہوگیا ہے۔

فردوسی کے اور ان کے کلام میں امتیاز کرنا نہیں ہوسکتا جب تک ایک مضمون کے اشعار دونوں بزرگوں کے تمہارے سامنے نہ ہوں۔ مثلاً فردوسی دنیا کے کون وفساد کو ایک جگہ سمجھاتے ہیں:

دو در دارد ایں کاخ نیلوفری | کہ ازہر دو در بایدت برتری
یکے در بہ دنیا کہ در آمدی | دگر در کہ ازدے بسر آمدی

نظامی کہتے ہیں:

دو رو دارد ایں باغ آراستہ | دروبند از و ہر دو برخواستہ
بیا از در باغ و بنگر تمام | زدیگر در باغ بیروں خرام

اسی مضمون کو فردوسی ایک اور جگہ کہتے ہیں:

دو در دارد ایں باغ پیراستہ | کہ دنیا و دین است از و خاستہ
نیا کہ کس دروں آمدا | دین الٰہی بروں آمدا

بہ دنیا نما تا کہ بر اوفتی بہ دینت ہماں تا بدر اوفتی

خیمہ کی صورتحال میں فردوسی فرماتے ہیں:۔

یکے خیمہ داشت افراسیاب زمشرق بمغرب کشیدہ طناب
بسر بر یکے خیمہ زربفت زگردوں کشیدہ بروپردہ ہفت

نظامی کہتے ہیں:

بسر خیمہ ہمچو مشکیں پرند ستارہ فشاندہ بجائے سپند

فردوسی کہتے ہیں:

بسر خیمہ نور پرویں فشاں کہ پرویں فشاندہ جہاں در جہاں

نظامی کہتے ہیں:

بسر خیمہ ہمچو زریں چمن کہ باشد ز انجم گل و یاسمن

فردوسی نیزہ کی بلندی دکھاتے ہیں:

بدستش یکے نیزۂ ارجمند چو روز قیامت بہ بالا بلند
بدستش یکے نیزۂ سی ارش زخون جگر یافتہ پرورش

ہر داستان کی تمہید بہاریہ مضمون اور رنگین استعاروں سے کرتے ہیں۔ وہ بھی ہمیشہ گل وبلبل اور چمن سے اور ستاروں کی انجمن سے اور خاتمہ ساقی کو ساغرو مینا کے ساتھ لاکر خمار شکنی کرتے ہیں کہ تھکن اتر جائے اور دماغ تازہ ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ باستانی ایرانیوں میں شراب کا استعمال اس طرح ہوتا تھا۔ اب جہاں ہے فقط شراب خواری ہے۔ تمہید اور استعاروں کی مثالیں دیکھو۔ آغاز داستان سکندر میں کہ انداز سخن نے جوش کا خروش دکھایا ہے:

علم برکش اے آفتاب بلند خراماں شوائے ابر مشکیں پرند
بنال اے دل رعد چوں کوس شاہ بخنداے لب برق چوں صبح گاہ

ایک اور مقام پر کہتے ہیں:

بیا باغباں خورمی سازکن گل آمد در باغ را بازکن
نظامی بہ باغ آمد از شہر بند بیارائے بستاں بہ چینی پرند

زجعد بنفشہ بر انگیز تاب　　سر نرگس مست برکش زخواب
لب غنچہ راکایدش بوئے شیر　　بہ کام گل سرخ دردم عبیر
یکے مژدہ برسوئے بلبل بہ راز　　کہ مہد گل آمد بہ بستاں فراز

سکندر کے سامنے روشنک کو دلہن بنا کر لاتے ہیں:

دگر بارہ بلبل بہ باغ آمد است　　پری پیش روشن چراغ آمد است

جہاں داستان خاتمہ پر ڈھالتے ہیں تو ساقی کی طرف دیکھتے ہیں اور کہتے ہیں:

بیہر جا کہ من مجلس آراستم　　ازاں مے ہمہ بے خودی خواستم
وگرنہ بایزد کہ تابودہ ام　　بہ مے دامن لب نیالودہ ام
مئے کو چو آب زلال آمد است　　بہ ہر چار مذہب حلال آمد است

انوری بھی اسی طبقہ کا صاحب کمال سخن ایجاد تھا۔ استعارہ کو لیا اور خوش ادائی سے برتا۔ ممدوح کی تعریف میں کہتا ہے:

اے کردہ خجل نسیم خلقت　　درساحت بوستاں صبارا
گرد سپہت بحکم رو کرد　　ازخانہ دیدہ توتیا را
خاک در تو بہ قہر بنشاند　　در گوشہ فقر کیمیا را
چوں نیک نگہ کنم نہ زیبد　　جز نام تو زیورے ثنا را

بے شک استعارہ سے لطف کلام اور اضافت سے کلام میں اختصار خوب ہوا۔ کیونکہ اضافت نے اپنی مروڑ میں کئی لفظوں کو لپیٹ لیا۔ مگر مطلب کی صفائی میں پیچ پڑ گیا۔ اور ہر کہ آمد براں مزید کرد۔ بڑھتے بڑھتے پیچ در پیچ ہو گیا۔

دوسرا ایجاد اس طبقہ کا انداز غزل ہے۔ اس عہد کے شعرائے۔ مطلع، مقطع اور مقطع میں تخلص لگا کر نیا سانچا ڈھالا جس کی پتلیاں آج تک کاغذوں پر دوڑتی پھرتی ہیں۔

پہلے اور دوسرے طبقہ کے کلام میں غور کرو۔ ایک ہلکا سا رنگ امتیاز کا اور بھی جھلکتا ہے۔ شعرائے طبقہ اول کے کلام میں سادگی، سنگینی اور استواری تھی۔ طبقہ دوم کے کلام میں رنگینی، لطافت اور ملائمت پیدا ہو گئی۔ اس کا سبب کیا؟ سبب ظاہر ہے۔ پہلے شاعر کوہ و دشت کے رہنے والے تھے۔ ان کی سیدھی سادی طبیعت بے تکلف زبان سے

شاعری اگتی تھی۔ اب شاعری دربار میں آئی۔ امرائے دربار اور اہل علم شاعر ہونے لگے۔ ان کے لباس، نشست برخاست، کھانے پینے اور سب کاروبار میں نزاکت اور تراش کے تکلف بھرے تھے۔ ویسی ہی ان کی گفتار تھی۔ وہی گفتار نظم میں آئی۔ رفتہ رفتہ پہلے اوصاف گم ہو گئے۔

میرے دوستو! پہلے کی سادگی اور بعد کی رنگینی کو یوں تصور کرو کہ انشا پردازی کا شہر آباد ہے۔ دکانیں سجی ہیں۔ بازار جاری ہیں۔ ان میں شعرائے طبقہ اول (خصوصاً فردوسی کا کلام) ایک پہلوان ہے کہ جنگل کے دامن اور پہاڑ کی گود میں پلا ہے۔ وہیں کی غذا نے بازوؤں میں بل دیا ہے اور قدرتی آب و ہوا نے چہرہ کو شاداب کیا ہے۔ وہیں کے سیدھے سادے اور ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے ہے۔ کئی سبز پتیاں ایک گلاب کا شگوفہ پگڑی میں ہے۔ اپنے بدن کے بل اور دل کی دھن میں جھومتا جھامتا چلا جاتا ہے۔

شعرائے مابعد کے کلاموں کو دیکھو! اہل شہر چلے جاتے ہیں۔ دھوئے دھائے چہروں کو خط نے تراش دی ہے۔ بالوں کو کنگھی نے آنکھوں کو سرمہ نے۔ روکھے چہرہ کو تیل نے چمکایا ہے۔ سوکھے سوکھے بدن پر چست کپڑے چپکے ہوئے ہیں۔ ایک نازک چھڑی ہاتھ میں ہے۔ خراماں خراماں چلے جاتے ہیں۔

اس معاملہ میں ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا آزاد کا کام نہیں۔ اپنا اپنا مذاق جدا ہے۔ کچھ لوگ ہیں کہ طبقہ اول کے کلام کو پسند کرتے ہیں۔ کچھ ہیں کہ دوم کو۔ اور جس قدر اس وصف میں ترقی کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ فصاحت کلام نے ترقی کی ہے۔

جو پرانے الفاظ اور خاص خاص محاورے طبقہ اول میں لکھے گئے۔ وہ اس طبقہ میں کم بلکہ بہت کم ہو گئے۔ اور اکثر الفاظ بالکل گم ہو گئے مثلاً کج کی جگہ کژ اور کژی کی جگہ کژی نہیں کہا۔ وغیرہ وغیرہ۔ جو الفاظ مردار یا متروک ہو گئے ان کی فہرست پڑھنی فضول ہے۔

یہ نکتہ بھی قابل اظہار ہے کہ زبان میں ایک قسم کی نرمی اور سلاست پیدا ہوئی اور یہ امتیاز بیان میں نہیں آسکتا۔ اسے مذاق سلیم پا سکتا ہے۔ شاہنامہ اور سکندر نامہ دونوں فارسی ہیں اور دونوں کے مصنف اعلیٰ درجہ کے صاحب کمال ہیں۔ پھر بھی دونوں کے

الفاظ اور بندش میں ایسا فرق ہے کہ گویا دونوں کی زبان جدا جدا ہے۔

باوجودیکہ نظامی نے بلبل کے نغمہ اور گل کے رنگ و بو سے بہت کام لیا۔ پھر بھی اس کے الفاظ اور بندش میں غزلیت کا مزہ نہیں پیدا ہوا۔ جاننے والے جانتے ہیں اور پہچانتے ہیں کہ غزل کے لیے الفاظ اور ہیں۔ الفاظ کی ترکیب اور ہے۔ اسی طرح مثنوی اور قصیدہ وغیرہ ہر ایک کلام میں ایسا فرق ہے گویا ہر ایک کی زبان جدا جدا ہے۔

اسی عہد سے سلسلہ نظم میں اول یا آخر، جہاں آجاتا کبھی کبھی تخلص بھی لگا دیتے تھے۔ خاقانی و انوری کے دیوان میں کہیں کہیں غزل کی آواز بھی آجاتی ہے۔

اس طبقہ میں الفاظ مذکورہ ذیل طبقہ اول کی یادگار باقی ہیں۔ پہلے خاص و عام کے محاورہ میں یہی ادائے مطلب کرتے تھے :۔

رامش فردوسی وغیرہ آرام و آسودگی یا عیش و نشاط کی جگہ رامش ہی کہتے تھے۔

رامشگر خنیاگر۔ فردوسی نے غالباً مطرب کا لفظ کہیں نہیں کہا۔ طبقہ دوم میں مطرب نغمہ گر نغمہ ساز وغیرہ بھی کہنے لگے۔

غریو۔ اس طبقہ میں غریو کی جگہ غوغا، شور، فریاد اور خروش وغیرہ بھی کہنے لگ گئے۔

پیغارہ اس طبقہ میں طعنہ، ملامت اور سرزنش بھی کہنے لگے۔

پیغولہ اس طبقہ میں گوشہ یا کنج بھی کہنے لگے۔

آرزم اس طبقہ میں شرم، حیا، مروت اور صلح وغیرہ بھی کہنے لگے۔

دژم اس طبقہ میں افسردہ۔ غمناک۔ اندوہگین۔ محزون۔ مغموم بھی کہنے لگے۔

دژخیم اس طبقہ میں زشت خو۔ زشت رو' بد' بدرو' بد خو کہنے لگے۔

نژند اس طبقہ میں غمگین و اندوہناک وغیرہ بھی کہنے لگے۔

اہرمن فردوسی کی زبان پر شائد کہیں شیطان آیا ہوگا۔ اس طبقہ میں شیطان اور ابلیس بھی آگئے۔

سوگند فردوسی کی زبان پر شائد کہیں آیا ہو گا۔ پھر یمین اور قسم بھی کہلانے لگے

پور فردوسی کی زبان پر شاید کہیں آیا ہو گا اب پسر۔ اور۔ فرزند۔ اور جگر گوشہ۔

نور دیدہ۔ وغیرہ پیدا ہو گئے۔

یل — دستان۔ کند آور۔ گرد۔ گو۔ فردوسی وغیرہ کا سکہ کلام تھا۔ اب پہلوان۔ دلاور۔ شجاع۔ وغیرہ وغیرہ کہنے لگے۔

ستام — اس طبقہ میں سازو یراق بھی کہنے لگے۔

گیہان — گیتی، عام محاورہ تھا۔ اب جہان اور عالم وغیرہ بھی بولنے لگے۔

راد — اب کریم۔ سخی۔ جوانمرد وغیرہ الفاظ کہنے لگے۔

کیفر — اس طبقہ میں پاداش، جزا اور مکافات بھی کہنے لگے۔

کنش — طبقہ اول کا عام محاورہ تھا۔ اب عمل، کار اور کردار بھی بولنے لگے۔

منش — خو، طبیعت، طینت بھی کہنے لگے۔

مانا — گوئیا۔ گویا۔ مانند۔ مثل۔ مشابہ بھی کہنے لگے۔

مشکو — حرم سرا۔ حریم حرمت وغیرہ وغیرہ الفاظ تراشے گئے۔

نیا — جد بھی کہنے لگے

بارہ۔ ہیون — تگاور۔ سمند۔ فردوسی وغیرہ اسپ کی جگہ یہی الفاظ لکھتے تھے۔ اب اور اصطلاحی الفاظ عام ہو گئے۔

دژ۔ بارہ — اس طبقہ میں حصن۔ حصار۔ قلعہ وغیرہ بھی عام ہو گئے۔

سپہبد — اس طبقہ میں سر لشکر۔ سپہ سالار وغیرہ بھی کہنے لگے۔

از یرا — از یراک۔ زیراک۔ بہت کہتے تھے۔ اس طبقہ میں زیراکہ بھی کہنے لگے۔

تخمہ — نژاد۔ گوہر۔ فردوسی کا تمغائے کلام تھا۔ اس طبقہ میں خانوادہ، خاندان اور اصل وغیرہ بھی کہنے لگے۔

نژادہ — اس طبقہ میں صاحب نژاد۔ عالی نژاد۔ صاحب گوہر۔ والا گوہر۔ عالی حسب۔ والا نسب۔ وغیرہ الفاظ تراشے گئے۔

نبردہ — متروک ہو گیا۔ ہم نبرد۔ ہم جنگ۔ مبارز۔ وغیرہ الفاظ آ گئے۔

گزاردن — اور۔ برگزاردن۔ فردوسی وغیرہ کا سکہ تھا۔ اب گفتن اور بیان کردن۔ اور پیام ادا کردن بھی کہنے لگے۔

چوناں چونیں۔ اودر۔ ایدر۔ ہے۔ فردوسی کے ہر کلام میں کام دیتے تھے۔ اب کم ہو گئے۔

تیسرا طبقہ

اس طبقہ میں غزلخوانی کی ایسی دھوم ہوئی کہ اور مطالب ملتوی بلکہ معزول ہو گئے۔ مطلع اور مقطع سے غزل محدود ہوئی۔ سلاطین و امرا کی خوشامدوں سے قصیدے تاجدار ہوئے۔ مثنویاں رہیں۔ وہ بھی عاشقانہ۔ باقی مضمون بہانہ اور بیگانہ۔ عاشق و معشوق کے راز و نیاز کو ہر دل جانتا ہے۔ اس کے خیال اور۔ اس کی زبان اور۔ نرم نرم الفاظ۔ میٹھی میٹھی باتیں۔ مختصر یہ کہ صدہا لفظ متروک ہو گئے۔ اور زبان ادائے مطالب میں کم مشق ہو کر اپاہج ہو گئی۔ پھر بھی اس میں بہت سے الفاظ طبقہ اول و دوم کی یادگار باقی ہیں۔ اس کے اراکین میں سے چند بزرگوں کے نام اور کلام سناتا ہوں۔

شیخ سعدی اس طبقہ کے شیریں کلام شاعر ہیں اور آج تک پھیکے نہیں ہوئے۔ نظم پڑھو۔ خواہ نثر دیکھو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ باتیں ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ وہی کتابی حکایتیں ہیں۔ جو نثر کی زبان ہے وہی نظم کی شان ہے۔ استعارے بھی ہیں۔ مگر مطلب میں پیچ نہیں ڈالتے۔ صفائی دکھاتے ہیں اور لطف بڑھاتے ہیں۔ دایہ ابر بہاری۔ طفلان نبات۔ مہد زمین۔ کلاہ شگوفہ۔ خلعت نوروزی وغیرہ وغیرہ۔ یہ بھی زیادہ نہیں۔ آٹھ صفحہ میں آٹھ یا دس آ گئے بس۔ دیوان میں جو عاشقانہ غزلیں ہیں۔ ان میں اکثر یاروں اور پیاروں کے حالیہ مطالب ہیں۔ دین و دنیا کی سودمند نصائح و پند ہیں اور قصائد میں بھی یک رنگ ہیں۔ جو کچھ ہیں بے تکلف اور میٹھی باتوں میں فصاحت شیراز کا شیرہ بہاتے ہیں اور ادائے مطلب میں پورے قادر الکلام ہیں۔ 691ھ میں فوت ہوئے۔

غزل

گلبناں پیرایہ برخود بستہ اند بلبلاں را در سماع آوردہ اند
ساقیان لاابالی در طواف ہوش میخواران مجلس بردہ اند

جرعہ خوردیم وکارازدست رفت تاچہ بے ہوشانہ درمے کردہ اند
مابہ یک جرعہ چنیں بے خودشدیم دیگراں چند قدح چوں خوردہ اند
آتش اندر منتگاں افتادہ و سوخت خام طبعاں ہمچناں افسردہ اند
خیمہ بیروں زن کہ فراشان باد فرش دیبادر چمن گستردہ اند
زندگانی چیست مردن پیش دوست کایں گروہ زندگاں دل مردہ اند
تاجہاں بودہ است جما شان گل از سلحداران خار آزردہ اند
عاشقاں راکشتہ بے بیند خلق بشنواز سعدی کہ جاں پروردہ اند

غزل

معلمت ہمہ سوخی و دلبری آموخت جفا ناز و عتاب و ستمگری آموخت
مرا بشاعری آموخت روزگار آنگہ کہ چشم مست تودیدم کہ ساحری آموخت
ہمہ قبیلہ من عالمان دیں بودند مرا معلم عشق تو شاعری آموخت
بلائے عشق تو بنیاد زہد و بیخ ورع چناں بکند کہ صوفی قلندری آموخت
وگرنہ عزم سیاحت کند نہ قصدوطن ہر آنکہ برسر کویت مجاوری آموخت
من آدمی بہ چنیں شکل و قدوخود روش ندیدہ ام۔ مگر ایں شیوہ از پری آموخت
چنیں بجریم ازیں پس کہ مرد نتواند بآب دیدہ سعدی شناوری آموخت

خواجہ حافظ نے دیوان غزل کے سوا کچھ نہیں لکھا۔ برائے نام چار یا پانچ قصیدہ بھی کہے مگر غزل ایسی لکھ گئے کہ آج تک سب آنکھوں پر رکھتے ہیں۔ ان کے ہاں بھی نہ صنعتوں کی بناوٹ ہے۔ نہ استعاروں کی رنگ آرائی ہے۔ دل کی صفائی ہے۔ زبان سے نکل آئی ہے۔ ایک غزل ان کی بھی سنئے اور وقت کی زبان کو قیاس فرمائیے۔ 791ھ میں انتقال فرمایا۔

غزل

بیاکہ قصر امل سخت ست بنیاداست بیار بادہ کہ بنیاد عمر برباد است
غلام ہمت آنم کہ زیرچرخ کبود زہرچہ رنگ تعلق پذیرد آزاد است
نصیحتے کنمت یاد گیرو درعمل آر کہ ایں حدیث ز پیر طریقتم یاد است

مجو درستی عہد از جہان سست نہاد　　که ایں عجوزہ عروس ہزار داماد است
چہ گویمت کہ بمیخانہ دوش مست و خراب　　سروش عالم غیبم چہ مژدہ ہا داد است
کہ اے بلند نظر شاہ باز سدرہ نشیں　　نشیمن تو نہ ایں کنج محنت آباد است
ترا ز کنگرہ عرش میزنند صفیر　　ندانمت کہ دریں دامگہ چہ افتاد است
غم جہاں مخور و پند من مبر از یاد　　کہ ایں لطیفہ نغزم ز رہروے یاد است
رضا بدادہ بدہ وز جبیں گرہ بگشا　　کہ بر من و تو در اختیار نگشاد است
نشان مہر و وفا نیست در تبسم گل　　بنال بلبل مسکیں کہ جائے فریاد است
حسد چہ مے بری اے سست نظم بر حافظ　　قبول خاطر و لطف سخن خداداد است

غزل

مزرع سبز فلک دیدم و داس مہ نو　　یادم از کشتہ خویش آمد و ہنگام درو
گفتم اے بخت بخوابیدی و خورشید دمید　　گفت با ایں ہمہ از سابقہ نومید مشو
تکیہ بر اختر شب گرد مکن کیں عیار　　تاج کاؤس ربود و کمر کیخسرو
گر روی پاک و مجرد چو مسیحا بہ فلک　　از فروغ تو بخورشید رسد صد پرتو
آسماں گو مفروش ایں عظمت کاندر عشق　　خرمن مہ بجوئے خوشہ پرویں بہ دوجو
گوشوار در و لعل ارچہ گراں دارد گوش　　دور خوبی گزرانست نصیحت بشنو
چشم بد دور ز خال تو کہ در عرصہ حسن　　بیذقے راند کہ برد از مہ و خورشید گرو
ہر کہ در مزرع دل تخم وفا سبز نہ کرد　　زرد روئی کشد از حاصل خود گاہ درو
اندریں دائرہ میباش چو دف حلقہ بگوش　　ور قفائے خوری ازدائرہ خویش مرو
آتش زرق و ریا خرمن دیں خواہد سوخت　　حافظ ایں خرقہ پشمینہ بینداز و برو

عزیزان وطن! اس طبقہ کے باکمالوں کے کلام آپ نے سن لیے۔ دیکھئے! ترکیبیں بدل گئی ہیں۔ نرمی اور صفائی زیادہ معلوم ہوتی ہے۔ تصنیفات کو پڑھیں گے تو معلوم ہوگا کہ کتنے الفاظ متروک ہوگئے۔ پھر بھی بعض بعض باقی ہیں۔ خصوصاً شیخ سعدی کے کلام میں۔ اس کی وجہ شاید یہ ہوگی کہ بزرگان قدیم کی طرح روئیداد احوال اور حالیہ خیالات بہت نظم کرتے تھے۔ ان میں ان کے الفاظ بھی آجاتے تھے۔ یا یہ کہ ایک صدی

کے میدان پر پانی پھیر کر دوسری صدی میں جھاڑو دے رہے تھے۔ بہ نسبت نوجوانوں اور تازہ خیالوں کے اسی یا نوے برس پہلے کے الفاظ زبان پر چڑھے ہوئے تھے۔ مثلاً مر۔ ہمانا اور خویشتن وغیرہ وغیرہ۔

غزل

بدرگاه لطف و بزرگیش بر — بزرگاں نهاده بزرگی زسر
بدریا در منافع بے شمار است — اگر خواہی سلامت برکنار است
ز عہد پدر یا دوارم ہمے — کہ باران رحمت بروہر زدے
تنم ہے بلر زد چویاد آورم — مناجات شوریدۂ در حرم
بہ بانگ دہل خواجہ بدار گشت — چہ داند شب پاسباں چوں گزشت
کہ ناگہ دہل زن فرو کوفت کوس — خواند از قضائے برہمن خروس
فروشو چو بینی در صلح باز — کہ ناگہ در توبہ گردد فراز
کہ چندیں زتمارو وردم مپیچ — کہ روز دو پیش از تو کردم بسیچ
دی شب آمد بر سعدی بہ تکلف بنشت — فتنہ بنشست جو برخاست قیامت برخاست
اے بحکم شرع آب خوردن خطاست — وگرخوں بہ فتوئی بریزی رواست
بکردار بد شاں مقید نکرد — ابضاعات مزجات شاں رد نکرد
الا تا بہ غفلت نہ خسپی کہ نوم — حرام است بر چشم سالار قوم
مرا ہچو تو خواب خوش در سراست — ولیکن بیاباں بہ پیش اندر است
نیا وردہ عاقل غش اندر میاں — نیندیشد از رفع دیوانیاں
منم آں زپائے اندر افتادہ پیر — خدایا بہ فضل خودت دست گیر
برو شکر کن گر بہ خربر نہ — کہ آخر بزیر کساں خر نہ
بہ صنعا درم طفلے اندر گزشت — چگویم کزانم چہ بر سر گذشت
دو خواہند بودن بہ محشر فریق — ندانم کدامی دہندم طریق

طبقہ چہارم

900ھ کے بعد کشور نظم میں عجیب انقلاب پیدا ہوا۔ قاعدہ ہے کہ جب تک شاعری عالم طفولیت میں رہتی ہے اس سے عام و خاص ہر شخص مزا اٹھاتا ہے۔ سبب بھی بیان کر چکا ہوں کہ مطالب ان تشبیہوں اور استعاروں میں ادا ہوتے ہیں۔ جو ہر جگہ اور ہر وقت پیش نظر ہیں۔ ایک عرصہ کے بعد جب وہ اہل سخن کے خرچ میں آجاتے ہیں تو نئے شاعر اپنے کلام میں نئی بات پیدا کرنی چاہتے ہیں۔ ناچار وہ باریک یا عمیق یا بلند یا دور کے مجاز اور استعاروں میں ادا کرتے ہیں۔ اس لیے کلام باریکی سے تاریکی میں گر کر کبھی غور طلب اور کبھی بے لطف ہو جاتا ہے۔

زبان فارسی میں عہد سعدی و حافظ تک کے شاعر جب بہت سے عمدہ اور دلکش انداز اور استعارے اور مجاز خرچ کر گئے تو بعد میں آنے والوں کو اس کے سوا چارہ نہ ہوا کہ استعارہ کو استعارہ در استعارہ اور مجاز کو مجاز در مجاز کر کے معنوں میں نزاکت اور باریکی پیدا کریں اور سننے والوں سے کہوائیں کہ سبحان اللہ۔ نیا مضمون ہے۔ اس طرز کے بانی جلال اسیر، قاسم مشہدی اور ملا ظہوری وغیرہ وغیرہ تھے۔ انہوں نے تعریفوں کے شوق میں اصلیت کو چھوڑ اور مجاز کو حقیقت سے بڑھا دیا۔ یعنی بے اصل کو اصلیت قرار دیکر اس کے لوازمات پر خیال پھیلانے شروع کر دیے۔ نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اصلیت بالکل نہ رہی۔ خیال ہی خیال رہ گئے۔ جن کا وجود یا وقوع نا ممکن اور محال ہے۔

جب دولت اور بے فکری عام ہوتی ہے تو خیالی چمن بہت پھولتے ہیں۔ بزرگان مذکور نے قدردانی کے دربار سے جائے اخراج کے عزت کے خلعت اور خیال بند اور معنی آفرین خطاب حاصل کیے اور جو فصیح شاعر ایسے خیالات نہ باندھتا۔ اور کلام اس کا دلپذیر اور پر تاثیر ہوتا تو اسے تذکروں میں درج کرتے اور لکھتے۔ سادہ گوست لا خوشگوست۔ کبھی لکھتے بر فتار قدما سخن مے پیماید۔ مجھے یہی افسوس ہے کہ اصلیت کلام سے جاتی رہی۔ اور قوت بیان میں ضعف آگیا۔ یہی دیکھ کر دانایان فرنگ نے حکم لگا دیا کہ ایشیائی شاعری (ان نیچرل) بے بنیاد ہے اور بے اصل مضمون باندھتی ہے اور ان کی زبان میں اصلیت کے ادا کرنے کی طاقت ولیاقت ہی نہیں۔

مثال میں ایک مطلع جلال اسیر کا پڑھتا ہوں۔ تمام غزل بلکہ دیوان کو اسی پر قیاس

کرلو:۔

تا کے از عکس تو آئینہ گلستاں گردد سوئے عاشق نگے تا ہمہ تن جان گردد

غیر زبان کے لوگوں کو اگر اس کا ترجمہ سناؤ تو بالکل لطف نہیں اٹھا سکتے کیونکہ ہر لفظ کے آگے سے کئی کئی سیڑھیاں اٹھ گئی ہیں کہ ہمیں تمہیں کثرت مزاولت کے سبب سے نہیں معلوم ہوتیں۔ غیر شخص بے خبر ہیں اس لیے رہ جاتے ہیں۔ مطلب شعر کا یہ ہے:

"اے معشوق! تو اپنے سرو قد، نرگس چشم، گل رخسار اور سنبل زلف وغیرہ کے لطف سے بہار گلشن ہے اور ہر وقت شوق خود آرائی میں آئینہ دیکھتا ہے کب تک اس لطافت سے آئینہ کو باغ بناتا رہے گا۔

عاشق کی طرف بھی ایک نگاہ کر کہ اس کا جوہر بہت قابل ہے۔ ایک نگاہ کے اثر سے اس کا تن بھی جان کی طرح لطیف ہو جائے گا"۔

پہلے مصرع کا مطلب دیکھیے۔ ایک رخ کے کہنے سے یہ باغ کا سامان ناواقف آدمی کب سمجھ سکتا ہے اور باعتبار اصلیت کے سوچئے تو ناممکن ہے۔ بھلا ایک عکس پڑنے سے آئینہ باغ کب ہو سکتا ہے۔

دوسرے مصرع کا معاملہ اس سے زیادہ مشکل ہے۔ بھلا جسم، جان کیونکر ہو سکتا ہے اور وہ بھی ایک نگاہ کے اثر سے؟

ان شعروں کی خوبیوں پر ہزار جانیں قربان۔ لیکن کلام اصلیت، اور غیر اصلیت میں ہے۔ وہ نہیں۔ یہ بات درست ہے کہ شاعر اصلیت خالص اور واقعہ واقعی کبھی کبھی اتفاقاً باندھتا ہے۔ اکثر خیالی مضامین نظم کیا کرتا ہے۔ لیکن خیال بھی ایک قریب الوقوع یا ممکن الوقوع ہوتا ہے۔ ایک ناممکن محض۔ ان صاحب کمالوں نے ناممکن کو ممکن کہنا کمال سمجھا اور جتنا زیادہ ناممکن اتنی ہی زیادہ تعریف۔ اسی کمال نے انہیں گھر میں خطاب مذکور دلوائے اور باہر بدنام کر دیا۔

ایران میں بعض شاعر اسی انداز میں ساری طبع کی موزونیت خرچ کر دیتے تھے اور بعض شاعر دونوں طرزوں کو ملا کر پانی سمو دیتے تھے۔ یہ رنگین کلام کہلاتے تھے۔ ان

میں صائب وغیرہ شامل ہیں۔ پھر بھی استعارہ اور اقسام مجاز اور مناسبت الفاظ سے باہر ہونا، مذہب سے باہر ہوتا تھا۔ صائب کے چند شعروں سے میں بھی جلسہ کو رنگین کرتا ہوں :

اگر امبارے افتد بدستم گردن مینا چو دروے نخواہم داشت دست از دامن مینا
دو صبح صادق اند، از یک گریباں سر برآوردہ ید بیضائے ساقی و بیاض گردن مینا
دو چیز از بزم میخوراں پسند آمد مرا صائب زپا افتادن ساقی بسر غلطیدن مینا

ہندوستان میں خیال بندوں کی امت، غنی کشمیری، مرزا بیدل اور ناصر علی وغیرہ نامور ہوئے اور پے رو ان کے آج تک بے شمار چلے آتے ہیں۔

خاقانی و انوری قصیدہ گوئی کا خاتمہ کر گئے۔ چوتھے طبقہ میں ظہوری، عرفی اور نظیری نے بڑے بڑے پرجوش قصیدے لکھے۔ مگر اکثر کی روش غزل سرائی۔ اب ایران میں اہل تحقیق سے گفتگو میں ہوئیں۔ انہوں نے کہا کہ سخن آفرین طبیعتیں تھیں۔ ہند میں گئے۔ بے محل قدر دانیوں نے رستہ بھلا دیا۔ لیکن اسے کیا کہوں کہ صائب جیسے کثیر الکلام شاعر کے اتنے بڑے کلیات میں دیکھئے 4-5 قصیدے۔ وہ بھی صاف صاف۔ مقرری باتیں اور معمولی اوصاف۔

مثنویاں بہت ہوئیں۔ سب کا ایک معمولی افسانہ۔ یعنی عاشقانہ۔ طرز بیان۔ غزل کا انداز اور رنگ رنگ کے مجاز۔

1200ھ کے بعد جدھر سے بادل اٹھا اور ہوا بگڑی تھی۔ خود بخود وہیں سے اصلاح شروع ہوئی۔ یعنی اہل ایران سعدی اور حافظ کے انداز میں غزل اور خاقانی و انوری کے انداز میں قصیدے کہنے لگے۔ یہاں تفصیل طلب ہے۔ انشاء اللہ۔

یار باقی و صحبت باقی

مل رہیں گے ترے کوچہ میں کبھی دل اور ہم یار باقی ہے تو صحبت ہے دل آرا باقی

المرقوم یکم اکتوبر 1872ء

خاتمہ

عزیزان وطن۔ دل شکستہ آزاد نظم فارسی کی ناتمامی پر کتاب کو تمام کرتا ہے۔ افسوس یہ ہے کہ بارھویں صدی کے انقلاب اور حال کی کیفیت نہ دکھا سکا۔ یہ ہو جاتا تو دل کا ارمان پورا ہو جاتا۔ مگر میں ناتمام۔ میرا ہر کام ناتمام۔ اہل طلب کے تقاضے حد سے گزر گئے ہیں۔ اب تھوڑی سی بات کے لیے وقت فرصت پر ملتوی کرنا مصلحت سے بعید ہے۔ امید فرصت میں 14 برس گزر گئے۔ اب ہو گا تو کیا ہو گا۔ عمر نے وفا کی تو طبع ثانی میں وعدہ پورا ہو گا انشاء اللہ۔ اور آزاد پورا ہو گیا تو سبحان اللہ۔ لکھنے والے بہت ہیں۔ وہ لکھ دیں گے۔ ہم دیکھ لیں گے۔ عادت الٰہی اسی راہ جاری ہے۔ خاتمہ کلام دعا پر ہے کہ خدا حسن قبول روزی کرے اور فوائد سے سب کو کامیاب کرے۔ آمین۔ آمین۔ ثم آمین۔

قطعہ تاریخ انطباع کتاب لاجواب سخندان فارس

از نتائج طبع جناب خلیفہ سید محمد محسن صاحب متخلص بہ متین برادر والا جناب معلیٰ القاب مشیر الدولہ ممتاز الملک آنریبل خلیفہ سید محمد حسین خان بہادر ممبر کونسل اوف ریجنسی ریاست پٹیالہ

بلند نام محمد حسین۔ آنکہ بود   خطاب۔ شمس العلما۔ تخلصش آزاد

کہ الحق است بہر علم۔ افضل و اعلیٰ   بہ نظم و نثر۔ بہر طرز۔ اکمل و استاد

ہمش محمد باقر پدر۔ جملہ علوم   ندانشت پایہ۔ کم از میر باقر داماد

چو فخر آں اب و این جد محمد ابراہیم   کتاب نغز۔ مجمم زندہ ساز والد راد[54]

کہ ازبرائے چنیں نامہ[55] اش بنام خدا   چہا شگرف[56]۔ سخندان فارس نام نہاد

ازینکہ ہست عجیب و غریب تاریخ   زبان ایراں راہبر ہند حسب مراد

بانطباع رسانیدازیں خیال نکو   کہ بے شمار فوائد خلق خواہد داد

بہ بندہ ہم پے تاریخ گفتگش بنوشت   سروش کرد ہمیں ہمدراں دمم ارشاد

کہ ہیں شتاب بجوائے متیں بلا کم و کاست   بسا مفید سندان فارس از آزاد

حواشی

1- یہ بھی درست ہے۔ یونان کی زبان نے فلسفہ الٰہی کو پھیلا کر خدا پرست فلاسفر کو بہشت میں پہنچایا۔ سنسکرت نے ہند میں دھرم گیان اور عربی نے معرفت الٰہی سکھایا۔

2- یہی سبب ہے کہ اگر ایک فصیح صاحب تقریر لکچر دے رہا ہو اور تم اس پر یہ قید لگا دو کہ کسی طرح کی حرکت اعضا میں یا تغیر چہرہ میں نہ آنے پائے تو دیکھ لو گے کہ بات بھی نہ کر سکے گا۔

3- یہاں سے ثابت ہوا کہ جس لفظ پر محاورہ صاد کر دے وہی فصیح ہے وہی درست ہے۔ صحیح لفظ ہو اور محاورہ میں نہ ہو تو ناروا ہے اگر اور کچھ نہیں تو کلام کو بدمزہ یا مکروہ ہی کر دے گا۔

4- لغت کسی زبان کے عام الفاظ جسے ملک مذکور کے عام رہنے والے سمجھتے تھے یا سمجھتے ہوں یا زبان مذکور کے جاننے والے جانتے ہوں، اسی کو کہتے ہیں کہ لفظ کے معنی قوم نے تسلیم کئے اور اصطلاح وہ ہے کہ گروہ خاص میں متعارف ہو۔ مثلاً جو بات پیل کی کشت سے ہوا سے پیلبند کہتے ہیں۔ دیکھ لو نعمت خان عالی نے وقائع میں ایک فرضی مہاجن کا معائنہ کیا ہے۔ اس کا شعر ہے:

آں صورت مہابت پیلان ہتیہ پول
ما را چہ پیلبند حساب و کتاب کرد

جو شخص اہل شطرنج کی اصطلاح کو جانتا ہو گا وہ اس شعر کا لطف اٹھائے گا، غیر کی سمجھ میں نہ آئے گا۔

5- ایران میں کہتے ہیں: "نہار حاضر است" یعنی دستر خوان پر صبح کا کھانا چنا ہوا ہے۔

آیئے نوش جان فرمایئے۔اور "ہنوز نہار نہ کردم"۔یعنی ابھی صبح کا کھانا نہیں کھایا۔

6- آلتہ=وصف کردن، شہوت:" صحبت کردن و صحبت داشتن۔

7- خان آرزو اور ٹیک چند بہار دو محقق ہمارے کہتے ہیں کہ "اس" بہ معنی فرسودن ہے۔ "تین" حرف نسبت ہے۔ آستین پہنچے کو گھستی ہے اس لئے اس نے یہ نام پایا۔ہدۂ آزاد کہتا ہے کہ دست، ہست۔ ہست سے است۔ پھر استی۔ پھر آستی اور پھر آستین ہو گیا ہو گا۔ پھر دیکھو کہ دستازبان ژند میں بہ معنی دست ہے اور یہ قاعدہ ہے کہ ژند کی "ذ" جب سر لفظ پر ہو تو فارسی میں دپڑھی جاتی ہے۔شاید ذال سین کے ساتھ ہو کر "ہ" ہوئی ہو اور سنسکرت میں ہست ہو گیا ہو اور "ت" اپنے اصل پر رہا۔

8- اسی سے ہے دویست یعنی ذوصد۔

9- تنگہ۔ترکستان بخارا میں چاندی کا سکہ ہوتا ہے ۵ آنے سے کچھ زیادہ۔

10- افغان کا مطلب یہ تھا کہ تصویر کے ذکر سے ہماری بت پرستی ثابت کرے اور ترک بچہ کے خیالات اسلامی کو چمکادے۔

11- روس کی بدولت یہ لفظ وہ بھی جان گئے تھے۔ گورز کو برناس کہتے تھے۔

12- ٹ،ڈ،ژ وغیرہ فارسی میں ت،د،ر ہو جاتے ہیں۔اور چ،گ وغیرہ عربی میں ص، ج ہو جاتے ہیں۔

13- جوارش کمونی اور معجون کمونی ایک دوائے ہاضم ہے۔ کمون زیرۂ خراسانی کو کہتے ہیں۔

14- ایک صاحب ژند پہلوی اور سنسکرت سے واقف ہیں۔ انہوں نے اس اتفاق پر اعتراض کیا اور کہا کہ ہتاشن اس آگ کو کہتے ہیں جو ہوم کے کام آتی ہے اور یہ آتش عام ہے۔انہوں نے یہ بھی کہا کہ آتش زبان ژند میں آترش ہے اور بعض ترکیبوں میں اس کا "ش" گر پڑتا ہے۔ فقط "اتر" رہ جاتا ہے،وہی آذر ہو جاتا ہے۔

15- ملا فیروز وہی ہیں جنہوں نے دساتیر باترجمہ و فرہنگ تصحیح کر کے چھپوائی تھی اور جارج نامہ تین جلدوں میں لکھا تھا۔

16- دیکھو تمرناسک۔بابو سیوا پرشاد کا جغرافیہ۔

17- "ج" سنسکرت میں حرف نسبت ہے۔ چنانچہ نیر سے نیرج (کنول کا پھول) اور آتمہ سے آتج نکلا ہے۔

18- یونانی مصنف اسے پر سی پولیس لکھتے ہیں۔ پر سی = پارس + پولیس۔ قلعہ کہ جمشید نے اقبال کے بلند پہاڑ پر بلند کیا تھا۔ اس کے کھنڈر اب تک پرانے جاہ و جلال کو عظمت دیتے ہیں۔ استخر = تلاؤ کو کہتے ہیں۔ اس میں پہلے بہت بڑا تلاؤ تھا۔ شیراز سے اصفہان کو جاتے ہوئے دوسری منزل میں رستہ سے ایک میل کے فاصلے پر ہے۔ انشاء اللہ سفر نامہ میں مفصل حال لکھوں گا۔

19- یہاں پارسا بہ معنی باشندۂ پارس ہے، پرہیزگار نہیں۔

20- اصل دساتیر کی عبارت میں سنگر نگاس لکھا ہے۔ ساسان پنجم نے فارسی ترجمہ میں چنگر نگاچہ بنا دیا ہے۔ اگر وہ شخص ہندو ہو گا تو شائد پہلا لفظ شنکر ہو کہ شوجی کا نام ہے۔ شائد شنکر اچارج ہوں۔ ان کے وقت میں بیاس جی کہاں؟ اور ممکن ہے کہ بودھ مذہب کا کوئی عالم ہو۔ اس نام میں میری عقل کام نہیں کر سکتی۔

21- یاسا: قانون سیاست۔

22- مواخذہ و تحقیقات۔

23- آرام نمودن۔

24- نوازش۔

25- برادر بزرگ۔

26- برادر کوچک۔

27- کجلی بن میں جب ہاتھیوں کو پکڑتے ہیں تو ہتھنی کی لاگ سے پکڑتے ہیں۔ اسے سدھا کر جنگل میں چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ ہاتھیوں کو لگا لاتی ہے اور ان کی اصطلاح میں اسے "کُٹنی" کہتے ہیں۔

28- مسند وزراء و امراء کو "نصدیق" کہتے ہیں۔

29- ارشیا۔ ارتھیا کا مبدل ہے۔

30- اسی کا بجوکر رو تارہ گیا ہے۔

31- اب بھی اصفہان سے طہران اور مشہد مقدس اور ہرات تک برابر تین تین، چار چار کوس پر عالیشان سرائیں اور رباط سلاطین صفویہ کی عظمت اور حسن نیت دکھارہی ہیں۔ میں جس سرا پر پہنچتا تھا اس کی استواری اور عمدہ تعمیر دیکھ کر دل اور زبان برابر کہتے تھے شکر اللہ سعیہم۔ ہاتھ اٹھاتا تھا اور فاتحہ پڑھ کر ثواب پہنچاتا تھا اور کاروان میں بھی چند آدمی ضرور نیکی سے یاد کرتے تھے۔ میرے دوستو! دیکھو نیکی کیا شے ہے اور اس میں کتنا زور ہے۔

32- غیر سلطنت کا وکیل جو دربار ایران میں حاضر رہتا ہے۔ اسے بالیوس یا وزیر مختار کہتے ہیں۔

33- یورپ کے سفر میں ناصر الدین شاہ لندن میں تھے۔ گھوڑے کے ساز کا ایک ٹکڑا ٹوٹ کر گر پڑا۔ ایک گورے نے پایا اور شاہ کے منزل گاہ پر لایا۔ مصاحب نے حضور میں پیش کیا۔ پھر لا کر گورے کو واپس دے دیا۔ اور کہا: "ہرچہ از شاہ افتاد۔ باز شاہ او را دست ممیکند کہ افتادہ است۔ بجیر یدحالا مال شماست"۔ اس کی قیمت ۱۰ ہزار تشخیص ہوئی تھی۔

34- فارسی قدیم میں میز دستر خوان کو کہتے تھے۔

35- ہند کی انشا پردازی میں جب کوئی مہمان یا مسافر کہیں پہنچا ہے تو اس کی تعظیم و تواضع کے سامانوں میں کھٹرس بھوجن یا شٹرس بھوجن ضرور کھلایا جاتا ہے۔ میں حیران تھا کہ ایک کھانے میں چھ مزے دیں تو وہ کھانا، کیا کھانا ہوگا؟ بہت لوگوں سے پوچھا مگر خاطر جمع نہ ہوئی۔ ایک دن استاد مرحوم سے ذکر آیا انہوں نے فرمایا کہ ہندوستان میں سال بھر کے ۶ موسم ہیں۔ ہر موسم اپنی بہار کا لطف الگ رکھتا ہے اور اس کے میوے دانے بھی الگ الگ لطف و لذت رکھتے ہیں۔ اس سے یہ مراد ہے کہ صاحب خانہ نے اپنی محبت یا اعتقاد یا صفائی دل کے کمال سے مہمان کو وہ لطف دکھایا کہ اسے چھوں فصلوں کی لذتیں حاصل ہو گئیں اور حقیقت میں عمر انسان کی انہی ۶ فصلوں میں گزرتی ہے۔ بس گویا لطف زندگی سے کامیاب کر دیا۔ اب خیال کرو ملک کی موسمی تقسیم نے یہ خیال ہند میں پیدا کیا۔ جن ملکوں میں یہ تقسیم نہیں وہاں یہ خیال پیدا کیونکر ہو سکتا ہے اور لوگوں

کو اس سے کیا لطف حاصل ہو سکتا ہے۔

36- آتش دان کے سامنے آتشگیر (دستپناہ) آتش کش، قبر اور خاکریز وغیرہ کئی چیزیں موجود رہتی ہیں۔

37- موسیو نکولا قنصل دولت فرانس مقیم طہران اپنے مکالمہ فارسی کے دیباچہ میں کہتے ہیں۔

38- ترکستان کی رسم قدیم ہے کہ نوروز کے دن دستر خوان سجاتے ہیں اور سب مل کر لوٹتے ہیں، کھاتے ہیں، خوشیاں مناتے ہیں اور اسے آئندہ کے لئے نیک شگون سمجھتے ہیں۔

39- سپر انداختن سے اظہار اور اقرار مغلوبی مراد ہے۔

40- جو تیر کہ ترکش بھر میں عمدہ ہو اسے تیر روئے ترکش کہتے ہیں۔ جیسے ٹوکرے بھر میں جو عمدہ پھول ہو اسے گل سر سبد کہتے ہیں۔

41- اب ایران میں لفافہ کو پاکت کہتے ہیں۔

42- سکاکی نے مصباح میں کہا ہے۔ والزيادة تنادى عليها باعلىٰ صورت۔ فقل للطبع السليم ان يزيد عليها ماشاء ۔ ولا حكم فى هذا الا لاسستقامة الطبع۔

43- رودہ۔ تانت کو کہتے ہیں۔ سارنگی پر تانت کے تار چڑھتے ہیں اس لئے اسے بھی رود کہتے ہیں۔

44- دریائے جیحوں کا ایک نام آمویہ بھی ہے۔

45- بربارہ۔ اب بھی عمدہ گھوڑوں کی دم میں کہیں ایک اور کہیں دو گرہ دیتے ہیں۔

46- آفریں: بہ معنی دعا و ثنا۔ عہد قدیم میں عام محاورہ تھا، اب متروک ہے۔

47- متاخرین میں متروک ہو گیا مگر خوشنما محاورہ ہے۔

48- بچے کے گویائی حاصل کرنے کو کیسے پیارے الفاظ میں ظاہر کیا ہے۔

49- اب بموجب محاورہ کہتے ہیں: "شاخ درخت مے شکست"۔

50- ان پاس پاس کی تشبیہوں کو دیکھو کیا بھلی معلوم ہوتی ہیں۔

51- فن زبان کے دہقان نے دیکھو "پائے کاشکن" کا محاورہ کیا خوب صورت نکالا ہے۔

52- کجا نبید است۔ یعنی جائیکہ نبید است۔

53- دوسرے طبقہ کے لوگ ہست کہنے لگے۔

54- بہ "ر" مہملہ لفظ فارسی ست بہ معنی فیض رساں و شجاع و عالم علوم۔

55- بہ معنی کتاب۔

56- بہ معنی نادر و نایاب۔

تاریخ و ادب پر ہماری منتخب کتب

فن تحقیق: مبادیات، اصول اور تقاضے	رانا سلطان محمود
ابتدائی لائبریری سائنس	رانا سلطان محمود
انگریزی ادب کا تنقیدی جائزہ 600ء تا حال	رانا خضر سلطان
مثنوی سحر البیان: شعری داستانوں کا ارتقاء، تحقیق شدہ متن	میر حسن دہلوی مرتب: رانا خضر سلطان
قدیم لکھنؤ: مشرقی تمدن کا آخری نمونہ	عبدالحلیم شرر
پاکستان کے تعلیمی مسائل	محمد اسلم خان نیازی
تاریخی مقالات	پروفیسر محمد اسلم
اردو نثر کی داستان	ڈاکٹر طیبہ خاتون
زبان و ادب	پروفیسر حبیب اللہ غضنفر
لال قلعے کی ایک جھلک	مرتب: ڈاکٹر انتظار مرزا
لکھنؤ کا دبستان شاعری (دو جلد سیٹ)	ڈاکٹر ابواللیث صدیقی
دہلی کا دبستان شاعری	ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی
کلیات اختر شیرانی	مرتب: ڈاکٹر یونس حسنی
کلیات پطرس (دو جلد سیٹ)	مرتب: شیما مجید
کلیات حالی	مرتب: رانا خضر سلطان
کلیات ڈپٹی نذیر احمد	مرتب: رانا خضر سلطان
کلیات انیس	میر ببر علی انیس مرتب: رانا خضر سلطان
کلیات اکبر	اکبر الہ آبادی مرتب: رانا خضر سلطان
کلیات جگر	جگر مراد آبادی مرتب: رانا خضر سلطان
کلیات حسرت	مولانا حسرت موہانی مرتب: رانا خضر سلطان
کلیات مولانا محمد حسین آزاد	مولانا محمد حسین آزاد

بک ٹاک
میاں چیمبرز 3- ٹمپل روڈ لاہور
فون: 6303321 - 6370656 (042)